

قراقرم کے قبائل

پروفیسر عثمان علی



954.9122 Usman Ali, Prof.
Qaraqaram ke qabail/Prof. Usman Ali. - Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2000.
582p.
1. Tahzeeb-o-tamadan. 2. Tareekh-Qaraqaram I. Title.

2000
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

969-35-1138-7

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore 54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

کمبائن پرنٹرز، لاہور

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم۔

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ (اور) خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک خدا سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے زیادہ خبردار ہے۔"

سورۃ الحجرات 13 قرآنِ کریم۔

انتساب

کنبہ کے ان افراد کے نام جو ایک پاکیزہ ماحول کے علمبردار ہیں۔

سنبل بیگم	رئیس احمد	میجر مسعود احمد
میجر ارشاد احمد	وسیم احمد	ذوالفقار احمد
شکیل احمد	عدیل احمد	ادیبہ زرتاج
عالیہ نازش	عظیمہ شاہین	عظمت جہاں
طاہرہ افشاں	فضل میر	قائد نعیم
ایمن	عروج	کامنی
نعیمی	ماہم	آبگینہ
نبیل	فہد	عمیر

عثمان علی

فہرست

پیش لفظ

1965ء میں، میں ہائی سکول گلگت میں ایک معلم کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ استادِ محترم حشمت اللہ خان ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ انقلابِ آزادی گلگت کی تاریخ قلمبند کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم دونوں مل کر اس کام کو آگے بڑھائیں۔ میں نے حامی بھر دی اور کام کا آغاز ہوا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ استادِ محترم اخراجات کا بار سنبھالیں گے اور میں قلم کا۔ چنانچہ اس فارمولے کے مطابق انہوں نے نہ صرف مجھے کچھ کتابیں فراہم کیں بلکہ اِدھر اُدھر سفر کے اخراجات بھی برداشت کیے جن میں مختلف لوگوں کے انٹرویو کرنے تھے۔ مقامی طور پر مواد کے حصول کے لئے مختلف دفاتر کے ریکارڈز کا بھی جائزہ لیا گیا۔ یہ کام جاری تھا اور میں نے تاریخ کے ابتدائی چار ابواب تیار کیے تھے کہ مجھے بی ایڈ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے پشاور جانا پڑا۔ جانے سے پہلے میں نے تیار ابواب اور متعلقہ سارا مواد استادِ محترم کے حوالے کیا اور یوں یہ کام کھٹائی میں پڑ گیا۔ اور پھر مختلف وجوہات کی بنا پر اس کام کو آگے نہ بڑھایا جا سکا۔

تاہم مجھے مختلف دفاتر کے ریکارڈز کے جائزہ کے دوران یہ معلوم ہوا کہ ان دفاتر میں موجود مواد تاریخی، معاشرتی، علمی اور قانونی اعتبار سے کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ سب ڈویژنل کورٹس کا ریکارڈ روم نادر علمی، قانونی، تاریخی اور معاشرتی حوالوں سے مزین پایا۔ یہاں مجھے امیر سنگھ نائب مہتمم بندوبست (94-1893)، ٹھاکر سنگھ مہتمم بندوبست (16-1915) کا مرتب کردہ بندوبستی ریکارڈ، نکس شجرے، رواج الملک، رہنیر ڈانڈبدیہی، شرع اسلام، ایف سی آر سے متعلق دلچسپ تفصیلات دیکھنے کو ملیں۔ انگریزوں کے بعض ایسے فیصلے بھی دیکھے جن میں نامور ماہرین السنہ و عمرانیات کے تجزیے بھی ردوکد اور استدلال کے لئے لف کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ ریکارڈ روم گلگت ایجنسی کے علاقائی اور تحصیل حدود، جنگلات، درائی، مالیہ، کاریگار، ریس، نسلی امور کے بارے میں معلومات کا ایک بے مثال خزانہ تھا۔ مجھے چونکہ اس ریکارڈ کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ اس لئے میں نے کچھ سابق کمشنران سے کہا تھا کہ وہ اس ریکارڈ کو نم اور کرم خوردگی سے بچانے کے لئے تحفظ کے معیاری طریقے اپنانے کے لئے کچھ تدابیر کریں۔ کیا معلوم تھا کہ بعد میں یہ ریکارڈ جہلا کے ہاتھوں نذرِ آتش ہوگا۔ بہر حال 1967 کے بعد میں نے اس مواد سے استفادہ کرنے کے لئے ریکارڈ کا دوبارہ جائزہ لیا۔ میں نے اپنی کتاب "گلگت کی روگ کہانی" اس ریکارڈ سے استفادہ

کے بعد مرتب کی۔ چونکہ میں نے 94-1993 اور 16-1915 کی بندوبستی نکس شجرے نقل کئے تھے۔ اس لئے میں نے یہاں کی نسلی تاریخ لکھنے کا عزم کیا۔

نسلی تاریخ نویسی کا کام کوئی آسان کام نہیں۔ جو اس خارزار میں قدم رکھے وہی جان سکتا ہے کہ یہ کام کتنا مغلق ہے۔ یوروپین مورخین نے اس حوالے سے جو لکھا وہ سطحی نوعیت کا ہے۔ ان کی معلومات کسی ٹھوس تحقیق کا نتیجہ نہیں۔ انہوں نے لوگوں کی "سنی سنی" کہانیوں کی بنیاد پر سفری بیان لکھے جن میں دیومالائی اثرات کی چھاپ تھی۔ بعض مورخین نے یہاں موجود دیومالائی فسانوں کا ذکر تمسخرانہ انداز میں تو کیا ہے لیکن اپنی طرف سے کوئی ٹھوس تحقیق بھی پیش نہیں کی۔

نسلی، مذہبی، معاشرتی، لسانی امور پر لکھنے والے یورپین میں جان بڈلف، فریڈرک ڈریو، ڈیورنیڈ، ڈاکٹر لٹز، کرنل شامبرگ، جٹ مار، فیرلے، جان ووڈ، کرنل لوری مر، آرل سٹائن، کننگھم، نائٹ، کروک، گرائرسن وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی کوششیں قابل لحاظ ہیں۔ تاہم ہمیں ان کی تحقیق سے یہاں کے بنیادی اور اہم عمرانی پوشیدہ گوشوں پر کوئی روشنی نہیں پڑتی مثلاً

1. پشاچہ کون تھے؟ پشاچہ اور داردی زبانیں آپس میں کیا رشتہ رکھتی تھیں؟
2. شین کو سکھین، یشکن کو یوچی قرار تو دیا گیا لیکن یوچی اور سکھین کے بارے میں کوئی ٹھوس بحث نہیں کی گئی۔ نتیجۃً موضوع ادھورا رہا۔
3. بلور دردستان، بروشال کی اصطلاحات کا ذکر کیا گیا لیکن یہ واضح نہیں کیا جاسکا کہ سیاسی اور لسانی اعتبار سے ان اصطلاحات کی کیا اہمیت تھی؟
4. اصلاً شین، یشکن کون لوگ تھے؟ ان کی حکمرانی کے کیا ادوار تھے؟ ان کی سیاسی وحدتوں اور حکمرانوں کے کیا نام تھے؟ ان حوالوں سے یورپین سکالرز کی تحریریں خاموش ہیں۔
5. کسی بھی یورپین مورخ نے تراخانی ادوار کے آغاز اور اختتام کے بارے میں کوئی مضبوط استدلال پیش نہیں کیا کہ اس میں سے کوئی نتیجہ نکل سکتا۔
6. بعض اقوام کے بارے میں قبیلوی اور نسلی تعصب کی بنا پر جو عیب چنیاں موجود تھیں۔ ان کی تہہ تک پہنچنے کے لئے راہیں تلاش نہیں کی گئیں۔
7. ان سکالرز کی کتابیں موازناتی تاریخ کے مقابلوں سے معرّا نظر آتی ہیں۔ اس وجہ سے مختلف تاریخی واقعات غلط ملط ہو کر رہے ہیں۔

8. کرمین اقوام کے بارے میں محض یک رخی اور یک طرفہ رائیں پیش کی گئیں۔ کسی مورخ نے ان کی اصل تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ انہیں محض کم ترین اقوام کی صف میں لا کھڑا کیا گیا اور بس۔

9. شمالی علاقہ جات میں اسلام کی اشاعت کے حوالے سے بہت سے پہلو تشنہ طلب رہے ہیں۔ کہ یہاں اسلام کب پھیلا؟ اسلام پھیلانے والے بزرگان کب اور کن ادوار میں یہاں آئے۔ ان کے مقبرے کہاں تھے؟ انہوں نے ابتداً کس اسلامی فقہ کی تبلیغ کی؟ ارد گرد علاقوں میں اسلام کی اشاعت کے مدارج کیا تھے؟ وغیرہ۔

10. شینا؟بروشسکی زبانوں کے آغاز اور ارتقائی مراحل کے بارے میں پُر مغز اور نتیجہ خیز مواد کی بڑی کمی پائی گئی۔

اس طرح یورپین سکالرز کی تحقیق کئی اعتبار سے تشنہ طلب تھی۔ میں نے ان تمام تشنہ کامیوں پر توجہ دی ہے اور قدیم تاریخ کو جدید علوم کی روشنی میں جانچتے ہوئے نتائج کو استنباط کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیز تمام نسلی، لسانی اور معاشرتی پہلوؤں پر سائنٹفک انداز میں غور کیا ہے۔ حقیقت اور مبالغہ، ممکن اور غیر ممکن الوقوع داستان طرازیوں کی تحقیق، استدلال، تجزیہ و تحلیل، چھان پھٹک کے سان سے گزار کر دیومالائی اثرات جھٹک دیئے گئے ہیں۔ علم تاریخ کا منشا مبالغہ آرائی، شاعرانہ تخیلات اور بے جا عقیدت مندی کو مسترد کرنا ہے۔ تاریخ کو انسانوں کی تاریخ بنانا ہے۔ نہ کہ جنات، جانوروں اور پرندوں کی۔ انسان انسان سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان عقل و نسطق کی وجہ سے دیگر جانوروں سے ممیز ہے۔ اگر یہ صفات جانوروں یعنی کوئے، مرغوں، کتوں وغیرہ میں منتقل ہو جائیں تو پھر انسان اشرف کیسے ہوا؟

ہماری تاریخ کے ماخذ بہت سی وجوہات کی بنا پر کم یاب رہے ہیں۔ اور جو ماخذ بھی دستیاب ہوئے یعنی چٹانی نقوش کتبے، لاٹھیں، بھوج پتر پر کندہ تحریریں تراخانی دور سے قدیم زمانے کی تعبیریں ہیں۔ ان میں بیشتر اب ضائع ہو چکی ہیں۔ جدید دور کی چند ہی نشانیوں میں نہر بالا و پائین، سردار کول، قلعہ گلگت شامل ہیں۔ تراخانی دور جواری پر ختم ہوا۔ اور اگرچہ یہ حکمرانی کا ایک لمبا دور تھا لیکن یہ دور آثار صنادید سے تہی دامان ہے۔ اس لئے جب اس دور کی کہانیاں جوڑی جانے لگیں تو قدیم داستانوں اور قصوں کا سہارا لیا گیا۔ ہمارے یہاں بہت قدیم زمانے سے کیسر داستان، داستانِ امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، حاتم طائی، الف لیلیٰ، رستم و سہراب، قصہ چہار درویش، گل بکاؤلی، اور جناب کے قصے عام تھے۔ چنانچہ ان

پُر نیچرل داستانوں کے اثرات ہماری تاریخ پر بھی پڑے۔ ہمارے تاریخی کردار اس پر نیچرل ماحول کی لپیٹ میں آئے۔ ہمارے کسی کردار کے سر پر سونے کے سینگ لگے۔ کسی کے پاؤں گدھے کے سم بنے۔ کوئی کردار پری زاد بنا۔ کوئی دیوا کو (جناتی مخلوق) کہلایا۔ کوے، مرغے، کتے وغیرہ انسانوں کی طرح بولنے لگے۔ فقیروں کے سیب کھانے سے بانجھ عورتیں بار وار ہوئیں۔ انسان فضاؤں میں اڑے۔ گور پھاچن (عنقا) یچولو، لیلی پتینئن، جیسی مخلوق سے ہماری یہ یوٹوپیا (Utopia) آباد ہوئی۔ دراصل مابعد الطبیعاتی باتیں اس وقت درمیان میں لائی جاتی ہیں۔ جب اصل تاریخ کے ڈانڈے کہیں ملتے نظر نہیں آتے۔ اس لئے گم شدہ ماخذوں کو جوڑنے کے لئے حضرت خضرؑ اور حضرت الیاسؑ یا جنات کی مدد حاصل کی جاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت اور جدید دور میں یہی تو فرق ہے۔ آج کا انٹرنٹ کا انسان لیلی پتینئن توجیہات کا مذاق اڑاتا ہے۔ اور یہی انسان کی اعلیٰ فراست، عقل شعور اور وجدان کی دلیل ہے کہ وہ اصل و نقل، ممکن اور غیر ممکن الوقوع، کھوٹے کھرے، حقیقت اور فسانہ میں تمیز کرتا ہے۔

میں نے یہ نسلی تاریخ کسی کو چھوٹا بڑا کرنے کے لئے نہیں لکھی۔ میں اللہ کے اس فرمان کا کہ "اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے" کا صدق دل سے قائل ہوں اور بس۔ نسلی طور پر جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور پھر اس ناتے برائیوں میں ملوث ہوتا ہے وہی بڑا ارزل ہے۔ لیکن جاروب کش جو اللہ کے احکام کی پابندی کرتا ہے۔ گناہ سے بچتا ہے اور نیکی کے کام کرتا ہے۔ وہی اللہ کا مقرب بندہ ہے۔ میرے نزدیک ارزل و افضل کا یہی تصور ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فضیلتیں شخصی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ایک خاندان میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ لہٰذا کسی انسان کی بڑائی یا بُرائی اس کی ذاتی فضیلت قرار پائیگی۔ اور نہ کہ پورے خاندان کی۔ اللہ کے نزدیک جزا اور سزا بھی شخصی ہوگا اور نہ کہ اجتماعی۔ اس لئے خاندان کی بڑائی چھوٹائی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میں نے اس کتاب میں جو کچھ پیش کیا ہے یہ کسی قومی، نسلی، مذہبی اور علاقائی برتری یا کمتری کے جذبے کے تحت نہیں کیا۔ مجھے تمام انسانوں سے محبت ہے۔ میں نے بعض بڑے ادیان کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن ان میں بھی کیڑے نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ ان ادیان سے وہ چیزیں تلاش کی ہیں جو دین اسلام سے لگا کھاتی ہیں۔

نسلی تحقیق کے اعتبار سے میری یہ کتاب نقشِ اوّل ہے۔ اس میں پہلی دفعہ نسلیات، عمرانیات، لسانیات وغیرہ سے متعلق امور پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہت

سے ابہام دور کیے گئے ہیں۔ اور ہر نسل کی ایک واضح صورت دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو اس کا حق بنتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی رُو رعایت یا طرفداری ملحوظِ خاطر نہیں رکھی گئی۔ میری تحقیق و تفتیش انصاف پر مبنی ہے۔ بہت سے فرسودہ، بے مغز، بے جان اور بے بنیاد نظریات جو قبیلوی اور نسلی عقیدتوں اور تعصّبات کا نتیجہ تھے۔ چھاج نکال کر مصفا کئے گئے ہیں۔ ہر قوم میں مدبروں، دانشوروں، منتظموں، خداپرستوں، انسان دوستوں کی کوئی کمی نہیں۔ ماحول اور وقت میسر ہو تو ہر قوم اچھے کارنامے سرانجام دے سکتی ہے۔ آریوں نے دراوڑوں کو راکش، بے دیوتا اور کیا نہیں کہا لیکن ان ہی کی تہذیب اور لسان پر اپنی عمارتیں تعمیر کیں۔ شمالی علاقہ جات میں دراوڑ اور پشاچہ اقوام کو ہم نے کمترین درجوں پر صف بند کیا۔ لیکن خود ان کی محنتوں کے اثمار سے استفادہ کیا۔ لہٰذا ہمارا نقطہ نظر تنگ نظری اور تعصّبات پر مبنی نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام ہمارا دین ہے۔ اس حوالے سے جو خدائی احکام موجود ہیں۔ ان کی تعمیل ہم پر لازم ہے۔

میری تحقیق و تحریک کے نتیجہ میں بعض اقوام کے بارے میں ریکارڈ آف رائٹس میں اصلاحات ہوئی ہیں۔ مجھے امید ہے اسی تحقیق کے نتیجہ میں بہت سی اور اقوام کے بارے میں نظریات بدل جائیں گے۔ اور تبدیلیاں آئیں گی۔ لوگ انسانیت کے ناتے تلاش کریں گے۔اور ایک دوسرے کے قریب آئیں گے۔

اس نسلی تاریخ کے لکھنے کے کام کو مہمیز کرانے میں جناب محمد الیاس مرزا ڈائریکٹر منگول ریسرچ اکادمی لاہور کی فکر اور کاوشیں میرے شامل حال رہی ہیں۔ میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔ میں عبدالواحد صاحب سابق جائنٹ سیکرٹری اور عبدالرزاق صاحب وکیل کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جنھوں نے اس تاریخی کام کو خاندانی حوالوں سے آگے بڑھانے پر صاد کیا۔ ان دونوں کا تعاون میرے شامل حال رہا۔ میں شیر محمد صاحب نمائندہ اے پی پی، بیورو چیف اخبار آج اور سابق چیف رپورٹر مسلم اخبار کا شکر گزار ہوں۔ کہ ان کی دیرینہ رفاقت میرے بڑے کام آئی۔ جمشید خان دُکھی میرے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ جنھوں نے دامے، درمے، قدمے، سخنے میری مدد کی۔ میں ٹھیکیدار شیر احمد، عزیزالرحمان، عبدالخالق تاج، میرباز خان، عبدالقیوم سابق چیئرمین، میر نواز ایڈووکیٹ، حاجی غلام قادر و محمد قادر، سلطان محمد، عابد حسن، محبوب علی، اشرف علی، حاجی صمد خان، غلام محمد، محمد یونس، اقبال رسول، شاہ دین وغیرہ سب کا ممنون ہوں کہ جنھوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ میں عبدالغنی مغل کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مکابرہ کے لئے اُن کی کوششیں

قابلِ قدر ہیں۔

میں اپنے بھائی اور دوست جناب مہر داد کا شکر گزار ہوں کہ جن کا تعاون اور خلوص ہر ایک کے کام آتا ہے۔ میں اپنے دوست رازول بھائی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کے مشوروں سے بہت استفادہ کیا۔

میں جناب غلام ربانی آگرو سابق ڈائریکٹر جنرل اکاومی ادبیات پاکستان اور جناب جی الانہ سابق وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کا ممنون احسان ہوں جنھوں نے بعض اہم امور میں میری رہنمائی کی۔

مجھے اپنے عزیز شاگرد شیر جہان میر کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ جن کے فکر انگیز علمی مباحث میرے کام آئے۔

مجھے اپنے پریوار پر فخر ہے کیونکہ میری فکر کو پروان چڑھانے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ ہم کسی سے بیر نہیں رکھتے۔

میرے مسلک میں نہیں بیر کسی سے رکھنا
میرے دشمن سے یہ تصدیق کرالی جائے

پاکستان سے محبت ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔ ہمیں ہر بُری بات بُری نظر آتی ہے۔

یہ عجب مرحلہ عمر ہے یارب کہ مجھے
ہر بُری بات بُری نظر آتی ہے

میں اور میری اولاد والد گرامی منشی محمد یوسف مرحوم، والدہ محترمہ مرحومہ کی دُعاؤں کے باعث آباد ہیں۔ مجھے اور میری اولاد کو ان کی پاکیزہ تربیت کاوافر حصہ ملا ہے۔

ادب ہی سے انسان، انسان ہے
نہ سیکھے ادب جو، حیوان ہے

میں اپنے والد گرامی کی ڈائری میں رقم کردہ دُعا پیش کرتا ہوں۔ ان کی اور والدہ ماجدہ کی ایسی ہی نیک تمناؤں میں ہم جی رہے ہیں۔

"Long live Usman Ali Khan and his children. May God give him wealth & health"

Muhammad Yousuf.

19-4-75

گلگت : 12 ستمبر 1999

عثمان علی

مقدمہ

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہر انسان فطری طور پر اپنے اسلاف کے متعلق جاننے کے لئے بہت متجسّس ثابت ہوا ہے۔ وہ اسلاف کے کارہائے نمایاں معلوم کر کے انہیں خود اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ذریعہ افتخار بنا لیتا ہے۔

یہ حقائق معلوم کرنے کا جذبہ غیر مہذب اقوام جو علم و فن سے محروم ہیں میں بھی صدیوں سے نمایاں طور پر موجود ہے۔ وہ اپنے اسلاف کی معلومات اور حقائق سینہ بہ سینہ محفوظ کئے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مہذب اور ترقی یافتہ اقوام اپنے اسلاف کے حقائق کو کتابی شکل میں محفوظ کر لیتے ہیں۔

موجودہ جدید دور میں تحریر و طباعت کے تمام ذرائع دستیاب ہونے کے باوجود اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ عوام الناس میں اپنے اسلام کے متعلق جاننے کا تجسّس تو برقرار ہے مگر ان کے پاس اسلاف کے تاریخی حقائق کتابی شکل میں موجود نہ ہونے کا انہیں شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے وہ سینہ بہ سینہ روایات پر انحصار کر کے فخر کر رہے ہیں۔ اس لئے ان کے پاس مستند تاریخی حقائق نہ ہونے کے باعث ان کا یہ افتخار مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

پاکستان کے شمالی علاقہ جات جو کوہ قراقرم میں واقع ہیں میں بھی صدیوں سے متعدد قبائل موجود ہیں۔ ان میں اکثر اپنے اسلاف کی تواریخ سینہ بہ سینہ تو کسی قدر جانتے ہیں۔ مگر اس کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ نہیں۔

جناب پروفیسر عثمان علی مغل نے شب و روز کی محنت اور عرق ریزی سے ان قبائل کے مدلل، مفصل اور مصدقہ اور عالمی شہرت یافتہ کتب کے حوالہ جات پر مشتمل تاریخی حقائق کو کتابی شکل میں یکجا کر کے شمالی علاقہ جات (قراقرم) کے قبائل کی تشنگی ختم کر دی ہے۔

جناب پروفیسر عثمان علی مغل کا یہ تحقیقاتی کام یقیناً ایک شاہکار علم تاریخ میں ایک

نئے باب کا اضافہ اور قراقرم کے قبائل کے لئے ورثہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جناب پروفیسر عثمان علی مغل سابق پرنسپل کالج آف ایجوکیشن گلگت ہیں۔ وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا شمالی علاقہ جات ہی نہیں بلکہ سارے پاکستان کے ادبی حلقوں میں بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے شمار ہوتا ہے۔ وہ ملک کے مایہ ناز ایک عظیم سپوت ہیں۔ ان پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ اُن کی خداداد خوبیوں، علمی، تعلیمی، ادبی خدمات کی بنا پر انہیں "سر سید گلگت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انکی ان ادبی خدمات کے صلہ میں متعدد ادبی تنظیموں نے انہیں کئی ایوارڈز اور اعزازات سے سرفراز کیا ہے۔ غیر ممالک میں بھی ان کی ان خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ جرمنی، برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا کے تحقیقی مراکز میں ان کی کتب جگہ پا رہی ہیں۔ ان کی کتاب "قراقرم کے قبائل" شہرت عام بقائے دوام کے دربار میں اونچے مقام پر فائز ہو گی۔ ان کی بے مثال اور نایاب کاوش سے نا صرف مذکورہ قبائل بلکہ مورخین، محققین اور اہل ذوق حضرات ضرور استفادہ کریں گے۔

محمد الیاس مرزا
ڈائریکٹر منگول ریسرچ
اکیڈمی لاہور۔

تمہید

میرے پیارے ابا جان 4۔ جون 1934 بروز پیر نو بجے شب گلگت میں پیدا ہوا۔ ابا جان کی پیدائش کی یہ ساعت بڑی مبارک تھی۔ آفتاب عالمتاب برج جوزا میں داخل ہو چکا تھا۔ آپ پر ایک بلند سیارہ عطارد جو دبیر فلک کے نام سے موسوم ہے۔ سایہ فگن تھا۔ یوں قلم اور کتاب آپ کے ہاتھ آئے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ کئی باتوں میں میں اپنے ابا جان سے مشابہ ہوں۔

میں بھی جوزاوی ہوں اور ابا جان بھی
میرا ستارہ بھی عطارد ہے اور ابا جان کا بھی
میرا خون کا گروپ بی پلس ہے اور ابا جان کا بھی
ہم قلم اور کتاب سے ایک سا محبت کرتے ہیں

ابا جان برج جوزا کی تمام خوبیوں سے متصف ہوئے۔ آپ دانشوری، شفقت و محبت، قوت تحریر و تقریر، تصنیف و تالیف، صلح جوئی، رحم و کرم، کچھ کچھ تنہا پسندی اور زیادہ لہو و لعب سے کترانے والے جیسے خصائص سے بہرہ ور ہوئے۔ میرے دادا جان منشی محمد یوسف اسلامی شعائر کے بڑے دلدادہ تھے۔ انہوں نے ابا جان کا نام عثمان علی رکھا۔ اس نام میں اسلام کی دو مقتدر ہستیوں کا حسن، حمیت، شرینی، لوچ، حیا اور دیگر کئی خوبیاں سمٹی ہوئی ہیں۔

ابا جان نے ابتدائی تعلیم گلگت میں ہی حاصل کی۔ اس کے بعد جب مختلف وجوہات کی بنا پر آپ تعلیم آگے جاری نہ رکھ سکے۔ تو آپ نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے اور سفر و حضر میں کتاب ساتھ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے آپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق بڑھتا گیا۔ 1962 میں ایف اے، 1964 میں بی اے، 1967 میں بی ایڈ اور 1971 میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ آپ شمالی علاقہ جات کے پہلے فرد ہیں جس نے بیچلر آف ایجوکیشن کے امتحان میں پشاور یونیورسٹی

سے گولڈ میڈل حاصل کیا ہے۔

26 جنوری 1960 میں ابا جان کی چھوٹی سی عمر میں خاندان میں شادی ہوئی۔ ابا جان کی خوش قسمتی سے ایک نیک سیرت، پرہیزگار، صوم و صلوۃ کی پابند شریکِ حیات ملیں۔ ابا جان کی کامیابیوں میں اُن کا بڑا ہاتھ ہے۔ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔ پھر بھی اگر ابا جان انہیں مار مار کر کچومر بھی نکالیں تو بھی وہ آنسو پونچھ کر ایسا ظاہر کرتیں کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔

نہیں عتاب زمانہ خطاب کے قابل
ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

میرے ابا جان 3 جون 1994 کو محکمہ تعلیم سے 39 سالوں کی سروس کے بعد کالج آف ایجوکیشن کے پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کی بے لوث، پاکیزہ، پر عزم خدمات سب کے سامنے تھیں۔

کالج آف ایجوکیشن میں آپ کے اعزاز میں ایک الوداعی تقریب منعقد ہوئی۔ یہ کئی اعتبار سے منفرد تقریب تھی۔ جس میں وطن کی کئی برگزیدہ ہستیاں شامل ہوئیں جنھوں نے برملا آپ کی علمی، پیشہ ورانہ، معاشرتی اور فرقہ ورانہ ہم آہنگی کے لئے خدمات کو سراہا۔ ان میں ہر فکر و نظر کے لوگ شامل تھے۔

میجر حسین شاہ، راجہ نثار ولی، سید فاضل شاہ، علامہ سلطان محمود، محمد اکرام خان، عبدالواحد سابق جائنٹ سیکرٹری، کریم خان، محمد امین ڈائریکٹر ایجوکیشن، میر فاضل شاہ، محمد افضل خان صدر امامیہ تنظیم، افتخار حسین، عبدالمجید، سید عباس علی، امان اللہ خان، بابر علی اور بہت سے لوگوں نے خطاب کیا۔ 7 جون 1994ء کو ایک ایسی تقریب پی ٹی سی، سی ٹی اور بی ایڈ کی طالبات نے منعقد کر کے آپ کی شاندار خدمات کا اعتراف کیا۔ میں عذرا بتول دختر سید فاضل شاہ کی تقریر سے کچھ اقتباس پیش کرتی ہوں۔ وہ کہتی ہیں عثمان علی کی ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ انہوں نے ایک طویل ملازمت کے دورانیہ میں تعلیم کے شعبہ میں ہر سطح پر اپنا لوہا منوایا۔

ایک معلم، ایک نگہبان، ایک ممتحن، ایک محقق، ایک ناظم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ شمالی علاقہ جات کے اوّلین گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ وہ پھر کہتی ہیں۔

"تعصبات اور فرقہ واریت کے شدید طوفان میں بھی انہوں نے نہ صرف اپنے دامن کو داغدار ہونے سے بچایا۔ بلکہ تنظیم اخوت اسلامی کے ذریعے گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھی محبت، اخوت اور اسلامی بھائی چارے کی شمع روشن کی۔ وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان، ایک محب وطن پاکستانی، ایک دردمند گلگتی، ایک عظیم قلمکار، ایک نقاد، اتحادِ اسلامی کے داعی اور سب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان ہیں۔"

وہ پھر اپنے مقالہ میں لکھتی ہیں۔ "عثمان علی صاحب اور میرے والد نہ صرف دوست ہیں بلکہ علم وادب اور اخوتِ اسلامی کی وجہ سے ہم خیال وہم رکاب بھی ہیں۔ ان کے والدین نے شاید ان کا نام بھی اس لئے عثمان علی رکھا ہو گا کہ وہ اپنے خاندان کے دونوں شاخوں ننھیال، دادھیال یعنی شیعہ اور سنی مین پُل کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے حضرت عثمانؓ ذوالنورین کا تاریخی کردار ادا کریں۔" وہ پھر لکھتی ہیں۔ "دختران گلگت پر آپ کے ان گنت احسانات ہیں جو ہماری آئندہ نسلیں بھی فراموش نہیں کرسکتی ہیں۔ کہ آج دختران گلگت جہالت اور ناخواندگی کے اندھیروں سے نکل کر علم کی روشنی پھیلانے کے لئے گھر گھر کا چراغ بنی ہوئی ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ یہاں کے سرسید ہیں تو کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔"

ابا جان کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ کوئی ان کے بارے میں لکھنے بیٹھ جائے تو قلم میں سیاہی ختم ہو جائے۔ ان کے بارے میں لکھنا اور ان کی تمام خوبیوں کا احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں ایک بیٹی کی حیثیت سے جو بھی لکھ رہی ہوں۔ وہ محض عقیدت نہیں بلکہ تمام سچ ہے۔ ابا جان کی یہ خوبی ہے کہ وہ دشمن کے لئے بھی بُرا نہیں سوچتے۔ معاف کرنا وہ بڑائی سمجھتے ہیں۔ اور وہ بڑے نرم دل کے مالک ہیں۔ ان کے سینے میں ایک دردمند اور انسانیت کا ہمدرد دل دھڑکتا ہے۔ وہ کائنات کی ہر چیز سے پیار کرتے ہیں۔ اور ہمیں بھی پیار کرنا سکھایا ہے۔ انہوں نے محنت کی روزی کمائی ہے۔ وہ کبھی مقروض نہیں رہے۔ آپ اتحاد بین المسلمین کے داعی رہے ہیں۔ آپ کبھی بھی لوکل، نان لوکل، شیعہ سنی، نسلی، علاقائی کسی بھی طرح سے تعصبات میں مبتلا نہیں ہوئے۔ آپ اپنی سادگی، پاکیزگی، بنی نوع انسان سے محبت اور اعلیٰ تدبر کی وجہ سے مشہور ہیں۔ آپ نے آج تک کوئی جانور ذبح نہیں کیا۔ اپنے گھر کے پالے جانوروں کو ذبح کرتے وقت آپ قریب نہیں رہتے ہیں۔ ابا جان امن پسند ہیں۔ اُن کی نظر میں سنی، شیعہ اور اسماعیلی کی اہمیت نہیں بلکہ ان کی نظر میں ایک اچھے مسلمان اور ایک اچھے انسان کی اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تنظیم اخوت اسلامی پھر پیس

فاؤنڈیشن کے اداروں کے توسط سے مذہبی تشدد کو ختم کرانے اور اتحاد بین المسلمین کے لئے مقدور بھر کوشش کیں۔ اس لئے شیعہ سنی اور اسماعیلی تمام حلقوں میں انہیں عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

آپ کم خور ہیں۔ بڑے پیالوں اور گلاسوں میں کوئی چیز بھر کر پینا پسند نہیں کرتے۔ آپ گوشت بھی کم کھاتے ہیں۔ چاول دو چار لقمے کھائیں گے۔ عموماً روٹی کھاتے ہیں۔ لیکن ان کے لئے پتلی روٹی تیار کی جاتی ہے۔ بچپن سے اب تک روزانہ سوتے وقت بادام ڈال کر دودھ پینے کے عادی ہیں۔ آپ کہیں بھی جائیں اس کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی نسوار کھانے والا اور سگریٹ پینے والا موجود نہیں۔ آپ صفائی کے بڑے دلدادہ ہیں۔ ہمارے گھر کا صحن اور تمام کونے کھدرے صاف شفاف نظر آئیں گے۔ کیونکہ ابا جان کو خود تنکے چننے کی عادت ہے۔ یوں ہم سب کو یہ عادت بھی لگی ہے۔ انہوں نے 1995 میں حج ادا کیا۔ آپ پانچ وقت کے نمازی ہیں۔

آپ آج تک کسی سیاسی پارٹی کے ممبر نہیں ہوئے۔ تاہم ذہنی طور پر آپ کا رجحان مسلم لیگ کی طرف ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ جماعت قائد اعظم کی ہے۔ جولائی 1998 میں آپ کو ضلعی بیت المال کمیٹی گلگت کا چیئرمین نامزد کیا گیا۔ اس تقرری کو تمام پارٹیوں اور تمام مذہبی گروپوں کی حمایت حاصل تھی۔ آپ کئی فلاحی، تعلیمی، اصلاحی اداروں کے فعال رکن ہیں۔

ابا جان کے بارے میں بہت سوں نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ سلمٰی اعوان۔ "میرا گلگت ہنزہ" میں لکھتی ہیں۔

"معصوم سا چہرہ" جس پر نکا ایک ایک نقش اس امر کی بہت حد تک نشاندہی کرتا ہے کہ صاحب املاک نرم رو اور نرم خو ہے" وہ پھر اردو ڈائجسٹ (اکتوبر 1988) میں لکھتی ہیں۔ "عثمان علی صاحب بڑے دھیمے کم گو، مخلص اور محترم شخصیت ہیں۔ اپنی میانہ روی اور اصول پسندی کی بنا پر صرف انتظامیہ ہی کیلئے نہیں بلکہ گلگت اور ملحقہ وادیوں کے سبھی فرقوں کے لئے قابلِ عزت ہیں۔"

ڈاکٹر انور سدید قومی ڈائجسٹ میں لکھتے ہیں۔ "عثمان علی صاحب کو احساس ہے کہ نئی نسل کے بچوں کو گلگت کے تاریک ماضی کا علم نہیں۔ وہ تاریخ کے نئے دھارے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جو خوشحالی اور ارتقا کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے گلگت کی

سابقہ تاریخ کے اوراق محفوظ کرنے کے لئے تحقیق کا بیڑا اٹھایا اور گلگت کے خوش نظر مناظر سے آنکھ اُٹھا کر ان ناسوروں کی نشاندہی کی جو ماضی میں اس خطے کو چاٹ رہے تھے۔ عثمان علی ایک درد مند دل رکھنے والے ادیب ہیں۔"

عبدالہادی احمد ہفت روزہ زندگی میں لکھتے ہیں۔ "عثمان علی ماہر تعلیم ہیں۔ تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ بہت سے دوسرے اہم لوگوں کیساتھ مل کر عوام میں مذہبی تشدد ختم کرنے کے لئے اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔"

جنرل طاہر علی قریشی فرماتے ہیں۔ "جو تحقیقی کام آپ نے کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ بڑی اہم بات یہ ہے کہ اس طرح آپ علاقے کی تاریخ، ثقافت اور روایات کو پائندہ بنا رہے ہیں۔ ہمیں آپ کی کوششوں پر فخر ہے۔ آپ نے یہ کتابیں لکھ کر بہت شاندار کام کیا ہے۔ آپ کی یہ کوشش موجودہ اور آنے والی نسلوں میں راست سوچ پیدا کرے گی۔

لباجان کی شخصیت ادبی، علمی، تعلیمی حوالوں سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ ایک مورخ، محقق اور تنقید نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ ایک نامور ادیب ہیں۔ آپ نے تعلیم، تاریخ، زبان اور ثقافت پر کوئی اٹھارہ کتابیں لکھی ہیں۔ چند مشہور کتابیں درج ذیل ہیں۔

1۔ گلگت کی روگ کہانی
2۔ شنالوجی
3۔ گلگت، نظریہ اور آزادی
4۔ اخوت اسلامی
5۔ خطۂ قراقرم زبانیں اور معاشرہ
6۔ بچوں کی نشوونما اور مشاورت
7۔ سکھانا سیکھیے
8۔ شہوار اردو گرائمر وانشاء
9۔ جغرافیہ گلگت ایجنسی
10۔ جغرافیہ اضلاع گلگت و دیامر
11۔ معاشرتی علوم اضلاع گلگت، غذر دو یامر

آپ ہی کی نگرانی و ادارت میں محکمہ تعلیم شمالی علاقہ جات نے بچوں اور اساتذہ کے

لئے اردو قائدہ، اردو کی پہلی کتاب، اردو کی دوسری کتاب ورہنمائے اساتذہ اردو تدریس جیسی کتابیں مرتب کی ہیں۔ آپ ہی کی ادارت میں کئی تعلیمی رسائل، شہوار، پیام معلم قائد، صدف اور لچھار منظر عام پر آئے۔ لچھار شینا میں صبح کے تارا کو کہتے ہیں۔ یہ سب رسائل لچھار کی مانند تھے۔ ان کے ذریعہ پاکیزہ علم وادب کو فروغ دیا گیا۔

لبا جان نے مقامی، قومی اور ملکی کئی سیمیناروں میں حصہ لیا۔ آپ نے سینکڑوں مقالے لکھے اور پڑھے۔ آپ کے مقالے جاندار، پراز تحقیق، پرمغز، فاضلانہ انداز کے ہوتے ہیں۔ وہ متعلقہ موضوع پر ایسے ایسے نکات تلاش کرتے ہیں کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ گلگت کی روگ کہانی میں ایف سی آر کے بارے لکھتے ہیں۔ "ایف سی آر قانون کی بدترین صورت تھی، اسے کالا قانون یا اندھا قانون کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ قانون ناخواندوں کا ڈانڈا، جاگیرداروں اور فیوڈل لاڈز کا اڑواڑ تھا۔ اسے دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے تنازعات کے فیصل کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔" گلگت، نظریہ اور آزادی میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "گلگت، نظریہ پاکستان کا حواری ہے۔ یہاں قومی تشخص کے حوالے سے دیکھا جائے تو دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب، رسوم ورواج، آداب واقدار کے لحاظ سے یہ علاقہ توانا ہے۔ سب سے نمایاں خوبی ہمارے لوگوں کی اُردو سے محبت ہے۔ اُردو ہمارے لئے لنگوافرینکا ہے۔ گلگت میں اردو کا راج ہے۔ اسے یہاں وہ منفرد مقام حاصل ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہماری مقامی زبانیں بھی اردو کی وجہ سے امیر و کبیر بنتی جارہی ہیں۔ آپ کی تحریر سادہ ہوتی ہے۔ تاہم آپ خوبصورت محاورات، استعارات کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ کہیں کہیں غیر مانوس ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ لیکن جملوں میں اس طرح پروے ہوئے نظر آتے ہیں کہ معنی اخذ کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی۔

لبا جان کا زندہ جاوید کارنامہ "قراقرم کے قبائل" کتاب کی تصنیف ہے۔ یہ ایک لاجواب نسلی تحقیقی تاریخ ہے۔ لبا جان نے اس کتاب کی تیاری میں کئی سال لگائے۔ اس موضوع پر نہ پہلے اس طرح کا کام ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ مقابرہ مغل ویلفیئر ایسوسی ایشن بنانے اور مقابرہ کے مختلف خاندانوں کو یکجا کرنے، انہیں نشان منزل دِکھا کر ان کی جو تنظیم کی ہے۔ وہ آپ کا ایک منفرد کارنامہ ہے۔ آپ اس کام کے "Pioneer" ہیں۔ مستقبل کی مقابرہ نسلیں آپ کی ان خدمات کو یاد کریں گی۔

آپ تنہا ہی چلے تھے جانب منزل مگر
راہ رو ملتے رہے اور کارواں بنتا گیا

ہمارے گھر میں مقابرہ کی مجلسیں 1987 سے ہوتی رہی ہیں۔ 12-12-97 کی مجلس بڑی فیصلہ کن تھی۔ اس میں درج ذیل اہم فیصلے ہوئے۔

(1) مقابرہ محفل ویلفیئر ایسوسی ایشن کا قیام۔

(2) لاجان کی نسلی تحقیق کے مطابق ضروری اقدامات اس اہم اجلاس میں درج ذیل شخصیتیں شامل ہوئیں۔

عبدالرزاق صاحب وکیل، حاجی صمد خان صاحب، غلام محمد صاحب، شیر محمد صاحب بیورو، چیف آج، جمشید خان دُکھی صاحب جنرل سیکرٹری حلقہ ارباب ذوق، محبوب علی انجینئر، خالق تاج، شیر دل خان صاحب، شیر افضل صاحب، ظفر وقار تاج صاحب، عابد حسین صاحب اور شاہ دین صاحب۔ اس اجلاس کے فیصلوں کے مطابق 12-1-98 کو نسلی تحقیق اپنے منطقی نتیجہ تک پہنچی اور اقوام ترخان مغل نے یکجا ہونے، اپنی شناخت قائم رکھنے، مقامی، قومی اور ملکی حوالوں سے فلاحی اور معاشرتی بہبود کے کاموں میں حصہ لینے کا عزم کیا۔ اس قوم کے لوگ مقامی امن عامہ کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ ان میں قلمکار، شاعر، صحافی، دانشور، صلح جو اور صلاح کاروں کی کوئی کمی نہیں۔ اس قبیلے کے شاعروں کے سر خیل جمشید خان دُکھی ہیں۔ جو شینا اور اُردو دونوں میں شاعری کرتے ہیں۔ اور خوب کرتے ہیں۔

آمدبر سر مطلب لاجان کی یہ تحقیقی نسلی تاریخ دُوررس اثرات کی حامل ہوگی۔ یہ نسلی تاریخ ملک اور بیرون ملک محققین کے لئے ایک مستند حوالہ ثابت ہوگی۔ لاجان کا مطمع نظر یہی ہے کہ انسان سب برابر ہیں۔ ہاں بڑائی محض اسے حاصل ہے جو متقی ہے، خداشناس اور دردشناس ہے۔

خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر

لاجان کو کئی ایوارڈز، ٹرافیاں، شیلڈز ملی ہیں۔ اور وہ ان اعلیٰ اعزازات کے مستحق

بھی ہیں۔ کیونکہ ان کی کوششیں علم کے فروغ کے لئے ہیں۔ آپ ایک اچھے [illegible] کے ساتھ ایک اچھے باپ، ایک اچھے شوہر، ایک اچھے بھائی، ایک اچھے دادا، ایک اچھے [illegible] ہیں۔ وہ ایک اچھے دوست بھی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ اُن کی کتاب "قراقرم کے قبائل" فن تاریخ نویسی میں بقائے دوام کے دربار میں بلند درجے پر فائز ہو گی۔ اس کے پڑھنے کے بعد عمومی طور پر انسان پرور جذبات جنم لیں گے۔ انسان کو انسان سے ہمدردی ہو گی۔ اور ہر ایک کو یہ کہنا پڑیگا کہ صرف اللہ کی ذات بڑی ہے۔ اور کوئی ذات بڑی نہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

گلگت : 28اپریل1999ء۔

عظمت جہاں

بی۔اے، پی ٹی سی

تقریظ

پروفیسر عثمان علی شمالی علاقہ جات، آزاد کشمیر کے ساتھ ساتھ اندرون وبیرون پاکستان اپنی تعلیمی، علمی، ادبی اور سماجی خدمات کی بدولت ہر دل عزیز شخصیت کے حامل ہیں۔ نامور محقق کے تعارف میں اہل علم ودانش وفکر جس انداز میں رطب اللسان ہیں، مجھ جیسا کم مایہ ونو آموز ریسرچر کو آپ کی ہمہ جہت شخصیت پر کچھ لکھنا سورج کو چراغ دِکھانے کے مترادف ہے۔

علم وادب، تاریخ وثقافت، عمرانیات ولسانیات پر تحقیق وتفتیش کوئی آسان مرحلہ نہیں۔ تحقیق وتفتیش کے مراحل یقیناً خارزار راہوں سے گزرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے اپنی گراں قدر تخلیقات کے ذریعے اس میدان میں بڑا نام کمایا ہے۔ اُن کی تخلیقات کو دیکھ کر کوئی بھی ریسرچر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میرے محترم بھائی کی حالیہ کتاب "قراقرم کے قبائل" بلاشبہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ جس میں پہلی بار شمالی علاقہ جات کے مختلف قبائل پر تحقیقانہ انداز میں بھرپور بحث کی گئی ہے۔ آپ نے ان قبائل سے متعلق بہت سے ابہام اور دیومالائی داستان طرازیوں کو دور کر کے تاریخ کو حقیقت کا روپ دیا ہے۔ بے جا عقیدت مندی، جاہلانہ روایات پسندی اور مافوق الفطرت عناصر سے تاریخ طلسم ہوش رُبا تو بن سکتی ہے۔ لیکن حقیقت شناس نہیں۔ میرے خیال میں یہ کتاب محققین، ماہرین تعلیم وعمرانیات کے لئے نشانِ منزل کا کام دے گی۔ آپ کی تحقیق جامع ہونے کے ساتھ ساتھ جاندار اور سائنٹفک بھی ہے۔ مغولی اصطلاحات کے حوالوں سے ترکھان، ترخان، لوہار، لہ آر، ہندی، سنسکرت لہجوں اور مخارج کی

بحث بڑی وزنی ہے۔ مجھے امید ہے یہ کتاب تاریخ و تمدن اور عمرانیات کے ملکی و غیر ملکی اساتذہ، محققین اور دانشوران کے لئے ایک بحرِ بیکراں ثابت ہو گی۔

میں پروفیسر صاحب کو اُن کی نایاب، نادر اور نولکھا تخلیق پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ میں امید کرتا ہوں اس تحقیق کی ہر سطح پر ستائش کی جائے گی۔ اور مصنف کو مناسب اعزازات سے نوازا جائے گا۔

تحریر: 4۔ جون 1999ء

پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد ساجد
آزاد جموں اینڈ کشمیر یونیورسٹی
کیمپس، مظفر آباد۔

میری بات

عصرِ حاضر کی روزافزوں ایجادات و اختراعات، سمندروں، پہاڑوں، اور صحراؤں کی رکاوٹوں کو دور کر کے اقوامِ عالم کو متحد کر رہی ہیں۔ انسان کے اتحاد کی آرزو نے پہلے ہی مختلف ملکوں اور براعظموں کو "قریۂ عالمی" بنادیا ہے۔ اور ایک بالکل نئے عالم گیر معاشرے کی داغ بیل ڈالی جاچکی ہے۔

نئے حالات وضروریات میں یہ ناگزیر سمجھا جانے لگا ہے کہ جس طرح سائنس نے ہمارے مادی فاصلے کم کردیئے ہیں اس طرح وہ مسافتیں بھی مٹادی جائیں جو شعوب وقبائل کے دلوں اور ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ ہمارا عہد عرفانِ بشر کا عہد ہے۔ اس عرفان کے بغیر ہم نہ اتحاد پیدا کرسکتے ہیں اور نہ ہی ترقی کی راہ میں قدم رکھ سکتے ہیں۔

آنے والی تاریخ اُس آدمی کو خراجِ عقیدت پیش کریگی جو اتحادِ بشر کے اس ابتدائی مرحلہ میں قوموں کے نزدیک سے نزدیک تر لانے کی سعی کریگا۔ اور پروفیسر عثمان علی کا شمار ایسے ہی بیدار مغز اور ذمہ دار اہل قلم میں ہوگا۔ شہرہ آفاق شاہراہ ریشم میں واقع گلگت کی وادیوں اور دروں میں بسنے والے قبیلوں کو متعارف کروانے کی غرض سے پروفیسر عثمان علی کی پُر محنت کاوش اور اعلیٰ بصیرت کی حامل تحقیق لائقِ تحسین ہے۔ سرزمین گلگت کے مشاہیر کی تاریخ جہاں خود ان کے اندر ہم آہنگی و تفہیم کی تحریک پیدا کریگی۔ وہاں اس گزرگاہِ تمدن کو سہل العبود اور پُر امن بھی بنادیگی۔ پروفیسر عثمان علی نے مستقبل کے تابناک تمدن اور رفاہی معاشرے کے قیام کو ممکن بنادیا ہے۔ اور ہماری سوچ کو ایک مثبت جہت دے دی ہے۔ فکری تاریخ کا دھارا موڑ دینا بہت بڑی کامیابی ہے۔

گلگت : 16۔ جون1999ء

ڈاکٹر پروفیسر صابر آفاقی

مظفر آبادی آزاد کشمیر۔

صحیفہ "قراقرم کے قبائل" شمالی علاقہ جات کی نسلی تاریخ نویسی میں نقش اول ہے۔ نسلی تاریخ کو تحقیقی، تجزیاتی اور سائنٹفک انداز میں ادبی چٹخارے کے ساتھ لکھا جاتا ایک لاجواب کارنامہ ہے۔ اس نسلی تاریخ میں کئی نئی جہتیں سامنے آئی ہیں۔ اور بہت سے فرسودہ نظریات کا قلع قمع ہوا۔ پروفیسر صاحب نے مقابرہ فعل ویلفیئر ایسوسی ایشن بنانے اور مقابرہ کے خاندانوں کو منزل شناس کرنے کے لئے جو فکر دی اور کاوشیں کیں وہ یگانہ و یکتا ہیں۔

یکم ستمبر 1999ء

عزیز الرحمان

نائب مہتمم بندوبست گلگت

گفتنی

1880ء کے زمانے میں ایک برطانوی مصنف John Biddulph نے ہندوکش کے قبائل کے عنوان سے ایک اہم کتاب لکھی تھی۔ جس میں مختلف حوالوں سے نہ صرف ہندوکش بلکہ قراقرم کی اقوام کے متعلق بھی انہوں نے لکھا تھا۔ لیکن اس کتاب میں اور اُن کے بعد لکھی جانے والی بیشتر کتابوں مین قراقرم کی اقوام کے متعلق زیادہ جامع اور ٹھوس معلومات دستیاب نہیں تھیں۔ اور اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ کوئی مقامی محقق اپنی عمیق تحقیق، مشاہدہ، شواہد اور جامع نتائج کی بنیاد پر ان اقوام کے متعلق آج کے پڑھنے والوں کو تسلی بخش معلومات فراہم کرے۔ تاکہ وہ ان علاقوں میں آباد پس ماندہ اور ہر دور میں ہر سطح پر نظر انداز کیے گئے ان لوگوں کے متعلق بہتر جان سکیں۔ عثمان علی صاحب یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اُردو قارئین کی اس اہم ضرورت کو اپنے علمی اور تحقیقی کام سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں کامیاب رہے ہیں۔

عثمان علی صاحب شمالی پاکستان کے ان محب وطن دانشوروں سے تعلق رکھتے ہیں جو دُکھ سکھ میں اپنے قلم کی حرمت اور اپنے ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت اپنا اوّلین فرض سمجھتے ہیں، جو اپنی مٹی سے وفاداری کا دم بھرتے ہیں، جو اپنی قوم کو فرقہ واریت کے زہر سے بچانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کا ایک حصہ تدریس میں صرف کیا۔ اور سینکڑوں افراد کو علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ انہوں نے تدریس کے ساتھ ساتھ ایک غیر جانبدار محقق کی حیثیت سے اپنی شناخت کرائی اور اپنا مقام پیدا کیا۔ شمالی پاکستان کے محققین اور لکھاریوں میں وہ اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہیں شمالی پاکستان سے باہر چاروں صوبوں کے علمی حلقوں میں اچھے مقام اور نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اب تک ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ تحقیقی کام میں مقامی شناخت کو قومی حوالوں اور دھاروں میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے پڑھنے والوں کو بہت سے نئے پہلوؤں سے ان علاقوں کی سماجی اور ثقافتی تاریخ سمجھنے میں راہنمائی فراہم ہوتی ہے۔ انہوں نے گزشتہ اور موجودہ کتاب میں بعض ایسے اہم اور

باریک پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ جنہیں عام لکھنے والا نظر انداز کر جاتا ہے۔ لیکن جو ماضی کے تانے بانے سمجھنے کے لئے انتہائی اہم ہوتے ہیں۔ موجودہ کتاب کے 14 ابواب اپنے موضوع اور تحقیقی مواد کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔

شمالی پاکستان میں بے شمار نسلیاتی گروہ و آباد ہیں۔ ان کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جاتی رہیں ہیں۔ یقیناً عثمان علی صاحب نے اس پہلو پر زیادہ سوچا ہوگا۔ اور اپنے پڑھنے والوں کو مستند حوالوں، اپنے مشاہدات و تحقیق اور اس سے اخذ کردہ نتائج کی بنیاد پر قابلِ قبول رائے تک پہنچنے میں مدد فراہم کریں گے۔

مجھے امید ہے کہ پڑھنے والے اس کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے۔ اور دُعاگو ہوں کہ خدا مصنف کو ہمت، حوصلہ اور وسائل عطا فرمائے تاکہ وہ آئندہ بھی اپنی تحقیقات سے استفادہ کا موقع دیتے رہیں۔ آمین۔

27 اپریل 1999ء

رازول کوہستانی

شینا ریسرچ فورم قراقرم

قومیت

قریشی ہو کہ کوئی ہاشمی ہو
کوئی رضوی ہو کوئی کاظمی ہو
تعارف کے لیے قومیں بنی ہیں
برابر ہیں سبھی جو کوئی بھی ہو
یہی معیار حق ٹھہرا ہے لوگو !
کسی بھی قوم کا ہو متقی ہو
لکھا پہچان کی خاطر یہ نسخہ
جوانوں کو ہمارے آگہی ہو
جہاں عثمان کا زور قلم ہے
وہاں جمشید کی کیا شاعری ہو
منور ہو یہ دل ایماں سے یا رب
گناہوں سے مرا دامن تہی ہو
یہی ہے التجا میری خدا سے
کہ لمبی زندگی عثمان کی ہو

باب۔ 1

یہ تاریخ

تاریخ نویسی ایک مشکل فن ہے۔ اس کا موضوع انسان ہے۔ انسانی کردار کے حوالوں سے واقعات و حالات کی تعبیر و تشریح معروضی انداز میں کرنا آسان نہیں۔ کہتے ہیں مورخین عموماً مذہبی، سیاسی، معاشرتی یا نسلی عقیدتوں کے زیر اثر تاریخیں لکھتے ہیں۔ اور ان کے ذریعے ایسا تاریخی مواد تیار کرتے ہیں جسکا مقصد شہرت اور عظمت کے قصوں کو عام کرنا اور عوام الناس میں پھیلانا ہوتا ہے۔ تاکہ شخصیتیں اور خاندان بزرگ اور معزز تر دِکھائے جائیں۔

ہم جب قدیم تاریخی ماخذوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان حوالوں سے پیچیدگیوں اور ابہام کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ ہماری پرانی تاریخیں، لوک گیت، گیتے، مخطوطات، لوگ کہانیاں، وغیرہ صاحب اقتدار و اختیار افراد کی رام لیلائیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ تمام ماخذوں پر ان افراد کو تصرف حاصل ہوتا تھا۔ جیسے چاہا ویسے افسانے ترشوائے اور واقعات تخلیق کیے۔ پہلے وقتوں میں راجے مہاراجے، امراء، روساء، جاگیرداروں اور نوابوں کو اپنے مقتدر دور کے واقعات لکھوانے کا شوق ہوتا۔ وہ چاہتے تھے کہ اُن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جائیں۔ اُن کو اُن کے خاندان کے افراد حتیٰ کہ اُن کے پالتو جانوروں تک کو تمام انسانوں کے مقابلے میں بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ تاکہ عام لوگ بہ اثر افراد کی صفات اور خصوصیات سے مرعوب ہو کر مطیع، فرمابردار رہیں۔ اور اُن کے خاندان کی بڑائی کی یادیں رہتی دنیا تک باقی رہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی تاریخ اور روایات کے عنوان سے لکھتے ہیں "یہاں نسلی و خاندانی بنیادوں پر منصب و عہدے، جاگیریں اور مراعات تقسیم کی گئیں جس کے نتیجے میں چند خاندان سیاست و اقتدار پر قابض ہوئے اور انہوں نے اپنے اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کے لئے نسل، خاندان اور ذات پات کے نظریات کو فروغ دیا تاکہ معاشرت کی اکثریت کو ذہنی طور پر

متاثر کر کے انہیں نچلے وکمتر درجہ پر مطمئن رکھا جا سکے۔"

ابن خلدون تاریخ میں کذب و غلطی کے در آمد ہونے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ "اکثر لوگ صاحب جاہ و مرتبہ حضرات کی ثناء خوانی ومدح سرائی کر کے ان کی ہر بات کو اچھے پیرایہ و رنگ میں اشاعت دیکر ان کے تقرب کے خواہاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ خبریں اسی طرح مخلوق میں پھیل پڑتی ہیں۔ کیونکہ انسان طبعاً خوشامد و تعریف کا دلدادہ ہے۔ اور خوگر۔ ادھر لوگ بھی دنیوی جاہ و ثروت کے بھوکے ہیں۔ حقیقی فضل و کمال کے متلاشی نہیں" اس سلسلے میں واقعات اور حالات کے جانچ پرکھ کے لئے کسوٹی منتخب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اکثر و بیشتر مورخین، مفسرین اور ناقلین نقل حکایات و وقائع میں غلطیوں کے شکار ہو گئے ہیں۔ محض اس لئے کہ انہوں نے صرف نقل پر بھروسہ کیا۔ خواہ وہ قابلِ رد ہو یا قابلِ قبول۔ اور ان کو نہ اصول پر کسا۔ نہ اُن کے مشابہات پر قیاس کیا۔ نہ معیار حکمت اور طبائع کائنات کی واقفیت پر ان کو پرکھا اور جانچا۔"

طبائع کائنات کوئی دقیق مسئلہ نہیں کہ سمجھ میں نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات تخلیق کی تو اس کے اندر موجود ہر شے اور خاصیت بھی متعین کی۔ پانی کی یہ خاصیت ہے کہ یہ نشیب میں بہتا ہے۔ یہ آگ بجھا دیتا ہے۔ یہ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔ عام حالات میں انسان پانی کے اندر سانس لے کر جی نہیں سکتا۔ آگ جلانے کی خاصیت رکھتی ہے۔ عورت مرد کے بغیر پیدائش کا کارنامہ سر انجام نہیں دے سکتی۔ سوائے اُن مستثنیات کے جن کو رب دو جہاں نے اپنے برگزیدہ بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے مخصوص اور قبول کیا۔ ابن خلدون مسعودی کے حوالے سے ایک تاریخی واقعہ رقم کرتے ہیں۔ "جب سکندر کو سمندری جانوروں نے اسکندریہ بنانے سے روکا تو اُس نے شیشہ کا ایک صندوق بنوایا۔ اور اس میں بیٹھ کر سمندر کی تہہ میں اتر گیا۔ وہاں اُس نے ان شیطانی جانوروں کی تصویریں کھنچیں جن کو اُس نے دیکھا اور پھر اُن ہی کے مجسمے کسی دھات سے بنوا کر شہر کی بنیاد کے بالمقابل نصب کرا دیئے۔ یہ جانور جب سمندر سے نکلے اور انہوں نے ان مجسموں کو دیکھا تو بھاگ گئے۔ اور اس کے بعد سکندر نے شہر کی تعمیر مکمل کی۔"

ابن خلدون اس واقعہ کا تجزیہ یوں پیش کرتے ہیں۔ "غرض اس کی بیان کردہ واہی تباہی حکایات میں سے یہ حکایت و قصہ بہت طویل ہے اور کئی لحاظ سے بعید از وقوع ہے۔ اوّل یہ کہ صندوق شیشہ کا ہو اور وہ موجوں کے تھپیڑوں سے چکنا چور نہ ہو۔ دوسرے بادشاہ خود کو

ایسے خطرات میں نہیں ڈالتے۔ تیسرے جنوں کی کوئی خاص شکل وصورت نہیں۔ وہ تو جس رنگ روپ میں چاہیں نمودار ہوں۔ اور یہ کہ اُن کے بہت سے سر ہوتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہے کہ اُن کی شکل بھیانک اور ہیبت ناک ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ ان کے واقعی کئی سر ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ سب واقعات امور واقعیہ اس حکایت کو محال، لچر اور دور از وقوع ثابت کرتے ہیں۔ اور سب سے زائد عقل میں نہ آنے والی بات اس قصہ میں یہ ہے کہ جب ایک شخص صندوق میں بند ہو کر پانی میں ڈوبے گا تو سانس لینا اس کے لئے دوبھر ہو جائے گا۔ اور جلد ہی اس کی روح حیوانی ناقابلِ برداشت حرارت محسوس کرے گی۔ کیونکہ پھیپھڑے کا مزاج اور روح قلبی معتدل ٹھنڈی ہوا کے سخت محتاج ہیں۔ تو بدین صورت اس کو نہیں مل سکتی تو نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ وہیں ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

ہماری تاریخ جاہ طلب، خوشامد پسند، تنگ نظر اور حریص مورخین سے بھری پڑی ہے۔ لہٰذا ان مورخین نے حق نمک ادا کرتے ہوئے معقول غیر معقول، ممکن نا ممکن، قابل وقوع نا قابل وقوع، سچے اور جھوٹے واقعات وحالات قلمبند کر کے اپنی نااہلی کا ثبوت دیا ہے۔ نیز یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اُن کے ممدحین بڑے احمق تھے کیونکہ نا معقول، نا قابل وقوع اور نا ممکن واقعات سُن کر چپ ہو رہے۔ اور یہ نہ سوچا کہ قلعی کھل بھی سکتی ہے۔ ہمارے ان مورخین نے کیا کیا گُل نہ کھلائے۔ سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے وہ سب کچھ کیا گیا جس میں سچ کا شائبہ تک نہ تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں۔ "برطانوی مورخین نے ہندوستان کی مختلف اقوام کے بارے میں جو رائیں دی ہیں۔ اس کے پس منظر میں ان کے استعمارانہ نظریات تھے۔ مثلاً بنگالیوں کو تخریب پسند، شورش پسند اور باغی کہا گیا۔ کیونکہ انہوں نے ہمیشہ قائم شدہ حکومتوں کے خلاف بغاوتیں کیں۔ اس لئے یہ ثابت کیا گیا کہ بنگالی کبھی کسی حکومت سے وفادار نہیں رہے۔ بنگالیوں کے بارے میں ہمیں یہ تاریخی تاثر ورثہ میں ملا ہے۔ اور ہمارے ہاں یہ نظریہ بڑا مقبول رہا ہے۔ خصوصیت سے بنگلہ دیش کی تحریک نے اس نظریہ کو مزید تقویت دی جبکہ اس بات کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بنگالیوں کی شورشیں اور بغاوتیں ان کے سیاسی شعور کا نتیجہ تھیں کہ جنہوں نے ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی اور خاموشی سے وفاداری کے بجائے اپنے حقوق کی جنگ کی۔ جو اُن کی کمتری کی نہیں بلکہ عظمت کی نشانی ہے۔ ان کی تمام بغاوتیں، ان کی بیداری، آزادی اور حریت کی علامتیں ہیں۔ جو انہیں دنیا کی باشعور قوموں میں اور اونچا مقام دیتی ہے۔ اس طرح جنگ جُو اور غیر

جنگ جُو قوم و نسل کا تصور بھی برطانوی استعمار کی پیدا کی ہوئی چیز ہے۔ جن اقوام نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اور ان کے اقتدار کو قائم کرنے میں مدد کی وہ جنگ جو کہلائیں اور جنھوں نے ان کی مزاحمت کی وہ باغی و تخریب کار۔"

شمالی علاقہ جات کی تاریخی روایات و نظریات کی تعمیر میں ہمارے مقامی، ڈوگری اور برطانوی حکمرانوں کے پروردہ تنخواہ دار مورخین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور یہاں بھی غلط نظریات کو جگہ دی۔ مارشل اور غیر مارشل اقوام کے نظریات پیش کر کے اپنے استعمارانہ مفادات کو تحفظ دیا۔ دیامیری کتنے جنگجو اور دلیر ہیں۔ انگریز انہیں جنگجو نہیں سمجھتے تھے۔ وہ کشمیری اقوام کو بھی جنگ جو اور مارشل اقوام کے زمرے میں شامل نہیں کرتے تھے۔ محض اس لئے کہ یہ اقوام باشعور، غیرت مند اور حریت پسند تھے۔ آج ہندو سامراج کے خلاف کشمیر کی جہد وجہد اور پیکار خود اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کہ غیرت مندی، حریت پسندی، عزم و استقلال پسندی میں دنیا کی کسی قوم سے یہ قوم پیچھے نہیں۔ کشمیریوں کی قربانیاں لازوال عظمتوں کی نشانیاں ہیں جو رہتی دنیا تک قائم رہیں گی۔

"کشمیر بہادروں اور مجاہدوں کی سرزمیں" کے عنوان سے محمد اسد اللہ قریشی لکھتے ہیں۔ "ماضی میں آزادی کے دشمنوں اور سامراجی طاقتوں کے پروپیگنڈوں کی وجہ سے یہ غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں کہ کشمیر کے لوگ بہادر نہیں ہیں۔ ہر سامراجی اور استبدادی طاقت محکوم قوموں کے بارے میں ایسے ذلیل پروپیگنڈے کرتی رہتی ہے۔ خود پنجاب میں سکھوں اور انگریزوں کی حکومت رہی ہے۔ جو اپنے آپ کو بہادر کہلواتے اور لکھواتے رہے ہیں۔ ظالم سکھوں کو شیر پنجاب کے خطابات دیئے جاتے رہے ہیں۔ اور انگریزوں کے لئے تو "صاحب بہادر" اب تک زبانوں پر ہے۔ اور متحدہ ہندوستان کی مختلف قوموں اور مختلف صوبوں میں انہوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" اور قبائلی اور صوبائی وطنی اور قومی منافرت اور تعصّبات پھیلاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متحدہ ہندوستان کی عام مجلسوں میں پٹھانوں کے خلاف لطیفے سنائے جاتے۔ پٹھانوں کی مجلسوں میں پنجابیوں کے خلاف اور پنجابیوں کی مجالس میں بنگالیوں کے خلاف کہانیاں اور حقارت آمیز لطیفے سنائے جاتے۔ اسی طرح ڈوگرہ اور انگریزی عہد میں محکوم اور مظلوم کشمیریوں کے متعلق دشمنوں کے پروپیگنڈہ کے نتیجہ میں ایسے لطیفے گھڑے اور سنائے جاتے رہے تاکہ اس بہادر قوم میں احساسِ کمتری، بزدلی اور مسلمانوں میں باہمی نفرت ہو۔"

انگریز لکھاریوں نے گلگتیوں کو ڈھول ڈھمکے کا رسیا قرار دیکر کمتر درجہ پر رکھنے کی منظم کوشش کی اور خود ایسے حالات پیدا کیے کہ یہ لوگ کھیل تماشوں میں ہمہ وقت مگن رہیں۔ اور حکمرانوں کے لئے مشکلات پیدا نہ کریں۔ یہی انگریز لکھاری یہاں کے لوگوں کے متعلق متضاد رائیں پیش کرتے ہیں۔ کہیں اپنے مفاد کی خاطر نسلی برتری کی باتیں بھی کیں اور کہیں یہ بھی کہا۔ "درووں کے متعلق یہ کہنے میں کوئی ہرج دِکھائی نہیں دیتا کہ یہ ایک مٹتی ہوئی نسل ہیں۔ جنوب اور مغرب سے پٹھان، مشرق سے تاتار اور کسی حد تک کشمیری اور شمال سے تاجک انہیں مسلسل دبائے ہوئے ہیں۔ اور انہیں منتشر ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ سوات، پنج کراہ اور سندھ کی وادیوں میں ان کا ردیہ بڑا نرم ہے اور یہ زیادہ مدافعت نہیں کرتے۔ جب دباؤ ایک خاص حد تک بڑھ جاتا ہے تو یہ لوگ جھک جاتے ہیں۔ اُن میں جنگجویانہ صلاحیت کی کمی، زراعت کے سوا کوئی دوسرا کام نہ کرنا، اُن کی نسل کے اضافہ میں کمی اور ان کے درمیان ہم آہنگی کے فقدان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک دِن زیادہ طاقتور قومیں انہیں اپنے اندر ضم کر لیں گی۔"

یہ تاریخ کی ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ نسل، خاندان اور ذات پات کے نظریات محض ہندوؤں نے ہی نہیں پیدا کیے بلکہ مسلمان حکمرانوں نے بھی ان نظریات کو فروغ دیا۔ اس کی وجوہات درج ذیل تھیں۔

(1) حکمران اقلیت اکثریت کے مقابلے میں اپنی احساس برتری قائم رکھنا چاہتے تھے۔

(2) اکثریت کو ذہنی طور پر مغلوب کر کے اُن میں احساسِ کمتری کے جذبات پیدا کرنا چاہتے تھے۔

(3) اقتدار کو محض اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ اور دوسروں کو اس کے حوالے سے کمتر قرار دیکر اقتدار میں شریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔

تمام دنیا کی تاریخ میں حملہ آور قوموں نے یہی وطیرہ اختیار کئے رکھا۔

وحشی آریوں نے ایک مہذب اور ترقی یافتہ ثقافت کے علم بردار دراوڑوں کو ان ہی وجوہات کی بنا پر راکشس، ملیچھ، کم اصل اور داسو قرار دیا۔ حالانکہ یہ قبائل وادی سندھ کی اعلیٰ تہذیب کے امین تھے۔ ڈاکٹر رفیق مغل جیسے نامور محقق کی یہ محکم رائے ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب پاکستان میں پھلی پھولی اور یہیں پروان چڑھی۔ اس تہذیب کو یہیں کے باسیوں نے بلندیوں تک پہنچایا۔ کتاب سات دریاؤں کی سرزمیں" میں ابن حنیف ڈاکٹر رفیق

مغل کی تھیوری کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "غرض چولیستان میں بھی ڈاکٹر مغل کی اثریاتی کاوشوں اور انکشافات سے اس بات کی مزید تصدیق ہو گئی ہے کہ وادی سندھ کی عروج یافتہ ہڑپائی تہذیب کا ارتقاء پاکستان ہی میں ہوا تھا۔ اور یہ تمام و کمال باہر سے نہیں آئی تھی۔"

ان مہذب قدیم پاکستانیوں کو آریاؤں نے نیچ قرار دیا حالانکہ خود اُن کی مجلسی زندگی اونچ نیچ کا شکار تھی۔ اُن کی قیمتی دولت مویشی تھے۔ اور اُن کی اقتصادی زندگی اُن ہی سے وابستہ تھی۔ مویشی سے وہ دودھ اور گوشت حاصل کرتے تھے۔ قبیلے کے سردار پر یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ارد گرد سے مویشی چرانے کے لئے منظم چھاپوں کا اہتمام کرے۔ ان وحشی آریوں نے مقامی لوگوں کو مغلوب کرنے کے بعد کیا کیا ابن حنیف مصنف سات دریاؤں کی سرزمین میں لکھتے ہیں۔ "فارسی میں لفظ ہندو کے معنی چور اور کالا (سیاہ فام) بھی ہیں۔ اور رگ وید میں پاکستان کے دراوڑوں کو حقارت سے کالے چور جیسے القاب سے بھی نوازا گیا ہے۔ اس لحاظ سے قدیم پاکستانیوں کے بارے میں بد دماغ نسبتاً وحشی اور نسلی تفاخر میں جاہلیت کی حد تک سرشار پاکستان میں نووارد آریاؤں کے رگ وید میں بیانات اور ان کے بھائی بند۔ ایرانی آریاؤں کی زبان میں ہندو کے معنی (کالا چور) میں قطعی طور پر مطابقت پائی جاتی ہے۔" ابن حنیف آگے چل کر پھر لکھتے ہیں۔ "آریائی بربریت ظلم و ستم اور پاکستان کے اصل مہذب باشندوں سے آریاؤں کی نفرت اور گھن کا پتہ خود رگ وید سے چلتا ہے۔ ارفع و اعلیٰ مہذب پاکستانیوں کے مقابلے میں کہیں غیر مہذب اور کم تر حملہ آور آریا بلاوجہ جس مکروہ تفاخر کا شکار تھے اس کے شاہد بھی رگ وید کے اوراق ہیں۔"

ذہنی تسکین حاصل کرنے کے لئے مہذب انسانوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا گیا۔ اور ان کی اعلیٰ تہذیبوں کو مٹی میں ملا دیا گیا۔ اس بارے میں ابن حنیف لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان ہی آریاؤں نے شائستگی اور تہذیب میں رچے بسے قدیم پاکستانیوں کو ملیچھ (ناپاک)، داسو (غلام)، اور راکشس (غلام) جیسے نام دیئے۔ رگ وید میں متعدد ایسے پاکستانی شہروں کے نام آئے ہیں جہاں آریاؤں نے جنگیں لڑیں۔ جنہیں ان کے دیوتاؤں (گویا خود آریاؤں) نے تباہ کیا۔" یہ نامور قبائل دراوڑ تھے اور ایک نامور تہذیب کے تخلیق کار تھے۔ ابن حنیف لکھتے ہیں۔ "اس وقت یہاں راوی اور چناب کے درمیانی زیریں علاقے میں ملی اور کشدرا کا قبائل کا طوطی بولتا ہے۔

ملی، ملینی، مینو، ملوطی، ملاوی، ملائی، ملا اور مالوی وغیرہ سب دراصل ایک ہی

نسل کے نام ہیں۔ سنسکرت میں انہیں ملاوا بھی لکھا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سکندر کی آمد سے بھی پہلے نہ جانے کن زمانوں سے آباد تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آج سے کوئی ساڑھے تین ہزار سال پیشتر جب آریاؤں نے پاکستان پر حملہ کیا تو اس وقت بھی پاکستان کے بہت بڑے علاقے میں ملی قبائل موجود تھے۔ نہ صرف موجود تھے بلکہ انہیں سیاسی اہمیت اور اقتدار بھی حاصل تھا۔"

یہ آریا جو وحشت اور بربریت میں بڑھے ہوئے تھے، گلہ بانی سے نکل کر شہری تہذیبوں میں داخل ہوئے۔ اس تبدیلی میں اُن غیر آریا مقامی باشندوں کی تہذیبی آثار کا بڑا حصہ تھا۔ جسے اُن آریاؤں نے اپنا لیا تھا۔ جہاں تک اُن کی شناخت اور پہچان کا سوال ہے۔ اُن کے متعلق بھی نسلی طور پر شکوک شبہات پائے جاتے ہیں۔ حضرت سید مجتبیٰ موسوی لاری مصنف کتاب مغربی تمدن کی ایک جھلک میں "نسلی امتیاز" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

"یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ بعض محققین اس قانون کی بنا پر کہ ابھی تک خالص نسل نہیں دیکھی گئی اور نہ کسی علمی تحقیق نے نسلی امتیاز کو مکمل واضح کیا ہے۔ آریائی نژاد کے قائل نہیں ہیں۔ اور اس کو ایک افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور نہ کسی طرح یہ بات ثابت ہو سکی ہے کہ تاریخ میں واقعاً کوئی آریائی نژاد قسم کی چیز موجود تھی۔ صرف آریائی زبان کا وجود ثابت ہے مگر آریائی نسل نہیں ثابت ہو سکی۔ اور عموماً یہ بات دیکھی گئی ہے کہ بہت سی نسلیں ایک ہی زبان بولتی ہیں۔"

بہر حال ستم ظریفی کی یہ انتہا ہے کہ ہندوستان کے آریاؤں نے جب حکومتی پھیلاؤ کے پیش نظر ذمہ داریاں تقسیم کرنا شروع کیں تو درج ذیل چار ذاتوں میں بٹ گئے۔

(1) برہمن : ان کا کام پڑھنا، پڑھانا اور مذہبی رسوم ادا کرنا تھا۔

(2) کھشتری : ان کا کام جنگ لڑنا اور ملک کی حفاظت کرنا تھا۔

(3) ویش : ان کا کام تجارت اور کھیتی باڑی کرنا تھا۔

(4) شودر : ان کا کام باقی تینوں ذاتوں کی خدمت کرنا تھا۔

شودروں میں دھرم سے گرے ہوئے آریا بھی تھے۔ اور مقامی باشندے بھی شامل تھے۔ جن کو جنگ کے بعد غلام بنالیا گیا تھا۔ یہ بات یاد رہے کہ برہمن، کھشتری اور ویش ایک ہی نسل کے لوگ تھے۔ اُن سب کی رگوں میں ایک ہی قسم کا خون دوڑ رہا تھا۔ لیکن ذات برادری میں تقسیم کے فوراً بعد اُن تینوں گروہوں کے خون میں درجہ بدرجہ خون خالص

اور غیر خالص ہو چکا تھا۔ یہ تسلیم کر لینا پڑیگا کہ ان تینوں گروہوں میں یا حقیقی ایک قسم کا خالص خون تھا یا تینوں میں غیر خالص خون۔ ذات برادری کے تقسیم کے فوراًبعد یہ تبدیلی کیسے ممکن ہوئی؟ ابن خلدون کا نظریہ یہاں قابلِ توجہ ہے۔ یہ چونکہ نا قابل وقوع تھا۔ اس لئے خالص اور غیر خالص خون کا نظریہ بھی بے بنیاد تھا۔ اور یہ نظریہ بھی حکمرانوں کا پیدا کردہ تھا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ عوام الناس کو ذہنی طور پر مفلوج کیا جائے اور اپنی بڑائی کا بھرم قائم رکھا جائے۔ ڈاکٹر مبارک علی استاد شعبہ تاریخ سندھ لکھتے ہیں۔ خاندان کے تصور کو مزید مستحکم اور مضبوط بنانے کے لئے ہمارے معاشرے میں ایک اور اہم تصور "خون کی پاکیزگی" کا بھی ہے۔ ہمارے ہاں اس بات پر یقین کیا جاتا ہے کہ جس کی رگوں میں شریف خون گردش کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ صاحب کردار ہوتا ہے۔ یہ خون کی پاگیزگی کیا ہے؟ یعنی وہ خون جس میں عوامی خون کی آمیزش نہ ہو اور صرف اس طبقہ کا خون ہو جو خود کو اعلیٰ، ممتاز، شریف اور معزز کہلاتا ہے۔ یہ اس بات کی کوشش ہے کہ ہمارے معاشرے میں طبقاتی تقسیم مضبوط اور اٹل بنیادوں پر قائم ہے۔"

ول اور ایریل ڈیورنیٹ (will and Ariel Durant) اپنی کتاب "تاریخ کے اسباق" میں لکھتے ہیں۔ "تاریخ کور رنگ ہے۔ یہ موافق ماحول کی موجودگی میں کسی بھی کھال کے زیرِ اثر تہذیب و تمدن تخلیق کر سکتی ہے۔"

ڈاکٹر مبارک علی کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "عالمی تہذیبوں کے مطالعہ کے بعد ہی ہم پر یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ رنگ و نسل کی وجہ سے دنیا میں کس قوم کو برتری نہیں۔ ہر قوم کا عالمی تہذیب میں اپنا حصہ ہے۔ کوئی کسی سے کم تر یا برتر نہیں۔ عالمی تہذیبوں کے مطالعہ ہی سے ہمارا ذہن کشادہ ہوگا۔ اور اسی ذریعہ سے ہم دنیا کی تہذیبوں کا تقابلی جائزہ لے سکیں گے۔ اور مختلف معاشروں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ ہو سکیں گے۔ اسی مطالعہ کے ذریعہ ہم بے جا فخر وغیرہ سے چھٹکارا پا سکیں گے۔ اور تعصب و تنگ نظری کی جگہ ہم میں وسیع انسانیت کا تصور پیدا ہوگا۔"

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں اپنے مقابلے میں کسی دوسرے کی برتری تسلیم نہیں کرتیں۔ وہ اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے کئی دلائل رکھتی ہیں۔ کہ وہ ایک اعلیٰ تہذیب کی علمبردار ہیں۔ یہ کہ اور لوگ اس تہذیب کے خوشہ چین رہے ہیں۔ اُن کی زبان کوثر میں دھلی ہوئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ اِسی کے بارے میں

ول انیڈ ڈیور نیٹ لکھتے ہیں۔

"Some weaknesses in the race theory are obvious. A chinese scholar would remind us that his people created the most enduring civilization in History. Statesmen, inventors, artists, peots, scientists, philosophers, saints from 2000 B.C to our own time. A Mexican scholar could point to the lordly structures of Mayan, Aztec and Incan cultures inprecolumbian America. A Hindu scholar while acknowledging "Aryan" infiltration into North India some sixteen hundred years before christ would recall that the black Dravidic peoples sf south india produced Great builders and poets of their own, the temples of Madras, Maduva and Trichnopoly are among the most impressive structures on earth.

دنیا بھر میں یہ طبقاتی نظام اقتدار (سیاست)، رہنمائی (مذہب) اور مایا کی بنیادوں پر وجود میں آیا۔ اسے منظم انداز میں پروان چڑھایا گیا اور موروثی بنادیا گیا۔ خطابات، القابات اور توصیفی ٹائی ٹلز جیسے ظل سبحانی، ظل اللہ، شہنشاہِ عالم، جان جہان، شمع عالم تاب، فاتح عالم، صاحب عالم، صاحب عزو شان، صاحب قرآن، ملکہ عالم وغیرہ ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ شرافت اور نجابت ورثے میں منتقل ہوتی تھی۔ بیٹا کیسا بد قماش، بدراہ، بد خُو جاہل اور اُجڈ کیوں نہ ہو شمع عالم تاب ہی کہلاتا۔ بیٹے کی ذاتی کمینگی موروثی نام نہاد شرافت کو دھبہ نہ لگا سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر نے ایک بار حکم دیا کہ قدیم خاندانوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ ان کے نااہل اور نالائق جانشینوں کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ابھی ایسے ہی احکام دیئے۔ بقول وزیر حشمت اللہ مصنف تاریخ جموں مہاراجہ رنبیر سنگھ کو پرانے خاندانوں کی بحالی کا بڑا پاس تھا۔ اسی لئے صغیر سن علی داد کو گلگت کا علامتی راجہ بنا دیا گیا۔ اصل حکومت انگریزوں اور مہاراجہ کے ہاتھوں میں تھی۔ راجہ علی داد بوئی (غلہ پیائی یعنی چکی ٹیکس) کی وصولی اور اپنی زمینوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ تاہم سرکاری

طرف سے علی داد کو آٹھ روپے بارہ آنے کے حساب سے وظیفہ ملتا تھا۔ گلگت کا پولیٹیکل ایجنٹ طاقت کا بڑا سر چشمہ اور وزیر وزارت طاقت کا دوسرا منبع تھا۔ ان کے فیصلے حرف آخر تھے۔

ان القابات میں چونکہ بڑی تسکین ہے اس لئے آج بھی ان سلسلوں کے اقتدار سے محروم لوگ صدیاں بیت جانے کے باوجود راجہ، شہزادہ، رانی کے القاب اپنے ناموں کے ساتھ منسلک کر کے اطمینان پاتے ہیں۔ عوام الناس سے وابستہ ایسے افراد جو کھوکھلے دبدبے کے متلاشی ہیں۔ اپنے بچوں کے نام راجا، بادشاہ، رانی، شہزادہ، شہنشاہ، گشپور، وزیر، ملکہ وغیرہ رکھتے ہیں۔ ہمارے علاقہ میں ایسے نام مثلاً لڑوم گشپور، وزیر خان، وزیر علی، شہزادہ عالمگیر، شہزادہ جان، کنول رانی، ملکہ حسن، شہنشاہ، ملکہ عالم، میر جان، نواب خان، نواب علی، وغیرہ عام مستعمل ہیں۔ یہ لوگوں کی ذہنی کیفیت کا عکس ہے۔ گلگت میں کچھ عرصہ پہلے ایک رسم موجود تھی جس کے مطابق کسی شخص کو برائے نام راجہ قرار دیا جاتا اور پھر اُس کے حواری بن کر اُس کی جمع پونجی لوٹی جاتی۔ ذہنی طور پر پسماندہ افراد ہی راجہ اور رانی کے القابات پسند اور قبول کرتے ہیں۔ طبقاتی نظام پیدا کرنے میں مسلمان بھی پیچھے نہ تھے۔ آنحضور ﷺ کے زمانے میں جو لوگ مسلمان ہوئے اُن میں بلال حبشی بھی تھے۔ اور سلمان فارسی بھی۔ حضرت عمرؓ بھی۔ یہ اصحاب رسولؐ سب برابر تھے۔ حضرت بلال حبشی سیدنا بلال کہلائے لیکن بعد میں ہم نے ایرانی ہندوستانی، افریقی مسلمانوں کو مساوی حیثیت نہیں دی۔ جو آنحضورؐ اور خلفائے راشدین کے دور میں دی گئی تھی۔ اسی کی نتیجے میں کئی مسائل نے جنم لیا۔ ڈاکٹر مبارک علی استاد شعبہ تاریخ اپنے مقالہ "تاریخ اور روایات" میں لکھتے ہیں۔ "اسی وجہ سے جب ہندوستان کی برادریاں مسلمان ہوئیں۔ تو انہوں نے مسلمان معاشرے میں مساوی و سماجی رتبہ حاصل کرنے کے لئے ضروری سمجھا کہ خود کو انصاری، قریشی اور شیخ بنالیں۔ ذات پات کی اس تبدیلی پر بھی ایک شاعر نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

"میں ابتدا میں روئی دھننے والا تھا پھر شیخ بن گیا
اگر اناج سستا ہو گیا تو میں اس سال سید بن جاؤں گا۔"

ہندوستان میں خاندان غلاماں کے بادشاہ اوّل سے آخر تک یا تو خود غلام رہ چکے تھے یا غلاموں کی اولاد تھے۔ حکومت حاصل کرنے کے بعد ہر ایک نے طبقاتی نظام کو سینے سے لگایا اور اسے خوب پروان چڑھایا۔ ڈاکٹر مبارک علی عہد سلاطین کے مورخ ضیاء الدین برنی کی

تاریخ فیروز شاہی سے بلبن کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔ "ایک مرتبہ ایک عہدے کے لئے ایک شخص کا انتخاب ہوا جس کا نام کمال مہیار تھا۔ جب بلبن نے اس سے مہیار کے معنی پوچھے تو اُس نے کہا۔ "مہیار میرا باپ ہے اور وہ ہندو غلام تھا۔ بادشاہ یہ سنتے ہی غصہ کے عالم میں دربار سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اور بعد میں اپنے امراء سے کہا۔ میں کسی کم اصل، کمینے، رذیل کو کسی شغل، مرتبے یا عزت کی جگہ پر نہیں دیکھ سکتا۔ اور جوں ہی اس قسم کے لوگ میرے سامنے آتے ہیں۔ میرے جسم کی حرکتیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ میں کسی کمین، نااہل لڑکے کو حکومت میں جو مجھ کو خدا کی طرف سے ملی ہے۔ شریک نہیں کر سکتا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

یہاں ایسا کوئی معاملہ نہ تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومتی دور میں طبقاتی نظام پورے شدومد کے ساتھ جاری وساری تھا۔ اسلام کسی ذات پات کا قائل نہیں۔ یہاں کوئی طبقاتی نظام موجود نہیں۔ یہاں رنگ و نسل تخصیص کا کوئی ذریعہ نہیں۔ جیسے ہندوؤں میں تھا۔ ویدی ہندوؤں نے رنگوں سے اپنی شناخت قائم کرر کھی تھی۔ ویدوں میں آیا ہے۔ "تب خداوند نے جنت تک رسائی کیلئے صداقت، راست بازی، پرہیز گاری کا ولولہ، لافانی وید، عمل صالح اور پاکیزگی کی تشکیل کی۔ پھر اُس نے دیوتا، راکشس اور انسان بنائے جن میں برہمن، کھشتری، ویش اور شودر اور دیگر طبقات پیدا کیے۔ برہمن کا رنگ گورا، کھشتری کا سرخ، ویش کا پیلا، اور شودر کا کالا تھا۔"

اسلام کی تعلیم واضح ہے۔ خداوند عالم کا یہ ارشاد اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں رنگ، نسب، زبان، معاش کے طریقوں کے بل بوتے پر کوئی تفریق موجود نہیں ہے۔ "لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے، کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ خدا کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔ بے شک خدا سب کچھ جاننے والا، سب سے خبردار ہے۔ (سورۃ الحجرات آیت 13)۔ النساء آیت میں پھر فرمایا گیا۔ "لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ اور اسی جان سے اُس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد عورت (پیدا کر کے) دنیا میں پھیلا دیئے۔"

فتح مکہ کے بعد رسول خدا نے متکبر عربیوں سے فرمایا اور کہا:

"اس خدا کی تعریف جس نے اسلام کے طفیل میں تمہاری جاہلیت کے آثار، فخر، تکبر، نفرت کو ختم کیا۔ یاد رکھو! خدا کی بارگاہ میں تمام لوگ دو ہی قسم ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو تقوائے الٰہی کی بنا پر بارگاہِ الٰہی میں بزرگ ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو گنہگاری کی وجہ سے اس کے سامنے سر جھکائے ہے۔" پھر حجتہ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: "لوگو! خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ عربی کو عجمی پر کوئی برتری نہیں اور نہ ہی کالے کو کسی گورے پر اور گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت ہے۔ فضیلت اور برتری صرف پرہیزگاری کی بنا پر ہے۔ سب لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں" فکر و نظر کے اختلافات کے علاوہ اسلام کسی امتیاز کو قبول نہیں کرتا۔ رنگ و روپ، زبان، نسبی اور معاشی اختلافات جغرافیائی ماحولیاتی منشا کے عین مطابق ہیں۔ تاہم حقوق انسانیت میں سب برابر ہیں۔ معاش کے مختلف ذریعوں سے بھی احترام انسانیت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ حضرت نوح علیہ السلام لکڑی کا کام کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام لوہے کا کام کرتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰؐ نبوت سے پہلے تجارت کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ تاجر پیشہ تھے۔ حضرت علیؓ محنت مزدوری سے اپنی گزر بسر کرتے تھے۔ آپؐ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ اللہ اس بندے کو پسند کرتا ہے جو کوئی پیشہ کرتا ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا کھیتی کرو کہ کھیتی میں برکت ہے۔

اسی تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر اگلے ابواب کے مباحث پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان مباحث کا مقصود کسی قوم کو برتر یا کمتر ثابت کرنا نہیں۔ یہ مباحث محض ایک علمی تحقیق کا حصہ ہیں۔ خالص یا غیر خالص، اعلیٰ یا افضل، شریف یا ذلیل کسی بحث سے سروکار نہیں۔ خدائی احکام کی موجودگی میں ایسا کرنا خود رذالت ہے۔ بقول مولانا حالی۔

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

جس تاریخ پر ہم نازاں ہیں۔ اُس کے بارے میں تاریخ کے اسباق نامی کتاب کے مصنفین ول اور ڈیورنیٹ کہتے ہیں۔ تاریخ کا بیشتر حصہ ظن و قیاس پر اور باقی تعصب پر مبنی ہے" اس لئے اُن کا پھر یہ کہنا ہے کہ

"Perhaps within these limits, We can learn enough from history to bear reality patiently, and to respect one another's delusions."

قرآنِ حکیم نے قوموں کے عروج و زوال کے قصے بیان کر کے یہ یاد دلایا ہے۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

قومیں اپنے اچھے اعمال کے نتیجے میں عروج حاصل کرتی ہیں اور پھر یہ قومیں اپنے اعمال میں حد سے بڑھتی ہیں۔ تو زوال پذیر ہوتی ہیں۔ قوموں کا عروج و زوال انسانوں کے لئے عبرت کا باعث ہے۔

باب۔2

حضرت نوحؑ کی اولاد

حضرت نوحؑ آدمِ ثانی کہلاتے ہیں کیونکہ نسل انسانی کا تسلسل آپ کے تین بیٹوں یافث، سام اور حام سے دوبارہ شروع ہوا۔ باقی لوگ خواہ وہ کشتی سوار تھے یا زمین پر رہنے والے نافرمان سبھی موت کا شکار ہوئے۔ خود حضرت نوحؑ کا ایک بیٹا یام بھی طوفان میں غرق ہوا۔ اور یوں آج دنیا کی ساری آبادی حضرت نوحؑ کی اولاد ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ خداوندی ہے۔ ہم نے نوح کو وحی کی کہ اُن لوگوں کے سوا جو پہلے ہی تم پر ایمان لا چکے ہیں اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ سو اُن کی وجہ سے غم نہ کھاؤ اور ایک کشتی ہمارے حکم سے ہمارے سامنے تیار کرو۔ چنانچہ نوحؑ نے کشتی بنانا شروع کی۔ بہرحال کشتی تیار ہوئی۔ نوحؑ اور اُس کے تین بیٹے اور چند لوگ جو اُس کے ماننے والے تھے۔ کشتی پر سوار ہوئے۔ اور طوفان کی تباہ کاریوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "جب نوحؑ کشتی سے باہر آئے تو اُس کے بیٹوں اور گھر کی عورتوں کے سوا دیگر تمام ساتھی رفتہ رفتہ مر گئے۔ علامہ طنطاوی قرآنی آیات کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ "تمام انسان نوحؑ کی نسل سے ہیں۔ نوحؑ کے تین بیٹے تھے۔ اوّل سام جو عربوں، ایرانیوں اور رومیوں کا جدِ اعلیٰ تھا۔ دوم حام سیاہ فام اقوام و قبائل کا باپ۔ سوم یافث جو بحیرہ خزر کے ترکوں اور یاجوج و ماجوج کا مورثِ اعلیٰ تھا۔ آیات صافات 75 تا 77 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "بے شک نوح نے ہم کو پکارا تھا اور ہم نے نہایت عمدہ طریقے سے اس کا جواب دیا۔ ہم نے اُسے اور اُس کے گھر والوں کو ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا اور زمین پر صرف اُسی کی اولاد کو باقی رکھا۔"

(میری آخری کتاب صفحہ 196)

ان تشریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ موجودہ دنیا کی ساری نسلیں حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں سے پھلی پھولی ہیں۔ آریا ہوں یا مغل، ستھین ہوں یا یوچی، ہُن ہوں یا افغانی، پاکستانی ہوں یا انگلستانی، امریکی ہوں یا عربی، ایرانی ہوں یا یہودی حضرت نوحؑ کی

ذریات ہیں۔ نسلی اعتبار سے ایک بیٹے کی اولاد دوسرے بیٹے کی اولاد پر کوئی فوقیت نہیں رکھتی۔ خُوبُو اور رنگ و خون کے اعتبار سے تمام بیٹے یکساں ہیں۔ ہاں اُن کے درمیان بڑائی کا معیار اُن کا ذاتی کردار ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں تورات کا ایک نظریہ یہ بھی بیان ہوا ہے کہ تمام انسان حضرت نوحؑ ، تین بیٹوں سام ، حام اور یافث کی اولاد ہیں۔ اور یہ کہ سام اور اُس کی اولاد دوسرے بھائیوں اور اُن کی اولاد پر فوقیت رکھتی ہے۔ یہ واضح نہیں فوقیت کا معیار کن باتوں کی وجہ سے قائم کیا گیا تھا۔ مُمیزہ خصوصیات کا کہیں ذکر نہیں کہ یہ ذاتی عادات واطوار تھے یا کوئی اور وجوہات جن کی وجہ سے سام دیگر بھائیوں سے فائق خیال کیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال ہے کہ یہ کوئی قومی نظریہ نہیں تاہم اِس نظریہ کے خالق یہودی ہیں۔ جو سامی ہونے کے ناطے دیگر تمام نسلوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل اپنی کتاب "پشتون تاریخ کے آئینے میں" لکھتے ہیں۔ "پشتون بھی بنی اسرائیل کی طرح اپنی نسل پر گھمنڈ کرتے ہیں۔ پشتون قوم کا ہر فرد غیر پشتون کے مقابلے میں اپنے آپ کو ممتاز سمجھتا ہے۔ پشتون کے معنی ہیں شریف، اصیل اور خوش اخلاق۔ بنی اسرائیل بھی اپنی نسل کو دوسروں سے اتنی ممیز جانتے تھے کہ ایک غیر اسرائیلی بزرگ کی بڑائی کا اعتراف کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوتے تھے۔

نسل انسانی کی ابتدا کیسے اور کس طرح ہوئی، اس بارے میں مختلف اقوام کے نظریات بھی جاننے کے لائق ہیں۔ کہ کس طرح حضرت انسان کی اعلیٰ نوع کو حقیر جانوروں کی اولاد قرار دیکر اسے پستیوں میں دھکیلا گیا۔

(1) کیلی فورنیا کے ریڈ انڈین کہتے ہیں کہ وہ بھیڑیوں کی اولاد ہیں۔

(2) ترک اور منگول اپنے آپ کو مادہ گرگ کی اولاد قرار دیتے ہیں۔

(3) امریکہ کے بعض قدیم باشندے اپنی نسل کو مچھلیوں پرندوں اور دیگر جانوروں سے جوڑتے ہیں۔

(4) افریقہ کا ایک قبیلہ اپنی نسل کو لگڑ بھگڑ کی نسل سے ملاتا ہے۔

(5) نیو گنی کے لوگ اپنے آپ کو مچھلی کی اولاد بتاتے ہیں۔

(6) آنبائے ماکا کے کچھ قبائل کا کہنا ہے کہ وہ درختوں کی اولاد ہیں۔

(7) یونانی اور نیل ابیض کے کچھ قبائل کا کہنا ہے کہ اُنہیں دیوتاؤں نے مٹی سے بنایا۔ شلوک قبیلے کے حبشی کہتے ہیں جو اک خالق نے تمام انسانوں کو مٹی سے بنایا

ہے۔ سفید مٹی سے سفید نسل کے لوگ۔ بھوری مٹی سے بھوری نسل کے لوگ۔ سیاہ مٹی سے سیاہ حبشی نسل کے لوگ بنائے گئے ہیں۔

(8) یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ اللہ نے کائنات بنائی۔ جانداروں کو پیدا کیا۔ پھر آدم کا پتلا بنا کر اُس میں اپنی روح ڈال دی۔ آدم بہشت میں رہنے لگا اُس کی تنہائی کو دور کرنے کے لئے آدم کی پسلی سے ایک عورت حوا کی تخلیق کی گئی۔ پھر ان دونوں کے جرم کرنے پر انہیں زمین پر گرادیا گیا۔

(9) قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ انسان کی تخلیق کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

1. اور ہم نے انسان کو کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا۔
(سورہ الحجر آیت 26)

2. اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔ پھر اُس کو ایک مضبوط جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر نطفے کو لوتھڑا بنایا۔ پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر اُس کو نئی صورت میں بنادیا۔ تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا بڑا بابرکت ہے۔
(سورۃ المومنوں آیت 12 تا 14)

3. لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا۔ اُس سے اُس کا جوڑا بنایا۔ پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد عورت پیدا کر کے روئے زمیں پر پھیلا دیئے۔ اور خدا سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو اور قطع مودت سے بچو۔ کچھ شک نہیں کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔
(سورۃ النساء آیت-1)

اسلامی نقطہ نظر بھی یہی ہے کہ آدم اور حوا بہشت میں رہنے لگے لیکن شجر ممنوعہ کا پھل کھانے کی وجہ سے انہیں بطور سزا زمین پر گرادیا گیا۔ اُن کی نسل انسانی چل نکلی۔ جہاں تک انسانوں کے رنگ روپ، جسمانی ساخت، چہرے مہرے اور طبعی خصوصیات کا تعلق ہے۔ اس میں جو واضح فرق دِکھائی دیتا ہے۔ یہ جغرافیائی عوامل کا نتیجہ ہے۔ شدید موسمی کیفیات والے خطوں میں رہنے والے لوگ درشت مزاج، سخت جان، سخت طبائع کے مالک ہوتے ہیں۔ سیاہ رنگ بھی موسمی کیفیات کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ چونکہ موسمی کیفیات حد اعتدال سے بالا ہوتی ہیں اس لئے ایسے خطوں کا تمدن بھی غیر ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ یہ بات یاد

رہے انسانوں کے ذہنی، طبعی اور معاشرتی سوجھ بوجھ کے قویٰ کمزور نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کا ناز ساماحول ایسا ہوتا ہے جو اُن کے لئے ترقی کے کم مواقع فراہم کرتا ہے۔ ابن خلدون اس ضمن میں یہ شبہات رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان کا سیاہ رنگ اُن کے کسی بد اعمالی کا نتیجہ نہیں وہ لکھتے ہیں۔ ''بعض نسب دان جو کائنات کی طبائع خواص سے ناآشنا و ناواقف ہیں۔ اسی وہم میں مبتلا ہوئے ہیں کہ زنگی قومیں حام بن نوحؑ کی اولاد ہیں۔ ان کو ان کے جدامجد نوحؑ نے چونکہ بد عادی تھی اس لئے ان کا رنگ سیاہ ہو گیا۔ اور اسی بد دُعا کے اثر سے غلامی کا طوق ان کی گردن میں پڑا۔ اور اسی سلسلہ میں ز ٹل قصے اور حکایتیں نقل کرتے ہیں۔ نوحؑ کا اپنے بیٹے حام کو بد دُعا دینا اس کا ذکر تو حقیقت میں توریت میں آچکا ہے۔ لیکن اس کی اولاد کا سیاہ فام ہونا اس کا اس میں کہیں حوالہ نہیں۔ بد دُعا بھی یہ تھی کہ حام کی اولاد اس کے بھائیوں کی غلام رہے نہ دوسروں کی۔ زنگیوں کی سیاہ فامی کی نسبت بد دُعا وغیرہ کی طرف اشارہ کرنا بتاتا ہے کہ وہ حرارت وبرودت کی طبیعت اور ہوا پر اس کے اثرات اور ہوا کے زیر اثر حیوانات کی پیدائش سے قطعاً غافل ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ پہلی اور دوسری اقلیموں کے باشندوں کا رنگ شدت حرارت کی وجہ سے جو ان کی ہوا کے مزاج میں پیدا ہو گئی ہے۔ سیاہ ہو گیا ہے کیونکہ آفتاب سال میں دو مرتبہ قریب قریب حدت میں ان کے سر پر آتا ہے۔ اور اس طرح گویا زیادہ تر موسموں میں آفتاب اس کے سروں کے قریب ہی رہتا ہے۔ ان اقوام کے مختلف حقیر نام پڑنے اور ان کے بارے میں مختلف قصے کہانیاں جاری ہونے کی ایک وجہ اُن اقوام کا حقارت آمیز رویہ تھا۔ جو ترقی یافتہ تھے اور انہیں اچھا ماحول ملا تھا۔ اس سلسلہ میں ابن خلدون لکھتے ہیں۔ ''جنوبی اقوام کو جس طرح رنگ کی لحاظ سے زنگی کہا جاتا ہے۔ اس طرح شمالی باشندوں کا نام ان کے گورے رنگ کی وجہ سے کچھ نہیں پڑا کیونکہ زنگی وغیرہ کے ناموں کو وضع کرنے والوں کا رنگ چونکہ خود گورا تھا۔ اس لئے اس میں ان کے لئے کوئی غرابت یا ندرت نہ تھی۔''

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔ ''اور بیچ کی معتدل اقلیم کے باشندوں مثلاً عربوں، رومیوں، پارسیوں، بنی اسرائیل، یونانیوں، سندھیوں، ہندیوں اور چینیوں نے اپنے دیگر اقوام عالم کے حالات سے ہم کو واقف کیا۔ اب نسب دانوں نے جب دیکھا کہ دنیا کی یہ قومیں اپنے علامات و نشانات میں آپس میں مختلف ہیں تو سمجھ بیٹھے کہ اس اختلاف کا اصلی سبب ان کی مختلف نسلیں ہیں۔ اسی لئے انہوں نے جنوبی اقوام کو حام کی اولاد ٹھہرایا۔ اور ان کے رنگ کی وجہ بتاتے وقت بے اصل و بے بنیاد حکایتیں گھڑ لیں۔ جس کا کوئی سر پیر نہیں۔ اور شمالی اقوام کو یا

ان میں اکثر کو یافث کی اولاد مانا۔ اور اسی طرح معتدل المزاج قوموں کو جو ہنر، دین ومذہب، طریقہ حکومت وسیاست میں ممتاز ہیں سام کی اولاد قرار دیا۔ یہ خیال ان نسب دانوں کا گو نسب کے معاملہ میں حق ہے لیکن استقرائے تام نہیں۔

اس بیان کے تناظر میں اس تقسیم پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو انسان کے قدو قامت، چہرہ مہرہ، جسم کی ساخت اور رنگ ڈھنگ کے پیش نظر قائم ہے۔ گرچہ یہ نکتہ نظر سالم حقیقت پر مبنی نہیں اور اس پر حرف زنی ہوتی رہی ہے۔ مثلاً فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاؤلی بان کا کہنا ہے کہ جلد، بالوں کے رنگ یا سر اور کھوپڑی کی ساخت کے اعتبار سے انسانوں کی کچھ تقسیم بندی تو کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ کوئی معتمد طریقہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ایک ہی قوم میں سفید یا گورا رنگ رکھنے والے کم وبیش ہو سکتے ہیں۔ اُن کے اپنے الفاظ یوں ہیں ''اگر ہم اقوام سفید رنگ کی تقسیم عرضیں الراس اور طویل الراس میں کریں اور پھر ان میں نہایت سفید اور کم سفید کی تفریق کریں تو اس تقسیم سے ہمیں فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس تقسیم میں ایسی مختلف الاصل اقوام شامل ہو جائیں گی جیسے فرانسیسی، انگریز، روسی اور المانی وغیرہ۔ پس معلوم ہوا کہ صرف جسمانی خصائص کی بنا پر اقوام انسانی کی تقسیم نہیں کی جاسکتی۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان اقوام انسان کی تقسیم کو اخلاقی ودماغی خصائص کی بنا پر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی کئی لحاظ سے قابلِ تنقید ہے۔ لیکن یہاں جسمانی ساخت کی بنیاد پر تقسیم بندی پیش کی جاتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کاکاخیل اپنی کتاب ''پشتون تاریخ کے آئینے میں'' میں انسانی نسل کو چار نسلی گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اُن کی تقسیم بندی درج ذیل ہے۔

(1) سفید فام: یا گورے رنگ کی نسل۔ ان لوگوں کا رنگ گورا، ناک کھڑی اور پتلی، ہونٹ پتلے، بال نرم اور گنجلگ اور ان کی داڑھیاں گھنی ہوتی ہیں۔ اس نسل کے لوگ یورپ، مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں رہتے ہیں۔

(2) زرد فام لوگ: ان لوگوں کا رنگ پھیکا اور زردی مائل آنکھیں دھنسی ہوئی اور چھوٹی چھوٹی، بال سخت، داڑھیاں چگی اور چھدری ہوتی ہیں۔ چین اور جاپان کے باشندے، مغل اور ترک اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ایشیاء کے شمالی اور مشرقی ممالک میں رہتے ہیں۔

(3) سیاہ فام: یہ لوگ کالے، ہونٹ موٹے موٹے، بال بہت سخت ناملائم اون کی طرح اور چھوٹے چھوٹے۔ اس نسل کے لوگ اکثر وبیشتر افریقہ میں رہتے ہیں۔

(4) سرخ فام: ان لوگوں کا رنگ تانبے کی طرح کا سرخ ہوتا ہے۔ اور ان کے اعضاء کی ساخت زرد فام لوگوں سے ملتی جلتی ہے۔ امریکہ کے قدیم باشندے اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

وہ آگے چل کر پھر لکھتے ہیں۔ "سیاہ فام اور سرخ فام قوموں نے بہت کم ترقی کی ہے۔ بلکہ بعض قبیلے تو آج بھی وحشی جنگلیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ اس لئے ان کی کوئی تاریخ بھی نہیں ہے۔ زرد فام بہت قدیم زمانے سے متمدن چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ان کا تمدن ایک عرصہ دراز سے بس ایک ہی حال میں چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے آگے کوئی ترقی نہیں کی۔ البتہ جس نسل نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ترقی کی ہے وہ سفید فام نسل ہے۔ لیکن مورخین اور علم الانسان کے علماء نے اس سفید فام نسل کو بھی دو شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک شاخ کو آریا اور دوسری کو سامی کہتے ہیں۔" پھر وہ آریوں اور سامیوں کے درمیان موجود فرق کو زبان کے فرق کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "کہ آریائی اور سامی زبانوں میں کوئی مشابہت نہیں۔ ماہرین علم النسل نے انسانی کھوپڑیوں کی بنا پر انسانی نسل کی جو تقسیم بندی کی ہے اُس کی تفصیل مرتضٰی احمد خان نے اپنی کتاب تاریخ اقوام عالم میں پیش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "علم النسل کے ماہروں نے انسانوں کے نسلی اختلافات کی ٹوہ لگانے کے لئے جو کلیات اور قاعدے وضع کیے ہیں۔ وہ بسا اوقات مشاہدات و حقائق پر پورے نہیں اترتے۔ کسی ایک امتیازی خصوصیت کو جسے نسلی امتیاز قرار دیا جاتا ہے۔ جب مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو ایک ہی خاندان میں اسی خصوصیت کو رکھنے والے اور نہ رکھنے والے افراد پائے جاتے ہیں۔" فاضل مصنف کی یہ رائے بڑی محکم اور معتبر ہے۔ علمائے علم النسل نے جو قاعدے کلیے بنائے ہیں۔ وہ انسانی نسل کی تقسیم کا کوئی مکمل جائزہ پیش نہیں کرتے۔ مرور زمانہ مختلف قوموں کے تگڈم اور اختلاف کی وجہ سے یہ اختلافات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ نسلوں کے خالص ہونے کی خصوصیات کے تصورات محض خیالی ہیں۔ مائیکل "ڈبلیو ڈیم سے" اپنی کتاب "Virtue's NEW Treasury of Knowledge" میں لکھتے ہیں۔

"It is belived that all people origionally came from one common ancestral type. but the various groups now have distinct and characteristic differences, Howerer, We

should think of racial differences as being hard and fast, because the races often over lap, and there is no such thing as a pure race."

مرتضیٰ احمد خان نے ماہرین علم النسل کی تقسیم کے حوالے سے جو تقسیم بندی کی ہے وہ درج ذیل ہے۔

(1) چوڑے سر والے لوگ : اس نسل کے باشندے عام طور پر یورپ اور ایشیا کے وسطی کوہستانوں کے سلسلے میں آباد ہیں۔ مثلاً برنیز، ایلپس، کارپیتھین، طورس، قاف، ہندوکش، پامیر، الطائی اور شمالی امریکہ کا سلسلہ کوہستان (منگول نسل اسی نسل کی ایک شاخ ہے۔)

(2) لمبوترے سر اور اونچی کھوپڑی والے لوگ : اس نسل کے لوگ شمالی میدان اعظم اور جنوبی میدان اعظم کے اصلی باشندے سمجھے جاتے ہیں۔ شمالی میدان والے آریا اور جنوبی میدان والے سامی کہلاتے ہیں۔

(3) لمبوترے سر اور پست کھوپڑی والے لوگ : اس نسل کے لوگ وسطی اور جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، بحر الکاہل کے جزیروں اور جنوبی ہند کے قدیمی اصلی باشندے ہیں۔ اور حامی کہلاتے ہیں۔"

انسانی نسلوں کی جان پہچان کے لئے زبان ایک اہم ذریعہ ہے۔ زبان کے ڈانڈے دور ماضی میں ملتے ہیں۔ اور یہ مقرب انسانی رشتوں کا پتہ دیتے ہیں۔ جیسے جیسے ہم ماضی کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ مختلف قومیں اور نسلیں قریب سے قریب تر آتی دِکھائی دیتی ہیں۔ ہم ایسے نسلی گروپوں میں آجاتے ہیں۔ جہاں لوگ ایک رنگ روپ، ایک زبان اور ایک معاشرت اپنائے دِکھائی دیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ انسانوں کے گروپس دور دور مقامات سے ایک مرکز کی طرف لوٹتے نظر آتے ہیں۔ حضرت نوحؑ کے تینوں بیٹے سام، حام اور یافث ایک زبان بولتے، ایک قسم کے اشارے کرتے اور ایک رنگ وروپ کے ساتھ سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر زبانیں نسلی ادغام اور قربتوں کا اظہار ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان کا جائزہ لینا ضروری اور مناسب ہے۔

تاریخی اور نسلی حوالوں سے دنیا کی زبانیں آٹھ بڑے خاندانوں میں منقسم ہیں۔

(1) سامی : سامی میں آشوری (بابل اور شام کی مفقود زبانیں) عبرانی، ڈراوڑی، ابے

سینوی، عربی اور سمیری زبانیں شامل بتائی جاتی ہیں۔

(2) ہند چینی : اس میں سیامی کی سات، تبتی کی تئیس اور برمی کی چھبیس شاخیں شامل ہیں۔ ان میں چینی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

(3) حامی : اس میں قدیم مصری، قبطی، بربری، ایتھوپی زبانیں شامل ہیں۔

(4) منگولی : اس میں یورالی، فنی، ترکی، ارگنگی، لیپی، مانچودی، میگاری وغیرہ زبانیں شامل ہیں۔

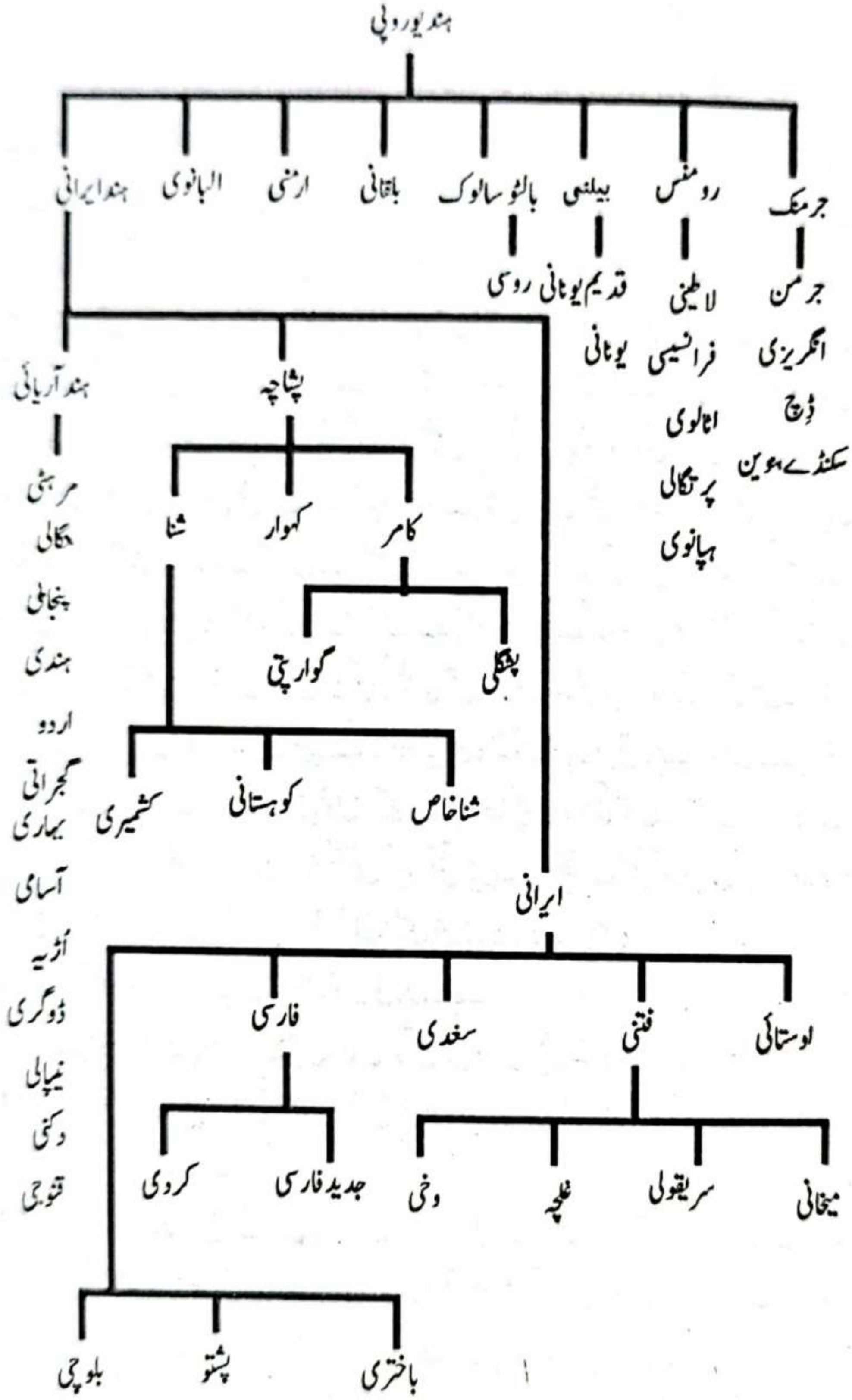
(5) بانتو : یہ براعظم افریقہ میں بولی جاتی ہیں۔ ان کی ایک سو پچاس شاخیں بتائی جاتی ہیں۔

(6) امریکی : امریکہ کے اصلی باشندوں کی زبان ہے۔

(7) ملاوی : یہ زبانیں ملایا اور متصل علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔

(8) ہندو یوروپی : زبانوں کے تمام خاندانوں میں ہندو یوروپی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں دنیا کی بڑی بڑی اور ترقی یافتہ زبانیں شامل ہیں۔ زبانوں کے درج ذیل سلسلوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہند یوروپی کتنی اہم زبانوں کی ماں ہے :-

ہند یوروپی شجرہ



آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، یورپ اور ایشیا کی بیشتر زبانیں ہند و یوروپی سے نکلی ہیں۔ اور ان براعظموں میں بسنے والے کروڑوں انسان اس کی شاخیں بولتے ہیں۔ ان شاخوں میں واضح قربتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ کسی دور میں ایک ماخذ سے منسلک تھیں۔ اسی دور میں نسلوں کا ایک خاص جتھا ایک زبان بولتا تھا۔ وہ جتھا مخصوص دائروں میں رہتا تھا۔ جہاں ایک جیسے جغرافیائی عوامل کار فرما تھے۔ ان دائروں میں رہنے والے ایک ہی قسم کے جذبات، آداب، تہذیب و تمدن رکھتے اور ان میں کم سے کم دوریاں ہوتیں۔ نسلی اعتبار سے وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے۔ لیکن وہ ان دائروں سے ہٹ کر رہنے والے لوگوں سے بہت سے امور میں یقینی تفاوت رکھتے۔ اگر ان دائروں میں ایک جگہ ہند و یوروپی بولی جاتی اور دوسری جگہ بانتو کی کوئی شاخ بولی جاتی۔ اگر ایک دائرہ میں زیادہ گرمی کے باعث محض ایک لنگوٹی پہنی جاتی اور جسم ننگا رکھا جاتا تو دوسری جگہ گرم پوستین، اونی اور جانوروں کی کھال یا بالوں کا لباس پہنا جاتا۔ غرض واضح فرق کے آثار نمایاں ہوتے لیکن یہاں اگلی منزلیں پھر یکجا ہو کر ایک ماخذ پر جا دم لیتیں۔ یہ بات بھی سچ ہے محض زبان کے ایک ہونے کی بنا پر کسی خاص نسل سے وابستگی کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ زبانوں کے چھوٹے بڑے گروہ کسی مرکزی طاقتور زبان میں گم ہو جاتے ہیں اور اس طرح اُن کی نسلیں بھی طاقتور جاری زبان بولنے لگتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود زبان ایک بنیادی وسیلہ ہے۔ اور یہ ان ماخذوں کا پتہ دیتی ہے۔ جہاں سے یہ نکل کر حال تک پہنچی ہے۔ مختلف زبانوں کے بنیادی ڈھانچوں، سابقوں لاحقوں، اصوات، ذخیرہ ہائے الفاظ وغیرہ میں جو مشابہتیں نظر آتی ہیں۔ وہ مختلف نسلی گروپوں کی شناخت کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ ہند یوروپی ایک ایسی ہی زبان ہے۔ جس نے بہت سی زبانوں اور بولیوں کو جنم دیا اور یہ کہ یہ ان تمام زبانوں کی ماں ہے۔

آگے جو مباحث بیان ہوئے ہیں ان کی روشنی میں درج ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

1. دنیا کی تمام نسلیں حضرت نوحؑ کی اولاد سے چل نکلی ہیں۔ اس لئے وہ آدمِ ثانی کہلاتے ہیں۔
2. حضرت نوحؑ کے تین بیٹے یافث، سام اور حام تھے۔ یہ تینوں رنگ و روپ، قد کاٹھ، جسمانی ساخت کے لحاظ سے قریبی مماثلتیں رکھتے تھے۔ یہ ایک ہی زبان بولتے تھے۔ اور اپنی حرکات و سکنات سے اپنا مدعا دوسروں تک پہنچاتے تھے۔
3. یافث سے یورپ اور ایشیا میں بسنے والی سینکڑوں نسلیں پروان چڑھیں۔

4. عرب، شام، مصر اور مشرق وسطیٰ کی کئی اہم نسلیں سام سے چل نکلیں۔
5. بیشتر افریقین اور کچھ کچھ امریکن قومیں حام کی ذریات ہیں۔
6. یافث، سام، حام کی اولاد میں جو امتیازات بعد میں رونما ہوئے وہ محض موسمی کیفیات، رسا یا نارسا ماحول، وسائل کی دستیابی یا کم یابی اور مقامی دوریوں کے نتیجے کے طور پر ظہور میں آئے۔
7. زبانیں نسلی قربتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ اگر زبانوں کے ماخذوں اور منابع کی طرف رجوع کیا جائے تو ہم اس مقام پر جا کر دم لیں گے جہاں یہ زبان ایک قوم کے افراد کسی دائرے میں بولتے ہونگے۔
8. طوفانِ نوحؑ کے بعد نوحؑ کے تین بیٹے یافث، سام اور حام کشتی میں سوار ہونے کے باعث طوفان کی تباہ کاریوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

یہ بات یاد رہے کہ بعض کا خیال ہے کہ طوفانِ نوحؑ محض اس جگہ آیا تھا جہاں قومِ نوح آباد تھی۔ اور ساری دنیا اس کی لپیٹ میں نہ آئی تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ طوفان دجلہ و فرات کی زمینوں میں آیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ طوفانِ نوح کا مرکز برصغیر پاک و ہند میں تھا۔ اور یہاں سے طوفانی ریلے ارد گرد پھیلے۔ ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ایک عالمگیر نوعیت کا طوفان زمین کے ایک بڑے حصے میں آیا جہاں آبادیاں تھیں۔ اور وہ حضرت نوحؑ کے احکام کی حکم عدولی کی مرتکب ہوئی تھیں۔ شمالی علاقہ جات کے اونچے سلسلہ ہائے کوہ یعنی کوہ قراقرم کوہ ہندوکش وار نانگا پربت کی چٹانیں اور سلاسل اس بات کی مظہر ہیں کہ کسی دور میں انہوں نے پانی میں ڈوبے رہنے کا مزہ چکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر طوفانی ریلوں کے نقوش ثبت ہیں۔

اس سلسلے میں رگ وید کی ایک کہانی یوں بڑھتی ہے کہ ایک مچھلی نے آریوں کے جدِ اعلیٰ منو کو یہ خبر دی کہ ایک سیلِ بادِ باراں آنے والا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے کشتی بنالی جائے۔ چنانچہ کشتی بنالی گئی۔ اور طوفان بھی آن پہنچا۔ منو کی کشتی ہمالہ کی بلندیوں کے اوپر تیرتی رہی اور پھر سیلاب کے اترنے پر کشتی بھی ہندوستان کے میدان میں اتری۔ یہیں منو کی اولاد پیدا ہوئی۔ یہ کہانی عرب اور اسرائیلی روایات سے لگا کھاتی ہے۔ جس کے مطابق جیسا کہ پہلے بیان ہوا حضرت نوحؑ نے طوفان کا سامنا کیا۔ اس کی کشتی کوہ جودی پر آلگی تھی۔ حضرت نوحؑ طوفان تھمنے پر بابل تشریف لائے۔ اور پھر وہیں سے ان کی نسل پھلی پھولی۔

اس طرح چینی روایات میں مذکور ہے کہ شہنشاہ یاہو کے زمانے میں ایک بڑا سیلاب آیا تھا۔ کہ جس میں پہاڑ بھی ڈوب گئے تھے۔ اور چین کی ساری زمین اس سیلابی ریلے کی نذر ہو گئی تھی۔ یونان کی تاریخ میں بھی دو بڑے سیلابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اور اسی طرح دنیا کی اور اقوام کی تاریخ بھی بڑے بڑے سیلابوں کی کہانیوں سے خالی نہیں۔

سام، حام اور یافث کی ذریآت کے حوالوں سے کئی مباحث ملتے ہیں۔ بعض نے اہل فارس کو بھی سام بن نوحؑ کی اولاد سے منسوب کیا ہے۔ ابنِ خلدون ان اہل انساب کی تحقیقات کا یوں تذکرہ کرتے ہیں:

"محققین اہل انساب اس امر کے قائل ہیں کہ اہل فارس بن سام بن نوح کی اولاد ہیں۔" یوں محققین کے کئی تجزیئے سامنے آتے ہیں۔

1۔ اہل فارس کا جداعلیٰ فرس ہے۔ اور وہ ایران بن اشوذ بن سام بن نوح کی اولاد ہے۔

2۔ بعض اہل فارس کو ایران بن ایران بن اشوذ بن سام سے جوڑتے ہیں۔

3۔ بعض لاوذ بن ارم بن سام سے سلسلے ملاتے ہیں۔

4۔ بعض یوسفؑ بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ سے نسلی رابطے دِکھاتے ہیں۔ تاہم بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ صرف ساسانیوں کا سلسلہ اس شجرہ تک جاتا ہے۔

5۔ فارسی (پارسی، ایرانی) فارس بن یاسور بن سام سے منسلک ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ بعض محققین انساب کہتے ہیں کہ اہلِ فارس یافث کی ہی اولاد ہیں۔

.1 اس سلسلہ میں اسرائیلین کہتے ہیں کہ اہل فارس طیراش بن یافث کی ذریات ہیں۔

.2 بعض علماء فارس کہتے ہیں کہ کیومرث کومر بن یافث بن نوحؑ کی اولاد ہیں۔

.3 بعض اہلِ انساب کا خیال ہے کہ اہل فارس۔ فارس بن برس بن یاسور بن سام کی نسل ہیں۔

.4 بعض اور محققین انساب کیومرث کو اہل فارس کا جداعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ ان سے ملوک فارس کے چار طبقہ ہائے حکمران ہوئے۔

1۔ بیشدادیہ

2۔ کیانیہ

3۔ اشکانیہ

4۔ ساسانیہ

ان کا زمانہ کیومرث سے یزد جرد تک پھیلتا جاتا ہے۔ اور یزد جرد کی وفات کے ساتھ اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ یہ یافث کی اولاد میں سے ہیں۔

اہلِ فارس کے بعد بعض روایات میں ہندوستانی اور سندھی اقوام کو بھی سام بن نوح کی اولاد میں سے قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ابنِ عباس فرماتے ہیں کہ عرب، ایرانی، نبطی، ہندوستانی، وسندھی اور نبدی بھی سام بن نوح کی اولاد ہیں۔ ایک اور روایت محمد بن اسائب کی ہے جس کے مطابق ہندوستانی وسندھی نبدی یوفر بن یقطن بن عابر بن ارفخشد بن سام بن نوح کے سلسلہ ذریات میں سے ہیں۔ نبد کے بیٹے کا نام مکران بتایا جاتا ہے۔

اس طرح تاریخ پشتون از قاضی عطاء اللہ خان میں مندرج ہے۔ کہ پشتون سامی النسل ہیں۔ اور ان کا سلسلہ قیس بن عبدالرشید تک جاتا ہے۔ قیس بن عبدالرشید حضرت خالد کے داماد تھے۔

تاریخ خورشید جہان کے حوالوں سے سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل اپنی کتاب "پشتون تاریخ کے آئینے میں" میں لکھتے ہیں: "یہی مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ پشتو عبرانی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ حضرت سلیمانؑ آصف اور افغانہ سے اپنے درباریوں اور عام لوگوں کی موجودگی میں راز کی باتیں اِسی زبان میں کرتے ہیں اور یہ زبان افغانہ ایجاد کی تھی۔ اس طرح یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک دِن حضور ﷺ نے فرمایا کہ دوزخ میں دوزخی آپس میں پشتو بولیں گے۔ اور جب یہ بات حضرت خالد کو معلوم ہوئی تو بہت رنجیدہ ہوئے۔ اور حضور کے پاس حاضر ہونا چھوڑ دیا۔ جب حضورؐ کو حضرت خالدؓ کی کشیدگی کا علم ہوا تو آپ نے حضرت خالدؓ سے پشتو میں فرمایا کہ "خالدہ! غشے آؤ یندہ راوڑہ" جس وقت حضرت خالدؓ نے حضور کی زبانِ مبارک سے پشتو کا جملہ سن لیا تو ان کی یہ تشویش رفع ہو گئی۔" اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ پشتون بھی سامی النسل ہیں۔ اور ان کا جد اعلیٰ قیس بن عبدالرشید ہیں۔ جن کا نسلی سلسلہ حضرت یعقوبؑ سے جاملتا ہے۔

سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل اس نظریہ پر تفصیلی مباحث پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ "اوپر دی ہوئی معروضات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ نظریہ اپنی موجودہ شکل میں نہ تو تورات کی شہادتوں سے میل کھاتا ہے۔ اور نہ اسلامی تاریخ سے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بالکل سنی سنائی اور موضوعی روایات پر مبنی ہے۔ یہ روایات تیرھویں صدی میں وضع ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ محض روایات تاریخی واقعات کی جگہ نہیں لے سکتے۔ یہ نظریہ کیسے وضع ہوا

اور کیونکر وضع ہوا، اس حوالے سے فاضل مولف لکھتے ہیں۔ "مغل اور ایرانی دونوں اپنے وقت کی استعماری طاقتیں رہی ہیں۔ اور پشتون اپنے جغرافیائی محل وقوع کے باعث ان دونوں استعماری طاقتوں کے بیچ میں گھرے ہوئے تھے۔ پشتون ایک ایسی بدنصیب قوم ہے کہ جس کو اپنی آزادی پسند طبیعت اور اپنی آزادی کی حفاظت کے جرم میں تاریخ کے ہر دور میں استعماری طاقتوں کی طرف سے نازیبا اور ناموزوں الفاظ میں یاد کیا جاتا رہا ہے۔ پشتونوں کی قومی تضحیک اور تذلیل میں ایرانی بھی مغلوں کے ہمسر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ پشتونوں کے اعلیٰ کارناموں میں عیب نکالے گئے۔ ان کے حسب نسب کے بارے میں بھی مغلوں کے درباری مورخوں نے بے سروپا افسانے وضع کیے۔ اور انہیں شہرت دی۔ یہ صورت حال پشتونوں کے لئے گمبیھر تھی۔ اُن کو حقیر بنانے اور ان کی اعلیٰ شہرت کو داغدار بنانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ اس پس منظر میں پشتون انتہائی نالاں تھے۔ وہ اپنی خاندانی وجاہت اور دبدبے کو گرتے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اس حوالے سے بہادر شاہ کاکا خیل لکھتے ہیں۔ "چنانچہ پشتونوں کے بڑوں اور سربراہوں نے اس تحریک کے دفعیے کے لئے پشتونوں کی اصل نسل کے مسئلے کی طرف توجہ دی۔ اور خان جہان لودھی کی سرپرستی میں نعمت اللہ ہروی سے مخزن افغانی کے نام سے ایک تاریخ لکھوائی۔ اور اس میں یہ نظریہ پہلی دفعہ پیش کیا اور یہی کتاب بعد کے مورخوں کا سب سے بڑا ماخذ بنی۔" فاضل مصنف لکھتے ہیں سامی شجرہ سے رابطے کے لئے خان جہاں لودھی نے اپنے چند امراء یعنی قطب خان، سرمت خان لبدالی، ہمزہ خان، عمر خان کاکڑ، ظریف خان یوسف زئی کو افغانستان بھیجا۔ اور یہ سند حاصل کرنے کی کوشش کی کہ افغان بنی اسرائیل ہیں۔ اور جن کا سلسلہ نسب یہود ابن یعقوب سے آگے سام ابن نوح تک جو یافث کا بڑا بھائی ہے پہنچتا ہے۔ اور یافث مغل قوم کا مورث اعلیٰ ہے۔"

فاضل مصنف اس امر کی توضیح کے لئے کہ پشتونوں نے اپنی نسل بنی اسرائیل سے کیوں ملائی درج ذیل وجوہات پیش کرتے ہیں۔

1۔ پشتون بھی بنی اسرائیل کی طرح اپنی نسل پر گھمنڈ کرتے ہیں۔ پشتون قوم کا ہر فرد غیر پشتون کے مقابلے میں اپنے آپ کو ممتاز سمجھتا ہے۔

2۔ اس زمانے میں بلکہ اس سے بہت پہلے بھی تورات کا یہ نظریہ لوگوں میں مقبول تھا کہ تمام انسان حضرت نوح کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث کی اولاد ہیں۔ اور سام کو اپنے دوسرے بھائیوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اس لئے سام کی اولاد کو بھی

دوسرے بھائیوں کی اولاد پر فضیلت حاصل ہوئی۔

3۔ یہ نظریہ ہند میں وضع ہوا۔ اور اس وقت ہند میں پشتونوں کے علاوہ قابلِ ذکر قومیں یا مغل تھے یا ہندو۔ مغل حکمران قوم تھی اور یافث کی اولاد تھی۔ اس لئے مغلوں کے ساتھ نسلی اشتراک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رہے ہندو تو وہ حام کی اولاد مانے جاتے تھے۔

4۔ ایرانیوں کے ساتھ نسلی اشتراک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ اس زمانے میں آج کل کی طرح انسانی نسل کی تقسیم و اشتراک علم انسان شناسی کے اصول پر مبنی تھا۔ بنابریں پشتونوں کی نسلی افتخار کے جذبے کی تسکین بنی اسرائیل کے ساتھ نسلی اشتراک ہی ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یہ نظریہ وضع کر لیا۔"

اِدھر مرزائیوں نے بھی موضوعی روایات کو آگے بڑھایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کشمیری اور افغان اسرائیلی نسل سے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے دس گمشدہ قبائل افغانستان اور کشمیر میں آکر آباد ہوئے تھے۔ اور ان ہی سے پشتونوں اور کشمیری نسلیں چلی ہیں۔ اس سلسلے میں خواجہ نذیر احمد جیجس ان ہیون آن ارتھ میں اِدھر اُدھر کے واقعات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "کہ اس بات کے قوی امکانات موجود ہیں کہ دس گمشدہ قبائل کی نسل کے لوگ افغانستان، کاشغر، بخارا، سمرقند، خراسان، کوہ کند اور تبت نیز مغربی چین و ہندوستان، شمالی پاکستان اور کشمیر میں پائے جانے چاہئیں۔"

"حضرت مسیح کشمیر میں فوت ہوئے" کتاب میں دو کتابوں کے حوالے سے (تاریخ کشمیر از ملا قادری اور وقایہ کشمیر از ملا احمد) لکھا گیا ہے: "کہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ کشمیری بنی اسرائیل کی نسل سے ہیں" اس طرح عبدالقادر بن قاضی القضاۃ واصل علی خان اپنی کتاب "حشمت کشمیر" میں یہی بات لکھتے ہیں۔ پھر آگے چل کر فاضل مصنف لکھتے ہیں۔ "مندرجہ بالا کتب کے علاوہ بے شمار کتب ہیں جو اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ افغان اور کشمیری اسرائیلی نسل سے ہیں۔ تاہم خواجہ نذیر احمد کی کتاب میں سب سے حتمی ثبوت وہ جامع فہرست ہے جس میں انہوں نے ان قبائل، ذات اور مقامات کے نام اکٹھے کر دیئے ہیں۔ جو کشمیر اور گردنواح کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور جن سے ملتے جلتے بائبل میں بھی موجود ہیں۔" اس کے بعد فاضل مصنف نے ان قبائل، ذات اور مقامات کے ناموں کی

فہرست دی ہے جو بائبل میں ہیں۔ اور جو افغانستان اور کشمیر میں ملتے ہیں۔

جن موضوعی روایات کا اوپر تذکرہ کیا گیا اور جن کی بنیاد پر مختلف نسلی رابطے استوار ہوئے، ان کو جب سائنٹفک تحقیقات کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو معاملات کچھ اور رنگ اختیار کرتے ہیں۔ انسان نے آج تمام دنیاوی علوم میں بڑی دسترس حاصل کی ہے۔ تحقیق کے سائنٹفک طریقے وضع ہوئے ہیں۔ اور ان وسیلوں سے کام لے کر علوم ارضیات، بشریات، نسلیات، لسانیات وغیرہ پر بڑا کام کیا گیا ہے۔ ہر شعبہ میں تحقیق نے قدم جمائے ہیں۔ اور نئے نئے راستے تلاش کیے ہیں۔ جن پر چل کر حقائق تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔ تحقیق کے نتیجہ میں آج ہم ماضی بعید کی بہت سی حقیقتیں جان چکے ہیں۔ ہم قیاسات اور امکانات کے حدود سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ مثلاً 1928ء میں پہلے ہم یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ پاکستان کی سر زمین میں کسی دور میں بابل اور مصر کی تہذیب کے ہم پلہ کوئی تہذیب پروان چڑھی ہو۔ رشید اختر ندوی اپنی کتاب "ارض پاکستان کی تاریخ" میں لکھتے ہیں کہ "فاضل ونسٹ سمتھ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ 1908ء تک کے انکشافات نے علمائے تاریخ کو اس قابل کر دیا ہے کہ وہ اس ملک کی تاریخ نئی بنیادوں پر مرتب کر سکتے ہیں۔ مسٹر سمتھ نے یہ بات آج سے کوئی پچاس باون سال پہلے کہی تھی۔ اس وقت ماہرین آثارِ قدیمہ نے مغربی پاکستان کے مختلف مقامات کھود کر وہ عجیب و غریب حقائق بے نقاب نہیں کیے تھے جن کے سبب پاکستان کی تاریخ سکندر مقدونی کے حملہ سے تین ہزار سال قبل تک پتھروں ایسی ٹھوس حقیقت کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اور ہم حتماً اپنے ماضی قریب ہی کے باب میں نہیں ماضی بعید سے متعلق بھی بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔"

آج علم عتقیات نے بڑی ترقی کی ہے۔ ان علوم کے ماہرین زمین کی عمر، قبور، آثارِ قدیمہ، مدفون اشیاء، انسانی ڈھانچوں، اور متعلقہ مٹیریل کے جائزوں سے ٹھوس نتائج نکالنے میں کامران ہوئے ہیں۔ کہ زمین کی عمر کتنی ہے؟ قدیم تہذیبوں کے مابین مماثلت کی بنیادیں کیا تھیں؟ زمین کن کن تبدیلیوں سے گزری؟ مختلف انسانی نسلوں کی پہچان کے لئے طبعی خواص کیا مدد فراہم کرتے ہیں؟ وغیرہم۔ اس سلسلے میں علوم السنہ کی سائنس نے بھی اپنے لئے ایک مضبوط مقام بنالیا ہے۔ ان علوم کے ماہرین یہ بات وثوق سے بتا سکتے ہیں کہ زبانیں کیسے بنیں؟ مختلف زبانوں میں باہمی ربط کیسا ہے؟ زبانوں کے خاندان کن بنیادوں پر قائم کئے گئے ہیں؟ زبان اور نسل کے باہمی رشتے کیا ہیں؟

ان تحقیقات کے نتیجے میں ہند یوروپی گھرانے کی زبانیں دریافت ہوئیں۔ ان کا پیچھا کیا گیا۔ اور اُن مراکز کا کھوج لگایا گیا۔ جہاں ان زبانوں کے خاندان پروان چڑھے۔ صاف ظاہر ہے کہ زبانوں کے خاندان کسی ایک ماخذ ایک مرکز اور ایک نسلی گروپ سے نکلے۔ یہ بات یاد رہے کہ نسلوں کے چھوٹے گروپ بڑے بڑے گروپوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح زبانوں کے چھوٹے گروپ وسیع بڑے اور منظم گروپوں میں شامل ہو کر اپنی شناخت کھو دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہند یوروپی مرکز سے نکل کر ہند یوروپی بولنے والے بڑے بڑے گروپ مختلف اطراف و جوانب کئی طرف رواں دواں ہوئے۔ بر صغیر ہندوپاک، آرمنیا، انگلستان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، بلقان، فرانس، پرتگال، ایران، سپین، جرمنی، یونان، روم پہنچنے والے نسلی گروپ ہند یوروپی بولتے گئے اور آج یہاں بولنے والی ساری زبانیں بنیادی طور پر ہند یوروپی کی اولاد تسلیم کی جا چکی ہیں۔ اسی ہند یوروپی کی بیٹی ہند ایرانی تھی اور ایران اور بر صغیر ہندوپاکستان میں بولی جانے لگی۔ اور اسی کی اولاد یہاں پھلی پھولی۔ تحقیق کے اصولوں پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو بیٹیاں ہند آریائی اور پشاچہ پورے بر صغیر پر چھا گئیں۔ بر صغیر ہندوپاکستان میں ڈراویڈی اور ہند آریائی زبانیں عرصے سے ایک ساتھ بولی جاتی رہی ہیں۔ لیکن واضح طور پر ان میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ اور اسی فرق کی وجہ سے ہند آریائی، پشاچہ اور ڈراویڈی زبانیں بولنے والی نسلوں میں بھی فرق موجود ہے۔ ڈراویڈی زبانیں سامی زبانوں میں شامل کی جاتی ہیں۔ اور اسی بنیاد پر خیال کیا جاتا ہے کہ ڈراویڈ اقوام سامی اقوام کے زیادہ قریب ہیں۔ ان نتائج کی بنیاد پر جب ہم نسلی معاملات پر غور کرتے ہیں تو یہ ثابت کرنا آسان نہیں رہتا کہ پشتو سامی الاصل زبان ہے۔ اور پختون یا افغان سامی النسل۔ اسی طرح سندھیوں، ہندوستانیوں، ایرانیوں، یعنی ہند ایرانی بولنے والی نسلوں کا سامی نسلوں کے ساتھ لسانیات کے بل بوتے پر کوئی رشتہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک مرزائیوں کا موضوعی روایات کی بنا پر اصرار کہ کشمیری یا افغانی یہودی النسل ہیں۔ کوئی وزن نہیں رکھتا۔ مقامات قبائل اور ذاتوں کے حوالے سے جو نام دیئے گئے ہیں۔ وہ بھی دور کی کوڑی لانے والی بات دِکھائی دیتی ہے۔ یہ موضوعی روایات کی سائنٹفک ریسرچ کا حصہ نہیں۔ بائبل جیسی مقدس کتاب میں ان علاقوں سے وابستہ چھوٹے چھوٹے مقامات کا تذکرہ بے ربط لگتا ہے۔ نیز یہ نام ہو بہو ایسے بھی نہیں۔ محض فرض کئے گئے ہیں۔ مثلاً استور کو عتارات، لداخ کو لعدہ، منات (سکردو) کو منبت، وغیرہ فرض کئے گئے ہیں۔

بعض نام حقیقتاً ہے ہی نہیں۔ اور بعض مشابہہ بھی نہیں۔ پھر بائبل میں لداخ، گلگت، بلتستان، دیامر اور افغانستان کے چھوٹے چھوٹے مقامات کے ناموں کا ذکر کوئی جواز نہیں رکھتا۔ اسلام کے آنے کے بعد اس طرف کے لوگوں نے محض عقیدت کی بنا پر موسیٰؑ، عیسیٰؑ، ہارونؑ، سلیمانؑ، یوسفؑ، یعقوبؑ، اسحاقؑ وغیرہ نام رکھے۔

دنیا کے تمام مورخین، محققین اور عملائے علوم بشریات اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم خالص ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ سب یہی کہتے ہیں کہ مختلف نسلیں باہم و گر خلط ملط ہوئی ہیں۔ یورپین اقوام ہوں یا ایشیائی، افریقی ہوں یا عربی، امریکی ہوں یا حبشی، مختلف وجوہات کی بنا پر ایک دوسرے میں مدغم ہوئی ہیں۔ قلیل اور کثیر کی جنگ رہی ہے۔ اور عموماً ایسا ہوا ہے کہ قلیل قومیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادیت اور شناخت قائم نہ کر سکے ہیں۔ اور کثرت میں کھوگئے ہیں۔ اس سلسلے میں بہادر شاہ ظفر کاکاخیل "پشتون تاریخ کے آئینے میں" میں لکھتے ہیں کہ "لیکن یہ حال اکیلے پشتونوں کا ہی نہیں ہے۔ تمام یوروپی اور ایشیائی قوموں کی نسلیں بھی خلط ملط ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ آج روئے زمین پر ایک قوم ایسی نہیں ہے۔ جس کی نسل خالص رہی ہو۔ اور نہ ہی اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم کی نسل میں ان لوگوں کی نسل آمیزش ہوئی ہے۔ جن کے ساتھ ان کا زیادہ عرصے تک گہرا تعلق رہا ہو۔" آگے چل کر پھر لکھتے ہیں۔ "یہی حال عرب قوم کا بھی ہے۔ عرب اگرچہ وسیع معنوں میں متحد الاصل اور سامی النسل ہیں۔ لیکن ان میں مختلف اقوام کی آمیزش اور اختلاط ہوا ہے۔ جیسے فینقی، بربری، ترک، عبرانی، یونانی اور رومی قومیں عربوں میں غلط ملط ہوئی ہیں۔ لیکن اختلاط اور آمیزش کے باوجود ایک قوم اپنی اسی نام سے یاد کی جائے گی۔ جس نسل کا حصہ اس میں غالب ہوگا۔ اس بنا پر ہمارے خیال میں پشتون آریا النسل ہیں۔"

اب آخر میں اولاد نوحؑ کے حوالے سے بحث سمیٹ لی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اہل فارس بشمول کیانیہ، ساسانیہ، یافث بن نوح کی اولاد ہیں۔ یونانی بشمول سکندرِ اعظم یونان بن یافث بن نوحؑ کی ذریات ہیں۔ اہلِ رومہ بھی نسباً یونان میں جا ملتے ہیں۔ ابن خلدون تاریخ ابن خلدون میں لکھتے ہیں۔ "اہلِ رومہ کا گروہ عالم کے مشہور ترین گروہوں میں سے ہے۔ یہ خیال بروشیوش غریقوں کا دوسرا فرقہ ہے۔ اور یہ دونوں نسلاً یونان میں مجتمع ہیں۔ اور یہ خیال بہیقی یہ غریقوں کا تیسرا گروہ ہے۔ اور یہ تینوں نسلاً یونان بن علجان بن یافث میں شریک ہیں۔

اور روم کے نام سے یہ تمام فرقے موسوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں رومیوں ہی کی بڑی سلطنت ہوئی ہے۔"

یہ سب ہندیوروپی بولتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ایک نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اور یہ نسل آریا کے نام سے معروف تھی۔ اسی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ہندیوروپی بولنے والی نسلیں آرین تھیں۔

ابن خلدون اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ "یونانیوں کے دو شعبے ہیں۔ ایک غریقی اور ایک لاطینی، ان لوگوں نے اپنے رہنے کے لئے اپنے تمام برادران بنی یافث مثلاً صقالیہ، ترک، افرنجہ وغیرہ کے ساتھ معمورۂ عالم میں شمالی جانب کو اختیار کر لیا۔ اور اس کے وسط میں جزیرہ اندلس اور بلد ترک درمیان مشرق میں طولاً اور بحر محیط اور بحر رومی کے درمیان عرضاً قابض ہوگئے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ صقالیہ اور ترک بھی یافث کی اولاد ہیں۔ ترک اور یونان دونوں یافث کی اولاد ہیں۔ واضح طور پر وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ترک، منگول آریا وغیرہ یافث بن نوح کی اولاد ہیں۔

باب۔3

منگول

شمالی میدان اعظم، وسط ایشیاء، دشت ایشیا، ایشیائے اعلیٰ، تاتار اعظم وغیرہ تمام نام قدیم ادوار میں ایک ایسی سرزمین کی نشاندہی کرتے تھے جسکی سرحدیں شمالی ہمالیائی خط ٹنڈارا سے شروع ہو کر جنوب میں سطح مرتفع تبت سے وابستہ ہمالیائی سلسلوں کو چھوتی تھیں۔ اور مشرق میں کوہستان خنجان سے شروع ہو کر مغرب میں کوہ یورال تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی سرزمین میں برف زار بھی تھے، چٹیل صحرا، بنجر زمینیں، لمبی گھاس کی چراگاہیں، زرخیز زمینیں، دریا، سطح مرتفع، پہاڑی سلسلے، گنجان جنگل بھی غرض یہاں عجیب گوناگونی تھی۔ ابتدائی ادوار میں یہاں زندگی شدائد سے دوچار تھی۔ زندہ رہنے کیلئے ہر قسم کے پاپڑ بیلنے پڑتے۔ موسمی شدائد جنگ و جدل، رہائش اور خوراک کے مسائل نے انسانوں کو گھیر رکھا تھا۔ یہاں لوگ قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ گزربسر کا بڑا ذریعہ ان کے پالتو اور جنگلی جانور ہوتے جنکا شکار کر کے یہ اپنا پیٹ پالتے۔ گھوڑا، آہو، بھیڑ، رینڈئر وغیرہ نیز موسمی شدائد سے بچنے کے لئے مارے مارے پھرتے۔ سینگوں، لوہے، لکڑی اور پتھروں سے ہتھیار بناتے، جانوروں کے چمڑوں، اون اور بالوں سے خیمے اور اپنا لباس تیار کرتے۔ چونکہ یہ بڑے بڑے گروہوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے، کبھی اپنے ہی قبیلوں سے جدا ہوتے، کبھی دوسرے طاقتور قبیلوں میں مدغم ہو جاتے۔ اور کبھی بڑے بڑے قبیلے چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹ کر اِدھر اُدھر ہو جاتے اور اپنی شناخت سے محروم ہو جاتے۔ وہ ایک طرح کی جانوروں کی زندگی گزارتے تھے۔ انہیں اپنے خاندانی رشتوں کا پتہ نہ تھا۔ کوئی یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں پیدا ہوا۔ اور اس کا باپ کون تھا۔ قوموں کے خروج میں حادثات ہی حادثات تھے۔ طاقتور قبائل جب کمزور قبائل کو مطیع کرتے تو ان کا سب کچھ ہتھیا لیتے۔ نسلی اور لسانی ادغام کے سلسلے چل نکلتے اور مختلف معاشرے وجود میں آتے۔

اسی میدان اعظم میں کسی دور میں عظیم ترکستان بھی بسا ہوا تھا۔ یہ مغرب میں

بحیرۂ خزر سے کوہستان الطائی تک، شمال میں یورال کے پہاڑوں اور سائبیریا کے میدانوں سے جنوب میں خراسان تک پچاس لاکھ مربع کلو میٹر علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ تب یہ دو واضح حصوں مغربی ترکستان اور مشرقی ترکستان کی صورت میں بٹا ہوا تھا۔ مشرقی ترکستان کا رقبہ اٹھارہ لاکھ مربع کلو میٹر سے زیادہ تھا۔ یہاں ترکوں اور مغلوں کی دبدبے کی حکومتیں قائم تھیں۔ سویٹ یونین کے سقوط کے بعد وسط ایشیا کی پانچ اسلامی ریاستیں قازقستان، ترکمانیستان، ازبکستان، کرغزستان اور تاجکستان آزادی سے ہم کنار ہو کر ماضی کی شان و شوکت کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ ٹرانس کاکیشیا (ماروائے قفقاز) میں آذربائیجان بھی آزاد ہو چکا ہے۔ جبکہ قفقاز میں داغستان، چیچنیا اور ایدل (والگا) اورال میں باشکریہ، تاتاریہ وغیرہ ایسے مسلم علاقے ہیں جو اب بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جب ہم ماضی میں لوٹ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں نسل انسانی کی ابتدائی تین اہم گہواروں کا پتہ چلتا ہے۔ پہلا افریقہ کا میدانِ اعظم، دوسرا جنوب مغربی ایشیائی میدان اور تیسرا وسطی اور شمالی میدان اعظم جہاں سے انسانی نسلوں نے چاروں طرف خروج کیا۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اہم انسانی مراکز تھے کہ جن کے اثرات نے تمام دنیا کو متاثر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ برفانی دور کے خاتمے کے قریبی ادوار میں جنوب مغربی ایشیائی میدان سے انسانی جمعیتیں بحیرہ کیسپئین کے جنوب کی طرف سے گزر کر شمال مشرق میں سائبیریا کی چراگاہوں تک پہنچیں اور پھر ایلاسکا سے ہوتی ہوئیں شمالی امریکہ کی سرزمین میں ورود کیا۔ اور وہیں رہنے بسنے لگیں۔ تاہم ان کے کئی بھائی بند نقل مکانی کرتے ہوئے اِدھر اُدھر بھٹک بھی گئے۔ یا مختلف راہ گزار پر آباد ہوئے۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر شمالی میدان اعظم ہے جس میں سائبیریا کا جنوبی حصہ، ترکستان اور وسطی روس کے علاقے شامل تھے۔ یہاں سے مختلف ادوار میں مختلف اقوام نے ارد گرد نقل مکانی کی۔ اگر اس علاقے کو اقوام عالم کا مسکن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں ہُن، آریا، سیتھین، یوچی، ترک، مغل، منچوری، گاتھ، اوئیغوری، ٹیوٹانی اور کئی اقوام کی بود و باش کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اقوام انتہائی جفاکش، سخت جان، موسمی شدائد سے نبرد آزما رہنے والے، جنگجو اور خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ دو ہزار سے تین ہزار ق م کے قریب زمانے میں جبکہ ارد گرد متمدن تہذیبیں بھی پروان چڑھ رہی تھیں۔ مثلاً مصری تہذیب، چینی تہذیب، بابل ننوا کی تہذیب، شمالی میدان اعظم، میں جنگجو خانہ بدوش سوار، زرخیز زمینوں اور

چراگاہوں کی تلاش میں جنگ و جدل میں بر سر پیکار تھے۔ اس زمانے میں جھیل بیکال کے جنوب مشرق میں زرخیز اور لمبی گھاس کی زمینیں تھیں۔ یہی علاقہ فساد کی جڑ تھا۔ طاقتور جتھے اس علاقے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے اور یوں اس طرح متعدد لڑائیاں لڑی گئیں۔ ہزیمت اٹھانے والی قومیں جہاں سینگ سماتے بھاگ نکلتیں۔ یہاں سے باہر نکلنے کے لئے آسان تر دو ہی راستے تھے۔ جنوب میں چین کی طرف اور مغرب میں وسط ایشیاء کے میدانوں کی طرف۔ اور یہی وجہ ہے کہ وحشی اقوام نے ان راہ گزاروں پر توجہ دی۔ مشرق سے مغرب کی طرف اور مغرب سے مشرق کی طرف جو بھی حرکت ہوئی وہ ان راستوں پر دکھائی دیتی ہے۔ یہ سڑک ایک طرح سے وحشتوں کی شاہراہ تھی۔

اس شاہراہ پر پہلے پہلے جس قوم نے اپنے نقوش ثبت کیے وہ ہُن قوم کے نام سے موسوم ہوئی۔ چینی اس کو ہیونگ نو یا ہو ینگ نو کہتے ہیں۔ ان کا وطن جھیل بیکال کے ارد گرد شمالی سمت واقع تھی۔ یہ ایک وحشی، خونخوار، طاقتور، خانہ بدوش قوم کی حیثیت سے نمودار ہوئی۔ چوتھی صدی عیسوی کے ختم پر مارسی پس نے ہُن حملہ آوروں کا ذکر جن الفاظ میں کیا اس کا حوالہ ہیرلڈ لیم نے یوں دیا ہے۔ ''دو پیروں والے چھوٹے چھوٹے بے ریش اپنے گھوڑوں سے بندھے ہوئے سے اور انہیں سے اکل و شرب حاصل کرنے والے سوتے بھی ہیں۔ تو گھوڑوں کے ایالون پر سر رکھے رکھے۔ یہ کھیتی باڑی کرتے ہیں، نہ ہل کو ہاتھ سے چھوتے ہیں۔ مکانوں میں نہیں رہتے۔ ان کی زندگی میں مسلسل آوارہ گردی ہے۔ جب پیدل کھڑے ہوتے ہیں تو بہت پستہ قد معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں تو عظیم الشان نظر آتے ہیں۔

ایک طاقتور کاغان کی سرکردگی میں اس قوم نے بڑی طاقت پکڑ لی تھی۔ جھیل بیکال کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے قبائل کو اِدھر اُدھر منتشر کرنے کے بعد اس قوم نے جنوب مشرق کی طرف چین پر تابڑ توڑ حملے شروع کیے۔ ان حملوں سے بچنے کے لئے تقریباً 2100ق م کے زمانے میں چینیوں نے عظیم دیوارِ چین تعمیر کی۔ جو بارہ سو میل لمبی اور 30 گز اونچی تھی۔ تاکہ بقول چینی، بھوتوں اور شیطانوں سے بچا جائے۔ ہُن چینیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس بنا پر نہ صرف ان کے علاقے تاراج کرتے بلکہ ان کی عورتیں، ریشم، غلہ اور قیمتی اشیاء پر بھی ہاتھ صاف کرتے۔

دیوارِ چین کی تعمیر کے بعد ان قبائل کا رخ مغرب کی طرف ہو گیا۔ مغرب کی طرف وحشیوں کا یہ راستہ چار ہزار میل لمبا تھا۔ لیکن ان وحشی قبائل کے لئے جو گھوڑوں کی پشت پر شہسواری بھی کرتے اور آرام بھی کرتے، کچھ دشوار نہ لگتا تھا۔ ان راستوں پر چل کر یہ یورپ تک گئے۔ اور وہیں بسے بھی۔ ان ہُن قبائل نے بڑی دنیا کو متاثر کیا۔ کہیں یوے چی قبائل اور کہیں سیتھین قبائل کو اور مغرب کی طرف بھگا دیا۔

آریوں کی ہندوستان میں آمد سے پہلے ہندوستان میں جن قدیم قوموں کا تذکرہ پہلے بھی ملتا ہے۔ ان میں کول، بھیل، گونڈ، منڈا، دراوڑ کے ساتھ منگول یا مگول قوم بھی شامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہُن قبائل منگولیا سے نکل کر تبت سے ہوتے ہوئے دریائے برہم پتر کی وادی سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان قدیم ہنوں نے نہ صرف تبت کا راستہ اختیار کیا ہوگا۔ بلکہ وہ قراقرم اور کوہ ہندوکش کے مختلف دروں کا بھی استعمال کیا ہوگا۔ کیونکہ اس طرف منگولوں کی قدیم آبادیاں اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔

ہُن قبائل کو تین بڑے گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ سفید ہُن، سیاہ ہُن اور وحشی تاتار۔ سفید ہُنوں کے بارے میں بڑا ابہام پایا جاتا ہے۔ کوئی یہ اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ واقعی ہُن کا ایک قبیلہ تھا یا کوئی اور قبیلہ۔ سفید ہُن اور کئی ناموں سے بھی موسوم ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً ہیاطلہ، افتالیت، یفتل وغیرہ، چینی مورخ کہتے ہیں کہ افتالیت (سفید ہُن) کسی زمانے میں آوروں (ایک مغل قوم) کے خدمت گار اور تابع تھے۔ جب ان پر آور قوم کی زیادتیاں بڑھیں تو انہیں نقل مکانی کرنا پڑا۔ آوروں کا مرکز بھی منگولیا کے ارد گرد تھا۔ پرو کوپئیس پہلا بازنطینی مورخ تھا جس نے افتالیت (سفید ہُن) کو زرد فام ہنوں سے جنہوں نے یورپ پر حملے کیے الگ قوم قرار دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ شہریت، زبان اور رنگ کے اعتبار سے یہ اصل ہنوں سے مشابہ نہیں۔ ایک اور انگریز محقق پارکر بھی ان افتالیوں کو زرد فام ہنوں، منگول یا ترکی قبائل سے الگ قرار دیتا ہے۔ وہ ان کو یوچی[1] قبائل کی ایک شاخ بتاتا ہے۔ اس طرح سر پرسی سائیکس، سمتھ، گوبستن سن، جیسے محققین نے بھی سفید فام ہنوں کو زرد فام ہنوں سے جدا اور الگ بتایا ہے۔ کہا جاتا ہے مرکزی ایشیا میں پہنچ کر یوچی قبائل دو شاخوں میں بٹ گئے تھے۔ تھایوچی (مہتر یعنی بڑے یوچی) یا کہتر یوچی (کوچک یا چھوٹے یوچی) افتالیت یا یفتالی (سفید ہنوں) کو چک یوچیوں (تخاری قبائل) کی ایک شاخ

نوٹ :- بعض محققین نے یوچی قبیلہ کو حیاطلہ کہا ہے۔ (صفحہ 227 تاریخ اقوام عالم از مرتضیٰ احمد)

تھے۔ 438ء میں یفتالیوں نے ایرانیوں کی ساسانی حکومت کو شکست دی۔ اور اس ملک کے ایک بڑے علاقے پر حاوی ہو گئے۔ ایران پر قبضے کے ساتھ ساتھ یفتالیوں نے ہندو کش کے دونوں جانب آباد قبائل پر بھی اپنے حملے جاری رکھے۔ ان دنوں کابل اور گندھارا پر کیداری ؔ یا کوچک کوشانی حکمران تھے۔ یفتالیوں کے حملوں سے کیداری حکومت بکھر کر رہ گئی۔ اور کوشانیوں نے بھاگ کر گلگت اور چترال کے پہاڑی سلسلوں میں جاکر پناہ لی۔ تاہم یفتالیوں کا زور ختم ہوتے ہی ان کے مضبوط جتھے اپنے مرکزوں کی طرف پھر سے لوٹے اور پھر "کابل شاہ" اور "رتبیل" کے نام سے اپنی حکومتیں قائم کیں۔

سفید ہُنوں (یفتالیوں) نے 455ء کے بعد ہندوستان پر مسلسل حملے شروع کیے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں سکندر گپت کی حکومت تھی۔ جس نے ان حملوں کو پسپا کر کے انہیں شکست سے دوچار کر دیا۔ لیکن چند سالوں کے بعد ان کے حملوں میں اور شدت آگئی۔ اور انہوں نے اپنے سردار تورمان کی سرکردگی میں گپت خاندان کو شکست دے کر پنجاب، راجپوتانہ، سندھ مالوہ، شمالی مغربی ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اور ساتھ ہی مہاراجہ ادھیراج کا لقب اختیار کر کے اپنی سلطنت کی سرحدیں بڑھانا شروع کیں تورمان کے بعد اس کا لڑکا مہر گل بادشاہ بنا۔ اور اس نے سکلا (سیالکوٹ) کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ کہتے ہیں کہ مہر گل بے حد ظالم اور بے رحم تھا۔ نتیجتاً اس کے خلاف عوامی بغاوت ہوئی۔ مالوہ اور مگدھ کے راجاؤں نے مل کر 528ء میں ملتان کے نزدیک اسے شکست سے دوچار کر دیا۔ مہر گل بھاگ کر کشمیر چلا گیا۔ جہاں اس نے بادشاہ کو قتل کر کے اس کا تخت حاصل کر لیا۔ 540ء میں اس کی موت کے ساتھ ہنوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ لیکن انہوں نے اپنے اثرات اس ملک پر چھوڑے۔ ہنوں نے ہندوؤں کا مذہب اختیار کیا۔ یفتالیوں (ہنوں) کا ایک بڑا گروہ مشرقی پنجاب، راجپوتانے میں رہائش پذیر ہو گیا۔ اور یہی لوگ بعد از گُرجر (گوجر)، جاٹ، پرنہار، راجپوتوں کی صورت میں تاریخی منظر پر آگئے۔ یہ لوگ بہادر اور جنگجو تھے۔ اور بری بڑی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ یہی راجپوت تھے جنہوں نے محمود غزنوی، محمد غوری اور ظہیر الدین بابر کے ساتھ جان توڑ مقابلے کیے۔ اور مزاحمت کے اعلیٰ نمونے پیش کیے۔ راجپوت اس نظریے سے اختلاف کرتے ہیں کہ وہ غیر ملکی قبیلہ کے اخلاف ہیں۔

نوٹ :- کیداری۔ اِن کے ایک حکمران کا نام کیدار تھا جس کے باعث یہ قبیلہ کیداری کہلایا۔ اصل میں یہ کوشانی قبیلہ تھا۔

اُن کا کہنا یہ ہے کہ وہ ان کھشتریوں کی اولاد ہیں جو زمانہ شجاعت کے دوران سورج بنسی اور چندر بنسی کے نام سے معروف تھے۔

ادھر چین میں بعد کے زمانے میں (210ق م) ہنوں نے اپنے سردار دیومان کے تحت بڑی طاقت پکڑلی تھی۔ انہوں نے ملک خطا (جنوبی منچوریا، منگولیا) سے یوچیوں کو بے دخل کر کے انہیں وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ کہا جاتا ہے یہ وہاں سے افغانستان کی طرف منتقل ہو گئے۔ دیومان کے بعد اُس کا بیٹا بغدور بادشاہ بن بیٹھا۔ یہ انتہائی سفاک قسم کا سردار تھا۔ اُس کے سامنے انسانی یا حیوانی زندگی کی کوئی قدرو قیمت نہ تھی۔ لوگوں کو ہلاک کر کے اُسے طمانیت ملتی تھی۔ اُس نے سب سے پہلے منچوریا کی تنگوس قوم کو شکست دیکر انہیں تہس نہس کر دیا۔ اور پھر بچے کھچے یوچیوں کا بھی صفایا کر دیا۔ ہنوں کے ان ترک تازیوں کے دوران جنوب اور مغرب کی طرف عجیب و غریب افواہیں گشت کر رہی تھیں۔ چینیوں نے شمال کی طرف سے حملہ آور قوموں کو آسمانی شیطانی مخلوق قرار دیکر اُن سے بچنے کی تمام تر تدابیر بروئے عمل لاتے رہے تھے۔ مغرب کی طرف اب جبکہ مذہب عیسائیت اپنے ابتدائی مراحل میں داخل ہو رہا تھا۔ مشرق کے یہ وحشی حملہ آور دجال کی امت یاجوج ماجوج سمجھے جا رہے تھے۔ اور ہر طرف ایک خوف سا طاری تھا کہ قیامت آنے والی ہے۔ مشرق کے یہ حملہ آور چہار طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ یہ ایک سیلاب کی طرح تھے کہ جس کے بہاؤ میں انسانی جانیں خس و خاشاک کی طرح بہی جا رہی تھیں۔ اس سیلاب کے سامنے کوئی بند نہ باندھا جا سکا تھا۔ یاجوج ماجوج کے متعلق چینیوں، مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے بہت سے نظریات سامنے آتے رہے ہیں۔ چینیوں نے ہُن اقوام کو شیاطین، بدارواح اور کیا کیا نہ کہا۔ عیسائی سینٹ جروم کی پیشن گوئی کی وجہ سے کہ دجال کے زمانے سے یاجوج ماجوج کے ملک سے ایک ظالم قوم نمودار ہو گی۔ پریشانِ خاطر تھے۔ اور اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ مشرق کے یہ حملہ آور اب تباہی پھیلانے والے ہیں۔ بائبل میں اس قوم کو نوحؑ کے بیٹے یافث کی نسل سے قرار دیا گیا۔ جیسے سابقہ ابواب میں ذکر کیا گیا ہے، یافث کی اولاد میں آرین اور منگول دو اہم قبیلے شامل تھے۔ اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ مشرق میں بسنے والی یہی قومیں جنہوں نے مغرب، جنوب، اور چہار طرف سے حملے کیے یاجوج ماجوج ہوں۔ حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں سورہ کہف میں ذوالقرنین کے حوالے سے تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "تیسری علامت کے بارے میں یہ تو قریب قریب متحقق ہے کہ یاجوج ماجوج سے

مراد روس اور شمالی چین کے وہ قبائل ہیں جو تاتاری، ہُن اور سیتھین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اور قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر حملے کرتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے حملوں سے بچنے کے لئے قفقاز کے جنوبی علاقے میں دربند اور داریال کے استحکامات تعمیر کیے گئے تھے۔"

سینٹ جروم کے مطابق یاجوج ماجوج کا کیشیا (بحر کیسپیئین اور بحر اسود) کے شمال میں آباد تھے۔ ایک اسرائیلی مورخ انہیں سیتھین قوم قرار دیتا ہے۔ بعض نے روس کے علاقے توبل (موجودہ توبالک) اور مسک (ماسکو) کو ان اقوام کا مسکن بتایا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں "یہی گہوارہ تھا (ان کا اشارہ منگولیا اور چینی ترکستان سے ہے) جہاں ابلنے والے انسانی چشمے کے بعض گروہوں کو اہلِ کتاب اور مسلمانوں کے مذہبی اسفار میں یاجوج ماجوج کہا گیا ہے۔

چینیوں کا ایک قبیلہ یوچی تھا۔ اسی نام نے مخارج و تلفظ کے اختلاف سے گزر کر عبرانی یاجوج کی شکل اختیار کرلی۔ اسی طرح منگول کی اصل موگ تھی۔ یونانی زبان میں یہ تلفظ میگ اور میگاگ بنا۔ اورجب اس نے عبرانی لباس پہنا تو ماجوج بن گیا۔"

بہر حال جیسے پہلے بیان کیا گیا ہے شمالی میدان اعظم ہی دو اہم اقوام یعنی منگول اور آرین کا مسکن رہا ہے۔ اور یہی قومیں جنگجو، نڈر طوفان بلا خیز کی طرح تھیں۔ ان ہی میں متمدن ممالک پر تواتر سے حملے کیے۔ یاجوج ماجوج کہلائے۔ وحشی ہنوں، ترکوں، مغلوں، آریوں، سیتھیوں، یوچیوں، پارتھیوں نے بڑے بڑے مذاہب کے پیروکاروں (زرتشت، بدھ ازم، عیسائیت، یہودیت، اسلام) پر حملے کیے۔ اوران مراکز کو تباہ وبرباد کیا۔ اس لئے ان مذاہب کے پیروکاروں نے انہیں وحشی ظالم، تباہ کار، شیطان خبیث ارواح قرار دیا۔ اگرچہ ان ہی قوموں نے بعد میں ان مذاہب کو اختیار بھی کیا۔ پھر عیسائیت اور اسلام کے بڑے داعی بن کر ان مذاہب کے فروغ کے لئے کام کیا۔ ان ہی مراکز سے اٹھنے والے مسلم علماء، محدثین، فقیہا، اولیاء مورخین وغیرہ نے عالم اسلام کو توانا کرنے میں جو کام کیا ہے وہ بھی بے مثال اور لازوال ہے۔ جہاں تک اقوام کے خاندانوں کا تعلق ہے۔ سیتھین، پارتھی، آرین، قومیں ایک ماخذ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہُن مغل ترک وغیرہ ہم نسل ہیں۔ جہاں تک یوچیوں کا تعلق ہے۔ ان کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ بعض نے انہیں چینیوں کا قبیلہ قرار دیا ہے۔ جبکہ چینی خود اسے قبول نہیں کرتے۔ بعض نے انہیں منگول قرار دیا ہے۔

مثلاً تاریخ پاکستان کے مصنفین ابوامام وغیرہ کا کہنا ہے کہ ہن، شاکا اور کوشانی وغیرہ یوچی کی ایک شاخ تھے۔ تاریخ اقوام عالم کے مصنف مرتضیٰ احمد خان کہتے ہیں کہ یوچی تاتار سے آکر ترکستان اور افغانستان میں آباد ہوتے گئے تھے۔ جنھوں نے اس قوم سے اقتدار چھین کر سندھ، پنجاب، افغانستان اور ترکستان میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ یوچی غالباً آریا تھے جن کو ہنوں نے ملک خطا (جنوبی منچوریہ ومنگولیا) سے نکال دیا۔ فاضل مصنف پھر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ بعض قدیم مورخین نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ وہ ترک النسل تھے۔ اس طرح معروف مورخ، ہیرلڈ لیم آریوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ نسلاً یہ سیتھین قوم کے رشتے دار ہیں۔ ان کی ایک شاخ گوبی تک پہنچی تھی۔ اور چینیوں نے ان کا نام یوچی رکھا۔ یہ آریائی یا ایرانی تھے۔ ان مباحث سے واضح ہوتا ہے کہ یوچی بھی آرین تھے۔ ان کا اصل وطن دشتِ روس تھا۔ قدیم زمانے میں ان کا ایک قبیلہ مشرق میں جاکر صحرائے گوبی کے زرخیز کناروں پر آباد ہوگیا تھا۔ چینیوں نے ہی انہیں یوچی کا نام دیا۔ بعد میں جیسے ہنوں کی یلغاریں شروع ہوئیں تو انہیں وہاں سے مہاجرت اختیار کرنی پڑی۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یوچی اور سیتھین ایک ہی تھے۔ اور آریوں کے بھائی بند تھے۔

بہر حال ہُن حملہ آوروں نے 206 قبل از مسیح مشرقی ترکستان میں اپنی حکومت قائم کی۔ یہ ایک بڑی سلطنت تھی۔ جسکی سرحدیں بحرہ چین سے بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھیں۔

اس سلطنت کے بانی حکمران میتے خان تھے۔ ترک مورخین ہن حکمران کو ہن کے ساتھ ساتھ ترک میتے خان بھی کہتے ہیں۔ چوتھی صدی میں ہن قبائل نے دیوارِ چین توڑ کر شمال چین پر قبضہ کیا۔ کہتے ہیں اس دور میں ہنوں کی حکومت کا دائرہ وسیع ہوکر مانچوریا اور سائبیریا سے لیکر یورپ میں دریائے رائین اور دریائے ڈینوب تک پہنچ گیا تھا۔ ہنوں کی حکمرانی کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ جاری رہا۔ لیکن ہنوں کا یہ عروج بالآخر مختلف وجوہات کی بنا پر گھٹتا چلا گیا۔ اور ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جب یہ پس منظر میں چلے گئے۔ اس میں چینی حکمرانوں کی مدبرانہ پالیسیاں تھیں کہ جن کے باعث ہن حکمران ہٹ گئے تھے۔ پھر وحشی قبائل کے اِدھر اُدھر کے حملوں سے بھی ہن حکومت کو زوال آیا۔

اس دور میں ایک وحشی قوم منظر عام پر آرہی تھی۔ یہ ترک تھے۔ جو جیو جن (چین کا حکمران) کی لوہے کی کانوں میں کام کرتے تھے۔ یہ بڑے مضبوط لوگ تھے۔ اس لئے چینی انہیں "تاؤکیو" (یعنی مضبوط) کے نام سے پکارتے تھے۔ اور یوں ترک مشہور ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک ترک سردار نومن نامی نے جیو جن بادشاہ سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا۔ جیو جن بادشاہ اناکوئے نے یہ رشتہ دینے سے انکار کیا کیونکہ وہ ترکوں کو اپنا غلام اور لوہار سمجھتا تھا۔ اس انکار کے نتیجے میں ترک سردار اور اناکوئے کے درمیان لڑائی ہوئی۔ جس میں جیو جن حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور یوں 500ء میں ترک تاتار میں برسر اقتدار آئے۔ مشرقی ترکستان کتاب کے ترک مولف عیسٰی یوسف الپتگین کہتے ہیں۔ کہ لفظ ترک پہلی مرتبہ اسی دور میں استعمال ہوا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان ترکوں کا اولین وطن کوہ تھیان شان کے نواح میں تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ایدل اور ال تاریخ کے آغاز ہی سے ترک باشندوں سے آباد رہے ہیں۔ ترک کہتے ہیں کہ وہ پہاڑوں میں محبوس تھے۔ اور وہاں سے نکلتے وقت انہیں لوہے کا پھاٹک توڑنا پڑا تھا۔ یہ بات قریب قریب دل کو لگتی ہے۔ کہ شمالی چین کے قریب کوہ تھیان شان اور التائی پہاڑی سلسلوں میں ترک صحرانوردی میں محو تھے۔ وہیں سے ان کے جتھے چین میں داخل ہوتے اور چینی بادشاہوں کے لوہے کی کانوں میں کام کرتے۔ ان کا وطن بھی شمال کا برف زار ہی تھا۔ جہاں سے یہ چراگاہوں کی تلاش میں نیچے اتر آتے تھے۔ ہیرلڈلیم اپنی کتاب "تاتاریوں کی یلغار" میں لکھتے ہیں کہ "جسمانی ساخت میں ترک کی حیثیت اس کے پیش رو آریائی (ایرانی) اور اس کے مشرقی ہمسائے وحشی مغل کے بین بین تھی۔ اس کا قد آریا کی طرح دراز تھا۔ اور وہ حرکت میں اتنا ہی تیز تھا جس طرح آریا عام طور پر لوگوں کو اس کے رنگ کے متعلق غلط فہمی ہے مگر دراصل وہ گندم رنگ مغل کے مقابل سفید فام تھا۔ اکثر اس کے بال سرخ ہوتے آنکھوں کا رنگ ہلکا ہوتا۔ خدوخال نمایاں اور جسم پر کثرت سے روئیں۔ اس کے برعکس گول چہرے والے منگول کا جبڑا ہڈی دار تھا۔ اور اس کے جسم پر بہت کم بال ہوتے تھے۔"

تاریخ میں ترک نمایاں مقام کے مالک رہے ہیں۔ بہت کم قومیں ان سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔ ہیرلڈلیم کی یہ رائے ہے کہ تمام قوموں میں صرف ایشیائی ترکوں اور یورپی روسیوں ہی نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا کہ ایک عالمگیر سلطنت کیسے قائم کی جاتی ہے۔ اور اس پر کس طرح حکومت کی جا سکتی ہے۔

عیسٰی یوسف الپتگین کہتے ہیں۔ "یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے جس قوم کو اسکیت کہا۔ ایران میں جسکو توران، ہندوستان میں ساکا اور توروشکا کہا جاتا تھا۔ وہ سب ترک تھے۔ توران جمع کا صیغہ ہے۔ اور توروشکا ترک کی سنسکرت شکل ہے۔ تور یا توران کی بحث دلچسپ

بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ اس حوالے سے بڑے بڑے محققین جیسے سر ہولڈج (گیٹس آف انڈیا) راگوزین (ویدک انڈیا)، ملر وغیرہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ ڈراویڈن تورانی الاصل ہیں۔ یہ ڈراویڈن تورنیئن کا بگڑا ہوا لفظ ہے۔ تورانیئن اور آرین ایک دوسرے کے ضد الفاظ ہیں۔ آریا کے معنی ہل جوتنے والے کے ہیں۔ اور تورا کے معنی گڈریوں کے ہیں۔ رشید اختر ندوی۔ "ارض پاکستان کی تاریخ میں مختلف مباحث کے آخر میں کہتے ہیں۔ "اگر ڈراویڈن تورنیئن کا بگڑا ہوا لفظ ہے اور ان کے زبان کے شروع دور سے ہی وہ ہے جو سندھ کے بروہی قبیلے کی زبان ہے تو پھر بروہی قبیلے کا یہ دعویٰ غلط نہیں قرار دیا جاسکتا کہ وہ ترک ہیں۔ اور ان کے آباؤاجداد ایرانیوں کی طرح ایشیائی ہیں۔ اور کسی لحاظ سے بھی ایرانی نسل سے کم تر نہیں۔" بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے ایشیا اور یورپ میں یافث کی اولاد بڑی پھولی پھلی۔ شکاری دور میں منگول یا مغول یا ہن اور آریا دنیا کے ہر حصے میں پہنچے۔ بڑی بڑی آبادیوں کو متاثر کیا۔

ہندوستان کی قدیم منگول آبادی کا پہلے ہی تذکرہ ہو چکا ہے۔ جو آریوں کی ہندوستان آمد سے پہلے یہاں آباد تھی۔ کیا عجب دراوڑ بھی شکاری دور کی منگول آبادی ہی ہو۔ جو وسط ایشیا سے وادی سندھ میں آکر بسی ہو اور موہن جودڑو اور ہڑپا کی اعلیٰ تہذیب کا باعث ہوئی ہو۔

ہنوں کے زوال کے بعد 552ء کے قریب زمانے میں گوک ترکوں نے ترکستان میں ایک مضبوط بنیاد ڈالی اور ارد گرد کے کئی قبائل کو اپنا تابع اور فرمانبردار بنالیا۔ یہ سلطنت شرقاً غرباً تین ہزار میل اور شمالاً جنوباً دو ہزار میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ برف زاروں میں رہنے والے اسکیمو بھی ترکوں کے باجگزار تھے۔ 595ء تک ترک بلخ اور ہرات تک پہنچ چکے تھے۔ اور یہاں کو شانیوں کو بھی مغلوب کیا تھا۔ 691ء سے 744ء تک ترکستان کا حکمران مرچو تھا۔ اس کی سلطنت بحر منجمد شمالی سے کوہستان تبت تک اور شرقاً غرباً تین ہزار میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب اس سلطنت کو زوال آیا تو ترکوں نے ان علاقوں میں مختلف جاگیری ریاستیں قائم کیں۔ ان میں کرغزیہ، خوارزم، ہفتالی، خزر، آوار، کوچی، طارم، سرچین، ٹوچارا، یوغمور وغیرہ ریاستیں قابل ذکر تھیں۔ اس زمانے میں عرب ترکستان میں داخل ہو چکے تھے۔ 751ء میں چینیوں اور عربوں کے درمیان تالاس (کرغزیہ) کی فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں چینیوں کو شکست ہوئی۔ اس جنگ کے نتیجے میں چینیوں کو ترکستان سے نکلنا پڑا۔ نویں صدی عیسوی میں قرہ خانی ترکوں کی حکومت قائم ہونے تک ان

علاقوں پر قارلقوں (برف کے رہنے والوں)، کرغزیوں (زرخیز کھیت) ایغوروں کی حکومت قائم رہی۔

840ء میں بو قاخان پہلا ترک حکمران تھا۔ جس نے مشرقی اور مغربی ترکستان پر مشتمل ایک وسیع سلطنت قائم کی۔ یہ قرہ خانی یا خطائی (ختائی) ترکوں کی حکومت تھی۔ 932ء میں ساتق بقر اخان (قرہ خانی حکومت کا نوجوان حکمران) نے اسلام قبول کیا۔ اور یوں اسلام نے ایک سرکاری مذہب کے طور پر ان علاقوں میں نفوذ کیا۔ اس زمانے میں ترک ہر طرف بڑھے چلے جارہے تھے۔ پورے وسط ایشیا میں ترک حاوی تھے۔ وسط ایشیا میں خوارزمی اور اردگرد اپنی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ بعض ترک قبیلے سطح مرتفع تبت، ہمالیہ اور ہندو کش پار کر چکے تھے۔ ترک سلجوقیوں نے 1000ء کے قریب مرو وہرات تک کے علاقے فتح کر کے اپنی ریاست قائم کرلی تھی۔ اسی زمانے میں میگیار (مجار) ترک قبیلے مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے ہنگری اور رومانیہ تک پہنچ گئے تھے۔ 1037ء میں سلجوق کا پوتا طغرل بیگ نے ایران فتح کرلیا۔ ہیرلڈ لیم کہتے ہیں یہ ایران پر توران کی فتح تھی۔ متمدن جنوب پر جنگجو شمال کی فتح تھی۔ سلجوقیوں نے ایران، آرمنیا، ایشیائے کوچک تک پورے علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملادیا۔ 1037ء میں سلجوقیوں نے یروشلم پر قبضہ جمالیا۔ اس مرحلے پر قسطنطنیہ کے بازنطینی حکمران کو پریشانی لاحق ہوئی۔ وہ سلجوقیوں کی پیش رفت سے پریشان خاطر تھے۔ چنانچہ اسی لئے صلیبی جنگ کے طویل معرکے شروع ہوئے۔

یہی ترک جنگجو قبائل تھے۔ جنہوں نے 962ء سے ہندوستان پر پے در پے حملے کیے۔ الپتگین، سبکتگین، محمود غزنوی 962ء سے 1030ء جس ترک حکومت کے سربراہ ہوئے اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی سرحدیں بحیرہ قزین اور عراق سے دریائے گنگا تک اور بحیرہ ارال سے اور نیز ماوراالنہر سے بحیرہ عرب سندھ اور صحرائے راجپوتانہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ 1206ء سے 1326ء یعنی 120 سال تک ہندوستان پر ترکوں ہی نے حکومت کی۔ ان حکومتوں کے سربراہ قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، رضیہ سلطانہ، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن، خلجی سلاطین میں جلال الدین اور علاء الدین خلجی، تغلق ترک میں غیاث الدین تغلق، محمد بن تغلق، فیروز شاہ تغلق تھے۔ جنہوں نے یادگار سلطنتیں قائم کیں۔ اور تاریخ میں نام کمایا۔

تاریخ میں عثمانی ترکوں کا اپنا ایک مقام ہے۔ یہی عثمانی ترک تھے جنہوں نے ایک

پائیدار، مستحکم اور مضبوط حکومت کی بنیاد ڈالی۔ تاریخ کے کئی دھارے آئے گئے۔ لیکن عثمانی ترکوں کی قائم ترکی حکومت آج بھی دنیا کے نقشے پر ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ جب تاتاریوں کے ہاتھ سلجوقی حکومت کا شیرازہ بکھرا تو ایک اور ترک سردار ارطغرل نے اپنی ایک خود مختار حکومت قائم کی۔ اس حکومت کی سرحدیں مشرقی رومی سلطنت سے ملتی تھیں۔ ارطغرل کے بعد اس کا لڑکا عثمان اس حکومت کا سربراہ مقرر ہوا۔ اس نام کی مناسبت سے بعد میں آنے والی ترکی حکومت کے سربراہ عثمانی کہلائے۔ 1300ء کے زمانے سے عثمانی ترکوں نے اپنی حکمرانی کا آغاز کیا تھا۔ عثمان کے بعد اورخان، مراد اوّل، بایزید اوّل، محمد اوّل، مراد ثانی، سلطان محمد فاتح، بایزید ثانی، سلیم اوّل، سلیمان اعظم، سلیم ثانی، عبدالمجید اوّل، عبدالعزیز، سلطان عبدالحمید، محمد خامس تک نامور حکمران ہو گزرے ہیں۔ جنہوں نے اپنی جنگجویانہ اور مدبّرانہ پالیسیوں کے ذریعے ترکی سلطنت کو ایک بلند مقام پر فائز کیا۔ عثمانی ترکوں میں سلطان محمد فاتح ایک عظیم حکمران گزرا ہے۔ 1453ء میں آپ ہی کے دور میں قسطنطنیہ مسخر ہوا۔ دولتِ عثمانیہ کا ایک اور عظیم ترین حکمران سلیمان اعظم تھا۔ اس دور میں مصر اور بلغراد بھی ترکی میں ضم کر دیئے گئے تھے۔ غرض عثمانی ترکوں سے گزر کر حکومت اتاترک مصطفیٰ کمال کو پہنچی۔ اور یوں جدید ترکی معرض وجود میں آیا۔ عظیم شہسوار ترک جنگی ترک تازیوں سے زمین کا کوئی ٹکڑا نہ بچا تھا۔ منچوریا سے بحر اسود تک اقتدار کے مالک تھے۔ ترکوں کے مختلف قبائل، آور، خزر، بلغار، سلجوق، خوارزمی، غزنوی، اویغور (یوغور) کرغز، قارلق، قرہ خانی، آق، قپچاق، ازبکی، قازق، ترکمان، مجار، میگیار، خلجی، تغلق، البیری (بلبن والتمش) ایبکی وغیرہ جگہ جگہ سریر آرائے سلطنت تھے۔ اب وہ ایک تمدن کے مالک تھے۔ بقول ہیرلڈلیم ان کی ہجرت عظیم ختم ہو چکی تھی۔ آرام طلبی نے سخت کوشی کی جگہ لی تھی۔ یہ ترک حکمران آپس میں لڑ جھگڑ بھی رہے تھے۔ بارہویں صدی عیسوی کے زمانے میں شمالی جنگلوں کی طرف سے ایک اور شکاری قوم نمودار ہو رہی تھی۔ اسے منگول یا مغل کہتے تھے۔ جسکے معنی ہیشگی کے ہیں۔ بعض نے منگول کی اصل کو موگ قرار دیا ہے۔ بعض اسے "منگ گر" قرار دیتے ہیں۔ جس کے معنی دلیر اور بہادر کے ہیں۔ سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل اپنی کتاب "پشتون تاریخ کے آئینے میں" میں لکھتے ہیں۔ "ان کا (مغلوں کا پہلا مسکن صحرائے گوبی کے ریگستان اور ٹنڈارا کے علاقے تھے۔ موسم کے بدل جانے کے بعد چراگاہوں کی تلاش میں جگہ جگہ پھرتے تھے۔ یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے لکھا ہے کہ یہ لوگ

ساتھین تھے۔ بہت عرصہ پہلے ان لوگوں کو ہو بنتو ہانو لکھا۔" چنگیز خان کے ظہور کے وقت یہ لوگ کوئی بیس قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے" بعض انہیں بنی اسرائیل کے ان دس گمشدہ قبائل کی نسل قرار دیتے ہیں۔ جنہیں سونے کے بچھڑے کو پوجنے کی سزا کے طور پر راندہ درگاہ قرار دیا گیا تھا۔ (چنگیز خان از تورا کینہ قاضی) کچھ محققین انہیں ہنوں کی نسل سے قرار دیتے ہیں۔

مرزا مقبول بیگ بد خشانی اپنی کتاب "تاریخ ایران جلد دوم" میں لکھتے ہیں۔ "منگول ہنوں کی نسل سے تھے۔ ایفوریوچی قبائل کی ایک شاخ تھے۔ منگولوں کو تاتاری بھی کہتے ہیں۔ چینی مورخین کے نزدیک ان کی تین شاخیں سفید ہن، سیاہ ہن، تاتار ہیں۔ ہنوں کے یہ قبائل وسط ایشیا کے صحرائے گوبی کے شمال سے بحیرہ بیکال تک پھیلے ہوئے تھے۔"

تاریخ بحر الجہان کے مولف منشی امیر اکبر خان لکھتے ہیں کہ : "دنیا میں ترک یافث بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ مغلیہ چنگیزیہ تاتار یہ سب قوموں سے زیادہ ہیں۔ روس اور تاتار روس جسکو سائبیریا کہتے ہیں۔ کل ملک جو ایشیاء اور یورپ کے اتر ہیں۔ سب کو یافث بن نوح کی اولاد بتاتے ہیں۔ یہ قوم پہلے ترک کہلاتی تھی۔ ان میں ایک بادشاہ بوالجاس عرف الخان ہوا۔ اس کے دو بیٹے تاتاری، اور ماجین ہوئے۔ جب دونوں آپس میں فطور مند ہوئے تو ان کو باپ نے ملک تقسیم کر دیا۔ طبقہ تاتاریوں میں سے سات شخصوں نے سلطنت کی۔ اور طبقہ مغلوں سے نو شخصوں نے سلطنت کی۔ مغلوں کے شجرہ میں جو سلسلہ 52 پر قرار بن ایقو تکو درج ہے۔ اس نے قراقرم کو دارالسلطنت بنایا۔ اس کا بیٹا آغور خان 53 بھی تمام مغلوں اور تاتاریوں پر حکمران ہوا۔ چنگیزیہ نسل سے بہت پیدائش بیان ہوتی ہے۔ مگر ممتاز تولی خان، اوکتائی خان، چغتائی خان وجوجی خان ہوئے ہیں۔ اور مغلیہ نسل سے تومنا 60 بن بائیقر 59 درج ہے۔ اس کے نام سے ترکستان مشہور ہے۔ تمام ترکستان میں اس نے بادشاہی کی ہے۔ اس کی اولاد سلطان ترک درج ہے۔"

بعض مسلمان مورخین کہتے ہیں کہ یافث کے فرزند کلاں اور ولی عہد کا نام ترک تھے۔ تمام ترک انہی کی نسل سے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ترک کی چوتھی پشت میں دو لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ ایک مغول خان تھا۔ اور دوسرا تاتار خان۔ تاتار خان نے ترکستان اور چین پر پشتہا پشت تک حکومت کی۔ مغول خان کو اپنے باپ کی حکومت ملی۔ اس کی اولاد مغول یا منگول کہلائی۔ (تاریخ اویماق مغل) مرتضیٰ احمد خان اپنی کتاب "تاریخ اقوام عالم" میں

لکھتے ہیں کہ "منگولیا کی سر زمین میں ایک زبر دست تخریبی طاقت جنم لے رہی تھی۔ یہ طاقت ترکی نسل کے ان خانہ بدوش قبائل کی صورت میں ترقی کر رہی تھی جو تین چار سو سال پہلے قبائلی حرکت میں پیچھے رہ گئے تھے۔ اور اپنی آبائی سر زمین کے کوہستانوں میں محنت مشقت کی سادہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ قبیلے سر سبز چراگاہوں پر قبضہ جمانے کی خاطر آپس میں بر سر پیکار تھے۔ اس لئے جنگجوئی ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ اور فنون حرب میں انہوں نے نئی نئی مہارتیں حاصل کر لی تھیں۔ ترکی نسل کے قبائل کی یہ شاخ منگولیا سے اٹھنے کے باعث منگول یا مغل کہلاتی ہے۔"

تاریخ رشیدی پر تبصرہ کرتے ہوئے این ای لیاس (N.Elias) مختلف ترکی اور پر شین مورخین کی تحریروں کے تجزیے کے بعد لکھتے ہیں۔ مول ہوں یا منگول یا مغل یہ تمام ایک انسان کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ لوگ منگولیا یا مغلستان میں رہتے تھے۔ وہ پھر ابو الغازی، ڈی، اوسن اور ہوورتھ کے حوالوں سے لکھتے ہیں کہ اس چھوٹے سے خطے میں منگول نسل کے لوگوں کے ساتھ اور قومیں بھی رہا کرتی تھیں۔ یہاں اوئیفور (یوغور) رہتے تھے۔ جو ایک ترک نسل تھی۔ قراخطائی رہتے تھے۔ جو زیادہ ترمانچو (تنگوس) تھے لیکن تاہم منگول خون ان کے جسموں میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ نیمائز اور قارلق اور کرغزان تمام کے آباؤ اجداد ترک النسل تھے۔ مزید بر آں کال مکس بھی تھے۔ جو منگولوں کی ایک نسل تھی۔ بہر حال جب اس علاقے میں منگولوں کا زور بڑھا تو مغربی بدیسوں نے اس علاقے کو مغلستان کہا۔ جس طرح انہوں نے قراخطلائیوں کے اقتدار کے دوران اس علاقے کو قراخطائی کہا تھا۔ کال مکس کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ یہ لفظ کالپکس کا بگاڑ ہے۔ قراکالپکس بھی (سیاہ ٹوپیاں) ایک اصطلاح ہے۔ نیمانز (آٹھ) اور قارلق ترکوں کے اویفور (یوغور) شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔

جیسے اوپر لکھا گیا ہے کہ جھیل بیکال کے ارد گرد کے علاقہ سر سبز اور زرخیز تھا۔ یہ علاقہ بشمول منگولیا مختلف قوموں کا مسکن تھا۔ اس علاقے کی سرحدیں جنوب اور مشرق میں ملک خطا سے ملتی تھیں۔ قدیم ملک خطا میں شمالی چین کا کچھ حصہ منچوریا اور مشرق ترکستان کے علاقے شامل تھے۔ مغرب میں اس کی سرحد کرغزستان سے ملتی تھیں۔ چودھویں اور پندرھویں صدی کے دوران یہ علاقہ جاٹھ بھی کہلاتا تھا۔ جتہ اور جاٹ کی مناسبت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ کسی طرح جتہ، ہندوستانی جاٹ قوم کا ہم پلہ و ہم مخرج ہو۔ مرزا حیدر

دوغلت کہتے ہیں کہ یہ علاقے مغلستان کے ساتھ جاٹھ بھی کہلاتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ چغتائی مغلوں کو جتہ کے معنی کم تر، بیکار، بد معاش کے ہیں۔ اس کے بدلے مغل چغتایوں کو کاروناز کہہ کر پکارتے تھے۔ کاروناز بھی ایک حقارتی نام تھا تاہم اس کے معنی معلوم نہیں ہوئے۔

یہاں مغول، منگول، تاتاری، ہون، ترک وغیرہ ناموں کے حوالے سے کچھ اظہار ضروری ہے۔ آیا یہ سب نام کسی ایک قوم یا نسل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یا یہ مختلف نسلوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس پر بڑی بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ ماہرین انساب نے یافث سے جو نسلی شجرے بڑھائے ہیں۔ ان میں مغنول خان، ترک اور تاتار خان کے نام بھی ملتے ہیں۔ مثلاً تاریخ بحر الجہان میں یافث کا لڑکا کومر اور کومر کا ترک اور اس سلسلہ میں تینتیسواں نام طفرل خان المعروف مغنول خان یا مغل خان بتایا گیا ہے۔ اسی طرح مرۃالانساب میں یافث کا لڑکا ترک اور ترک کا پوتا تاتار اور تاتار کا پوتا مغول خان ظاہر کیا گیا ہے۔ ان ناموں کے حوالوں سے ترک، تاتار اور مغول الفاظ یافثی نسل کا حصہ ہیں۔ اگر ان ناموں کے حوالوں سے اس نسل کو ترک، تاتار یا مغول کہا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ ہیرلڈلیم نے ترک اور منگولوں میں جسمانی ساخت کے اعتبار سے واضح فرق بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جسمانی ساخت میں ترک کی حیثیت اس کے پیش رو آریائی (ایرانی) اور اس کے مشرقی ہم سائے وحشی مغل کے بین بین تھی۔ اس کا قد آریا کی طرح دراز تھا۔ اور وہ حرکت میں اتنا ہی تیز تھا۔ عام طور پر لوگوں کو اس کے رنگ کے متعلق غلط فہمی ہے۔ مگر دراصل وہ گندم رنگ مغل کے مقابل سفید فام تھا۔ اکثر اس کے بال سرخ ہوتے۔ آنکھوں کا رنگ ہلکا ہوتا۔ خدوخال نمایاں اور جسم پر کثرت سے روئیں۔ اس کے برعکس گول چہرے والے منگول کا جبڑا ہڈی دار تھا۔ اس کے جسم پر بال بہت ہوتے تھے۔" تاہم جہاں تک ان کی معاشرتی روایات کا تعلق ہے۔ وہ قریب قریب ایک جیسی روایات کے مالک تھے۔ نیلا ریچھ سب کا ابوالاباء تھا۔ یہ تمام لوگ جسم پر بدبودار روغن اور چربی کا لیپ لگاتے۔ ان کی جلد سخت ہوتی۔ ٹانگیں چھوٹی چھوٹی اور خمیدہ شاید مسلسل گھوڑے کی سواری کی وجہ سے ایسا ہو۔ آہو، گھوڑا، ریچھ، رینڈیئر، باز ان کے پسندیدہ جانور تھے۔ آندھیوں، بجلی کی گرج اور تاریکیوں سے سب خوف زدہ ہوتے۔ نیلا آسمان انہیں بہت بھاتا۔ سفید رنگ ان کا محبوب رنگ ہوتا۔ گھوڑی کا دودھ بطور غذا اور شراب کے طور پر مرغوب مشروب ہوتا۔ شکار کھیلنا اور گلہ بانی تمام کا اہم پیشہ ہوتا۔ ہُن،

ترک اور منگول اقوام ہی کے حملوں سے بچنے کے لئے اردگرد دیواریں، بند، آہنی باڑ تیار کیے گئے۔ کہتے ہیں خسرو اعظم نے یاجوج ماجوج سے اپنے ملک کو بچانے کے لئے کوہ قاف کے ایک درے میں لوہے اور تانبے کی دیوار بنائی تھی۔ یہ دیوار اس نے سیتھین اور پارتھیو کو روکنے کیلئے بنائی تھی۔ ظاہر ہے شمال کی طرف ان کے ساتھ ہنوں اور منگول قبائل کا بھی زور تھا۔ ان تمام کے سردار قان، کاغان، خان، خاقان، (خان آف خانز) وغیرہ کہلاتے۔

اس کے باوجود ماہرین انساب و عمرانیات نے منگولوں کے کئی کئی خاندان بتائے ہیں۔ وصاف منگولوں کے 39 قبائل بتاتا ہے۔ بعض نے منگولوں کے 25 خاندان بتائے ہیں۔ اور بعض نے ان سے بھی زیادہ۔ بعض تاتاریوں اور مغلوں میں واضح فرق بتاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تاتاری مغلوں کے مشرقی علاقوں کی طرف آباد تھے۔ مغولی زبان میں تار خانہ بدوش کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مغربی مورخین نے ہی انہیں تاتاری کہا۔ ولیم آف رُوبروک جو پہلا یوروپی تھا۔ اور جو تین پشتوں کے گزرنے کے بعد مغلوں کے علاقے میں آیا تھا۔ نے انہیں تاتاری ہی لکھا ہے۔ جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ثانی نے بھی انہیں (مغلوں ہی کو) تاتاری ہی قرار دیا ہے۔ وہ ہنری سوم کو خط میں لکھتے ہیں کہ یہ تاتاری قہر خداوندی سے کم نہیں۔ ڈی، اوحسن کہتے ہیں کہ لفظ تاتار مغلوں کے لئے ہی مستعمل ہوتا رہا ہے۔ لیکن مغلوں نے خود اس نام کو اپنے لئے پسند نہیں کیا۔ کیونکہ وہ تاتاریوں کو اپنے سے الگ اور اپنا حریف سمجھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کن حکمرانوں نے تاتاریوں کو جو جھیل بویار کی چراگاہوں میں رہتے تھے۔ ملک خطا پر مغلوں کے حملے روکنے کے لئے ملازم رکھا ہوا تھا۔ معلوم ہوا مغل اپنے آپ کو تاتاری کہلانا پسند نہیں کرتے تھے۔ آج وا لگا کے حدود میں تاتاریہ (68 ہزار مربع کلومیٹر) ایک خود مختار یونٹ کی حیثیت سے روس کے زیر اقتدار ہے۔ محمد الیاس مرزا اپنی کتاب تاریخ مغلیہ میں لکھتے ہیں کہ تاتار یا تاتاری الفاظ مارکوپولو نے رائج کیے۔ ابنِ خلدون نے تاتار اور ابن بطوطہ نے مغلوں اور منگولوں کو تتز اور تار جیسے الفاظ استعمال کیے۔

اس سلسلہ میں ترک اور مغلوں میں بھی ایک چشمک باقی رہی ہے۔ مغلوں نے اپنے آپ کو ترک کہلانا پسند کیا۔ لیکن مغل یا منگول کہلانا پسند نہیں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ چنگیز خان کا قبیلہ منگول اور امیر تیمور کا قبیلہ تاتار (اثر چوہان، بابر بادشاہ مغل یا ازبک) یا تاتاری کہلاتا تھا۔ برلاس تاتاری پہلے ہی کی ایک شاخ تھی۔ اثر چوہان لکھتے ہیں "ازبک قوم کے بارے میں دو نظریات ہیں۔ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ ان کا تعلق جتہ مغل اور ہنری غول قبائل

سے ہے۔ پہلے ان کا شمار صحرائی لوگوں میں ہوتا تھا۔ اور انہیں قپچاق کہا جاتا تھا۔ پھر یہ از بک کہلانے لگا۔ از بک پرانی ترکی کا لفظ ہے۔ اس کے معنی خود مختار امیر یا سردار کے ہیں۔ امیر تیمور اپنی تزک میں اپنے آپ کو برلاس کہتا ہے اور اپنے کو از بک قبیلے سے الگ ٹھہراتا ہے۔ بابر بھی اپنے آپ کو برلاس (ترک) قبیلے کا ایک سپوت مانتا ہے۔ وہ کسی صورت اپنے آپ کو مغل کہلانا پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنی تزک میں مغلوں کیلئے حقارت کا اظہار کرتا ہے۔ اس حقارت کو اشعار میں ظاہر کیا جسکا ترجمہ ہے۔ "اگر مغل فرشتوں کی ذات سے ہیں تو بھی یقیناً یہ برے ہیں۔ اگر مغلوں کا نام سونے سے لکھا جائے تو یہ کریہہ ہوگا۔ مغلوں کی فصل سے ایک دانہ بھی نہ لو۔ ان کا بیج ایسا ہے کہ جو بھی کاشت کیا جائے اچھا برآمد نہ ہوگا۔"

(اخبار نوائے وقت)

لسانیات کے حوالے سے کچھ امتیازات منگولوں اور ترکوں میں پیدا ہو رہے۔ اس طرف بولنے والی زبانیں تورانی نسلی گروپ میں شمار ہوتی تھیں۔ اِن زبانوں میں ترکی، ہجری، تاتاری، مغولی، تبتی وغیرہ زبانیں شامل تھیں۔ ایک وقت میں جب منگول چنگیز خان اور اسکے جانشینوں کی فتوحات اور اقتدار کے باعث دنیا پر حاوی ہو رہے تھے۔ مغولی زبان عروج پر تھی۔ لیکن مرور زمانے کے ساتھ مغولوی زبان پر ترکی حاوی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ مشرقی ترکستان سے ترکی تک ترکی زبان راج کرنے لگی۔ اس کا واضح ثبوت یہودی صحافی سولزبرگر کے اس بیان سے ہوگا۔ آج ترکی زبان بولنے والا ایک انسان اگر گھوڑے پر سوار بلغاریہ سے چینی ترکستان تک سفر کرے تو وہ سارے راستے اپنا دکھ درد بیان کر سکتا ہے۔ آج بھی ارومچی کے لوگ ترکی یورپی حصے میں واقع ادرنہ کے لوگوں کیساتھ اس سے زیادہ آسانی سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ جتنی وہ پیکنگ کے لوگوں سے کر سکتے ہیں۔ (مشرقی ترکستان عیسیٰ الپتگین) اس طرح مغولوی زبان پس و پشت جاتی رہی اور اس پر ترکی کا اثر بڑھتا گیا۔ اسی لئے ای۔ لیاس تاریخ رشیدی کے کنٹری مین لکھتے ہیں۔ کہ منگولوں کا وہ قبیلہ جو مغلستان میں رہتا تھا۔ مغرب کے لئے اب بھی منگول تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ زبان اور خون کی آمیزش سے ترک بنتا جارہا تھا۔ یہ بھی یاد رہے مشرقی ترک کے مورخین نے ہن قبائل کو زیادہ تر ترک ہی لکھا ہے۔ اس تمام بحث کے بعد کچھ نتائج سامنے آتے ہیں کہ وسط ایشیا سے کچھ جنگجو، وحشی اور شہسوار قومیں نکلیں۔ پہلے ہن آئے، پھر ترک اور پھر مغل۔ ان میں کچھ فرق بھی تھا لیکن مشابہتیں بھی تھیں۔ ان کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ ہُن، منگول، ترک، مغل،

تاتاری۔ بعض نے بعض نام پسند کیے۔ اور بعض نے نہیں کیے۔ بعض نام حقارتاً بھی دیے گئے۔ مثلاً مغلوں نے تاتاری کہلانا پسند نہیں کیا۔ بعض حکمرانوں نے بعض نسلی نام پسند نہیں کیے۔ مثلاً بابر نے مغل کہلانا پسند نہیں کیا اور ترک ہونے پر فخر کیا۔ ترکی زبان اور خون کا دبدبہ قائم رہا۔ اور وقت کے ساتھ ترک زیادہ جاوداں نام بن کر اُبھر آیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس بات پر تمام مورخین اور محققین متفق ہیں کہ مغل ہوں یا منگول ہوں، ترک ہوں یا تاتاری یا ہن یہ سب ہم نسل ہیں۔ میرے نزدیک فرق ان کے عروج کے زمانوں کا ہے۔ پہلے ہن آئے، پھر ترک آئے اور پھر مغل آئے۔ ہر ایک نے اپنی بہار جانفزا دِکھلایا۔ ہن آئے اور ہر طرف یلغار کرتے ہوئے گئے۔ اپنی حکومتیں قائم کیں۔ ترک آئے اور ہر چار سو بڑھے۔ بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں۔ مصر، ہندوستان، یورپ، ایران، افغانستان اور عرب پر حکمران ہوئے، جہاں حکومت نہیں کی وہاں امیر کبیر، وزیر و مشیر کی حیثیت سے حکمرانوں پر حاوی رہے۔ مغل آئے اور پھر ایک عظیم انقلابی دنیا کے مالک ہوئے۔ 1157ء کے ارد گرد زمانے میں جھیل بیکال کے متصل علاقوں میں ایک قوم جو تقریباً ایک ہزار خاندانوں کی صورت میں بکھری ہوئی تھی۔ منظم حرکت میں دِکھائی دے رہی تھی۔ ان منتشر قبیلوں کے جنگجو سردار جو ترخان (بڑے خان) کہلاتے تھے، ان قبائل کو متحرک کر رہے تھے۔ ان ہی قبیلوں کے ایک خاندان میں جسے قیات کہتے تھے۔ 1154ء تا 1164ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ باپ نے اس کا نام تموچن رکھا۔ بعض کہتے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے وقت باپ کو لوہے کا ٹکڑا یا کوئی لوہار نظر آیا۔ اور انہیں دیکھ کر اس نے یہ نام رکھا۔ تموچن لوہے کو کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ چنگیز کا باپ یسوکائی اپنے ایک دشمن سے جسکا نام تموچن تھا جنگ کرنے گیا تھا۔ اس نے اپنے دشمن پر فتح پائی اور اسی دشمن کے نام پر بچے کا نام تموچن رکھا۔

1206ء میں جب ہندوستان میں قطب الدین ایبک خاندان غلاماں کی بنیاد رکھ رہا تھا۔ تموچن کو اس کے منگول قبائل نے اپنا خان مقرر کیا۔ اور اسے چنگیز خان کا لقب دیا جس کے معنی خان اعظم کے ہیں۔

یوں 1206ء میں مغلوں کی ترک تازیاں شروع ہو گئیں۔ اس نے چیدہ چیدہ اشخاص کا ایک لشکر تیار کیا۔ جسے کیشک کہا گیا۔ یعنی خان کے محافظ فوج۔ چنگیز خان نے سب سے پہلے ارد گرد کے ترک، تاتاری اور خود اپنے مغل قبائل کو مطیع اور منظم کر کے ایک

جنگجو فوج تیار کی۔ سب سے پہلے اُس نے ملک خطا کو سر کر لیا۔ اس کے بعد اس کے جرنیلوں نے شمالی چین کے قرہ خطا (مشرقی ترکستان) علاقوں کو سر کر لیا۔ منگولوں نے 1278ء تک سارا چین فتح کر لیا۔ چینی انہیں یوان کہتے تھے۔ یوان مغلوں نے چین پر 87 سال تک حکومت کی۔ چین پر فتح یاب ہونے کے ساتھ ساتھ مغلوں نے مغرب کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔ ان کی راہ میں خوارزمی شاہی حکمران کی طاقت آڑے آ رہی تھی۔ جنگی حکومت ترکستان، افغانستان اور ایران تک پھیلی ہوئی تھی۔ چنگیز خان ایک لشکر جرار کے ساتھ 1218ء میں ترکستانات کے مرکز کی طرف بڑھا اور اس نے آناً فاناً خوارزمیوں کی مضبوط حکومت کا تیاپانچا کر دیا۔ 1218ء سے 1222ء تک موصل، تبریز اور بحیرہ خزر تک علاقے پامال کیے۔ مغل فوجیں کوہ ہندوکش سے گزر کر افغانستان پر چھا گئیں۔ کچھ مغل فوجیں دشتِ روس میں چار طرف پھیل گئی تھیں۔ یہاں انہوں نے قپچاق ترکوں، روسی شہزادوں اور جنگجو گرجستانیوں کو شکست دیکر تتر بتر کر دیا۔ اور 1227ء میں جب چنگیز خان نے وفات پائی۔ مغل بحر الکاہل سے والگا تک براعظم کے نصف حصے کا مالک بن چکے تھے۔

چنگیز کے بعد اوغدائی خاقان منتخب ہوا۔ اس نے جھیل بیکال کے جنوب میں دریا کے کنارے کنارے ایک ہموار زمین منتخب کر کے ایک چھوٹا سا شہر بسایا۔ یہاں اس نے اپنے لئے ایک محل بنایا۔ شہر پناہ کے طور پر مٹی کی ایک دیوار بھی چنوادی۔ اس مقام کو قراقرم کا نام دیا گیا۔ یعنی سیاہ دیواریں۔ گویا قراقرم خاقانوں کا صدر مقام بنا۔ یہاں پر چینی اور ایرانی کاریگروں اور معماروں کے ذریعے رہائشی مکانات، یورتیں، شکار کے لئے ہنکا دیواریں تعمیر کروائیں۔28۔1227ء سے مغلوں کے اس قراقرم نے شہرت پائی۔ اور ہمیں کوہ قراقرم کا تحفہ ملا۔ جو مغرب میں دریائے قرمبر اور دریائے اشکومن کے حدود سے شروع ہو کر مشرق میں دریائے شیوک تک 327 کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ ترکوں نے ہی پہاڑ کے سیاہ خدوخال کو دیکھ کر اسے قراقرم کا نام دیا۔ یعنی سیاہ فصیل، سیاہ دیوار، ترک کوہ قراقرم کے ارد گرد علاقوں پر مدتوں حکومت کرتے رہے۔ ترک آج بھی اس پہاڑ کے متصل کثرت سے آباد ہیں۔

خاقان اوغدائی کے دور میں چین میں نانکن خطا کے تمام علاقے، یوروپی اور وسطی روس، کیف تک کے علاقے فتح ہوئے۔ مغل فوجیں ہنگری، رومانیہ، پولینڈ اور جرمنی کے کچھ علاقوں پر بھی قابض ہو گئیں۔

اوغدائی کے بعد اس کا بیٹا کویوک خاقان منتخب ہوا۔ اس کے دور میں فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ 1251ء میں منگو خاقان بنا۔ اس نے اپنے بھائیوں قبلائی خان کو جنوبی چین اور ہلاکو کو مغربی اسلامی ممالک کو تاراج کرنے کا حکم دیا۔ ہلاکو نے 1258ء میں اسلامی خلافت بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ نوے ہزار مسلمان قتل ہوئے اور شہر کو آگ لگا کر اُسے راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا گیا۔ اس کے بعد ہلاکو کی فوجیں حلب اور دمشق میں داخل ہوئیں۔ اِدھر قبلائی خان چین میں شہر پر شہر فتح کیے جارہا تھا۔ 1260ء میں خاقان منگو خان فوت ہوگیا۔ اس وقت قراقرم میں اس کا چھوٹا بھائی اوک بوغا یاسا کے اصولوں کے تحت چولھے کے وارث کے طور پر فرائض بجالا رہا تھا۔ منگو کا دوسرا بھائی قبلائی شمالی چین پر حکمران تھا۔ اوغدائی کا پوتا قائدو وسط ایشیاء، ترکستان اور افغانستان تک کے علاقوں پر متمکن تھا۔ عراق اور ایران پر ہلاکو کی حکمرانی قائم تھی۔ منگو خاقان کی وفات کے بعد مغلوں کی یہ الگ الگ خود مختار حکومتیں بنیں۔ تاہم چین کے فرمان روا قبلائی خان نے منگولیا کے صدر مقام قراقرم پر بھی قبضہ کیا۔ اور خاقان کے خطاب سے پورے علاقوں کا بادشاہ بنا۔ قبلائی نے جنگی مہمیں برما، جاوا، سماٹرا تک روانہ کیں۔ یہ علاقے بھی اس کے باج گزار بن گئے۔ تاہم قبلائی کی جاپان کی مہم کامیاب نہ ہوسکی۔ قبلائی کی سلطنت منگولیا، منچوریا، کوریا، چین، برما، ہند چینی، ملایا، سماٹرا اور جاوا تک پھیل چکی تھیں۔ نتیجۃً جہاں قراقرم کی مرکزیت ختم ہوئی وہاں مغلوں کے عروج کا گراف بھی گرتا گیا۔ ان کی وہ حکومت جو دنیا کے ایک بڑے خطے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یعنی مشرق سے مغرب تک چھ ہزار میل اور شمالی کے برف زار سے لے کر جنوب میں دو ہزار میل تک پھیلی ہوئی حکومت آہستہ آہستہ زوال پذیر ہوئی۔

مغلوں کے اس زوال پذیر دور میں ترکوں کے برلاس قبیلے میں تیمور لنگ پیدا ہوا۔ ماں کی طرف سے وہ چنگیز کا رشتہ دار تھا۔ 1380ء وہ ترکستان کا حکمران بنا۔ اُس نے 1380ء سے 1383ء کے درمیانی عرصے میں ہرات، قندھار، سیستان فتح کرلئے۔ اور عثمانی ترکوں کو شکست دی۔ مصر کے مملوک حکمران بھی اس کے باج گزار بن گئے۔ 1398ء میں وہ شہر پر شہر فتح کرتا ہوا دہلی پہنچا۔ دہلی کا قتل عام ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس نے تغلقوں سے حکومت لے کر سادات کے حوالے کی۔ جو اس کے نائب بن کر حکومت کرنے پر آمادہ ہوئے۔

تیمور کے حملے مغلوں کے حملے جیسے تھے۔ تاہم تیمور کی فوجی تنظیم زیادہ موثر اور منظم تھی۔ اس نے چغتائی خانوں کو شکست سے دوچار کیا۔ ایران کے ایل خان مغلوں کو مطیع کر کے ایران کو اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا تھا۔ 1404ء میں اس کی وفات کے ساتھ اس کی حکومت اس کے نااہل جانشینوں کے ہاتھوں کئی حصوں میں بٹ گئی۔ ترکوں اور مغلوں کی ترک تازیاں جو 1157ء سے ابھرنے لگی تھیں۔ وہ امیر تیمور کی وفات کے ساتھ دم توڑتے نظر آئیں۔ لیکن جیسے پہلے لکھا گیاہے کہ عثمانی ترکوں نے1373ء سے1924ء تک قریباً551سال تک حکومت کی جو1924میں ختم ہوگئی۔ اور جدید ترکی حکومت کا آغاز ہوا۔ جسکابانی مصطفیٰ کمال پاشا تھا۔

1526ء میں تخت دہلی پر ظہیرالدین محمد بابر متمکن ہوا۔ اور یوں ہندوستان میں ترکی النسل حکمرانوں کی حکومت کا آغاز ہوا۔ بابر باپ کی طرف سے تیمور اور ماں کی طرف سے چنگیز خان کی اولاد تھا۔ بابر کے جانشین بھی اپنے آپ کو ترک، تیموری یا چغتائی سمجھتے تھے۔ لیکن مورخین نے انہیں مغل اوران کے عہد کو مغلیہ سلطنت قرار دیاہے۔ مغلوں کی حکومت 1707' تک قائم رہی۔ جب اورنگ زیب عالمگیر نے وفات پائی۔ اس کے بعد چونکہ اورنگ زیب کے جانشین کمزور نکلے۔ ہندوستان میں وسط ایشیاء کے عظیم سپوتوں کی حکومتیں بھی اختتام کو پہنچیں۔ ہنوں، ترکوں، مغلوں کے پاؤں ہر مقام تک گئے۔ اورانہوں نے پوری دنیاپرانمٹ نقوش چھوڑے۔ بہت سے ممالک کی زبان، ثقافت اور روایات میں تبدیلیاں، ترکوں اور مغلوں کی یلغاروں کی وجہ سے ہوئیں۔ چین میں آج بھی ترک (اوئیغور)، قازق، کرغمز، ازبک اور تاتار بڑی تعداد میں ہیں۔ 1978ء کی مردم شماری کے مطابق55لاکھ اوئیغور ترک صوبہ سنکیانگ میں موجود تھے۔ 1957ء میں ایک اندازے کے مطابق مشرقی ترکستان سے سنکیانگ کے نام سے جو اخبار نکلتا تھا۔ وہ آٹھ مقامات سے اوئیوفوری بولی میں، چار مقامات سے قازق بولی میں، دو مقامات سے چینی بولی میں، اور ایک مقام سے منگولی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ بلغاریہ میں1990ء کے اعداد و شمار کے مطابق 17لاکھ مسلمان تھے۔ ان میں ترک (بشمول تاتاری) ایک لاکھ پانچ ہزار تھے۔ قبرص میں چھ لاکھ کی آبادی میں ایک لاکھ سولہ ہزار ترک آباد ہیں۔ البانیہ میں بھی ترک آباد ہیں۔ بوسنیا، ہرزگوینا (یوگوسلاویہ) میں بیشتر ترک آباد ہیں۔ مغربی جرمنی میں 1971ء کے اعداد و شمار کے مطابق گیارہ لاکھ کی مسلمان آبادی میں9لاکھ ترک آباد تھے۔ ہالینڈ میں دو لاکھ

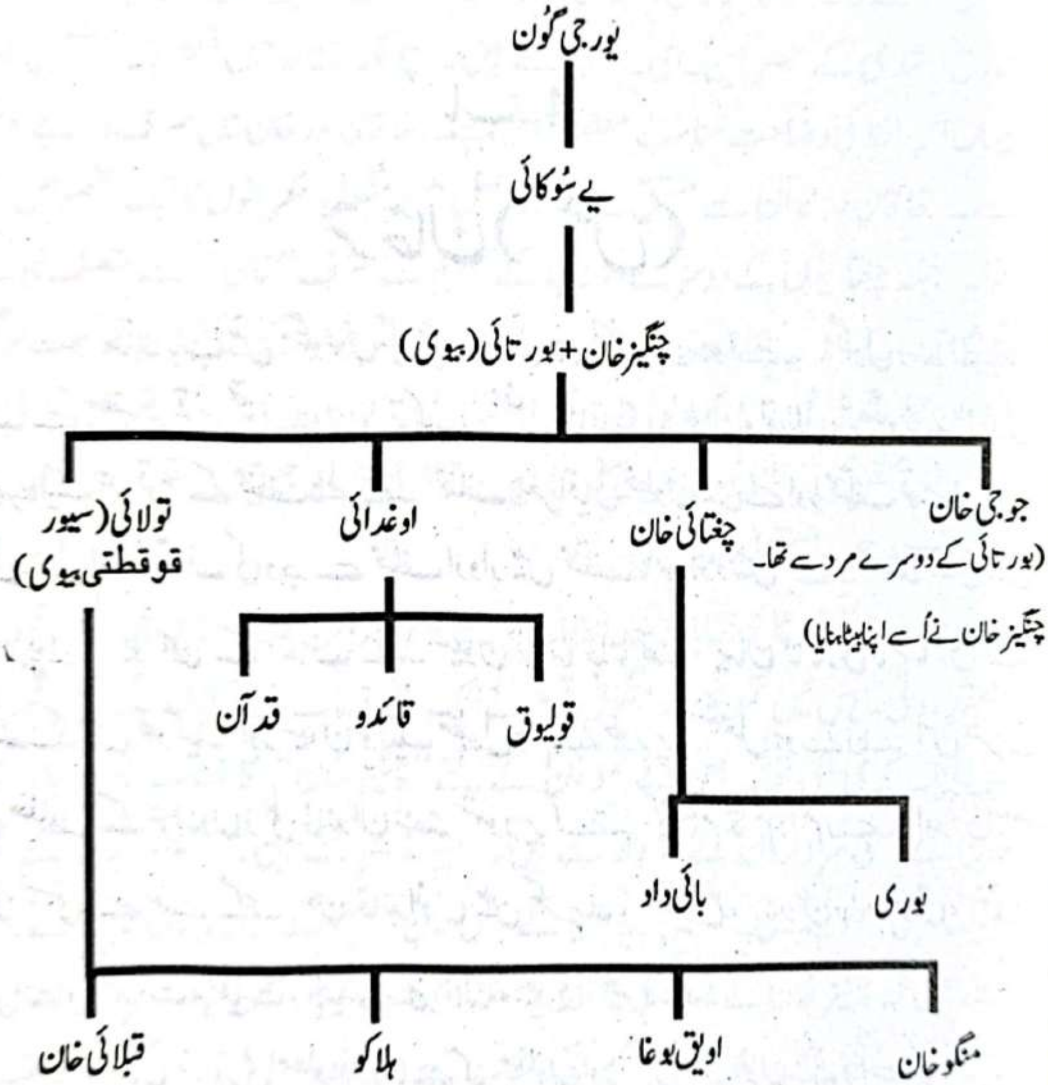
بیس ہزار یونان میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار مسلمانوں میں ترک مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ آسٹریلیا کی اسی ہزار آبادی میں ترک مسلمان زیادہ ہیں، رومانیہ میں ترک اور تاتار مسلمان زیادہ ہیں۔ ڈنمارک، سویڈن، فن لینڈ میں ترک اور تاتار موجود ہیں۔ روس کی آبادی میں بھی ترکوں کی ہر نسل کے لوگ ملتے ہیں۔ افغانستان، ایران، ہندوستان اور پاکستان میں ترک اور مغل قبائل کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سندھ کے ارغون اور ترخان حکمران مغل (ترخان) تھے۔

مغلوں سے متعلق چند اہم باتیں جو یاسا میں محفوظ کی گئیں۔ جو روایات کا حصہ بھی ہیں۔ یہاں دی جاتی ہیں۔

1. چوری اور زناکاری انتہائی قابلِ نفرت افعال ہیں۔
2. اولاد کی نافرمانی ناقابلِ قبول ہے۔
3. بیوی کی سرکشی اور شوہر کی بیوفائی ناپسندیدہ افعال ہیں۔
4. منگول کی تقدیر اس کی شجاعت سے بنتی ہے۔
5. صبر و تحمل منگول کے کردار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔
6. بہادری کے لئے "ترخان" یعنی بڑے خان کے خطابات دیئے جاتے تھے۔
7. یاسا میں جھوٹی گواہی، جاسوسی، غداری، ہم جنسیت، زناکاری اور کالے جادو کی سزا موت تھی۔
8. جو جتنی شراب پی جائے اتنا ہی محترم اور معزز سمجھا جاتا تھا۔
9. خان اعظم کے دربار میں "ترخانوں" کو سب سے زیادہ محترم سمجھا جاتا تھا۔
10. مذہبی رواداری تھی۔ ہر مذہب کے علماء، پجاری محصولات سے مستثنٰی تھے۔ مکمل مذہبی آزادی تھی۔ مسلمان، عیسائی، بدھ، آتش پرست، کافر کسی سے مذہبی معاملات میں تعرض نہ کیا جاتا تھا۔
11. گھوڑا، ان کی زندگی کا ساتھی تھا۔
12. شہبازی اور شکار ان کے محبوب مشغلے تھے۔
13. چمڑے کے جوتے (کوری) اور جانوروں کی کھال پہنتے۔
14. ہنکا شکار عام تھا۔ ہنکا لفظ بھی مغل لغت کا ہے۔
15. مرد تیر و کمان اور زین بناتے۔ خیمے اور گاڑیاں بناتے۔

16. چھوٹا لڑکا چولھے کا یعنی باپ کے گھر کا مالک ہوتا۔
17. ان میں ذات پات کی کوئی تمیز نہ تھی۔
18. ان کے خیمے کے ڈھانچے لکڑی کے ہوتے۔ لوہے سے ان کی بڑی دلچسپی تھی۔
19. بیوائیں شادی نہیں کرتیں کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اگلی دنیا میں وہی مرد اس کا خاوند ہوگا۔
20. سوکھا گوشت رکھ کر کھانے کا رواج تھا۔ گھوڑے کا بھی گوشت کھاتے تھے۔
21. عورت گھر میں چولھے کے بائیں طرف رہتی کیونکہ بائیں طرف دل ہے۔
22. پہلے لڑکے کی پیدائش سے عورت کی عزت بڑھ جاتی۔ مغلوں کی ضرب المثل ہے۔ "جوان لڑکیوں کے گیسو لمبے اور عقل کوتاہ ہوتی ہے۔"
23. جنگ میں شیروں کی طرح پیش آؤ اور امن میں قمریوں کی طرح۔
24. گھڑ دوڑ، کشتی لڑنا مشعلوں کی روشنی میں کہانی سننا، کٹھ پتلی کے کھیل تماشے مغلوں کو پسند تھے۔
25. آگ یا راکھ میں پیشاب کرنا، بہتے پانی میں کپڑے دھونا ممنوع تھا۔
26. اپنے کھانے میں شریک کرنا اور دوسروں کے کھانے میں شریک ہونا مغلوں کی روایات کا حصہ تھا۔
27. امن سے رہنا اور رشتوں کا لحاظ رکھنا فرض تھا۔
28. بھائی کی بیوہ سے شادی کا رواج تھا۔
29. مغل عورت سے مشورہ لیتے۔
30. ترک اور مغل مظاہر قدرت کی پرستش کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ نیلے آسمان پر نیکی کے فرشتے رہتے ہیں۔
31. مغل قبائل اپنے مردوں کو خاص رسموں کے ساتھ دفن کرتے تھے۔
32. مغل لکڑی اور لوہے کے کام سے نفرت کرنے والوں کو اپنے سے نہ سمجھتے۔

یہاں چنگیز خان کے خاندان کا شجرہ دیا جا رہا ہے جو ہیئر لڈ لیم کا مرتب کردہ ہے۔



باب۔4

ترخان (مغل)

سابقہ باب میں منگولوں کی ایک اجمالی تاریخ کا بیان ہوا ہے۔ منگول وسط ایشیا کی سب سے مضبوط قوم تھی۔ ہون، ترک، مغل، تاتاری، یوان، تورانی، منگول، مغول وغیرہ ایک ہی قوم کے مختلف نام تھے۔ مختلف جغرافیائی خطوں میں بسنے اور مختلف قوموں کے میل جول اور اختلاف کی وجہ سے مختلف ادوار میں مختلف نام وجود میں آئے۔ مثلاً چین میں تاتاریوں کو جو ہن کے اخلاف تھے۔ سیون نو کہا جاتا تھا۔ یہاں تاتاری نام ماضی کے دھندلکے میں کھو گیا۔ اور سیون نو ایک مقبول نام کے طور پر مستعمل ہونے لگا۔ اس طرح ان مغلوں کے ہزاروں ذیلی خاندان منصۂ شہود پر آئے۔ کئی نام قائم دائم رہے۔ اور کئی نام صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ ان خاندانوں میں مکریت، اقتیاغ، نارین، سالوجی، کلچی، اویرات، کنگرات، قیات، جیاجی، بیرلان، جوخی وغیرہ تھے۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں اور مغل حکمرانوں سے وابستہ ان القابات اور خطابات کا تذکرہ کیا جائے جو محض مغلوں کی شناخت کا باعث تھے۔ اور مغل لغت سے منسلک تھے۔ ان القابات کا استعمال مغلوں نے ہی کیا تھا۔ نسل انسانی کی کوئی اور شاخ اگر کسی لقب کو نام برائے نام کے طور پر استعمال کرے تو مغل نہیں کہلائے گی۔ مثلاً خان کا لفظ ایک مغل اعزازی نام ہے۔ پہلے زمانے میں یہ محض منگول اقوام استعمال کرتے تھے۔ لیکن اب یہ اور قوموں کے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً صمد خان، احمد خان وغیرہ اب "خان" چونکہ عمومی طور پر ناموں کے ساتھ استعمال ہونے لگا ہے۔ اسلئے ہر وہ شخص مغل نہیں کہلائے گا جو اپنے نام کے ساتھ "خان" استعمال کرے گا۔ (لفظ خان پٹھانوں کی ذاتی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں یہ ترکی لفظ ہے۔) ترکی زبان میں خان کے معنی سردار، امیر اور آقا کے ہیں۔ شروع شروع میں منگول حکمران "خان" کو اپنی سرداری

جتانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہی لفظ ارد گرد مختلف تراکیب اور مختلف شکلوں میں بھی منتقل ہونے لگا۔ مثلاً کاغان، قاآن، خاقان، ترخان، ایل خان، خانِ اعظم وغیرہ۔ تاریخِ رشدی کے مبصر این۔ ای۔ لیئس لکھتے ہیں۔ چونکہ لفظ خاقان اکثر جگہ مستعمل ہوگا۔ یہاں اس لفظ کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ خاقان اور خان میں صرف درجے کا فرق ہے۔ خاقان، قاآن سے مشتق ہے۔ جو اصل میں منگول حکمرانوں کا ایک مخصوص لقب تھا۔ جبکہ چغتائیوں کے دوسرے درجے کے شہزادے صرف ''خان'' سے متصف ہوتے۔ کچھ وقت کے بعد یہ القابات روبہ تنزل ہوئے۔ اور حکمرانوں کے ساتھ ساتھ بہت لوگوں نے ان کا استعمال کیا۔ مارکوپولو نے قاآن استعمال کیا۔ اور اسے چین کے حکمران قبلائی خان کے لئے مختص دیا۔ ''خان خانان کے متبادل ہے۔'' اسی لئے چین کے حکمرانوں کے لئے بلا امتیاز خاقان چین مستعمل ہونے لگا۔

مغلوں میں خطابات اور القابات دینے کا عام رواج تھا۔ چنانچہ جو اولین قوریلتائی منعقد ہوئی، اس میں تموچن کو منگول قوم نے ایک اعلیٰ خطاب سے نوازا۔ کہتے ہیں قوریلتائی میں ایک نجومی بھی تھا۔ اس نے تموچن کے لئے ''چنگیز خان'' کا خطاب تجویز کیا۔ چنگیز خان کے معنی سرداروں کے سردار کے ہیں۔ ہیرلڈلیم کہتے ہیں۔ ''چنگیز خان کے ٹھیک ٹھیک معنی معلوم نہیں۔ ممکن ہے اس کے معنی خانِ اعظم کے ہوں یا خان تاباں کے۔'' وہ کہتے ہیں کہ چنگیز خان نے خود کبھی خاقان یا شہنشاہ کا لقب اختیار نہیں کیا۔ بہر حال تاریخ میں تموچن ہی چنگیز خان اور خانِ اعظم کے القاب سے معروف ہوا۔ خانِ اعظم کے لقب کو بعد کے آنے والے کچھ اور سرکردہ حکمرانوں نے بھی استعمال کیا۔ لیکن وہ گنے چنے ہی خان تھے۔ مثلاً قبلائی خان، ہلاکو خان، جوجی خان وغیرہ اور مغل حکمران نے ''خانِ اعظم'' کے نام کو استعمال نہیں کیا۔ یہ امر بھی یاد رہے کہ چنگیز خان اپنی نئی رعایا کو کوئی خطاب نہیں دیا کرتا تھا۔ تاہم نئی رعایا میں موجود صاحبِ فہم و فراست افراد کو ''سنچن'' اور بہادر افراد کو ''بگھاتر'' کے خطابات دیئے جاتے تھے۔ لفظ بگھاتر مختلف شکلیں بدل کر شنا میں ''بغدور'' بنا اور یہ بغدور شاہ یا بغدور خان وغیرہ تاہم یہاں بغدور کے معنی بہادر کے ہیں۔ آج کل شنا میں لفظ بہادر ہی عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اسی طرح مغل بادشاہوں نے ارد گرد خصوصی القابات استعمال کیے۔ اور ان القابات سے معروف بھی ہوئے۔ مثلاً مشرقی یورپ کے حکمرانوں نے ''بایان''، منگولیا کے

چن خاندان کے حکمرانوں نے "جو جان"، منچوریا کے مغل حکمرانوں نے "کیتھے" اور قبلائی خان کے حکمران اولاد نے تبت میں "دلائی لامہ" کے القابات استعمال کیے۔ ہندوستان میں مغل حکمرانوں نے اپنے لئے شاہ، بادشاہ اور شہنشاہ کے القابات پسند کئے۔ مثلاً شہنشاہ ہند محمد ظہیر الدین بابر، شہنشاہ اکبر اعظم وغیرہ۔ یہ حکمرانوں کے القابات تھے اور یہ مجموعی اعزازی نام نہ تھے ہر کوئی استعمال کرتا۔ تاہم مغلوں میں کچھ اعزازی خطابات تھے۔ جو مغل شہزادے استعمال کرتے یا مغل حکمران مغل سورماؤں، کمانڈروں، جانبازوں اور لڑاکا لشکریوں کو ان کے اعلیٰ کارکردگی کی بنیاد پر عطا کرتے۔ جیسے پہلے بیان ہوا کہ یہ اعزازات محض مغلوں کے لئے مخصوص تھے۔ مثلاً ترکی لفظ میں بیگ یا بے کمانڈروں، شہزادگان اور فوجی سرداروں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ کتاب اردو انسائیکلو پیڈیا مطبوعہ فیروز سنز 1968ء میں لکھا ہے۔ بیگ یا بے ترکی اور تاتاری زبان کا ایک اعزازی خطاب ہے۔ یہ کسی وقت شہزادگان، امراء، اور معززین کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن بعد ازاں فوجی افسروں کے لئے مخصوص ہو گیا۔ دراصل جب سلجوقی ترک یورپ گئے۔ تو لفظ بیگ "بے" ہوا۔ ترکی میں انور "بے" کمال بے مشہور جرنیل ہوئے۔ جو بعد ازاں انور کمال پاشا اور مصطفیٰ کمال پاشا بنے۔ بالالفاظ دیگر "بے" "پاشا" سے نیچے درجے کا رتبہ ہے۔ پاک و ہند کے مغل اپنے نام کے ساتھ بیگ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ یہ لوگ دراصل منگولیا اور ترکستان میں سکونت رکھتے تھے۔ اور جب بابر بادشاہ کے ساتھ ہندوستان آئے تو فوجی سپاہی تھے۔ اور بیگ کہلاتے تھے۔ گلگت، ہنزہ علاقوں میں اسے نام کے طور پر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حامل نام مغل ہو۔ رونو خاندان کے شجرہ میں کئی نام "بیگ" لاحقہ کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً شاہ مرزا وزیر کے شجرہ میں ان کا جد اعلیٰ موسیٰ بیگ کا نام تھا۔ اس شجرہ میں محمد علی بیگ نامی شخص بھی تھا۔ اسی طرح کئی شین شجروں میں "بیگ" ناموں کے آگے پیچھے مستعمل ہوتا رہا ہے۔ مثلاً بونجی کے ملوے خاندان کے جد اعلیٰ ملو کے تین لڑکوں میں سے ایک کا نام "بیئے بیگ" اسی شجرہ میں اور کئی نام مثلاً دولت بیگ، وزیر بیگ، اور سلطان بیگ وغیرہ ملتے ہیں۔ ہنزہ، ورشگوم اور چترال میں بھی "بیگ" ناموں کے ساتھ بہت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وزیر بیگ، حاتم بیگ، دولت بیگ، سلطان بیگ، موہور بیگ، چلی بیگ، پویان بیگ، بوڈوڈ بیگ، وغیرہ حالانکہ یہ سب مغل نہیں تھے۔ اور خود یہ لوگ بھی دیگر نسلوں سے ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہنزہ اور گلگت علاقوں میں یشکن اقوام کے ناموں کے ساتھ "بیگ" کا عام استعمال ہوا ہے۔ ملک چین بھی "بیگ" یا"

بیگ "الفاظ سر دار، امیر اور جاگیر دار کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ وہاں آبادی کی کسی معین سیاسی، معاشرتی اور مذہبی اکائی کی ضروریات کے دیکھ بھال کے لئے جو فرد متعین ہوتا وہ "بیگ " کے نام سے موسوم ہوتا تھا۔ وہاں بھی بیک کا ماخذ "بے "ہی تھا۔ حاجی ابراہیم۔ ٹی۔ وائی۔ ما۔ چین کے مسلمان کتاب میں لکھتے ہیں۔ " تبت ' میں خدمات انجام دینے والے مانچوؤں کی ضروریات بدھ لامہ پوری کرتا تھا۔ اور سنکیانگ میں متعین مانچوؤں کی ضروریات کے کفیل وہاں کے بیگ تھے۔ (بے ایک چینی خطاب ہے۔ ترکی زبان میں بھی مقامی شہزادگان اور سرداروں کو بے کہا جاتا ہے)" محمد دین فوق لکھتے ہیں۔ کہ نامور فوجی افسروں کے علاوہ خاندان مغول کے ممتاز افراد کو بھی ان کی خدمات کے لحاظ سے یہ خطاب ملا کرتا تھا۔ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ کہ مرزا کا لفظ خاندان شاہی کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ اور بیگ کا خطاب بھی خاص خاص سر فروشان سلطنت کے علاوہ خاندان مغول کے ممتاز ممبروں کو ملا کرتا تھا۔ اس لئے بیگ اور مرزا کا استعمال ہر مغل خطاب کے لئے لازم سمجھا گیا۔ مثلاً میر زار ستم بیگ، میرزا یعقوب بیگ، وغیرہ فاضل مصنف پھر لکھتے ہیں۔ کہ بیگ میرزا اور میرزا بیگ کہلاتے ہیں۔ لفظ خواجہ کے استعمال کے بارے میں فوق کہتے ہیں۔ مگر کشمیر میں بعض لوگوں کے ناموں کے پہلے خواجہ کا لفظ بھی دیکھا گیا ہے۔ مثلاً خواجہ مصطفیٰ بیگ، اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے۔ کہ جس طرح بیگ ترکی لفظ ہے اور اس کی مونث بیگم ہے۔ اسی طرح خواجہ بھی ترکی لفظ ہے اور اس کی مونث خوجم ہے۔ اور چونکہ بیگ خاندان بھی یار قند، کاشغر وغیرہ ترکستان (منگولیا) کی طرف سے آیا ہے۔ اور بیگ خواجہ بھی ان اطراف کے الفاظ ہیں۔ اس لئے یہ لوگ میرزا اور خواجہ دونوں لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔

مغلوں میں امیر، مرزا، اور میر الفاظ بھی اہم اعزازی القابات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور یہ الفاظ بہت پہلے سے ان کے سیاسی، معاشرتی اور نسلی سلسلوں کا حصہ رہے ہیں۔ ترکی زبان میں امیر اور میر کے معنی افسر اور سردار کے ہیں۔ اس لئے یہاں میر اور امیر اعلیٰ لشکری اور معاشرتی رتبوں کا اظہار تھے۔ جیسے امیر آتش، میر تزک، میر آخور وغیرہ۔ محمد دین فوق تاریخ اقوامِ کشمیر صفحہ نمبر 209 میں لکھتے ہیں۔ چنانچہ میر علی بخاری جو حدود ترکستان و مغولستان ہی سے بڈشاہ کے زمانے میں کشمیر آئے تھے۔ ان کے نام کے ساتھ میر کا لفظ کشمیر آنے سے پیشتر ہی رائج تھا۔ میر بجائے خود ترکی لفظ ہے۔ اس کا تعلق امیر افسر سے ہے۔ بہر حال اس کے رائج کرنے والے مغولستان کے لوگ ہی تھے۔

محمد دین فوق ہر تاریخ گلش کشمیر (غیر مطبوعہ) کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔"
میر قوم کی اصلیت کو میرزا یا امیر ظاہر کر کے لکھا ہے۔ یہ لوگ مغل ہیں۔ پھر صاحب موصوف لکھتے ہیں۔ کہ مغل میرزا یا میر کس طرح مشہور ہو گئے۔ اس کی تفصیل درج ذیل کے الفاظ سے معلوم ہو گی۔ مغول خان کی اولاد میں کئی پشتوں کے بعد دو فرزند قبل خان، اور قالوچی پیدا ہوئے۔ قبل خان اور اس کی اولاد کو یکے بعد دیگرے سلطنت نصیب ہوتی گئی۔ اور قالوچی بہادر اور اس کی اولاد کئی نسلوں تک سپہ سالاری کے منصب پر رہی۔ قالوچی بہادر نے اپنے لئے امیر کا لقب پسند کیا۔ اور اس کی اولاد بھی اسی لقب سے مشہور ہوتی گئی۔ تیمور گورگان اسی کی نسل سے تھا۔ اور ہر چند کا شہنشاہ تھا۔ لیکن امیر تیمور ہی کے نام سے مشہور ہوا۔ امیر کا لفظ اسی سلسلہ نسب میں عام ہوا۔ اور اس تعلق سے حکمران کی اولاد امیر زادوں کی صف میں شامل ہوئی۔ اور اس خاندان کے شہزادے امیر زادے بنے۔ لفظ امیر زادہ آہستہ آہستہ ہیت بدل کر میرزا کی صورت میں نمودار ہوا۔ اور مغل اسے اپنے نام کے آگے پیچھے استعمال کرنے لگے۔ مثلاً میرزا اسلم بیگ، میرزا مقبول بیگ بدخشانی، یا محمد الیاس میرزا لیکن آہستہ آہستہ اور اقوام نے بھی محض برائے نام استعمال کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ مغل نہ تھے۔ مثلاً شاہ مرزا، مرزا علی، گلگت کے شجروں میں بہت سے اقوام نے لفظ مرزا کو بھی ایک نام کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لیکن جہاں تک مغل افراد کا تعلق ہے وہ اپنے پورے نام کے ساتھ اسے لاحقہ یا سابقہ کے طور پر استعمال کرتے آئے ہیں۔

بلوچستان میں تقریباً اکثر "تکر" کے سربراہ "میر" (بہ معنی سردار) بطور سرداری لقب استعمال کرتے رہے ہیں۔ اگر چہ چند قبائل کے علاوہ زیادہ تر سردار یا تو بلوچ ہیں۔ یا افغان ہیں۔ یا کسی اور خانوادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مری قبائل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ منگول ہیں۔ ان میں ایک قبیلہ لوہارانی بہت مشہور ہے۔ جو لوہار (مغل) سلسلہ نسب سے تعلق رکھتا ہے۔ بلوچستان میں "تکر" ایک خانوادہ کی اکائی کو ظاہر کرتا ہے۔ شینا میں اس اکا مبدل ڈوکر ہے۔ تکر اور ڈوکر کتنے ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ کیوں نہ ہو بلوچ اور افغان اور گلگت کے شین ایک لسانی ڈھانچے سے منسلک ہیں۔ قلات کے سرداروں نے "میر" کو عام استعمال کیا ہے۔ بلوچستان کے قبائل مترجمہ پروفیسر ایم انور رومان صفحہ 87 میں لکھا ہے۔ مذہبی القابات میں سابقہ "میر" یا میرا اور لاحقہ "شاہ" (جو سادات استعمال کرتے ہیں) لیکن "میر" براہوئی، کابرین کے لئے بھی مستعمل ہے۔

اسی کتاب کے صفحہ 304 میں مندرج ہے۔ قبیلہ جیسے مقامی طور پر خوم (قوم) کہتے ہیں۔ کئی گروہوں میں منقسم ہے۔ نرے بڑے حصے یا طائفے "ٹھکر" کہلاتے ہیں۔ (آگے ٹھکر کو ٹکر لکھا گیا ہے) ان کے چھوٹے حصے شلوار (رشتہ داری کا ہم معنی لفظ) جن کے مزید چھوٹے چھوٹے حصے پرایا خاندان جبکہ "زئی" ایک عام اصطلاح ہے۔ جو قبیلہ یا اس کے کسی حصہ کی ترجمان ہو سکتی ہے۔ ہر قبیلہ کا سربراہ ہے اس کے بعد میر آتے ہیں۔ جو طائفوں کے سربراہ ہیں۔ (یہ اصطلاح سردار کے بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں کے لئے بھی مستعمل ہے) ان کے بعد معتبر یا کماش ہیں جو ہر ٹھکر کی شلواروں کے سربراہ ہیں۔ قبیلہ کے سرداروں اور بڑے طائفہ کے "میر" کا منصب موروثی ہے۔ یہی وجہ ہے میر ٹکر یعنی نسل پاروں کا سربراہ کہلاتا ہے۔ اور نسل در نسل "میر" خاندان میں بلا لحاظ اس کے کوئی خاندان کا سربراہ رہا یا نہیں۔ ناموں کا حصہ بنا اور یوں یہ بلوچستان میں عام ہوا۔ خیر پور، حیدر آباد، اور میر پور پر مشتمل علاقہ سندھ پر چند بلوچی سردار حکمران تھے۔ جو امیرانہ سندھ کے نام سے معروف تھے۔ لارڈ ایلن برانے 1823ء میں ان کو شکست دیکر ان علاقوں کو انگریزی مملکت کا حصہ بنا دیا تھا۔

در حقیقت "امیر" کا لقب مغلوں کے استعمال سے بہت پہلے عرب میں مستعمل تھا۔ عربی میں اس کے معنی قائد، سالار اور حاکم کے ہیں۔ خلفائے راشدین کو "امیر المومنین" کے معزز خطابات سے نوازا گیا۔ یعنی مومنوں کے امیر بہ معنی حاکم یا سردار یا حکمران کے تاہم بعد میں اموی حکمرانوں نے اس لقب کو ترک کیا۔ اور خلیفہ کے لقب کو رواج دیا۔ جو بعد کے مسلمان حکمرانوں نے جاری رکھا۔ اموی دور میں صوبوں کے گورنروں کے اسسٹنٹ، نائب امیر کہلاتے تھے۔ اور فوجوں کے سربراہ امیر عسکر کے نام سے موسوم ہوتے تھے۔ اس طرح لفظ امیر کو مسلمانوں نے قائد، حاکم، رہبر، سالار، لیڈر، اور کسی جماعت کے سربراہ کے لئے عام استعمال کیا۔ 1818ء سے کابل کے بارک زئی حکمرانوں نے "امیر" کے لقبی نام کو استعمال کیا۔ اور یہ سلسلہ امیر دوست محمد خان سے ہوتے ہوئے امیر امان اللہ خان تک آیا۔ اس کے بعد حکمران یعنی محمد نادر شاہ اور ظاہر شاہ بادشاہ کہلائے۔ "امیر" فارسی میں مخفف ہو کر "میر" اور یہ لقبی نام "سردار" کے معنوں میں ایران، بلوچستان، افغانستان اور اردگرد استعمال ہو کر عام ہوا۔ اس سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور مضمون سادات وعلیوین مطبوعہ معارف اکتوبر 1945ء کے حوالے سے محمد عبداللہ قریشی اپنے مضمون کشمیری ذاتوں کے عجائبات میں لکھتے ہیں۔ حجاز میں حسنی و حسینی کے امتیاز کے لئے حسینوں کو "الشریف" اور

حسینیوں کو "سید" کے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ پچھلے دور میں بھی یہی تھا اور اس دور میں بھی یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ ایران اور سادات کو خواہ حسنی ہوں یا حسینی سید، میر کے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ یہی رواج ترکی ہندوستان میں بھی ہے۔

میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ لفظ "امیر" مغلوں کے استعمال سے بہت پہلے عربی لغت میں موجود تھا۔ اور یہ امر کرنے والا، حکم دینے والا، سردار، حاکم کے معنوں میں مستعمل تھا۔ اور یہ لفظ عرب کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے میں سربراہ اور منتظم اعلیٰ کے لئے استعمال ہو رہا تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں اسے عام مقبولیت ہوئی یعنی امیر المومنین، امیر عسکر، امیر داد، امیر الامرا، امیر البحر، امیر الجیوش وغیرہ کی صورت میں رائج ہوا۔ اموی اور عباسی دور میں امیر المومنین کی اصطلاح کے سوائے دیگر تراکیب عام استعمال ہو رہے تھے۔ امیر زادہ فارسی ترکیب میں امیر کے بیٹے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ زادہ فارسی لاحقہ ہے۔ یوں امیر، امیر زادہ الفاظ عربی اور فارسی زبان میں مغلوں کے استعمال سے پہلے رائج تھے۔ فارسی کے "امیر زادہ" سے میرزا کا ظہور ہوا اور میرزا بھی فارسی لغت کے مطابق اعلیٰ درجے کے منشی یا کلرک کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ جہاں تک لفظ میر کا تعلق ہے۔ یہ عربی لفظ امیر کا مخفف ہے۔ عربی اور فارسی میں یہ امیر لفظ کا مترادف ہے۔ تاہم یہ بات یاد رہے کہ عرب، ایران اور افغانستان کی طرف امیر، میر اور مرزا کے الفاظ کو مغلوں کے علاوہ اور اقوام نے نام برائے نام یا رتبے کے علاوہ نسلی شناخت کے لئے کبھی استعمال نہیں کیا۔ مغولستان میں یہ الفاظ نہ صرف مغلوں کے نام کا حصہ رہے ہیں۔ بلکہ نسلی شناخت کا ذریعہ بھی۔ امیر تیمور کا نسب چنگیزی نسب کا اہم جز تھا۔ خود اس سلسلہ میں تقریباً تمام نام "امیر" سابقہ کے ساتھ شروع ہوتے ہیں۔ امیر تیمور کے والد کا نام امر ترگئی تھا اس شجرہ میں امیر الطنگیز، امیر ایجل، میر، اقراچار، امیر سوغوچچن، امیر امردم، امیر قچور، وغیرہ نام بھی ملتے ہیں۔ امیر تیمور نے 1336ء میں حکومت سنبھالنے کے بعد "امیر القدر" کا لقب اختیار کیا تھا۔ جسکے معنی بڑائی والے کے ہیں۔

ہندوستان میں مغلوں نے لفظ "میر" کو اپنی نسلی شناخت ظاہر کرنے کے لئے اپنے نام کیساتھ بعد میں استعمال کیا۔ یہاں بھی ایران کی طرح لفظ میر نام کے شروع میں کسی کی سیادت کا اظہار تھا۔ تاہم کچھ استثنائی صورتیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً حیدر آباد کے فرمان روا میر محبوب علی خان، میر عثمان علی خان، جیسے ظاہر ہے اپنے نام کے آگے میر لفظ کا استعمال کرتے

تھے۔اس لئے کہا جاسکتا ہے۔ کہ اگر کوئی "میر" ہونے کا دعویٰ کرے اور اس سلسلہ نسب میں میر کسی نام کے آگے یا پیچھے ہو تو وہ سوائے مغل ہونے کے کسی اور خاندان سے جڑ نہیں سکتا۔ اس طرح مرزا لقب اختیار کرنے والے مغل محض اپنی شہزادگی جتانے کے لئے اس لفظ کا استعمال کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ امیر تیمور کے دور اور اس کے بعد جہاں کہیں مغل رہے یا ایک مقام سے دوسرے مقام تک نقل مکانی کی، مغل شہزادوں نے "مرزا" اور "میر" کے القابات اپنے نام کا دم چھلا بنائے رکھا۔ جیسے لوگ رانا، راؤ، راجہ، راٹھور، ملک وغیرہ اپنے ناموں کے ساتھ ملائے رکھتے تھے۔

"میر" لفظ کے حوالے میں سے میں ایک فیصلے کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ جیسے پہلے بیان ہوا ہے کشمیر اور ہندوستان میں "میر" نام کے سابقہ کے طور پر سید کے لئے ہی مخصوص ہوتا ہے۔ اور لاحقہ کے طور پر اس کے مغل ہونے کی دلالت کرتا۔ اور یہ بات ثابت بھی ہے۔ کہ بہت سے ترک، مغل اور دیگر قومیں کشمیر میں آتی رہیں۔ کچھ مستقل آباد ہوئیں۔ اور کچھ ارد گرد نقل مکانی بھی کرتی رہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کشمیری قومیں ہندوستان، نیپال، بھوٹان، سکم، تبت، مشرق بعید، برطانیہ، امریکہ دنیا کے تقریباً ہر حصے میں آباد ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری قوم ایک متحرک قوم ہے کہتے ہیں کسی پرانے زمانے میں کریم بخش نامی ایک شخص کشمیر سے چل کر سیالکوٹ میں جا آباد ہوا۔ اسی کریم بخش کی اولاد میں منشی نظام الدین نامی شخص عرائض نویسی کیا کرتے تھے۔ آپ کبھی میونسپل کمشنر بھی رہ چکے تھے۔ 8 دسمبر 1929ء کو ایک شخص پیراند تا ولد میراں بخش سے ایک کنال اراضی خریدی۔ جب انتقال اراضی درج کرانے کے حوالے سے اقدام کا وقت آیا تو نارووال تحصیلدار نے انتقال درج کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ مدعی زراعت پیشہ اقوام میں شامل نہیں۔ حالانکہ 13 مارچ 1920ء کو کلکٹر ضلع سیالکوٹ نے منشی نظام الدین میر کو مغل زراعت پیشہ قرار دیا ہوا تھا۔

منشی نظام الدین نے 7 مئی 1930ء کو سب جج کی عدالت میں استقرار حق کا دعویٰ دائر کیا۔ مختلف مباحث کے بعد جس فیصلے کا اعلان ہوا اس میں لکھا گیا۔ "اب ہمیں دیکھنا ہے کہ لفظ "میر" سے کیا مراد لی جاتی ہے۔ اگر لفظ میر کو شروع میں لگا دیا جائے تو محض ایک معزز خطاب ہے۔ ہاں اگر یہی لفظ کسی نام کے بعد میں آجائے تو اس سے سمجھا جاتا ہے کہ یہ مرزا کا مخفف ہے۔ جو مغل کا معزز خطاب ہے۔ رپورٹ مردم شماری ہند 1911ء میں صفحہ 126 پر

205 کے حاشیہ میں مغلوں کی سات گوتیں بتائی گئی ہیں۔ جن میں "میر" کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ میر مغل زراعت پیشہ ہیں۔ اسی کتاب میں "سید" کو "میر" سے جو پروہت جماعت ہیں۔ علیحدہ بتا کر لکھا گیا ہے۔ زراعت پیشہ میر کی حالت میں "میر" نام کے بعد لگایا جاتا ہے۔ اور سید کی صورت میں میر نام کے آگے لگایا جاتا ہے۔ ایسے مستند حوالہ جات کی موجودگی میں بلا شبہ یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ میر کشمیری مغل زراعت پیشہ ہیں۔ پنجاب میں جو جماعتیں میر کہلاتی ہیں۔ فقط "سید" یا میراثی ہیں۔ لیکن کشمیری مغلوں کے سوا اور کوئی میر نہیں کہلاتا کتاب ویلی آف کشمیر از والٹرایل لارنس کے صفحہ 309 کے اقتباس سے جن کی نقل شامل مثل ہے۔ پایا جاتا ہے کہ میر مرزا کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مغلوں کے نسل سے ہیں۔ بہر حال مدعی بلا شبہ کشمیری میر ہیں۔ اور کشمیری میر سے مراد سوائے مغل کے اور کچھ نہیں۔ اور مغل اس ضلع میں زراعت پیشہ ہیں۔ لہذا مدعی زراعت پیشہ ہے۔ اور اس استقرار کا مستحق ہے۔ جس کے لئے اس نے درخواست دی ہے۔ اسی طرح ایک اور فیصلہ کہ مغل زراعت پیشہ ہیں کہ نہیں ڈسٹرکٹ جج گجرات کا ہے۔ فیصلے کی تاریخ 15 اکتوبر 1931ء ہے۔ فیصلہ کی تفصیل درج ذیل ہے۔ مستغیث صوبیدار میجر و آنریری مجسٹریٹ محمد خان نے یہ دعویٰ دائر کیا ہے کہ اسے مغل قرار دیا جائے جو ضلع گجرات میں مشتہرہ زراعت پیشہ قوم ہے۔ مستغیث نے یہ بھی کہا کہ کاغذات مال میں غلط طور پر اس کی ذات کشمیر درج کی گئی ہے۔ کیونکہ کشمیری در حقیقت کوئی ذات نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ مقصد بالکل واضح ہے۔ معزز گواہوں نے مستغیث کے مغل ہونے کی شہادت دی۔ کاغذات مال میں بھی کشمیری ظاہر کیا گیا ہے۔ اور الفاظ "میر کشمیری" کے اس کے سوائے اور معنی نہیں کہ وہ مغل ہے۔ مردم شماری ہندوستان بابت 1911ء جلد 20 کشمیر حصہ دوم میں صفحہ 126 پر مغلوں کو حسب ذیل ذاتوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ بیگ، چوعطہ، میر، قزلباش۔ اسی رپورٹ مردم شماری میں صفحہ 205 کے حاشیہ پر ان مغلوں کو جو خراسان و ترکستان سے نقل وطن کر کے آئے ہیں۔ سات گوتوں میں دکھایا گیا ہے۔ اور ان میں سب سے پہلی گوت میر ہے۔ جو میرزا کا مخفف ہے۔ یہ میر زراعت پیشہ ہیں۔ اور سید میروں سے بالکل الگ ہیں۔ سید میر مذہبی پیشواؤں کی گوت ہے۔ ان دونوں گوتوں کا بین فرق یہ ہے کہ مغل میر تو اپنے نام کے بعد میر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور سید میر کو اپنے نام سے پہلے رکھتے ہیں۔ اس لئے کشمیر میں میروں سے صرف مغلوں ہی کی گوت مراد ہے۔ جیسا کہ مستغیث نے دعویٰ کیا ہے۔ کشمیری کوئی ذات نہیں ہے۔ اور فرہنگ کے

صفحہ 478 جلد دوم میں بھی جسکا حوالہ مرافعہ گزار کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ لفظ کشمیری کا استعمال کشمیری افراد کے لئے ہے جو ہر صورت ایک جغرافیائی اصطلاح ہے۔ اور جس میں بہت سی ذاتیں ہیں۔ صفحہ 479 میں بتایا گیا ہے کہ قبائل کشمیر کے مکمل حالات سر والٹر لارنس کی کتاب ویلی آف کشمیر کے باب 12 صفحہ 309 پر بھی درج ہے۔ ان میں میر ذات کو مغل ظاہر کیا گیا ہے۔ اور لفظ میر کو میرزا کی بگڑی ہوئی صورت بیان کی گئی ہے۔ امپریل گزٹیئر آف انڈیا جلد 15 صفحہ 103 پر بھی مسلمانان کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے میر ذات کو میرزا کی بگڑی ہوئی صورت اور میر کو مغلوں کی ایک گوت ظاہر کیا گیا ہے۔ فاضل سرکاری وکیل مجھے ایک بھی ایسی سند نہیں دکھا سکا۔ جس میں لفظ میر کشمیری کو مغل کے سوا کسی اور مفہوم میں استعمال کیا گیا ہو۔ اس لئے مستغیث کی اپیل اصطلاحی طور پر اس حد تک منظور کی جاتی ہے کہ وہ مغل ہے"۔

مغلوں کے القابات میں "لوہار" بھی ایک اعزازی نام کی حیثیت سے ظہور میں آیا۔ اور مغلوں کی معاشرت کا حصہ بن کر رہا۔ کہتے ہیں کہ یہ قدیم ژند اوراز بک بولیوں میں مروج تھا۔ اور سیاہ ہنوں مغربی چین، منگولیا اور جھیل بیکال کے ارد گرد بولتے چالتے تھے۔ جیسا کہ لفظ کی ساخت سے ظاہر ہے یہ دو الفاظ لوہ اور آر سے مل کر بنتا ہے۔ ہنوں کی ان بولیوں میں "لوہ" سرخ کے معنوں میں مستعمل تھا۔ اور "آر" اسم فاعل کے طور پر مستعمل ہونے کی وجہ سے اس کے معنی سرخی یعنی خون بہانے والے اور جنگ و جدل کرنے والے یعنی جنگجو کے بتائے جاتے ہیں۔ چونکہ لوہا گرم ہونے کے بعد سرخ ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ دھات اپنی سرخی کے حوالے سے لوہا کہلائی اور مغولستان میں یہ اصطلاح ہو کر منگول لغت کا حصہ بنے۔ جب ہنوں 455ء میں برصغیر پاک و ہند آئے تو یہ الفاظ بھی اس اقلیم میں بولے جانے لگے۔ چونکہ لوہا ہتھیاروں کا اہم بنیادی جز تھا۔ اور ہنوں کے توسط سے اس کا عام استعمال بھی ہوا۔ اس لئے یہ لفظ مقامی زبانوں میں سما کر رہ گیا۔ درحالانکہ یہ ایک غیر ملکی منگول لفظ ہے۔ : محمد الیاس مرزا اپنی کتاب " تاریخ مغلیہ " میں لفظ "لوہار" کا ہندوستان و پاکستان میں تعارف کے حوالے سے لکھتے ہے۔

(1) لفظ لوہار کے معنی جنگجو بہادر کے ہیں۔ چنگیز خان کے آباؤ اجداد قدیم زمانے سے یہ لفظ استعمال کرتے آئے ہیں۔ جب منگول قوم نے قبلِ مسیح میں مشرق کی طرف سے دریائے برہم پتر کے راستے ہندوستان پر حملہ کیا تو لفظ اس وقت منگول استعمال کر رہے تھے۔ یہ منگول ہند میں مگول نام سے یہاں کے قدیم باشندوں کی ایک جماعت کی حیثیت سے روشناس ہوئے۔

(2) ہندوستان کا شاہی مغلیہ خاندان انجینئرنگ اور صنعت، و حرفت، عمارت کا کام، چوب کاری اور اسلحہ سازی میں پیش پیش رہا ہے۔ اس لئے لوہے کی دھات سے کام کرنے والے مغل قبائل یہاں بھی لوہار کہلائے۔

(3) راجہ لوہ جن کے نام سے لاہور شہر بسا، وہ ایشائے کوچک کی آریائی اقوام سے تعلق رکھتا تھا۔ مختلف مورخین راجہ لوہ کو ہن نسل سے ظاہر کرتے ہیں۔ آرین اقوام منگولوں کی ہم نسب تھیں۔ راجہ لوہ کی اولاد میں بعض لوگ لوہار کہلائے جن کا یہ نام رفتہ رفتہ آر، لہٰ آر، لہار اور لوہار کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔

(4) ہندوستان کا مشہور لوہار خاندان جو والئی ریاست لوہارو بھی تھا۔ منگول نسل سے تھا۔ اس خاندان کی جاگیر ریاست لوہارو کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کا دارالحکومت لوہارو شہر تھا۔ جو آج بھی دہلی سے بیکانیر جانے والی ریلوے لائن پر دہلی سے 174 دور جنکشن ہے۔ اس لفظ لوہار سے تبدیل ہو کر لوہارو بنا۔

(5) بلوچستان کے قبائل میں ایک مری ہے۔ اس کی شاخ لوہارانی ہے۔ یہ قبیلہ افغانستان سے یہاں آیا۔ اس منگول قبیلہ کا نام یہاں آکر لوہارانی میں تبدیل ہو گیا جو آج بھی مستعمل ہے۔

(6) سندھ میں آباد مغلوں کی ایک شاخ لار یعنی لہ آر ہے۔ یہ قوم ایران کے ایک صوبے میں آباد ہے۔ اس کا دارالحکومت بھی لہار کہلاتا ہے۔ یہ لفظ مغل قوم کے نام لوہار سے بگڑ کر "لار" رہ گیا۔

کشمیر کی ریاست پونچھ پر لوہار (مغل) راجوں نے 1017ء تا 1177 تک 160 سال 2 ماہ 5 ایام بڑے دبدبے سے حکومت کی یہ کشمیر کے حکمرانوں کے سیاسی حریف تھے۔ یہ راجگان لوہر کوٹ کے نام سے معروف ہوئے۔ 1023ء میں محمود غزنوی نے لوہر کوٹ پر حملہ کر کے قلعہ لوہار کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لیکن برف باری اور نامساعد حالات سے مجبور ہو کر محاصرہ اٹھالیا اور ناکام و نامراد لوہر کوٹ سے چلا گیا۔ یہ راجے ہنوں کے اولاد بتائے جاتے ہیں۔ جو چینی ترکستان کی طرف سے براستہ تبت ر لداخ آکر بس گئے تھے۔

مغلوں کے القابات میں سب سے اہم لقب 'ترخان" تھا۔ جس کے معنی بڑے خان کے ہیں یہ ایک بڑا اعزازی نام تھا۔ اور ابتدائی منگول کلچر کا حصہ بن چکا تھا۔ شروع شروع میں جب منگول قبائل جھیل بیکال کے اردگرد یکجا ہو رہے تھے۔ تو وہ اپنی جنگجویانہ حملوں سے دیگر

اقوام کا صفایا کر رہے تھے۔ اس وقت ان جنگجو قبائل کے سردار نویان اور ترخان کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہیر لڑیم اپنی کتاب "تاتاریوں کی یلغار" میں لکھتے ہیں: "اب اس جاگیر دارانہ دھند لکے میں قبائلی معاشرے کی صورت بدل گئی تھی۔ اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے منفرد جنگجو "ترخان" کہلاتے تھے برسر اقتدار ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے لفظ "ترخان" کو منگولوں نے بہت پہلے استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ اور یہ ان کی عسکری تاریخ کا ایک نادر تحفہ تھا۔ ہر وہ شخص جو منفرد اور اعلیٰ درجے کا عسکری کام نبھاتا یا وفاداری اور جانثاری کے کارنامے انجام دیتا اسے ترخان کے لقب سے ملقب کیا جاتا۔ جب چنگیز خان نے عروج حاصل کیا تو اس نے اسے ایک بڑے منگول اعزاز کے طور پر رائج کیا اور محض منگولوں کے لئے مختص کیا۔ چنگیز خان یہ اعزاز اپنے ان جانثاروں کو دیتے جو جان پر کھیل کر اس کی حفاظت کرتے تھے۔ کتاب چنگیز خان میں تورا کینہ رقم طراز ہیں: "لیکن خان نے ان بہادروں کو بڑے اعزازات عطا کئے۔ جنہوں نے معرکوں میں اپنی جانوں پر کھیل کر اس کی حفاظت کی تھی۔ اس نے انہیں "ترخان" کے خطابات عطا کئے۔ اور ان کا مرتبہ دوسروں سے اونچا قرار دیا۔ انہیں اس کی اجازت تھی کہ جب چاہیں بے تکلفانہ اور بلا اجازت شاہی یورت میں چلے آئیں۔ ہر جنگ میں مال غنیمت کے بہترین حصے پر ان کا حق سمجھا جاتا تھا۔ انہیں ہر قسم کا خراج معاف تھا۔ ان کی کوئی غلطی غلطی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اور نو مرتبہ انہیں موت کی سزا معاف تھی۔ جو زمین وہ پسند کرتے وہ انہیں عطا کی جاتیں۔ اور نو پشتوں تک ان کی اولاد بھی ان ہی حقوق کی مالک قرار دی جاتی۔

چنگیز خان نے اپنے ایک جان نثار ساتھی قشلق (QISHILIQ) کو "ترخان" کے خطاب سے نوازا تھا۔ جسے بعد میں چغتائی امیروں کے زمرے میں شامل کیا گیا۔ یہ اعزازی خطاب اس کی اولاد میں منتقل ہوتا گیا۔ اسی کی اولاد میں سیف الدین ترخان اور غیاث الدین وغیرہ تھے۔ جنکا امیر تیمور کا بااثر سرداروں میں شمار ہوتا تھا۔ غیاث الدین ترخان کی تین لڑکیوں کی شادی امیر تیمور کے تین لڑکوں اور پوتوں سے ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک لڑکی تیمور کے فرزند شاہ رخ کی بیوی تھی۔ جو انتہائی بااثر اور طاقتور خاتون تھی۔ اور امور مملکت میں بڑا دخل رکھتی تھی۔

(صفحہ 186 رائز اینڈ رول آف تمبر لینڈ از پیٹر ائس)

ترخان (مغل) قبائل بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بنے اور انہیں وسیع زمینوں پر بسایا گیا اور اس طرح ان کی مخصوص جاگیری بیلٹ وجود میں آئے۔ ابن خلدون اپنے تاریخی

مقدمہ میں لکھتے ہیں ''اور چھٹی اقلیم کے پانچویں حصے میں پھر چوتھے حصے کے آخیر میں یہ قطعۂ آبِ بحرِ نیطش کے پاس خلیب سے ملتا ہوا اپنی سمت میں مشرق کی جانب آگے بڑھتا ہے۔ اور پورے حصہ اقلیم سے گزر جاتا ہے۔ بلکہ چھٹے حصہ کے بعض علاقہ سے بھی۔ اور اپنے مبداء سے تیرہ سو میل مسافت طے کرنے کے بعد چھ سو میل کے عرض پر ختم ہو جاتا ہے۔ اسی سمندر کے عقب میں پانچویں حصہ اقلیم کے جنوب میں مغرب سے مشرق کی طرف ایک لمبا خشکی کا قطعۂ زمین ہے۔ جس کے مغرب میں ہر قلیہ، بحر نیطش کے ساحل پر واقع ہے۔ جو پانچویں اقلیم سے آنے والی سر زمین بلقان سے ملتا ہے اور اس کے مشرق میں بلادلان ہے۔ اس کا دارالحکومت سو تلی ہے۔ جو نیطش کے ساحل پر آباد ہے۔ بحر نیطش کے شمال میں اس حصہ اقلیم کے مغرب میں ''ترخان'' کا علاقہ اور مشرق کی جانب روس کا ملک ہے۔ جو دور تک ساحل پر چلا گیا ہے۔ ولایت روس ''بلادِ ترخان'' کو اس حصے میں مشرق کی طرف سے قلیم ہفتم کے پانچویں حصہ میں اور چھٹی اقلیم کے چوتھے حصہ میں مغرب کی طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ترخانوں کی سر زمین بڑے وسعتوں کی حامل تھی۔ اور دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ ترخان مغل معاشرے میں بہت با اثر طاقتور اور شاہی درباروں کے قریب خیال کئے جاتے تھے۔ اس لئے عام منگول ترخانوں کی ملازمت اختیار کرنے کی آرزو کرتے کیونکہ ترخانوں کے ملازم بھی بڑی بڑی حیثیتوں کے مالک ہو جاتے۔ ترخانوں کی پہچان کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا۔ کہ وہ اس خطاب کو اپنے نام کا جز بنائے رکھیں تاکہ اعلیٰ جانثاروں کی پہچان میں آسانی ہو۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے۔ کہ ترخانوں کی اولاد نو نو پشت تک شاہی اعزاز کی سہولیات سے مستفید ہو سکتی تھی۔ اس لئے یہ خطاب ان مغلوں کے نام کا حصہ بن کر رہا جو ترخان سے لقب کئے گئے تھے۔ اس طرح یہ اعزاز نسل در نسل مغل ترخانوں کے سلسلے میں منتقل ہوتا گیا۔ جہاں کہیں ترخانوں نے نقل مکانی کی یہ نام بھی ان اجنبی معاشروں میں داخل ہوا جہاں لفظ ترخان کسی طرح مستعمل نہ تھا۔ مثلاً جب مغل ترخان سندھ میں آئے تو چونکہ وہ ترخان خطاب یافتہ تھے۔ اس لئے وہ یہاں اسی نام کے حوالے سے مشہور ہوئے۔ سندھ کے ارغوں اور ترخان دونوں اپنا تعلق لباقہ بن ہلاکو بن تولائی بن چنگیز خان سے ملاتے ہیں۔ چنگیز خان ہی نے اپنے دور اقتدار میں ایران فتح کر کے مغل سلطنت کا حصہ بنالیا تھا۔ 1256ء میں ہلاکو خان جو ایل خان (چھوٹے خان) کے لقب سے موسوم تھے۔ تختِ ایران پر براجمان ہوئے۔ 1256ء سے 1291ء تک ہلاکو اور اس کی اولاد ایران اور عراق پر بر

سر اقتدار رہی۔ یہ ایل خانی دور حکومت کہلاتا ہے۔ جبکہ سندھ کی مغلوں کی حکومت ترخانی حکومت کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور یہی ترخانیوں کی آزاد حکومت تھی۔ جو ایک لمبے عرصے تک سندھ میں جاری رہی۔ اس حکومت کی عظمت کا اندازہ مکھلی کے عظیم قبرستان سے لگایا جا سکتا ہے۔ سندھ کے حکمران ترخان کیسے کہلائے اس حوالے سے کہا جاتا ہے۔ کہ سندھ کے حکمرانوں کے ایک جد ایکو تیمور نے ایک لڑائی میں امیر تیمور کی جان بچاتے ہوئے خود اپنی جان کی قربانی دی تھی۔ امیر تیمور یہ لڑائی تکتمش خان کے خلاف لڑ رہا تھا۔ امیر تیمور نے ایکو تیمور کو بعد از مرگ ترخان کے خطاب سے نوازا۔ اور یوں ایکو تیمور کی اولاد جو سندھ میں بر سر اقتدار آئی ترخانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی خاندان میں ارغوں کی دو شاخیں نکلیں۔ ایک شاخ جو بڑے لڑکے شاہ ملک سے چلی اگر چہ یہ اصلاارغوں تھی۔ یہ بھی ترخان کے نام سے معروف ہوئی۔ (تاریخ ارغوں اور ترخان آف سندھ (1507 تا1593) از میر معصوم ترجمہ و تبصرہ محمود الحسن صدیقی کراچی یونیورسٹی چنگیز خان کے بعد امیر تیمور جس نے بڑی لڑائیاں لڑیں وسط ایشیاء بر صغیر ہندوپاکستان ایران افغانستان اور ارد گرد بہت سے علاقوں کو اپنی وسیع سلطنت کا حصہ بنالیا۔ اس اعزاز کو اپنے جانثار ساتھیوں کو دیا کرتا تھا۔ ان کے دور میں بہت سے ترخان مغل خاندان موجود تھے۔ اور اس کی فوج میں بھی بہت سے ترخان کمانڈر اہم ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے۔ تزک تیموری میں چالیس میں سے بارہ ترخان خاندانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں سندھ کے ارغوں اور ترخان خاندان بھی شامل تھے۔

امیر تیمور اہم کمان سنبھالنے کے لئے جن خاندانوں کو اولیت دیتا تھا۔ ان میں ترخان برلاس ارغوں جلائر تو پکی دولائی مغول سلاجز طولائی قپچاق ارلات اور تاتار شامل تھے۔ ان خاندانوں میں بھی ترخان اور برلاس سر فہرست تھے۔ کیونکہ یہ لوگ آزمودہ کار جنگجو اور جانثاری میں یکتا ہوتے تھے۔ تزک بابری میں بھی جگہ جگہ ترخانیوں کی جنگجویانہ سرگرمیوں کا عام ذکر ملتا ہے۔ بابر ایک جگہ لکھتے ہیں اسی رمضان میں ترخانیوں نے سمرقند میں فساد برپا کیا۔ بائتغر مرزا سے حکومت چھین لینے کی کوشش کی لیکن بائتغر مرزا نے خواجہ احمد حاجی بیگ کی مدد سے اس فساد پر قابو پالیا۔ ترخانیوں کے سربراہ محمد ترخان کو قتل کر دیا۔ پھر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور باب فیروزہ پر رسائی پاکر وہاں اپنے پہرہ دار فاضل ترخان کو مار ڈالا پھر لکھتے ہیں اسی طرح باقی ترخان بھی دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ مجھ سے آن ملا۔ پھر ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ اس لڑائی میں میرے بہت اچھے سپاہی مارے گئے تھے۔

مقتولین میں ابراہیم ترخان ابراہیم سارد اور ابراہیم جانی بھی تھے۔ ان تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ اصل نام کے ساتھ ساتھ لفظ ترخان بطور اعزازی خطاب ناموں کے لاحقہ کے طور پر شامل رہتا تھا۔ تاکہ جنگجو اور جانثار ساتھیوں کی پہچان میں مدد ملے۔

کہا جاتا ہے بلاد ترخان میں ترخانوں کی جگہ جگہ جاگیریں قائم تھیں۔ یہ لوگ اپنی اپنی جاگیروں میں متمکن گزر بسر کرتے۔ تاہم مغل حکمرانوں کو جب بھی ان کی خدمات کی ضرورت ہوتی وہ ان کی خدمات سے استفادہ کر سکتے تھے۔ ترخان جاگیر دار اپنی جاگیروں کے انصرام کے بارے میں آزاد تھے۔ انہیں خود بھی ارد گرد کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ سمرقند کا ترخان حکمران کو قتیبہ بن مسلم کے ساتھ نبرد آزما ہونا پڑا اور اس نے ترکستان اور فرغانہ سے ترخانوں کو اپنی مدد کے لئے بلوایا تھا۔ اور یوں جنگجو قبائل مسلسل جنگ کے لئے مستعد رہتے۔ طبقات ناصری جلد دوم ترجمہ غلام رسول مہر میں انہیں خراساں کی ایک قدیم قوم قرار دیا گیا ہے۔ اس قوم کو صوبہ خراسان تک محدود کر نا دکھائی درست نہیں دیتا بلاد ترخان جسکا ذکر ابن خلدون نے کیا وہ ایک وسیع علاقہ تھا۔ خراسان میں بھی ترخان خاندان موجود تھے۔ کیونکہ خراسان پر ایک عرصے تک امیر تیموز اور اس کی اولاد نے حکمرانی کی تھی۔

بر صغیر ہندوپاکستان میں اس کی آمد کا سلسلہ قبل مسیح سے جاری تھا۔ مگول جو منگول ہی تھے ہندوپاکستان میں آاریوں کی آمد سے پہلے یہاں کے قدیم باشندوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی آمد کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ پانچویں صدی کے نصف ہنوں اقوام نے بر صغیر پر حملہ کر کے شمال مغربی ہندوستان کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ جمالیا اور یہاں ایک لمبے عرصے تک حکمرانی کی۔ ان ہی کے حملوں کے نتیجے میں گپت خاندان کا خاتمہ ہوا۔

بہت سے ہنوں نے ہندو مذہب اختیار کیا اور اس سر زمین کے باسی ہو کر رہے۔ بہت سے راجپوت کہلائے اور مقامی آبادی میں ایسے ضم ہوئے کہ ان کی اپنی شناخت مٹ کر رہی۔

اس کے علاوہ وسط ایشیاء سے مغل اور ترکوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ غزنوی ترک آئے گئے۔ غوریوں نے ہندوستان پر مسلم حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ دہلی میں مسلم سلطانوں کی ایک عرصے تک حکمرانی رہی۔ اس زمانے میں 1221ء میں چنگیز خان سندھ کی سرحدات تک آپہنچا۔ بلبن کے دور میں بر صغیر پر مغلوں کے حملے جاری رہے۔ 1285ء کا پنجاب پر مغلوں کا حملہ بہت اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اسی حملے کے دوران شہزادہ محمد دیپالپور کی لڑائی میں راہی ملک عدم ہوا۔ خلجی دور میں مغلوں کے حملے تواتر سے جاری رہے۔ 1298ء میں

علاؤالدین خلجی دور حکومت میں مغلوں کے سردار رر قتلغ خواجہ کا دولاکھ افواج کے ساتھ دہلی پر حملہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی مغلوں کے چھوٹے موٹے حملہ ہوتے رہے۔ لیکن محمد تغلق کی حکمرانی کے زمانے میں 1328ء میں دہلی پر مغلوں نے ایک بڑا حملہ کیا۔ محمد تغلق کو اس لڑائی سے بچنے کے لئے مال و زر کی قربانی دینی پڑی اور خزانہ سے بہت سا روپیہ دیکر لڑائی ٹال دی۔ ان دنوں محمد تغلق ملک کے اندرونی خلفشاروں سے لاچار ہو رہا تھا۔ 1398ء میں دہلی پر امیر تیمور نے حملہ کیا جو تاریخ ساز تھا۔ دہلی کے حکمران محمود تغلق کو شکست کا مزہ چکھنا پڑا۔ دہلی پندرہ یوم تک مغلوں کے زیر نگین رہی لیکن چونکہ امیر تیمور یہاں ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے وہ یہاں سے واپس ہوا۔ تاہم 1526ء میں ظہیر الدین بابر کا دہلی پر حملہ اور قبضہ تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ کیونکہ اسی واقعہ کے بعد مغل تخت دہلی پر متمکن ہو گئے اور تقریبا دو صدیوں تک کے عرصے کے لئے یہاں بلا شرکت غیر حکمران ہوئے۔ 1542ء میں صوبہ سندھ پر قندھار کے ترخانوں نے قبضہ کیا اور یہاں ترخان مغلوں کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ گلگت بلتستان اور کشمیر پر مغلوں کے کئی حملے تاریخ کا حصہ ہیں۔ مرزا حیدر ردوغلت کا گلگت بلتستان اور لداخ پر قبضہ اور پھر کشمیر پر دس سالہ حکمرانی سے عیاں ہوتا ہے۔ کہ مغل برصغیر کو وسط ایشیاء کی دہلیز سمجھتے تھے۔ وہ مستقل یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ چونکہ وسط ایشیاء میں ہمیشہ ہل چل رہتی تھی۔ اس لئے بہت سوں نے برصغیر میں رہنے کو ترجیح دی اور یہاں کے ہو رہے۔ ان اقوام میں برلاس۔ ترخان۔ بیگ۔ خواجہ۔ مرزا۔ قازق۔ لوہار۔ میر کہلانے والے مغل شامل تھے۔ جنہوں نے ہندوپاکستان کو اپنے وطن کے طور پر منتخب کیا اور یہاں رہنے لگے۔ کئی مغل خاندان اپنے اجداد کے ناموں کے حوالے سے یا مختلف علاقوں کی مناسبت سے بھی مشہور ہوئے۔ مثلا دوغلت سڈھل۔ تناولی۔ بانڈے۔ گانیچھ۔ عشائی۔ ملدیال۔ دولی۔ رفیقی۔ اور جان لیکن بہت سے محض مغل کے نام سے بھی مشہور و معروف ہوئے۔

مغلوں نے برصغیر کو فنونِ لطیفہ۔ آہن گری۔ چوب کاری۔ تعمیرات باغات۔ ادب اور ثقافتی حوالوں سے مالامال کیا۔ ہندوپاکستان میں مغلوں کے علاوہ اور لوگوں نے بھی حکمرانیاں کی ہیں۔ لیکن صنعت و حرفت تعمیرات کے حوالے سے جتنی یادگاریں مغلوں نے چھوڑی ہیں۔ کوئی قوم ان کی ثانی نہیں۔ مصوری۔۔ موسیقی۔ خوش نویسی۔ تعمیرات۔ ململ سازی۔ بندوق و توپ جہاز سازی اور چوب کاری غرض کونسی صنعت ایسی تھی جسکو مغلوں نے بام ترقی

تک نہ پہنچایا ہو۔ کہتے ہیں بابر نے ہندوستانی عمارتوں کے جو نقشے دہلی اور آگرہ میں دیکھے ان سے وہ بالکل مطمئن نہ ہوا اور اس لئے اس نے وسط ایشیاء سے ماہرین تعمیرات بلوائے اور کئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ پانی پت اور سنبھل کی جامع مسجدیں آج بھی بابر کی یادگاریں ہیں۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہ جہان۔ عالمگیر۔ نے بھی ایک سے ایک اعلیٰ درجے کی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ جو ملک بھر میں آج بھی مغلوں کی صنعت گری کی یاد دلاتی ہیں۔ ادب کی ترویج میں بھی ان حکمرانوں نے کوئی مخل نہیں کیا۔ وہ ادب کے بڑے مربی تھے۔ شعر و شاعری۔ سوانح عمری۔ ہیت۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ اسلامی علوم۔ فارسی۔ عربی ترکی۔ سنسکرت کے ادب عالیہ کے شہپاروں کو عام کیا گیا۔ اردو ہندی زبانوں کو پروان چڑھانے اور عربی فارسی ترکی سے مالا مال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ ہماری قومی زبان اردو نے مغلوں کے ہی عہد میں جنم لیا۔ اس سلسلہ میں زبانوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا اور بعض صورتوں میں مختلف زبانوں کے حروف و الفاظ کی کھچڑی بھی پکائی جو ان کی زبانوں پر نہیں چڑھ سک رہے تھے۔ یا الفاظ کو معانی پہناتے ہوئے کم مائیگی کا ثبوت دیا گیا۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد بعض الفاظ سفر کر کے آتے ہیں اور ملک بھر میں بے عزت ہو جاتے ہیں آزاد اس بارے میں کئی مثالیں لکھتے ہیں۔ غلام عرب میں نوخط لڑکے کو کہتے ہیں۔ فارسی میں لونڈی کا نر غلام، مہتر فارسی میں سردار کو کہتے ہیں ہندوستان میں چوہڑا ہو گیا۔ خلیفہ کا رتبہ عرب میں نائب پیغمبر اور خلیفہ الٰہی تک پہنچا ہوا ہے۔ ہندوستان میں نائی کو کہتے ہیں۔ مختلف زبانوں کے حروف کی بحث ایک تفصیل طلب بحث ہے۔ اجمالاً کہا جا سکتا ہے کہ بعض زبانوں میں کچھ ایسی اصوات ہوتی ہیں جو دوسری زبانوں میں نہیں ہوتیں۔ اس لئے لہجوں کی ادائیگی میں زبانیں بعض اجنبی حروف اور الفاظ ادا کرتے ہوئے لڑکھڑا جاتی ہیں۔ جب ایسے حروف و الفاظ ادا کیے جاتے ہیں تو زبانیں اپنا ہی انداز اختیار کرتی ہیں اور یوں حروف و الفاظ اجنبی دنیاؤں میں اپنی اصلیت کھو جاتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں: جس طرح ہر ملک کے آدمی کی طبیعت جدا ہے اسی طرح دہان و زبان کی طبیعت بھی جدا ہے۔ بعض آوازیں بعض دہانوں سے موافق ہیں۔ خاک ہندوستان کی زبان میں خ، ز، ص، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، کی آوازیں ہیں۔ جب کوئی ایسے حروف والا لفظ سنسکرت یا کسی ہندی زبان میں جاتا ہے۔ تو صرف مذکور دوسرے حرف سے بدل جاتا ہے۔ وہ پھر لکھتے ہیں "تبریز وغیرہ قطعات ایران کے لوگوں کی زبان سے گ نہیں نکلتا۔ اس ملک کے لوگ انگور کو اینور کہتے ہیں۔ شمالی علاقہ جات میں خود ایک علاقہ کے

لوگ دوسرے علاقوں کے لوگوں کے مقابلے میں الفاظ بدل کر ادا کرتے ہیں۔ چند کلو میٹر کے فاصلے پر زبان کے یہ اختلافات موجود ہیں۔ مثلا

آگ کو ہگار اگار بولتے ہیں

بوکا ایونو یونو بولتے ہیں

پہاڑ کھن کھنڈ بولتے ہیں

افیون اخیون پیون بولتے ہیں

بر دشکی میں الفاظ ادا کرتے وقت زیر پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ مثلا تیز کو تیز، نمک کو نِمک کہتے ہیں۔ اور سینکڑوں تبدیلیاں ایک ہی بولی بولنے والوں کے درمیان موجود ہیں۔ تو مختلف بولیوں اور زبان کے بولنے والوں کے درمیان اگر واضح اختلاف پایا جائے تو اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ پنجاب۔ سندھ۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں اسطرح آج بھی لفظوں کے ہیر پھیر موجود ہیں۔ کوئی گیارہ کو یارہ بولتا ہے۔ کوئی زبان کو جبان کہتا ہے۔ کوئی حضور کو جور کہتا ہے۔ کوئی مطلب کو مطبل کہتا ہے۔ کوئی قفل کو قلف کہتا ہے۔ کوئی تمباکو کو تماکو کہتا ہے۔ غرض بگڑے بدلے اور مسلے الفاظ کی ایک بھر مار ہے۔ ”ترخان“ ایک مغولی لفظ تھا۔ وہ پنجاب سندھ۔ اور ہند کے دیگر حصوں میں آیا تو اسنے کئی پلٹے کھائے۔ اس کی اصل شکل بگڑ کر رہ گئی۔ حروف اور لہجوں کی نیرنگیوں نے کام کر دکھایا اور یہ لفظ بقول مولانا محمد حسین آزاد ”بے عزت“ ہو کر رہ گیا۔ مولانا محمد حسین آزاد ”سخن دان فارس“ میں کہتے ہیں۔ خاک ہند میں خ کی آواز نہیں۔ دیکھ لو فارسی کی خ ہندیوں کی زبان پر ک کھ ہو جاتی ہے فارسی میں اکثر حرفوں سے بدلتی ہے مثلاً

لفظ۔	فارسی۔	سنسکرت ۔ہندی۔ پنجابی
آفتاب	خور	سور
خواب	خواب	سواپ
خسر	خسر	سسر
خوک	خوک	شوکر
خون	خون	شون
خشک	خشک	شُشک
گدھا	خر	کھر

شاخ	شاخ	شاکھا
ناخن	ناخن	نکھ
سخت	سخت	شکت
لڑکی	دختر	دہتری
خالی		کھالی
خشخاش	خشخاش	گھس گھس
خانہ	خانہ	کھانہ
خاک	خاک	کھاک
چہرہ	خال	کھال
کانٹا	خار	کھار
مٹی	خاکی	کھاکی
خبر	خبر	کھبر
کان	کان	کھان

سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل اپنی کتاب "پشتون تاریخ کے آئینے میں" میں لکھتے ہیں۔ کہ سنسکرت میں خ نہیں ہے جہاں خ کی آواز کی ضرورت ہو گی اس کے لئے ک یا کھ لکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہیرو ڈوٹس نے لفظ پکھتا اپنے درست تلفظ میں سنا ہو گا۔ لیکن وہ اس لفظ کو درست طور پر لکھنے سے معذور رہا ہو۔ شاہ صاحب یہاں پختون کی بحث میں یہ لکھ رہے ہیں۔ کہ ہندیوں کو پختون کا مسئلہ بھی ایسا ہی درپیش ہوا اور انہوں نے پکھتا بنا دیا۔ الفاظ کے وہی گورکھ دھندے موجود تھے۔ یہاں الفاظ کو توڑنے الفاظ کی ہیت بدلنے اور مسخ کرنے کا دھندہ ملک کے کسی حصے سے کچھ کم نہ تھا۔ کشمیر میں بھی خ کے بدلے کھ اور ف کے بدلے پھ کا استعمال عام ہے۔ وہاں خر کو کھر، خان کو کھان، ایران کو ییران بولتے ہیں۔ محمد دین فوق فرماتے ہیں "جن لوگوں کو کشمیر جانے اتفاق ہوا ہے۔ ان کو معلوم ہو گا کہ سری نگر کے کشتی بان ہانجی جب امیر اکدل کے گھاٹوں کو کسی پنجابی مہمان کو دیکھتے ہیں۔ وہاں ہانجی اس کو دور سے دیکھ کر "کھان صاحب شکارہ" کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ جن کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ "خان صاحب شکارہ حاضر ہے"۔ خان کو ابھی تک عوام کھان ہی کہتے ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر خان سے کھان اور کھان سے کھانڈ یا کھانڈ ۔۔۔ وغیرہ کی شکل اختیار کر لی ہو۔ مولانا آزاد

فرماتے ہیں کشمیری تازہ وارد سے باتیں کرو۔ جن لفظوں میں آ ہے ی بولے گا۔ غرض زبانوں کے لئے موافق اور ناموافق الفاظ نے اپنا اثر کر دکھایا اور کئی لفظ بگڑ کر اپنی اصلی ہیت کھو بیٹھے۔ لفظ ترخان کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ اور ہند میں آکر اس لفظ نے کئی شکلیں بدلیں۔ حالانکہ مغلوں کے آنے سے پہلے یہ لفظ موجود نہ تھا۔ یہ مغلوں کے ساتھ آیا۔ اور سنسکرت ہندی۔ پنجابی۔ کشمیری حلقوں میں داخل ہو کر انہیں کہ لہجوں حروف اور الفاظ میں ڈھل گیا۔ کہیں ترکھان۔ ہوا کہیں طرخان۔ کہیں ڈرکھان کہیں دیرکھان اور کہیں ترکان۔ گویا ایک لفظ نے کئی روپ بدلے۔ اگر میں مولانا حسین آزاد کی زبان اختیار کروں۔ یہ معزز لفظ ترخان ہند میں آکر "بے عزت" ہو گیا۔ تو بے جانہ ہو گا انگریزی اور رومن زبانوں میں خ اور کھ کے لئے ایک مشترک KH کے جوڑنے اپنا کرشمہ دکھایا اور "Tar-khan" اور لکھے جانے کے بجائے "Tarkhan" ہو گیا۔ اور اس کا ترجمہ بھی ہندی سنسکرت اور بر صغیر اور زبانوں میں ترکھان کی صورت میں نمودار ہوا۔ اکثر نے اپنا رنگ جمایا اور اقلیتی آواز دم توڑ گئی۔ اور لفظ ترکھان عام ہوا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں یہ لفظ توڑ کر بولا جارہا تھا۔ تو یہ خطابی اور صفاتی نام کے طور پر مستعمل ہورہا تھا۔ کسی اور اعتبار سے نہیں کیونکہ ان دنوں جب یہ ترخان مغل قبائل ارد گرد بکھر رہے تھے۔ ہند کے ایک بڑے صوبے میں ترخانوں کی حکومت بھی پھل پھول رہی تھی۔ لکڑی کا کام کرنے والوں کے لئے اپنے لئے علاقائی مخصوص نام تھے۔ مثلاً پنجاب اور وسطی ہندوستان میں لکڑی کا کام کرنے والے کے لئے ٹھوکہ بھیڈی سندھ میں واڈھو کشمیر میں چھان وغیرہ الفاظ بولے جاتے تھے۔ ترکھان ایک حقیر نام کے طور پر سامنے آیا۔ ایسا کرنے میں محض انگریز ہی شامل نہ تھے۔ اور قومیں بھی شریک ہوئیں۔ انگریز اور مغل بر سر پیکار رہے تھے۔ پٹھانوں نے مغلوں سے شکست کھائی تھی۔ اور ان کے ہاتھوں سے حکومت چھین لی گئی تھی۔ پٹھانوں نے مغلوں کو نیچا دکھانے کے لئے کئی نام رکھے۔ اور خود کو سامیوں سے جوڑنے کے لئے کئی منظم تحریکیں چلائیں۔ آریاؤں نے دراوڑوں کو دراوڑوں نے آریوں کو انگریزوں نے بنگالیوں کو خود مسلمانوں نے منگولوں کو (جن کے ہاتھوں اسلامی تمدن کی تباہی ہوئی تھی) بعض قوموں نے کشمیریوں کو کشمیریوں نوواردوں سکھوں نے ہندوؤں کو ہندوؤں نے سکھوں کو کیا کچھ نہیں کہا۔ ڈاکٹر مبارک علی تاریخ اور روایات کتاب میں لکھتے ہیں۔ "لیکن تاریخ کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں۔ مثلاً فاتح اقوام غیر مہذب اور وحشی ہوتی ہے۔ تو اس صورت میں آگے چل کر وہ خود اس تہذیب کے ہاتھوں شکست کھا لیتی ہیں۔ متمدن قوم کی تہذیبی و ثقافتی

قدروں اور روایات کو اختیار کر لیتی ہیں۔ جیسے آریا قوم نے دراوڑ روایات اختیار کیا۔ رومیوں نے یونانیوں کی تہذیب کو اور منگولوں نے اسلامی تمدن کو اور بالآخر مفتوح قوم کی تہذیب میں ضم ہو گئے۔" یہ ایک عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک قوم خود جو کام کر رہی تھی۔ اس وقت اسے برا نہ لگ رہا تھا۔ لیکن وہی کام جب دوسرے کرنے لگے تو ان میں سے کچھ نے اسے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ یہ محض انکی کم علمی اور جہالت کا نتیجہ تھا۔ وہ اپنی تاریخ سے بے خبر تھے۔ آریوں کے بارے میں یہ تاریخی حقائق موجود ہیں۔ کہ وہ چوب کار چرم کار اور چرواہے تھے۔ وہ یہ کام کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق سرانجام دیتے تھے۔ اور انہیں یہ کام کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ بلکہ وہ ان کاموں پر نازاں بھی تھے۔ مرتضیٰ احمد خان تاریخ اقوام عالم میں آریوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ان میں سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق اہل حرفہ بھی تھے۔ نجاری یعنی لکڑی سے سازو سامان بنانا ان میں بہت رائج تھا۔ یہ لوگ بیل گاڑیاں، چھکڑے اور رتھیں بناتے تھے۔ رتھوں میں گھوڑے جوتتے تھے۔ پہیوں پر چلنے والی گاڑیاں بنانا ان آریا قبائل کی اپنی ایجاد تھی۔ ان آریوں کا ذکر برگزیدہ پیغمبروں اصحاب رسول اولیا کرام نے مختلف کام کیئے اور بزرگی حاصل کی۔ حضرت نوحؑ خود ایک بڑا چوب کار تھا۔ یہودیوں کی مقدس کتاب عہد نامہ عتیق میں حضرت موسیٰ کے جانشین یشوع کےمتعلق لکھا ہے کہ انکے پاس لوہے کے آلات تھے۔ خود حضرت داؤد ایک نامور لوہار تھے۔ قرآن پاک میں ہم نے داؤد کے لوہے کو (موم کی طرح) نرم کر دیا۔ جس میں زبردست دہشت ہے۔ آنحضور جو انبیاء کے سردار تھے۔ نے ریوڑ چرائے اسلام میں بڑائی کا معیار تقویٰ قرار دیا۔ اور دیگر تعصبات کو باطل قرار دیا۔

بہر حال اصل مغل اپنے آبائی کام پر فخر محسوس کرتے تھے۔ چنگیز خان اور اسکے اجداد لوہار تھے۔ اور اس کام کو معزز خیال کرتے تھے۔ طبقات ناصری جلد دوم مترجمہ میجر یورٹی میں لکھا ہے کہ مغل لوہے کے فن پر اس قدر نازاں تھے۔ کہ انہوں نے یہ اعلان کر رکھا کہ کوئی شخص مغل کہلائے اور اپنے ہاتھ سے لوہے کا کام نہ کرے۔ تو اسے مغل نہ سمجھو۔ اور اسے قطعہ تعلق کرو اس طرح ملکوں نے اپنے پیشوں کو سر آنکھوں پر لیا اور حکمرانی بھی کی۔ اور اپنے ان آبائی پیشوں کو ترقی دے کر آلہ فنون میں بدل دیا۔

ہندوستان میں جب ریکارڈ آف رائٹس کے اندراجات شروع ہوئے تو بہت سے گھمبیر مسائل سامنے آئے۔ 1857ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد مغلوں پر جو ستم کے پہاڑ توڑے جانے لگے۔ جو مغل ہاتھ آتا اسے تختہ دار پر چڑھایا جاتا۔ 18 نومبر 1857ء کو ایک

ہی دن چوبیس مغل شہزادے پھانسی پر لٹکائے گئے۔ بہادر شاہ ظفر کو مجرم قرار دیکر رنگون میں جلاوطن کیا گیا۔ ایسے حالات میں مغل نام ایک گالی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اور مغل قومیت رکھنے والے لوگ اپنا تشخص چھپائے پھرتے تھے۔ پھر 1901ء کے ایکٹ اراضی کے تحت مغلوں کو غیر کاشتکار قرار دیکر کمین ذاتوں میں درجہ بند کیا گیا۔ اس لئے مغلوں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کہ وہ اپنی مغلیت کو چھپائیں۔ چنانچہ بہت سے مغلوں نے کھوکھر، بھٹی، قریشی، سندھو، چوہان، اعوان ذاتوں کے ساتھ ناتے جوڑے اور ریکارڈ آف رائٹس میں ان غیر ذاتوں کا سہارا لیا۔ تاکہ ایک تو انگریزوں کے جور و ستم سے بچیں اور دوسر زمین حاصل کر کے کاشتکار کہلائیں۔ اگرچہ اس طرح کچھ لوگ اپنے ارادوں میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن وہ دیرپا نتائج حاصل نہ کر سکے وہ اپنی ذات برادری سے بھی کٹ کر رہے۔ اور دوسروں سے بھی دائمی ناطے قائم نہ کر سکے۔

1901ء ایکٹ اراضی نے زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ افراد کی تفریق پیدا کر کے لوگوں کی مشکلات میں اضافہ کیا۔ فنکاروں اور کار گزار نفری کو غیر زراعت پیشہ قرار دے کر کمی درجہ بندیوں میں لانے کے لئے انگریزوں کے دو بڑے مقاصد تھے۔

(1) انگریز چاہتے تھے کہ کار گزار افراد کا ایک بڑا طبقہ موجود ہو۔ جو جاگیر داروں، نوابوں، امراء، راجوں وغیر کی زمینوں کی دیکھ بھال کرے۔ ان کی زمینوں پر ہل چلائے مزارع تابع مرضی مالک بن کر کام کرے۔ اس طرح انگریز جاگیر داری نظام کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ اور زمینوں کی ملکیت کو عام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ کار گزار نفری کی تعداد گھٹ نہ جائے۔

(2) وہ اس طرح مغلوں کو زک پہنچانا چاہتے تھے۔ کہ وہ کمی درجہ بندیوں میں رہ کر صرف دوسروں کی خدمت گزاری میں رہیں۔

پٹواریوں کے داخل خارج میں سنسکرت ہندی۔ پنجابی۔ کشمیری۔ اور مقامی زبانوں کے زیر اثر ترخان کو ترکھان لکھ کر اصل لفظ کی ہیت کو بگاڑ دیا گیا۔ اور اسے ایک پیشے کے معنوں میں مستعمل کیا جانے لگا۔ حالانکہ پہلے لکھا گیا ہے۔ کہ یہ ایک بڑا اعزازی نام تھا۔ جس کو بے عزت کر کے غلط معنی پہنائے گئے۔ یاد رہے کہ ریکارڈ آف رائٹس میں ترخان (مغل) کو خواہ وہ لکڑی کا کام کرتے یا نہیں کرتے۔ پورے بر صغیر میں ترخان کے بجائے۔ ترکھان لکھا گیا۔ یہ ایک علمی اور لسانی غلطی تھی۔ اس قبیلے کے لوگوں کو ترخان (مغل) لکھا جانا چاہئے تھا۔

تاہم اس سے ایک حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو ترکھان لکھا گیا۔ وہی ترخان مغل تھے۔ حالانکہ وہ تمام قبائل قریشی ہوں، اعوان ہوں، سندھو ہوں، کھوکھر ہوں، بھٹی ہوں، جنھوں نے لکڑی کا کام کیا۔ ریکارڈ آف رائٹس میں ترکھان نہیں لکھا گیا۔ اور ان کی اپنی اصل ذات کا نام درج ہوا۔ کیونکہ وہ لوگ ترخان مغل نہ تھے۔ اگر وہ ترخان (مغل) ہوتے تو انہیں بھی سندھو کھوکھر لکھنے کی بجائے ترکھان لکھا جاتا کیونکہ ایک عرصے سے وہ لکڑی کا کام کرتے آئے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پٹواریوں کے داخل خارج میں بعض بھاری غلطیاں ہیں۔ اول تو ریکارڈ آف رائٹس میں نسلیاتی طائفہ کا نام لکھا جاتا ہے۔ مثلا (ترخان) مغل۔ (میر) مغل ۔ (بیگ) مغل (مرزا) مغل یا بھٹی یا جاٹ (آرائیں) یا جاٹ (گوجر) وغیرہ لیکن پٹواریوں کے داخل خارج میں بھٹی (حجام) جاٹ (لوہار) کھوکھر (کمہار) وغیرہ کے اندراجات قطعی طور پر غلط ہیں۔

اس لئے بعض اہل علم ماہرین انساب ماہرین قانون وغیرہ نے نہ صرف 1901ء ایکٹ اراضی کی مخالفت کی بلکہ داخل خارج کے ان اندراجات کی بھی مخالفت کی۔ جس میں اصل نسلیاتی نام لکھنے کے بجائے پیشے کا نام لکھا تھا۔ اس حوالے سے بہت سے عدالتی فیصلے سامنے آئے۔ جن کے مطابق مغل اراضی خرید کر کاشتکار کہلانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن بورڈ آف ریونیو پنجاب کا فیصلہ نمبری 1434-1189/86 ایل آر آئی آئی مورخہ 14 مئی 1986ء ایک اہم فیصلہ ہے۔ اس فیصلے میں کہا گیا ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ مختلف دستاویزات متعلقہ ریکارڈ زمین میں خصوصیت سے رجسٹر حقداران اراضی، پرچہ، کھتونی، شجرہ نسب، رجسٹر گرداوری، رجسٹر داخل، خارج، کھتونی اشتمال، رجسٹر سکیم اشتمال اور فرد تقسیم آبادی وغیرہ میں مالکان یا کاشتکاران زمین کے پیشے کا اسطرح ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسے نیچے صراحت کیا گیا ہے۔

1____ ولد ___ قوم نائی۔ لوہار۔ یا ترکھان

1____ ولد ___ قوم بھٹی حجام یا مغل لوہار یا کھوکھر ترکھان یا جنجوعہ قمہار

چونکہ کسی شخص کا پیشہ اس کی قومیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ کسی شخص کے پیشے کو ریکارڈ آف رائٹس میں بطور قومیت یا قبیلہ مندرج نہیں کیا جائے گا۔ اس فیصلے پر درج ذیل صورت عمل درآمد کیا جائے گا۔

الف اصولاً ریکارڈ آف رائٹس، معیادی ریکارڈز یا دیگر دستاویزات زمین میں کسی شخص کے پیشے کا ذکر نہیں کیا جائے گا۔

ب۔ جہاں کہیں قومیت یا قبیلے کے ساتھ کسی شخص کے پیشے کا تذکرہ ہو یعنی بھٹی (حجام) مغل۔ لوہار وغیرہ پیشہ دکھانے والے الفاظ جو بطور لاحقہ منسلک ہیں۔ اگلی ایڈیشن میں حذف کیے جائیں گے۔ جبکہ اندراجات متعلقہ قومیت و قبیلہ مکمل رہنے دیے جائیں گے۔

ج: جہاں کہیں کسی شخص کی قومیت یا خاندان محض پیشے کے حوالے سے مندرج ہوئے ہیں۔ ایسی اندراجات مستقبل میں تمام دستاویزات متعلقہ ریکارڈ اراضی سے حذف یا ترمیم کی جائیں یا از سر نو مرتب کی جائیں۔

و: شق "ج" کی صورت میں اگر کوئی شخص زبانی یا تحریری اپنی اصل ذات یا قومیت کے اندراج کے لئے درخواست کریں سرکل ریونیو آفیسر ایسا اندراج کر کے ضروری تصدیق کرے۔

دستخط

سیکرٹری ریونیو بورڈ پنجاب

اس سرکلر کی کاپیاں تمام اشخاص اداروں او ذمہ دار افیسروں کو بھیجی گئیں۔ تاکہ ان پر صحیح عمل درآمد کیا جائے۔ یہ یقیناً ایک اہم فیصلہ ہے پٹواریوں کے داخل و خارج میں ان الفاظ کی اصلاح لسانی۔ علمی۔ اور تحقیقی بنیادوں پر کی جانی چاہیے۔ تاکہ اصل حقیقت حال واضح ہو اور تمام ابہام دور ہوں۔

باب۔5

گلگت کے ترخان (مغل)

کشمیر اور وسط ایشیاء کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ خود اس خطے میں کشمیر کی مرکزی حیثیت ہے۔ اور وہ کشمیر کے مختلف دروازے ہیں جو وسط ایشیا میں کھلتے ہیں۔ ان راستوں اور دروں کی وجہ سے کشمیر کا تعلق تبت، چینی، ترکستان، ایران، افغانستان، بدخشان، سمرقند، تاشقند اور بخارا کے ساتھ رہا ہے۔ زمانہ قدیم سے وسط ایشیاء سے نقل مکانی کرنے والے خانہ بدوش لوگ ان راستوں کو پامال کرتے گزرے اور گلگت اور کشمیر کے علاقوں کو ایک طرح سے جولان گاہ بنائے رکھا۔ منگول آرین، یوچی، سیتھین، یونانی، ایرانی، بلخی، افغانی، پارتھین، تبتی، بدخشانی وغیرہ غرض بہت سی قومیں آئیں اور اپنے آثار و نقوش چھوڑے اور یہاں کی معاشرت، زبان، اقدار اور فکری سلیقوں کو متاثر کیا۔ درہ بانشالا، درہ بدھل، درہ بانہال، درہ رتن، درہ برزل، درہ زوجیلا، درہ توش میدان، درنگ بارہ مولا اور کئی دروں اور راستوں سے کشمیر چار طرف اہم مراکز سے ملا ہوا تھا۔ کشمیر کا جغرافیائی ماحول بہت دل پذیر اور مسحور کن ہونے کی وجہ سے قوموں کی کشش کا باعث بنا۔ جو ایک بار یہاں آیا وہ یہاں کا ہو رہا۔ اور جو یہاں سے گیا وہ کئی کئی بار آیا۔ اور دوسروں کو بھی لایا۔ فکر اور مذہبی نشو و نما کے لئے یہ زمین بڑی زرخیز ثابت ہوئی۔ یہاں کے لوگوں کی سرشت میں مذہبی تفکر کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس لئے صوفیا، علماء، اولیاء، جوگیوں، پجاریوں، تیاگیوں اور تپسیا کرنے والوں نے اسے اپنا گھر بنالیا۔

یونانیوں، چینیوں، اہل عرب اور اہل ہندوستان کے تذکروں میں کشمیر کا بڑا ذکر ملتا ہے۔ ان تذکروں میں علاقے کا تقدس مذہبی روایات، کشمیری علماء اور فضلا کے تفصیلی اذکار ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہیون سانگ کشمیری فضلا کے عالمانہ مباحث میں شریک ہوتا اور بڑا محظوظ ہوتا۔ ابوالفضل کے مطابق ہندو، رشی کشمیر کی سرزمین کو مقدس مانتے تھے۔ لہذا ہر چار طرف سے یاتری اس سرزمین میں داخل ہوتے اور گیان دھیان میں محو ہو جاتے۔ سادھو، سنیاسی، درویش، عابد، تارک الدنیا جیسے لوگ یہاں آباد ہوتے گئے اور ایک

سادھو، سنیاسی، درویش، عابد، تارک الدنیا جیسے لوگ یہاں آباد ہوتے گئے اور ایک عارفانہ ماحول میں پھلتے پھولتے رہے۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے۔ کہ کشمیریوں کے اسلاف زیادہ تر مذہبی لوگ ہو گئے۔ ابتدا میں یہاں جو قدیم آباد کار بستے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سانپوں، درختوں اور قدرتی مناظر کی پوجا کرتے تھے۔ ان آباد کاروں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خطہ حمیر و روم سے چل کر یہاں آئے تھے۔ تورانی، دراوڑ، آریا، پارسی بارسی آئے اور یہاں بستے گئے۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے یوں گھل مل گئے کہ آج کشمیریوں کے ہزاروں صفاتی، عربی، القابی، خطابی اور حرفی ناموں کے پیچھے ان کی شناخت ممکن نہیں رہی کہ دراوڑ اور آریاکون یا آسٹرک اور نیگرائڈ کون۔ تاہم ان خوبصورت گورے چہروں، سیاہ آنکھوں، مناسب سڈول جسموں، کاغذی ناک نقشوں کے بل بوتے پر انہیں یونانیوں، سامیوں (بنی اسرائیل کے دس گمشدہ قبائل) سے مشابہ بتایا گیا۔ یونانی حقیقتاً آرین بھی ہیں۔ جیسے پہلے بیان ہوا ہے۔ تمام نسلی گروہ بندیوں کے تحت رنگ، سر، کالبد اور قد کاٹھ کی بنیاد پر آرین اور سامیوں کو ہم ذات درجہ بند کیا گیا ہے۔ اگرچہ کئی اہم خصوصیات کی بنیاد پر الگ الگ نمائندہ اقوام کی نسلیں بھی شمار کی جاتی ہیں۔

ابتدا کشمیر میں تورانی الاصل لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ یہ لوگ بڑی تعداد میں گلگت اور کشمیر میں آباد ہوتے گئے۔ تورانی کہاں کے رہنے والے تھے؟ اور یہ کون لوگ تھے؟ اس حوالے سے بڑے مباحث ملتے ہیں۔ وسطی ایشیا، ٹرانس اوکس، باختریہ، سندینہ، کے علاقے تورانی علاقے شمار ہوتے تھے۔ آسان طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وسط ایشیاء کے وہ تمام علاقے قدیم دور میں توران کہلاتے تھے۔ جہاں ہون، ترک، مغل، منگول نسلوں کے لوگ رہتے بستے تھے اور مغولی گروپ کی زبانیں بولتے تھے۔ وسط ایشیاء میں اور نسلیں بھی رہتی تھیں۔ لیکن وہ تورانی الاصل نہ تھیں۔ کیونکہ وہ انڈو آرین زبانیں بولتی تھیں۔ اِدھر کشمیر کے نام کے حوالے سے ایک نظریہ بھی ملتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے قدیم آباد کاروں کا ایک بڑا جتھا شمالی طرف سے بھی آیا ہوگا۔ کش، کشان اور کاشغر سے آئے لوگ اپنے آبائی علاقوں کے ناموں کے خدوخال بھی لائے۔ لفظ کشمیر کے ریشوں میں کش، کشان اور کاشغر کے ریشے مدغم دکھائی دیتے ہیں۔ کش بخارا کا ایک قصبہ تھا۔ کشان ایران کے کسی قدیم قصبے کا نام بتایا جاتا ہے۔ اور کاشغر چینی ترکستان کا مشہور معروف شہر اور بابِ شاہراہِ ریشم جو آج بھی ارد گرد کے ممالک پاکستان، تاجکستان، قزاقستان، کرغزستان اور

کے اثرات بھی حاوی نظر آتے ہیں۔ شان، کھشان، کشان، لفظ بدخشان سے ماخوذ دِکھائی دیتے ہیں۔ صرف برصغیر ہندوپاکستان میں خ کو کھ اور ک میں بدلنے کی گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کشان بدخشاں سے نکاا ریشہ ہو۔ قدیم آباد کار جو زیادہ تر تورانی الاصل تھے، نے ان اطراف سے نقل مکانی کی ہو۔ کیونکہ کاشغر، بدخشان، واخان، پامیر ایسے علاقے ہیں جہاں سے جنوب کی طرف جانے کے لئے کئی درے اور راستے نکلتے ہیں۔

کشمیر کا ماحول شروع سے ہی صوفیانہ رہا ہے۔ جہاں شروع میں رِشی، سادھو، جوگی، بدھ، چینی، آتش پرست مبلغین آئے اور اپنے اپنے نقوش چھوڑے وہاں مسلمان اولیاء، مفکرین، مبلغین، فضلاء اور علماء کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ وہ اسلام کی مشعل لے کر آئے اور نور کی ایسی چادر بچھائی کہ کشمیر بقعۂ نور بنا۔ ذوالقدر خان المعروف زولچو ترکستانی کے کشمیر پر حملے کے ساتھ جو اس نے درہ زوجیلہ کے راستے سے کیا تھا۔ یہاں مسلمانوں کی منظم آمد کے لئے راہیں کھلیں۔ اس کے کشمیر پر حملے کے دوران کشمیریوں پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹے۔ ان کے گھر بار اجڑے۔ انہیں ایک بڑی تباہی کا سامنا پڑا۔ اس کی بڑی وجہ کشمیر کے بزدل حکمران سہر دیو کا کمزور دفاع تھا۔ ان دنوں کشمیر میں ایک بھٹہ لداخی شہزادہ رنچن نامی مقیم تھا۔ وہ سیاسی بصیرت اور تدبر کا مالک تھا۔ جنگ کے بعد اسے سہر دیو کے سپہ سالار، رام چندر اسے حکومت حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ رنچن 6 اکتوبر 1320 کو کشمیر کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ آپ کے قدم مبارک ثابت ہوئے اور آپ ہی کے زمانے میں اسلام کی ابتدائی اینٹیں ڈھلیں۔ ان دنوں ایک بزرگ شخص سید شرف الدین المعروف بلبل شاہ ایک ہزار پناہ گزینوں کے ساتھ ترکستان سے دین اسلام کی تبلیغ پر مامور ہو آیا تھا۔ رنچن شرف بہ اسلام ہوا۔ اور اسلام کی دولت سے مزین ہو کر صدرالدین اسلام بنا۔ یہ واقعہ بھی سال 1320ء کا ہے۔ رنچن منگول تھا۔ اور لداخ کا باشندہ تھا۔ جیسا راجا ویسی پرجا، اِن کے دیکھا دیکھی بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ یہیں سے مسلم سلاطین کشمیر کا دو سو چالیس سالہ حکمرانی کا دور شروع ہوا۔

سید علیؒ ہمدانی جسے کشمیر میں شاہ ہمدان کہتے ہیں، کشمیر اور اردگرد علاقوں میں فکرِ اسلامی کے انقلاب کا چشمہ سلسبیل ثابت ہوئے۔ آپ کشمیر میں تین بار (1372ء 1379ء اور 1383ء) تشریف لائے۔ 1379ء کی آمد ڈھائی سال قیام پر منتج ہوئی۔ آپ کے ہمراہ آنے والوں میں علماء، فضلاء اور ماہرین فن کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔

جنھوں نے فکر و فن کے فروغ میں آپ کا ساتھ دیا۔ ان دنوں ایران پر وسط ایشیاء کے مغلوں کی حکمرانی قائم تھی۔ امیر تیمور کی تگ و تازیاں پورے عروج پر تھیں۔ سید علی ہمدانی امیر تیمور سے ناراض ہو کر کشمیر آیا تھا۔ لیکن آپ کی یوں آمد جموں و کشمیر کے لوگوں کے لئے باعث برکت ثابت ہوئی۔ اسلام پوری آب و تاب کے ساتھ کشمیر اور ارد گرد کے علاقوں میں پھیلتا گیا۔ اور لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوتے گئے۔

وسط ایشیاء سے کشمیر اور کشمیر سے وسط ایشیاء لوگوں کی عام آمدورفت جاری رہی۔ کہتے ہیں۔ کہ کسی قدیم زمانے میں ترک شہزادگان نے بھی کشمیر پر حکومت کی تھی۔ وسط ایشیاء کے حکمرانوں اور جنگجوؤں کے دل میں کشمیر بسا ہوا تھا۔ جہاں علماء، مبلغین، صوفیاء وغیرہ کشمیر آئے۔ وہاں ترک، مغل حکمرانوں کے کشمیر پر حملے جاری تھے۔ محمود غزنوی نے 997ء تا 1030ء کے دوران کشمیر پر دوبار حملے کیے۔ ایک بار اسے جزوی کامیابی بھی ہوئی لیکن دوسری بار برف باری اور دیگر وجوہات کی بنا پر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ بابر نے جب کابل پر اپنی حکومت قائم کی تو بدخشاں بھی اس کے تصرف میں آ گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ قراقرم اور ہندوکش سے گزر کر کشمیر پر قبضہ کرے۔ لیکن وہ اپنے اندرونی خلفشاروں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ ان دنوں پکھلی کشمیر اور افغانستان کے درمیان ایک اہم رابط مرکز تھا۔ یہ علاقہ حاکم کنار کے علاقائی حدود کو چھوتا تھا۔ آخری بار جب سید علی ہمدانی یہاں سے گزر رہے تھے وہ یہیں علیل ہو کر عالمِ جاودانی سدھارے۔ امیر تیمور بھی کابل جاتے ہوئے یہاں سے گزرے اور جاتے ہوئے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے کچھ ترک فوجی یہاں چھوڑ گئے۔ کہتے ہیں پکھلی کے کچھ لوگ ان ہی ترکوں کی اولاد سے ہیں۔ 1393ء میں سید میر محمد فرزند شاہ ہمدان کشمیر آیا اور 22 سال تک دینِ اسلام کی تبلیغ کے لئے یہاں مقیم رہا۔ ان شاہ صاحب کے ساتھ بھی علماء، فضلاء اور مبلغین کشمیر آئے تھے۔ جو وسط ایشیاء اور کشمیر کے درمیان رابطوں کا باعث رہے۔

سلطان شہاب الدین غازی کشمیر کا ایک عظیم حکمران تھا۔ آپ کا دور (1354ء تا 1373ء) کشمیر کی حکمرانی کا ایک یادگار دور خیال کیا جاتا ہے۔ آپ نے کئی فتوحات کیں۔ آپ کی شاندار فتوحات کا دائرہ کابل، قندھار، بخارا، بدخشاں، لغمان، پکھلی، باجوڑ، غزنی، غور، ہرات، پنجاب اور سندھ تک پھیلا ہوا تھا۔ شمالی علاقوں کی فتوحات کے بعد جب وہ واپس آ رہے تھا دردستان سے گزرا۔ اس نے گلگت اور تبت خورد کو بھی فتح کر کے اپنی قلمرو میں

شامل کیے۔ اس وقت تک گلگت میں اسلام کی شمع نہ پہنچی تھی۔ اور نہ ہی بلتستان اس کی زد میں آیا تھا۔ خود کشمیر میں بھی پوری طرح اسلام نہ پھیلا تھا۔ ان دنوں صوبہ بدخشاں میں پیر ناصر خسرو کی تبلیغی کوششوں کے نتیجہ میں اسمٰعیلی عقائد فروغ پا رہے تھے۔ پیر ناصر خسرو 1060ء میں بدخشاں آئے اور یہیں (یمگان) مقیم ہوئے۔ انہوں نے بدخشاں کو اپنی تبلیغی کوششوں کے لئے مرکز بنایا۔ اس کے نتیجے میں اردگرد اسماعیلی مبلغین پھیلتے جارہے تھے۔ بارھویں صدی کے زمانے میں بدخشاں میں خاندان غور کی دور کی ایک حکومت تھی جسے تیرھویں صدی کے آخری زمانے میں محمد خوارزم شاہ نے ختم کر کے یہاں اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کیا۔ چترال میں اسماعیلی دعوت پہنچ چکی تھی۔ تاہم اس وقت بدخشاں میں کوئی اسماعیلی حکومت قائم نہ تھی۔ حسن بن صبا کی وفات 1124ء میں ہوئی۔ اگرچہ اس کے جانشین 171 سال تک الموت پر قابض رہے۔ لیکن اس وقت یعنی 1256ء تک جب ہلاکو نے قلعہ الموت کو تسخیر کیا۔ بدخشاں میں اسماعیلی دعوت کو کسی حکومت کی سرپرستی حاصل نہ تھی۔ اسی زمانے میں قلعہ الموت کی طرف سے بہت سے بہت سے فدائن اردگرد بکھر گئے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں نے بدخشاں اور واخان کا رخ کیا کیونکہ یہ علاقے اسماعیلی دعوت کے لئے ایک مرکز کا کام دے رہے تھے۔ مغلوں اور ترکوں کی مذہبی پالیسی عموماً عدم مداخلت پر مبنی تھی۔ اس لئے اسماعیلی فکر کے فروغ کے لئے شمال کے یہ علاقے باعث برکت ثابت ہوئے۔

شہاب الدین کے دور میں دردستان اور بلتستان میں اسلام کی تبلیغ کے کوئی شواہد نہیں ملتے۔ میرے خیال میں سلطان شہاب الدین اپنی غیر ملکی فتوحات میں ہی محو رہا اور اسے اس کام کے لئے کوئی موقع میسر نہ آیا۔ تاہم سلطان سکندر بت شکن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اس طرف توجہ دی۔ 1411ء میں جب وہ بدخشان کے اطراف پر حملہ آور ہوا تو گلگت سے اس کا گزر ہوا تھا۔ کشمیر میں دینِ اسلام کے فروغ کے لئے اس نے جس قدر کام کیا وہ کسی اور حکمران کے حصے میں نہیں آیا۔ دینِ اسلام کے فروغ کے لئے ان کی کوششیں قابلِ قدر مانی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے قیاس کیا جاتا ہے کہ شاید اس کے ساتھ آئے کچھ مسلمان یہاں بس گئے ہوں گے۔ امیر سنگھ نائب مہتمم بندوبست 94-1893ء میں تحصیل گلگت کی اولین بندوبست رپورٹ مرتب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”کسی کسی جگہ بتوں کے نشان بھی پائے جاتے ہیں۔ اور نام بھی آج تک دم سنگھ وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ قریب موضع جوٹیال دامن پہاڑ ایک بر جی بدھ مذہب کی آج تک موجود ہے۔ جس سے پایا جاتا ہے کہ

بلا شک وہ شبہا اصلی باشندہ ہندو یا بدھ تھے۔

الاسمت 1868 بکرمی مطابق 1411ء جب سلطان سکندر نے اس ملک سے گزر کیا تو اس وقت سے کچھ کچھ مسلمان علاقہ جات گردونواح کے آکر آباد ہوگئے۔" امیر سنگھ جوٹیال کی جس برجی کا ذکر کرتے ہیں اس کے بارے میں ایک مقامی روایت یہ بھی ہے کہ یہ مغلوں نے فتح کے موقع پر ایستادہ کی تھی۔ ماہرین آثارِ قدیمہ اسے بدھ مذہب کے آثار میں شمار کرتے ہیں۔ اور یہی بات زیادہ درست ہے۔ اس طرح سلطان سکندر بت شکن کے شمالی علاقہ جات میں اسلام پھیلانے کی کسی مہم یا کوشش کے شواہد نہیں ملتے۔ اگر ایسا ہوتا تو 1527ء میں مرزا حیدر دوغلت یہ نہ کہتے کہ یہ علاقہ کفر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور ایک نفس بھی یہاں اللہ کا نام لیوا نہ تھا۔

سلطان شہاب الدین (1356-74ء)، سلطان سکندر بت شکن (1379-1413ء) اور سلطان زین العابدین (1420-70) کے ادوار میں کشمیر کی حکومت کے حدود شمال میں بدخشان اور جنوب میں پنجاب اور دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سلاطین کے دور میں وسط ایشیاء سے بہت قریبی تعلقات رہے۔ کشمیر مسلمان مبلغوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ایران، ترکستان، افغانستان، عراق سے مسلمان علماء اور مبلغین کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ ان سلاطین نے ماہرین فن کی بڑی آؤ بھگت کی۔ کاشغر، ختن، یارقند، بدخشان، خراسان، ایران کے دستکار، فنکار، ادباء، محققین جوق در جوق کشمیر آئے۔ ملبوسات سازی چوبی کام، پیپر ماشی، قالین و شال بافی اور نقاشی کے ماہرین کی آمد سے کشمیر مالا مال ہوگیا۔ کشمیر کے مولف ڈاکٹر۔ ایم۔ ڈی صوفی لکھتے ہیں۔ اس دور میں کئی عمدہ خانقاہیں، عمارات اور دیگر اعلیٰ درجے کی تعمیرات وجود میں آئیں کہ جنکی مثال نہیں ملتی۔ یہ سارے فن کدے ترکستان، ایران اور کشمیر کے صنعت گروں، انجینئرز اور فنکاروں کی مشترکہ محنت کمال کا نتیجہ تھا۔ ان سلاطین کی مذہب، صنعت و حرفت اور علم و فن میں دلچسپی کی ہی وجہ تھی کہ ترکستان، ایران، افغانستان، بدخشاں، خراسان سے لوگ کشمیر آکر یہیں کے ہو رہے۔

1529ء تک ہنزہ، نگر گلگت، پونیال کے لوگوں کے لئے اسلام خاصا اجنبی تھا۔ یہاں اگرچہ اکا دکا مسلمانوں کی آمد شروع ہوگئی تھی لیکن یہ آٹا میں نمک کے برابر تھے۔ یہاں کا عمومی مذہب بدھ مت، پوٹاپا اور مناظر پرستانہ قسم کا تھا۔ یہاں لوگ عموماً ایک دوسرے کی

مذہبی سرگرمیوں پر تعرض نہ کرتے تھے۔ اور لوگ معجون مرکب قسم کے تصورات رکھتے تھے۔ میں سٹائن کے اس بیان سے اتفاق نہیں کرتا کہ بارھویں صدی عیسوی میں گلگت کے درد قبائل مسلمان ہو چکے تھے۔ مرزا حیدر دوغلت نے سال 1528ء میں وسط ایشیاء (کاشغر) کی طرف سے بلور (گلگت) پر حملہ کیا۔ گلگت اور ارد گرد کے علاقے ہنزہ، نگر، تاش کرغان، یونیال، یقاسین، چترال، کافرستان اُس وقت بلورستان سے معروف تھے۔ مرزا حیدر دوغلت بلتستان کو بلور کا حصہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اس حصے کو اپنی کتاب میں الگ وحدت کے طور پر بلتی نام سے متعارف کرایا ہے۔ مرزا حیدر دوغلت نے اپنی کتاب تاریخ رشیدی 45-1544ء میں کشمیر میں مرتب کی۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

ہم نے شاہ محمد سلطان والی کاشغر کی خواہش پر کہ یہاں کفر ہے ہولی دار (جہاد) کا ذمہ اٹھایا اور 1528ء کے سرما میں ہم بلور پر حملہ آور ہوئے۔ وہ کہتے ہیں "بلور ایک کافرستان ہے۔ اسکے بیشتر لوگ کوہ پیا ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی کوئی عقیدہ یا مذہب نہیں۔ وہ کسی شے سے نہیں چوکتے بلکہ اپنی خواہشات کے مطابق کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے افعال سر انجام دیتے ہیں۔ بلورستان کے مشرق میں کاشغر اور یارقند، شمال میں بدخشان، مغرب میں کابل اور لمغان اور جنوب میں کشمیر واقع ہیں۔ ان اطراف میں گھومنے کے لئے چار ماہ کی مدت درکار ہوتی ہے۔ یہ پورا علاقہ پہاڑوں، وادیوں پر مشتمل ہے۔ تاہم بلورستان میں ایک فرسخ زمین مسطح نہیں ملے گی۔ آبادی کثیر ہے۔ کسی گاؤں کا بھی دوسرے گاؤں کے ساتھ دوستانہ مراسم نہیں بلکہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل جنگ کی حالت میں رہتے ہیں۔ ان کی اکثر جنگیں اس انداز میں ہوتی ہیں۔ ان کی عورتیں گھر اور کھیتوں میں کام کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ جبکہ مرد لوگ جنگ میں مصروف ہوتے ہیں۔ عورتیں کھانا تیار کرتی ہیں اور جب دونوں طرف عورتیں کھانا لے کر محاذ جنگ پر پہنچتی ہیں تو مردوں کو جنگ سے روکتی ہیں اور اس دوران کوئی لڑائی نہیں ہوتی۔ بعض علاقوں میں لوگ قلعہ بند جنگ لڑتے ہیں۔ اور دن رات چوکسی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ چونکہ یہاں چراگاہیں کم ہیں اسلئے لوگ کم مویشی اور بھیڑ بکریاں رکھتے ہیں۔ وہ بھیڑوں کی اون سے اپنے لباس تیار کرتے ہیں۔ مویشیوں کے دودھ، مکھن پر گزر بسر کرتے ہیں۔ ہر وادی کی اپنی بولی ہوتی ہے اور لوگ ایک دوسرے کی بولیوں سے ناشناس ہیں۔ بلور میں اعلیٰ قسم کے انار کثرت سے ہیں۔ بلورستان میں ایک قسم کے ایسے انار ہوتے ہیں جن کے بیج سفید اور شفاف ہوتے ہیں۔ یہ

انار بہت میٹھے، خالص اور رس بھرے ہوتے ہیں۔ یہاں شہد بھی کثرت سے ملتا ہے۔ ہم نے بلورستان میں سرما گزارا۔ اور اس دوران کئی خونی لڑائیاں لڑیں لیکن فتح ہمیشہ ہمارے مقدر رہی۔ دوسرے سال (1529ء) بہار کے دنوں میں ہم بحفاظت تمام بہت مال غنیمت لے کر اپنے وطن سدھارے"۔

این۔ای۔ لیئس۔ کتاب میں اپنے تعارفی مقدمے میں لکھتے ہیں!

"There appears to have been no cause for the invasion, other than that the inhabitants were not musulmans".

ان تفصیلات سے درج ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں :۔

(1) یہ کہ یہاں کوئی قابلِ ذکر توانا مرکزی حکومت نہ تھی۔ لوگ چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اور یہ نسلی وحدتیں ایک دوسرے کیخلاف جنگ و جدل میں مصروف ہوتیں۔

(2) مرد دن رات جنگ لڑتے جبکہ عورتیں گھربار، کھیتی باڑی، امورخانہ داری اور مویشی پروری کے کام سرانجام دیتیں۔

(3) بلور ایک کفرستان تھا۔ واضح طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہاں اس وقت ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو مرزا حیدر اس کا ضرور تذکرہ کرتے۔

(4) لوگوں کی الگ الگ بولیاں تھیں۔ ایک گاؤں کے لوگ دوسرے گاؤں کی بولی سے نابلد ہوتے۔

(5) لوگ بھیڑ بکریاں پالتے اور بھیڑوں کی اون سے اپنے لئے لباس تیار کرتے۔

(6) یہاں انار اور شہد کی بہتات تھی۔

(7) بلور کا علاقہ چار طرف سے کاشغر، یارقند، کشمیر، بدخشان، کابل سے گھرا ہوا تھا۔ اس حوالے سے مرزا کا مطلوبہ علاقہ چترال، درشگوم، گلگت اور موجودہ دیامر بنتا ہے۔

(8) یہاں چار طرف پہاڑ ہی پہاڑ اور تنگ وادیاں تھیں۔ جہاں ایک فرسخ بھی ہموار زمین نہ تھی۔

(9) مرزا حیدر دوغلت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زیادہ تر تگ و تازیاں پونیال، گلگت، ہنزہ، چلاس، داریل و تانگر کے علاقوں تک محدود رہیں۔ ان

ہی علاقوں میں انار اور شہد عام ملتے ہیں۔ اسے یہاں بروشکی، کھوار اور شنا کی مختلف بولیوں سے سابقہ پڑا ہو گا۔

(10) اس کی حملے کی اصل وجہ کفرستان کے خلاف جہاد تھا۔ کیونکہ یہاں مسلمان نام کو بھی نہ تھے۔ تاہم آخر میں وہ اپنی اسلامی تبلیغ کے بارے میں کچھ نہیں کہتا اور اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہے۔ کہ اُسے یہاں بہت مال و غنیمت ہاتھ آیا۔ مرزا حنفی مسلمان تھا۔ اگر اس کی جنگ اسلامی جہاد ہوتی تو وہ یہاں حقیقت کی تبلیغ کرتا۔ لیکن اس حوالے سے اس کی کوشش صفر تھی۔ اور یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کا بلور پر حملہ مال و متاع کے حصول کی غرض سے تھا۔

ان دنوں صوبہ بدخشان، واخان، چترال و ور شگوم میں اسماعیلی دعوت کو ترقی مل رہی تھی۔ بدخشان اور واخان کی سرحدیں کاشغر سے ملتی تھیں اور یہ علاقہ والئی کاشغر کے زیرِ اثر بھی تھا۔ اس کے علاوہ صوبہ بدخشان پر مغلوں اور ترکوں کی مسلسل حکمرانی کی تاریخ بھی ملتی ہے۔ لیکن یہاں پر کسی مذہبی جنگ کی تاریخ نہیں ملتی۔ کیونکہ مغلوں کی مذہبی پالیسی فراخ دلانہ تھی۔ وہ کبھی بھی مختلف مسالک مسلمانوں کے ساتھ مذہبی بنیاد پر برسرِ پیکار نہیں ہوئے۔ بدخشان میں 1500ء تک مقامی شاہی حکومت قائم رہی۔ یہ حکمران سکندرِ اعظم کی اولاد سے ہونے کے دعویدار تھے۔

مارکوپولو اپنے سفر نامہ میں (صفحہ 58) لکھتے ہیں۔ "بدخشان کے صوبے میں بیشتر لوگ مسلمان ہیں اور ایک اجنبی زبان بولتے ہیں۔ اس علاقے پر ایک شاہی خاندان حکومت کرتا تھا۔ جس کے آباؤاجداد کا تعلق سکندرِ اعظم اور دارا کی بیٹی سے تھا۔ یہاں پر بادشاہ کو ذوالقرنین پکارا جاتا ہے جسکا مطلب سکندر ہی ہے۔

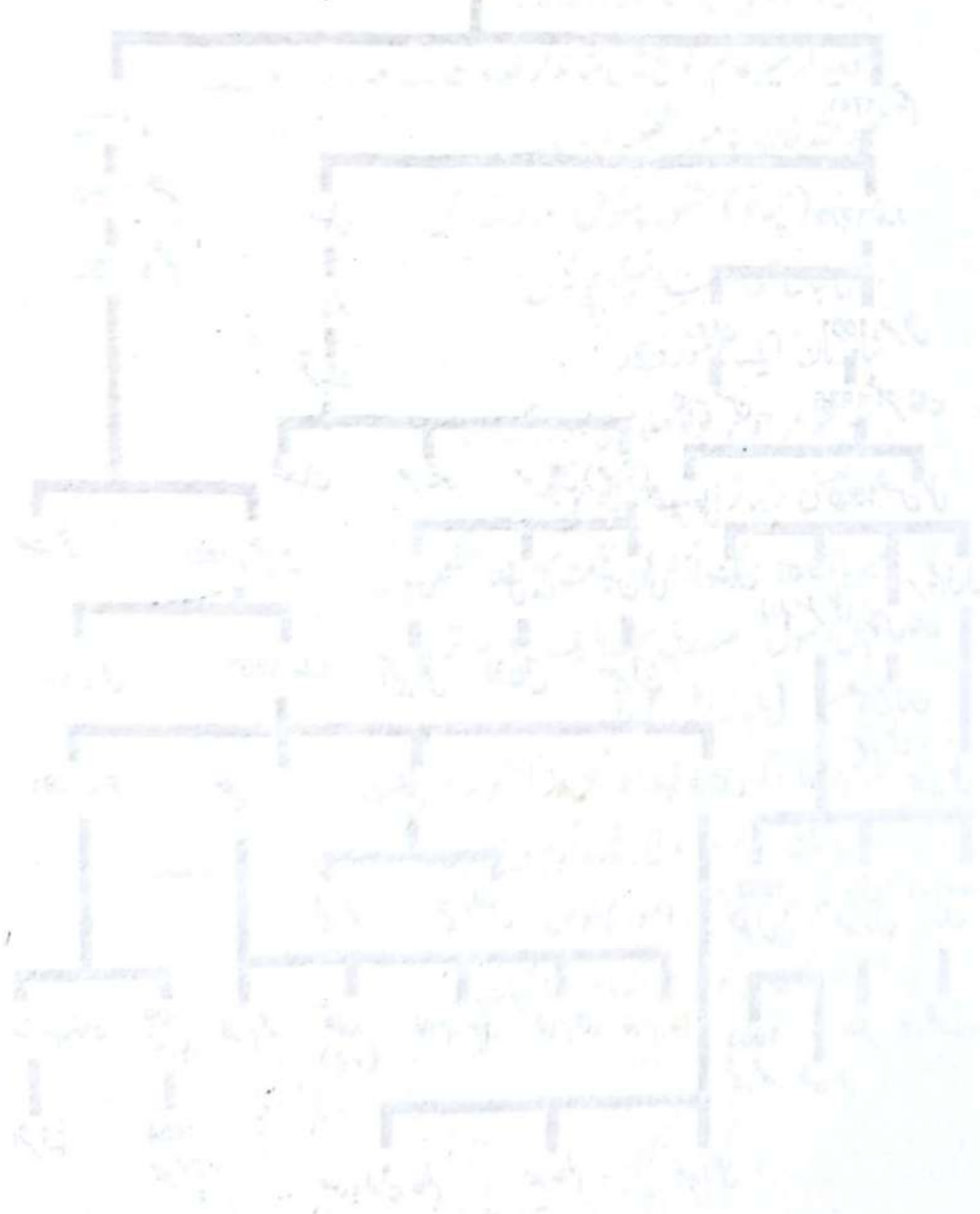
اس طرف یہی دعویٰ ہمارے بہت سے حکمران کرتے آئے ہیں۔ بدخشان کے مقامی شاہی حکومت کے آخری فرماں روا سلطان محمد بدخشی تھا۔ جو اسماعیلی فکر رکھتا تھا۔ اس نے والئی کاشغر ابوسعید سلطان کی بھیجی افواج کی اطاعت قبول کی۔ اور اسے یہاں سے ہرات منتقل ہونا پڑا۔ اور اس کا لڑکا عازم کاشغر ہوا۔ یہاں 1505ء میں بابر کا بھائی مرزا تیمور حاکم بدخشان مقرر ہوا۔ 08-1507 میں بابر کی اجازت سے اویس مرزا حکمران ہوا۔ اسی زمانے میں یعنی 1509ء میں ایک شخص اسماعیلی فکر لئے بدخشان میں نمودار ہوا اور کچھ علاقے فتح کر کے یہاں اسماعیلی حکومت قائم بھی کی۔ لیکن 1510ء میں رکن الدین قتل

ہوا۔ لیکن بدخشان، واخان، درشگوم اور چترال میں اسماعیلی تحریک منظم انداز میں جاری رہی۔ اسماعیلی مبلغین نے جنوب کی طرف اور اردگرد اپنے مبلغانہ مشن جاری رکھے۔ ایسا لگتا ہے 1529ء کے بعد یا اسی دور کے متصل واخان بدخشان کی طرف سے کسی تاج مغل نامی شخص نے کچھ رضاکار لے کر گلگت پر حملے کیے۔ چونکہ یہ حملے منظم تھے۔ اور مبلغانہ کوششوں کے نتیجے میں تھے اس لئے پونیال اور گلگت کے حکمرانوں کو مغلوب کرنے میں ان حملہ آور جتھوں کو کوئی دشواری پیش نہ آئی اور یہاں بیشتر لوگوں نے اسماعیلی دعوت کو لبیک کہا۔ تاج مغل کے ساتھ اسماعیلی مبلغین بڑی تعداد میں آئے ہونگے۔ انہوں نے پہلی بار یہاں کے لوگوں کے باطل خیالات کو مٹانے کی کوشش کی ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ کہ شمالی علاقہ جات (گلگت/پونیال وغیرہ) میں اسلامی اسماعیلی فکر رکھنے والے مبلغین نے پہلی بار اشاعتِ اسلام کی منظم کوشش کی۔ اس وقت تک یہاں باقاعدہ کسی اسلامی تبلیغ کے شواہد نہیں ملتے۔ ڈاکٹر لٹز گلگت کے ایک قدیم گیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو تاج مغل کے حملے کی یاد دلاتا ہے۔ گیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں یہاں جواری کی حکمرانی تھی۔ بیان اس طرح ہے ایک بار مغل افواج نے قلعہ گلگت کا محاصرہ کیا، ان دنوں گلگت پر جواری ایک عورت حکومت کرتی تھی۔ وہ ایک بلتی راجہ کی مطلقہ تھیں۔ دشمن سے اپنے آپ کو محصور پاکر اس نے ایک گیت گایا جسکا مطلب تھا۔ "میں ایک بہادر بادشاہ کی بیٹی ہوں لیکن آہ میں محض عورت ہوں۔ میں جلادتوں کا ایک پیالہ ہوں اور خطرات سے بھرپور جواسے گھونٹ گھونٹ چاہے پی سکتا ہے۔ شومئی بخت! میری نمایاں حیثیت کی وجہ سے دشمن یہاں تک آئے ہیں۔ اوہ میرے عزیز فرزند جی خان! میں اپنے آپ کو قربان کردوں گی میں تمہیں قربان کردوں گی، بجائے اس کے کہ میں تمہارے لئے حکومت محفوظ کردوں۔ صبح کا تارا (لچھار) جو اپنی بربادی پر چمکتا ہے وہ اب تجھ پر چمک رہا ہے۔" اس گیت سے یہ واضح ہے کہ مغل کسی دور میں یہاں حملہ آور ہوئے۔ وزیر حشمت اللہ اپنی کتاب "تاریخ جموں" میں لکھتے ہیں کہ تاج مغل نے تراخان کے دور میں (1310ء) گلگت پر حملہ کیا۔ یہ کہ اس نے شاہ رئیس نامی کسی سردار کو چترال میں اسماعیلیت کی تبلیغ کے لئے ذمہ داریاں سونپ دی تھیں۔ وزیر حشمت اللہ مزید لکھتے ہیں کہ تاج مغل گلگت کی مہم سر کر کے ہنزہ اور پھر کاشغر چلا گیا تھا۔ اور ان مقامات پر بھی اسماعیلیت کی تبلیغ کی تھی۔ ان دنوں کاشغر میں منگولوں کے چغتائی خاندان (1228ء تا 1369ء) کی ایک طاقتور حکومت

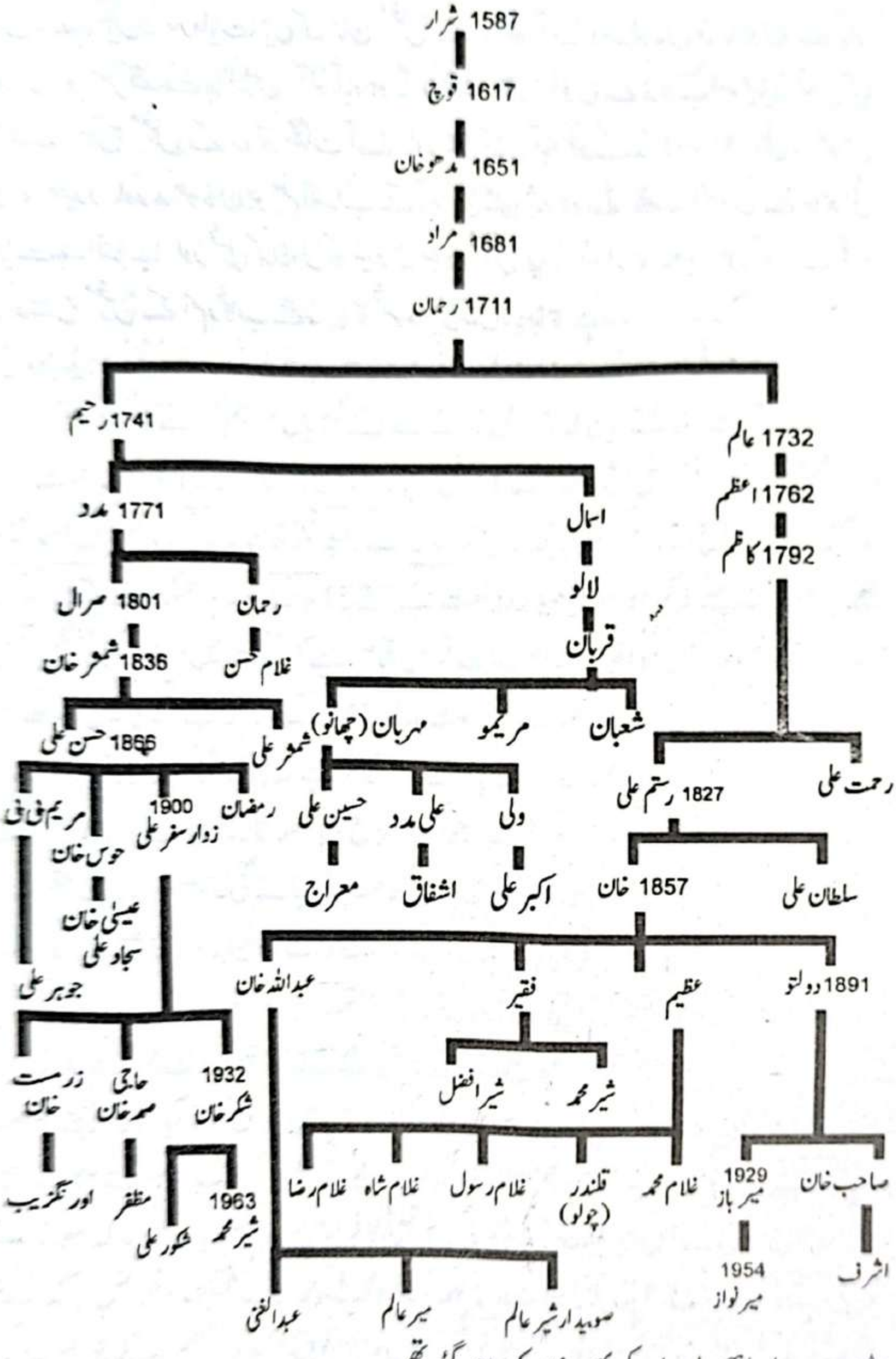
قائم تھی۔ اور اس حکومت کو پورے مغربی اور مشرقی ترکستان پر اقتدار حاصل تھا۔ ایک چھوٹے سے مذہبی داعی کا جو ایک مختصر سی رضاکاروں کی جماعت کے ساتھ گلگت آیا تھا، کاشغر پر یلغار کرنا ممکن نہیں دِکھائی دیتا۔ کاشغر کی تاریخ میں ایسے کسی واقعہ کا بھی ذکر نہیں ملتا۔ میرے نزدیک تاج مغل گلگت سے ہی واپس ہوا۔ اور بروغل کی راہ پامیر چلا گیا۔ وزیر حشمت اللہ مغل تاج کے ایک دوسرے حملے کا بھی ذکر کرتے ہیں جو سوملک کے دورِ حکمرانی (1335-90ء) میں ہوا تھا۔ اس حملے کے دوران تاج گلگت نہیں آیا۔ کہا جاتا ہے کہ سو ملک اور تاج مغل کی فوجوں کے درمیان یاسین کے مقام پر مڈبھیڑ ہوئی۔ اس میں سوملک کی افواج کو شکست ہوئی اور سوملک گرفتار ہوا۔ کافی عرصہ تک وہ تاج مغل کے مطبخ کا ہیڈباورچی رہا۔ وزیر حشمت اللہ کہتے ہین کہ باورچی خانے کے لئے لکڑیاں فراہم کرنے کا مہتمم مقرر ہوا تھا۔ محترم الواعظ فدا علی ایثار صاحب کا خیال ہے۔ 1310 تا 1565ء تک گلگت میں اسماعیلی مذہب رائج رہا۔ اور نیز یہ کہ راجہ ترا خان سے راجہ نور خان تک سب حکمران اسماعیلی تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا مرزا حیدر دوغلت کے 1528ء کے بلور پر حملہ کے وقت گلگت میں اسلام کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ تاہم یہ بات قرین قیاس ہے کہ گلگت میں اسلام کی منظم تبلیغ کا سہرا اسماعیلی داعین کے سر سجتا ہے۔ گلگت کے راجوں کے ادوار کے تعین میں بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اس کے لئے جیسے کہ مختلف بیانات سے ظاہر ہے کہ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت۔ ہر ایک نے مختلف ادوار متعین کیے ہیں۔ جو کسی طرح ہم عصر تاریخوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس موضع پر موقع محل کے مطابق پھر کچھ بحث کی جائے گی۔ تاہم یہ بات حقیقت کے قریب ہے کہ مرزا حیدر دوغلت کے بلور پر حملے کے وقت اسماعیلیہ، اثنا عشریہ یا اہلِ سنت والجماعت میں سے کوئی اسلامی فرقہ یہاں موجود نہ تھا۔

بہر حال تاج مغل گلگت آیا۔ گلگت پر اس کے حملے کا مقصد لوٹ مار کرنا یا زمین پر حکومت کا حصول نہ تھا۔ وہ مبلغانہ کوششوں کے تسلسل میں یہاں تک آیا اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوا۔ اس کے ساتھ صوفیاء، علماء اور مبلغین کی ایک مضبوط جماعت بھی تھی۔ تاج مغل نے اس جماعت کے توسط سے تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا۔ جیسا کہ ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والے حملہ آوروں کے ساتھ آنے والے کچھ لوگ مختلف اغراض کے لئے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ غزنویوں، خلجیوں، تیموریوں، مغلوں سکندرِ اعظم کے فوجیوں کی طرح جو برصغیر میں ادھر اُدھر رہ گئے اور بس گئے۔ تاج مغل کے ساتھ آنیوالے کچھ لوگ بھی

یہاں کے ہو رہے۔ ان میں ترخانیوں کے کچھ خاندان شامل ہیں۔ جو آج بھی یہاں پھل پھول رہے ہیں۔ روایات ہیں کہ تاج مغل کے ساتھ آنے والے میں ترخانیوں کے کچھ خاندان جو سمرقند سے بدخشاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اور جنہوں نے مذہب اسماعیلیہ قبول کیا ہوا تھا۔ تاج مغل کے ساتھ گلگت آئے اور پھر یہیں آباد ہو گئے۔ زوار سغر علی، حوس خان، حیدر اور مدھو خان جو علم النساب کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے خاندانی روایات، انساب اور نسلی کہانیوں کو سینہ بہ سینہ منتقل کیا۔ شرار او سعید اور آزر کے آباؤ اجداد تاج مغل کے ہم رکاب تھے۔ جنکا شجرہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔



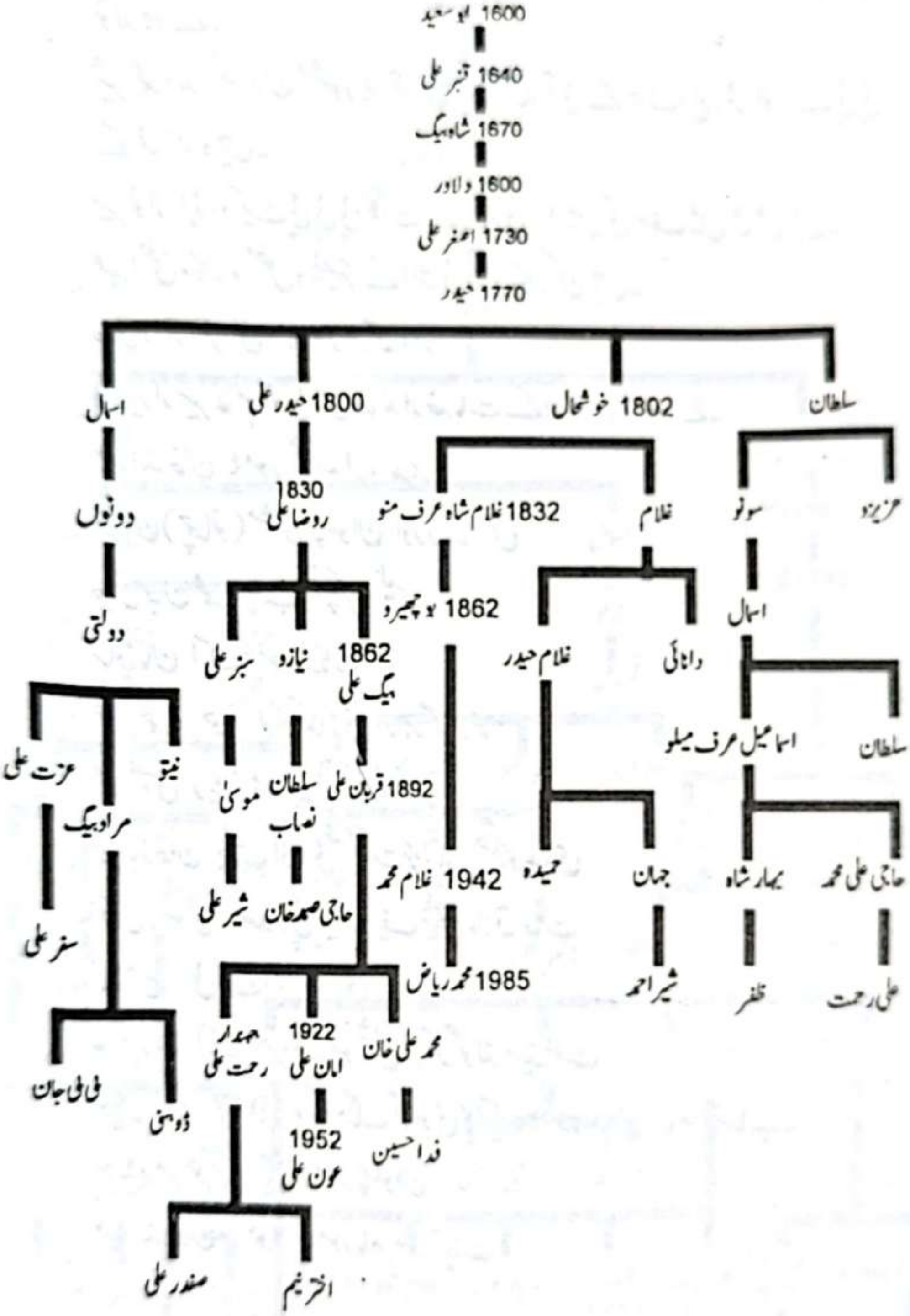
شرارتر خان کا شجرہ



☆ ابراہیم ولد دادو کی بہن خان کو بیاہی گئی تھی۔

☆ مریم بی بی نور علی بٹ کو بیاہی گئی تھی۔ جن سے جوہر علی خان ایڈوکیٹ تولد ہوئے۔
☆ شیر محمد ولد شکر خان مشہور جرنلسٹ اور اخبار آج کے چیف رپورٹر اور اے پی پی کے نمائندہ ہیں۔
☆ میر نواز ایڈووکیٹ پی پی پی گلگت کے بنیادی اراکین کی صف میں شامل ہیں۔
☆ عبد الغنی مکابرہ مغل ویلفیئر کے انتہائی فعال کارکن ہیں۔
☆ حاجی زوار سفر علی نامور جرگہ دار
☆ صوبیدار شیر عالم فوج میں شاندار خدمات کے بعد ریٹائر ہوئے۔
☆ عبداللہ خان نامور ٹھیکیدار، مدبر
☆ مہربان (چھانو) مشہور پہلوان اور رسہ کش
☆ حاجی جان محمد سب انسپکٹر پولیس
☆ شاہ زمان ایک نامور فنکار
☆ فقیر محمد مرحوم پولو کھلاڑی اور جرگہ دار
☆ محمد عیسیٰ ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس
☆ میرباز خان جنگِ آزادئ گلگت کا ایک جنگجو سپاہی
☆ اقبال رسول صدر پی ایف ایف شمالی علاقہ جات
☆ محمد منیر بی اے ایل ایل بی
☆ غلام رضا ایک معروف سوشل ورکر گولڈ میڈلسٹ
☆ حوس خان 1947ء کی جنگ آزادی کا ایک نامور سپاہی، ماہر انساب۔
☆ کریمو مرحوم ایک نامور پہلوان
☆ عبداللہ خان مرحوم نامور ماہر معاشیات

ابو سعید ترخان کا شجرہ

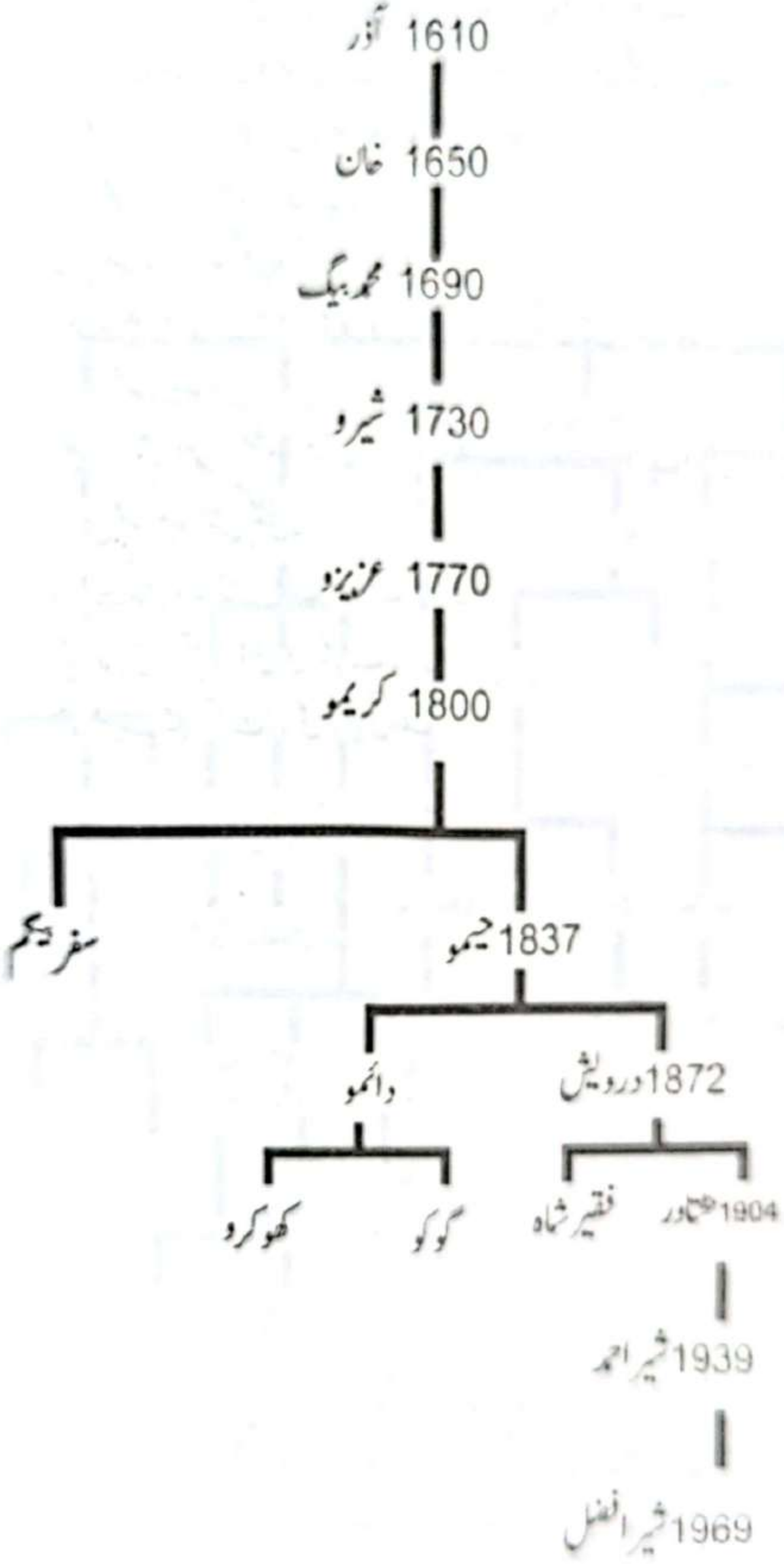


☆ بی بی جان کی ماں غلام حیدر کی بیٹی تھی۔

☆ دانائی غلام حیدر کی بہن تھی۔ ابراہیم ولد دادو کو بیاہی گئی تھی۔ جن سے حاجی اسحاق، شکور علی و شکور خان تولد ہوئے۔

☆ حمیدہ چھانو کو بیاہی گئی تھی۔ اُن سے ولی، حسین علی اور علی مدد پیدا ہوئے۔
☆ جہان بختاور کو بیاہی گئی تھی۔ جس سے شیر احمد ٹھیکیدار پیدا ہوئے۔ بختاور کی وفات کے بعد جہاں کا تمریز کے ساتھ نکاح ہوا۔ اُن سے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ جنکے نام حوراں، صبزی اور ذوالجہ تھے۔
☆ غلام محمد سابق افسر انتظامیہ۔
☆ حاجی صمد خان سوشل ورکر، جرگہ دار۔
☆ رحمت علی جمعدار 1947ء اور 1965 کی جنگوں میں حصہ لیا۔
☆ منو مشہور پہلوان۔
☆ ٹھیکیدار شیر احمد مشہور جرگہ دار، سوشل ورکر، مقابرہ کا ایک فعال کارکن، سابق ممبر میونسپل کمیٹی۔
☆ دولت خان ولد خان ایک معروف حکیم۔
☆ شیر غازی آڈیٹر ڈی سی ایم اے۔
☆ محمد لطیف منیجر آڈٹ زرعی ترقیاتی بنک

آذر ترخان کا شجرہ



☆ سفر بیگم دادو کو بیاہی گئی۔ جن سے نیت بیگم اور اُس کے چھ بھائی پیدا ہوئے۔ سفر بیگم راقم کی پردادی تھی۔

بندوبست اوّل و دوئم کے کارپردازان امیر سنگھ اور ٹھاکر سنگھ نے ان خاندانوں کا شجرہ مرتب کیا۔ وہ دونوں چونکہ ہند کے باسی تھے۔ اس لئے انہوں نے ترخان لکھنے کے بجائے ترکھان لکھا کیونکہ ہندی میں خ کو کھ اور ک ہی متبدل حروف تھے۔ اصل خاندانی نام لہجوں، ہجوں اور حروف کے غلط استعمال سے تاریکی میں گم ہوتے گئے۔ غلط تعبیرات نے کام کر دِکھایا۔ مغل ترخانوں کو محض ترکھان لکھنے پر اکتفا کیا گیا۔ ترخانوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اُن پر پانی پھیر دیا گیا۔ اُن کے اچھے ناموں کو بگاڑ کر پیش کیا گیا۔

برصغیر کی تاریخ ہُن، منگول، مغل اور ترکوں کی کارگزاریوں سے بھرپور ہے۔ صوفیہ، مبلغین سے لے کر حکمرانوں تک ہر نوع کے لوگ آئے۔ کشمیر کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالیں تو واضح ہوتا ہے کہ کشمیر پر مغلوں نے ایک لمبے عرصے تک حکمرانی کی۔ ہون، ترک، مغل حکمران کشمیر میں آتے رہے جہاں کشمیر کے قدیم آبادکاروں میں تورانی الاصل اقوام کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہاں اُن کے ہم قوم افراد کشمیر پر حکمرانی اس بات کی دلیل ہے کہ کشمیر میں بڑی تعداد میں مغل خاندان آباد ہوئے۔ کشمیر کے پنڈت، بہت سے راجپوت، گوجر اقوام وغیرہ کے تورانی الاصل ہونے کی شہادتیں ملی ہیں۔ کشمیر پر مختلف اقوام کی حکمرانی کی مدت پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کی حکمرانی کا دور طویل ادوار میں شامل ہے۔ درج ذیل اعدادوشمار اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

1۔ قبل تاریخ کا دور	1320 تک	
2۔ مسلم سلاطین کا دور	1320ء تا 1560ء	240سال
3۔ چک سلاطین	1560ء تا 1586ء	26سال
4۔ مغل حکمران	1586ء تا 1752ء	166سال
5۔ افغان حکمران	1752ء تا 1819ء	67سال
6۔ سکھ	1819ء تا 1846ء	27سال
7۔ ڈوگرے	1846ء تا 1947ء	101سال

1586ء تا 1752 تک ہند کے مغل حکمرانوں نے کشمیر پر منظم انداز میں حکمرانی کی۔ شہنشاہان ہند کی طرف سے اس زمانے میں 49 مغل صوبیداروں نے باری باری صوبہ

کشمیر کے نظم و نسق کو کنٹرول اور تصرف میں رکھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کشمیر کے وسط ایشیا سے تعلق ٹوٹ گیا تھا۔ والئی کاشغر سلطان سعید خان فتوحات اور مال غنیمت حاصل کرنے کا دلدادہ تھا۔ بلور کی فتح (29-1528ء) کے بعد وہ تبت، لداخ اور بلتستان کو بھی زیر کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے انہوں نے ان علاقوں پر یلغاریں کیں۔ اور ان مہموں میں وہ بڑے کامیاب ہوئے۔ 1531ء میں مرزا حیدر کی سربراہی میں مغل فوجیں کامران کشمیر میں داخل ہوئیں۔ لیکن چونکہ ان کا ان علاقوں پر مستقل ٹھہرنے کا کوئی مقصد نہ تھا اس لئے وہ کافی مالِ غنیمت کے ساتھ کاشغر لوٹے۔ یہاں بھی سلطان سعید یا مرزا حیدر دوغلت کے کسی مبلغانہ کوشش کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔

مرزا حیدر دُغلت کشمیر سے واپسی پر بدخشاں کے راستے کابل چلا گیا اور وہاں سے لاہور آیا تاکہ اپنے ہم قوم مغلوں کی مدد سے اپنے مستقبل سنوارنے کے لئے قسمت آزمائی کرے۔ ان دنوں ہندوستان میں مغلوں پر مصائب اور آلام کا زور تھا۔ ہمایوں اور شیر شاہ سوری اور خود ہمایوں اور اس کے بھائیوں میں مناقشات کی وجہ سے معاملات الجھے ہوئے تھے۔ مرزا حیدر نے ہمایوں کی طرف سے شیر شاہ سوری کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔ لیکن انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ مرزا حیدر دُغلت کہاں نچلا بیٹھنے والا شخص تھا۔ وہ کشمیر دیکھ چکا تھا۔ ان دنوں کشمیر سیاسی طور پر عدم استحکام کا شکار تھا۔ کشمیر کے دو سیاست کار ابدال ماگرے اور ریگی چک کا مرزا سے رابطہ تھا۔ کشمیر کے حالات مرزا حیدر دغلت کے لئے بہت پر کشش تھے۔ وہ چار سو مغل سواروں کا ایک دستہ لے کر کشمیر پر حملہ آور ہوا۔ اور اسے کشمیر پر غلبہ پانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ وہ 1540ء سے 1550ء تک کشمیر کا اصل مالک و حکمران رہا جبکہ نازک شاہ برائے نام شاہِ کشمیر تھے۔ مرزا دُغلت کے اس دور میں کشمیر میں مغلوں کی آمد میں اضافہ ہوا۔ وسط ایشیا سے رابطے بڑھے۔ مرزا حیدر نے کئی فتوحات بھی حاصل کیں۔ اس دور میں بلتستان، پکھلی، راجوڑی اور کشتواڑ کے علاقے فتوح ہوئے۔ مرزا حیدر نے دور دور سے ماہرین فن، دستکار، آرٹسٹ، نقاش وغیرہ بلوائے جنہوں نے کشمیر کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ وسط ایشیاء سے کئی اعتبار سے تعلقات میں اضافہ ہوا۔

1. علماء فضلا، مبلغین، سیاست کار، جنگجو، لڑاکا فوجی کشمیر آتے جاتے رہے اور بستے بھی رہے۔
2. مذہبی عقیدت مند اور سیاح آثار اور مقدس مقامات کی زیارت کے لئے بھی

آتے رہے۔

3. وسط ایشیاء کے ساتھ تجارتی اور سفارتی تعلقات میں اضافہ ہوتا گیا۔

4. ایران اور وسط ایشیا سے ایسے فنون اور حرفے کشمیر میں آئے۔ جو یہاں ناپید تھے یا ترقی یافتہ نہ تھے۔ مثلاً کشمیر کا چوبی فن تعمیر ایرانی مسلمانوں کے کمال کا نتیجہ تھا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز کہتے ہیں کشمیر کا چوبی فنِ تعمیر محض مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے۔ ہندو اس فن میں مسلمانوں کے ہم پلہ نہ تھے۔

5. لسانی رابطوں کا نتیجہ تھا کہ فارسی کشمیر کی سرکاری زبان قرار پائی۔ کشمیر کے فارسی شعرا اپنا ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔

6. وسط ایشیا افغانستان اور ایران سے تعلق کی وجہ سے کشمیر کی معاشرت نے مسلمانوں کا رنگ اختیار کیا۔ مکانوں کی تعمیر اور سجاوٹ کھانے پینے کے برتن میوہ جات، مساجد کے ڈیزائن، چوبی کام۔ پیپر ماشی کا کام شال اور قالین بافی، گتہ سازی، لکڑی پر بیل بوٹے ڈالنا، چاندی، تانبے، پیتل کے برتن پر آرائشی کام، مجلسی آداب کے سلیقے مماثل خطوط پر فروغ پاتے رہے۔

مرزا حیدر دُغلت سلطان سعید خان کی وفات کے لاہور آرہا تھا۔ تو اس کے ساتھ کاشغر سے چند مغل سوار ہم رکاب ہوئے۔ ان میں ایک دولت خان نامی شخص تھا جو یوان قبیلے کا ایک فرد تھا۔ وہ بھی قسمت آزمائی کے لئے آمادہ سفر ہوا۔ لاہور اُن دنوں مرزا کامران کے تسلط میں تھا۔ بابر کی وفات کے بعد ہمایوں کو تخت دہلی ملا تو تھا لیکن بھائیوں میں خلفشار اور شیر شاہ سوری کے حملوں نے مغل سلطنت کو متزلزل کرر کھا تھا۔ مرزا کامران اور ہمایوں دونوں کی خواہش تھی کہ کشمیر مغلیہ سلطنت کا حصہ بنے۔

جیسے پہلے بیان ہوا ہے کہ ان دنوں کشمیر میں بڑی ہلچل تھی۔ لدال ماگرے، مغلوں کی مدد سے کشمیر کی اس وقت کی حکومت کو گرانے کے در پے تھے۔ لدال ماگرے کی ترغیب، تائید کو دیکھ کر مغل کشمیر پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ لیکن کس واضح فیصلے سے بیشتر شیر شاہ سوری کے حملوں کی وجہ سے مرزا کامران کابل اور ہمایوں کو ایران کی طرف بھاگ جانا پڑا۔ ان کے ارادے پورے نہ ہوسکے۔ مرزا حیدر دُغلت نے ان شاہ بر ادران کی مدد کے بغیر کشمیر حاصل کیا۔ دولت خان ترخان اس حملے میں مرزا حیدر دُغلت کے ساتھ تھا۔

دولت خان ترخان سال 1541ء کے دوران بارہ مولہ میں مقیم ہو گیا۔ اور یہیں کسی مقامی خاندان میں اس کی شادی ہوئی۔ بارہ مولہ کشمیر میں ایک اہم مقام کا حامل ضلع ہے۔

اس کی سرحدیں مظفر آباد، گلگت اور سری نگر سے ملتی ہیں۔ بارہ مولہ کی وجہ سے تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ہندی میں بارہ کے معنی سُور کے اور مولہ کے معنی جگہ کے ہیں۔ اور یوں سوروُں کی جگہ کے طور پر مشہور ہے۔ قدیم زمانے سے بارہ مولہ گلگت کا دروازہ بنتا تھا۔ بارہ مولہ سے سنبل 29 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہی مقام گلگت سری نگر شاہراہ کا مقام اتصال ہے۔ بانڈی پور جو بارہ مولہ کا ایک شہر ہے۔ گلگت کا پہلا پڑاؤ بھی ہے۔ دولت خان اسی بارہ مولہ کا باسی بنا۔ کشمیر ہمیشہ سازشوں کا گڑھ رہا ہے۔ اور اس حوالے سے اسے کبھی استحکام نصیب نہیں ہوا۔

مرزا حیدر دُغلت کو بھی وہ سکون نہ مل سکا جسکا وہ متلاشی تھا۔ چنانچہ 1551ء میں خان پور کے معرکے میں یہ من چلا مغل جانباز، کمانڈر، مورخ، قلمکار اور منتظم میدان جنگ میں کام آیا۔ اور کشمیر پھر سے فسادات کی لپیٹ میں آیا۔ دولت خان اُن دنوں بدخشان گیا ہوا تھا۔ اسے کشمیر کے متزلزل سیاسی حالات کا علم ہوا۔ تو اس نے کشمیر کے لئے اپنی روانگی ملتوی کی۔ اور وہیں اچھے دنوں کا انتظار کرنے لگا۔ تاہم 1555ء میں جب ہمایوں تخت دہلی پر دوبارہ متمکن ہوا۔ وہ لاہور آیا۔ اور یہیں 1577 میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا فرزند برک خان 1586ء میں اپنے ننھیال کی تلاش میں بارہ مولہ آیا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔

ہر کمالے راز والے ہندوستان میں مغلوں کی عظیم الشان حکومت آہستہ آہستہ روبہ تنزل ہونے لگی۔ مغلوں کی جہاں مرکزی حکومت کو ضعف آیا وہاں دور دراز انتظامی یونٹ، صوبے، پرگنے اور اضلاع مرکز کے کنٹرول سے آزاد ہوتے گئے۔ اردگرد طاقتور صوبیداروں نے صوبوں میں خود مختاری کا اعلان کیا۔ اور جہاں صوبیدار مرکز کے تابع فرمان تھے۔ وہاں انہوں نے من مانی کاروائیوں سے لوگوں کی ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ کشمیر ایک ایسا صوبہ تھا جہاں بد نظمی، بدانتظامی، عوامی لوٹ کھسوٹ، لاقانونیت، غربت و افلاس نے گھیر رکھا تھا۔ کشمیر ایک بار پھر روایتی سازشوں میں الجھ کر رہ گیا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملوں کی وجہ سے مغل سلطنت آخری ہچکیوں میں مبتلا تھی۔ اس آخری دور میں کشمیر میں ابوالقاسم مغل گورنر تھا۔ حسبِ روایت کچھ کشمیری لیڈروں نے افغانوں سے رابطہ کیا۔ اور انہیں کشمیر پر حملے کی دعوت دی۔ احمد شاہ ابدالی نے اس دعوت کو خوشی خوشی قبول کیا۔ اور اس نے اپنے ایک تجربہ کار جرنیل عبداللہ ایشک کو پندرہ ہزار افغان افواج کے ساتھ کشمیر روانہ کیا۔ وہ وہاں پانچ ماہ چوبیس روز تک مقیم رہا۔ ان دنوں افغانوں نے کشمیری عوام پر جو

مظالم ڈھائے وہ ناگفتہ بہ ہیں۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق وہ ایک ایسے عذاب میں گرفتار ہوئے جسکی مثال نہیں ملتی۔ عبداللہ خان ایشک اقاصی، عبداللہ خان کابلی کو صوبیدار اور سوکھ جیون مل کو اسکا نائب متعین کر کے مال غنیمت کی ایک بڑی کھیپ کے ساتھ عازم کابل ہوا۔ اس کے جاتے ہی کشمیریوں کو ایشک اقاصی کے مظالم یاد آئے۔ انہوں نے افغانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ راجہ سکھ جیون مل کو کشمیری عوام کی مدد حاصل ہوئی اور اسے عبداللہ خان کابلی اور اس کے بیٹے کو ٹھکانے لگانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ان دنوں یعنی 1754ء کے متصل زمانے میں احمد شاہ ابدالی ایران اور پنجاب کے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ وہ فوری طور پر کشمیر میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے سوکھ جیون مل کی صوبیداری قبول کرتے ہوئے خواجہ کچک کو نائب صوبیدار بنا کر کشمیر روانہ کیا۔ خواجہ کچک دراصل کشمیریوں سے مال و دولت بٹورنے کے لئے مامور ہوا تھا۔ افغانوں کے ناروا مطالبات سے عوام بپھر گئے۔ اور اس کے نتیجے میں افغانوں کے حامیوں کے ساتھ بارہ مولہ کی لڑائی وقوع میں آئی جس میں کشمیری عوام نے فتح پائی۔

جون 1762ء میں احمد شاہ ابدالی لاہور وارد ہوا۔ اسے سوکھ جیون مل کی شرکشیاں پسند نہ آئیں۔ وہ اسے قرار واقعی سزا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک سردار نورالدین بامیزی کو پچاس ہزار سپاہ کے ساتھ روانہ کیا تاکہ سوکھ جیون مل کی گوشمالی کی جائے۔ نورالدین بامیزی کو راجہ جموں کی اعانت بھی حاصل تھی۔ یہ افواج درہ توش میدان سے گزر کر پرگنہ ونیئو میں اقامت گزیں ہوئیں۔ یہیں سوکھ جیون مل اپنی فوجوں کے ساتھ بالمقابل ہوا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا کمانڈر بخت مل افغانوں سے جاملا۔ سوکھ جیون مل اب مقابلے کے لائق نہ رہا تھا۔ لہٰذا بھاگ نکلا اور گرفتار ہوا۔ افغان اسے دردناک عذاب دینے کا قصد کر چکے تھے۔ لہٰذا ہاتھی کے پاؤں تلے روندوا دیا گیا۔ اور یوں ایک جامع الصفات شخص کا خاتمہ ہوا۔

بلند خان بامیزی افغان کا پہلا صوبیدار مقرر ہوا۔ اس کی مدت حکومت 1762ء تا 1764ء ہے۔ اس کے بعد نورالدین خان بامیزی صوبیدار مقرر ہوا۔ جسکی صوبیداری کا زمانہ 1766ء تک جاتا ہے۔ یوں کشمیر میں افغانوں کی منظم حکمرانی کا دور شروع ہوا۔ جو 1819ء تک جاری رہا۔ افغانوں کا 67 سالہ دور حکومت بدترین ادوار میں شمار ہوتا ہے۔ افغانوں نے ان لوگوں پر خصوصی مظالم کے بازار گرم کیے۔ جنھوں نے سوکھ جیون مل کا

ساتھ دیا تھا اور افغانوں کیخلاف لڑائیوں میں حصہ لیا تھا۔ افغانوں نے کشمیر میں آباد مغل قبائل کی بیخ کنی کے لئے تمام حربے استعمال میں لائے۔ افغانوں اور مغلوں کی چپقلیشیں تاریخ میں دور دور تک جاتی تھیں۔ مغلوں نے پٹھانوں سے تخت دہلی حاصل کیا تھا۔ بابر ابراہیم لودھی، ہمایوں شیر شاہ سوری کی لڑائیاں اور پھر احمد شاہ ابدالی کے حملے مغلوں اور پٹھانوں کی رقابتوں کے مظہر تھے۔ نعمت اللہ ہروی کی تاریخ مخزن افغانی جو خان جہان لودھی کی تحریک پر لکھی گئی تھی، محض مغلوں سے نسلی برتری جتانے کے لئے مرتب کی گئی اور پٹھانوں کو سامی نسل سے جوڑا گیا تھا۔ حالانکہ لسانی اور نسلی شواہد اس بات سے لگانہ کھاتے تھے۔ خوشحال خان خٹک کی مغلوں سے نفرت اور اس کی شاعری یہ تمام معاملات پٹھان مغل مخاصمت کی دلیل ہیں۔ اور اب جو کشمیر میں افغانوں کو مغلوں سے سودا چکانے کا وقت آیا تھا۔ وہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ سوکھ جیون مل کو کشمیری مغلوں کی بڑی اعانت حاصل ہوئی تھی۔ اور ان کی حمایت سے سوکھ جیون مل نے دہلی کے بادشاہ عالم گیر دوم (1754-59ء) کے اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا تھا۔ اس لئے افغان انتقامی جذبات سے باؤلے ہو رہے تھے۔ انہوں نے مغلوں کو چن چن کر قتل کرنا، ستانا اور زک پہچانا شروع کیا۔ ایسے حالات میں مغل خاندانوں کے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ زیرِ زمین چلے جائیں مہاجرت کریں اور اپنی شناخت چھپائیں۔

دولت خان ترخان کا قبیلہ بارہ مولہ میں آباد ہو گیا۔ اور اس کے قبیلے کو یہاں 1586ء سے 1762ء تک رہتے ہوئے ایک سو چھتر سال کا زمانہ گزرتا تھا۔ اس خاندان کے کچھ لوگ سوپور، سری نگر اور لولاب میں بھی منتقل ہوئے تھے۔ دولت خان ترخان کی اولاد میں محمد کریم اور اس کا فرزند عبدالمراد پر 1753ء کی بارہ مولہ کی لڑائی میں شامل ہونے کا شبہ تھا۔ اور اس میں حقیقتاً بارہ مولائی زیادہ شریک بھی تھے۔ اس لئے 1762ء میں جیسے ہی افغانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ شک و شبہ پر مقامی لوگوں کی پکڑ دھکڑ، قتل و غارت گری اور قید و بند کے لامتناہی سلسلے شروع ہوئے۔ 1762ء میں مختلف قوموں خصوصیت سے مغلوں کے بڑے بڑے جتھے پناہ اور عافیت کی تلاش میں سرگرداں ہو کر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے۔ محمد کریم اور اس کا فرزند عبدالمراد بھی ان جتھوں میں سے ایک جتھے میں شامل تھے۔ جو بھٹکتے بھٹکتے اسی سال گلگت وارد ہوئے اور کشروٹ کے مقام پر آباد ہوئے۔

میجر بڈلف اور کئی مورخین اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ افغانوں کے اسی

دور میں بہت سے جنگجو قبائل خصوصاً مغلوں کو افغانوں کی ستم رانیوں سے بچنے کے لئے مجبوراً مہاجرت کرنی پڑی۔ پھر جے۔ بڈلف لکھتے ہیں کہ افغانوں کے ظلم اور ایذا دہی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بعض اقوام نے شمالی علاقہ جات کے مختلف علاقوں کی طرف ہجرت کی تھی۔ وہ اپنی کتاب "ہندوکش کے قبائل" میں لکھتے ہیں کہ

"From the head Hodur valley a road leads into the Gilgit valley. In Hodur there is a small settlement of cashmeeri refugees, who fled from the severity of the pathan rule about a hundred years ago." Page 14.

ترجمہ:

"وادی ہوڈر سے ایک راستہ وادی گلگت میں جاتا ہے۔ ہوڈر میں کشمیری آباد کار مہاجرین کی ایک چھوٹی سی کالونی ہے۔ یہ لوگ ایک سو سال پہلے کشمیر سے پٹھان حکومت کی سختیوں سے بچنے کے لے بھاگ آئے تھے۔"

ایک سو سال بیشتر کا زمانہ وہی نکلتا ہے جب افغانوں نے 1762ء میں کشمیر پر دوبارہ قبضہ کیا تھا۔ اور افغانوں کے خلاف لڑائیاں لڑنے کی پاداش میں مقامی جنگجو قبائل پر ستم رانیوں کے باب کھول دیئے گئے تھے۔ بڈلف آگے چل کر کشروٹ میں بسنے والے کشمیریوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "گلگت میں بڑی تعداد میں کشمیری بستے ہیں جنہیں کشیروز کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان کے آباؤاجداد 1760ء کے لگ بھگ زمانے میں یہاں آکر آباد ہوئے۔ وہ اب آبادی کا ایک بڑا حصہ بناتے ہیں۔ ان میں سے کچھ چترال چلے گئے اور وہاں کی آبادی میں ضم ہوگئے۔ یہ بڑے چالاک اور ہوشیار لوگ ہیں۔ جو کشمیری گلگت میں رہتے ہیں وہ زیادہ تر جولاہے اور بڑھئی ہیں۔ شین، یشکن لوگ انہیں کسی قدر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کشمیریوں کی نمایاں ذاتیں میر شیخ، پایر، لون، زرگر ڈار، راوٹ، بٹ اور ترکھان ہیں۔ یہ ساری ذاتیں کشمیر میں پائی جاتی ہیں۔ یہ لوگ زمینیں کاشت کرتے ہیں۔ اور پیشے کے لحاظ سے بھی ان کی ذاتیں بن گئی ہیں۔ ماسوا، زرگروں اور ترکھانوں کے وہ آپس میں شادیاں کرلیتے ہیں۔ لیکن خود دوسروں کے ہاں شادی نہیں کرتے ہیں۔ یہ تمام کشمیری قومیں کبھی کبھی شینوں اور یشکنوں کو اپنی بیٹیاں بیاہ دیتے ہیں لیکن ان سے ایسی توقعات نہیں رکھتے۔ اگرچہ یہ لوگ معاشرتی اعتبار سے کوئی بلند مقام نہیں رکھتے لیکن یہی لوگ آبادی کا زیادہ فعال

حصہ ہیں۔ ساتھ ساتھ انہوں نے کشمیریوں کی کچھ بری عادتیں ترک بھی کر دی ہیں۔
"صفحہ 40,39 کتاب ہندوکش کے قبائل۔

میجر جے بڈلف کی کتاب سے دو اقتباسات اوپر دیے گئے ہیں۔ ان سے کچھ حقائق پر روشنی پڑتی ہے۔

(1) یہ کہ 1760ء تا 1790ء کے دوران کشمیر سے بڑی تعداد میں کشمیریوں نے ہجرت کی۔ (کتاب 1890ء کے قریب مرتب ہوئی)

(2) اس وقت ہجرت کرنے والے کشمیریوں نے کشروٹ اور ہوڈر میں پناہ لی۔

(3) یہ ہجرت پٹھانوں کے ظلم و تعدی سے بچنے کے لئے کی گئی۔

(4) کشروٹ میں آنے والے کشمیری 1760ء میں آئے، ان میں سے کچھ چترال بھی گئے۔ لیکن وہ مقامی آبادی میں ضم ہو گئے۔ اور ان کی کوئی الگ شناخت نہیں رہی۔

(5) یہ کشمیری بڑے فعال لوگ ہیں۔

یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ 1762ء میں افغانوں نے کشمیر پر دوبارہ قبضہ جمایا اور اسی زمانے میں کشمیریوں نے نقل مکانی کی۔ 1760ء میں کشمیر میں سوکھ جیون مل، عبدالحسن بانڈے وغیرہ مقامی لوگوں کی حکمرانی تھی۔ یہ سوکھ جیون مل اور عبدالحسن خان بانڈے ہی تھے جنہوں نے مقامی جنگجو قبائل کی مدد سے بارہ مولہ کے مقام پر افغانوں کو شکست فاش دی تھی۔ 1762ء میں جیسے ہی افغان غالب آئے مقامی جنگجو قبائل نے جنہوں نے افغانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔ راہِ فرار اختیار کیا۔ اس تفصیل سے یہ بات اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ سال 1762ء ہی وہ سال ہے کہ جس میں کشمیریوں نے نقل مکانی کی اور یہ نقل مکانی افغانوں کے ظلم جور سے بچنے کے لئے کی گئی۔ اس کے علاوہ بٹو گاہ کھنر جسکلوٹ، نگر اور اردگرد بھی مغل قبائل نے ہجرت کی ہے۔ فریڈرک ڈریو اپنی کتاب جموں اینڈ کشمیر ٹریٹیز میں لکھتے ہیں۔ "گلگت کے داردوں میں ایک کشمیری کالونی ہے۔ یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض گلگتی لوگوں کے خون میں کشمیری خون کی آمیزش ہوئی۔ کئی پشتیں پہلے ان کشمیریوں کے آباؤ اجداد نے مقامی عورتوں سے بیاہ ناتا کیا اور یہاں آباد ہوئے۔ ان کی اولاد نے کشمیری خصوصیات کھو دی ہیں۔ اور اجنبی نظروں کے لئے وہ بالکل گلگتی لگتے ہیں۔ تاہم داردوں کے پاس ان کی شناخت ہے۔ اور جہاں تک باہمی شادیوں کا تعلق ہے تو وہ ان سے الگ رہتے ہیں۔" فریڈرک ڈریو کشمیری نسل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "کشمیری لوگ

بلاشبہ جسمانی طور پر تمام قبائل سے خوبصورت ترین نسل ہے جسکا اس کتاب میں تذکرہ کیا جارہا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ قد و قامت اور خدوخال کے اعتبار سے براعظم ہندوستان میں کشمیری خوبصورت ترین نسل ہیں۔" (صفحہ 174) ڈاکٹر گستاؤلئی بان مشہور فرانسیسی محقق اپنی کتاب "تمدن ہند" میں لکھتے ہیں "جب ہم نیچے اتر کر خاص وادیٔ کشمیر میں آتے ہیں جو تقریباً 80 میل لمبی اور 30 میل چوڑی اور جس کا منظر تمام عالم میں مشہور ہے تو یہاں ہمیں ایک ایسی قوم ملتی ہے جو گردونواح کی اقوام سے اسی قدر مختلف ہے جیسی کشمیر کی وادی تمام دنیا کے ملکوں سے۔ کشمیریوں کا نام صرف اس وادی کے باشندوں پر صادق آتا ہے۔ ملک ہند کے باشندوں میں کشمیری جسمانی خصائص کے لحاظ سے سب سے زیادہ عجیب اور سفید رنگ ہیں۔ ان کی عورتوں کا حسن شہرہ آفاق ہے۔ جلد ان کی نرم اور صاف ہے۔ ناک خمدار اور بال داڑھی گھنی۔ قد میں یہ زیادہ لمبے نہیں ہیں لیکن مضبوط ہیں۔ یہ زیادہ جری نہیں لیکن ان کی فنی قابلیت تعجب خیز ہے۔ یہی اس مشہور شال کے بنانے والے ہیں جو تمام دنیا میں پہنچ گئی ہے۔ اور یہیں وہ تانبے پر میناکاری کا کام ہوتا ہے جس کی نقل اس وقت یورپ نہ کر سکا۔ اصلیت کے لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کشمیر کے باشندے اقوام آریہ کی خالص اولاد ہیں۔" (صفحہ 125)

کشمیر زمین پر ایک جنت ہے۔ باغِ عدن ہے۔ ارض و سما کی تمام خوبیاں، نعمتیں، نظارے اور نیچر کی بہاریں سب اس جنت ارضی کا حصہ ہیں۔ جہانگیر بادشاہ اس کے مسحور کن حسن سے سرشار ہو کر کہتے ہیں۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اگر مشکل حالات درپیش نہ ہوں ایک ایسی جنتِ ارضی سے کون باہر نکلنا چاہے گا۔ امپیریل میں لکھا ہے۔ "اس کے باوجود کے کشمیر پر طاقتور مغلوں، خونخوار افغانوں اور جابر سکھوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی لیکن کشمیری بدلے نہیں۔ معمولی حالات میں کشمیری اپنے اس وطن سے باہر نہیں نکلتے۔" اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کشمیر میں ہر چیز کی بہتات ہے کشمیر کی زمین سونا اگلنے والی زمین ہے۔ زعفران، چاول، اقلیم جہاں کے میوہ جات، خودرو سبزیاں، پانی کی فراوانی، ریشم کا کیڑا، لکڑی، ماہی، جنگل، پہاڑ، دریا کس شے کی کمی ہے کہ لوگ اِدھر اُدھر بھٹکیں۔ یہاں روزگار عام ملتا ہے۔ کشمیریوں کی

سرشت میں فن شناسی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور تو اور کشمیر کا کاشت کار سطح آب پر بھی کھیتی باڑی کرتا ہے۔ ڈل کا ایک بڑا حصہ مصنوعی کھیتوں سے سبزہ زار بنا رہتا ہے۔ ایسے میں جب ملک کشمیر میں انواع نعمتیں دستیاب ہوں، کشمیری کہیں باہر جانے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے۔ کیونکہ کشمیر کا ساگ، کشمیر کے جیسے چاول جوان کے من بھاتا کھاجا ہیں۔ دنیا میں کہیں اور نہیں مل سکتے۔ آج کشمیری ارد گرد جہاں کہیں ملتے ہیں یا تو انہیں مشکل حالات میں مہاجرت کرنی پڑی ہے یا انہیں جلاوطنی کے عذاب کاٹنے پڑے ہیں۔ یا پھر علمی، فنی، مذہبی شوق نے جوگ لینے پر مجبور کیا ہو۔ کشمیری اپنے وطن میں ہی مطمئن رہتا ہے۔

گلگت کے قدیم راجگی دور میں یہاں عوام کا برا حال تھا۔ مقامی راجے عموماً ارد گرد جنگ میں مصروف رہتے یا خالی اوقات میں پولو کھیلتے یا ہانکا شکار کرتے یا محل کی رنگینیوں میں کھوئے رہتے۔ کئی کئی رانیوں کے جھرمٹ میں دن رات بسر کرتے یا مسخروں، قصہ گویوں کی کہانیوں سے جی بہلاتے، غریب عوام سے کوسوں دور رہتے۔ اس وقت کے گلگتی عوام انتہائی افلاس زدہ تھے۔ راجے وغیرہ ان خستہ حال غریبوں کی کمائی میں برابر کے شریک ہوتے۔ نسالو کی وقت پٹھالی، شادی بیاہ کے وقت نذرانہ، لس پک کے جھنجٹ، بیگار، رئیس، وزیر، ترنگفہ کی غلامی، یرفے کے چونچلے، کُل چین کی ستم رانیاں غرض عوام ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے رہتے۔ قدیم گلگت میں نجی یا سرکاری طور پر کوئی صنعت قائم نہ تھی۔ لوگ کھیتی باڑی کرتے یا بھیڑ بکریاں پالتے۔ بہت مشکل سے گزر بسر ہوتی۔ لوگ اون سے پٹو تیار کرتے۔ اور اسی سے اپنا لباس بنایا کرتے۔ قدیم راجگی دور میں درج ذیل عہدیدار موجود تھے۔

1۔ وزیر: سرکاری مالگزاری اور سیاسی امور کی نگہداشت کرتا تھا۔ عدالتی فیصلے کرتا یا جنگ کی صورت میں جنگی امور کی دیکھ بھال کرتا۔

2۔ کُلچین: یرفوں کا سربراہ ہوتا، مالیات، ٹیکس، بوئی (آٹا پیسنے کی مزدوری) وغیرہ کا حساب رکھتا۔

3۔ یرفہ: مالیات اور ٹیکس وصولی کا کارندہ۔

4۔ ترنگفہ: نمبردار کو کہتے ہیں۔ یہ سرکاری مالیات کی وصولی میں مدد کرتا۔ بیگار، رئیس، لس پک، بلہ شری معاملات نبھاتا۔

5۔ چربوہ: چوکیدار۔

ان عہدوں سے ظاہر ہے کہ یہ تمام لوگ راجوں کے خاندانی، مالیاتی ٹیکس وصولی نظام کے کارپردازان یا کارندے ہوتے۔ یہ راجوں کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے، لوگوں سے بب (مالیہ) وصول کرتے، بھیڑوں کی اون، بکریوں کے بال، شرے (بالوں کی بنی مقامی چٹائیاں)، پٹو، میوہ جات، تحائف کے حابات، آٹاپسوائی کی فیس، بازؤں کے لئے گوشت، ہانکا شکار کی باریاں، گھوڑوں اور جانوروں کے لئے چارہ، راجوں کے کچن کی لکڑی وغیرہ کا اہتمام ان کے ہاتھوں میں ہوتا۔ پورے علاقے میں کوئی مکتب مدرسہ، تعلیمی نام کا ادارہ موجود نہ تھا۔ راجے بھی ان پڑھ، عوام بھی ناخواندہ، اندھوں میں کانا راجہ غرض سبھی ایک کشتی کے سوار۔ یہ راجے غریب عوام کا محض استحصال کرتے۔ ان راجوں میں کوئی تہذیبی حس موجود نہ تھی۔ علم ودانش، فنون، تمدن وغیرہ سے بے خبری ہی وجہ ہے کہ آج گلگت میں ان راجوں کے حوالے سے کوئی آثار دستیاب نہیں ہیں۔ مغلائی شکار، یاں چھنی یا نوپورہ کے کھنڈرات سب دساوری یادگاریں ہیں۔

پوبر، ہوڈر، کھنر، جگلوٹ، کشروٹ، چترال، بلتستان، یا اردگرد کشمیریوں کی نقل مکانی مشکل حالات کے نتیجے کے طور پر عمل میں آئی۔ محمد کریم اور اس کا نوجوان بیٹا عبدالمراد کشمیری تارکین وطن کے ساتھ گلگت آچکے تھے۔ اس وقت کشروٹ آباد نہ تھا۔ یہاں بڑی بڑی چٹانیں تھیں۔ کانٹوں اور سرکنڈوں کا ایک جنگل تھا۔ اور بیشتر علاقہ دلدل میں ڈوبا ہوا تھا۔ نائیکوئی، برمس، نوپورہ، سونی کوٹ میں تھوڑی سی زمین، کپل کھن کا کچھ ٹکڑا، زمین، دینور میں چھوٹی سی آبادی، سکوار، مناور میں چند گھر، ہنزل اور بسین کی مختصر آبادی، بسین پائین میں کارگاہ نالہ کے منہ کے ساتھ تھوڑی سی آبادی سارگن گلگت بناتے تھے۔ پھر نگرل آباد ہوا۔ خومر جوٹیال کی آبادیاں وجود میں آئیں، کپل کھن کے ساتھ کلچوٹ بنا۔ شفاخانہ کے ساتھ دوچار گھر بنے۔ اور یوں یہ آبادی بڑھتی گئی۔ 1762ء میں کشروٹ میں آنے والے لوگ انتہائی فعال اور صاحب عمل تھے۔ کشمیریوں کے اس جتھے نے جلد ہی اس افتادہ ٹکڑے زمین کو سونا اگلنے والی زمین میں بدل دیا۔ چاول کی کاشت کا سہرا ان ہی کشمیریوں کے سر رہا۔ کشروٹ کی دلدلی زمین کو چاول کی کاشت کے لئے موزوں بنایا گیا۔ ان ہی کشمیریوں نے کشمیر کی کاشت کاری کے عین مطابق کپاس اور تمباکو کی کاشت کے تجربات بھی کیے۔ اور کشمیریوں نے دھان کے ریشے سے عمدہ چٹائیاں اور پاؤں کے پاپوش تیار کرنا، بید کی لکڑی سے برتن اور ٹوکرے بنانا۔ (رسیاں، چمڑے کے تھیلے (کوتو)، کوری (چمڑے

کے پاپوش بنانے کا کام قدیم گلگت میں پہلے سے رائج تھا۔)، سونے چاندی کے زیور اور فرنیچر تیار کرنے اور کئی فنون یہاں رائج کیے۔ محمد کریم اور عبدالمراد کی اولاد نے کشروٹ، ہنزل، اور بسین میں کئی سو کنال زمین آباد کی۔ یہ خاندان آج بھی بڑی زمینوں اور جائیدادوں کا مالک ہے۔ اس خاندان میں ماہرین السنہ، دانشور، شاعر، قلمکار، فنکار، ہنر، چوب کار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی کوئی کمی نہیں ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

1۔ عبدالرحمان عرف رحمان :

سفارت کار، مدبر، نگر، ہنزہ کی طرف سفارتی امور سرانجام دیتا تھا۔ اسی لئے مناپن کے خواجہ حسن میر کے گھرانے سے تعلق ہوا۔ اور اس خاندان میں شادی ہوئی۔ مصنف تاریخ ان کی اولاد سے ہے۔

2۔ رحمت اللہ عرف رحمہ :

ماہر زبان شنا، موذن۔

3۔ عبدالرحیم ولد رحمہ مرحوم :

ماہر زبان شنا۔

4۔ عبدالقاسم مرحوم :

راجہ سکندر اور گوہر امان کی لڑائی میں راجہ سکندر کی طرف سے لڑا۔ جنگ میں گرفتار ہوا۔ گلگت کے دو سو قیدیوں میں شامل تھا۔ جنہیں بدخشان فروخت کیا جاتا تھا ان قیدیوں میں رونو، شین، یشکن، سید اور کشمیری شامل تھے۔ سنگل کے مقام سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ اور تانگیر پہنچا۔ وہیں آباد ہوا۔

5۔ محمد اسمال مرحوم :

نامور راج، گلگت پل کے برج بنانے میں کشمیری کاریگروں کے ساتھ کام کیا۔

6۔ حاجی عبدالکریم مرحوم :

شمالی علاقہ جات کے چھ اولین حاجیوں کے دستہ میں شامل تھا۔ راجہ محمد اکبر گورنر پونیال بھی اسی جماعت کا ممبر تھا۔ دلیر سیاست دان، جرگہ دار، جمعدار مہتمم بندوبست (16-1915)۔

7۔ عبدالصبور مرحوم:

1920-21ء میں میٹرک کیا۔ اور آپ اس طرف میٹرک کرنے والا پہلا شخص تھا۔ فنکار، سری پرتاب ہائی سکول میں پڑھتا رہا۔

8۔ چوہدری محمد کریم مرحوم:

جرگہ دار، چوہدری، راجہ گلگت جعفر خان کا ریفہ، راجہ مرحوم نے انہیں ایک مکان اور دکان گفٹ کی تھی۔

9۔ منشی محمد یوسف مرحوم:

مڈل جے اے، دی (سری نگر) نامور ادیب، اپیل رائیٹر، اول مدرس ڈموٹ، بونجی، قُل (عوام) کے لکھت پڑھتے کے کام کرتا تھا۔ اس لئے بلہ شری کے کاموں سے معافی دار تھا۔ تنظیم ملت (کرنل حسن مرحوم کی جماعت)، مسلم کانفرنس (آفس سیکرٹری) اور تحفظ حقوق گلگت جیسی جماعت کا فعال رکن تھا۔

10۔ عبدالقاسم مرحوم۔

شینا، پہیلیوں اور محاوروں کا ماہر۔

11۔ حاجی محمد اسحاق مرحوم:

موذن، مشہور، قصہ گو۔

12۔ حاجی محمد حسن:

معروف راج

13۔ محمد حسین مرحوم:

پولو کھلاڑی، مدبر صلح کار۔

14۔ منشی محمد عیسیٰ مرحوم:

مشہور عرائض نویس، جرگہ دار۔

15۔ عبدالعزیز:

شاعر، گائیک، شنازبان، راج۔

16۔ عبدالواحد:

بی اے ایل ایل بی۔ سابق جائنٹ سیکرٹری حکومت پاکستان، گلگت کا

پہلا مقامی ڈپٹی کمشنر، دانشور، شاعر، ادیب، انگریزی لسان اور لٹریچر کا مدرک۔

17۔ عبدالرزاق :

وکیل، فنکار، گلگت کے ابتدائی کئی ڈراموں میں حصہ لیا۔

18۔ عبدالرحیم مرحوم :

(کور آف گلگت سکاؤٹس کا سپاہی) اور فنکار۔

19۔ میجر مسعود احمد :

(بی ایس سی (آنرز) پی ایس سی (PSC)

20۔ رئیس احمد

بی اے۔ مُنصِرم، مدبر

21۔ وسیم احمد

بی ایس سی (امریکی شہریت اختیار کیا) شجاع، فہامہ۔

22۔ عزیزالرحمان :

بی اے، ڈی کام مجسٹریٹ درجہ اوّل، اے او، تحصیلدار وغیرہ کی اہم پوسٹوں پر کام کیا۔ دفتری مسودہ نویسی کا ماہر۔ نائب مہتمم بندوبست گلگت۔

23۔ عبدالخالق تاج :

تحصیلدار، شاعر، اردو وشنا زبان، پہلا مکمل شنا قاعدہ مرتب کیا۔ حلقہ ارباب ذوق کے نائب صدر۔

24۔ حاجی خیر الامان :

سابق ممبر میونسپل کمیٹی۔

25۔ حاجی غلام قادر :

معلم و سوشل ورکر۔

26۔ محمد قادر :

مدبر، منتظم، منصوبہ کار۔

27۔ ناصرالدین مرحوم :

ڈی کام۔ سابق مینجر زرعی بنک۔

28۔ محبوب علی :
انجینئر۔

29۔ عابد حسین :
بی اے، افسر ترقیات۔

30۔ حاجی میر عبداللہ :
انجینئر

31۔ جاوید اقبال :
بی اے ایل ایل بی، ممبر بار گلگت۔

32۔ اشرف علی :
لائبریرین کشروٹ میونسپل لائبریری۔

33۔ جہانگیر :
بی کام۔ منیجر سمال بزنس کارپوریشن۔

34۔ شاہ دین :
بی اے۔ منیجر اڈٹ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن گلگت۔

35۔ صلاح الدین :
بی اے۔ افسر کارپرداز سول ایوی ایشن۔

36۔ عبدالستار :
سابق ممبر یونین کونسل۔

37۔ عبدالقیوم :
سابق چیئرمین یونین کونسل۔

38۔ ظفر وقار تاج :
بی اے۔ شاعر صاحبِ دیوان۔ آکاس و آنند۔ کمپیر۔

39۔ عارف حسین :
انجینئر۔

40۔ علی مدد مرحوم :
مشہور قصہ گو۔ (مصنف کتاب نے کیسر کی کہانی ان سے سنی)

41- عالم حسین :
سوشل ورکر۔

42- انتخاب :
بی ایس سی آنرز (انجینئرنگ)

43- شباب :
بی ایس سی آنرز (انجینئرنگ)

44- زاہد حسین :
صحافی لاہور۔

45- شکور علی :
مشہور چوب کار۔

46- شاہد اقبال :
سابق ممبر میونسپل کمیٹی۔

47- ذوالفقار :
بی ایس سی آنرز (زراعت) :اس میدان میں اس خاندان کا پہلا فرد۔

48- شیراز :
سی اے۔ اس میدان میں اس خاندان کا پہلا فرد۔

راقم کے وادیال کے ساتھ شجرہ

دولت خان ترخان (مغل) کاشغر کا مکین تھا

برگ خان

اور خان ـــــ سعید خان ـــــ قادر خان

سواد خان المعروف سودہ (سواد خان کے معنی بڑے خان کے ہیں)

محمد کریم

عبدالمراد بولیو نامی شخص کی لڑکی سے شادی ہوئی تھی۔
یہ خاتون یشکن قبیلے سے تعلق رکھتی تھی)

عبدالرحمان المعروف رحمان (ان کی زوجہ کا نام جانی تھا۔) جانی خواجہ محمد حسن میر ساکن مناپن قوم میر مغل خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔۔ خواجہ محمد حسن نے میر نگر کے لئے گوتم سر کی لڑائی میں حصہ لیا تھا اس کی اعلیٰ کارکردگی سے خوش ہو کر میر نگر نے اسے مناپن میں جاگیر سے نوازا۔ اس خاندان کے بڑی نگر، پسن، مناپن وغیرہ میں پچاس ساٹھ گھرانے ہیں۔ امیر حیدر بحردار مناپن، غلام حسین ٹی وی انجینئر اسی خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔ یہ ایک معزز خاندان ہے۔

رحمت اللہ المعروف رحمہ زوجہ کرم بی بی دختر دماع ساکن چونگڑہ استور کے ایک مغل خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے آباؤاجداد بھی کشمیر سے آکر چونگڑہ میں آباد ہوئے تھے۔

عبدالرحیم زوجہ نیت بیگم دختر محمد مراد المعروف دادو مغل ترخان خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

III راقم کے دادا رحمت اللہ کے بھائی عبدالقاسم المعروف چتورو کو گوہر امان نے 1841ء میں گلگت کے دو سو جوانوں کے ساتھ جو جنگ میں قیدی بنائے گئے تھے، بدخشان

فروخت کرنے کے لئے پونیال روانہ کیا۔ اس قافلے میں گلگت کے شین، یشکن رونو، کشمیری، سید وغیرہ سبھی شامل تھے۔ ٹھاکر سنگھ مہتمم بندوبست نے 1973 بکرمی کی بندوبست دوم میں ان قیدیوں کی فہرست دی ہے۔ قیدیوں میں محمد فاضل شاہ صاحب کا ایک جد بھی شامل تھا۔ چند نمائندہ نام یہاں دیے جاتے ہیں۔

(1) غلام ولد مقیم ولد سوکو ولد سمو قوم یشکن بدخشان میں فروخت ہوا۔

(2) سلطان ولد اونومو قوم یشکن بدخشان میں فروخت ہوا۔

(3) عبداللہ ولد باقر ولد حیدر ولد رحمہ قوم میر۔

(4) باقر شاہ ولد لطف شاہ قوم سید۔

(5) غلام حسین ولد میر کہن قوم یشکن یارقند میں فروخت ہوا۔

(6) کیثر ولد داؤد قوم شین یاغستان میں فروخت ہوا۔

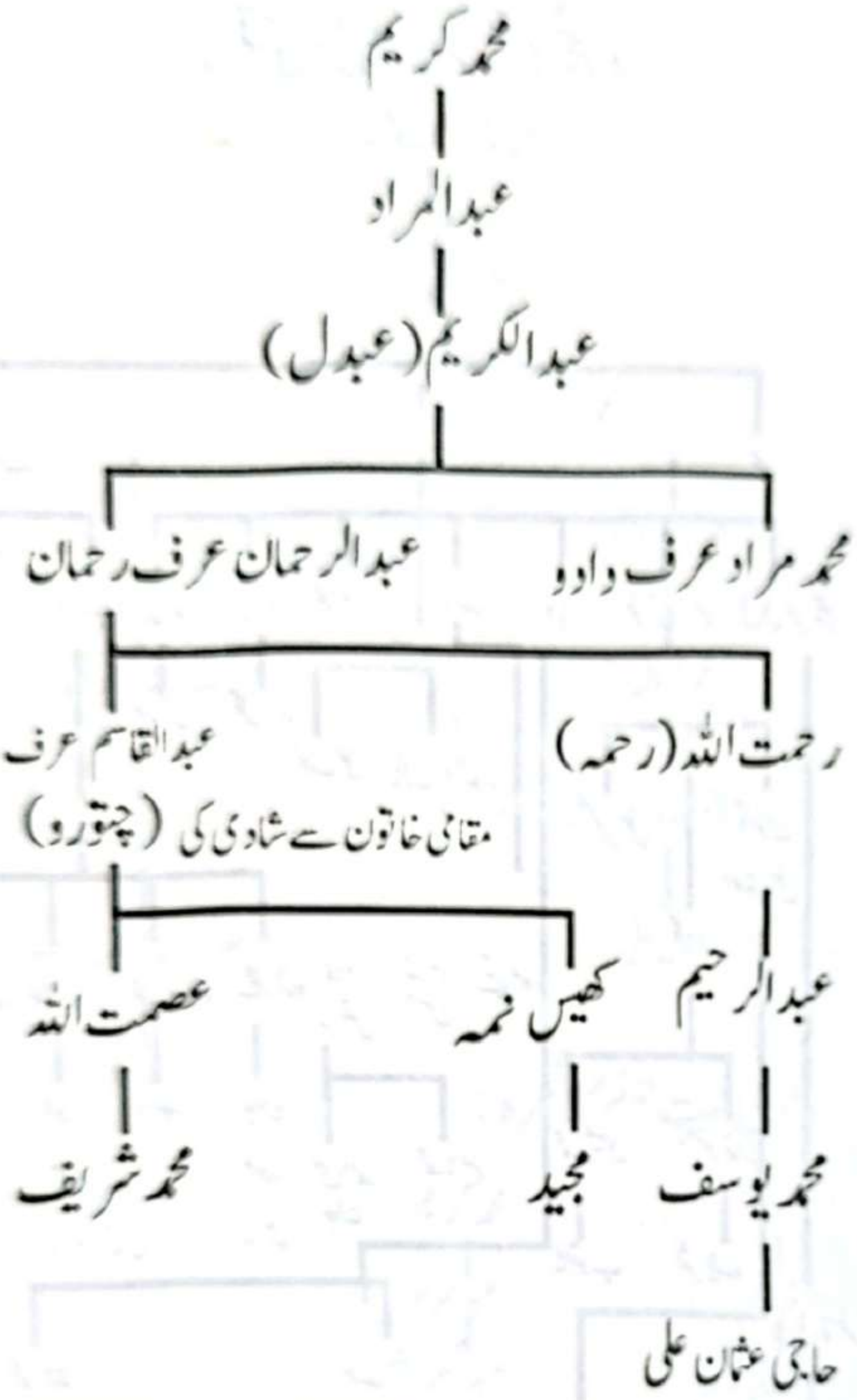
(7) محمد علی بیگ ولد شاہ کریم ولد موسیٰ بیگ قوم رونو بدخشاں میں فروخت ہوا۔

(8) شمشیر خان ولد شمشیر بیگ ولد عزاری قوم شین بدخشان میں فروخت ہوا۔

(9) نیاز علی ولد سبزو ولد پسر علی قوم یشکن چترال میں فروخت ہوا۔

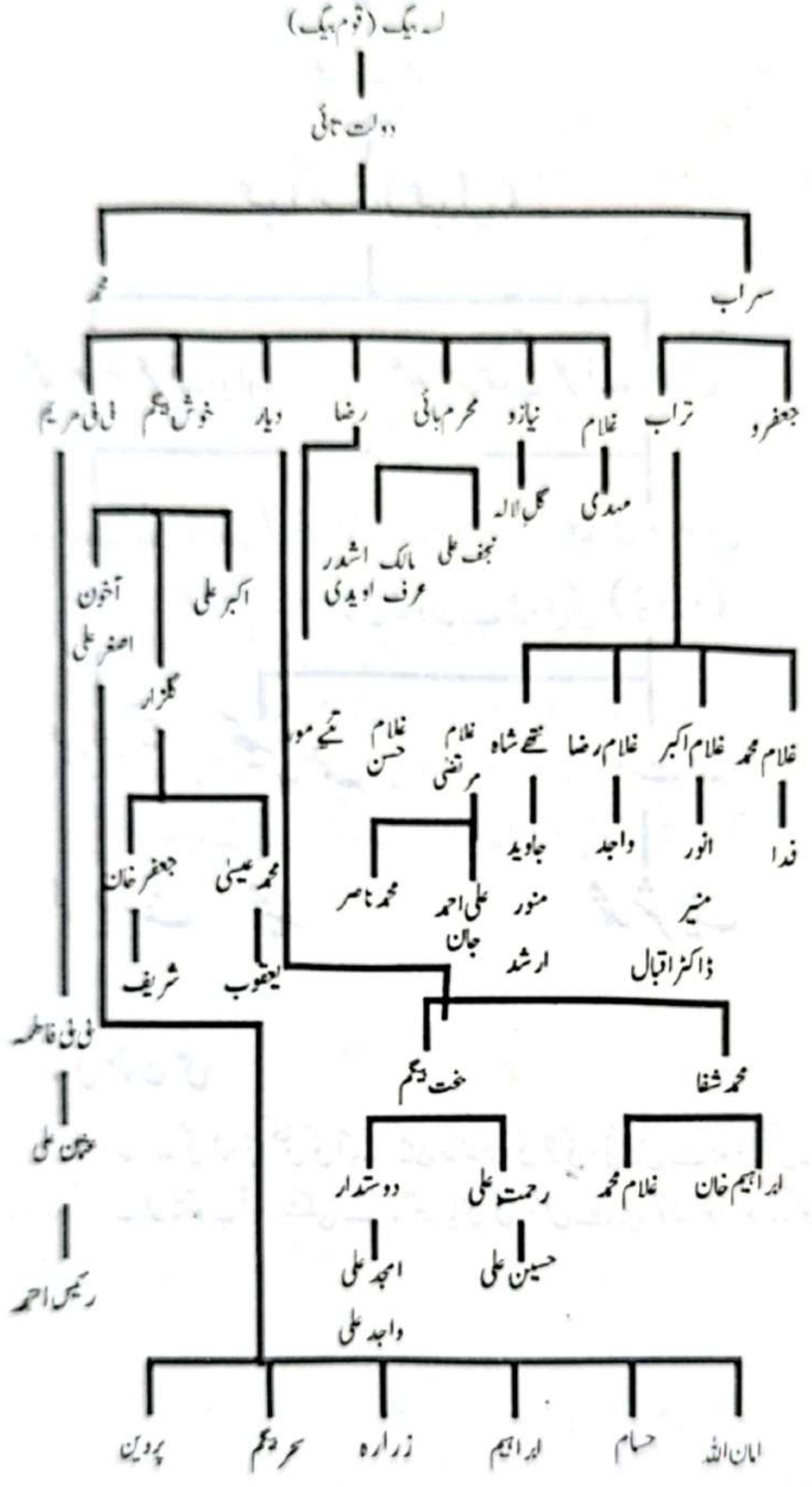
(10) سید باقر علی ولد سبز علی قوم سید بدخشان میں فروخت ہوا۔

میرا دادا عبدالقاسم سنگل (پونیال) کے مقام سے کسی طرح بھاگ کر کھیمی کوٹ (تانگر) پہنچا اور وہیں آباد ہوا۔ ان کا شجرہ درج ذیل ہے۔

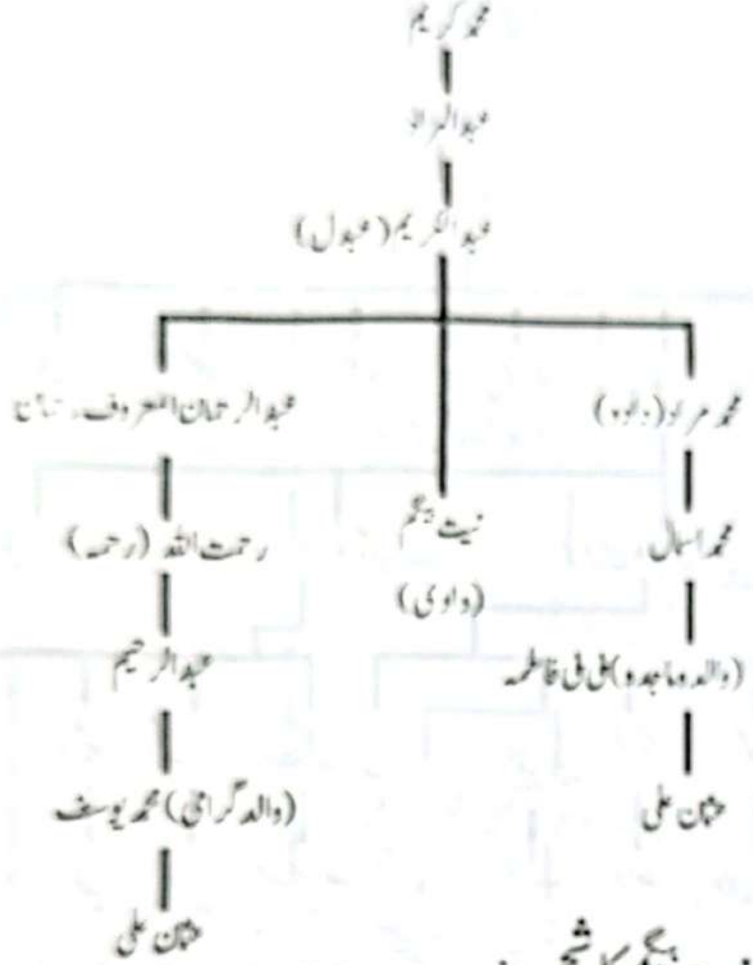


عصمت اللہ کی شادی کھلی کی ایک شین خاندان کی لڑکی ونی نامی سے ہوئی تھی۔
کھیس نامہ بارگو کے محمد یعقوب قوم یشکن کے ساتھ بیاہی گئی جس سے مجید تولد ہوا جو بارگو میں آباد ہے۔

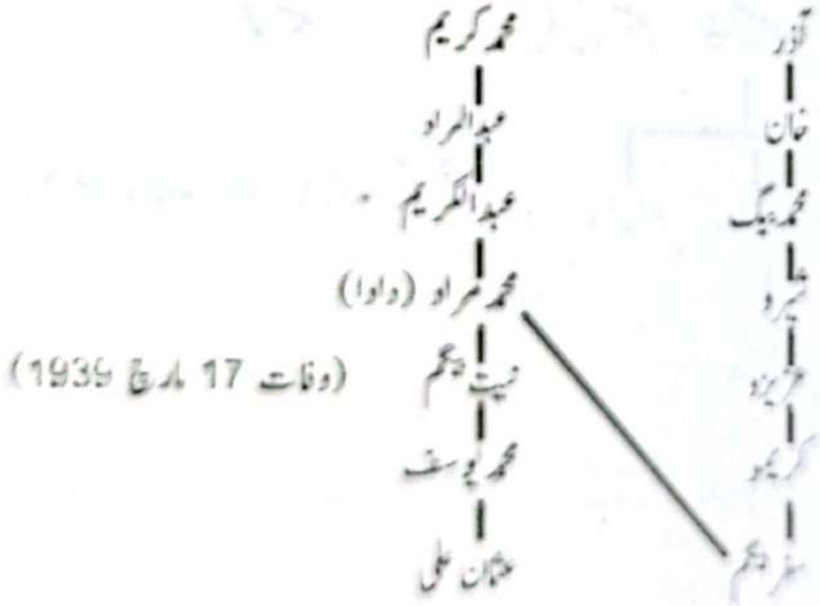
راقم کی نانی بی بی مریم کا شجرہ



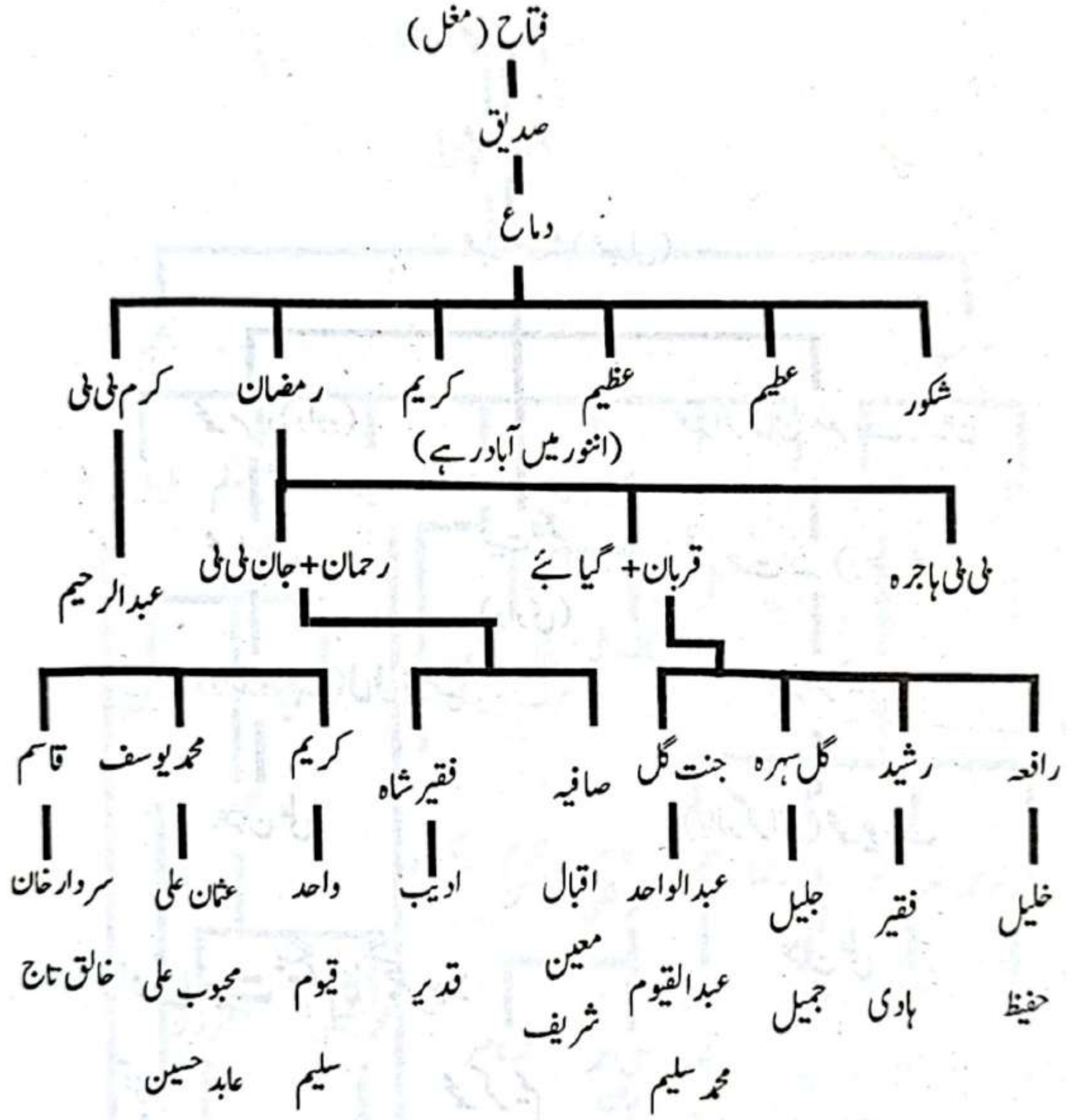
راقم کے نانا کا شجرہ



دادی نیت بیگم کا شجرہ:

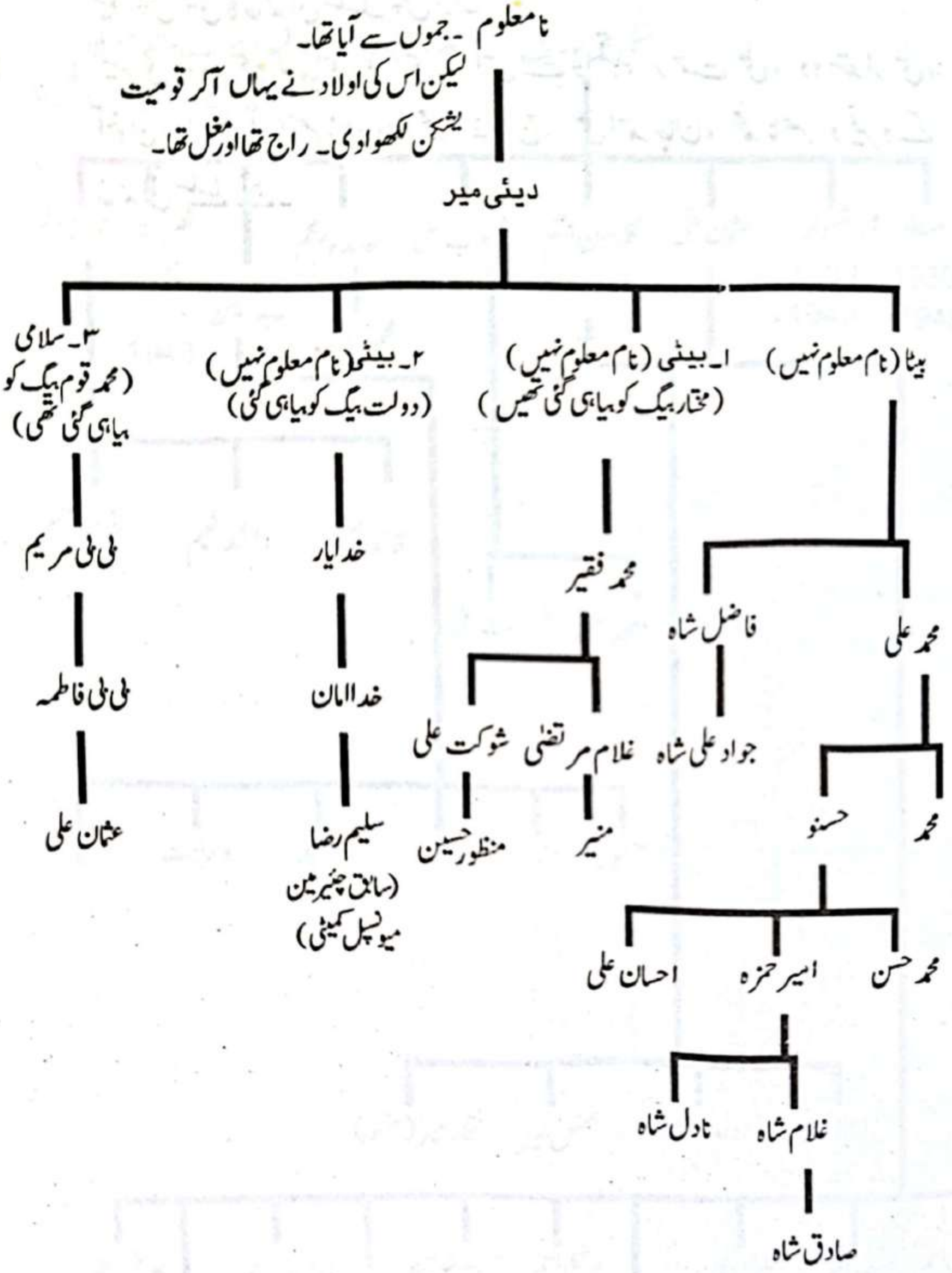


راقم کی پردادی کرم بی بی کا شجرہ



جان بی بی دختر شکور خان ولد ابراہیم رحمان کو بیاہی گئی تھیں۔

سلامی پرنانی کا شجرہ

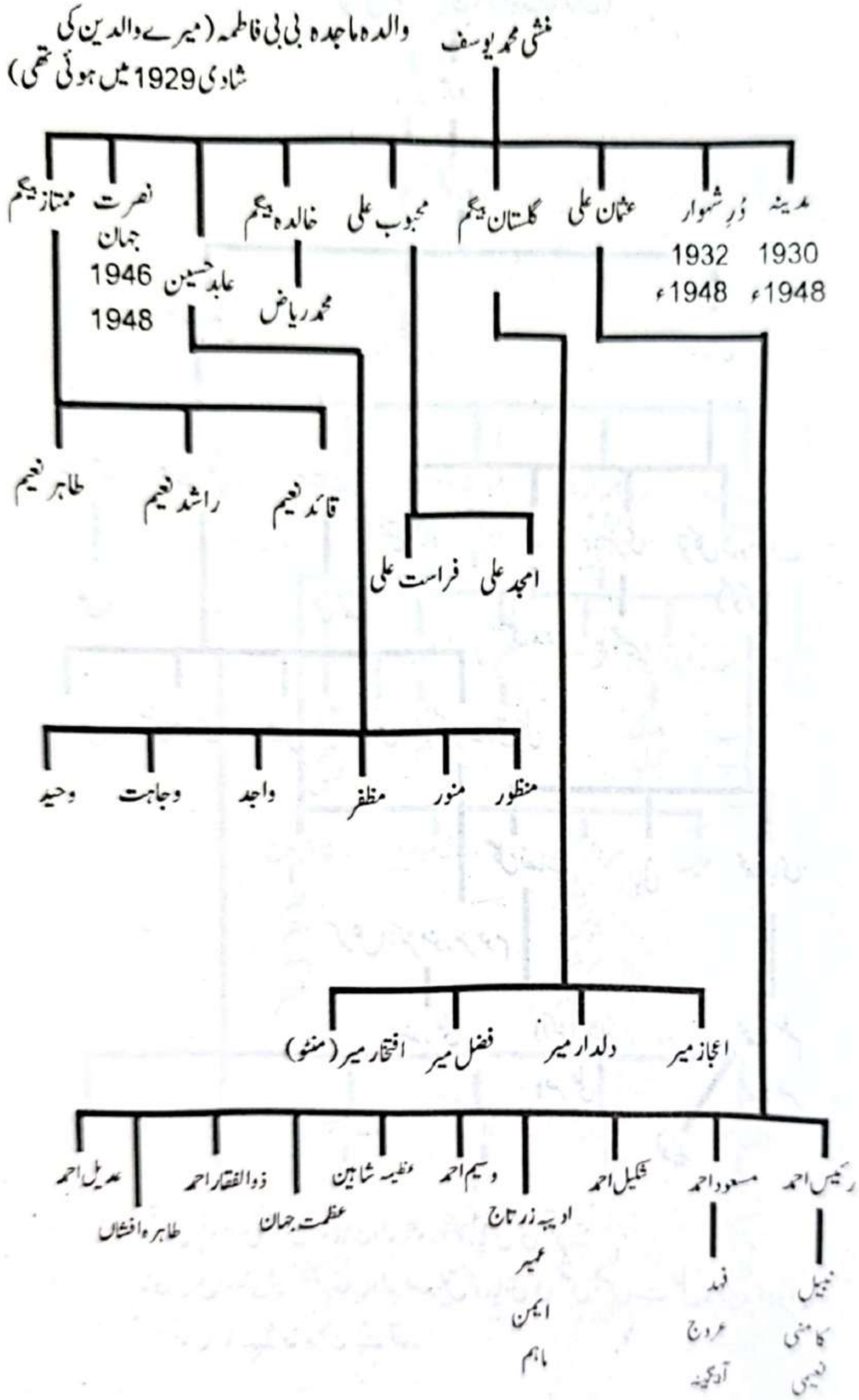


☆ پہلی بیٹی مختار بیگ کو بیاہی گئی تھی اس سے غلام مرتضٰی استاد کا خاندان نکلا۔

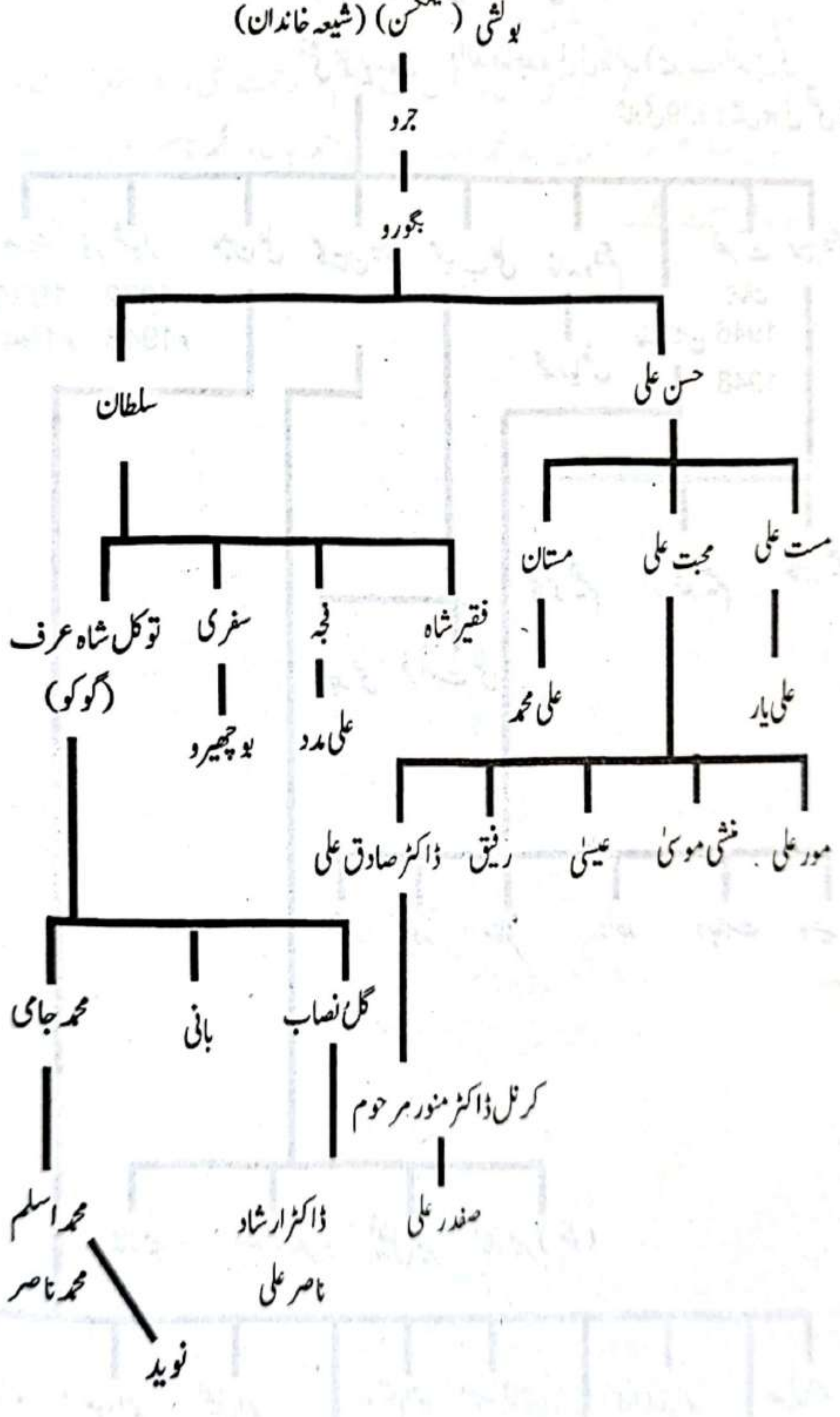
☆ دوسری بیٹی دولت بیگ کو بیاہی گئی تھی اس سے سلیم رضا سابق چئیر پرسن میونسپل کمیٹی کا خاندانی سلسلہ چل پڑا۔

☆ تیسری بیٹی محمد کو بیاہی گئی تھی۔ اس سے راقم، رحمت علی، دوستدار علی، آخون اصغر علی ابراہیم خان ولد محمد شفاراج، علی احمد جان، محمد ناصر وغیرہ کے خاندانی سلسلے نکلے۔

والد محترم منشی محمد یوسف کی اولاد

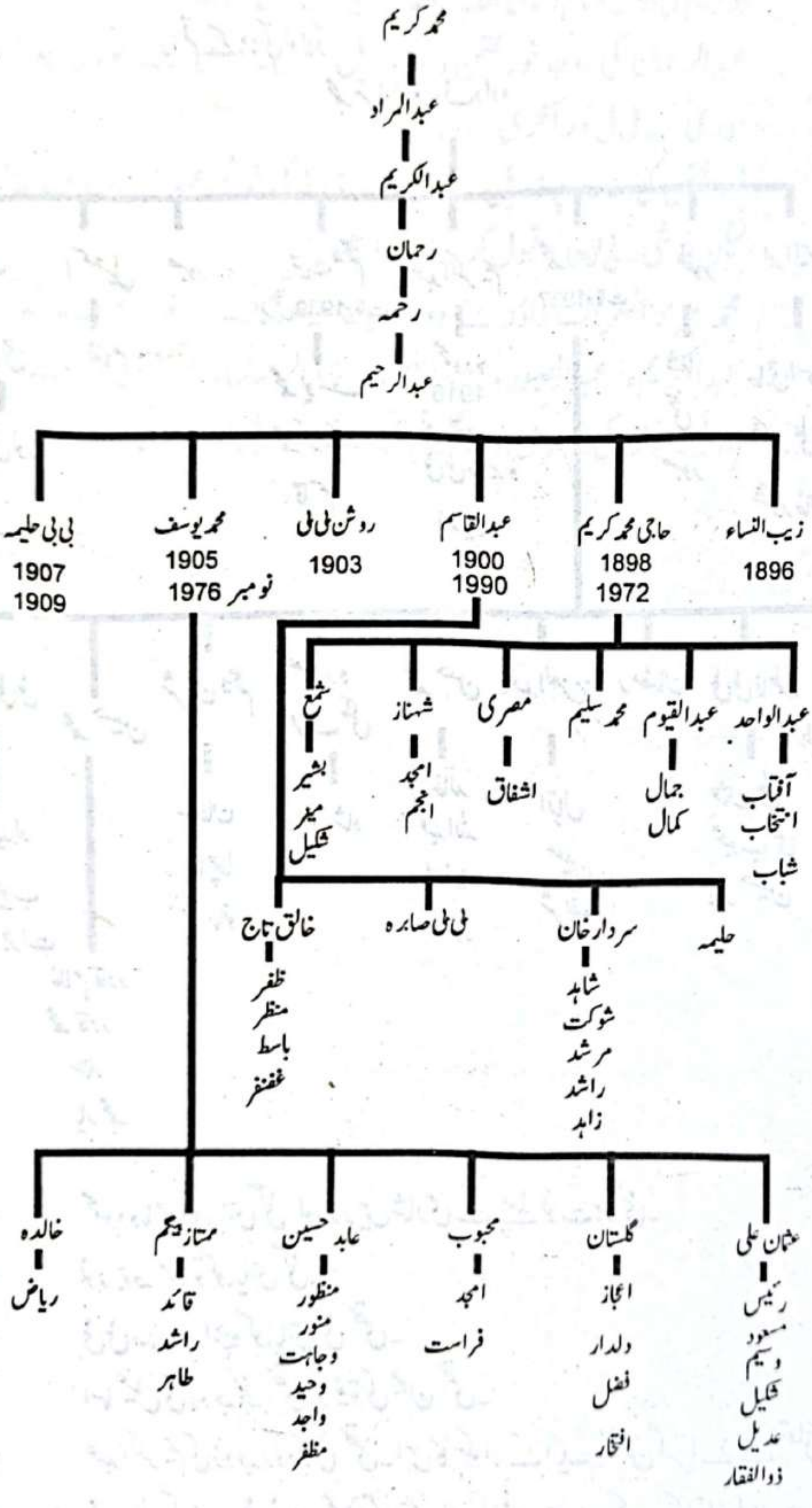


محمد اسلم منیجر ملٹی پرپز سوسائٹی کے ساتھ رشتہ

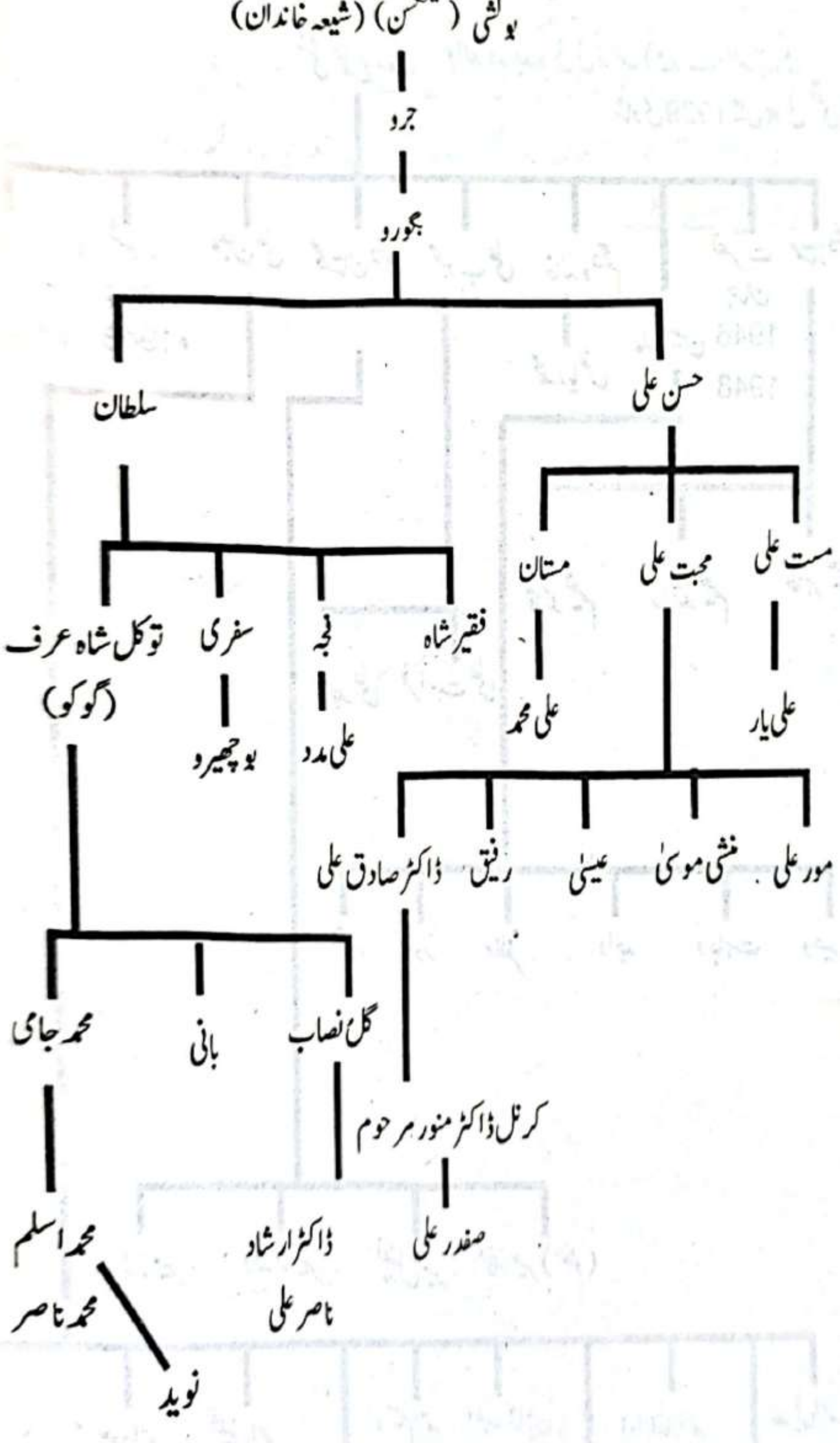


۲ راقم کی پردادی گلشن سلطان ولد بجورو کو بیاہی گئی تھی۔
سلطان کی بیٹی فجہ حیکم خان ولد صدیق کو بیاہی گئی تھی جس سے علی مدد پیدا ہوا۔
حیکم خان ہمارے خاندان سے تھا۔

راقم کے دادا عبدالرحیم کی اولاد

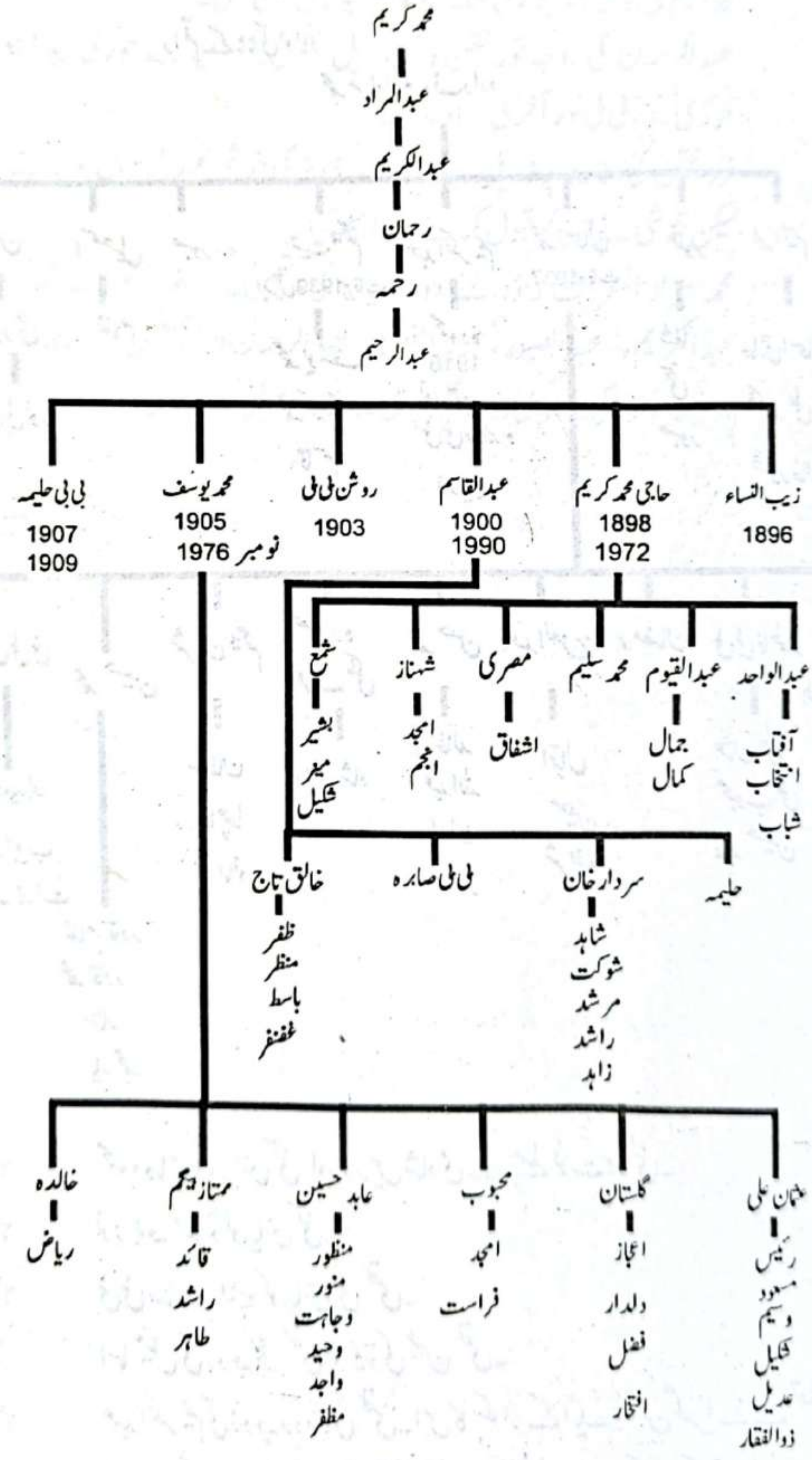


محمد اسلم میجر ملٹی پرپز سوسائٹی کے ساتھ رشتہ

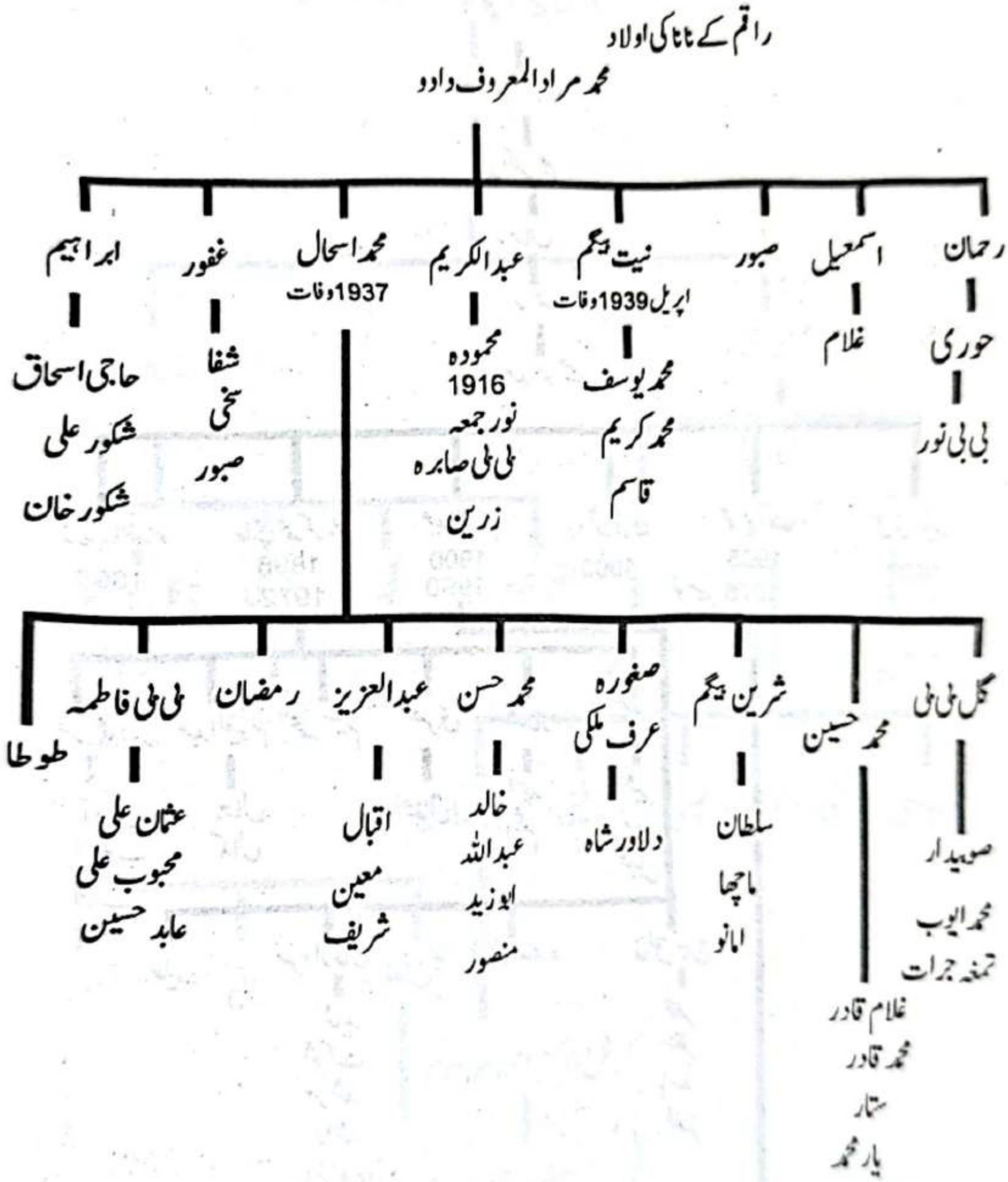


راقم کی پردادی گلشن سلطان ولد بگورو کو بیاہی گئی تھی۔
سلطان کی بیٹی فجہ حیکم خان ولد صدیق کو بیاہی گئی تھی جس سے علی مدد پیدا ہوا۔
حیکم خان ہمارے خاندان سے تھا۔

راقم کے دادا عبدالرحیم کی اولاد



راقم کے نانا کی اولاد



☆ محمودہ ماچھا کو بیاہی گئی اور زریں شادی سے پہلے فوت ہو گئی۔

☆ نور جمعہ ممّا تو کو بیاہی گئی۔

☆ بی بی صابرہ راجپو کو بیاہی گئی تھی۔

☆ اسماعیل کی زوجہ فجہ تھی جو نیتو کی بہن تھی۔

☆ عبدالکریم کی زوجہ روضائی تھی۔ اس کا سکوار کے ایک یشکن گھرانے سے تعلق تھا۔

☆ محمد سال کی زوجہ بی بی مریم (بیگ)، واجد لی منیجر حبیب بنک کے خاندان سے تھی۔

☆ غفور کی بیوی کا نام بی بی ماریفہ عرف بکی دختر رحمہ تھیں۔

☆ ابراہیم کی بیوی کا نام دانائی تھا۔ جو غلام حیدر کی بہن تھی۔

☆ عبدالرحمان کی زوجہ نور ختن دختر ذریل تھیں۔ جن سے حوری پیدا ہوئی۔ حوری سے بی بی نور آخری اولاد ہوئی۔

نور ختن کی وفات پر ذریل نے اپنی دوسری لڑکی خوشی عبدالرحمان کو بیاہنے چاہی لیکن خوشی نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

☆ محمد مراد المعروف داؤد نے دو شادیاں کی تھیں۔ سفر بیگم سے محمد اسال، عبدالکریم، عبدالصبور، عبدالغفور، عبدالرحمان، اسمٰعیل اور نیت بیگم اولاد ہوئی۔ داؤد کی دوسری زوجہ گل پری سے درج ذیل اولاد ہوئی۔

داود+گل پری کا شجرہ

داود + گل پری

- محمد ابراہیم
  - حاجی محمد اسحاق 1991وفات
    - عبدالرحیم
    - عبدالرازق
    - قوی
    - میر عبداللہ
    - یعقوب
    - بی بی جوہر
    - داناحور
    - مدینہ
  - شکور علی 1961وفات
    - ماچھا
    - سلطان
    - خیرالامان
    - کی
    - صنبری
  - شکور خان
    - غلام محمد
    - غلام نبی
    - جان بی بی
  - بی بی حمیدہ
    - غلام محمد
    - غلام رسول
    - غلام محی الدین
    - محمد اکبر خان
    - بی بی انصارہ
- بہن
  دولتو کے والد خان کے ساتھ بیاہی گئی تھی
- بہن
  گوہر امان نے یارقند میں فروخت کیا تھا

رحمت اللہ المعروف رحمہ کی اولاد

رحمہ

- عبدالرحیم
  - یوسف
    - عثمان علی
  - کریم
    - واحد
  - قاسم
    - خالق تاج
- عبدالعزیز
- غفار
- بی بی حاریفہ (لکی)
  - شفا
  - سخی
  - صبور
- بی بی (حوالدار محمد شاہ پٹھان کابلی کے ساتھ بیاہی گئی تھی)
  - ممہ

دولت خان ترخان (مغل) کی اولاد نے گلگت کے کئی دیگر خاندانوں میں شادیاں کیں۔ ان کی ایک مختصر فہرست دی جاتی ہے تاکہ نئی نسلوں کو اپنے خاندانی رشتوں کا پتہ ہو۔

1۔ نام معلوم نہیں۔ دختر بولیو قوم یشکن ساکن معلوم نہیں۔ زوجہ عبد المراد۔
2۔ نور بیگم دختر معلوم نہیں۔ قوم یشکن ساکن گلگت زوجہ عبد الکریم۔
3۔ جانی دختر غلام حسن میر مغل ساکن مناپن کے خاندان سے تھیں۔ پڑدادا رحمان کی زوجہ تھیں۔
4۔ کرم بی بی دختر دماغ قوم مغل ساکن چونگڑہ زوجہ رحمہ۔
5۔ مدینہ دختر شرین قوم یشکن ساکن شکیوٹ زوجہ یار محمد ولد محمد حسین۔
6۔ فرزانہ دختر محمد اشرف قوم شین ساکن کھر زوجہ عبد الرحمٰن ولد عبد الستار۔
7۔ شاہین بیگم دختر حبیب الرحمان قوم خوش وقت ساکن بسین زوجہ غفار ولد عبد الستار۔
8۔ نسرین دختر سلطان ابراہیم قوم خوش وقت ساکن بسین زوجہ عالم زیب ولد عبد الستار۔
9۔ تیئے سرہ دختر شکور محمد قوم راوٹ ساکن کشروٹ زوجہ عبد الصبور ولد غفور۔
10۔ حمیدہ دختر بغدر شاہ قوم شین ساکن کھر زوجہ محمد حسین ولد محمد اسمال۔
11۔ بی بی مریم دختر محمد بیگ قوم بیگ (مغل) ساکن گلگت زوجہ محمد اسمال ولد دادو۔
12۔ راحیلہ دختر امیر خان قوم زرگر ساکن ہنزل زوجہ سردار خان ولد عبد القاسم۔
13۔ نور جمعہ دختر شمشیر خان قوم شین ساکن بگروٹ زوجہ حاجی اسحاق ولد ابراہیم۔
14۔ دلارا دختر محمد یوسف قوم یشکن ساکن جوٹیال زوجہ جاوید اقبال ولد عبد الرازق۔
15۔ پری دختر حمید قوم شین (گوارے) ساکن بسین پائین زوجہ عابد حسین ولد محمد یوسف۔
16۔ چنارا دختر میر باز خان قوم زرگر ساکن کشروٹ زوجہ محبوب علی ولد محمد یوسف۔
17۔ معراج دختر سلطان ابراہیم قوم خوش وقت ساکن بسین زوجہ محمد قادر ولد محمد حسین۔
18۔ معروف دختر ٹھیکیدار امیر خان قوم پٹھان زوجہ عبد الستار ولد محمد حسین۔
19۔ گل پری دختر نامعلوم قوم یشکن ساکن کوہ نمنذر زوجہ دادو ولد عبد الکریم۔
20۔ سفر بیگم دختر کریمو قوم مغل ساکن گلگت زوجہ دادو ولد عبد الکریم۔
21۔ فریدہ بیگم دختر جبار قوم شیخ ساکن جوٹیال زوجہ لیاقت علی ولد محمد عیسیٰ۔
22۔ روضائی دختر نامعلوم، قوم یشکن ساکن سکوار زوجہ عبد الکریم ولد دادو۔
23۔ جنگ گل دختر قربان قوم مغل ساکن ہنزل زوجہ محمد کریم ولد عبد الرحیم۔
24۔ محمودہ دختر نور جلال قوم یشکن زوجہ ختاور خان ولد یارو۔
25۔ بی بی آئینہ دختر وعجب خان قوم یشکن زوجہ بشیر احمد ولد یار محمد۔

26- مہر دختر دلاور خان قوم شین زوجہ نذیر احمد ولد یار محمد۔

27- زینت خاتون ولد دختر محمد یونس قوم یشکن زوجہ کثیر احمد ولد یار محمد۔

28- راحت نسیم دختر عبداللہ خان قوم پٹھان زوجہ محمد اکبر ولد یار محمد

29- رحمت نسأ دختر بلبل خان قوم یشکن زوجہ محمد شفیع ولد یار محمد۔

30- منصورہ دختر شہزاد خان قوم شین ساکن دنیور زوجہ قوی ولد حاجی اسحاق۔

31- جانو دختر شیر احمد قوم زرگر ساکن ہنزل زوجہ عبدالقیوم ولد محمد کریم۔

32- ممتاز بیگم دختر غلام احمد قوم مغل ساکن گلگت زوجہ خالق تاج ولد عبدالقاسم۔

33- شمشاد بیگم دختر سلطان میر قوم میر ساکن کثروٹ زوجہ میر عبداللہ ولد محمد اسحاق۔

34- صوبہ بیگم دختر دولت شاہ قوم یشکن ساکن ڈومیال زوجہ عبدالرحیم ولد محمد اسحاق۔

35- خوش نماد دختر مہر جان قوم لون ساکن کثروٹ زوجہ محمد حسین ولد محمد اسمال۔

36- روحی دختر فقیر محمد قوم راجپوت ساکن ڈومیال زوجہ عزیزالرحمان ولد محمد سخی۔

37- گُل ناری دختر عبدالرحمان قوم شین ساکن گلگت زوجہ محمد سخی ولد غفور۔

38- زین نورا دختر راحت خان قوم پٹھان ساکن بسین زوجہ محمد حسن ولد محمد اسمال۔

39- جنڈولی دختر محمد خان قوم شین ساکن بسین زوجہ محمد حسن ولد محمد اسمال۔

40- مَس بیگم دختر غریب شاہ قوم یشکن ساکن مناور زوجہ محمد حسن ولد محمد اسمال۔

41- دولت نساء دختر شرین قوم یشکن ساکن شکیوٹ زوجہ محمد حسن ولد اسمال۔

42- نصرت فاطمہ دختر غلام محمد قوم کشمیری زوجہ صلاح الدین ولد حاجی امانو۔

43- فریدہ بیگم دختر یعقوب قوم یشکن ساکن بیارچی زوجہ خالد ولد محمد حسن۔

44- خورشید بیگم دختر غفار قوم پٹھان ساکن بسین پائیں زوجہ نظام الدین ولد محمد سلطان۔

45- دنی دختر نامعلوم قوم شین ساکن کھلی زوجہ عصمت اللہ ولد عبدالقاسم۔

46- فاطمہ دختر ممدوح قوم کشمیری زوجہ یعقوب ولد محمد اسحاق۔

47- رخسانہ دختر غلام قادر قوم لوہار ساکن گلگت زوجہ امتیاز ولد محمد عیسیٰ۔

48- حسنہ دختر شیر بہادر قوم میر ساکن امپھری زوجہ محمد نذیر ولد عبدالرحیم۔

49- شان دختر میر دلی قوم زرگر ساکن کثروٹ زوجہ جمال ناصر ولد عبدالقیوم۔

50- شمشاد دختر سخاوت شاہ قوم شین ساکن کثروٹ زوجہ یار محمد ولد صبورو۔

51- نرگس دختر سخاوت شاہ قوم شین ساکن کثروٹ زوجہ اقبال ولد صبورو۔

52۔ غزالہ پروین دختر جمال زیب قوم رونو ساکن مغلوپورہ محلّہ زوجہ شبیر احمد ولد محمد نخی۔

53۔ تاج بیگم دختر میرباز قوم یشکن ساکن جوٹیال زوجہ محمد اقبال ولد عبدالعزیز۔

54۔ یاسمین دختر میرباز قوم شین ساکن شکیوٹ زوجہ معین الدین ولد عبدالعزیز۔

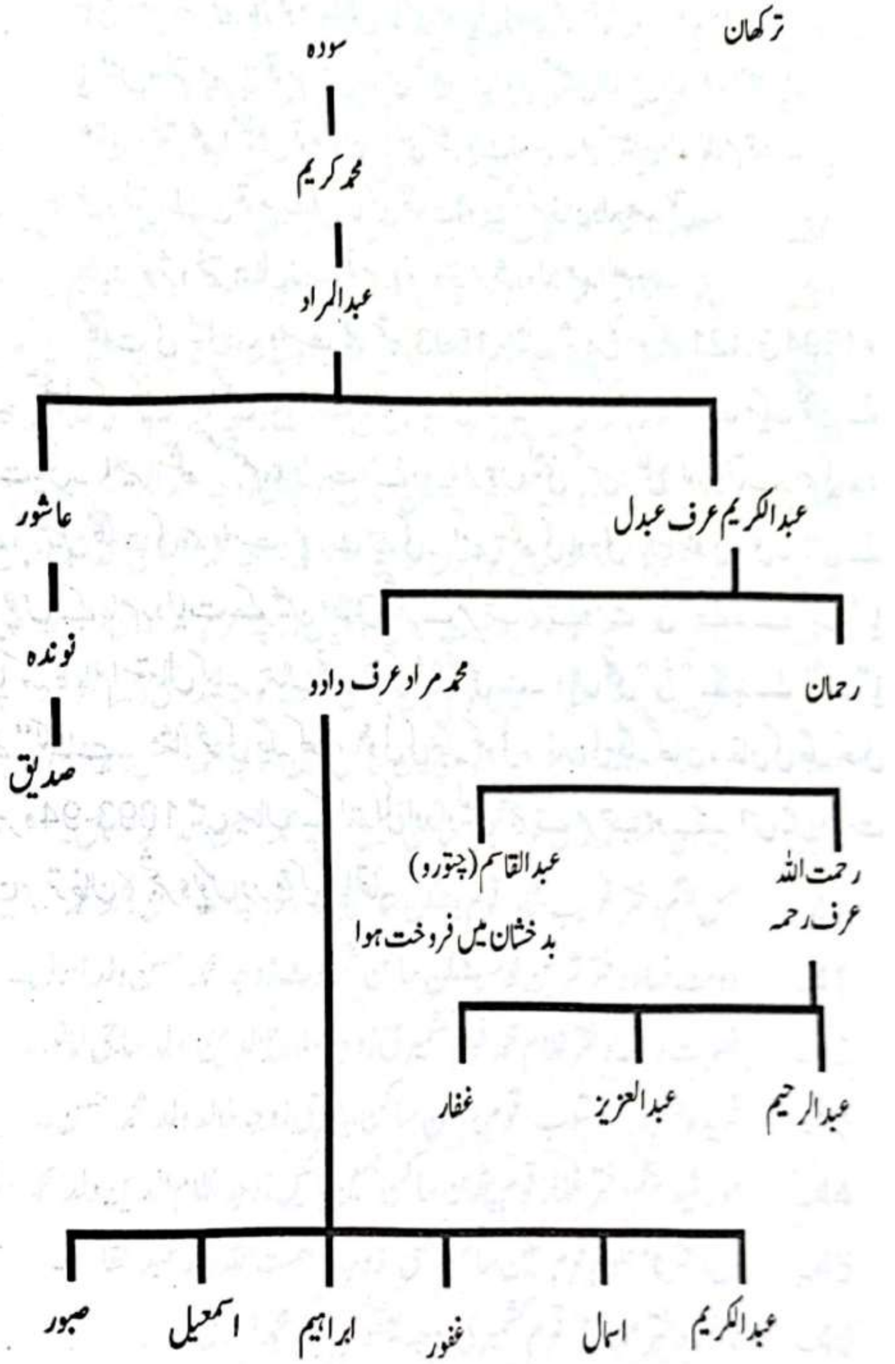
55۔ عقیلہ دختر محمد افضل قوم لون ساکن کشروٹ زوجہ عالم حسین ولد غلام قادر۔

56۔ نجہ دختر سلطان قوم یشکن ساکن گلگت زوجہ حکیم خان ولد صدیق۔

57۔ شبانہ کوثر دختر جمال زیب قوم رونو زوجہ ارشاد ولد عبدالصبور۔

گلگت کی پہلی بندوبست یکم ستمبر 1893ء میں شروع ہو کر 21 مارچ 1894ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ابھی بندوبست کا کام جاری تھا کہ انگریز مہتمم بندوبست میک نچن نے وفات پائی۔ امیر سنگھ مہتمم بندوبست نے دو پٹواریوں یعنی محسن علی اور آفتاب رام کی مدد سے تحصیل گلگت کی بندوبست رپورٹ تیار کی۔ امیر سنگھ کی مادری زبان ہندی تھی۔ اس نے ہندیوں کے عام روایات کے عین مطابق شجرے مرتب کرتے وقت "خ" کے بدلے "ک" یا کھ یا کہ کا عام استعمال کیا۔ جہاں نمونے کی شینا لکھی ہے۔ وہاں بھی "خ" کے بدلے "ک" یا "کھ" لکھا ہے۔ مثلاً خر کی جگہ کھر، خوٹی کی جگہ کھوٹی، خان کی جگہ کھان، خالی کی جگہ کھالی وغیرہ 94-1893 میں یہاں کے ابتدائی اور اولین شجرے مرتب ہوئے۔ اس میں دولت خان، ترخان کا شجرہ یوں درج کیا گیا تھا۔

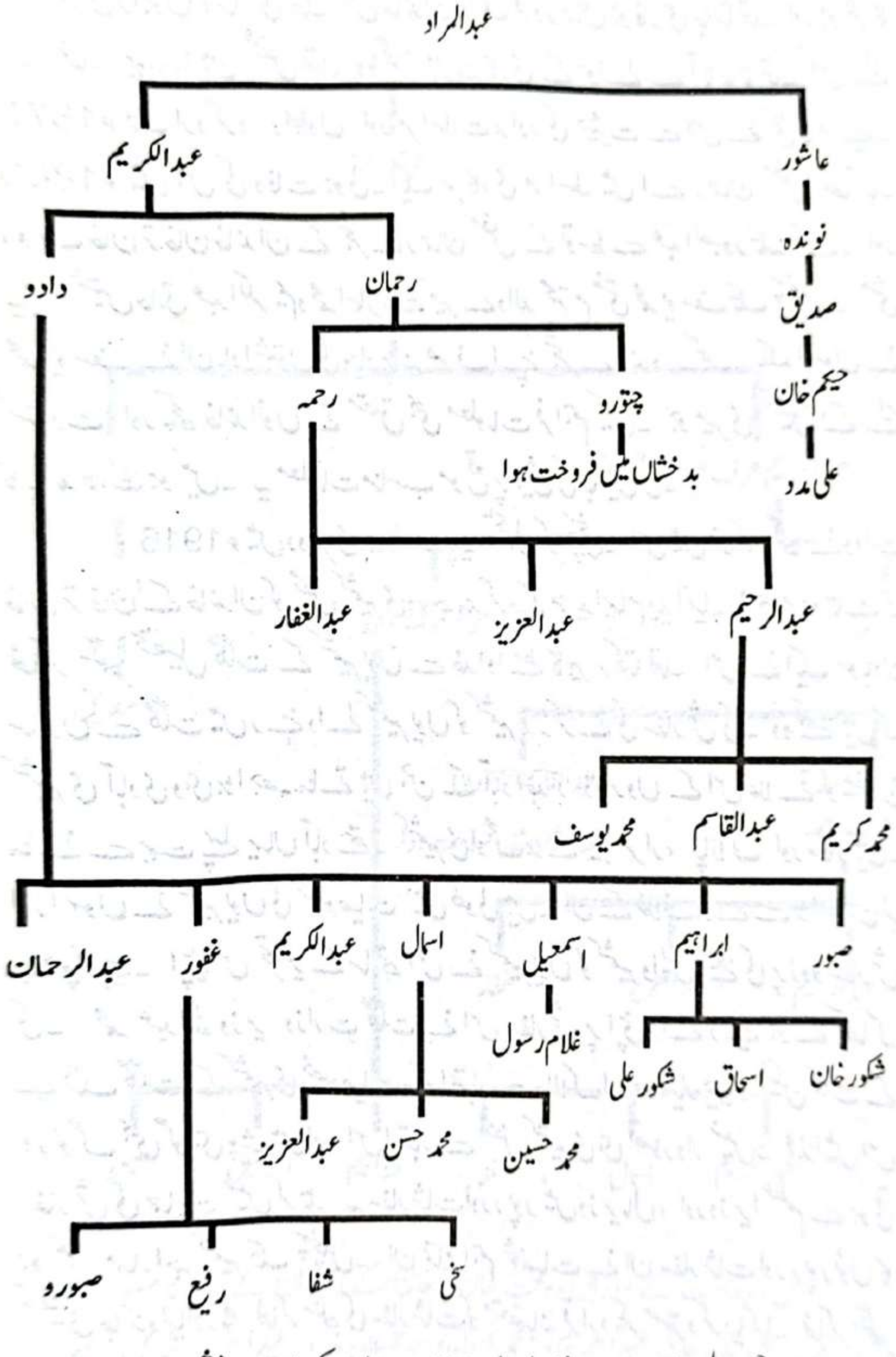
ترکھان کا شجرہ



اس بندوبست کے دوران دولت خان ترخان کے خاندان کے چند نامور لوگ موجود تھے۔ ان میں حاجی عبدالکریم، محمد اسمال، رحمت اللہ، عبدالصبور شامل تھے۔ عبدالقاسم تانگیر میں مقیم ہو گیا تھا۔ حاجی عبدالکریم کے راجہ اکبر خان آف پونیال اور دیگر راجگان کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ گلگت میں عبدالصبور واحد پڑھا لکھا شخص تھا۔ لیکن

وہ کشمیر میں زیرِ تعلیم تھا۔ محمد اسمال ایک نامور راج تھا۔ گلگت پل کی بنیادیں کھڑی کرنے میں وہ کشمیری راجوں کا ساتھی تھا۔ اس خاندان کا ایک فرد رحمان جو فارسی جانتا تھا۔ اور جو نگر کا داماد تھا۔ بہت ذہین شخص تھا۔ وہ نگر سفارت کاری کے حوالے سے آتا جاتا تھا۔ اس لئے 1870ء تک ارد گرد رابطوں اور مراسلات برادر کی حیثیت سے اس نے کئی کام کیے۔ 1880ء میں اس کی وفات ہوئی۔ ایک سرکاری مراسلہ میں اسے رحمان مغل لکھا گیا۔ دولت خان ترخان خاندان کے شجرے رحمان مغل کے توسط سے عبد الصبور تک آئے۔ اور یہ یاداشتیں حاجی عبد الکریم و محمد اسمال سے میرے والد محترم منشی محمد یوسف تک پہنچیں۔ منشی محمد یوسف نے ان یاداشتوں کی بنیاد پر نہ صرف اپنے شجرے زندہ رکھے۔ بلکہ انہوں نے کشروٹ اور کچھ خاندانوں کے متعلق بھی معلومات فراہم کیں۔ جو میری تحقیق کے لئے کار آمد ثابت ہوئیں۔ یہ معلومات مناسب موقع پر پیش کی جائیں گی۔

1916ء میں دوسری بندوبست پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس میں ٹھاکر سنگھ نے دولت خان ترخان کے خاندان کو محض کشمیری درجہ بند کر کے مزید ابہام پیدا کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ٹھاکر سنگھ تحصیل گلگت کے کشمیریوں سے خدا واسطے کا بیر رکھتا تھا۔ اس نے ایک سو باون سالوں سے گلگت میں رہنے والے کشمیریوں کو کشمیر بدر کرنے کی سفارش کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ کشمیری آبادی وہی بڑا حصہ بناتے ہیں جن کے آباؤ اجداد ڈوگروں کے اس علاقے کو مفتوح بنانے سے بہت پہلے یہاں آباد تھے۔ کشمیری لوگ بڑے تیز طرار، چالاک اور مکار ہیں۔ اور انہوں نے کشمیریوں کی خصوصیات نہیں کھوئی ہیں۔ ان کے خلاف بڑے سے بڑا ایکشن لیا جانا چاہیے۔ اپنی اس تحریر کے ساتھ اس نے کشمیریوں کو کشمیر واپس بھیجنے کی پر زور سفارش کی۔ محمد عبداللہ وزیر وزارتِ گلگت نے اس سفارش پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا کہ بے شک گلگت کے کشمیری خصوصیات کے اعتبار سے چالاک اور ہوشیار ہیں۔ لیکن گلگت کے اور لوگ بھی گواہی پیشہ ہیں اور اس اعتبار سے محض کشمیری ہی قصوروار نہیں۔ لہٰذا میں اس سفارش کی حمایت نہیں کرتا۔ یہ سفارشات اور رپورٹیں وزیر مال، اور وزیر اعظم سے ہوتی ہوئیں مہاراجہ کشمیر تک پہنچیں۔ ان تمام اہم شخصیات نے ان سفارشات اور رپورٹوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور پھر ٹھاکر سنگھ کی سفارشات کو متعصبانہ قرار دیکر مسترد کر دیا گیا۔ ٹھاکر سنگھ نے دولت خان ترخان کے خاندانی شجرہ یوں قلمبند کیا۔



جس طرح بہت سے خاندان اپنے نامور جدوں کے نام سے مشہور ہوئے اور بعد ازاں یہی نام قومیت کا نشان بن گئے۔ مثلاً سندوزئی قبائل اپنے جد سدو، بامزی اپنے جد بامی، نقے، اپنے جد نقو نام سے مشہور ہوئے۔ حالانکہ یہ نام کسی نسل کا نمائندہ نہ تھے۔

دولت خان ترخان کا خاندان بھی بہت عرصے تک خاندان سودہ کے نام سے مشہور رہا۔ اس کی وجہ سودہ کا کشمیر کے مغل گورنر شپ کے حلقوں میں اثر رسوخ تھا۔ وہ وہاں سواد خان یعنی بڑے خان کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ خاندان والوں نے اسے سودہ بنادیا۔ اور یہی نام گلگت تک چلا۔ اور خاندان میں آج تک مشہور ہے۔ اور دولت خان ترخان کے خاندان کا نمائندہ نام ہے۔ یہی نام بعض عدالتی کاروائیوں میں بھی نمائندہ حیثیت سے مستعمل ہوتا رہا۔ مثلاً 15، اکتوبر 1957 کے ایک دعویٰ کا ٹائٹل اس طرح لکھا ملا ہے۔ :

عبدالکریم ولد دادو، شکور علی واسحاق پسران ابراہیم، محمد سخی و عبدالصبور و مسماۃ حوری دختر عبدالرحمان اقوام سودہ کشمیری۔

بنام

علی مدد ولد حکیم خان و محمد یوسف ولد عبدالرحیم قوم سودہ کشمیری ساکنان گلگت۔ یہ دعویٰ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج گلگت کی عدالت میں پیش ہو کر فیصلہ ہوا۔ سودہ سٹریٹ کے نام سے محلہ کشروٹ میں ایک سٹریٹ بھی پہلے سے مشہور رہے۔ بیان ہوا ہے کہ کشروٹ کے باسی سال 1762ء میں کشروٹ میں وارد ہوئے۔ اور ان کی مہاجرت کی اصل وجہ افغان حکومت کی پکڑ دھکڑ اور قتل وغارت گری کے واقعات تھے۔ ان دنوں جب ہجرت کا واقعہ ہوا۔ گلگت میں کوئی مرکزی مستحکم حکومت نہ تھی۔ یہاں کے سیاسی حالات انتہائی مخدوش تھے۔ حکومت کی اصل ڈوری وزیر ملا بیگ کے ہاتھ میں تھی۔ راجہ سلیمان شاہ بھی دربار کی سیاست پر حاوی تھا۔ راجہ گوری تھم بڑھاپا اور لاغری کے ہاتھوں مجبور ہو کر خلوت نشین ہو گیا تھا۔ شاہ رئیس کہتے ہیں کہ راجہ گوری تھم نے ضعیف جسمانی اور بڑھاپا کی وجہ سے حکومت وزیر ملا کے حوالے کی تھی۔ یہ کہ شہزادہ محمد خان تیرہ سال کا تھا۔ اور گوری تھم ایک سو گیارہ سال کا بوڑھا۔ اس تعبیر سے ایسے لگتا ہے کہ 98 سالہ گوری تھم سے شہزادہ محمد خان پیدا ہوا۔ شاہ رئیس خان نے اپنی تاریخ میں ایسے محیر العقول واقعات لکھے ہیں کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ تاریخ میں ایسے واقعات کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ شاہ رئیس کے بیشتر کرداروں کی عمریں 90 سال سے لے کر 140 سال تک بنتی ہیں۔ دراصل خالی زمانوں کو تسلسل دینے کے لئے اُسے اپنے کرداروں کی لمبی عمریں وضع کرنا پڑیں۔ اس طرح اس نے یشکنوں، شینوں کی حکومتی ادوار کو تراخانی ادوار میں مدغم کر کے یشکنوں کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ وہ 643ء سے 1846ء تک تراخانی دور حکومت شمار کرتے ہیں۔ اور یوں یہ دور ایک ہزار دو

سو تین سالوں پر محیط ہوتا ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک جہاں ذہین فطین افراد کی کمی نہیں۔ اور اس ملک کے بیرونی دنیا کے ساتھ علمی، معاشرتی، ثقافتی، لسانی اور نسلی رابطے تھے۔ نیز یہاں اِس حوالے سے مورخین کی بھی کمی نہ تھی۔ ایک جاندار زبان سنسکرت/ہندی لکھی اور بولی جارہی تھی۔ اس کے باوجود تمام محققین/مورخین کی یہ تحقیق کہ 1200ء سے پہلے کی ہندوستان کی تاریخ کے متعلق بشمول شمالی علاقہ جات کوئی قابلِ ذکر کتاب کہا جائے یا ایسی تصنیف جس سے اِس ملک کے تاریخی حالات کچھ معلوم ہو سکیں نہیں لکھی گئی۔ (مقدمہ تاریخِ قدیم صفحہ 105)۔ اس تحقیق کی روشنی میں شاہ رئیس کے 643ء سے حرف بحرف تاریخی واقعات کا اذکار جبکہ یہاں کے راجے اور عوام 1860ء تک ناخواندہ تھے۔ محض افسانہ تراشی کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ گلگت کا پہلا پرائمری سکول 1892 میں کرنل ڈیوائینڈ کی سفارش پر قائم ہوا۔ اُس وقت تک یہاں ناخواندوں کا راج تھا۔ ایسے حالت میں تاریخ لکھی جائے تو کیسے لکھی جائے۔ اور تاریخ زندہ رکھنے کے لئے کونسے وسیلے اختیار کیے جائیں۔ 643ء سے 1846ء تک حکومت کرنے والے تراخانی راجوں کے حوالے سے تاریخ کا کوئی ایک ماخذ بھی دستیاب نہیں۔ تاریخی ماخذوں میں درج ذیل ماخذ تاریخ کہانی مرتب کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

1. مذہبی کتابیں۔
2. تاریخی کتابیں۔
3. کتبے۔
4. سکے۔
5. قدیم کھنڈرات۔
6. سیاحوں کے سفرنامے۔
7. لوک گیت۔
8. شجروں کی تختیاں۔
9. نقش ونگار وغیرہ۔

ہمارے اِن راجوں کے زمانہ ماقبل تاریخ کا بھی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک مادی ماخذ بھی اب تک اِن کے حوالے سے دریافت نہیں ہوا۔ جن عمارات میں ہمارے آخری راجے رہتے نظر آئے، وہ عمارات عمومی طور پر عام عمارات کے زمرے میں بھی شامل نہیں

کی جاسکتیں۔ جو آثار آج بھی ہمیں یہاں ملتے ہیں۔ وہ آتش پرستوں، بدھوں اور مظاہر پرستی کے زمانے سے متعلق ہیں۔ سیاحوں کے سفر ناموں میں جو تذکرے ملتے ہیں۔ وہ بھی اس دور سے تعلق کو ظاہر نہیں کرتے۔ البیرونی، حدوالعالم کے نام معلوم مصنف کی تاریخ رشدی کے مصنف مرزا حیدر دُغلت، پنڈت کلہن، سٹائن، دانی، جٹ مار، فاہیان، ہیروڈوٹس، ایبویا، جدید دور کے مصنفین محمد دین فوق۔، ذکاالله وغیرہ سبھی نے کسی تراخانی راجے یا اُن کے حکومتی آثار کا ذکر نہیں کیا۔ تمام آثار، تمام لوک کہانیاں، چٹانوں پر نقوش، مسودات، بتوں کے نام، سکے، لسانی نمونے وغیرہ تراخانیوں کے علاوہ کسی اور دور کی تعبیرات ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ شاہ رئیس خان نے گلگت میں اسلام کا ظہور 725ء میں دِکھایا ہے۔ حالانکہ اُس وقت گلگت کے چاروں طرف کہیں اسلام کا نام و نشان نہ تھا۔ ابھی کشمیر میں اسلام نہیں آیا تھا۔ بلتستان و تبت ولداخ، شمال، مغرب اور مشرق میں کفر کی تاریکیاں تھیں۔ شاہ رئیس کو موازناتی اور نسبتی تاریخ کا اندازہ نہ تھا۔ کہ اردگرد صورت حال کیا تھی۔ بہر حال ان حوالوں سے موقع محل کے مطابق پھر گفتگو کی جائے گی۔ فی الوقت یہ دیکھنا ہے کہ 1762ء میں گلگت کی سیاسی صورت حال کیا تھی۔ شاہ رئیس کی تاریخ کے مطابق 95 سال حکمرانی کرنے کے بعد 123 سال عمر رکھنے والے، 98 سال کی عمر میں باپ بنے۔ گوری تھم اپنی ضعیفی کے ہاتھوں مجبور ہو کر خلوت نشین ہو گیا۔ شہزادہ محمد جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اور حکومت وزیر ملا بیگ کے ہاتھوں میں تھی۔ راجہ سلیمان شاہ امور دربار میں بڑا اثر رسوخ رکھتا تھا وغیرہ ہم۔ اس کے ساتھ ہی شاہ رئیس خان کہتے ہیں کہ گوری تھم کی داد و دہش، سخاوت اور دریادلی کی شہرت سن کر ان دنوں کشمیر سے بہت سے فنکار گلگت آئے جن کو محلہ کشروٹ کے اردگرد بسایا گیا۔

وزیر حشمت الله اپنی تاریخ جموں میں 1700ء سے 1790ء کے زمانے کو لاوارث قرار دیتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ ایک افراتفری کا دور تھا۔ گوری تھم یا کوئی راجہ اس دور میں تھا بھی تو وہ محض ایک عضو معطل تھا۔ اصل حکومت کا مالک کوئی اور شخص تھا۔ گوری تھم مقید تھا۔ شہزادہ محمد جان سکردو میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ علاقہ جنگ و جدل کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ ان راجوں کی داد و دہش کی کوئی ایک مثال بھی موجود نہیں تھی۔ یہ راجے چکیوں کی پسوائی کی بوئی (فیس) تک کو نہیں چھوڑتے تھے۔ یہاں کی عوام کی خستہ حالی

ضرب المثل بن چکی تھی۔ ایسے میں کوئی احمق یہاں آجاتا۔ جیسے پہلے بیان ہوا ہے کہ کشمیریوں کو کشمیر میں مشکل حالات کا سامنا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے افغانوں کی مخالفت کی تھی، جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ اور مغلوں کا ساتھ دیا تھا۔ وہ امن و سکون کی تلاش میں پکڑ دھکڑ اور افغانوں کی قتل و غارت گری سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے یہاں آئے تھے۔ کشمیریوں کے اس جتھے کو کشروٹ کی غیر آباد اور دلدلی زمین الاٹ کی گئی جسے ان لوگوں نے محنت اور جانفشانی سے سر سبز و شاداب کھیتوں میں بدل دیا۔ فردوس اوّل (1359ء تا 1397) فردوس دوم (1449ء تا 1479ء) کے دور میں کشمیریوں کی کسی ہجرت کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ نیز فردوس اوّل اور دوم کا جو زمانہ دِکھایا گیا ہے۔ وہ زمانہ خود تراخانیوں کا نہیں بنتا۔ مزید بر آں وزیر حشمت اللہ کی تاریخ اور کئی دوسری تاریخوں میں ان فردوسوں کا کوئی ذکر بھی موجود نہیں۔ جس قلعہ فردوسیہ کا شدومد سے ذکر کیا گیا ہے۔ وہ جو جدید دور میں تعمیر ہوا آج بھی اس کے آثار کہیں نہیں ملتے۔ جن سے معلوم ہو کہ کبھی ایسا پر شکوہ محل فردوسیہ رہا ہو۔ ڈاکٹر حسن دانی شاہ رئیس کی تاریخ بیانی کے حوالے سے کہتے ہیں۔

The history NARRATED by Shah Rais Khan is at variance with the events known from other sources.

یعنی شاہ رئیس خان نے جو تاریخ بیان کی ہے۔ اس میں اور دیگر ذرائعوں سے حاصل تاریخی واقعات میں بڑا فرق ہے۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ شاہ رئیس کے تاریخی بیانات متعصّبانہ ہیں۔

کشروٹ میں آباد قبائل کے بارے میں کچھ عام کہانیاں بھی ملتی ہیں۔ کشروٹ کے حاجی موسیٰ کہتے ہیں۔ کشروٹ کے رہنے والے بارہ بھائیوں کی اولاد ہیں۔ ان بھائیوں کے کچھ رشتہ دار نگر استوار (میر ملک) اور لولاب کے علاقوں میں جا بسے تھے۔ یہ کہ کشروٹ کے رہنے والے کشمیری الاصل نہیں۔ بلکہ نسلی طور پر پٹھان ہیں۔ ان کے آباؤاجداد تناول سے کشمیر آکر آباد ہوئے تھے۔ اور بعد ازاں گلگت وارد ہوئے۔ غلام محمد گون، تراب، سر فراز خان نمبردار مرحومین وغیرہ کی بھی یہی رائے تھی کہ یہ کشمیری الاصل نہیں بلکہ پٹھان ہیں۔ اور سوات کی طرف سے کشمیر آکر آباد ہوئے تھے۔ اور پھر انہیں گلگت آنا پڑا۔ رسول میر ایڈووکیٹ کہتے ہیں کہ کشروٹ کے رہنے والے پٹھانوں کی اولاد ہیں۔ اور کسی بعید زمانے میں ان کے آباؤاجداد افغانستان کی طرف سے کشمیر آئے تھے اور پھر گلگت آئے۔

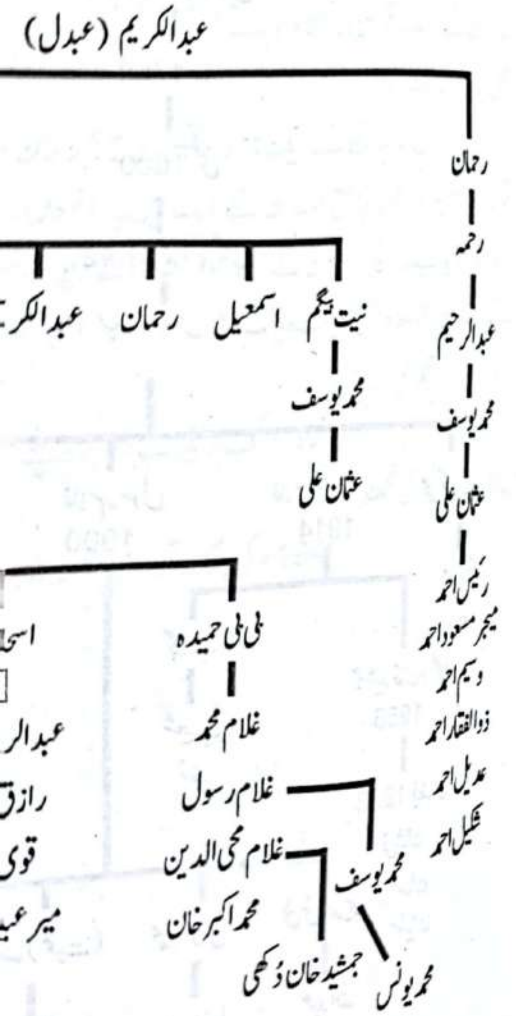
بہر حال تاریخی شواہد، قلمی رابطوں، واقعات، تحقیقی ماخذوں کی بنیاد پر یہ بات اب پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ یوبر، کشروٹ، جگلوٹ، کھر، ہوڈر، چترال و نگر کی طرف مہاجرت کرنے والے کشمیریوں (جو زیادہ تر مغل قبائل ہیں۔) کو افغانوں کی مخاصمت کا سامنا تھا۔ افغانوں کی ستم رانیوں سے بچنے کے لئے ان کی جماعتوں نے مختلف کونے کھدرے تلاش کیے۔ کئی جتھے بانڈی پورہ سے گلگت کی طرف آئے۔ اسی زمانے میں بہت سے کشمیری جتھے افغانستان، ہندوستان بھی چلے گئے تھے۔ جو لوگ ہزارہ (کاغان) اور سوات کی طرف سے ہمارے علاقوں میں آئے انہوں نے اپنے آپ کو ان حوالوں سے پٹھان گردانا، کوئی بانڈی پورہ کی طرف سے آئے لوگوں نے انہیں کشمیری مشہور کیا۔ جب ان لوگوں نے نقل مکانیاں کیں تو وہ کشروٹ، جگلوٹ، چترال، چلاس یکبارگی نہیں پہنچے بلکہ مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے موجودہ سہولیات کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ جہاں انہیں وافر سہولیات نظر آئیں وہیں مستقل طور پر آباد ہوئے۔ دراصل دولت خان ترخان کے ساتھ آنے والا جتھا بہت بڑا جتھا تھا۔ ان کے جتھے میں شامل کوئی لوگ لولاب کی طرف بھی چلے گئے۔ کوئی استور (میر ملک) میں ٹھہرے، کوئی چونگڑہ میں رکے، کوئی گلگت آئے اور کوئی چترال کی طرف چلے گئے۔

اِکّا دُکّا کشمیری قبائل اردگرد جلاوطن بھی ہوئے۔ یہ واقعات 1834ء کے بعد پیش آئے۔ خصوصیات سے گلہ بان قوم کے لوگ جو کشمیر میں منظم ڈاکے ڈالتے، گھوڑے اور مویشی چراتے ان کو اِدھر اُدھر جلاوطن کیا گیا۔ محمد دین فوق تاریخِ اقوامِ کشمیر میں صفحہ 418، 419 میں لکھتے ہیں۔

"افغانوں کے زوال اور سکھوں کی حملہ آوری کے دنوں میں گلہ بان بڑے بڑے جتھے بنا کر پھرا کرتے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر اِدھر اُدھر غارت گری کرتے۔ مَن جملہ اور سنگدل ڈاکو گلہ بانوں کے خیرہ وگلہ بان کا نام خاص طور پر مشہور ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے بھی اس فرقہ کی اصلاح بلکہ انہیں تباہ کرنے کی بہت کوشش کی۔ رگوناتھ پورہ سے بہت سے گلہ بان گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈالے گئے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ان لوگوں کو بونجی (گلگت) میں زمین دیکر وہاں آباد کیا مگر ان مراعات کے باوجود بھی بہت سے گلہ بان کشمیر واپس آ گئے۔"

ترخانوں کا ایک بڑا خاندان جمشید خان دُکھی کا ہے۔ جو حلقہ ارباب ذوق کا سیکرٹری

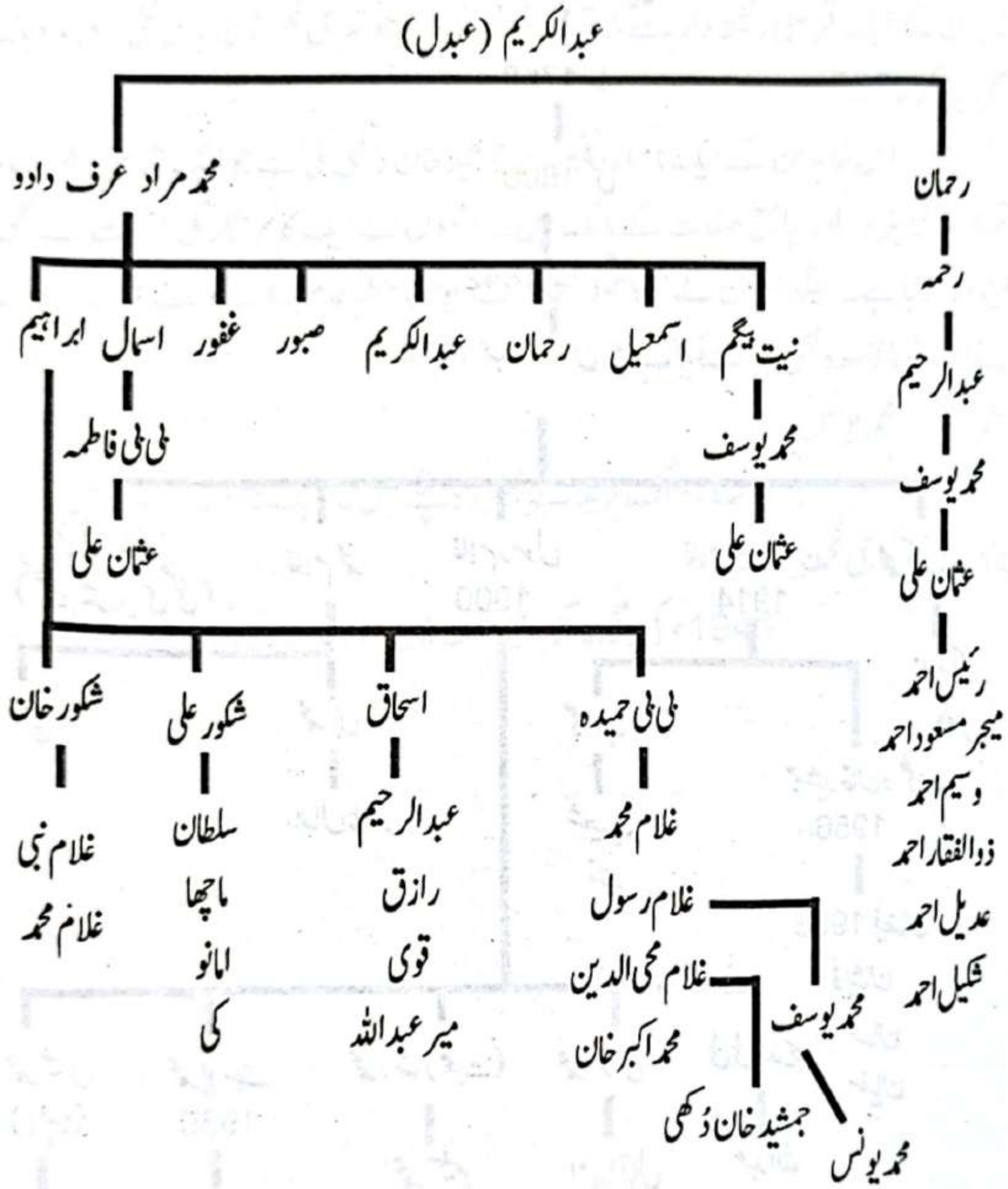
بی بی حمیدہ کا شجرہ



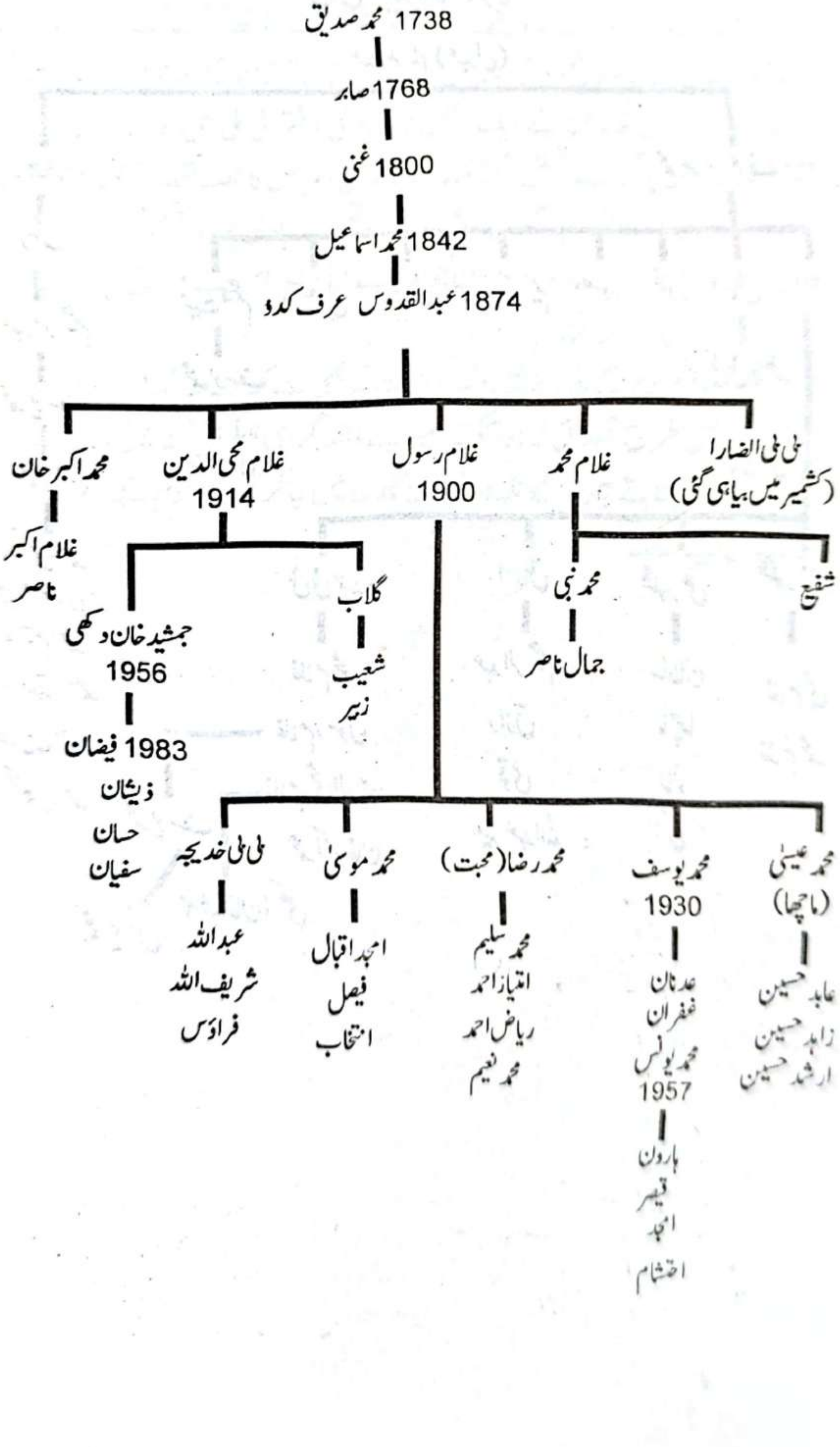
جنرل شنا اور اردو کے شاعر ہیں۔ ان کا جد اعلیٰ جو 1900ء کے قریب زمانے میں گلگت وارد ہوا۔ عبدالقدوس المعروف کدو تھے۔ وہ ڈوگرہ افواج کے ساتھ گلگت آیا۔ اور ملازمت کے اختتام پر یہاں رہنے کو ترجیح دی کیونکہ اس نے دولت خان ترخان کے خاندان سے اپنے آپ کو وابستہ کیا تھا۔ اس خاندان کے ایک شخص ابراہیم کی دختر بی بی حمیدہ سے اس کا ناتا ہوا۔ عبدالقدوس ہمل پرگنہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جو کامراج ڈویژن کا حصہ تھا۔ ہمل کو سکھوں نے اپنے زمانے میں ایک الگ پرگنے کی حیثیت دی تھی۔ ہادی پورہ تحصیل صدر مقام تھا۔ 1856ء تا 1860ء کے دوران یہاں جو سروے کیا گیا۔ اس کے مطابق یہ پرگنہ 45 گاؤں اور 368 گھروں پر مشتمل تھا۔

کدو مرحوم کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ حبہ کدل کا باسی تھا۔ لیکن اس بات کی کسی طرح تصدیق نہ ہو سکی۔ میرے والد گرامی ہمل پرگنہ میں ہادی پورہ کو اس خاندان کا مرزبوم بتاتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود اُس گاؤں میں جا کر کدو مرحوم کے کسی قریبی رشتہ دار سے مل چکے تھے۔

بی بی حمیدہ کا شجرہ



عبدالقدوس المعروف کدو کا شجرہ



والد گرامی منشی محمد یوسف اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ "کدو ڈوگرا افواج کے ساتھ گلگت آئے تھے۔ ہمارے خاندان میں اس کی شادی ہوئی۔ کشمیر کے قیام کے دوران میں ان کے ایک قریبی رشتہ دار سے ملا تھا۔ بی بی انصارا جو سری نگر میں بیاہی گئی تھی، وہاں بھی جایا کرتا تھا۔"

اس خاندان کے ایک نامور شخصیت جمشید خان دُکھی کی ہے جو ایک شاعر، ادیب، قلمکار، کمپیئر ر اور جامع صفات کے مالک ہیں۔ انھوں نے ایک کالم نگار کی حیثیت سے بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ جلد ہی اُن کے شینا اور اُردو کے دیوان منظرِ عام پر آنے والے ہیں۔ انھوں نے ایک شینا قاعدہ بھی مرتب کیا ہے۔

☆ محمد یونس :

چائنا بورڈ آف ٹریڈ کے ممبر رہ چکے ہیں۔ ایک نامور ٹھیکیدار ہیں۔

☆ حاجی محمد یوسف :

1948ء کی جنگ آزادیٔ گلگت میں حصہ لے چکے ہیں۔

باب۔6

گلگت، اسلام اور سادات

میں پہلے ابواب میں اشارہ کر چکا ہوں کہ قبائل کا ذکر کسی کو چھوٹا بڑا دکھانے کے لئے نہیں کیا جارہا ہے۔ بلکہ ایسے ماخذوں کی تلاش مقصود ہے جہاں سے انسانیت نے جنم لیا۔ انسان انسان کے کام آیا۔ انسان نے قابلِ قدر کارنامے سرانجام دئے۔ دنیا میں انسانیت کی خدمت کی عدل و انصاف کے باب کھولے۔ ظلم۔ جبر قتل خون ریزی جیسے قبیح جرائم سے اجتناب کیا۔ پدرم سلطان بود کے واہیات نعرے بلند کئے۔ فسادات، تعصبات اور منافرتوں کے ڈور نہیں کھینچے۔ انسان کا نام اچھے کارناموں سے بقائے دوام پاتا ہے۔ اور بُرے کرتوت سے مٹ کر رہتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام ابوالانبیاء تھے۔ ان کا قابیل جیسا ناخلف بیٹا بھی تولد ہوا۔ جس نے انسانیت میں دراڑیں پیدا کیں۔ اور ہابیل جیسا سپوت بھی پیدا ہوا جس نے انسانیت کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔ حضرت نوح علیہ السلام کا ایک فرزند عار اپنے کرتوتوں کے باعث طوفان میں بہہ کر اس بزرگی سے محروم ہوا۔ جو پیغمبر زادہ ہونے کے باعث اسے حاصل تھی۔ اگر محض نام سے بزرگی مل سکتی تو ابو لہب اس کا بڑا حقدار تھا۔ کیوں کہ وہ نہ صرف ہاشمی تھا۔ بلکہ حضور ﷺ کا چچا بھی لیکن وہ اللہ کی دائمی اور کھُلی پھٹکار سے نہ بچ سکا۔ امام حسین علیہ السلام اور یزید دونوں قریش ہیں۔ دونوں مناف کی اولاد ہیں۔ قریشی ہونے کے باوجود یزید اپنی سیاہ کاریوں کی وجہ سے قہر مذلت میں گرا۔ جبکہ امام حسین علیہ السلام جوانانِ اہلِ جنت کے سردار ٹھہرے۔ دراصل شرافت اور رذالت ذاتی اور شخصی صفات ہیں۔ اگر طبیعتوں کا میلان رزالت کی طرف ہوا۔ وہ رذیل ہوا۔ اور جسکا شرافت کی طرف ہوا وہ شریف ہوا۔

ابو الصفار ضوانی اخبار چودھویں صدی (23 مارچ 1900ء) میں ذات اور شرافت کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ "ہندوستان میں موجودہ مسلمانوں کی بڑی ذاتیں چار ہیں۔ سید، مغل، پٹھان، شیخ لیکن درحقیقت یہ تمام القابات وصفات ہیں۔ سید عربی میں مطلق

سردار کو کہتے ہیں۔ مغل یا منگل کے معنے مغلیہ یا منگولیا واقع مہا چین کا باشندہ، پٹھان اصل میں ایک عربی لفظ فتان کا بگڑا ہوا ہے۔ جس کے معنی نہایت فتنہ انگیز ہیں۔ یہ لقب پہلی صدی میں عرب والوں سے سلیمانیوں یعنی کوہ سلیمان کے باشندوں کو ملا تھا۔ اصل میں پٹھانوں کی ذات قبطی یا اسرائیلی ہے۔ اور سیدوں کی ہاشمی اور مغلوں کی مقررہ قدیمی ذات اور شیخوں کی کھتری، برہمن، وغیرہ چنانچہ اب بھی پنجاب وہندوستان کے صحیح النسب نو مسلم اپنی ذاتوں سے اپنے آپ کو منسوب کر کے گکھڑ، مگڑ، جنجوے۔ آوان، کھاٹر وغیرہ کہلاتے ہیں۔ اس موقعہ پر یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ شائد ہندوستان میں وہی نو مسلم شیخ کہلائے۔ اس موقع پر یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ شائد ہندوستان میں وہی نو مسلم شیخ کہلائے۔ جو بالکل مجہول النسب تھے۔ یا ہندوؤں کی ذاتوں سے نفرت و کراہت کرتے تھے۔ یا ان کے بزرگ یا وہ خود کسی رذیل پیشوں سے منسوب تھے۔ جنکو لفظ شیخ نے مٹا دیا۔ لیکن پیشوں اور ملکی نسبتوں کے لحاظ سے نہ ذاتیں بدلتی ہیں۔ اور نہ یہ خود ذاتیں بن سکتی ہیں۔ کیونکہ بہت سی شریف ذاتوں کے لوگ لاچاری اور مفلسی کے باعث اپنی اوقات بسری اور قوت لایموت حاصل کرنے کیلئے بہ تقضائے وقت مختلف پیشے اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ہم ان کو درزی یا موچی یا نائی نہیں کہہ سکتے۔ کشمیری، پنجابی، اور ہندوستان وغیرہ جو ملکی نسبتیں ہیں یہ ہرگز ذاتیں نہیں۔ بلکہ ہر ایک ملک کا آدمی ملک کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اور وہ نسبت اس کی ذات نہیں ہو سکتی۔ عربی استعمال میں لفظ ذات کا اطلاق صفات کے مقابل اور وجود پر ہوا کرتا ہے بس اس شعر میں۔

اگر قحط الرّجال افتد بہ سہ کس اُنس کم گیری
یکے افغان دوم کمبوہ سوم بدذات کشمیری

بدذات کے معنی بدباطن اور بد طینت ہو سکتے ہیں۔ یعنی جن کے وجود میں بدی پائی جاتی ہے۔ اور یہ ایک متعصبانہ خیال ہے۔ جس سے دنیا کی کوئی مہذب قوم بھی خالی نہیں۔ اور سب ایک دوسرے کو اپنے مقابلے میں حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو عمدہ اور زبدہ تصور کرتے ہیں۔" پھر لکھتے ہیں کہ "کشمیر کے باشندے عموماً شریف اور صالح اور خدا پرست اور رحمدل اور دانش مند ہیں۔ اور دنیا کی کسی قوم سے اپنی لیاقت اور ذہانت اور جودت طبع میں کم نہیں ہیں۔ کشمیری پنڈت اور خطاط اور نقاش اور مصور صناع دنیا میں مشہور ہیں۔ اور زمانہ قدیم زمانہ وسطی اور موجودہ ایام میں بھی ان کی مثالیں ملتی ہیں۔ کشمیریوں نے سلطان محمود غزنوی اور امیر تیمور گورگان اور مرزا حیدر کاشغری وغیرہ سے بڑے بڑے زبردست حملہ آ

وروں کے ساتھ سخت مقابلے کئے ہیں۔" پھر لکھتے ہیں "میں خود ایک حق پسند آدمی ہوں۔ ازروئے انصاف کہتا ہوں کہ کشمیر بھی دیکھ آیا ہوں۔ اور پنجاب اور ہندوستان کی بھی سیر کر چکا ہوں۔ اور سب کے اوضاع اطوار سے بخوبی واقف ہوں۔ کشمیری قوم کی صحبت یافتہ اور مہذب لوگ کسی قوم کے شرفا سے کم نہیں۔ اور نہ ان میں کوئی خاصا ہے جن کے سبب وہ بالکل حقیر سمجھے جائیں۔" وہ پھر لکھتے ہیں کہ مخالفین نے سیدوں، پٹھانوں، مغلوں، اور دیگر قوموں کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اور اورنگ زیب عالمگیر کے ایک قول کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔" فرقہ سادات مثل ہیزم مسجد است نہ قابل فروختنی نہ قابلِ سوختنی" وہ پھر کہتے ہیں۔ "کیا ایرانیوں کے شاعر شیخ سعدی" نے افغانوں کو گدھا نہیں بتایا۔ دیکھو شرفائے عرب کو عجم کیا کہا کرتے تھے۔ اور کس حقارت سے ان کو دیکھتے تھے۔ اور دیکھو امیر خسرو مغلوں کی کس طرح ناک کاٹ رہے ہیں۔

" خطائی تنگ چشمان (خوردبینی) مغل راہ چشم بینی خود نہ دبینی" دنیا میں ہزاروں مثالیں قائم ہیں۔ کہ ایک قوم دوسری قوم کے مقابلے میں اپنے آپ کو بلند و برتر سمجھتی ہے۔ اور دوسری قوم کو کئی حقیر نام دیئے۔ اسلام نے ان منافروں اور تعصبات کو قبول نہیں کیا۔ اور تمام انسانوں کو برابری کا درجہ دیکر بڑائی کے لئے تقویٰ معیار قرار دیا۔ ہندوستان میں اسلام کے آنے سے پہلے چار ورن قائم تھے۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔ یہاں ذات پات کی اتنی سخت پابندیاں تھیں کہ شودر ذات کے لوگوں کی معاشرتی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ قطعی الگ تھلگ زندگی بسر کرتے تھے۔ برہموں کھشتریوں اور ویشوں کے معاشرہ میں ان کا کوئی مقام نہ تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یہ تمام لوگ شیوخ کے زمرے میں شامل ہو گئے۔ اور ذات برادری کے شدید بندھنوں سے آزاد ہو گئے۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں: "لیکن کشمیر کی برہمن اور راجپوت اور دوسری ذاتوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اپنی قدیم ذاتوں کو برابر قائم رکھا۔ مثلاً تانترے، ماگرے، لون، ڈار وغیرہ کشمیر کی کئی اقوام قبائل شیوخ میں شامل ہونے کے باوجود اپنی قدیم ذاتوں سے منسوب ہیں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض شیوخ نے اپنی قدیم ذاتوں کو اپنی پہچان کے طور پر قائم رکھا اور بعض شیوخ نے نہیں۔ تاہم شیخ ایک اعزازی نام کے طور پر اس شخص کو ملا جس نے اسلام قبول کیا کیونکہ عرب میں یہ اصطلاح معزز اشخاص کے لئے ادب و احترام کے طور پر استعمال ہوتی تھی اور ہے۔

کشمیری بحیثیت مجموعی آرین ہیں۔ بیشتر ماہرین انساب کی یہی رائے ہے۔ کہ کشمیر کے باسی اقوام آرین کی خالص اولاد ہیں۔ پروفیسر مکس مولر کا کہنا ہے کہ آریہ وسط ایشیاء سے ایران کے راستے شمالی ہندوستان میں وارد ہو کر سارے ہند میں چھا گئے۔ اور اس میں وادی کشمیر بھی شامل تھی لیکن انقلاب زمانہ دیکھئے کہ وقت کے ساتھ کشمیر میں خطائی، القابی، اعزازی، صفاتی، وطنی، نسبتی، کاروباری، عرفی، تخلصی، پیشہ وری، وغیرہ کئی نئی ذاتیں پیدا ہو گئیں۔ اور اصل ذاتیں ایسی معدوم ہو گئیں کہ اب یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ کون کیا تھا۔ اور اس کا کس بڑے گروپ سے تعلق تھا۔ جموں کشمیر کی یہ بڑی بد قسمتی رہی ہے۔ کہ اس پر مغل افغان، سکھ، ڈوگرے وغیرہ جب بھی حکمران رہے انہوں نے باری باری یہاں کے عوام پر دل کھول کر مظالم کئے۔ بعض جنگجو اور سیاسی طور پر باشعور اقوام کو یا تو مجبوراً نقل مکانی کرنی پڑتی یا انہیں جلاوطن کیا گیا۔ 1760ء تا 1800ء کے زمانے میں کشمیریوں کے مختلف اقوام کی نقل مکانی کا آگے مجملاً ذکر کر چکا ہوں۔ کہ انہیں اپنا وطن کیوں چھوڑنا پڑا۔ اور کن حالات میں نقل مکانی کی ضرورت پیش آئی۔

کشمیریوں کو اور بھی کئی نامساعد حالات در پیش ہوئے جن کی بناء پر انہیں اپنا پیارا وطن چھوڑنا پڑا اور در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ کشمیری عوام پر ڈوگروں کے مظالم کچھ کم نہ تھے۔ گلاب سنگھ (1846ء تا 1947ء) رنبیر سنگھ (1857ء تا 1885ء) پرتاب سنگھ (1885ء تا 1925ء) اور ہری سنگھ (1925ء تا 1947ء) کے آمرانہ حکمرانی کے ادوار میں لوگوں کو جمہوری حقوق حاصل نہ تھے۔ مسلمانوں پر قسم قسم کی بندشیں قائم تھیں۔ کہ وہ اپنے پاس کسی قسم کا ہتھیار نہیں رکھ سکتے تھے۔ گائے ذبح نہیں کر سکتے وغیرہ۔ ہم مسلمانوں پر کڑی نگرانی قائم تھی اور کہیں کوئی مسلمان ایک جائز حق کی بات کرتا نظر آتا، اسے قسم قسم کی صعوبات سے گزرنا پڑتا۔ ڈوگروں نے اپنے دور میں بہت سے مسلمان خاندانوں کو ان وجوہات کی بناء پر دور دراز علاقوں میں جلاوطن کیا۔ جموں کشمیر سے باہر اردگرد اور شمالی علاقہ جات میں جو کشمیری خاندان یا کنبے ہمیں آج آباد دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زیادہ تر وہی لوگ ہیں جنہیں ڈوگروں نے سیاسی بنیادوں پر خاندان کے خاندان جلاوطن کئے۔ تاکہ وہ آئندہ کشمیر کا رُخ نہ کر سکیں۔ جو کشمیری خاندانوں کے علاوہ انفرادی طور پر یہاں آئے وہ کاروبار کی خاطر رشتہ داروں سے ملنے کے لئے آئے۔ محمد اسد اللہ قریشی اپنے مضمون ''کشمیر بہادروں اور مجاہدوں کی سرزمین'' میں لکھتے ہیں: گلاب سنگھ کے مرنے پر کشمیریوں نے ڈوگرہ حکومت کو

منصوبہ بنایا تھا۔ مگر راز فاش ہو گیا۔ اور منصوبہ بنانے والے تمام افراد پکڑے گئے۔ اور انہیں سنگین سزائیں ملیں۔ اور بعض بہادر کشمیری عنصر اور طبقوں کو وادیِ کشمیر سے نکال کر بونجی، یاسین، گلگت، چندر کوٹ، اور دیگر سرحدی کوہستانوں میں جلاوطن کر دیا گیا۔ "1916ء، 1926ء اور 31-1930ء کے دوران مسلمانوں نے اپنے حقوق کے حوالے سے جو کوششیں کیں۔ اس کے نتیجے میں بھی بہت سے مسلمانوں کو جلاوطنی کا مزا چکھنا پڑا۔ اس حوالے سے محمد اسد اللہ قریشی لکھتے ہیں۔ "مسلمانوں نے لارڈ ریڈنگ کے سامنے ان کے کشمیر آنے پر ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ جس میں کشمیری عوام کے لئے جائز حقوق دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ مہاراجہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس کو مسلمانوں کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ دکھاوے کے طور پر اگرچہ تحفظ و حقوق کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا مگر بعد میں اس محضر نامہ پر دستخط کرنے والوں میں سے بعض کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اور بعض کو کشمیر سے جلا وطن کر دیا گیا۔

قدیم الایام سے کشمیر کا ایران، افغانستان اور ترکستان سے بڑے قریبی معاشرتی روابط رہے۔ مختلف عوامل کی بنیاد پر ان خطوں کے لوگ ایک دوسرے علاقوں میں آتے جاتے رہے۔ اور نقل مکانی کر کے ان علاقوں میں مستقل آباد ہوتے رہے۔ اور پھر باہمی اختلاط سے کشمیریوں نے ایرانی، افغانی، اور ترکستانی خول چڑھائے اور ایرانی، افغانی اور ترکستانیوں نے کشمیری رنگ روپ دھار کر خالص کشمیری بنے۔ پھر ایک دوسرے کے خصائل ایسے بنائے کہ ترکستانی کشمیریوں اور ترکستانیوں میں یا کشمیری ترکستانیوں اور کشمیریوں میں خصائل و عادات و اطوار میں فرق کرنا مشکل ہو کر رہا۔ آج کشمیر کے ہزاروں ذاتوں میں کچھ ایسی ذاتیں بھی ملتی ہیں۔ جو ترکستان، ایران، عراق، افغانستان اور عرب نژاد ہیں۔ مثلاً کاشغری، قاضی، بخشی، خان، سلطان، عرض بیگ، قندھاری، ترکی، منشی، بامزئی، وزیر، زابلپوری، سید، آقون، سمرقندی وغیرہ۔ مختلف وابستگیوں کی وجہ سے سطور بالا میں مذکورہ ذاتوں میں کشمیر کے پنڈت بھی ملتے ہیں۔ ان ذاتوں کے علاوہ قادری، نقش بندی، سہروردی، ہاشمی، بخاری، نقوی، گیلانی، ہمدانی، قزلباش، مغل، بیگ، ترخان، میر، بابا، رضوی، موسوی، اندرابی، وغیرہ ذاتیں بھی ان مسلمان ملکوں کی پیداوار ہیں۔ جو باہر سے در آئیں۔ اور کشمیر اور ہند کے تمام علاقوں میں بکھریں اور یہاں کا حصہ بنیں۔ آج ہندوستان، پاکستان اور شمالی علاقہ جات میں باہر سے آئے یہ خاندان اور ان کے سلسلے مقامی آبادیوں میں ایسے گھل مل

گئے ہیں۔ کہ ان علاقوں کی قدیم آبادیوں اور باہر سے آکر بسنے والے خاندانوں میں فرق کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔

شمالی علاقہ جات میں کشمیر سے آکر آباد ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان لوگوں کی نقل مکانی کرنے کی کئی وجوہات تھیں :

1۔ مذہبی تبلیغ کی غرض سے مختلف ادوار میں مبلغین اور ان کے متعلقین آتے رہے۔ اور یہیں کے ہو رہے۔

2۔ لداخ، بلتستان، اور گلگت اور شمال کی طرف کشمیری حملوں کے نتیجے میں اکا دکا کشمیری لشکری یہاں آباد ہوتے گئے۔ اور مقامی آبادیوں کا حصہ بنتے گئے۔

3۔ بہت سے کشمیری قبائل افغانوں، مغلوں کی مخاصمت کے نتیجے میں نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے۔

4۔ بہت سے قبائل کو جلاوطنی کی مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اور بادل نخواستہ ان علاقوں میں رہنا پڑا۔

5۔ بعض لوگ روزگار کی تلاش میں آئے۔ تجارت، صنعت و حرفت اور کئی فنون کے کامل فن حضرات یہاں آئے اور یہیں اپنے کاروبار سجائے۔

6۔ بہت سے لوگ ڈوگروں اور انگریزوں کی عملداری کے دوران مختلف ملازمتوں کے سلسلے میں آئے۔ اور پھر یہیں رہنا پسند کیا۔

7۔ رشتہ داروں اور متعلقین کی ترغیب و تعلق کی بنا پر بھی لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔

اس طرح شمالی علاقہ جات میں کشمیری نژاد اقوام کا تانتا بندھا رہا۔ نتیجتہً کشمیری یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ بناتے ہیں۔ آبادی کے اعتبار سے یشکن، شین کے بعد کشمیریوں کا ہی نمبر آتا ہے۔

21 مارچ 1894ء کو پایۂ تکمیل پانے والی پہلی بندوبست کے اعداد و شمار سے یہ بات عیاں ہوتی ہے۔ امیر سنگھ ذکر اقوام اسامیاں کی حد میں لکھتے ہیں : "رقبہ تحصیل ہذا بہ اقوام ذیل بحیثیت اسامی ہے۔ یشکن، شین، کشمیری، منچون، کمین، راجہ برس، سید، فقیر، مغلوٹو، گوجر، رونوں، نقشہ نمبر 7 سے اس کا پورا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ بہ مقابلہ کُل اقوام کے زیر قبضہ رقبہ زیادہ ہے۔ اور اُس سے کم بہ قبضہ شین و کشمیری و کمین و سید ہے۔"

اس طرح 15 اگست 1916ء کو مکمل ہونے والی دوسری بندوبست میں یشکن اقوام کی

3226، شین 917، کشمیری 732، ڈوم 229، کمین 181، رونو 135، دھرم خیل 122، سید پیرزادہ 114، بلتی 91، راجہ 78، گوجر 77، پٹھان 52، اور دیگر 223 اسامیاں ریکارڈ ہوئی تھیں۔ کشمیر سے آنے والی اقوام کا کچھ تذکرہ آگے گزر چکا ہے۔ اور کچھ تذکرہ بعد میں ہوگا۔ یہاں ان سادات کا تذکرہ کیا جائے گا۔
جو کشمیر سے یہاں آئے اور تبلیغ کا فریضہ انجام دیا:۔

سادات :

کشمیر میں اسلام کی بنا سادات نے ڈالی۔ اولین مبلغ کے طور پر جو بزرگ سامنے آئے : وہ سید عبدالرحمن بلبل شاہ تھے۔ جس کے ہاتھوں پر 1320ء میں کشمیری حکمران رنچن مشرف بہ اسلام ہو کر صدر الدین کے نام سے پہلا مسلم حکمران کہلایا۔ کہتے ہیں کہ اس کے ہاتھوں پر دس ہزار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ یہ بات یاد رہے کہ کشمیر میں اسلام محض اس واقعہ کے بعد مقبول عام ہوا۔ تاہم اس واقعہ سے پہلے یہ علاقہ اسلام سے قطعی طور پر نابلد تھا۔ بر صغیر میں اسلام کا دور آٹھویں صدی عیسوی میں ہو گیا تھا۔ سندھ میں مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا تھا۔ محمد بن قاسم کی تگ و تازیاں پنجاب کی سرحدات تک پہنچ چکی تھیں۔ اس زمانے میں کشمیر پر راجہ للتادت (مکتا پیڈ) (715ء729ء) کی حکمرانی تھی۔ کشمیر کا وہ ایک عظیم حکمران تھا۔ پنجاب اس کی عملداری میں شامل تھا۔ اس کی فتوحات کا حلقہ بحر بنگال تک پھیل چکا تھا۔ اپنی حکمرانی کے آخری سالوں میں اس نے کابل، سمرقند، تاشقند، قوقند، کاشغر، ختن، خطا و خراسان کے علاقے مفتوح کر کے اپنے قبضہ اقتدار میں لایا۔ گلگت، سکردو، لداخ کے علاقے اس کی قلمرو میں شامل تھے۔ للتادت گلگت کے ادواروں کی بسیار شراب خوری سے نالاں رہتا تھا۔ اور ان پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ (جٹ مار صفحہ 13 بولر اینڈ دردستان)۔ للتادت کی حکمرانی سے ذرا پہلے شام کے انیس مسلمانوں کا ایک گروہ کشمیر میں اقامت پذیر ہوا۔ اس گروہ کا سردار حمیم بن سامہ تھا۔ جس نے کشمیر میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ڈول ڈالے۔ ان مسلمانوں نے وجر دتیہ (للتادتیہ کا فرزند) کے دور میں بھی اشاعت اسلام کا کام جاری رکھا۔ پھر سلطان محمود غزنوی کے کشمیر پر حملوں کے نتیجے میں جو 1015ء تا 1021ء میں وقوع میں آئے بہت سے مسلمان مبلغ، عالم، صوفی وغیرہ کشمیر کے متصل علاقوں یعنی کوہستان نمک، پوٹھوہار، پونچھ، میرپور، مظفر آباد، ہزارہ، پکھلی اور یاغستان میں آباد ہو گئے۔ اور یوں کشمیر میں اسلام کا نفوذ کا سلسلہ

جاری رہا۔ راج ترنگنی اور سفر نامہ مارکوپولو سے عیاں ہوتا ہے۔ کہ کشمیر میں مسلمان آبادیاں تھیں۔ اور مسلمان، غیر مسلم حکمرانوں پر بھی اثر رسوخ رکھتے تھے۔ جی ایم ڈی صوفی کہتے ہیں۔ کہ جو کچھ شہادت دستیاب ہے اس سے یہ بات ملتی ہے۔ کہ وادی کشمیر میں اسلام کی اشاعت حیثیت مجموعی زیادہ تر فقراء، درویش، علماء، اور دینی مبلغین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان میں الموت کے اسمعیلی مبلغین بھی شامل ہیں۔

بہر حال بلبل شاہ کے ہاتھوں رنچن کے مسلمان ہونے کا اثر یہ ہوا کہ اسلام کو ایوان حکومت میں جگہ ملی۔ اور اس کے راستے کشادہ ہونا شروع ہوئے۔ سید عبدالرحمٰن بلبل شاہ موسوی سلسلہ سہروردیہ سے منسلک تھے۔ اور حنفی فکر رکھتے تھے۔ کشمیر میں برصغیر کی طرح صوفیہ کے چاروں سلسلے یعنی نقش بندیہ، قادریہ، چشتیہ، اور سہروردیہ جاری ہوئے۔ کبراویہ سلسلہ سہروردیہ سلسلہ تصوف کی ہی ایک شاخ تھی۔ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آفاقی ایک عوامی کہاوت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کشمیر میں صوفیوں کے ایک لاکھ پچیس ہزار نفوس ہو گزرے ہیں۔ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ کہ کشمیر کی فضا ہمیشہ صوفیانہ رہی ہے۔ لہذا تصوف کے مختلف سلسلے یہاں پروان چڑھے۔ یہ مرزین صوفیہ کا مسکن رہی ہے۔ خانقاہیں، مسجد، زیارت گاہیں، تکیے، رشی گاہوں وغیرہ کی بہتات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صوفیاء، رشی، اولیاء کرام بڑی تعداد میں یہاں آئے گئے اور بسے۔ اس مرکز سے ارد گرد تبلیغی مشن بھیجے تاکہ دین حنیف پھلے پھولے۔ سید عبدالرحمٰن بلبل شاہ ترکستان سے ایک ہزار مبلغین کے جلو میں آیا تھا۔ آپ کی تبلیغ کے زمانے یعنی 1320ء میں ہندوستان میں غیاث الدین تغلق اور ترکستان میں منگول خان ابو سعید حکمران تھے۔ 1323ء میں سلطان صدر الدین کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد 1339ء تک صدر الدین کی ملکہ کوٹہ رانی اور ادیان دیو کی وجہ سے جو کشمیر پر حکمران ہو گئے تھے۔ اسلامی تبلیغ کی رفتار ست پڑ گئی۔ تاہم 1339ء میں جب شاہ میر (سلطان شمس الدین) کشمیر کا حکمران بنا تو ایک بار پھر اسلامی تحریک نے اپنی قوت پکڑ لی۔ اور چار سُو اسلام کا ڈنکا بجنے لگا۔ 1312ء میں سلطان شہاب الدین غازی کی حکمرانی کے دور میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کشمیر وارد ہوئے۔ آپ نے اپنے چار ماہی قیام کے دوران اسلامی تبلیغ کو نئی جہتیں عطا کیں۔ 1379ء میں آپ اپنے سات سو مریدوں کے ساتھ کشمیر وارد ہوئے۔ اور ڈھائی سال تک یہاں قیام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بیشتر سادات کرام جنکی نسلیں آج کشمیر یا ارد گرد موجود ہیں۔ کے اسلاف آپ کے جلو میں کشمیر آئے تھے۔

چند نامور سیدوں میں سید جمال، سید جلال الدین، سید محمد کاظم، میر سید حیدر، سید کمال، سید کمال ثانی، میر سید رکن الدین، سید محمد قریشی، میر سید عزیزاللہ، سید محمد مراد، سید احمد قریشی، پیر محمد قاری، سید نعمت اللہ وغیرہ شامل تھے۔ شاہ ہمدان 1381ء میں براہ درہ قراقرم ترکستان چلے گئے تھے۔ تاہم 1383ء میں تیسری بار کشمیر تشریف لائے لیکن 1384ء میں براہ پکھلی دوبارہ عازم ترکستان ہوئے۔ اس سفر کے دوران کنار کے مقام پر آپ علیل ہوئے اور یہیں وفات پائی۔ مریدان آپ کی لاش کتلان لے گئے۔ اور وہیں سپرد خاک کر دیا۔

سید علی ہمدانی سہروردیہ سلسلہ کی شاخ کبرادیہ سلسلہ تصوف سے وابستہ تھے۔ اس سلسلہ کے بانی شیخ نجم الدین کبرا ساکن خوارزم تھے۔ آپ کو شافعی مسلک بتایا جاتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے کشمیر اور اڑد گرد حنفی فکر اسلامی کی تبلیغ کی اور اسے مکمل خطوط پر پروان چڑھایا۔ اس دور میں کشمیر میں اسلام کی ابھی جڑیں پوری طور پر استوار نہیں ہوئی تھیں۔ فکر اسلامی کی ابھی آمد آمد تھی۔ حضرت امیر کبیر کا در پردہ کسی اور مسلک کے ہوتے ہوئے حنفی فکر کی تبلیغ وترویج کے لئے کوششیں کرنا کوئی مجبوری نہ تھی۔ حضرت شاہ ہمدان کے سوانح نگار نور الدین جعفر بدخشی اپنی کتاب مناقب الجواہر میں لکھتے ہیں۔ کہ حضرت شاہ صاحب پہلے حنفی تھے پھر شافعی ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب کے بارے میں اور کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ جہاں تک شاہ صاحب کی تبلیغ کا تعلق ہے آپ نے کشمیر میں محض اہل سنت الجماعت کے اصول پھیلائے۔ قدیم وجدید تحقیق مثلاً وزیر حشمت اللہ، ڈاکٹر ایم ڈی صوفی، محمد دین فوق، ڈاکٹر ایم ایس ناز، ڈاکٹر صابر آفاقی (بہائی فکر دانشور) سید اسد اللہ شاہ دوارکی، محمد اسد اللہ قریشی، (مرزا غلام احمد کا مقلد) سلیم خان گمی وغیرہ سبھی اس بات پر یک زبان ہیں۔ کہ حضرت سید علی ہمدانی نے حنفیت کو کشمیر میں رواج دیا۔ محمد اسد اللہ قریشی اپنے مقالہ سلسلہ نور بخشیہ کشمیر اور اصلاح کی ضرورت میں لکھتے ہیں۔ کہ واضح ہو کہ سلسلہ نور بخشیہ صوفیا کرام کے دیگر سلسلوں سہروردیہ، چشتیہ اور قادریہ کی طرح ایک روحانی سلسلہ ہے۔ جو سید محمد نور بخش قہستانی ولادت 1393ء اور وفات 1464ء سے منسوب ہے۔ ان کا سلسلہ انیس واسطوں سے امام علی رضا (203ھ) سے چلتا ہے۔ جنہوں نے اپنے لڑکے امام محمد تقی کے نابالغ اور غیر مکلف ہونے کی وجہ سے معروف کرخی کو اپنا روحانی جانشین بنایا تھا۔ سید محمد نور بخش کے مرشد خواجہ اسحاق ختلانی اور ان کے مرشد میر سید علی ہمدانی (ولادت 714ء

وفات 786ء) کشمیر کے مبلغین میں سے تھے۔ جنہوں نے یہاں سنی مسلک کی تبلیغ کی تھی۔ اور اہل کشمیر کا سنی حنفی ہونا اور 1320ء سے مسلسل سولہ سنی بادشاہوں کا 1561ء تک یعنی تقریباً اڑھائی سو سال تک شان و شوکت سے حکومت کرنا اس بات کا تاریخی ثبوت ہے۔ اسد اللہ قریشی لکھتے ہیں کہ سید محمد نور بخشؒ ہمدانی المشرب تھے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی اپنی تاریخ کی کتاب "تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں" میں لکھتے ہیں کہ حضرت سید نور بخش سنی العقیدہ تھے۔ قاچو سکندر خان "قدیم لداخ تاریخ تمدن" میں لکھتے ہیں کہ بلبل شاہ کے مرقد کی کتبوں اور میر ہمدانی کی کتاب موذۃالقربیٰ کو مد نظر رکھ کر ان دونوں بزرگواروں کے امامیہ ہونے میں شک و شبہ نہیں رہتا۔ مگر جب ان کے تبلیغی کارناموں پر نگاہ کرتے ہیں۔ تو وہاں اس مذہب کے بیرونی آثار نظر آتے ہیں۔ اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے امامیہ سطح پر اسلام کی تبلیغ نہیں کی۔ تاریخ نے ابھی اس حیثیت سے ان کو پیش نہیں کیا۔ بہر حال سید علی ہمدانی نے کشمیر میں اپنے قیام کے دوران اسلامی تبلیغ کا جو فریضہ انجام دیا اس کی وجہ سے کشمیر کی کایا پلٹ ہو کر رہی۔ آپ کے ہاتھوں پر 37 ہزار لوگ مسلمان ہوئے۔ عوام اور حکمران جو پہلے سے مسلمان ہو چکے تھے۔ کافرانہ عقائد اور ثقافتوں کے شکنجوں سے پورے طور پر باہر نہیں آئے تھے۔ آپ کی تبلیغ کے نتیجہ میں بہت بہتری آئی۔ اور اسلام فہمی کے لئے ان میں اصل ذوق و شوق پیدا ہوا۔ ان دنوں حکمران اور عوام غیر اسلامی لباس زیب تن کرتے تھے۔ سلطان قطب الدین کے عقد میں دو سگی بہنیں تھیں۔ آپ کی تبلیغ کے نتیجہ میں حکمران اور عوام نے کافرانہ ثقافتوں کو ترک کر دیا۔ اور اسلام کے پاکیزہ اصولوں پر کاربند رہنے کی سعی کی۔

حضرت سید علی ہمدانی کے متعلق کچھ خیال ہے کہ آپ بلتستان میں اولین مبلغ اسلام تھے۔ آپ نے کچھ عرصہ شگر میں قیام کیا۔ اور اس دوران یہاں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی اور یہیں بیٹھ کر چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔ آپ سکردو۔ شگر، کیرس، خپلو، وغیرہ مواضع آتے جاتے رہے اور دین کی تبلیغ کرتے رہے۔ آپ کی کوششوں کے نتیجے میں بلتستان کی پیشتر آبادی نے دین اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت سید علی ہمدان نے کشمیر میں ڈھائی سال قیام کیا۔ پہلی دفعہ چار ماہ اور پھر 1383ء اور 1384ء میں کچھ ایام گزرے۔ اُن کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ کہ بلتستان میں بھی قیام کر کے تبلیغی فرائض انجام دیتے۔ کشمیر تبلیغ اسلام کے لئے ایک وسیع میدان تھا۔ سید ہمدانی کے لئے اس مرکز سے کام سر انجام دینے کے لئے مناسب وسائل بھی موجود تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنا پیشتر وقت کشمیر میں دین اسلام کی تبلیغ کے لئے وقف کئے

رکھا۔ تاہم آپ نے اپنے مرکز سے اپنے مریدوں کے جتھے ارد گرد پھیلائے اور اس حوالے سے یہ امکان ہے کہ آپ کا فریستادہ کوئی مبلغ بلتستان بھی وارد ہوا ہو۔ اور آپ سے اس تعلق اور تبلیغی رشتے کی بنیاد پر یہ تاثر پیدا ہوا کہ آپ بہ نفس نفیس بلتستان تشریف لائے۔ اور یہ کہ بلتستان میں تبلیغ اسلام کا کام سر انجام دیا۔ اس تاثر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ 1381ء میں ترکستان جاتے ہوئے اور پھر 1383ء میں تیسری بار کشمیر آتے ہوئے آپ نے درہ قراقرم کے راہگزر کو استعمال کیا تھا۔

1393ء میں سید علی ہمدانی کے فرزند سید میر محمد اپنے والد گرامی کی تبلیغی مشن جاری رکھنے کے لئے اپنے تین سو رفقاء کے ساتھ کشمیر میں تشریف لائے۔ اور 22 سال تک یہاں اپنے دینی فرائض انجام دیتے رہے۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں کہ آپ نے کشمیر میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے جبکہ ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی لکھتے ہیں کہ حج سے فارغ ہو کر کشمیر آئے اور پھر ختلان چلے گئے۔ جہاں آپ کی وفات ہوئی اور آپ کو یہیں والد گرامی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آپ ہی کی کوششوں کے نتیجے میں سلطان سکندر، کے وزیر اعظم اور کمانڈر ان چیف سوہا بھٹ مسلمان ہوئے۔ اور سیف الدین کے نام سے معروف ہوا۔ صاحب موصوف کے احکام پر ارد گرد کچھ منادر بھی مسمار ہوئے جس بنا پر سلطان "بت یشکن" کے لقب سے ملقب ہوا۔

سید عبد الرحمٰن بلبل شاہ، سید امیر کبیر، سید علی ہمدانی، سید میر محمد، کے بعد جس بزرگ ہستی کا شہرہ اس طرف عام ہوا۔ ان میں سید محمد نور بخشؒ کا نام نامی ہے۔ آپ نور بخشیہ سلسلہ تصوف کے بانی کہلائے۔ آپ 795ھ بہ مطابق 1393ء میں پیدا ہوئے۔ آپ غیر معمولی طور پر ذہین دین شناس اور فہم فراست کے مالک تھے۔ سات برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ اور تمام اسلامی علوم سے ایسے مزین ہوئے جیسے یہ انکا ہی حصہ ہوں۔ آپ خواجہ اسحاق ختلانی جو کہ حضرت امیر کبیر کے داماد تھے۔ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ اور باطنی علوم کی طرف راغب ہوئے۔ اس دور میں امیر تیمور کے جانشینوں میں شاہ رخ مرزا (1405ء تا 1448ء) قابل حکمران اور ایک نامور جرنیل تھا۔ اس کی سلطنت خراسان، ماور النہر، فارس، کرمان، آذربائیجان، کے ایک بڑے علاقے پر محیط تھی۔ خواجہ اسحاق ختلانی کا ایک ایسے حکمران سے نبرد آزما ہونے کا عزم غلط ثابت ہوا۔ خواجہ اسحاق کتلانی، سید نور بخش اور دیگر کئی ہزار مرید گرفتار ہوئے۔ خواجہ اسحاق ختلانی اور ان کے بھائی شمس الدین کو بغاوت

کے پاداش میں شہید کیا گیا۔ آپ کے مولانا طبیب حکیم الدین کی سفارش پر موت کی سزا سے رہائی ملی تاہم آپ کو قید کی سزا دی گئی۔ شاہ رخ مرزا کے 34 سالہ دور حکمرانی میں بیس پچیس برس تک آپ کو قید و بند صعوبتوں کا سامنا رہا۔ کبھی خوزستان، کبھی شیراز، کبھی خلخال، کبھی ہرات اور کبھی کہاں اور کبھی کہاں آپ کو قیدی بنا کر رکھا گیا۔ مشروط آزادی کے دنوں میں بھی آپ پر کڑے پہرے تھے کہ آپ حکومت وقت کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کریں۔ ایک طویل کشمکش، قید و بند اور دار وگیر کی زندگی گزار کر 1465 ء میں آپ عالم جاودانی سدھارے۔ آخری دنوں میں آپ حجرے میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور اس مرکز سے بلا خوف و خطر اپنے سلسلہ فکر کو تقویت بہم پہنچاتے رہے۔ سید محمد نور بخش کو تیموریوں کے دور حکمرانی میں جن حالات سے گزرنا پڑا ایسا نہیں لگتا کہ آپ ترکستان یا ایران سے باہر چلے گئے ہوں۔ کردستان اور بدخشاں کے حدود تک آپ کی تبلیغی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن آپ کا کشمیر یا بلتستان آمد کے بارے میں ٹھوس شواہد موجود نہیں۔ اگر کوئی اشارہ کہیں دستیاب ہے تو وہ میر نجم الدین ثاقب شعری اشارے ہیں۔ کہ آپ بلتستان بھی تشریف لے گئے تھے۔ خود میر نجم الدین ثاقت بہت بعد کے دور کے عالم تھے۔ کسی مستند حوالے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ بلتستان بھی تشریف لے گئے تھے۔

مرزا حیدر دوغلت تاریخ رشیدی میں بدخشاں اور کشمیر کے نور بخشی تعلیمات کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ کشمیر میں جن نور بخشی عقائد کو شمس الدین عراقی نے پیش کیا وہ بدخشاں کے نور بخشی عقائد سے میل نہیں کھاتے۔ میں بدخشاں اور ارد گرد نور بخشی بزرگوں سے ملا ہوں وہ حضرت محمد ﷺ کے احکام کی پیروی کرتے ہیں۔ اور سنیوں سے قریبی میل رکھتے ہیں۔ جبکہ کشمیر میں ایسے عقائد پھیلائے گئے ہیں جو نہ سنی اور نہ شیعہ بلکہ کسی بھی فرقہ سے میل نہیں کھاتے۔ (تاریخ رشدی مرتبہ این۔ الیاس انگریزی ترجمہ صفحہ 434-35) بہر حال کشمیر کی تاریخ میں میر شمس الدین عراقی کا کشمیر آنا ایک دوررس اثرات کا حامل واقعہ ہے۔ اس وقت تک کشمیر یا ارد گرد حنفی فکر کے علاوہ، کسی اور اسلامی فکر کو کوئی دخل نہ تھا۔ میر شمس الدین عراقی پہلا شخص ہے۔ جس نے کشمیر کی مذہبی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اور کچھ ایسے مذہبی خیالات پیش کئے جو رائج فکر سے متصادم تھے۔ اور اس کے نتیجہ میں کشمیر کی مذہبی تاریخ میں ایک ہل چل پیدا ہوئی۔

محمد دین فوق کشمیر کے ایک نامور مورخہ رہے ہیں۔ اُن کی کتاب مکمل تاریخ کشمیر

میں میر شمس الدین عراقی کے بارے میں یوں لکھا ہے: "1487ء میں عراقی والئی خراسان کا سفیر ہو کر کشمیر آیا۔ سلطان محمد شاہ اور فتح شاہ کے فساد کے دوران یہ شخص بابا اسماعیل کبروی جو اولیائے کشمیر میں شمار ہوتے تھے، کے مریدوں میں شامل ہوا۔ لیکن چونکہ وہ مذہب شیعہ کا پیرو تھا، چپکے چپکے اس کی اشاعت کی تدبیر بھی کرنے لگا۔ بابا علی نجار اس کا پہلا معتقد ہوا۔ 1495ء میں خراسان واپس ہوا لیکن والئی خراسان کو اس کے مذہبی خیالات معلوم ہوئے تو اسے علاقے سے خارج کیا گیا۔ عراقی کشمیر واپس آیا اور یہاں آکر اس نے علانیہ مذہب امامیہ کی تبلیغ شروع کی۔ موسیٰ رینہ، کاجی چک، غازی چک جیسے بااثر لوگ اس کے مرید ہوئے۔ اس وقت سید محمد بیہقی سلطان محمد شاہ کا مدار المہام تھا۔ جب شاہ صاحب کو عراقی کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو اسے 96-1495ء کے زمانے میں سکردو جلاوطن کیا۔ 1501ء تا 1514ء کے زمانے میں سید محمد مارا گیا۔ 1501ء میں عراقی حالات سازگار پا کر کشمیر واپس آیا۔ اب اس کا ہی ایک مرید موسیٰ رینہ وزارت کا انچارج تھا۔ عراقی نے زڈی بل میں سکونت اختیار کی۔ مذہب شیعہ پھیلانے کے لئے سخت کوششیں شروع کیں۔ ہندوؤں اور اہل سنت پر قیامت برپا ہوئی۔ 34 ہزار ہندوؤں کو زبردستی شیعہ بنایا گیا۔ بعض سنیوں کو ملک سے خارج کیا گیا۔ اور بعض کو شیعہ بنایا گیا۔ سید محمد کے تینوں لڑکوں میں سے سید مرتضیٰ کو تبت میں ہلاک کیا گیا۔ سید ابراہیم کو تبت میں قید کیا گیا۔ سید یعقوب جو کمسنی کی صورت میں ماں کی گود میں تھا، کسی طرح بچ پایا۔ 1510ء میں موسیٰ رینہ مختلف سازشوں کا شکار ہو کر مارا گیا۔ اور یوں مذہبی آفات کچھ تھم گئے۔ عراقی 1526ء میں فوت ہوا۔

1532 میں مرزا حیدر نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ مرزا حیدر نے کشمیر پر 1540ء تا 1551ء یعنی دس سال 8 ماہ حکومت کی۔ بدقسمتی سے میر شمس الدین عراقی کے وارد خطہ ہونے کے بعد مسلمانان کشمیر میں تفریقہ پیدا ہو گیا تھا۔ مذہب تشیع کی اشاعت کے بعد مسلمان مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ مرزا حیدر نے مسلمانوں میں صلح کرانے کی بجائے اور یہ سمجھ کر کشمیر کی بدامنی میں شیعہ ہی حائل ہیں۔ اس مذہب کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوششیں شروع کیں۔ سنی جو ایک عرصے تک کاجی چک اور اس کی جماعت کے ظلم سے تنگ آگئے تھے۔ اور اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کر کے اپنی جانیں بچا رہے تھے۔ شیعوں سے بدلہ لینے پر آمادہ ہو گئے۔ خانقاہ عراقی جلائی گئی۔ بابا علی نجار کے مرید شنگی رشی جو پرس پور میں تلقینِ دین کر رہا تھا۔ سخت بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ قاضی میر علی کو جلاوطن کر کے اس کے گھر بار

کو لوٹ لیا گیا۔ میر عراقی کے سینکڑوں معتقد اس ہنگامہ میں مارے گئے۔ اور ہزاروں گھر ویران ہو گئے۔ اس پر بھی مرزا حیدر کی چشم خشمگیں سیر نہ ہوئی۔ اور اس نے میر صاحب کے بڑے بیٹے میر دانیال کو اسکردو سے محبوس کر کے منگایا اور سال بھر تک مقید رکھ کر اسے بھی قاضی ابراہیم اور قاضی عبدالغفور کے فتوے پر ہلاک کیا۔ (صفحات 388 تا 1-420)" ڈاکٹر صابر آفاقی اپنی کتاب تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں لکھتے ہیں۔ : "شمس الدین عراقی 1484ء میں بعہد سلطان حسن شاہ (1474ء ۔ 1484ء) کشمیر پہنچا۔ وہ خراسان سے سلطان حسن مرزا (1474۔ 1506ء) کا سفیر بن کر آیا تھا۔ سلطان مذکور سید محمد نور بخش کے بیٹے اور خلیفہ شاہ قاسم انوار کے زیر اثر تھا۔ کشمیر میں اس کے پہنچنے کے بعد جلد ہی سلطان حسن شاہ فوت ہو گیا۔ شمس الدین عراقی جیسے منچلے اور پر جوش مبلغ کے لئے یہ وقت بہت مناسب و مساعد تھا۔ سیاسی زعما کی باہمی کشمکش کے نتیجہ میں ملک انتشار کے دور سے گزر رہا تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے شمس الدین عراقی نے وادی میں اپنے قیام کی مدت بڑھا دی۔ چونکہ وہ سفیر تھا اس لئے مذہبی مجثوں یا اپنے عقیدہ کی تبلیغ میں کھلے بندوں میں حصہ نہ لے سکتا تھا۔ بنابریں اس نے شیخ اسمٰعیل کبردی کے ساتھ میل جول بڑھایا جو اس وقت کشمیر میں اسلام کا با اثر اور پر جوش مبلغ تھا۔ (تاریخ اعظمی)۔ اس نے عراقی کے محافظ کا رول ادا کیا۔ شروع شروع میں اس کے پلیٹ فارم سے شمس الدین عراقی نے اپنے عقیدہ کی تبلیغ کا آغاز کیا پھر چپکے چپکے اپنے سرپرست محافظ کے لئے ایک با اثر لیکن احمق کشمیری لیڈر بابا علی نجار کی ناجائز حمایت کر کے مصیبت پیدا کر دی۔ اب کشمیر میں بابا علی نجار عراقی خلیفہ بن گیا۔ مسلمانانِ کشمیر میں نفرت و عداوت کا بیج بو کر شمس الدین عراقی وہاں سے چلا گیا۔ (صفحہ 128)

"شمس الدین عراقی دوبارہ کشمیر میں اس وقت آیا جب فتح شاہ دوسری مرتبہ (1505-16ء) حکومت کر رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے خراسان کو اس لئے ترک کیا تھا۔ کہ سلطان حسن مرزا نے اسے وہاں سے نکال دیا تھا۔ پہلے سفر کے دوران شمس الدین عراقی نے کشمیر میں مٹھی بھر وفادار مرید پیدا کئے تھے۔ انہی کے ذریعے وہ کشمیر کے حالات سے اپنے آپ کو باخبر رکھتا تھا۔ اور جب صورت حال مناسب ہوئی تو خود یہاں آگیا۔ بابا علی نجار جسے پہلے اس نے شیخ اسماعیل کبروی کے خلاف لڑایا تھا۔ اب ایک مقتدر مذہبی رہنما بنا ہوا تھا۔ اور مریدوں کی ایک جماعت اس کی پیرو تھی۔ اس کا سب سے بڑا پیرو موسیٰ رینہ وزیر اعظم تھا۔ شمس الدین عراقی نے کشمیر پہنچتے ہی دعویٰ کر دیا کہ وہ سید محمد نور بخش کا نائب ہے۔ حالانکہ

وہ تو اس کے بیٹے قاسم کا فقط مرید تھا۔ (تاریخ رشدی صفحہ 435)۔ پھر ہندوؤں کے خلاف ایک مہم شروع کر دی۔ ایک ہی حملہ میں چوبیس ہزار ہندو خاندان مسلمان بنا لئے گئے۔ (بہارستان۔ 74)۔ ہم عصر مورخ شک رقم طراز ہے میر شمس الدین عراقی موسیٰ چندر (رینہ) کا مذہبی گرویدہ بن گیا۔ اس کے کہنے پر موسیٰ چندر نے مندروں کے سادھوؤں کو گرفتار کر دیا۔ اور برہموں کی زمینیں ضبط کر لیں۔ (تاریخ حیدر ملک صفحہ 39)

1516ء میں محمد شاہ نے تیسری بار سلطان کشمیر ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور کاچی چک کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ عراقی جو اس پر اثر ڈال چکا تھا۔ ایک دفعہ پھر منظر عام پر آگیا۔ اس نے کاچی چک کو مشورہ دیا کہ وہ ہندو مت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا دے۔ چنانچہ 1518ء میں کوئی آٹھ سو ہندو رہنماؤں کا ہولناک طریقے سے قتل عام کیا گیا۔ (صفحہ 131)

شمس الدین عراقی سری نگر 1526ء میں فوت ہوا۔ اسے زڈبل میں سپرد خاک کیا گیا۔ شیعان کشمیر اس مزار کی بڑی تعظیم کرتے ہیں۔ قاضی نور اللہ شوشتری کا خیال یہ ہے۔ کہ شیعہ عقیدہ شمس الدین عراقی کے مبلغانہ جوش کے باعث بڑی تیزی سے پھیلا۔ در حقیقت شمس الدین عراقی نے پہلی مرتبہ کشمیر کو نور بخشیہ عقائد سے روشناس کیا اور ساتھ ساتھ شیعہ عقیدہ کو بھی پھیلایا۔ نور بخشیہ جہانگیر کے عہد میں بھی یہاں پائے جاتے تھے۔ لیکن اس عقیدہ نے وادی میں کوئی قابلِ ذکر مقبولیت حاصل نہ کی۔ البتہ اسے بلتستان میں بڑی کامیابی ہوئی۔ بلتستان میں بھی شمس الدین عراقی ہی نے تبلیغ کی تھی۔ اور اس کے دو بیٹوں میر مختار اور میر یحییٰ نے مقبول بنایا تھا۔ اس امر میں اختلافات پایا جاتا ہے۔ کہ شمس الدین عراقی نے نور بخشیہ کی اشاعت کی یا شیعہ عقائد کی۔ مرزا حیدر کے بقول شمس الدین عراقی نے نور بخشیہ سلسلے کی تبلیغ کی تھی۔ ابوالفضل کی بھی رائے یہی ہے۔ محمد اعظم کے مطابق شمس الدین عراقی نے بابا علی نجار کے تعاون سے شیعہ عقیدہ کو پھیلایا اور زڈی بل میں اپنی خانقاہ بھی تعمیر کرائی۔ لارنس رقم طراز ہے کہ شیعہ سلسلہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ 1450ء میں شمس الدین عراقی کے ذریعے پھیلا لیکن چکوں کے مختصر دور کو چھوڑ کر کبھی پورا پورا تسلط حاصل نہ ہوا۔" مولانا محمد اسد اللہ قریشی اپنے مقالہ " سلسلہ نور بخشیہ کشمیر اور اصلاح کی ضرورت " میں لکھتے ہیں: "صفوی خاندان کا شجرہ شیخ صفی الدین اردبیلی سے ملتا ہے۔ اس اردبیلی خاندان سے شیخ شمس الدین عراقی بھی تھا۔ جو پہلے سفیر بن کر کشمیر آیا اور واپس چلا گیا۔ اس کے ساتھ بعض اور آدمی بھی تھے۔ اس کے باوجود وہ دوبارہ کشمیر آیا۔ اسی نے سب سے پہلے سلسلہ ہمدانیہ نور

نخشیہ کے صوفی کے بھیس میں کشمیر جاکر غیر معروف عائد کی تبلیغ کی۔ سید محمد نور بخش کو مہدی موعود اور اپنے آپ کو ان کا خلیفہ مشہور کر دیا۔ اور 1503ء میں خانقاہ شمسیہ نور بخشیہ زڈی بل میں قائم کی۔ اور اس کا طواف خانہ کعبہ کے طواف بلکہ اس کے سات طواف کے برابر قرار دیا۔"

طبقات نوریا حالات مشائخ نور بخشیہ صفحہ 112۔ تاریخ فرشتہ میں محمد قاسم (شیعہ مورخ) کے بیان کے مطابق جو لوگ شمس الدین عراقی کے مرید ہوتے تھے۔ خلفاء ثلاثہ اور حضرت عائشہؓ کو بُرا کہنا شروع کرتے تھے۔ تاریخ فرشتہ صفحہ 336۔ صفحات 10,11 سلیم خان گمی اپنی کتاب کشمیر میں اشاعت اسلام میں لکھتے ہیں: "شمس الدین عراقی ایران کے صوبہ گیلان کے ایک ضلع طالش میں مبلغ تھے۔ آپ وہیں سے 1487 میں کشمیر تشریف لائے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی ابراہیم تھا اور آپ کی والدہ ماجدہ قزوین کے موسوی سیدوں میں سے تھیں۔ آپ نے اپنے شاگردوں اور مریدوں کی مدد سے کشمیر میں بے شمار لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ اور انہیں حلقہ اسلام میں لانے میں کامیاب ہوئے۔ میر شمس الدین، سید معین الدین بھی المعروف شاہ قاسم زر بخش کے شاگرد تھے۔ سید معین الدین کے والد ماجد کا نام سید محمد نور بخش تھا اور آپ ایران کے صوبے خراسان کے رہنے والے تھے۔ یہ محمد نور بخش خراسانی خواجہ اسحق ختلانی کے شاگرد تھے۔ اور سلسلہ نور بخشیہ کے بانی تھے۔ یہ سلسلہ بلتستان میں ہے۔ سلطان فتح شاہ (93-1486ء) (14-1505) نے وہ تمام اراضیات شیخ شمس الدین عراقی کے حوالہ کر دیں۔ جو سرکار نے ضبط کی ہوئی تھیں۔ آپ نے چکوں کو حلقہ اسلام میں لانے کے لئے کامیاب کوشش کی۔ کیونکہ آپ شیعہ تھے اس لئے آپ کو کشمیر میں شیعوں کا سب سے بڑا عالم تصور کیا گیا ہے۔ آپ کشمیر میں شیعوں کے اس فرقے کے مبلغ تھے۔ جسے نور بخشیہ کہا جاتا ہے۔ دوسری جگہ سلیم خان گمی پھر لکھتے ہیں۔ "آپ 1481ء میں کشمیر کے سلطان حسن شاہ کے دربار میں آئے اور 8 سال وادی کشمیر میں رہے۔ آپ اس دوران خفیہ طور پر اپنے عقیدہ کی اشاعت کے لئے کام کرتے رہے۔ اور بابا اسماعیل کبروی اور بابا علی نجار کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ آخر کار علماء کے احتجاج پر آپ کو کشمیر چھوڑنا پڑا۔ اور آپ ہرات چلے گئے۔ مگر وہاں سلطان حسین مرزا آپ کے خلاف ہو گیا۔ اور رے میں سید نور بخش کے بیٹے شاہ قاسم کے پاس آ گئے۔ آپ دوبارہ 1501ء میں کشمیر آئے۔ آپ کے ہمراہ کئی صوفی منش بزرگ اور ان کے خاندان تھے۔ راستے میں آپ نے مشہد میں حضرت امام رضا کے روضہ پر حاضری

دی۔ مشہد سے آپ قندھار آئے۔ اور قندھار سے ملتان پہنچے۔ ملتان سے آپ نے کوہستان نمک (پوٹھوہار) کا رخ کیا۔ اور آخر کار 1502ء میں کشمیر میں آئے اور کئی لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا۔ تاہم سلطان محمد شاہ کے وزیر اعظم سید محمد بیہقی اور کشمیر کے علماء نے آپ کی سخت مخالفت کی۔ اور آپ اپنے 50 ساتھیوں کے ہمراہ کشمیر چھوڑ کر بلتستان چلے گئے۔ اور وہاں جا کر بدھ مت کے پیروکاروں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ بلتستان میں آپ نے دو سال قیام کیا۔ اور 1505ء میں سید محمد بیہقی کے مرنے پر آپ موسیٰ رینہ کی دعوت پر کشمیر آگئے۔ جب آپ نے وفات پائی کشمیر میں سلسلہ نور بخشیہ اپنے قدم مضبوطی سے جما چکا تھا۔ مرزا حیدر دوغلت کے عہد اقتدار میں سلسلہ نور بخشیہ کے ماننے والوں پر بے حد تشدد کیا گیا۔ لیکن جب 1551ء میں مرزا حیدر ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اور حکومت ایک بار پھر چک خاندان میں آگئی۔ تو سلسلہ نور بخشیہ کے پیروکار اپنے عقیدہ خیال کی تبلیغ کرنے لگے۔ صفحات 149-150"

ڈاکٹر ایم ایس ناز۔ اپنی کتاب تصویرِ کشمیر میں لکھتے ہیں: "دسویں صدی ہجری میں ایران کے طالع آزما خالص ایرانی فکر و ثقافت کا عزم لے کر نمودار ہوئے۔ اور فقیروں اور درویشوں کی صورت بنا کر کشمیر میں اسماعیلی تحریک کی اشاعت کیلئے آئے۔ ان میں جو داعی سب سے پہلے کشمیر میں وارد ہوا اس کا نام میر شمس الدین عراقی ہے۔ اس نے حاکم خراسان سلطان حسین مرزا کے سفیر کے طور پر وادی میں قدم رکھا۔ اور بظاہر شیخ اسماعیل کبروی کے حلقہ ارادت میں شمولیت اختیار کی۔ مگر درپردہ نور بخشی و شیعہ عقائد کی تبلیغ کرنے لگا۔ جلد ہی اسے ملک رینہ موسیٰ رینہ، ملک محمد ناجی ایسے سرداروں کی حمایت حاصل ہو گئی۔ جو بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر شیخ الاسلام اسماعیل کبروی کے حق میں تھے۔ انہیں وزراء کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔ میر شمس الدین عراقی نے اس سے فائدہ اٹھایا اور خانقاہ معلیٰ کے مقابلے میں اپنی ایک الگ خانقاہ بنوا کر اس کے حج طواف کا اعلان کر دیا۔ (اس کی تفصیلات ملا جمیل کی قلمی کتاب تحفۃ الاحباب میں درج ہیں بعض اشارات تاریخ اعظمی میں بھی ملتے ہیں) میر شمس الدین عراقی کے بعد اس کا بیٹا دانیال جانشین ہوا۔ اس وقت تک نور بخشی کافی تعداد میں کشمیر کے گرد و نواح میں پھیل چکے تھے۔ ریاست میں سنی مسلمانوں کی کثرت تھی۔ وہ نور بخشیت کے خلاف مزاحم ہوئے۔ کاشغر کے مرزا حیدر دوغلت نے موقع غنیمت جانا اور مغل سپاہیوں کا ایک لشکر لے کر بغیر کسی مزاحمت کے کشمیر پر قابض ہو گیا۔ اس نے نور بخشیوں کے خلاف ہمایوں کے درباری علماء سے فتویٰ بھی حاصل کیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ نور بخشیوں کا استحصال ہوتا،

کاشغری مغل کشمیر رنگ رلیوں اور بربریت میں مشغول ہو گئے۔ اور مرزا حیدر کی اصلاحی تحریک خود بخود دم توڑ گئی۔ اس دوران چک سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ یہ سلطنت 32 سال برقرار رہی اور اس نے شیعت اور نور بخشیت کی تجدید احیاء میں کوئی کسر نہ اٹھار کھی۔ "ڈاکٹر ایم ایس ناز مزید لکھتے ہیں: "کشمیر کے جس بزرگ عالم دین اور ولی کامل نے شاہمیری دور کے ساتھ ساتھ ابتدائی چک عہد میں ریاست میں اسلام کی قندیل فروزاں کی اور اسے مذہبی فرقہ واریت کے شدید طوفانوں میں بھی گل نہ ہونے دیا۔ وہ حضرت شیخ اسماعیل کبروی تھے۔ شیخ اسماعیل کبروی نے کشمیر میں اسماعیلی تحریک کو قدم جمانے سے روکے رکھا۔ وہ اہل کشمیر کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے رہے کہ میر شمس الدین عراقی کا ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کا اس کے سوا کوئی مقصد نہ تھا کہ کشمیر میں شیعیت فروغ پائے۔"

ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی۔ صوفی اپنی کتاب کیشر میں لکھتے ہیں: صفحات 109-111

" Fresh impetus to conversion was given towards the close in the fifteenth century by the arrival in 1487 A.C and not 1450 A.C as lawrence wrongly puts it, of shaikh Shams-ud-Din Muhammad al Isfahani commonly known as Mir Sham-ud- Din Iraqi who was a preacher from Tal-ish on the shores of caspain. Sham-ud-Din arrived from Iraq in the first reign of Sultan Fath Shah and Converted many thousand of people. After this he was Crowned in the name of twelve Imams. The Shias of Kashmir contend that he was a true shia and the Ahwat, or Most Comprehensive a book in Arabic containg the tenets of Nur Bukhshi sect, prevalent at present in Baltistan is not his Composition. Firishta says that Mir Shams-ud-Din was a disciple of sayyid Mu-in-ud-Din Ali known as Shah Qasim Zar-bakash, the son of sayyed Muhammad Nur Bakhash of Khurasan, sayyid Muhammad Being a

disciple of Khawaja Is-Haq Khatlani; Sultan Fath Shah made over to Mir Shams-ud-Din all the Confiscated lands which had fallen to the crown and in a short time, chaks were converted by him. The shia doctrine did not gain much support from the people of the valley, The grave of Shaikh Iraqi is held in great Veneration by the Pro-Iraqi party of shais of Kashmir as the pro-Iraqi party of shais do not beleive on his being a sayyid, Malik Haider Chadur, himself a noted shia, also sall him shaikh Shams-ud-Din Iraqi in his Tarikh.""

<u>SIR Wolsely Haig.</u>

Says that Shams-ud-Din probessed to be an orthodox Sunni" but the doctrines set forth by him in the Ahwat are described as a mass of cirfidelity and heresay conforming neither to the sunni nor to shia creed"(P-110) Mr. Sufi again points out that:- " The Nur Bakshi sect is an attempt to find a via media between shia and sunni doctrines. In winter the Nur Bakshis pray with folded arms like the sunnies in summer with the hands hanging down like the shias. like the sunnis they pray together and observe friday prayers but they donot wash their feet before praying and only perform mas-ha like the shias, The chief cause of quarrel arises in Muhammad, as the Nur Bukshis maintain that mouring shall take place in the mousque but the shias do not allow to be proper."

(P-109)

الحاج مولوی حشمت اللہ خان لکھنوی اپنی کتاب تاریخ جموں میں لکھتے ہیں۔

"1487ء میں میر شمس الدین عراقی خراسان سے تحائف لے کر کشمیر میں وارد ہوا۔ لیکن بادشاہ کی علالت اور بعد میں اس کی وفات کے باعث دربار میں پیش نہ ہو سکے۔ سلطان محمد شاہ اور فتح شاہ کے فساد کے زمانے میں وہ بابا اسماعیل کی خدمت میں پہنچے۔ اور ان کے مریدوں میں داخل ہو گئے۔ لیکن دراصل وہ شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ اور انہوں نے دوران قیام میں بابا علی نجار کو اپنے مذہب کا معتقد بنالیا تھا۔ جب محمد شاہ نے دوسری مرتبہ تخت حاصل کیا۔ اور سید محمد بیہقی اس کا مدار المہام تھا۔ تو میر شمس الدین عراقی کو اپنا وطن یاد آیا۔ اور آٹھ سال بعد 1495ء میں واپس خراسان چلے گئے۔ لیکن وہاں بھی انہیں رہنا نصیب نہیں ہوا۔ اور خراسان سے جلا وطن ہو کر انہوں نے کشمیر ہی کی طرف رجوع کیا۔ یہاں پہنچ کر بابا علی نجار کی معاونت سے وہ علانیہ مذہب امامیہ کی اشاعت کرنے لگا۔ ملک موسی کا جی چک اور غازی چک آپ کے معتقد اور مریدان با اخلاص بن گئے۔ جب سید محمد بیہقی کو اس کی خبر ہوئی تو وہ غضبناک ہوا۔ اور اس نے میر شمس الدین عراقی کو بجر و تشدد کشمیر سے نکال کر اسکردو بھجوادیا۔ کشمیر سے ملک بدر ہو کر میر صاحب اسکردو میں پہنچے تو چونکہ یہاں حضرت سید محمد نور بخش کا نام ہر شخص کے ورد زبان تھا۔ تو میر صاحب نے اپنے آپ کو سید صاحب موصوف کا خلیفہ ظاہر کر کے مذہب امامیہ کی اشاعت شروع کر دی۔ اور اس حکمت سے وہ اپنے مذہب کو پھیلانے میں بخوبی کامیاب ہوئے۔ پانچ چھ سال وہ اس ملک میں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں سید محمد بیہقی کے کشمیر میں شہید ہونے کی خبر پہنچی۔ تو میر صاحب تقریباً 1502ء میں واپس کشمیر چلے گئے۔ صفحات نمبر 591-592 قاچو سکندر خان نے اپنی کتاب قدیم لداخ تاریخ تمدن میں لکھتے ہیں۔ "میر عراقی 892ھ میں (تیمور گورگانی کے پوتے) سلطان حسین مرزا والئی خراسان کی جانب سے شاہ کشمیر سلطان حسن شاہ کے دربار میں سفیر مقرر ہو کر آئے۔ اور آٹھ سال تک سفارت کے فرائض نہایت استقلال ستعدی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں اپنے وطن واپس چلے گئے۔ آپ کی زندگی کا اصل مشن مذہب تشیع کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ لیکن اس دفعہ سفارت کے نازک فرائض آپ کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ اور آپ کھلم کھلا کچھ نہ کر سکے۔ صرف اتنا ہوا کہ حسن آباد کے بابا علی نجار کو شیعہ بنادیا۔ ایران پہنچنے کے بعد آپ نے سلطان حسین مرزا کی ملازمت کو خیر باد کہا اور شاہ قاسم نور بخش کے خوزۂ تربیت سے متعلق ہو گئے۔ آخر میں نور بخش کی خلافت کے منصب پر فائز ہو گئے۔ شاہ قاسم ذر بخش

نے آپ کو تبلیغ کے لئے کشمیر جانے پر اصرار کیا۔ قاچو سکندر اس کے بعد مولوی حشمت اللہ لکھنوی کی کتاب سے کچھ اقتباسات پیش کر کے اپنا استدلال یوں بڑھاتے ہیں؟ فاضل مصنف (وزیر حشمت اللہ) کا شائد یہ خیال تھا۔ کہ میر عراقی نے جو مذہب پھیلایا وہ سید نور بخش کے مذہب سے مختلف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدین موصوف کے عقائد مذہبی میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ اور یہ کہ دونوں بزرگوار فرقہ امامیہ سے منسلک تھے۔ مصنف کتاب اختر درخشاں مولانا سید محمد باقر کے بقول سید محمد نور بخش کا بلکہ سادات نوربخشیہ کا تعلق مذہب امامیہ سے تھا۔ سید محمد نور بخش سادات کے سلسلے کی پہلی کڑی تھے۔ وہ اصولاً شیعہ مسلک تھے۔ جو تصوف کے رنگ میں ظاہر ہوا تھا۔ سید محمد باقر نے سادات نور بخشیہ کے شیعہ امامیہ ہونے کی تائید میں متعدد اکابر علما کی روایات کے حوالے درج کئے ہیں۔ ان میں قاضی نوراللہ شوستری زیادہ مشہور ہے۔ قاضی موصوف نے اپنی کتاب مجالس المومنین میں سید محمد نور بخش اور شاہ قاسم انوار کے شیعہ امامیہ ہونے پر تصریح کی ہے۔ قاچو سکندر پھر اپنے مباحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ میر عراقی راہ سلوک میں سادات نور بخشیہ سے متعلق تھے۔ اور بعد میں نور بخش کی خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔ سادات نور بخشیہ سید محمد نور بخش اور ان کے سلسلے کے سادات اور میر عراقی شیعہ امامیہ تھے۔ اور ان دونوں بزرگوں نے ایک ہی مذہب یعنی شیعہ امامیہ کی تبلیغ کی۔ میر عراقی کا تشیع ایرانی علماء مصنفین کی تحریروں سے بھی ثابت ہے۔

شمالی علاقہ جات میں اشاعت اسلام کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ عبدالحمید خاور سابق اے آئی جی کا قراقرم ہندوکش میں صفحات 193 تا 224ء میں چھپا ہے۔ خاور صاحب مباحث پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ حکیم الامت اقبال عاشق رسول تو تھے ہی مگر حضرت علیؓ سے بھی والہانہ محبت رکھتے تھے۔ ان تمام نذرانہ ہائے عقیدت کے بنا پر ان تمام بزرگوں کو ہم شیعہ نہیں کہتے۔ جہاں تک قاضی نوراللہ شوستری کا تعلق ہے۔ انہوں نے تقریباً بڑے بڑے بزرگوں کو شیعہ بنایا ہے۔ اور قاضی صاحب کے نسبت تو ملک الشعراء بہار نے شیعہ تراش کہا ہے۔ اور بہت درست کہا ہے۔ کشمیر میں شاہ ہمدان کے پیر شافعی ہیں اور اس سرزمین میں شیعہ مسلک شاہ ہمدان کی آمد سے دو سو سال بعد مقبول ہوا۔ اگر سید صاحب مذہباً شیعہ ہوتے تو آپ کی آمد کے فوراً بعد شیعت کے اثرات ملتے۔ حضرت شاہ ہمدان کے اہل سنت ہونے کی سب سے بڑی دلیل خود ان کی اپنی تحریریں اور عقائد ہیں۔ ایک موقع پر آپ فرماتے ہیں۔ ''صحابہ کرام بعد از بیینی بہترین خلق اند بہترین اشیاں چوں ابو بکرؓ۔ عمرؓ۔

عثمانؓ۔ علیؓ۔" پھر صاحب موصوف آگے لکھتے ہیں کشمیر میں مذہب نور بخشیہ کس نے پھیلایا۔ یہ امر واضح ہے کہ میر شمس الدین عراقی حضرت شاہ قاسم فیض بخش کی ہدایت پر بلتستان آگئے اور نور بخشیہ تحریک کو چلایا۔ لیکن بیشتر مورخین کی یہ رائے ہے کہ میر شمس الدین عراقی خود شیعہ تھے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو کسی نے یہ نہیں بتایا ہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ بظاہر ان کے سامنے ایسی کوئی مصلحت نظر نہیں آتی۔ جس کے بنا پر وہ شیعہ ہوتے ہوئے خود کو نور بخشی ہونا ظاہر کیا۔

میں نے یہ تصریحات کسی مباحثہ کے لئے پیش نہیں کئے میرا مقصد شمالی علاقہ جات میں اسلامی فکر کی ترویج کے حوالے سے اثرات کا ایک منظر پیش کرنا ہے۔ شمالی علاقہ جات میں مختلف اسلامی مسالک کب کیسے اور کن بزرگوں کے ذریعے پروان چڑھے۔ میں آگے اشارے کر چکا ہوں کہ کشمیر میں اسلام کی منظم تبلیغ کا سہرا سید عبد الرحمٰن بلبل شاہ کے سر ہے۔ 1320ء سے کشمیر میں اسلام حکومتی سطح پر فروغ پانے لگا تھا۔ سید عبد الرحمٰن بلبل شاہ موسوی سید تھے۔ آپ کے ساتھ ایک ہزار مبلغین موجود تھے۔ جنہوں نے آپ کا اس عظیم کام میں مسلسل ہاتھ بٹایا۔ اس کے بعد جناب سید امیر کبیر علی ہمدانی کشمیر تشریف لائے۔ 1372ء سے 1384ء تک کشمیر اور ارد گرد تبلیغِ اسلام کے لئے آپ اور آپ کے سات سو جانثار ساتھیوں نے دینی فرائض کے حوالے سے دن رات محنت کی جس کے نتیجے میں کشمیر میں اسلام کی بنیادیں استوار ہوئیں ہمدانی صوفیہ کے برگزید سلسلہ سہروردیہ سے منسلک تھے تمام مورخین اور محققین اس بات پر متفق ہیں کے ان بزرگوں نے حنفی فکر کی تبلیغ کی قاچو سکندر ابو الفضل تاریخ فرشتہ کے شیعہ مورخ نے بھی یہ کہا کہ ان بزرگوں نے امامیہ سطح پر تبلیغ اسلام نہیں کی۔

1393ء میں ہمدان کے فرزند سید میر محمد کشمیر آئے اور آپ 1415ء تک یہاں مقیم رہے۔ آپ کے ساتھ تین سو مبلغین موجود تھے۔ ان برگزیدہ تینوں ہستیوں نے ایک ہی فکر کی تبلیغ کی۔ جس کی متابعت حکمران اور عوام یکساں کرتے رہے۔ یہ سلسلہ تبلیغ تلقین 1320ء سے 1500ء تک جاری رہا۔ لوگوں میں فکری اختلافات موجود نہ تھے۔

جناب میر علی ہمدانی جب کشمیر میں تبلیغی فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ تو آپ نے ارد گرد تبلیغ اسلام کے لئے مبلغ روانہ کئے۔ آپ کے ساتھیوں میں فکر و فن میں ید طولی رکھنے والے بزرگ شامل تھے۔ یہ بزرگ خطاطی صناعی عمارت سازی وغیرہ فنون میں بھی

مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فرائض مذہبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے مراکز از قسم مساجد خانقاہیں صومعات وغیرہ ایرانی طرز پر خود تعمیر کئے۔ یا تعمیر میں رہنمائی کی سید ہمدانی کے کچھ جانثار ساتھی بلتستان بھی مامور ہوئے۔ جنہوں نے اپنے پیر بزرگوار سید علی ہمدانی کے نام نامی پر تبلیغ کا کام شروع کیا۔ خانقاہیں اور مساجد تعمیر کئے۔ اور خطاطوں نے قرآن پاک کی آیتیں جلی حروف میں تحریر کئے۔ شمالی علاقہ جات کی طرف تبلیغ کا یہ ابتدائی کام تھا جناب شاہ ہمدان کے مقلدین نے آپ کے نام کو مقبول عام بنایا۔ اور یہ نام لوگوں نے حرز جان بنایا۔ تاہم شاہ ہمدان کو خود بلتستان میں دین اسلام کی تبلیغ کا موقعہ نہیں ملا۔ البتہ آپ نے ترکستان آتے جاتے ہوئے درہ قراقرم کے راہگزر کو استعمال کیا۔ کشمیر میں آپ کا قیام بہت مختصر تھا۔

شمالی علاقہ جات میں اسلام کی اس تبلیغ کے آغاز سے پہلے بدھ مت شیومت۔ مجوسیت۔ بون۔ چھوس جیسے مذاہب کے ملغوبے۔ رواں دواں تھے۔ مظاہر پرستی عام تھی۔ لوگوں پر ارواح خبیثہ کا راج تھا۔ شجر چٹان جانور پرستی کے اعتقادات سے فضا مامور تھی۔ روشنی اور حرارت کے ماخذوں کا احترام کیا جاتا بادلوں گرہنوں بجلی کی چمک بادلوں کی گرگراہٹ زلزلوں اور تاریکیوں سے خوف زدہ رہا جاتا۔ پُراسرار دیوتاؤں کی نظریں مانی جاتیں۔ نیلے پتھروں اور چٹانوں کی پرستش کی جاتی بلتستان میں اسلام کی تبلیغ کا آغاز ہوتے ہی لوگوں کو فکری یکجائی ملی۔ اور انہیں گوناگوں مذہبی عقائد سے چھٹکارا ملا۔ اسلام نے اللہ کا ایک ارفع تصور دیا۔ اس لئے لوگوں کی ذہنی پراگندگیاں دور ہونے لگیں۔ اور وہ مختلف جھمیلوں سے باہر نکل آئے۔

کشمیر میں جب سید میر محمد کا تبلیغی مشن جاری تھا اور اسلام کشمیر کے اردگرد فروغ پا رہا تھا۔ اور تصوف کے چاروں سلسلے نقشبندیہ، قادریہ چشتیہ سہروردیہ برصغیر اور کشمیر میں قدم جمارہے تھے۔ ختلان میں تصوف کا ایک اور سلسلہ نوربخشیہ کی صورت میں ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ یہ سلسلہ جناب سید محمد نوربخش 1392ء تا 1464ء سے منسوب تھا۔ آپ کا سلسلہ 19 واسطوں سے امام علی رضا سے ملتا ہے۔ آپ کے مرشد جناب خواجہ اسحاق ختلانی تھے۔ سید محمد نوربخش فکر و سلوک کے اعلیٰ منازل پر فائز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مرشد یعنی خواجہ اسحاق ختلانی نے آپ کے ہاتھوں پر بیعت کی۔ اور اپنے مریدوں سے بھی ایسا کرنے کے لئے کہا۔ ختلان میں خواجہ اسحاق اور سید محمد نوربخش کے مریدوں کا زور تھا۔ اور اسی بناپر ختلان میں عملاً حکومتی اقتدار بھی ان کے ہاتھوں میں تھا۔ ان دنوں میں ایران شاہرخ مرزا فرزند امیر تیمور (1405ء تا 1448ء) کی حکمرانی تھی۔ شاہرخ مرزا کو ختلان کے واقعات قابل قبول

نہ تھے۔ لہذا اس نے اس طرف مامور اپنے ہاکم بایزید کو حکم دیا۔ کہ وہ صورت حال کو قابو میں لائے۔ چنانچہ بایزید کو آپ اور آپ کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ خواجہ اسحاق ختلانی اور ان کے بھائی شمس الدین اور ان کے کئی جانثاروں کو قید کے دوران شہید کیا گیا۔ تاہم جناب سید نور بخش کی جان بخشی کی گئی۔ لیکن آپ کو پابند سلاسل کیا گیا۔ 23-24 سال کا زمانہ کوئی کم وقت نہیں ہوتا۔ آپ اس پوری مدت کے دوران قید میں رہے۔ کبھی ہرات کبھی ختلان کبھی خوزستان کبھی گیلان کبھی خلخال میں قید وبند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ ان حالات میں آپ کو ایران سے باہر جانے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ شاہرخ مرزا کی وفات کے بعد۔ آپ رے میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور وہیں سے آپ نے نور بخشیہ سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت کے لئے کام جاری رکھا۔ آپ کے کشمیر یا بلتستان آمد کے بارے میں کوئی بنیادی طور پر کوئی ایک بھی مستند بات نہیں ملتی۔ یہ بات درست ہے کہ نور بخشیہ تصوف کو بہت پذیرائی ملی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند سید شاہ قاسم فیض نے مسند خلافت سے اپنے والد گرامی کا مشن جاری رکھا سلطان حسین مرزا والئی خراسان آپ کا معتقد تھا۔ اس سلسلے کے بڑے بڑے عالم شاعر نثار پیدا ہوئے۔ اس دوران میں جبکہ نور بخشیہ کی تحریک زوروں پر تھی سید شاہ قاسم کا شہرہ عام تھا۔ میر شمس الدین عراقی آپ کے حلقہ ارادات میں داخل ہو گئے۔ اور نور بخشیہ سلسلہ کو دل و جان سے قبول کیا۔ آپ حسین مرزا والئی خراسان کی فرمائش پر بطور سفیر کشمیر روانہ ہوئے۔ سلطان حسین مرزا بھی نور بخشی سلسلہ سے متاثر تھا۔ دراصل یہ سفارت مذہبی تبلیغی سفارت تھے۔ آپ 1487ء میں کشمیر وارد ہوئے جبکہ اس وقت کشمیر میں حسن شاہ (1475-87ء) کی حکمرانی کا دور تھا۔ آپ نے کشمیر میں 8 سال قیام کیا اور اس دوران چپکے چپکے مذہبی ماحول کا مطالعہ کیا۔ آپ ایک مشہور بزرگ جناب شیخ اسماعیل کبروی کے محفلوں میں جاتے اور وعظ و تلقین سے استفادہ کرتے۔ اس دوران آپ نے ان محفلوں کے ایک خوشہ چین بابا علی نجار کو اپنا معتقد بنا لیا۔ 1495ء میں آپ خراسان واپس ہوئے۔ لیکن جلد ہی سلطان حسن مرزا سے اختلاف کی بنا پر آپ کو خراسان سے جلاوطنی کا سامان کرنا پڑا۔ اور آپ کشمیر واپس آئے۔ ان دنوں کشمیر پر محمد شاہ 1493ء تا 1501ء کی حکمرانی تھی۔ سید محمد بیہقی مدارالمہام تھے۔ میر شمس الدین عراقی نے اپنے آپ کو سید محمد نور بخش کا خلیفہ قرار دیکر نور بخشیہ سلسلہ کی تبلیغ شروع کی۔ چونکہ کشمیر میں پہلی دفعہ کچھ اور فکری اسالیب منظر پر آرہے تھے۔ اور وہاں رائج فکر سے مختلف تھے۔ لہذا انہیں قابل قبول نہ سمجھا گیا۔ اس لئے وزیر اعظم

سید محمد بہیقی کے حکم پر آپ کو 1496ء میں سکردو جلاوطن کر دیا گیا۔ سکردو میں جناب سید علی ہمدانی کے ساتھیوں کی وجہ سے اسلام کچھ کچھ پھیل چکا تھا۔ اور آپ یعنی شاہ ہمدان کا نام لوگوں کے ورد زبان تھا۔ میر شمس الدین عراقی نے ہمدانی کی فکر پر اپنے فکری اسالیب کی بنیادیں جوڑنا شروع کیں۔ آپ کے ساتھ ایران سے پچاس مبلغین اور خاندان ساتھ آئے تھے۔ اور پھر آپ کو بلتستان میں تبلیغ کے لئے بڑا وقت ملا آپ تقریباً چھ سال تک یہاں مقیم رہے پورے بلتستان میں نور بخشیہ سلسلہ فکر کو بڑی پذیرائی ملی۔ اور یہ فکر بلتستان اور پوریگ میں دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔ چونکہ بلتستان میں ہمدانی فکر ابھی مستحکم نہ ہو پایا تھا۔ اور اس فکر کو پروان چڑھانے کے لئے۔ تسلسل سے کمک بھی نہ ملی تھی۔ اس لئے میر شمس الدین عراقی کو اپنی فکر کو لوگوں میں پختہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ چونکہ عراقی کی تبلیغ سید محمد نور بخش کے نام پر ہوئی اس لئے لوگوں کے ذہنوں پر شاہ ہمدان کے ساتھ ساتھ سید محمد نور بخش کا نام بھی ثبت ہوتا چلا گیا۔ یہ بات یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان دنوں گلگت، چلاس، ہنزہ، نگر، داریل و تانگیر اور استوار میں وہی معجون مرکب فکری اسالیب موجود تھے۔ جو محض کفر کا نمائندہ تھے۔ میر شمس الدین عراقی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے چند مبلغ گلگت بھی روانہ کئے۔ لیکن اس کی کوئی مستند شہادت موجود نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو گلگت میں بھی نور بخشی فکر کی کوئی بھی تاریخ مل جاتی۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ عراقی نے اپنی توجہ محض بلتستان اور پوریگ پر مرکوز کرر کھی۔

یہاں گلگت کے حوالے سے کچھ تاریخی واقعات کا تذکرہ یہ جاننے کے لئے ضروری ہے کہ دین متین کی ترویج کے لئے کب اقدامات سامنے آئے۔ 715ء تا 752ء کے دور میں کشمیر کا حکمران راجہ للتادت تھا۔ یہ کشمیر کا ایک نامور حکمران تھا۔ گلگت اس کی عملداری میں شامل تھا۔ راج ترنگنی میں اس دور میں کسی مقامی حکمران کا ذکر نہیں ملتا۔ تاہم یہاں کے بسنے والے داردوں کو مفسد۔ شر پسند اور مشرک فکر کے حامل لوگ کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ للتادت نے گلگت کو مفتوح کرتے ہوئے۔ سمر قند۔ تاشقند۔ خوقند۔ کاشغر۔ ختن۔ خطاء۔ خراسان۔ تبت ۔ وغیرہ علاقے بھی کشمیر کا حصہ بنادیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ گلگت میں مقیم رہا۔ وہ داردوں کی مسلسل شراب خوری کا نا قابل برداشت گردانتا۔

(بلور اینڈ دردستان صفحہ 13 جٹ مار)

کتاب حدود العالم کو کسی مسلمان جغرافیہ دان نے لکھا تاریخ فہمی کے لئے ایک

اہم سند مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب 83-982ء میں لکھی گئی۔ اس میں بلور کو ایک کفرستان قرار دیا گیا۔ صفحہ 39 آگے چل کر صاحب موصوف لکھتے ہیں۔ کہ بلور ایک وسیع علاقہ ہے۔ اس کا ایک راجہ ہے جو اپنے آپ کو سورج کا بیٹا کہتا ہے۔ اور وہ اس وقت تک نہیں جاگتا جب تک سورج طلوع نہیں ہوتا۔ اس کا کہنا ہے کہ باپ کے جاگنے تک بیٹے کو نہیں جاگنا چاہیے۔ وہ بلورین شاہ کے نام سے معروف ہے۔ اس ملک میں نمک نہیں ملتا اور یہ کشمیر سے منگوایا جاتا ہے صفحہ 121 ۔

علامہ ابوریحان البیرونی نے 1030ء کے بعد اپنی کتاب "کتاب الہند" مرتب کی۔ وہ محمود غزنوی کے دربار میں بلند مقام پر فائز تھا۔ اس نے محمود غزنوی کے ساتھ ہند کا سفر کیا۔ اور محمود کے کشمیر پر حملوں کے دوران کشمیر کے قرب وجواز سے گزرا۔ وہ اس علاقے کے بارے میں لکھتے ہیں۔ دریائے سندھ اٹک پہاڑوں سے جو ترکوں کی حدود میں نکلتا ہے اگر تم مدخل کی گھاٹیوں سے صحرا میں نکلو تو تمہارے بائیں طرف دو دن کی راہ پر بلور اور شمیلان ترکوں کے پہاڑ ہیں جو بھاٹادریان کہلاتے ہیں۔ ان کا بادشاہ بھوٹ شاہ ہے۔ ان کے شہر گلگت اسورہ۔ اور شلتاس ہیں۔ اور انکی زبان ترکی ہے۔ انکی لوٹ مار سے کشمیر مصیبت میں رہتا ہے۔" صفحہ 218 اردو ترجمہ کتاب الہند جٹ مار بھوٹ شاہ اور بلورین شاہ کو ایک ہی خیال کرتے ہیں۔ سر اورل سٹائین بھاٹادریان کی شناخت کو تبتین سے ملاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں بلور تبت کے زیر اثر تھا۔ سر اورل سٹائین کو بعد رد میں جب چلاس کے بھوٹ قبائل کے بارے میں۔ پتہ چلا تو یہ سوچنے لگے کہ کیا ان دونوں اصطلاحات میں کوئی تعلق بھی ہو سکتا ہے ؟

مارکوپولو نے بلور کو ایک ایسی جگہ بتایا جہاں وحشی کافر رہتے ہیں۔ اور وہ وحشی جانوروں کی کھالیں پہنتے ہیں۔ (سفر نامہ مارکوپولو) مارکوپولو (1324-1254ء) نے اپنے سفر نامہ کو 1310ء کے قریب زمانے میں مرتب کیا۔ اس کی قبلائی خاں کے دربار تک رسائی تھی۔ اور وہ چین جاتے ہوئے بلور کی سرحدوں سے گزرا تھا۔ شمالی علاقہ جات اور کشمیر کی تاریخ میں مرزا حیدر دوغلت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ مرزا حیدر دوغلت ایک فاتح، ایک حکمران، ایک تاریخ دان، ایک نامور منتظم کی حیثیت سے اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ خزاں 1528ء میں اس نے بلور پر والئی کاشغر کے حکم پر محض اس لئے حملہ کیا تھا کہ یہ علاقہ ایک کفرستان ہے۔ میں اس سلسلہ میں آگے تفصیلا حالات رقم کر چکا ہوں۔ ان کے کہنے کے مطابق یہاں ایک متنفس بھی اسلام کا نام لیوانہ تھا۔ وہ بہار 1529ء میں کاشغر واپس ہوا اس سے پہلے سلطان

شہاب الدین غازی (78-1360ء) نے جو کشمیر کا ایک عظیم حکمران ہو گزرا ہے۔ اور جس نے شمال کی طرف بشمول گلگت بہت سے علاقے فتح کئے تھے۔ یہاں کسی اسلام کا ذکر نہیں کرتے۔ اس طرح 1411ء میں جب سکندر بت یشکن گلگت کو پامال کرتے ہوئے۔ بدخشاں پر حملہ آور ہوا۔ یہ علاقے کفر کی تاریکیوں میں پڑے تھے۔

ادھر 1501ء میں کشمیر ایک اور انقلاب سے دوچار ہوا سید محمد بیہقی وزیر اعظم کشمیر ملکی خانہ جنگیوں میں مارا گیا۔ سلطان فتح شاہ (1514-1501ء) دوسری بار تخت سلطنت پر متمکن ہوگئے۔ اس نے موسیٰ رینہ کو اپنا وزیر اعظم منتخب کیا۔ جو عراقی کا ایک معتقد تھا۔ موسیٰ رینہ نے عراقی کو سکردو سے واپس بلا بھیجا۔ اور کشمیر میں اسکی تبلیغی سرگرمیوں کو مستحکم کرنے کے لئے ایک خانقاہ بھی تعمیر کروا ڈالی۔ یہ خانقاہ میر عراقی کے نام سے منصۂ شہود پر آئی۔ اب کشمیر میں فکری اختلاف عیاں تھا۔ خانقاہ شاہ ہمدان اور خانقاہ میر عراقی ایک دوسرے کا ضد بنے ہوئے تھے۔ یہاں مسلمانوں کے درمیان شیعہ سنی یا سنی نور بخشیہ کے نام سے اختلافات نہیں تھے۔ بلکہ کچھ اہم فکری امور پر اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے پر فتویٰ بازی کر رہے تھے۔ انہیں اختلافات کی وجہ سے میر شمس الدین عراقی کو سکردو جلاوطن ہونا پڑا تھا اب جب وہ اقتدار کے قریب تھے۔ تو مخالف فریق کو بھی مشکلات کا سامنا ہوا۔ 1517ء میں محمد شاہ (1527-1517ء) پھر سے کشمیر کا حکمران مقرر ہوا۔ جس نے کاجی چک کو اپنا وزیر سلطنت مقرر کیا۔ یہ شخص بھی عراقی کا معتقد تھا۔ لہذا عراقی نے 1526ء یعنی وفات تک کھلے عام اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

کشمیر کی زمین انقلابات کا گڑھ رہی غیر مستحکم حکومتیں سازشیں ادھر ادھر سے مختلف نظریات کے حامل نفوس کی آمد و رفت اور مفادات نے اس زمین کو مسلسل ہل چل میں رکھا۔ اس میں فکری اختلافات نے اپنا کام کر دکھایا۔ کشمیر میں 1540ء میں جو بڑا انقلاب آیا وہ مرزا حیدر دوغلت کا کشمیر کا اقتدار حاصل کرنا تھا۔ 1540ء میں کچھ مقامی سربر آوردہ اصحاب کی شہ پا کر اور ہمایوں بادشاہ دہلی کی تائید و حمایت سے مرزا حیدر دوغلت کشمیر پر قابض ہوا۔ نازک شاہ برائے نام حکمران تھا۔ کشمیر میں فکری اختلافات موجود تھے۔ اب کشمیر کے سنی اور اہل ہنود شاداں و فرحاں تھے۔ کہ ان کے مظالم چھٹ گئے۔ مرزا حیدر نے بطور حکمران کئی اچھے کام کئے لیکن جہاں تک اس کی مذہبی پالیسی کا تعلق ہے وہ کسی لحاظ سے اس کے شایان شان نہ تھی۔

کشمیر میں نور بخشیہ خیالات رکھنے والے اصحاب پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔

کتاب احوط ایک نسخہ ہمایوں کو بھی پیش کر دیا گیا تھا۔ علمائے ہند بشمول ہمایوں ان نظریات کو اسلام کے بنیادی نظریات سے متصادم سمجھتے تھے۔ ہمایوں مرزا حیدر دوغلت کے ساتھ اصلاح احوال کے لئے کشمیر جانے پر آمادہ تھا۔ لیکن شیر شاہ سوری کے ساتھ جنگ کی وجہ سے وہ ایسانہ کر سکا۔ مرزا حیدر واضح طور پر شمال کی طرف موجود نور بخشی نظریات اور کشمیر میں موجود نظریات میں واضح فرق پاتا تھا۔ محمد دین فوق اپنی تاریخ صفحہ 420 میں لکھتے ہیں۔ کہ مرزا کو یہ خیال تھا۔ کہ کشمیر کی ابتری حال کا اصل سبب یہی فکری اختلافات ہے۔ جسے میر شمس الدین نے پیش کیا۔ اور جب تک اس فکر کا صفایانہ کر دیا جائے۔ کشمیر میں امن متوقع نہیں۔ وہ اس مذہب کے استحصال پر آمادہ ہوا۔ مرزا نے عراقی کے معتقدین میں اسقدر خوف وہراس پیدا کیا کہ لوگ زیرزمین چلے گئے۔ انہوں نے اپنے مذہب کو چھپایا اس طرح نور بخشیہ پر ضرب کاری لگی۔ خانقاہ میر شمس الدین جو زڈی بل میں واقع تھی۔ جلا کر راکھ کر دی گئی۔ بابا علی نجار کو قتل کر دیا گیا۔ قاضی میر علی کو جلاوطن کر کے اس کے گھربار کو لوٹ لیا گیا۔ میر صاحب کے بڑے فرزند میر دانیال کو اسکردو سے کشمیر لا کر قتل کر دیا گیا۔ بطور حکمران رعایا کے ساتھ اس کا یہ سلوک ناروا تھا۔ آہستہ آہستہ بحیثیت مجموعی اس کے اقدامات سے تمام رعایا متنفر ہو گئی۔ اور آخر وہ بھی عوامی انتقام کا شکار ہوا۔ اور وہ 1550ء میں خان پور کی لڑائی میں مارا گیا۔

ادھر کشمیر میں نور بخشیوں کی فکری نظریات پر ضرب کاری لگ رہی تھی۔ ادھر ایران میں حکومت کی تبدیلی کے ساتھ مذہبی ماحول میں تغیر رونما ہو رہا تھا ایران میں خاندان صوفیہ کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ 1510ء میں شاہ اسماعیل کو ایران کی حکومت حاصل ہوئی۔ آپ سید صفی الدین اردبیلی کی اولاد میں سے تھے۔ ایران پر اس خاندان کی حکومت 1510ء سے 1736ء تک یعنی دوسو چھبیس سال تک قائم رہی۔ اور اسی حکمرانی کے دور میں نہ صرف ایران میں بلکہ اردگرد متصل علاقوں میں بھی شیعی فکر کو فروغ ملا۔ شاہ اسماعیل کی حکمرانی کا دور 1510ء تا 1524ء ہے۔ اس دور میں اور دنیا میں پہلی بار شیعہ مذہب سرکاری مذہب قرار پایا۔ صفوی حکمرانوں نے اس مذہب کی ترقی و ترویج کے لئے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ شاہ اسماعیل 38 سال کی عمر میں 1524ء میں فوت ہوا۔ آپ نے ہی آزاد ایرانی حکومت قائم کی آپ نے ہی دنیا میں موقع محل کے مطابق اردگرد تبلیغی مشن روانہ کئے۔ ان ہی بنیادوں پر شاہ طہماسپ 1524ء تا 1547 شاہ عباس اعظم 1578ء تا 1629ء اور دیگر حکمرانوں نے بھی 1737ء تک جدوجہد کی۔

تاہم صفویوں کی دور حکمرانی میں شاہ اسماعیل شاہ محمد خدا بندہ 1574ء تا 1578ء تا 1578 نے اہل سنت والجماعت کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس حوالے سے شیخ محمد اکرم رودِ کوثر میں لکھتے ہیں۔ ''ہمایوں کے بعد شیعہ حضرات کی ایک کثیر تعداد ایران سے اس زمانے میں آئی جب وہاں 1576ء میں شاہ اسماعیل ثانی نے اہل سنت والجماعت کا طریقہ اختیار کر لیا۔ اور سنی عقائد کے عارضی فروغ کے دوران میں برگزیدہ شیعہ علماء اور اکابرین پر سختی شروع ہوئی تو شیعوں نے ہندوستان کی طرف نقل مکان شروع کی''

ادھر کشمیر میں 1551ء میں چک حکمران ہوئے۔ ان کی کشمیر میں حکمرانی کا دور تقریباً اکتیس سال بنتا ہے۔ ایران کے صفویوں اور کشمیر کے چکوں نے کھُل کر شیعی فکر کو پروان چڑھانے میں تگ و دو کی۔ صفویوں نے نور بخشیوں پر قدغنیں لگا دیں۔ ایران کے شاہ طہماسپ نے نور بخشیوں کے خلیفہ شاہ بہاؤالدولہ کو اسیری میں ڈالا جہاں اسیری کے دوران ہی اس کی وفات ہوئی۔ صفویوں کی مخالفت کے نتیجہ میں یہ مذہب تیزی سے روبہ زوال ہوا اور مرکزی رہنمائیوں سے محروم ہو کر یہ ایران سے معدوم ہوتا چلا گیا۔ یہ شاہ طہماسپ وہی ہیں۔ جس نے شیر شاہ سوری کے خلاف ہمایوں کو ایرانی افواج کی مدد دی تھی۔ اور جس کے بل بوتے پر ہمایوں تخت دہلی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔

1551ء میں دولت چک کو کشمیر کا برائے نام سا اقتدار حاصل تھا۔ تاہم 1551ء سے 1554 تک اُس نے سلطان اسماعیل شاہ دوم کے وساطت ایک مقتدر حکمران کی حیثیت سے حکومتی فرائض سر انجام دئے۔ آپ نے حکم دے رکھا تھا کہ مسجدوں میں بارہ اماموں کا خطبہ پڑھایا جائے۔ آپ نے ہی زڈی بل میں عراقی کی قبر از سر نو تعمیر کروائی۔ بابا علی نجار اور میر دانیال کی یاد میں نئی قبریں بنوائیں۔ دولت چک نے بلتستان فتح کر کے کشمیر کا حصہ بنا دیا تھا۔ 1554ء میں غازی چک کشمیر کا پہلا باقاعدہ چک حکمران ہوا۔ آپ نے 1560ء کے قریب گلگت پر ایک فوجی مہم روانہ کی تھی۔ اُسے اس مہم میں کامیابی ہوئی اور گلگت سلطنت کشمیر کا حصہ بنا۔ غازی چک مذہبی تبلیغی کا داعی تھا۔ اُدھر ایران کے صفوی بھی ایسی ہی تبلیغ کے داعی تھے۔ یوں کشمیر اور ایران کا قریبی تبلیغی رشتہ قائم ہوا۔ اس دور میں ایران سے علماء فضلاء، شیوخ، اور سیدوں کے جتھے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ ایران سے کشمیر کو توانائی بہم پہنچتی رہی۔ نور بخشیوں کی ترقی رُک گئی۔ کشمیر وہ شیعہ صفوں میں مدغم ہوتے گئے۔ اور جو بلتستان گئے اُنھوں نے اپنی شناخت کسی حد تک قائم رکھی۔

1424ء کے بعد ایران سے کشمیر یا شمالی علاقہ جات میں جو بھی مبلغین آئے۔ وہ فقہ جعفریہ کے علمبردار تھے۔ انہیں سرکاری حمایت بھی حاصل تھی۔ وزیر حشمت اللہ لکھتے ہیں۔ ریگو پمبر یعنی ابراہیم کے عہد میں دو بھائی سید ناصر طوسی سید علی براہ نالہ سلترہ تھفس وارد ہوئے۔ ان بھائیوں نے سید محمد نور بخش کے مذہب کو خوب ترقی دی۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کا کہنا ہے۔ کہ راجہ ریگو پمبر (1590ء تا1600ء) کے عہد میں دو بھائی سید ناصر طوسی اور سید علی طوسی نالہ سلترو کے راستہ تھفس آئے۔ یہ دونو نور بخش کے پیرو تھے۔ حمید خاور لکھتے ہیں۔ کہ گیارہویں صدی میں ایران و خراسان میں نور بخشیوں کی موجودگی کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے لامحالہ یہ دونوں بزرگ اہل تشیع ہونگے۔ میں نے اگلی سطور میں تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ کہ 1524ء کے بعد ایران میں نور بخشیوں کو سخت مزاحمت کا سامنا تھا۔ ان کے خلیفہ قید ہو چکے تھے۔ نور بخش تحریک کے بزرگ مشکل حالات سے دوچار ہو کر ہتھیار ڈال رہے تھے۔ اس لئے ایران و عراق اور خراسان سے باہر ان کی تحریک بھی دم توڑ چکی تھی۔ راجہ ریگو پمبر یعنی ابراہیم (1590ء تا1600ء) کے زمانے میں یا اس کے بعد بلتستان میں جو بھی مبلغ آئے وہ شیعہ فکر کے حامل تھے۔

چنانچہ طوس (ایران) سے آنے والے سید ناصر اور سید علی برادران کے شیعہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ پھر راجہ اعظم خان کے دور حکومت (1745ء تا1780ء) میں شگر میں ترکستان سے جو دو بھائی سید یحیٰ اور سید مختار تشریف لائے وہ بھی شیعہ تھے۔ اس طرح 1715ء تا1763ء سید عارف اور سید ابو سعید برادران کشمیر یا بلتستان آئے۔ انھوں نے بھی شیعہ مذہب تبلیغ کی شگھو اور دراس کی طرف تلیل اور گریز کی طرف آنے والے علماء نے حنفی مذہب کی تبلیغ کی۔ اسی طرح کشمیری اور یارقندی تاجروں کے توسط سے لداخ کی طرف حنفی لوگ بھی پھیلتے گئے۔ پدم (زانسکا) اور سورُو میں سنی زیادہ ہیں۔ تو اُس کی یہی وجہ ہے چکوں کے بعد کشمیر کی طرف سے آنے والے زیادہ تر علماء سنی فکر کے پرچارک تھے۔

گلگت میں میرے نزدیک اسلام بہت دیر بعد آیا ہے۔ یہاں کی قدیم تاریخ مبہم ہے۔ تاریخ کو سمجھنے کے لئے یہ زمین تاریخی وسائل سے قطعی طور پر محروم رہی ہے۔ یہ علاقہ خود شروع سے جنگ و جدل کا گڑھ رہا۔ یہاں زندگی کو قرار نہ تھا۔ جن قدیم مستند تواریخ میں باور، دردستان کے بارے میں اشارے ملے ہیں۔ وہ اُن افسانوی کہانیوں سے لگا نہیں کھاتے جو 1987ء کے بعد منظر عام پر آئے۔ تاریخ انسانیت کی باہمی جوڑ اور پیوند کی کہانی ہے۔ اور یہ

کہانیاں ایک دوسرے کے قریب سے گزرتی ہیں۔ قریب اور متصل علاقوں میں تضادات واقعات کو مشکوک اور نا قابل اعتبار بنا دیتے ہیں۔ ان حالات میں تاریخ نویسی موازناتی تاریخ کی سمجھ کے بغیر کوئی وقت نہیں رکھتی۔ گلگت، ہنزہ، چترال کی تاریخ میں سنین، واقعات اور شخصیات کے نام محض قیاسات کی پیداوار ہیں۔ یہ جدید تاریخ نویسی کے اصولوں سے لگا نہیں کھاتے۔ یہی وجہ ہے گم نام زمانوں کو تسلسل دینے اور واقعات میں ربط پیدا کرنے کے لئے اشخاص کے نام وضع کیے گئے ہیں۔ اور بعض بعض موقعوں پر انسانوں کی عمریں اور حکومت کے سالوں کو عمر خضر سے جوڑا گیا ہے۔ پھر یہ علاقہ مرکزی علمی، تمدنی اور ثقافتی مرکزوں سے کنارہ رہنے کی وجہ سے غرائب کا شکار رہا۔ اور یوں اس پر تاریکیوں کے دبیز پردے پڑے رہے ہیں۔ مافوق الفطرت پراسرار کہانیوں سے آراستہ، کیسر، آدم خور اور دیوزاد شری بدد یا یہاں کے دیوا کو (دیوزاد) حکمران محض افسانویت کے علمبردار ہیں۔ ان افسانوں کو سردی کی لمبی راتیں گزارنے اور لوگوں کے دلوں میں دیوزاد حکمرانوں کے لئے احترام پیدا کرنے کے لئے تراشے گئے ہیں۔ تاریخ گلگت داستانِ امیر حمزہ، الف لیلہ، قصہ حاتم طائی وغیرہ سے زیادہ متاثر ہے۔ اس میں بیشتر ایسے واقعات مندرج ہیں۔ جو اِن داستانوں سے ماخوذ ہیں۔ اور یہی کتابیں ان علاقوں میں مقبول عالم رہی ہیں۔

بہر حال اس زمین کے بارے میں موازناتی تاریخ سے جستہ جستہ جو بھی واقعات ملتے ہیں اس سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ یہاں اسلام 1529ء کے بعد ظہور میں آیا۔ میں نے سابقہ ابواب میں تاج مغل کا ذکر کیا ہے۔ کہ کس طرح اور کب اُس نے یہاں اسلام کی تبلیغ کی۔ پروفیسر احمد دانی شعبہ امور ترکستان کے ماہر ہیں۔ وہ میری رائے سے متفق ہیں کہ بدخشان یا ارد گرد اس نام کا کوئی اسماعیلی حکمران موجود نہ تھا۔ وہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ منگول اُس وقت یعنی اُس وقت 1214ء کے قریب زمانے میں مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے تاج مغل کوئی اسماعیلی نہیں ہو سکتا۔ لیکن پروفیسر دانی کی یہ بات درست نہیں کیونکہ پیر ناصر خسرو 1060ء سے یمگان میں مقیم تھے۔ اور بدخشان، واخان، روسی ترکستان کے کچھ علاقوں میں اسماعیلی فکر ارزاں تھا۔ ہاں البتہ مشرقی ترکستان میں چغتائی منگولوں نے 1369ء میں ہی اسلام قبول کیا تھا۔ میرا نقطۂ نظر محض یہ ہے کہ گلگت میں اسماعیلی یا کوئی اور مذہب 1529ء سے پہلے نہیں پھیلا تھا۔ اس کے لئے واضح اسناد موجود ہیں۔ اور جن کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ جہاں تک جوٹیال کی مغلائی شکار کا ذکر ہے کہ اسے تاج

مغل نے اپنی فتح کی یاد منانے کے لئے ایستادہ کیا تھا۔ کسی طرح درست نہیں۔ اس لئے ماہرین آثارِ قدیمہ (بشمول پروفیسر دانی) کی متفقہ رائے ہے کہ تھول، ہنزل اور جوٹیال کے یہ مینار بدھ سٹوپہ ہیں۔

کارل جٹ مار "علم الانساب اور دردستان" کے مقالہ میں لکھتے ہیں۔ شمال مغرب کی طرف ہنزہ (شامل کرکے) بدخشان میں بھی بلاامتیاز سارے لوگ اسماعیلی ہیں۔ اُن کے مبلغ شاید پہلے آئے ہوں۔ نگر اور گلگت کے مشرق کی طرف شیعت غالب ہے۔ یہ کشمیر اور بلتی راجاؤں کے اثر نفوذ کی وجہ سے ہے۔ یہ سولھویں اور سترھویں عیسوی کے واقعات ہیں۔ گلگت استوار، چلاس اور درایل و تانگیر کی طرف اسلام کی آمد اور دین متین کے عقائد علمدار آمد کے حوالے سے ہمیں بہت دور ماضی میں جانا نہیں پڑتا۔ جس ملک میں اسلام 725ء میں آیا ہو اور اس دین کو مستحکم کرنے کے لئے بزرگانِ دین نے یہاں ڈیرے ڈالے ہوں اور بزرگانِ دین باہر سے مسلسل آتے رہے ہوں۔ ہمارے حکمران صوم صلوٰۃ کے پابند، تہجد گزار، پارسائی میں یکتا رہے ہوں، کیا یہ امر تعجب خیز نہیں کہ یہاں انیسویں صدی کے نصف میں وسط تک انتہائی جاہلانہ اور کافرانہ طریقے رواں دواں تھے۔ مثلاً

(1) چراغ تربت جلانے کا طریقہ جو ابھی بہت تھوڑا عرصہ ہوا ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ مجوسی دور کی بقایات میں سے تھا۔

(2) سورج گرہن اور چاند گرہن کے عقائد کے گراں (گہن) ایک عظیم الجثہ جن تھا۔ جو چاند پر اُس کی خوبصورتی کی وجہ سے لپٹ جاتا لیکن جب سورج چھا جاتا تو اُس کی وجہ سے دنیا سے اچھے راجاؤں کی جدائی ہوتی اور گراں اپنا غصہ جتانے کے لئے سورج پر حاوی ہو جاتا۔

(3) چند سال آگے زلزلوں کے بارے میں یہاں کے لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ زمین ایک بڑے بیل کے سینگوں پر کھڑی ہے۔ اور جب یہ بیل اپنا سر جھٹکتا ہے تو زمین جنبش کرتی ہے۔

(4) گلگت میں بہت قریب زمانے تک جگہ جگہ نیلوبٹ (نیلا پتھر) کو احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا اور کسی حد تک اس کی پرستش کی جاتی۔ اس کی بنیادی وجہ گلگتی راجاؤں کا نیلے پتھر کا احترام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گلگت کے موجودہ ڈاکخانہ کے سامنے ایک نیلے رنگ کی بڑی چٹان تھی جس پر راجے بیٹھا کرتے اور راجگی کی

تبدیلی کے وقت اس چٹان پر انتقال اقتدار کی رسم ادا کی جاتی۔ راجے چٹان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ جاتے اور آداب بجالاتے۔ اس کے بغیر ان کے سر پر تاج نہ رکھ دیا جاتا۔

میرے رشتہ داروں میں ایک گھرانا ایسا تھا۔ جو 1900ء کے دوران میں بھی اپنے کھیت میں نصب ایک نیلے پتھر کی پرستش کرتے تھے۔

(5) داریل و چلاس کی طرف بہت دیر بعد تک دیوتاؤں کی پرستش کا سلسلہ موجود تھا۔ ہر وادی میں تحفظ کے دیوتا موجود تھے۔ گور کے دیوتا کا نام تائبان، چلاس کے دیوتا کا نام ناران تھا۔

(6) چلی اور چلغورہ کے درختوں کو مقدس اشجار کا درجہ حاصل تھا۔

(7) 1900ء سے ذرا پہلے تک یہاں دیواکوز (دیوزاد مخلوق) کا راج تھا۔

(8) اگر کوئی شکاری ایک سو سے زیادہ جانوروں کا شکار کرتا تو وہ اپنی پری سے شادی رچاتا۔ اس حوالے سے 1900ء سے ذرا پہلے یہاں انسانوں میں پری زاد ملنے کی باتیں عام تھیں۔

(9) یہاں ایسی لوک کہانیاں تھیں کہ اگر کسی انسان یا جانور کی ہڈیاں یکجا کی جاتی تو وہ جانور اس ڈھانچے سے دوبارہ جی اُٹھتا تھا۔ یہی خیالات کالیسا میں بھی موجود تھے۔ میں نے اپنے قصہ گوؤں سے ایسی کئی داستانیں سنیں۔

(10) 1900ء تک زمانے میں یہاں یاں چھولو (ایک بونا مخلوق) انسانوں کے ساتھ ساتھ آباد تھے۔ وہ انسانوں کے ساتھ رہتے بستے کھاتے پیتے۔ یہ انسانوں کے گھروں سے چاول، آٹا اور دیگر کھانے پینے کی چیزیں چراتے اور اپنی گزر بسر کرتے۔ سردیوں کی لمبی اور تاریک راتوں میں دھان کوٹنے کی آوازیں آتیں اور یاں چھالوا اپنے خوراک کے ذخیرے تیار کرتے۔

(11) انیسویں صدی کے ابتدائی ایام تک یہاں ارواح خبیثہ کا راج تھا۔ یہاں کے لوگ اپنی حاجتوں کے حصول کے بارے میں ایسے اعمال سرانجام دیتے جو اسلام کے قطعی منافی ہوتے۔

(12) منتر، دیو، ٹوٹکے، دھوبن، رھٹس، پشو، کالے، بچھ، بچھانی، شوشولی، گورفہ چھن، سارپودیواکوروٹین مٹو، روئیں وغیرہ غرض قسم قسم کی مخلوقات

چند سالوں پہلے تک یہاں آباد تھی۔ لیکن آج یہ زمانہ ان تمام خرافات سے خالی ہے۔ وہ جہالت کادور تھا۔ اور موجودہ زمانہ علم اورباخبری کادور ہے۔

(13) 1893-94ء کی بندوبست کے دوران محکمہ بندوبست نے جو شجرے تیار کیے اُن میں بیشتر نام ایسے ہیں جو اسلامی خصوصیات سے محروم ہیں۔ مثلاً ہری، تھم، ہری سنگھ، جوار سنگھ، جوار خاتون، چھمار نگھ، یہال سنگھ، شلی بائی، کپوری، شلی مار، اُچل، گرگ چند، راجرو، وتشو، سکرو(وکرم)، دم سنگھ، درمو(درم ماتر)، چو، (ہیم چند)، لوتھنو(لو تھن)وغیرہ اس طرح 1915-16ء کی بندوبست کے شجروں میں بھی کئی نام ایسے ملتے ہیں جو ہندوانہ دور کی یاد دِلاتے ہیں۔

(14) بڈلف کے مطابق شن لوگوں کے نام کے آخر میں عموماً سنگھ آتارہاہے۔ وہ اسلام قبول کرنے کے باوجود ایسے نام رکھنے سے باز نہیں آئے۔ شنوں کے نام جو اب بھی مستعمل ملے ہیں وہ ہیں۔ مُوسنگھ، کموسنگھ، مل سنگھ، دم سنگھ، حنا سنگھ، حب سنگھ، گی سنگھ، چمار سنگھ، بُنیال سنگھ، گل سنگھ، ارام سنگھ، پونیار سنگھ، سنگھو، ڈینگو، شلی بنائی، شولی لی، شوشہ بائی، سوکومل، لی لی، بائی، روزی بائی، شرمل۔ صفحہ 45

یشکن اپنے نام جانوروں اور دیگر اشیاء کے حوالے سے رکھتے ہیں۔ مثلاً ژکونی، شوں، چوتو، برائی، کارٹو، بدلو، گرگس، ٹون کر، گوکو، قطرو، بوسیرو وغیرہ۔ 1915ء کی بندوبست میں بھی کچھ ناموں کے ساتھ سنگھ ملتاہے۔

یہاں کے لوگ اوّل دوم بندوبستوں کے درمیان بھی عجیب وغریب قابل شرک ہندوانہ رسوم اداکرتے تھے۔

(15) کچھ عرصہ پہلے تک دیاسر کی طرف بعض لوگ اپنے آپ کو پریوں کی اولاد گردانتے

(16) 1800ء تک کے مستعمل زمانے میں بعض لوگ مردے جلایا کرتے تھے۔ ان حالات میں یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ ہماری طرف اسلام بہت دیر بعد آیا۔ اسلامی تبلیغ کے دوران بعض اقوام نے بزرگان دین سے اسلام قبول کرتے ہوئے بڑی مزاحمت کی، ان میں شین اقوام سرفہرست تھے۔ بزرگوں نے اُن کی ہٹ کے پیش نظر انہیں اولادِ ابو جہل قرار دیا تھا۔

ہمارے علاقے میں اسلام تین اطراف سے آیا۔

(1) شمال کی طرف سے (بدخشاں) جو بزرگان دین آئے اور آتے رہے اُن میں اسماعیلی فکر رکھنے والے بزرگان تھے۔

(2) مشرق کی طرف سے (بلتستان) جو بزرگان آئے وہ مذہب شیعہ کے علمبردار تھے۔

(3) جنوب کی طرف سے (سوات، ہزارہ) جو اولیا کرام مبلغین کی حیثیت سے آئے وہ اہلِ سنت الجماعت کے داعی تھے۔

شمال کی طرف سے پہلا داعی تاج مغل تھا۔ جس کے بارے میں پہلے لکھا جا چکا ہے۔ تاج مغل کا پھیلایا اسماعیلی مذہب گلگت میں دیرپا ثابت ہوا۔ شیعیت کی تبلیغ کے ساتھ یہ شمال کی طرف محدود ہو کر رہا۔ تاہم اسکومن، گوپس، یاسین، پونیال علاقوں میں مبلغین کی مدد آتی رہی اور یہاں یہ مذہب پھل پھولتا رہا۔ ہنزہ کی طرف شروع میں مذہب شیعہ کی تبلیغ ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں بدخشاں کے داعیوں کی تبلیغ سے تشیع فکر آہستہ آہستہ کمزور پڑتا گیا۔ یہاں تک کہ 1850ء کے بعد ہنزہ میں مذہب اسماعیلیہ کا پورا زور تھا۔

ہنزہ میں اسماعیلیت قبول کرنے والا پہلا شخص میر سلیم خان ثانی تھے۔ جس نے 1815ء کے قریب زمانے میں داخان میں اپنی جلاوطنی کے دوران سید شاہ اردبیل کے ہاتھوں پر بیعت کر کے اس مذہب کو اختیار کیا۔ آپ 1821ء کے قریب ہنزہ واپس آئے اور یہاں امارت بھی حاصل کی۔ اُس وقت ہنزہ کی آبادی مذہب اثنا عشری کی پیروکار تھی۔ میر سلیم خان ثانی کے بعد اُس کا لڑکا میر غضنفر علی خان تخت امارت پر متمکن ہوا۔ اُس وقت شاہی گھرانا اور اُس کے متعلقین مذہب اسماعیلیت کے پیروکار تھے۔ سید حسین شاہ اردبیل تبلیغ کی غرض سے میر غضنفر کے شاہی محل میں موجود تو تھا۔ لیکن بعض غلط فہمیوں کی بنا پر اُسے تبلیغ عام کا موقعہ میسر نہ آسکا۔ اور اُسے بدخشاں لوٹنا پڑا۔ گنش کو چھوڑ کر مرکزی ہنزہ میں اسماعیلیت کی تبلیغ عام کا شہرا سید یاقوت شاہ ابن سید شاہ عبدالرحیم کے سر سجتا ہے جس نے چند دنوں کی محنت سے مرکزی ہنزہ کے عوام کو مذہب اسماعیلیہ میں داخل کیا۔ حاجی قدرت اللہ کا کہنا ہے کہ وہ گوجال کی طرف سریقول اور ترکستان میں خواجہ شاہ طالب، خواجہ شہدا اور مرزا اسماعیل کی تبلیغ سے لوگوں نے اسماعیلیت قبول کی۔ جبکہ شناکی کی طرف سید شاہ عبدالحمید ابن سید پرتو شاہ کی تبلیغ سے لوگوں نے مذہب اسماعیلیہ اختیار کیا۔ یہ میر غزن کی حکمرانی کا دور تھا۔

پونیال یاسین، گوپس اور اشکومن میں سید کرم علی شاہ اور اس کی اولاد نے تبلیغی فرائض سرانجام دیئے۔ اور بالائی پولیٹکل اضلاع میں اسماعیلیت کو فروغ دیا۔ عبدالحمید خاور کا خیال ہے کہ اس طرف اسماعیلیت کی فروغ سے پہلے یاسین، پونیال کی طرف سارے لوگ اہل تشیع تھے جنھوں اسماعیلی داعیوں بشمول شاہ سید اکبر نے مذہب اسماعیلیہ میں داخل کیا۔ میرے خیال میں صورت حال بالکل ایسی نہ تھی۔ یہ علاقے بدخشاں، پامیر، واخان کے متصل ہونیکی وجہ سے اور پھر تاج مغل اور اس کے قدیم مبلغین اور ان کے متعلقین کے وساطت جو اس طرف آباد ہوگئے تھے، مذہب اسماعیلیہ کی طرف راغب تھے۔ لہٰذا اس طرف اس مذہب کے اختیار کرنے میں لوگوں نے زیادہ تردد نہیں کیا۔

بلتستان میں مذہبی تغیرات کے حوالے سے کافی تفصیلات پچھلی سطور میں پیش کر دی گئی ہیں۔ 1526ء میں میر شمس الدین عراقی کی وفات کے بعد بلتستان اور کشمیر میں مذہبی تبلیغ نے ایک بڑا پلٹا کھایا۔ ایران میں صفویوں اور کشمیریوں میں چکوں کی شعیت کی فروغ کے لئے کوشش بڑی کارآمد ثابت ہوئیں۔ بلتستان میں سکرو، شگر اور روندو مراکز سے بزرگان نے مذہب اثنا عشریہ کی تبلیغ کے لئے مشن اِدھر اُدھر روانہ کیے۔ شگر/ہسپر، روندو اشنگوس کے راستوں سے بزرگانِ مذہب شیعہ نے رابطے شروع کیے۔ پروفیسر دانی اپنے مقالہ فوکس آن نارون ایریاز مورخہ 5/9/90 مسلم اخبار میں لکھتے ہیں کہ گلگت میں اسلام کی تبلیغ کی غرض سے چھ مبلغ آئے تھے۔ وہ اس سلسلہ میں کسی تاریخ کا تعین تو نہیں کرتے لیکن اتنا کہتے ہیں کہ یہ مبلغ میر عراقی کے پیروکار تھے۔ اور پھر کہتے ہیں کہ انہیں میر شمس الدین عراقی نے سولھویں صدی کے وسط میں اکبر اعظم کے دور حکومت سے ذرا پہلے تبلیغ کے لئے گلگت بھیجا تھا۔ ان چھ مبلغین میں وہ درج ذیل بزرگ شامل کرتے ہیں۔

1۔ سید سلطان ولی امپھری والا بزرگ۔
2۔ ہائی سکول گلگت کے متصل قبرستان میں مدفون دو بزرگان۔
3۔ پولیس اسٹیشن کے پیچھے والے بزرگ (چائینا ٹریڈ کیساتھ)
4۔ دینور والے بزرگ۔
5۔ کشمیری بازار کے پیچھے مدفون بزرگ۔

یہ بزرگان راہ ہسپر شگر سے گلگت آئے تھے۔ پروفیسر دانی امپھری والے بزرگ کا نام سید سلطان ولی بتاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ انہیں میر شمس الدین عراقی نے گلگت بھیجا تھا۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سید سلطان ولی شیعہ فکر کے حامل بزرگ تھے۔ وزیر غلام حیدر نے کشمیری کاریگروں کی مدد سے ان کا قبرستان تعمیر کروایا تھا۔ ہائی سکول کے ساتھ واقع دونوں قبروں کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ یہاں کون لوگ دفن ہیں۔ پروفیسر دانی دینور کے مقبرہ کے مکین کا نام سید سلطان عارف بتاتے ہیں۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بزرگ بھی شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ چار پانچ نسلوں (اس حساب سے تقریباً 1840ء کا زمانہ بنتا ہے۔) سے یہاں ارد گرد مجاوروں نے اپنے مکان بنا کر رہنا شروع کیا۔ 1940ء میں گچ کے سید عباس ولد سید علی نے اس مقبرہ کو از سر نو تعمیر کروایا تھا۔ میں پروفیسر دانی کے اس خیال سے متفق نہیں کہ ان بزرگان کو شمس الدین عراقی نے روانہ کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ 1526ء میں فوت ہو گئے تھے۔ پروفیسر دانی کی باتیں۔ حالات واقعات سے بہت بعد کی ہیں۔

پروفیسر دانی اپنے اسی مقالہ میں سید شاہ ولی کا الگ سے تبصرہ کرتے ہیں۔ اور ان کو اُن چھ مبلغین کی فہرست میں شامل نہیں کرتے۔ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ سید شاہ ولی کے بارے میں آپ ایک روایت کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ان کا تعلق طوسی برادران سے تھا۔ جبکہ طوسی برادران کا زمانہ 1590ء تا 1600 کا ہے۔

ایک اور روایت کے حوالے سے آپ کا یہ کہنا ہے کہ سید شاہ ولی 1140ھ بہ مطابق 1735ء کے قریب زمانے میں گلگت آئے تھے۔ اُس وقت یہاں راجہ رحیم شاہ ولد راجہ کمال خان کی حکومت تھی۔ آپ جب چوپر سن میں باباغندی کے قبرستان کی طرف سے گزرنے لگے تو آپ کو یہاں سے گزرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ سید شاہ ولی کے مقبرہ پر 1295ھ کی تعمیر کی تاریخ مندرج ہے۔ پروفیسر دانی اس ہجری سال کو عیسوی سال میں تحویل کرتے ہوئے 1878ء کا سال قرار دیتے ہیں۔ وزیر حشمت اللہ گلگت کے متعلق اسلام کی آمد کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ ”گلگت کے متعلق روایت ہے کہ اس ملک میں اسلام کی بنیاد آذر شمشر کے زمانہ 1120ء میں پڑی۔ گو کہ خود شمشر نے بعد تسخیر گلگت اشاعت اسلام میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ مگر اس کے عہد میں چھ بزرگ سید شاہ بریا ولی، سید سلطان علی، سید شاہ ولی، سید شاہ افضل، سید شاہ اکبر، سید میر ابراہیم اس ملک میں وارد ہوئے۔ انہوں نے مذہب اسلام کی تلقین کی۔ اور کل اہل ملک کو بدھ مذہب سے مسلمان بنا دیا۔ ان

بزرگوں کے مزار گلگت کے مختلف علاقہ جات میں اب تک موجود ہیں۔ بعد میں تراخان کے زمانہ میں 1290ء تا 1335ء تاج مغل نے بدخشاں سے گلگت پر حملہ کیا۔اس نے ایک جدید مذہب گلگت میں رائج کیا جس کا نام اس کے رائج کرنے والے کے نام پر مغلی رکھا گیا۔ جو بعد میں کثرت استعمال سے بگڑ کر مولائی ہو گیا۔ تراخان نے اس مذہب کو اختیار کیا۔ پونیال یاسین، چترال، اور ہنزہ میں بھی اسی تاج مغل کے ذریعے مذہب رائج ہوا جہاں یہ آج تک موجود ہے۔ جس زمانے میں گلگت میں تھا۔(95-1893) ایک گھرانے (راجہ کمال خان نومل) کے سوا میں نے اور کوئی شخص اس تمام علاقہ میں اس مذہب کا پیرو نہیں دیکھا۔ بعد میں علی شیر خان انچن راجہ اسکردو 1599ء تا 1633ء اور اس کے پوتوں شیر شاہ اور شاہ مراد 1660ء تا 1710ء کے حملوں کے سلسلہ میں اسکردو کے ساتھ گلگت کا تعلق پیدا ہو گیا۔ اس سے متاثر ہو کر مرزا خان اراجہ گلگت 1565ء تا 1600ء نے مذہب شیعہ اختیار کیا۔"

وزیر حشمت اللہ گلگت میں اسلام کی آمد کا سنہ 1120ء بتاتے ہیں۔اور اسے آذر شمش اولین تراخانی حکمران سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر جب ہم موازناتی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو وزیر صاحب کی یہ روایاتی باتیں محض قیاس آرائی کی پیداوار لگتی ہیں۔ 1120ء میں مشرق کی طرف صوبہ سنکیانگ میں اسلام موجود نہ تھا۔ جنوب مشرق کی طرف بلتستان کفر کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کشمیر میں ہندوازم کا راج تھا۔ اور جینگہ (1120ء تا 1155ء) یہاں حکمران تھا۔ جنوب کی طرف چلاس، داریل، تانگرد کوہستان میں کفر ہی کفر موجود تھا۔ علاقہ سوات میں اگرچہ اسلام کے ابھی پاؤں پڑے تھے۔ لیکن بہت نحیف اسلام موجود نہ تھا۔ شمال کی طرف بارہویں صدی عیسوی میں خاندان غور کی دور کی ایک حکومت قائم تھی۔ بدخشاں میں پیر ناصر کی وجہ سے اسماعیلی عقائد کچھ کچھ نفوذپارہے تھے۔ تاہم اس طرف بیشتر منگول بدھ مذہب سے وابستہ تھے۔ گلگت کے چاروں طرف ایسے ماحول کی موجودگی میں یہ خیال کہ 1120ء میں یہاں اسلام کے قدم پڑے۔ بعید از قیاس بات ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آذر شمشر یا آذر جمشید بلتستان کی طرف سے آئے ہوں۔ اس بیشتر مورخین متفق بھی ہیں۔ تو پھر بھی یہ بات سوالیہ نشان بنتی ہے۔ کہ بلتستان میں جہاں بدھ ازم، بوناپا ازم کا راج تھا۔ ایک مسلمان فرد کہاں سے نکل آیا۔ جہاں تک شاہ رئیس خان کی 725ء والی بات ہے کہ اس سال سید شاہ افضل گلگت تشریف لائے تھے۔ یہ بات کسی توجہ کے لائق نہیں کیونکہ اس دوران یا کئی سو سال بعد تک ترخانیوں کی حکمرانی کا دور شروع ہی نہیں ہوا تھا۔ آج ریسرچ

کی بنیاد پر موازناتی تاریخ کے حوالوں سے یہاں بارہویں صدی عیسوی کے حکمرانوں کے جو نام ملتے ہیں۔ ان میں سے کوئی نام بھی شاہ رئیس خان کے ناموں سے لگا نہیں کھاتا۔ اس بارے میں میں نے مستند تاریخوں سے بہت حوالے دیئے ہیں۔ اور موقع محل کے مطابق اس موضوع پر پھر بات کی جائے گی۔

تاج مغل کے حملے کے حوالے سے بھی آگے بحث گزر چکی ہے۔ یہاں پھر اسے دوہرانے کی ضرورت نہیں۔

عبدالحمید خاور سابق اے آئی جی گلگت میں اسلام کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ "آغاز اسلام کی نسبت ہمارے پاس کوئی دستاویز یا تحریر موجود نہیں۔ البتہ ہنزہ التت کے قلعے کے اندر برج کے دروازے پر ایک تاریخ درج ہے۔ جن میں 955ھ تحریر ہے۔ تاریخی روایت ہے کہ ہنزہ کے راجہ عیاشو نے سکردو بلتستان کی ایک شہزادی سے شادی کے بعد التت اور بلتت میں قلعہ تعمیر کرانے کے لئے سکردو سے کاریگر اور معمار طلب کئے۔ چنانچہ وہاں کے کاریگروں نے یہ قلعے تعمیر کئے۔ سکردو اور ہنزہ کے درمیان اس رشتے سے آمدورفت شروع ہوئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد اہالیان ہنزہ نے بلتی آخوند اور سادات کے ہاتھ پر بیعت کیا اور اسلام قبول کیا۔ پھر کچھ سادات کا بھی بلتستان سے گلگت آنے کا ذکر موجود ہے۔ جن کے نام یہ ہیں:

سید شاہ بابر ولی ، سید سلطان علی عارف
سید شاہ ولی ، سید شاہ افضل، سید اکبر شاہ
سید ابراہیم شاہ۔

سید شاہ بریاولی گلگت سے ہوتے ہوئے چترال چلے گئے اور ان کا مدفن چترال میں ہے۔ سید سلطان علی عارف کا مزار دینور میں ہے۔ یہ شاہ ولی کا مزار گلگت علاقہ نگر میں ہے۔ سید شاہ افضل کی قبر موجودہ کشمیر بازار کے عقب میں واقع ہے۔ اور سید شاہ اکبر اور سید شاہ ابراہیم کے مدفن کا صحیح علم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ موجودہ ہائی سکول نمبر 1 کے عقب میں جانب جنوب مشرق دو آستانے موجود ہیں۔ ان میں یہ دونوں بزرگ پیوند خاک ہوئے ہوں۔

خاور مرحوم کی اس تحریر میں کوئی بات نہیں۔ ہنزہ کے برج کے بارے میں حاجی قدرت اللہ اور پروفیسر دانی بھی اشارہ کر چکے ہیں۔

بڈلف اپنی کتاب ہندوکش کے قبائل میں لکھتے ہیں:۔ "اگر ہم ہر نسل کو پچیس

سال دیں تو آذر کی حکمرانی کا آغاز چودھویں صدی سے ہوتا ہے۔ تقریباً اسی دور میں گلگت سے شین حکومت کا خاتمہ ہوا۔ سکردو کے مقپون حکمرانوں کے آغاز کا بھی تقریباً یہی زمانہ بنتا ہے۔ ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ بلتستان اور گلگت میں ساتھ ساتھ اسلام پھیلا۔ جنرل کنگھم تیس سال فی نسل کے حساب سے ایک صدی پہلے نکلتے ہیں۔" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔ کہ ہم سولھویں صدی کے قریب نگر کے کسی حکمران کا مسلم نام پاتے ہیں۔

پروفیسر دانی اپنے ایک مقالہ میں جو مسلم اخبار کے 25 مارچ 1987ء کی اشاعت میں چھپا۔ شاہ رئیس کی تواریخ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ آذر جمشید سے دینک ملک تک سارے نام غیر مسلم نظر آتے ہیں۔ وہ آگے چل کر راجہ تراخان اور سوملک کے ادوار کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ کہ یہ دور سید علی ہمدانی کے دور سے منسلک ہے۔ اس دور میں شاہ صاحب بلتستان تشریف لائے۔ لیکن گلگت میں اسلام کی تبلیغ کے کوئی شواہد نہیں ملتے۔ بلتستان کی سات مسجدیں اُن کے نام سے منسوب ہیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ گلگت میں اسلام پندرھویں اور سولھویں صدی میں آیا ہو۔ یہاں اُس وقت شیعہ حکمران دینور کے شاہ صاحب کے بہت معتقد تھے۔ جو اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ بلتستان سے گلگت آیا تھا۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں یہاں شیعہ اور سنی فکر فروغ پا رہا ہے۔

حاجی قدرت اللہ اپنے مقالہ "بروشکی زبان وادب" میں لکھتے ہیں: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کے غلبہ پالینے کے باوجود اسلام کی تبلیغ کا کام بہت بعد میں شروع ہوا۔ کیونکہ 1887ء سے پہلے تک تو اس علاقے میں قرآن کریم نہیں پہنچا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شاہ بیگ کا بیٹا خان مذکورہ سن (1887ء) میں تخت نشین ہوا تو اس وقت قرآن کریم کا ایک نسخہ یہاں لایا گیا۔ چونکہ انیسویں صدی کے آخر تک کوئی تعلیمی بندوبست نہیں تھا۔ اس لئے لوگ اسلامی عقائد سے پوری طرح آگاہ نہ تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہندو مذہب کے اثرات ختم ہو جانے کے باوجود یہاں کئی معمر لوگوں (زمانہ 70-1960ء نوٹ کریں مصنف تاریخ) کے نام سکھ یا ہندوانہ ہیں۔ مثلاً ہری سنگھ، چھمار سنگھ، کھنگ، جو سنگھ، ممو سنگھ، موسنگھ، میل سنگھ، گل سنگھ، زیور، پویار، شلی بائی، میری بائی، کپوی وغیرہ۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاں تبلیغ اور راہنمائی کے لئے کوئی انتظام نہ ہو وہاں مخلوط قسم کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی حال یہاں کے باشندوں کا ہوا۔ یہاں بھی ایک مخلوط عقیدہ رائج ہو گیا۔ جس میں بت پرستی، اسماعیلی اور اثنا عشری عناصر شامل تھے۔ اس صورت حال میں جب کہ میر سلیم خان ابن

خسرو یہاں حکمران تھا۔ (1815ء۔1820ء کا دور) شاہ اور اردبیل ہنزہ وارد ہوئے۔ میر سلیم خان پہلا شخص تھا جو اسماعیلی عقیدہ کی طرف مائل ہو گیا۔ صفحہ (72-71)

ان مباحث کے نتیجہ میں ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ کہ گلگت میں اسلام تیرھویں صدی عیسوی سے آنے کا کہیں کوئی تصور نہیں۔ اگرچہ یہ بات بھی حقائق و روایت اور موازناتی تاریخ کے اصولوں سے لگا نہیں کھاتی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ گلگت یا بلتستان میں اسلام یکبارگی نہیں آیا بلکہ اس کو آتے آتے اور لوگوں کی رگوں اور ریشوں تک پہنچتے پہنچتے بھی صدیاں لگی ہیں۔ کیونکہ تبلیغ اسلام میں اسلام قبول کرنے والی پہلی نسل نے محض کلمہ پڑھا دوسری نسل نے کچھ عادات پر توجہ دی لیکن جاہلانہ دور کی ثقافتوں روایات، ضوابط کو ترک نہیں کیا۔ تیسری نسل نے کچھ کچھ خرافات کو ترک کرنا شروع کر دیا۔ لیکن بعض ذہنی طور پر راسخ باتوں کو ترک نہیں کیا۔ مثلاً گلگت میں "چراغ تربت" جلانا، (مرگھٹوں) اور گل خنوں کا احترام، پتھروں اور چٹانوں سے محبت کے سلسلے جاری رکھے :

بڈلف لکھتے ہیں :۔

In spite of the more severe type of Muhammadanism which prevails and which gathers strength, year by year, idolatrous customs still survive, In every village in which Shias are in the majority, there is a large stone, which is still more or less the object of reverence. Each village has its own name for this stone, but an taken or an engagement made over it, is often held more binding than where the koran is used."

اب میں یہاں پر مختصر اُن واقعات کی طرف پھر سے اشارہ کروں گا جو یہاں کی اسلامی تاریخ پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ سلطان شہاب الدین غازی کا 1360ء تا 1374ء کے درمیان اور سلطان سکندر بت شکن کا 1411ء میں گلگت پر حملے اور اسے کشمیر کا حصہ بنانا تاریخ کے اہم واقعات ہیں۔ یہ دونوں سلاطین سید امیر کبیر ہمدانی کی تبلیغ کے زیر اثر تھے۔ تاہم ان کے شمال، مشرق، مغرب اور جنوب کی طرف حملے محض جہان بانی اور جہان گیری کے دائرے میں آتے ہیں۔ انھوں نے اسلام کی تبلیغ کے لئے ان حملوں کے وساطت کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

ان کے بعد بلتستان اور کشمیر میں میر شمس الدین عراقی کی 1496ء سے 1526ء وفات تک تبلیغی کوششیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ کیونکہ عراقی نے پہلی دفعہ کشمیر میں مسلمانوں کے ایک نئے مسلک کو رواج دینے کی کوشش کی جو کشمیریوں کے لئے اجنبی تھا۔ میر عراقی نے کشمیر اور بلتستان میں بنیادی اور دوررس تبدیلیاں پیدا کیں۔ لیکن گلگت میں اُس کی تبلیغ کرنے یا یہاں مبلغ بھیجنے کے اثرات نہیں تھے۔ اگر کسی قسم کا اثر ہوتا تو مرزا حیدر دوغلت جیسے عالم، فاضل، مورخ مگر کٹر سنی کی نظروں سے اوجھل نہ ہوتے۔ وہ مسلمانوں کے مختلف فکر مسلکوں نوربخشیہ، شیعہ، اسماعیلیہ، اور حنفیہ پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اُس نے بدخشاں کشمیر میں نوربخشیہ، شیعہ مسالک کا شدومد سے ذکر کیا۔ اگر گلگت میں وہ کسی بھی مسلک کے کسی فرد سے ملا ہوتا تو اس کا تاریخ رشیدی میں ضرور ذکر کرتا۔ لیکن چونکہ اُسے کوئی ایسا متنفس نہیں ملا اُس کی تاریخ اس تذکرہ سے خالی ہے۔ وہ محض یہی لکھتا ہے کہ بلور ایک کفرستان ہے۔ یہ لوگ کوئی دین مذہب نہیں رکھتے۔ پھر اگر عراقی نے یہاں اپنے مبلغ روانہ کئے ہوتے تو کچھ بھی نوربخشیہ اثرات پائے جاتے جو کبھی نہیں رہے اور نہ ہی کسی تاریخ میں اس طرف کوئی اشارہ ملتا ہے۔ پروفیسر دانی کو یہاں تواریخی مغالطہ ہوا ہے۔ کہ عراقی نے یہاں سولھویں صدی کے وسط میں مبلغ بھیجے جبکہ 1526ء میں اُس کی وفات ہوئی تھی۔ جہاں تک خود مرزا حیدر دوغلت کی کسی اسلامی تبلیغ کا سوال ہے اس کے کوئی اثرات جاری نہیں ہوئے۔ حالانکہ وہ یہاں کچھ ماہ مقیم رہا۔ اُن کے حملوں کے مقاصد وہ خود بھی بیان کرتا ہے۔ وقت بسری، مالِ غنیمت کے حصول اور جہانبانی کے لئے تھا۔

ایرانی تاریخ میں صفویوں کا دور حکومت 1510ء تا 1736ء اور کشمیر میں چکوں کا دور 1551ء تا 1582ء دو ایسے ادوار ہیں۔ جب شیعت کے فروغ کے لئے سرکاری سطح پر منظم کوششیں کی گئیں۔ اس دور میں شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل تھی۔ سرکاری سطح پر مذہب شیعہ کی اشاعت کے لئے مبلغین اِدھر اُدھر روانہ کئے گئے۔ گویا 1551ء تا 1736ء کا زمانہ ان کوششوں کے لئے نمایاں حیثیت کا حامل دور ہے۔ ڈاکٹر ایم ڈی صوفی لکھتے ہیں کہ چک حکمرانوں نے اپنی فوج میں بیشتر شیعہ کمانڈر مقرر کئے۔ غازی چک نے 1555ء کے دوران گلگت، سکردو، کشتوار، پکھلی وغیرہ علاقے فتح کر کے کشمیر کا پھر سے حصہ بنا لیا۔ اِسی دور اور اس کے بعد شیعہ مبلغین ایران، کشمیر، بلتستان سے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ 1590ء تا 1600ء کے دوران طوسی برادران، 1745ء تا 1765ء کے دوران سید

عارف اور سید ابو سعید اور 1745ء تا1780ء کے دوران سید مختار اور سید یحیٰی برادران بلتستان وارد ہوئے۔ ان سب نے مذہب شیعہ کی تبلیغ کی اور بلتستان کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔

گلگت میں 1529ء کے بعد تاج مغل کے حملے کی نتیجے میں جس اسماعیلی فکر نے یہاں رواج پایا تھا۔ وہ بدخشاں سے تسلسل سے علمی اور فکری کمک نہ ملنے کی وجہ سے جلد ہی گلگت سے معدوم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ 1580ء تا1850ء تک اسماعیلی فکر رکھنے والا ایک بھی متنفس یہاں موجود نہ تھا۔ تاج مغل کے حملے کے اثرات ہنزہ اور نگر تک بھی نہ پہنچے تھے۔

گلگت اور متصل علاقوں میں اسلام کی آمد کے حوالے کے حوالہ سے التت اور بلتت قلعوں کی تعمیر کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے۔ کہ یہ قلعے بلتی کاریگروں نے تعمیر کیئے جو مسلمان تھے۔ التت قلعہ کے ساتھ چھوٹی سی مسجد جو ملی غورث کے نام سے معروف تھی وہ اُس بلتی شہزادی کے نام پر تعمیر ہوئی جو ہنزہ کے حکمران عیاشو کے فرزند کے عقد میں آئی تھی۔ مسجد کے برج پر 955ھ کے بجائے سنہ 989ھ خیال کرتا ہے۔ جو تقریباً1581ء بنتا ہے۔ یہاں مجھے پروفیسر دانی کی رائے صائب نظر آتی ہے۔ یقیناً یہاں مسجد کی تعمیر ایک اہم واقعہ ہے۔ اور جب ہم ارد گرد نظر ڈالتے ہیں۔ تو یہ ہمیں یہاں اولین مسجد دکھائی دیتی ہے۔ بلتی کاریگروں یا ملی غورث نے اس مسجد کو اپنی عبادت کے لئے استعمال کیا ہو۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہاں عوامی سطح پر کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ اور پھر یہ کاریگر، یا ایک شہزادی کسی مستحکم تبلیغ کے لئے کار آمد ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔

1591ء تا1633 کے دوران کسی سال علی شیر انجم نے گلگت سے چترال تک علاقے مفتوح کیئے۔ اس حملے کے حوالہ سے بھی گلگت میں اسلام کی آمد کا شائبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن تاریخ میں علی شیر انچن کے کسی تبلیغی مشن کا تذکرہ موجود نہیں۔

تاہم1555ء میں گلگت پر غازی چک کے افواج کا حملہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ چک حکمرانوں کے حملے محض ارضی توسیع پسندی کے مقاصد کے لئے نہ تھے۔ بلکہ یہ تبلیغی مشن کا درجہ بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ گلگت کے حملے کے دوران یہاں مبلغین کا ایک جتھا بھی در آیا جس میں شاہ افضل اور اُس کے کچھ ساتھی بھی شامل تھے۔ یہ بزرگان براہ راست کشمیر آئے تھے۔ اور جب افواج یہاں سے کامران وکامیاب واپس لوٹیں تو ان بزرگوں نے یہاں اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک مرکز قائم کیا سید شاہ افضل شیعہ فکر رکھتے تھے۔ اُن کی منظم تبلیغ کا نتیجہ تھا

کہ گلگت میں اسلام کا نور پھیلتا چلا گیا۔ آپ کچھ عرصہ وہاں رہے لیکن آپ اپنی تبلیغی مشن مکمل کر کے چند سال بعد کشمیر لوٹے۔ جہاں تک کشمیری بازار کے پیچھے جس آستان کو آپ سے منسوب کیا جاتا ہے۔وہ محض ایک مفروضہ ہے۔ جس دور کو آپ سے منسوب کیا جاتا ہے وہ تحقیقی حالات و واقعات کے مطابق کسی اور دور کی نشان دہی کرتا ہے۔ اُس وقت گلگت میں بروشوں کی حکومت تھی اور اس حکومت کا تبت کی حکومت کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ کچھ نامور مورخین و محققین نے بڑی تحقیق کے بعد تراخان حکومت کے آغاز کے بارے میں جو رائے دی ہے۔ اس کے مطابق اس وقت بلور میں بروشوں کی حکومت تھی۔ وزیر حشمت اللہ موازناتی تاریخ کے جائزوں کے بعد یہ رائے دیتے ہیں۔ کہ تراخان حکومت گلگت میں بارھویں صدی میں قائم ہوئی۔ کنگھم ایک اور نامور محقق ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ گلگت میں تراخان حکومت تیرھویں صدی میں قائم ہوئی۔ جبکہ بڈلف اور سر اورل سٹائن جیسے محققین کا خیال ہے کہ تراخانی حکومت یہاں چودھویں صدی میں قائم ہوئی۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ کہ 725ء میں جب گلگت کے چار اطراف کفر موجود تھا۔ تو محض گلگت میں اسلام کہاں سے آیا۔ اس طرح آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ یہ شاہ افضل کے 725ء کے افسانہ کی کیا حقیقت ہے۔ ترکستان بشمول بدخشاں پر عرب والوں نے 714ء تا 874ء تک 175 برس تک حکمرانی کی اور اس دور میں شیعہ سنی کی ایسی تفریق موجود نہ تھی۔ جو کئی سو سال بعد پیدا ہوئی۔ امیر معاویہ کی حکمرانی کے دور میں یعنی 661ء تا 680 کے دوران بخارا، سمرقند، ترمذ فتح ہوئے۔ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں (705ء تا 715ء) قتیبہ بن مسلم کے نائب اور بھائی صالح نے کاشان، فرغانہ اور کئی شہر فتح کئے۔ اسی زمانے میں قتیبہ نے کاشغر کو بھی مفتوح کیا۔ 724ء تا 743ء میں اموی حکمران میں ہشام بن عبدالملک کی حکومت تھی۔ اسی وقت خراسان کا حاکم اشرس بن عبداللہ تھا۔ خاقان چین اور اس کے ترک حلیف سمرقند، بخارا، اور سفر کے محاذوں پر مسلمانوں سے لڑتے رہے۔ لیکن مسلمان ہمیشہ فتح یاب ہوئے۔ تاہم ترکستان کے علاقوں میں ابھی اسلام نیا نیا تھا۔ 751ء میں ابو مسلم خراسانی کے نامزد کردہ سالار بن زیاد نے تالاس (کرغزیہ) کے مقامات پر چینی جرنیل کاؤ سین جی کو شکست فاش دیکر ختن، فرغانہ اور کش کے علاقے فتح کئے۔ بعض مورخین تالاس کی لڑائی کے حوالے سے یہ کہتے ہیں۔ کہ شاید عرب اس وقت یہاں داخل ہوئے ہونگے۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ماموں کے حکم پر اس کے ایک وزیر افضل ابن صالح نے کچھ مہمات کا بیڑا اٹھایا تھا۔ یہ حملے Transoxania کے گورنر رفیع ابن

لید ، تبتی سلطنت اور کابل شاہ کے خلاف کئے گئے تھے۔ الفضل نے واخان فتح کیا۔ اور اس طرح عرب فوجیں داخان کے راستے بلور میں داخل ہوئیں تھیں۔ تاکہ تبتین اور کشمیر کے اثر سے بلور کو خالی کرایا جائے۔ حدود العالم اور تاریخِ ہند البیرونی، راج ترنگنی از پنڈت کلہن میں اس وقت یہاں یعنی چھٹی صدی عیسوی سی لے کر دسویں صدی عیسوی کے آخر تک حکمرانوں کے جو نام ملے ہیں۔ مثلاً موکن ینگ نن ہی، مولائی ہی، سوچی لی، بولرین شاہ، بھوٹ شاہ، وغیرہ ایسے نام ہیں جو ہمارے تراخانوں کے ناموں سے لگا نہیں کھاتے۔

بہر حال سید شاہ افضل نے 1555ء تا 1560ء تک گلگت میں تبلیغ اسلام کے فرائض نبھائے۔ اس صدی کے دوران 1000ھ تقریباً 1590ء کے زمانے میں ایک اور بزرگ سید بریاولی نگر کی طرف سے درہ ہسپر عبور کر کے نگر تشریف لائے۔ اس وقت نگر میں بدھ مت، ہندو مت، مجوسیت سے ملے جلے عقائد کا دور دورہ تھا۔ سید بریاولی اس طرف آنے والے پہلے مبلغ تھے جنہوں نے منظم انداز میں اسلام کے شیعہ فکر مسلک کے تبلیغ کی۔ لوگوں کو اسلام کی دائرے میں شامل کیا لوگوں کے توہمات توڑے۔ آپ نے ہنزہ میں بھی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ اسی دور میں ہنزہ اور نگر میں چھوٹی چھوٹی مساجد تعمیر ہوئیں۔ صدیوں کے پرانے عقائد کو یک لخت توڑنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سید بریاولی نے کچھ سال یہاں تبلیغ اسلام میں بتائے اور پھر آپ اپنی اصل منزل کی طرف لوٹے جہاں سے آپ تشریف لائے تھے۔ ایک روایت کے مطابق Frembgen جرمن سکالر نے نگر کی تاریخ ثقافت کے حوالہ سے جرنل آف سنٹرل ایشیا (اشاعت دو دسمبر 1984) میں ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ کہ سید بریاولی اپنے دو خادموں ایک ابو الحسن جو نگر کے کشمیریوں کے جد اعلیٰ ہیں۔ اور دوسرے سنگِ علی (سگ علی) کے ساتھ کشمیر سے بلتستان آئے۔ اور پھر براہ ہسپر نگر آئے۔ اس سنگ علی کو بعد میں چترال کی مہتر شپ ملی۔

جہاں تک آپ کے چترال جانا یا آپ کے خادموں کا وہاں حکومت کرنے کا سوال ہے۔ موازناتی حقیقی علمی بنیادوں پر ثابت نہیں ہے۔ چترال کی تاریخ میں رئیسہ خاندان کا منظم انداز میں تذکرہ موجود ہے۔ رئیسہ خاندان کا بانی شاہ نادر رئیس بد خشاں کے قدیم ترکمان حکمرانوں میں سے ایک فرد تھا۔ جس نے 1370ء میں چترال میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے کئی نامور حکمران یکے بعد دیگرے چترال کی حکومت پر متمکن ہوتے رہے۔ اور تقریباً ڈھائی سو سال تک چترال میں حکومت کی۔ ان میں شاہ جان رئیس، شاہ خان رئیس، شاہ

کرم رئیس، شاہ نظام رئیس، شاہ اکبر رئیس شاہ ناصر رئیس، شاہ محمود رئیس، شاہ قادر رئیس شامل ہیں۔ کہتے ہیں۔ ان رئیسوں کے دور حکومت میں ایک تیموری شہزادہ بابا ایوب کسی بزرگ کا ہم سفر بن کر 1520ء میں چترال آیا۔ اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ اس کی اولاد میں ماہ طاق پھر ماہ طاق کا بیٹا خوش مال اور اس کا بیٹا سنگین علی رئیسوں کی حکومت میں اعلیٰ عہدوں تک پہنچا۔ 1570ء میں اس کی وفات ہوئی۔ سنگین علی کا لڑکا محمد بیگ اور پھر اس کا لڑکا محترم شاہ (کٹور) 1585ء میں چترال کا حکمران بنا۔ اور یوں چترال میں حکمرانوں کا ایک بڑا قبیلہ ور آیا۔ جس نے نہ صرف چترال بلکہ بد خشاں اور ور شگوم، گلگت، دیر، سوات کی سیاست پر اثر ڈالا۔ 1570ء سے کچھ سال پہلے چترال میں ایک بزرگ "شاہ بوریا ولی" کا تذکرہ ملتا ہے۔ جب اس بزرگ کی وفات ہوئی تو اسے بازار کہنہ کے قبرستان میں دفنایا گیا۔ میرے خیال میں یہ بزرگ بابا ایوب کے ہی ہم سفر ہوں جو ان کے ساتھ ساتھ چترال آئے تھے۔ اگر یہ بریاولی چترال گئے ہوتے اور انہوں نے وہاں تبلیغ کی ہوتی تو پھر ضروری تھا۔ کہ چترال میں شیعہ فکر اثرات ہوتے۔ جیسے نگر میں دیکھے گئے۔ لیکن اس دور میں اور اس کے بعد بھی چترال میں سنی اور اسماعیلی فرقوں کے علاوہ کسی تیسرے فرقہ کا بھی اثر نہیں رہا۔ اور نہ اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ نیز شمال میں اموی دور کے افتتاح تک یعنی 661ء تا 743ء تک جو عرب فوجیں آئیں۔ جو چین تک گئیں اور ترکستان وغیرہ میں جو عرب بسے وہ سب کے سب ایک ہی فکر مسلمان تھے۔

سید بریاولی کے بعد جو شخص دین اسلام کی تبلیغ کے لئے نگر و ہنزہ میں تشریف لائے وہ سید شاہ ولی تھے۔ دراصل نگر ہنزہ میں اسلام کی بنیادیں مستحکم کرنے اور عوام کو دین اسلام کی راہ پر ڈالنے کا فریضہ آپ نے ہی سر انجام دیا۔ چونکہ آپ نے یہاں مستقل قیام کیا۔ لوگوں کو برابر وعظ و تلقین کرتے رہے۔ اس لئے لوگوں کو دین سے پھر بھٹکنے کا موقع نہ مل سکا۔ پروفیسر دانی کا کہنا ہے۔ کہ آپ کا تعلق طوسی برادران (1590ء تا 1600ء) سے تھا۔ اور آپ بلتستان سے یہاں دین اسلام کی تبلیغ کے لئے تشریف لائے تھے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ 1140ھ مطابق 1727ء میں راجہ رحیم شاہ ولد کمال خان کے زمانے میں پامیر کی طرف سے براہ جو پرسن ہنزہ آئے تھے۔ آپ کو اس مقام سے گزرنے نہیں دیا گیا تھا۔ جہاں بابا غنڈی سے منسوب آستانہ ہے۔ سید شاہ ولی کے مقبرہ پر 1295ھ مندرج ہے۔ جو 1878ء عیسوی بنتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ 1660ء تا 1680ء کے زمانے میں یا اس کے متصل 1700ء تا 1750 تک کے دور میں گلگت نگر اور اردگرد اسلام نے بھی اپنی جڑیں پوری

طرح نسیں پھیلائیں تھیں۔ مراد خان و والئی سکردو (1660ء تا 1680ء) نے جب گلگت پر حملہ کیا تو اُس وقت سکردو سے لشکر اس لئے روانہ کیا گیا تھا۔ کہ گلگت میں کافروں کو ہلاک کیا جائے۔ مراد خان والئی سکردو کا یہی خیال تھا۔ کہ اس سرحد و ملک کا راستہ نہایت تنگ ہے۔ پہاڑ اور پتھر کے سوا زمین نظر نہیں آتی ہے۔ اہل گلگت بھی مہذب نہیں ہیں۔ اسلام اور درست رسم و رواج کے پابند نہیں۔ مسافر کے قتل کرنے میں انھیں ذرا باک نہیں ہوتا۔ انھوں نے بے شمار مسلمانوں کو ہلاک کیا۔ اور کافروں کی ہلاکت کی غرض سے لشکر اسکردو سے روانہ ہوا۔ (صفحات 477ء تاریخ جموں وزیر حشمت اللہ) خود شگر میں 1745 تا1780ء سید یحیٰ اور سید مختار برادران کے ساتھ جو واقعات پیش آئے۔ وہ بھی کسی لحاظ سے کم افسوس ناک نہیں کہ حکمران وقت کو سید مختار کی شہرت اور لوگوں کی عقیدت بھلی نہیں لگ رہی تھی۔ چنانچہ سید مختار کو قتل کرنے کی سازشیں ہوئیں۔ اس کے نتیجہ میں وہ جان بچا کر اسکردو نکل بھاگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمرانوں کو مبلغین کی عوامی عقیدت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ یہاں حکمرانوں کی سطح پر اسلام کبھی پھلا پھولا نہیں۔ بہر حال میرے خیال میں سید شاہ ولی 1730ء کے بعد اسکردو سے براہ شگر نگر آئے۔ اور تھول میں مستقل قیام کیا۔ وہ پامیر، بدخشاں، واخان کی طرف سے نہیں آئے کیونکہ اس طرف اُس وقت شیعہ فکر مراکز کہیں موجود نہ تھے۔ گلگت، نگر، حراموش، بگروٹ ایسے علاقے ہیں جو بلتستان سے بالکل متصل واقع ہیں۔ اور رابطے کے لئے سہل رسا بھی ہیں۔ اس لئے یہاں شیعہ مسلک بلتستان کے واسطے ہی پروان چڑھا۔ ہنزہ، اشکومن، یاسین، گوپس وہ علاقے ہیں جو پامیر، واخان، قراقرم سے متصل ہیں۔ اور اسی واسطے سے یہاں اسماعیلیت نے فروغ حاصل کیا۔ پھر استور کشمیر سے متصل ہونے کے ناتے اور پیرون اور پیرزادوں کی تبلیغ سے اس طرف سنی فکر رائج ہوا۔ داریل و جانگیر اور چلاس کے علاقے سوات و ہزارہ کے متصل ہونے کے ناطے اور باباؤں کی تبلیغ سے اہل سنت والجماعت کے دائروں میں چلے گئے۔ اس لئے شمال کی طرف سے سید شاہ ولی کے آنے کا واقعہ محض قیاس پر مبنی ہے۔ آپ نے نگر، ہسپر کے راہ گزر کو استعمال کیا اور نگر تشریف لائے۔ سید شاہ ولی نے نگر و ہنزہ میں ایک لمبے عرصے تک تبلیغ اسلام کا فریضہ سرانجام دیا۔ آپ ہنزہ بھی آتے جاتے رہتے اور لوگوں کو دین حنیف کی اچھی اچھی باتیں سناتے۔ مرکزی ہنزہ میں اس کا بڑا اثر بھی ہوا۔ تاہم گوجال اور شنا کی ایریا میں توہمات کا بازار گرم رہا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے خادموں کی اولاد نے جو تولیت پر مقرر ہوئی۔ اور نیز آخون زادوں نے مذہبی رہنمائی کا کام

جاری رکھا۔ پھر میر سکندر خان کی حکمرانی سے کچھ سال پہلے سید امیر شاہ، سید محمد شاہ، اور کئی سید نگر میں جا کر بسنے لگے۔ اور سلسلہ درس و وعظ کے مراتب پر فائز ہوئے۔ اب گلگت، ہنزہ اور نگر میں مذہبی تعلقات بڑھ چکے تھے۔ اس لئے دین سے انحراف کے لئے مواقع گھٹتے گئے۔

گلگت میں اسلام کی تبلیغ کے حوالے سے سید شاہ سلطان الف یا میر سلطان الف کو بلند مقام حاصل ہے۔ آپ تقریباً سال 1680ء میں مراد خان والئی سکردو کے گلگت پر حملے کے متصل زمانے میں گلگت تشریف لائے۔ گلگت میں ابھی اسلام کی بنیادیں استوار نہ ہوئی تھیں۔ داریل، تانگیر، چلاس اور ارد گرد علاقوں میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ مرکزی گلگت پر ارد گرد سے مسلسل حملوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ شمال کی طرف پونیال سے اور علاقوں میں اسماعلیت نے اپنے مقام بنالیا تھا۔ چترال، مستوج، ور شگوم کے حکمران اہل سنت والجماعت سے منسلک تھے۔ مرکزی گلگت اور اس کے ارد گرد ابھی اسلامی تبلیغ کی بڑی ضرورت تھی۔ اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ حکمرانوں نے کبھی سر انجام نہیں دیا۔ اس لئے درویش ی فقراء، اولیاء کرام، شیوخ، علماء، پیرزادوں، سید زادوں وغیرہ نے اسلام کی تبلیغ کے لئے تن من، دھن کی بازی لگادی۔ جناب میر سلطان الف نے گلگت کو تبلیغ کے لئے مستقل مستقر بنالیا۔ اور عوام کو رہنمائی فراہم کرنی شروع کی۔ پروفیسر دانی کا یہ کہنا کہ آپ ان چھ مبلغین میں شامل تھے جن کو میر شمس الدین عراقی نے گلگت روانہ کیا تھا۔ موازناتی تاریخ سے یہ ثابت نہیں۔ سید شمس الدین عراقی 1526ء میں وفات پا چکے تھے۔ اور اس حوالے سے آگے سطور میں کافی بحث گزر چکی ہے۔ میں یہاں پر مزید تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔ لفظ "میر" پر بھی سابقہ ابواب میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ لہذا اس کا واضح مطلب یہی ہے۔ کہ آپ سید تھے۔ اور سیدوں کے لئے "میر" کی اصلاح بھی استعمال ہوتی تھی۔ آپ کی وفات 1710ء کے متصل زمانے میں ہوئی اور آپ کو دینور میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کا مقبرہ 1800ء کے قریب زمانے میں کشمیری کاریگروں نے تعمیر کیا تھا۔ پھر 1940ء میں گورچ کے سید عباس ولد سید علی نے از سر نو تعمیر کرایا۔ مقبرہ کے ساتھ امام باڑہ بھی تعمیر ہوا تھا۔ جسے بعد میں ایک مذہبی مدرسہ، مدرسہ باب الاسلام" میں بدل دیا گیا۔ اس زیارت کے شیعہ و سنی برابر کے معتقد رہے ہیں۔ اور کچھ سال پہلے ارد گرد سے یہاں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا اور لوگ آپ کے توسط سے خداوند عالم سے اپنی حاجتیں طلب کرتے آپ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ جو آپ کے مسند وعظ پر متمکن ہوتی تاہم آپ کے مریدوں نے درس و وعظ کا سلسلہ جاری رکھا۔

؎۱ امپھری کی زیارت کے حوالے سے متضاد بیانات موجود ہیں۔ کوئی اس آستان کے مکین کا نام سید ابراہیم، کوئی سید سلطان ولی اور کوئی سید علی بتاتا ہے۔ شاہ رئیس اس آستان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ کہ راجہ علی شیر کی کوئی اولاد نہ تھی۔ آپ نے برمس کے ایک شخص مسمی جروّ سے ایک بچہ لے کر اسے اپنا بچہ بنالیا۔ راجہ علی شیر اس سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ لوگوں کو یہ بات پسند نہ تھی۔ اس لئے ایک دن ایک سازش کے تحت اس نوجوان کو قتل کر دیا گیا۔ لیکن جس مقام پر اسے قتل کرایا گیا تھا وہاں اس کی لاش دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئی۔ اور وہاں راکھ کا ایک ڈھیر ملا۔ اسی راکھ کے ڈھیر پر امپھری کا آستانہ بنا۔ اور یوں یہ آستانہ مرجع خلائق عام ہو گیا۔ پروفیسر ہمدانی آپ کو بھی ان چھ مبلغین میں شمار کرتے ہیں۔ جنکو میر شمس الدین عراقی نے یہاں بھیجا تھا۔ اور آپ کا نام سید سلطان ولی بتایا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا۔ اس طرف آنے والے مبلغین کا عراقی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کا نام سید ابراہیم تھا۔ اور آپ کا تعلق شیعہ مسلک سے تھا۔ اور آپ 1760ء کے بعد گلگت تشریف لائے تھے۔ لیکن آپ شاہ افضل، سید بریاولی، سید شاہ ولی، سید سلطان شاہ الف اور سید اکبر شاہ کی طرح زیادہ معروف نہ ہو سکے۔

؎۲ ہائی سکول گلگت سے متصل قبرستان میں دو قبور موجود ہیں۔ پہلی قبر جو مرکزی گنبد نما ڈھانچہ میں موجود ہے۔ بڑی پختہ ہے۔ جب ہم سکول میں پڑھتے تھے۔ اس وقت سے یہ مقبرہ برابر دیکھ بھال کی حالت میں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ مقبرہ ترو تازہ لگتا ہے۔ اس مقبرہ کے ڈھانچہ کے باہر جنوبی رخ جو بڑی قبر ملتی ہے۔ وہ اگرچہ خستہ حال ہے۔ پھر بھی واضح طور پر موجود ہے۔ کہا جاتا ہے یہ دو برادران کی قبریں ہیں۔ ان قبور کے بارے میں بھی متضاد رائیں ہیں۔ لیکن میرے بڑے بوڑھوں کی طرف سے جو معلومات مجھے ملی ہیں۔ اس کے مطابق یہ دونوں بھائی کشمیری پیرزادے تھے۔ ایک کا نام پیرزادہ سید شاہ اکبر اور دوسرے کا نام پیرزادہ سید شاہ فضل تھا۔ وہ گلگت میں کشمیریوں کے بڑے جتھے کی آمد کے بعد جو کشروٹ میں آکر آباد ہوئے تھے۔ 1762ء کے متصل زمانے میں تشریف لائے تھے۔ آپ سنی مسلک بزرگ تھے۔ اس قبرستان میں شروع سے اب تک سنی الفکر بزرگان مدفون ہیں۔ میرے والد گرامی کے حقیقی ماموں حاجی عبدالکریم جو 16-1915ء کی بندوبست میں جمعدار تھے۔ اور جس نے 120 سال سے اوپر عمر پائی، کا کہنا ہے کہ یہ کشمیری پیرزادہ سید تھے۔ نانا جی حاجی عبدالکریم نے 1960ء میں وفات پائی اور وہ اسی قبرستان میں خواہیدہ ہیں۔ مولوی فراح

صاحب کہتے ہیں۔ کہ اس قبرستان پر شیر آکر سر جھکایا کرتے تھے۔ تھانہ کے پیچھے سید محمود بابا کی قبر ہے۔ اس پر عام اتفاق بھی ہے۔ آپ ہزارہ سے یہاں تشریف لائے تھے۔ اور فقراء میں سے تھے۔ آپ سنی الفکر بزرگ تھے۔ تاہم یہاں آپ کی کسی تبلیغ کا ذکر نہیں ملتا۔

چلاس، داریل، تانگیر میں اسلام ہزارہ اور سوات کی طرف سے آیا اور یہاں اسلام 1760ء کے بعد پھیلتا چلا گیا۔ چلاس میں اسلام پھیلانے میں سادات کاغان کا بڑا ہاتھ ہے۔ سادات کاغان پیر بابا بونیر حضرت سید علی غواص ترمذی کی اولاد میں سے ہیں۔ سید نور غازی بابا کے آباء اجداد نے کاغان، بٹہ کنڈی، تھک، چلاس، میں اسلام کی تبلیغ کی۔ جبکہ داریل و تانگیر کی طرف اسلام پھیلانے میں کابل گرام کے سیری بابا، پھگلی کے سید مهذب پیر ابا سین کوہستان میں اسلام پھیلانے والے بزرگان میاں بابا، باقی بابا، اخوند صادق بابا، سید نور غازی شاہ، سید ولی محمد وغیرہ کا بڑا ہاتھ ہے۔

کوہ غذر، گوپس، اشکومن، پونیال، یاسین، میں چترال کے شاہ کٹور اور ور شگوم کے خوش وقتیہ حکمرانوں کے توسط سے اہل سنت الجماعت کا مسلک پروان چڑھا۔ خصوصیت سے سلیمان شاہ والئی یاسین مذہب اسلام سے بڑی رغبت رکھتا تھا۔ اُس نے پشاور سے علماء کرام بلوا کر شاہی متعلقین کے درس و تدریس پر متعین کیا۔ آپ کا سید احمد شہید کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ اور خط و کتابت بھی جاری تھی۔ ان حوالوں سے ور شگرم میں سنی مسلک داخل ہوا۔ پھر جب گوہر امان برسر اقتدار آیا تو بھی پشاور کے علماء کرام سے رابطے موجود تھے۔ گوہر امان نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ اسی کے نتیجے میں آپ کی اولاد میں میر ولی اور میر امان دینی امور میں بڑی دسترس رکھتے تھے۔ میر ولی نہ صرف ایک عالم شخص تھے۔ بلکہ آپ فارسی زبان کے ایک شاعر، مصور اور خطاط بھی تھے۔ اس طرح میر امان پشاور کے سیندو بابا کے مرید تھے۔ اور آپ کے گھرانے کا پشاور کے علماء کرام سے مسلسل تعلقات قائم رہے۔ استور میں اسلام پھیلانے میں کشمیر کے پیر اور پیرزادوں نے بڑا کام کیا۔ اس میں پیرزادہ سید اکبر شاہ کے حوالے بھی موجود ہیں۔ جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔

بہر حال کشمیر، بلتستان، گلگت، دیامر، غذر میں اسلام کی بنا سیدوں نے رکھی۔ وہ سید جنھوں نے یہاں اسلام پھیلایا۔ بڑی بابرکت ہستیاں تھیں۔ جسی نسبی تفاخر ان کے لئے زیبا ہے۔ وہی اصل سید ہیں۔ جنھوں نے خود مصائب جھیلے، مختلف مشکلات سے دو چار ہوئے۔ اور ان علاقوں میں اسلام کی تبلیغ کی۔ لوگوں کو راہ سلامتی کی طرف راہنمائی کی۔ یہ

لوگ امن، سلامتی اور اخلاق کے ماخذ تھے۔ ہم اس تبلیغی دور میں یہاں کسی قسم کا فساد نہیں پاتے۔ میں ان لوگوں کو سید نہیں سمجھتا جو لوگوں کو لڑاتے ہیں۔ جن سے شر فساد پھیلتا ہے۔ جو بد امنی کے ماخذ ہوں۔ اور جن میں صبر و استقامت، ور گزر کرنے کی استطاعت نہ ہو۔

سیدوں کی کثرت ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ کربلا کا جاں گداز واقعہ 10 اکتوبر 680ء کو پیش آیا۔ اس واقعہ کے بعد علی بن حسین علیہ السلام یعنی امام زین العابدین تنہا بچے تھے۔ جبکہ اس حادثہ جانکاہ میں معصوم بچے تک شہید کر دیئے گئے۔ لیکن اس کے باوجود دنیا میں سیدوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ امت مسلمہ تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ مربع میل پر مراکش انڈونیشیا تک پھیلی ہوئی ہے۔ 1986ء میں دنیا میں تقریباً 95 کروڑ مسلمان تھے جو اب 1998ء میں تقریباً ایک ارب کچھ کروڑ ہو گئے۔ لیکن ان میں محض حسینی سیدوں کی آبادی کروڑوں میں ہونا اور وہ بھی ایک فرد واحد سے ایک معمہ ہے۔ سمجھنے کا اور نہ سمجھانے کا حسنی سیدوں کو بھی ملایا جائے تو بھی یہ تعداد کروڑوں میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس طرح اگر کچھ افراد کروڑوں میں بدل سکتے ہیں۔ تو پھر دنیا کی پوری آبادی ہم مسلمانوں پر ہی مشتمل ہو گی۔ باقی مذاہب یا اقوام کے لئے کسی اور دنیا کا انتخاب کرنا ہوگا۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں: "سادات کی کثرت ایک لاینحل معمہ چلی آئی ہے۔ واقعہ کربلا میں ایک دو سید زادوں کے سوا کوئی اور نہیں بچا تھا۔ مگر پونے تیرہ سو سال کے عرصہ میں اس ایک دو کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ یہاں تک کہ صرف کشمیر میں ان کی تعداد 1911ء کی مردم شماری کے مطابق ایک لاکھ دو ہزار ایک سو پچانوے ہے۔ پھر لکھتے ہیں۔: "اور عجیب بات یہ ہے۔ کہ جن کے نام سے سیادت ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی حسنی الحسینی رضوی وغیرہ ان کی تعداد بہ مشکل تین سو تک ہے۔ سادت سازی کے معاملات صرف کشمیر تک محدود نہیں رہے۔ بلکہ ہر طرف ظالم لوگوں نے خواہ وہ کیسا ہی بد کردار کیوں نہ ہو مختلف صورتِ حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو سیدوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ سادات سازی کے حوالے سے محض ایک واقعہ ہی اس افراط و تفریط کو سمجھنے کے لئے کافی ہو گا۔ آپ اکثر لوگوں کے ناموں کے آخر میں شاہ دیکھتے ہیں۔ یہ اور آج کل بھی ناموں کے سابقوں کے طور پر عام مستعمل ہے۔ مثلاً احمد علی شاہ، محمد شاہ، ظاہر شاہ، غلام علی شاہ، پنجاب میں لوگ ان ناموں والے صاحبان سیدوں کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پنجاب کے ایک شخص ظاہر شاہ کی اولاد اسی طرح شاہ صاحب اور شاہ جی کہلوا کر سیدوں میں شامل ہو گئی تھی۔ اسی طرح ہر آخون، بابا، پیر اور پیر زادے بھی سیدوں میں درجہ بند ہوئے۔ ان میں بقیہ

افراط و تفریط ہو گئی ہے۔ تاہم کشمیر میں ایسے پیر زادہ، پیر، باباخاندان بھی ہیں جو اصل میں سید تھے۔ تکیہ و مسند ہونے کی وجہ سے مریدوں نے انہیں پیر، پیر زادے کے القاب سے یاد کیا۔ یہ چند ایک لوگ ہوں گے جو پیر اور پیر زادہ مشہور ہوئے۔ اور سید بھی تھے۔ لیکن تمام پیر زادوں کو سیدوں کی صف میں شمار کرنا درست نہیں۔

کشمیر میں سادات قادریہ، گیلانیہ، سادات نقشبندیہ، سادات اندرابیہ، سادات دوارکی، سادات ہمدانیہ، سادات رفاعی، سادات دوہیدی، سادات بخاری، سادات منطقی و بیہقی زیادہ تر اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ سادات رضوی، سادات جلالی، سادات موسوی، نقوی شیعہ مسلک سے وابستہ ہیں۔ سادات سازی کے حوالے سے لوگوں کی جہالت کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے۔ کہ بعض لوگوں نے اپنی نسبتوں کو امام مہدی سے لا جوڑا ہے۔ جو سراسر زیادتی ہے۔ کشمیر میں سادات ہمدانیہ (سید امیر کبیر علی ہمدانی سے متعلق) پیر زادہ بھی کہلاتے ہیں۔ اور یہ تاریخی طور پر صحیح ہے۔

کشمیر میں جن علاقوں سے سید آئے۔ ان میں سیستان، خراسان، خوارزم، مدینہ، کرمان، ختلان، مکہ، کاسان، شیراز، سرخاب، (متصل تبریز) بغداد، شام، اندراب، ترکستان، بخارا، بلخ، قم، (ایران)، بیہق، ہرات، بصرہ، دوارک، (بغداد شریف کے نواح میں واقع ہے) وغیرہ علاقے شامل ہیں۔ 12-1911ء میں جامع مسجد گلگت کے امام سید محمد یوسف صاحب گیلانی تھے۔ جنکا محمد دین فوق نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ اور ان کے حوالے سے کشمیر کے سادات قادریہ گیلانیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ کہ اس گھرانے کے دو بزرگ سید دریادل، سید شاہ محمد فاضل 1107ء کے لگ بھگ زمانے میں کشمیر تشریف لائے تھے۔ ان بزرگوں کا شجرہ نسب سترہ واسطوں سے سید عبد القادر جیلانی سے ملتا ہے۔ اور کشمیر میں ان صاحبوں کی اولاد (سادات خانیار کے نام سے مشہور ہے کیونکہ خانیار کو ان بزرگوں نے اپنا مسکن بنالیا تھا۔)

گلگت، بلتستان نگر میں شیعہ سادات کی کثرت ہے۔ کوہستان، داریل و تانگیر، چلاس کی طرف سنی سیدوں کی کثرت ہے۔ جبکہ اضلاع میں اسماعیلی سید بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ شمالی علاقہ جات میں کئی سید خاندان ہیں۔ ان تمام کا شجرہ نسب پیش کرنا ممکن نہیں۔ اگر اس طرح تمام خاندانوں کا شجرہ نسب یہاں دیئے جائیں تو یہ کتاب اتنی ضخیم ہو کہ اسے کئی کئی جلدوں میں چھپوانا پڑے گا۔ جو میرے لئے ممکن نہیں۔ لہذا میں یہاں چند نمائندہ شجرے دینے پر اکتفا کروں گا۔

سادات رضوی :

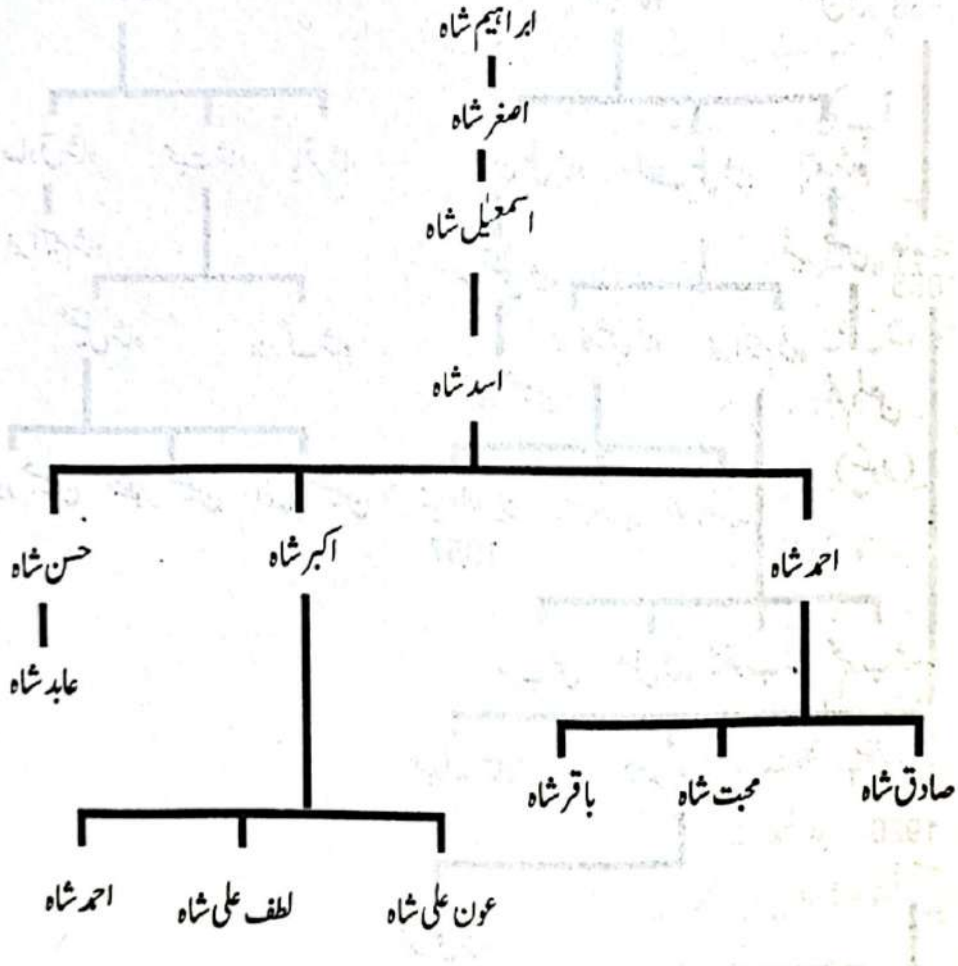
امام رضوی کی اولاد رضوی کہلاتی ہے۔ کشمیر میں یہ عہد سلطان زین العابدین (1420-70ء) قم (ایران) سے ایک بزرگ سید حسین رضوی تشریف لائے تھے۔ آپ زینہ گیر میں مقیم ہو گئے۔ اور درس، تدریس، کا فریضہ سر انجام دینے لگے۔ آپ عوامی اور سرکاری سطحوں پر بیک وقت قابلِ محترم سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی وفات پر یہ علاقہ موضع سید پورہ مشہور ہوا۔ یہاں شیعہ اور سنی برابر کی تعداد میں آباد ہیں۔ سید حسین رضوی کے فرزند کلاں احمد پورہ (بارہ مولا) کے رہائشی تھے۔ وہیں دفن ہوئے 1854ء کے لگ بھگ زمانے میں سادات احمد پورہ میں سے ایک بزرگ جو اپنے جد امجد یعنی سید حسین رضوی ہی کے نام سے موسوم تھے۔ اپنے تین بیٹوں سید قاسم، سید احمد، اور سید محمد کے ہمراہ لاہور منتقل ہوئے۔ آپ کی اولاد میں سید قاسم پنجاب میں بڑے مشہور ہوئے۔ سید قاسم ہی کے فرزند کلاں شمس العلماء مولانا سید علی الحائری، مجتہد العصر پنجاب اپنے علم و فضل کی وجہ سے پنجاب بھر میں معروف تھے۔ علامہ سید حسین قمی ہی کے ایک فرزند آغا سید احمد کی اولاد کشمیر، مرشد آباد، پٹنہ پشاور اور عراق تک کے علاقوں میں موجود ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں کشمیر سے خاندان رضویہ کی ایک شاخ پشاور منتقل ہوئی۔ اس شاخ کے بانی سید تقی شاہ رضوی تھے۔ اس کی اولاد آج بھی پشاور میں موجود ہے۔ تاہم یہاں سے ان رضویوں کی کسی شاخ کا گلگت و بلتستان کی طرف نقل مکانی کی تاریخ نہیں ملتی۔ محمد دین فوق اپنی کتاب "تاریخ اقوامِ کشمیر" میں سادات کے مختلف شاخوں کی نقل مکانی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ان ذرائعوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ جنکے توسط سے انہوں نے اپنی معلومات اکٹھی کیں۔ ان کا اہم ذریعہ ان اقوام کے معتبر، صاحبِ علم وبصیرت اشخاص تھے۔ جن سے مل کر انہوں نے ان کی نسلی نسبتوں اور اِدھر اُدھر نقل مکانیوں کے بارے میں استفارات کئے۔ ان کے شجرے حاصل کئے اور بے تکے اور بے سند شجروں کی تصدیق وتردید کے مباحثے کئے۔ اس کے علاوہ دیگر رابطوں، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب و مسوادات سے مدد حاصل کی۔ اور یوں اپنی نادر کتاب تاریخِ اقوام کشمیر مرتب کی۔ تاریخِ اقوام کشمیر میں رضویوں کے بارے میں جو تفصیلات ملتی ہیں۔ ان سے ان کا لاہور، پشاور، مرشد آباد، پٹنہ اور عراق کے رضویوں سے نسبتی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔

جہاں تک گلگت کے رضویوں کا تعلق ہے۔ میرے خیال میں یہ کاغان کی طرف

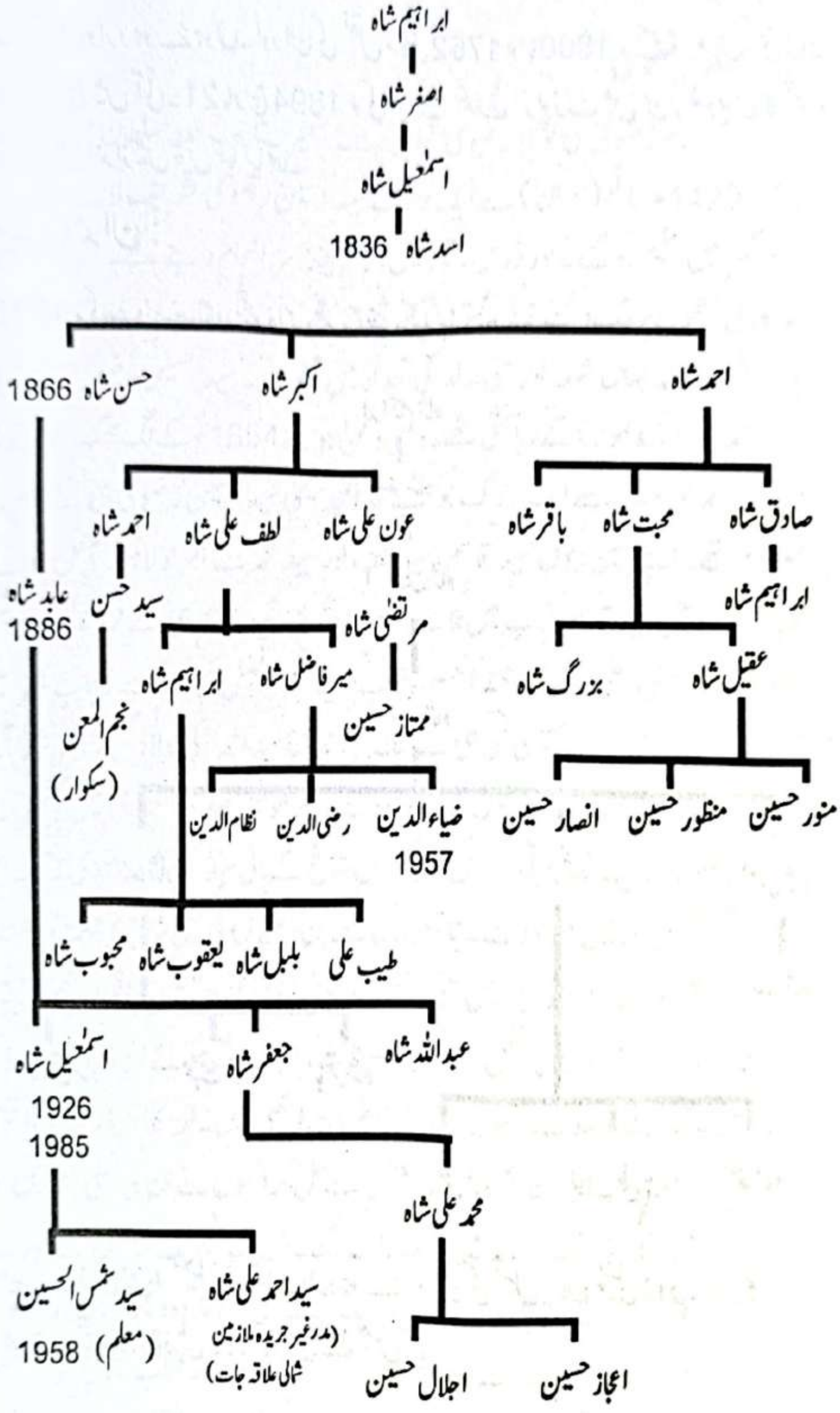
سے یہاں وارد ہوئے ہوں۔ اور ان کی نقل مکانی 1762ء تا 1800ء کے درمیان کسی زمانہ میں وقوع میں آئی۔ 21 مارچ 1894ء کی مرتبہ سٹلمنٹ رپورٹ میں ان رضویوں کا شجرہ درج ذیل انداز میں پیش کیا گیا تھا۔

سید خاندان :

1915ء کی بندوبست میں شجرہ اس طرح پیش کیا گیا۔ :-



میرے خیال میں اسمٰعیل شاہ گلگت وارد ہوئے اور ان کی نسل یہاں پھیلی پھولی۔ ان کا موجودہ شجرہ درج ذیل ہے۔ جو میں نے مکمل کیا۔



سید ضیاء الدین اس وقت امام جمعہ الجماعت مرکزی امامیہ مسجد گلگت ہیں۔
رضویوں کے جد اعلیٰ نگرل میں سکونت پذیر ہوئے۔ تاہم آپ کا دادا لطف علی شاہ کی شادی

سید میر احمد کی بہن سے ہوئی۔ اور پھر اس حوالہ سے آپ کے جد امپھری منتقل ہوئے۔ سید میر احمد مرحوم بھی خاندان رضویوں سے منسوب بتائے جاتے ہیں۔ آپ نے اپنی بیٹی اپنے بھانجے میر فاضل شاہ کے عقد میں دی تھی۔ سید میر احمد کے تین بیٹے سید محمد علی شاہ، سید ہادی علی شاہ، بقید حیات ہیں۔

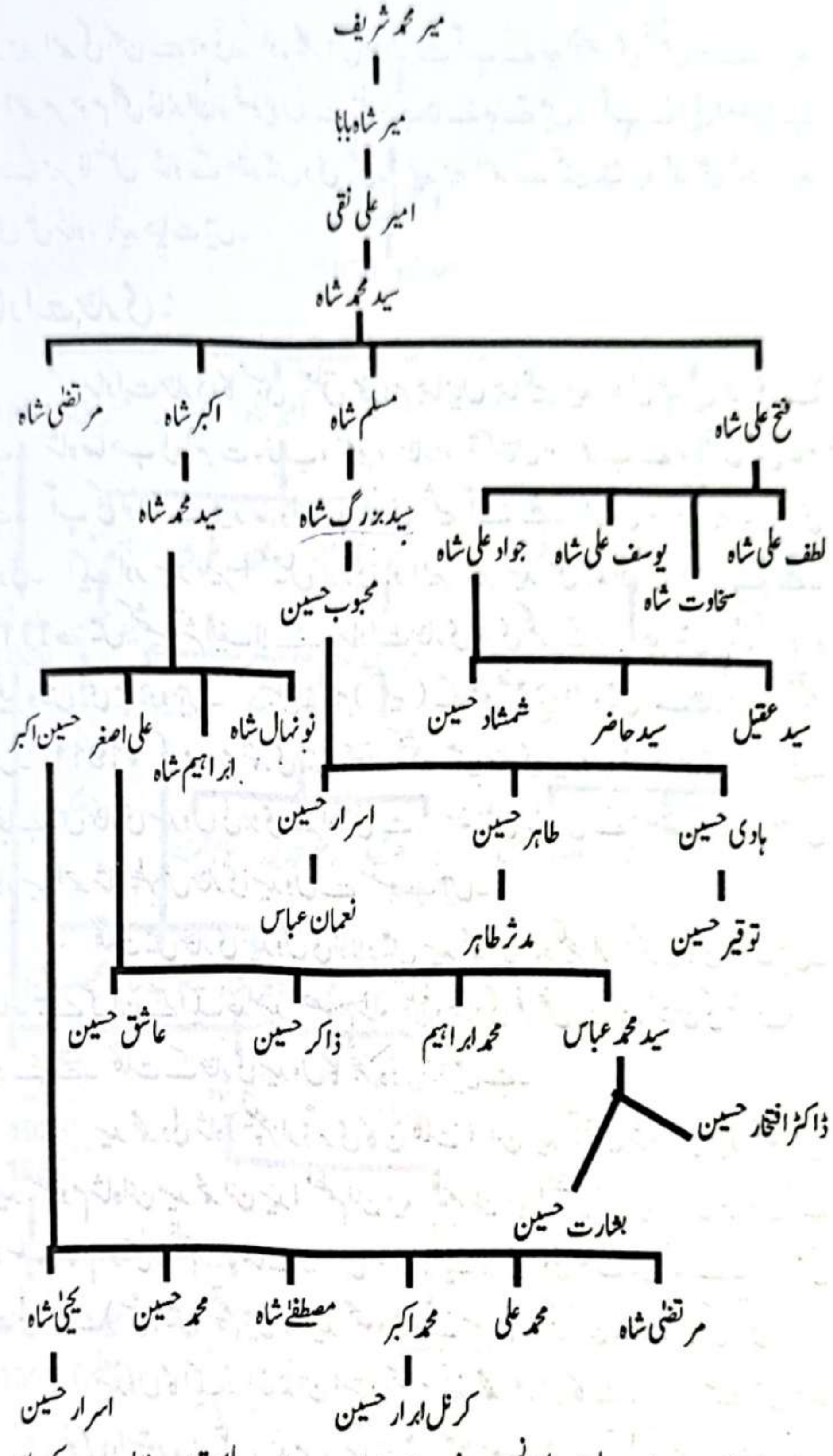
سادات بخاری :

سادات بخاری کا نسبی تعلق مخدوم جہانیاں جہانگیر سید جلال الدین بخاری سے ہے۔ شاہ صاحب کی شہرت پنجاب، کشمیر، بخارا، ترکستان اور عرب کے علاقوں میں عام ہے۔ آپ کی اولاد سے سید علاؤالدین بخاری کشمیر آئے تھے۔ ان کی اولاد کشمیر میں پھیلی پھولی۔ ایک اور سید امیر اسمٰعیل بخاری جو امیر کبیر سید علی ہمدانی کی اولاد سے تھے۔ 1114ھ میں کشمیر تشریف لائے۔ سادات بخاری سری نگر کے علاوہ جد کیل، کمانگر پورہ وغیرہ میں بھی موجود ہیں۔ تحصیل بڈگام (کشمیر) کے موضع چپوڑارہ میں سب بخاری سید مقیم ہیں۔ 1911ء کی مردم شماری میں جموں کشمیر میں بخاری سیدوں کی تعداد 9237 تھی۔ پنجاب میں بخاری سیدوں کی بڑی تعداد ملتی ہے۔ مضامین پطرس کے مصنف مشہور مزاح نگار سید احمد شاہ پطرس بخاری سیدوں سے منسوب ہیں۔

گلگت میں بخاری سیدوں کی اولاد میں سید محمد ولی شاہ لکچرار ڈگری کالج گلگت ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک جد سید معصوم شاہ تبلیغ و جہاد کی غرض سے افغانستان کی طرف وارد ہوئے تھے۔ گلگت کے بخاری سیدوں کا شجرہ درج ذیل ہے۔

سید محمد ولی شاہ (لیکچرار ڈگری کالج گلگت) ابن سید تیغون شاہ ابن سید محمود ابن سید معصوم شاہ ابن سید محمد ابن سید اعظم ابن سید سلیم ابن سید افضل ابن سید حسن اور یوں آپ کا سلسلہ امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔ اس سلسہ کا ایک بھائی سونی کوٹ میں آباد ہے۔ اور تین بھائی ڈموٹ (سئی) میں مقیم ہیں۔ سید محمود شاہ نے موسیٰ بروکی بہن سے شادی کی تھی۔

سیدوں کا ایک بڑا خاندان استاد محترم آغا محمد عباس کا ہے۔ اس سلسلے میں سید برمس، نومل، استور، جوتل، خومر، مناپن میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ حسینی سید ہیں۔



سادات کاغان سے اس سلسلہ کا نسبی رشتہ بتایا جاتا ہے۔ اس لئے قیاسِ غالب ہے کہ اس سلسلے۔ کہ جد اعلیٰ کاغان کی طرف سے ہی گلگت وارد ہوئے۔ سادات کاغان ہی کی ایک شاخ کسی زمانے میں تانگیر وارد ہوئی۔ اس سلسلہ کے سادات میں اپتگین زکواۃ ایڈ منسٹریٹر شمالی

علاقہ جات ہیں۔ شجرہ کچھ اس طرح ہے۔

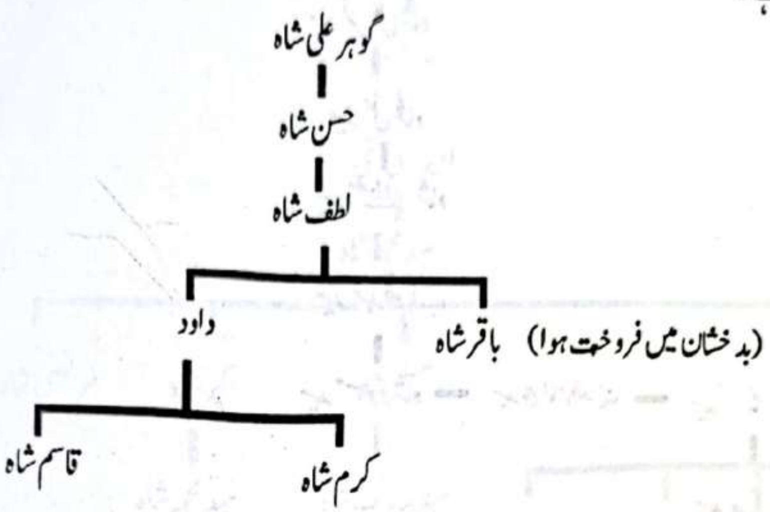
سید قمر علی شاہ
|
سید علی شاہ
|
سید مصطفیٰ شاہ
|
سید عبدالوہاب
|
سید مسعود شاہ — سید پیر امام الدین — سید کریم شاہ
|
سید حاجی شاہ
|
سید زبیر شاہ — (پیدائش بالاکوٹ)
|
سید جلال شاہ
|
سید نصیر شاہ
|
سید باد شاہ
|
سید الپتگین شاہ

پیر کرم علی آف اشکومن کا شجرہ امام علی نقی علیہ السلام سے ملتا ہے

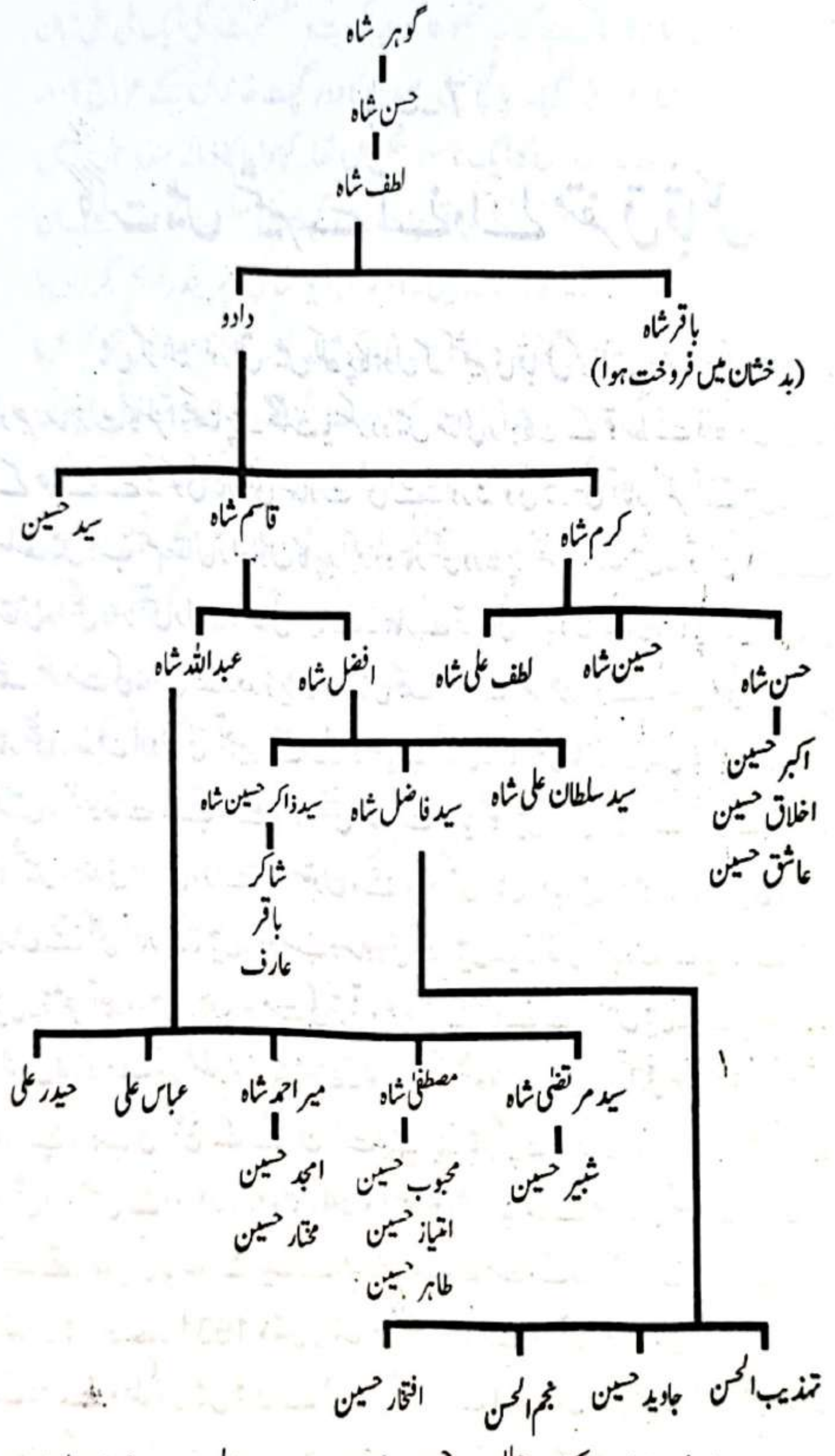
شاہ کلان
|
سید جلالی شاہ 1872 پیدائش
|
سید جلالی شاہ 1915 پیدائش
|
سید کرم علی شاہ

پیر کرم علی شاہ صاحب سے پورا شجرہ فراہم کرنے کے لئے درخواست کی تھی۔ انہوں نے وعدہ بھی کیا لیکن پھر یہ وعدہ ایفا نہیں کیا۔ یہ شجرہ میں نے گزیٹیرؤں کی تلاش سے حاصل کیا۔ سید فاضل شاہ گلگت کے ایک نامور مقرر، ادیب، شاعر اور جرنلسٹ ہیں۔ آپ کا تعلق جلالی سیدوں سے ہے۔ شجرہ درج ذیل ہے۔ جو 1893ء کی بندوبست کے

مطابق ہے۔


گوہر علی شاہ
حسن شاہ
لطف شاہ
باقر شاہ
(بدخشان میں فروخت ہوا)
داود
کرم شاہ
قاسم شاہ

درج ذیل شجرہ میں نے قدیم وجدید ریکارڈ کی روشنی میں تیار کیا ہے۔



جلادی سادات کے جداعلیٰ سید حسین سبزواری ابن سید علی ہیں۔ جن کا سلسلہ امام زین العابدین تک پہنچتا ہے۔ یہ سادات زیادہ تر شیعہ ہیں۔ اہل سنت بہت کم ہیں۔ اور جو ہیں وہ قادریہ سلسلے سے منسلک ہیں۔

باب۔ 7

گلگت میں کشمیر سے آنے والے متفرق قبائل

میں گزشتہ اوراق میں لکھ چکا ہوں کہ کشمیری قبائل کو مختلف وجوہات کی بنا پر ادھر اُدھر مہاجرت کا مزا چکھنا پڑا۔ گلگت یا سکردو میں مقامی راجگان کے توسط سے فنکاروں کی آمد کے حوالے سے نہ کوئی تاریخی شہادت ملتی ہے۔ اور نہ کوئی تاریخی آثار نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جب ہم مقامی راجاؤں کا پیدا کردہ تاریخی ورثہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو اس حوالہ سے مقامی راجگی دور تہی داماں دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے تراخانی راجاؤں نے یہاں پر تین سو سال تک حکومت کی۔ اس کے بعد ڈیڑھ سو سال تک مغلوٹ حکمران ہوئے۔ لیکن کوئی ایک بھی تاریخی ماخذ ان ادوار کی تعبیر کے لئے دستیاب نہیں۔ تاریخی ماخذوں میں مذہبی و تاریخی کتابیں، مخطوطات، کتبے، سکے، تاریخی عمارات، یادگاریں، فن تعمیر کے نمونے، مینار، لاٹھیں، ہندی اشکال، راستے، ستون، قلعے، کنوئیں، پُل، دہاریں، وغیرہ شامل ہیں۔ آج یہاں جتنے بھی آثار ملتے ہیں۔ وہ سب دساوری آثار ہیں۔ یا تراخانی راجاؤں سے پہلے کے آثار ہیں۔ بیشتر آثار وہ ہیں۔ جو بدھ مت کی ترقی و عروج کے زمانے سے متعلق ہیں۔ جب یہ علاقے اشوک اور کنشک کی عملداری میں تھے۔ اور بدھ بھکشوؤں نے یہاں تبلیغی مراکز قائم کیئے۔ اور اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے دن رات ایک کیا۔ پھر گپت خاندان (320 تا 450ء) اور ہرش وردھن کے دور (606ء تا 647ء) حکمرانی میں یہ علاقے مرکزی حکومت ہند کے ماتحت تھے۔ اور یوں یہ علاقے ایک لمبے عرصے تک بدھ مت کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے بدھ ماخذوں کا گڑھ بنے۔ 1931ء میں یہاں جو مخطوطات ملے اور جن کو بعد میں گلگت مسودات کے نام سے دو جلدوں میں کلکتہ سے شائع کیا گیا۔ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مخطوطات پانچویں چھٹی صدی کے دوران مرتب ہوئے۔ اور مقامی زبان میں لکھے گئے۔ تاکہ لوگ آسانی سے انھیں سمجھ سکیں۔ ان مخطوطات کو پڑھنے کے لائق بنانے والوں میں کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈی۔ ایم بھاٹا چاریہ، اے۔ سی بنر جی، پروفیسر بی۔ ایم، بورا، پروفیسر شاستری، ڈاکٹر

پی۔ سی باگچھی، شیو، ناتھ، شرما، اور ڈاکٹر نالی نقشہ جات شامل ہیں۔ مخطوطات کی زبان کے بارے میں ان ماہرین لسان کا خیال ہے کہ یہ مخطوطات پراکرت و سنسکرت کی ایک ملی جلی زبان میں لکھتے گئے۔ جو یہاں مروج تھی۔ پانچویں صدی کا دور گپت خاندان کے عروج کا دور تھا۔ چندر گپت وکرُمادیتہٗ۔ ہندوؤں کا ایک نامور حکمران تھا۔ گپتوں کا زمانہ ہندو تاریخ میں سنہری دور کہلاتا ہے۔ اُس وقت بشمول شمالی علاقہ جات چندر گپت کی سلطنت کا حصہ تھے۔ ان مخطوطات میں مقامی حکمرانوں کے جو نام ملتے ہیں۔ وہ سری دیواشاہی، سریندرا، بکریکرامادیتہٗ نندا جیسے نام ہیں۔ ویکرمادیتہٗ کے معنی بہادری کا سورج کے ہیں۔ اور یہی لفظ بعد میں بگڑ کر بکرما جیت بنا۔ گلگت مسودات میں ویکرامادیتہٗ جیسے نام اُسی دور سے لگا کھاتے ہیں۔ تراخانی راجاؤں سے پہلے مقامی راجگان، اَمسر (نوپورہ) کو صدر مقام بنائے رہے۔ اس مرکز سے جس قدر آثار ملے ہیں۔ اور مل رہے ہیں۔ ان پر ہمارے تراخنی راجاؤں کی پرچھائیں بھی نہیں پڑیں۔ 1822ء میں سلیمان شاہ والئی یاسین نے عباس خان والئی گلگت کو شکست دیکر گلگت پر قبضہ جمایا اور جب عباس خان و محمد خان بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تو یہاں مغلوٹ دور اپنے انجام کو پہنچا۔ اُس وقت اس علاقے میں ایک بھی ماخذ دریافت نہیں ہوا۔ جو تراخانی حکمرانوں کے تین سو سالہ اور مغلوٹوں کا نمائندہ ہو۔ گلگت پر اُس وقت کے نگر، پونیال اور یاسین کے راجاؤں نے یکے بعد دیگرے حکمرانی کی۔ لیکن یہ دور محض جنگ و جدل کا دور رہا۔ حکمران ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور گلگت پر اقتدار قائم رکھنے کے لئے دن رات لڑائیوں میں مشغول ہوتے تو کیا یادگاریں قائم کرتے۔

ان راجاؤں کے دور کی محض دو یادگاریں قلعہ گلگت اور قلعہ کھرپوچو کی شکل میں ہمیں ملیں۔ جو ان حکمرانوں کی جنگجویانہ سرگرمیوں کی مظہر ہیں۔ تراخانی اور مغلوٹ راجاؤں کا چھوٹا سا قلعہ جو موجودہ قلعہ کے مقام پر قائم تھا۔ 1822ء میں گوہرامان نے اپنی دوسری حکمرانی کے دور میں از سر نو تعمیر کرالیا۔ پھر ڈوگروں نے 1860ء کے قریب یہاں چھوٹے موٹے بارہ قلعے تعمیر کئے تھے۔ قلعہ کھرپوچو مقبون بوخا نے تعمیر کرایا تھا۔ جہاں تک شمالی علاقہ جات میں مساجد، خانقاہوں، کی تعمیر کا سلسلہ ہے۔ وہ امیر کبیر سید علی ہمدانی کے فریستادہ صانع اور مبلغین کا کام تھا۔ جنہوں نے کھری ڈونگ کی مسجد، حسین آباد کی مسجد، خپلو میں چقچن کی مسجد اور شگر میں امبورک کی مسجد عوام کی مدد اور تائید غیبی سے تعمیر کی۔ اسی طرح یہاں جتنی زیارتیں تعمیر ہوئیں اُن کی تعمیر میں عوام الناس میں سے مخیّر حضرات نے حصہ لیا۔

اور یہ کام بزرگوں کی راہنمائی میں انجام پایا۔

اس پس منظر میں مقامی حکمرانوں کا یہ تاثر لغو لگتا ہے۔ کہ چونکہ وہ فن و ثقافت کے دلدادہ تھے۔ اس لئے انھوں نے کشمیر سے معمار، سنگ تراش، نگار وغیرہ بلوائے تاکہ تعمیرات اور مختلف فنون وغیرہ کو ترقی دی جائے۔ میں پہلے تفصیلاً لکھ چکا ہوں کہ 1762ء میں کشمیریوں کے جو جتھے کشروٹ، کھنر، جنگلوٹ، ہوڈر، بوبر وغیرہ علاقوں میں مختلف راستوں اور مختلف اوقات میں بھٹکتے ہوئے آئے۔ اُن کی ہجرت افغانوں کے جور و ستم سے بچنے کے لئے تھی۔ تاہم ان میں صانع، ذرگار، دستکار، معمار، عالم، جنگجو، پہلوان، بڑھئی، سنار، جولاہے ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ ان میں بیشتر لوگ مغل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں کشمیر سے آنے والے مختلف قبائل کا ذکر کیا جارہا ہے۔ بیشتر شیعہ سنی سید بھی کشمیر کی طرف سے یہاں آئے۔ جن کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ ذیل میں اُن مختلف قبائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جو کشمیر سے وارد ہوئے اور مقامی آبادی کا حصہ بنے۔

لون :

لون کشمیر کی ایک اہم قوم خیال کی جاتی ہے۔ یہ قوم کئی ناموں سے پکاری جاتی رہی ہے۔ کبھی لونیا کے نام سے کبھی لونی کے نام سے اور کبھی لون کے نام سے۔ کبھی لون اور رینہ کو ایک ہی قبیلہ قرار دیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے۔ کہ لفظ رینہ بگڑ کر رُن ہوا۔ رُن یا رون بگڑتے بگڑتے لن یا لون ہو گئے۔ لیکن یہ خیال زیادہ قوی نہیں کیونکہ رینہ اور لون واضح طور پر دو الگ الگ قبیلے ہیں۔ اور ڈیڑھ دو ہزار سال سے اپنی اپنی الگ حیثیت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس حوالہ سے کہا جاسکتا ہے لون ایک قدیم قوم ہے۔ راج ترنگنی میں راجہ ہرش دیو 1130ء کے دور اقتدار میں لون لونیا کے نام سے مذکور ہوئے ہیں۔ محمد دین فوق تاریخ کشمیر میں لکھتے ہیں۔ "اسی دوران ہرش دیو اپنے چچیرے بھائیوں سے برگشتہ ہو کر اُن کے مارنے کے درپے ہوئے لیکن وہ منچلے بہادر کب قابو میں آتے تھے۔ راجہ کے تیور بدلتے دیکھ کر دونوں بھائی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اسی دوران اوچل نے کشمیر پر چڑھائی کر دی۔ اور بارہ مولہ کے راستے کے مراج میں داخل ہو گیا۔ اس موقع پر ستم رسیدہ ڈانگر لون بھی از سر نو بیدار ہوئے۔ اور اوچل سے آملے۔ بمقام پر سپور صف آرائی کر کے غنیم کی پیش دستی کا انتظار کرنے لگے ادھر سے ہرش دیو فوج لے کر نکلا اور محاربہ و مقاتلہ شروع ہو گیا۔ لیکن اوچل تاب مقاومت

نہ لا سکا اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔" اس تفصیل سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو لون ایک قدیم قوم ہے۔ دوم یہ کہ یہ ایک جنگجو قوم ہے۔ اس قوم کی تاریخ جنگ و جدل کی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔

سر والٹر لارنس کمشنر بندوبست کشمیر نے لون کو ویش قوم میں درجہ بند کیا ہے۔ ہندوؤں میں چار ذاتیں مشہور تھیں۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔ ویش قوم کا کام تجارت، کھیتی باڑی کرنا تھا۔ نیز وہ مختلف پیشہ ورانہ کام بھی سرانجام دیتے تھے۔ محمد دین فوق کہتے ہیں۔ کہ لون ویش نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ بڑی بڑی زمینوں کے مالک عموماً زراعت پیشہ ہیں۔ ویش لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ ہوتے تھے۔ رپورٹ مردم شماری 1891ء میں لون اور پرے اقوام کو اقوام راجپوت اور انھیں جنگجو اقوام میں صف بند کیا گیا۔ کشمیر کی تاریخ میں لونیا، ڈامر، رینہ، پرے اور گگھڑ اقوام کو لڑاکا اقوام ظاہر کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لون قوم بہت قدیم زمانے سے کشمیر کی جنگ و جدل میں حصہ لیتی رہی ہے۔ راجہ ہرش دیو تین قوموں کا بڑا دشمن تھا۔ ڈامر، لون اور برہمن۔ برہمن مذہبی حوالوں سے بااثر تھے۔ اور ہمیشہ مسائل پیدا کرتے تھے۔ لیکن سیاسی اقتدار کے لئے ڈامر اور لون ہی وہ قومیں تھیں۔ جو کسی بھی وقت حکمرانوں کو تخت و تاج سے باہر کر سکتی تھیں۔ راجہ ہرش کو آخر کار لون اور ڈامر قوم نے ہی تباہ کر دیا۔ او چل نے ان ہی اقوام کی مدد سے راجہ ہرش کو شکست فاش دیکر کشمیر کا تخت حاصل کیا۔ لون اور ڈامر کی قربتوں کی وجہ سے بعض مورخین نے دونوں اقوام کو ایک قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ یہ دونوں الگ الگ قومیں ہیں۔ یہ اپنی جنگجویانہ سرشت کی وجہ سے ایک دوسرے کے قریب تھیں۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں۔ "لونیا تجارتی گروہ نہ تھا۔ اور نہ فرقہ ویش سے اس کا تعلق تھا۔ وہ ایک خالص جنگجو طبقہ تھا۔ اور اس کا ثبوت کشمیر کی ہر تاریخ اپنے صفحے سے دے رہی ہے۔"

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ لون قوم نے ہر دور میں ملکی نظم و نسق اور سیاسی پیچ و خم میں حصہ لیا ہے۔ کشمیر کے حکمرانوں نے اس قوم کی مشاورت کو کافی اہمیت دی ہے۔ 1186ء میں رسہ دیو جب کشمیر کا حکمران بنا تو وہ لون سرداروں کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔

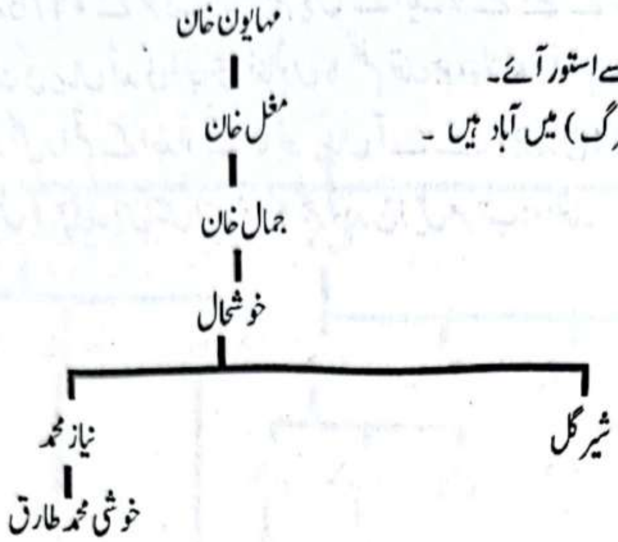
لون قوم کے اسلام میں داخل ہونے کی کوئی واضح تاریخ نہیں ملتی۔ تاہم غالب خیال یہی ہے کہ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے دوران قیام کشمیر (1379ء تا 1381ء)

اس قوم نے مذہب اسلام قبول کیا۔ سلطان شمس الدین شاہ میری کے عہد حکومت میں سال 1347ء کے آگے پیچھے لون قوم نے اپنے کھوئے ہوئے وقار (ہندوؤں کا اقتدار) کو حاصل کرنے کے لئے کشمیر میں ایک شورش برپا کی تھی۔ کشمیر کی لون اور دیگر ہندو اقوام کا خیال تھا کہ وہ متحد ہو کر یہاں سے اسلام کو خارج کر سکتے ہیں۔ اور اپنے دھرم کو تقویت پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن سلطان شمس الدین نے اپنی ہوشیاری اور سیاسی سوجھ بوجھ کو کام میں لاتے ہوئے اس شورش پر قابو پایا۔ اس کے بعد اُس نے پالیسی کے طور پر لون قوم کو ملکی انتظامی امور کے انصرام سے دور رکھا تاکہ یہ قوم پھر کسی ہلچل کو بڑھاوا نہ دے۔ یہی وجہ ہے اس کے بعد کشمیر کی سیاست میں ماگرے اور چک قومیں چھائی رہیں۔

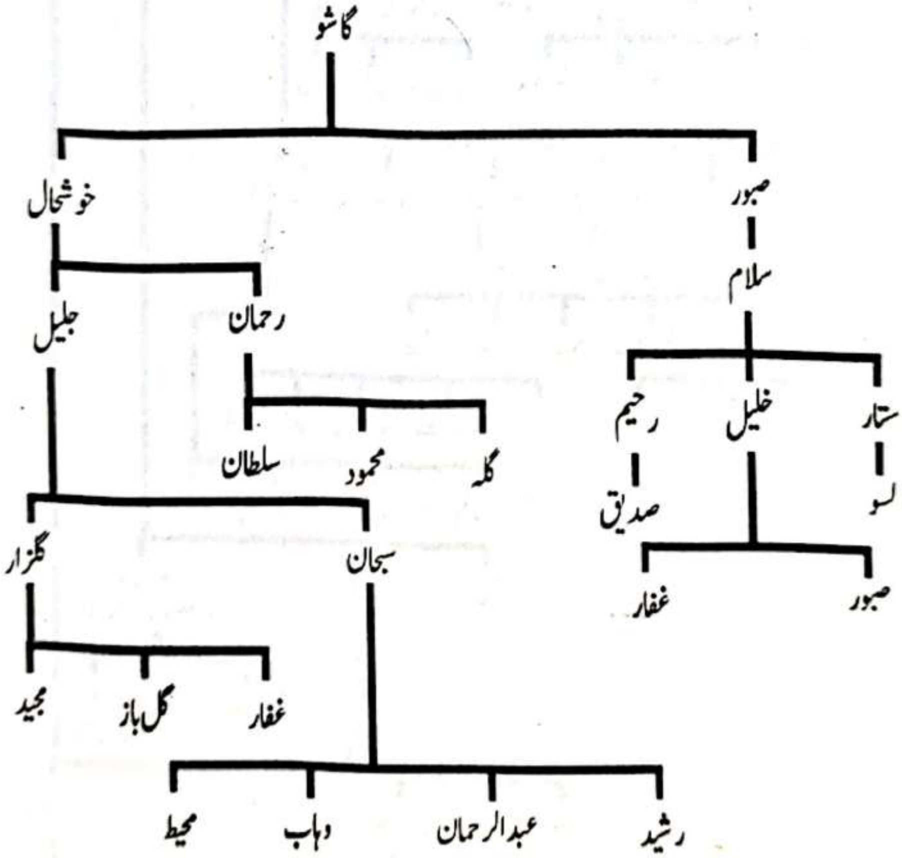
لون قوم کے بارے میں خود کچھ قدیم لونیوں کا یہ خیال بھی قابل لحاظ ہے۔ کہ اُن کے اجداد چلاس کے باسی تھے۔ اور بہت پہلے چلاس سے چل کر کشمیر وارد ہوئے۔ اور یہیں کے ہو رہے۔ جیسے پہلے بیان ہوا ہے۔ کہ اس قوم کا ابتدائی قبیلہ جاتی نام لونی یا لونیا تھا۔ ہندی لغت میں لونیا کے معنی پائنیر پہل کار کے ہیں۔ اسے ایک ہندو ذات بھی بتایا گیا ہے۔ چونکہ یہ قوم ہزاروں سال پہلے سے کشمیر میں آباد تھی۔ اور جنگجو قوم تھی۔ اس لئے اغلب خیال یہی ہے کہ یہ قوم چلاس کی طرف سے ایک حملہ آور قوم کی حیثیت سے وارد ہوئی ہو۔ اس قوم نے کشمیر میں اپنی وحدت کو ہمیشہ قائم رکھا۔ اور ٹوٹ پھوٹ سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ یہی وجہ ہے یہ ایک مضبوط قوم کی حیثیت سے کشمیر سے نمایاں رہی۔ جموں وکشمیر ہو، گلگت وبلتستان یا پنجاب ہو اس قوم نے اپنی شناخت کو مٹنے سے بچایا ہے۔ ان حوالوں سے کہ یہ قوم اپنی یکجائی کو محفوظ رکھے ہوئے۔ لڑاکا قوم ہے۔ مشاورت اور ملکی نظم و نسق میں حصہ لیتی رہی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وارد حملہ آوروں کی ایک شاخ ہو۔ اس کے بعد کشمیر سے ہی اس قوم نے پنجاب، اضلاع گلگت دیامر اور بلتستان میں نقل مکانی کی ہو۔ بہر حال لون کوئی افغانی قوم نہیں اور نہ اس نے افغانستان سے نقل مکانی کی ہے۔ لون اور الوان میں کوئی مماثلت نہیں۔ الوان ہندوواڑہ کا کشمیری نام تھا۔ اور یہ عبرانی نام بھی ہے۔ بعض مورخین نے عبرانی ناموں سے مماثلت پیدا کرنے اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کشمیری بھی بنی اسرائیل ہیں۔ عبرانی اور کشمیری ناموں کو جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں لون قوم کا ماضی شاندار رہا ہے۔ اگرچہ براہ راست انھوں نے حکومت نہیں کی لیکن حکومت سازی میں یہ اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ اب یہاں چند لون خاندانوں کا شجرہ دیا جاتا ہے۔

استور : لون

یہ ہندواڑہ (کشمیر) سے استور آئے۔
آج کل پشواڑی (منی مرگ) میں آباد ہیں ۔

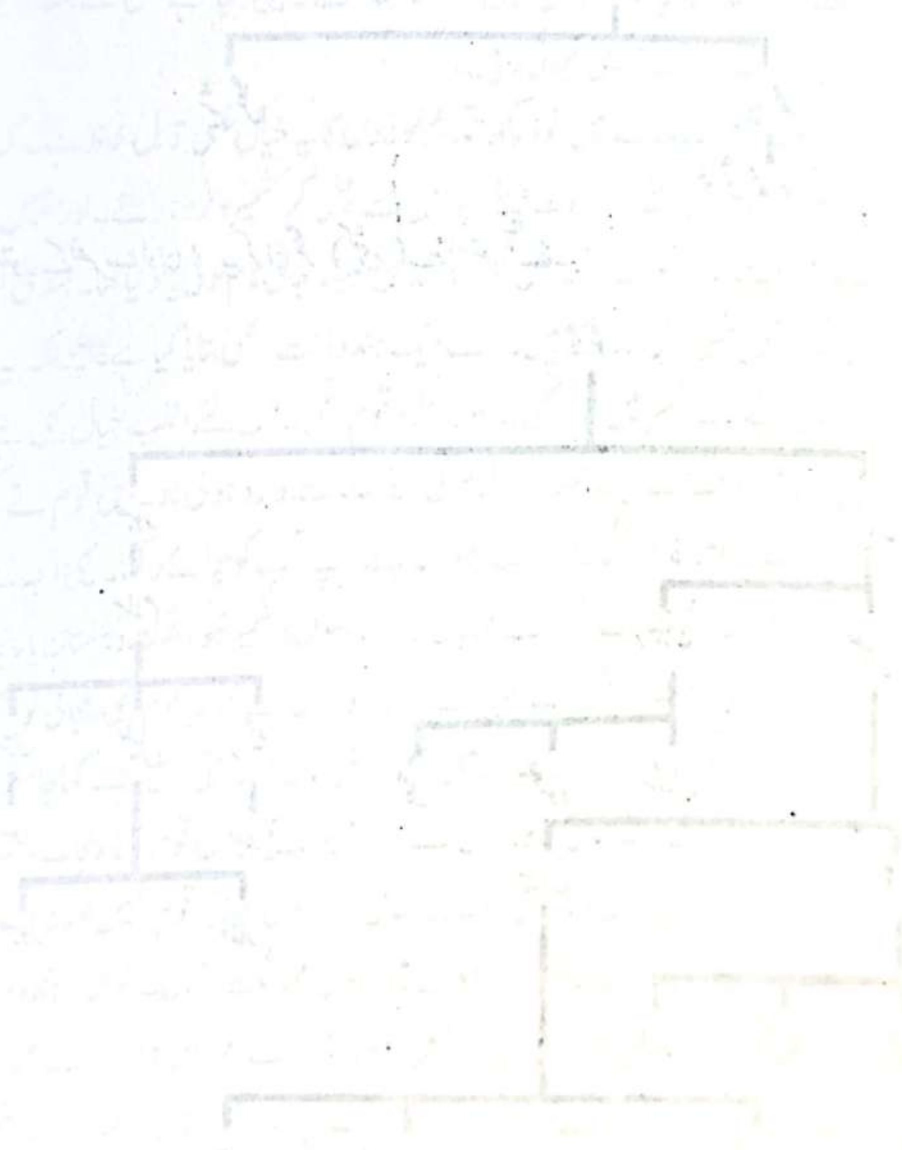


استور کے نصرے لون : یہ کرن نگر (کشمیر) سے استور آئے۔

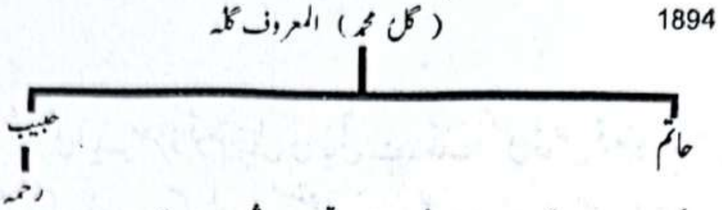


کشروٹ گلگت میں آبادلون :

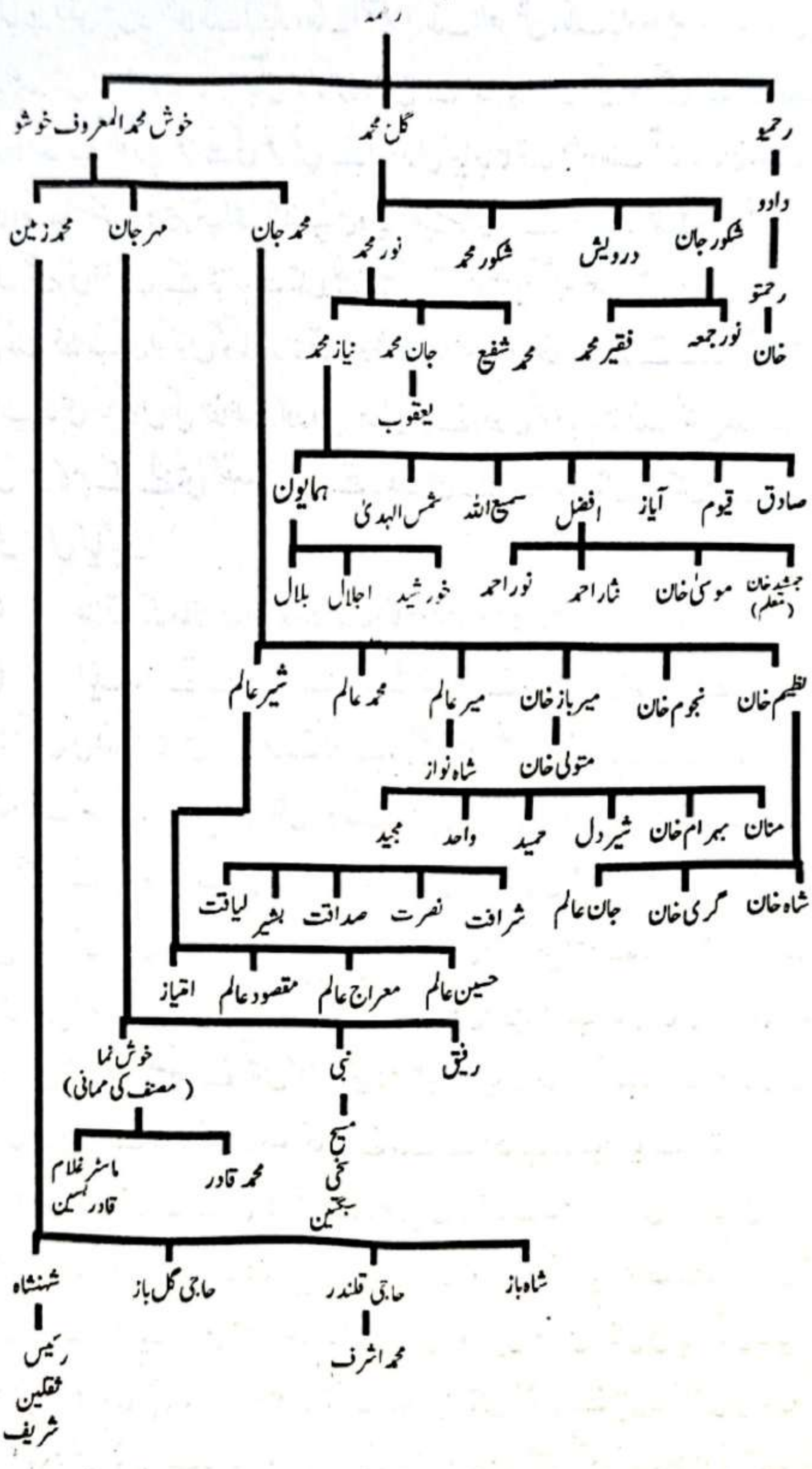
1762ء کے قریب یہ کشمیریوں کے ایک بڑھے جتھے کے ساتھ کشروٹ وارد ہوئے۔ اور ان کی یہاں آمد کی وجہ ہی افغانوں کا ظلم تھا۔ جو وہ لڑاکا اقوام سے روا رکھتے تھے۔ ان کے اجداد بھی راقم کے اجداد کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ 21 مارچ 1894ء کو پہلی بندو بست پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس میں اس قوم کا شجرہ درج ذیل مرتب ہوا تھا۔



1894



15 اگست 1916ء کی بندوبست ثانی بنیاد پر راقم نے یہ شجرہ مرتب کیا۔



ملک :

یہ کشمیر کی ایک معزز قوم خیال کی جاتی ہے۔ ملک کسی خاص قوم کا نام نہیں بلکہ یہ مسلمان اقوام میں ایک خطاب کے طور پر مستعمل ہے۔ یہی وجہ ہے اسی لفظ کے حوالے سے کئی مرکبات بنتی ہیں۔ مثلاً ملک التجار، ملک الشعرا، ملک العرش، ملک زادہ وغیرہ۔ سلاطین کشمیر کے عہد میں امراء، روساء، جاگیر داران، فوج کے عہدیداران وغیرہ سبھی کے لئے ملک نام کے لاحقہ کے طور پر عزت کی غرض سے استعمال کیا جاتا تھا۔ مثلاً ملک قلندر خان، ملک عزیز خان، ملک اسفندیار وغیرہ۔ اس خطاب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے۔ محمد عبداللہ قریشی اپنے مقالہ کشمیری ذاتوں کے عجائبات میں لکھتے ہیں۔ "سلاطین کشمیر اور مغل بادشاہوں کے عہد میں ملک خطاب اُن لوگوں کو ملا کرتا تھا۔ جو شاہی سڑکوں کی حفاظت کرتے تھے۔" کشمیر میں یہ خطاب شاہی سڑکوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنے والوں کو دیا جاتا تھا۔ لیکن ملک صاحبان محض اس کام کے لئے ہی مخصوص نہ تھے۔ بلکہ ان کے ذمہ داری میں بعد میں درج ذیل امور کو بھی شامل کیا گیا۔

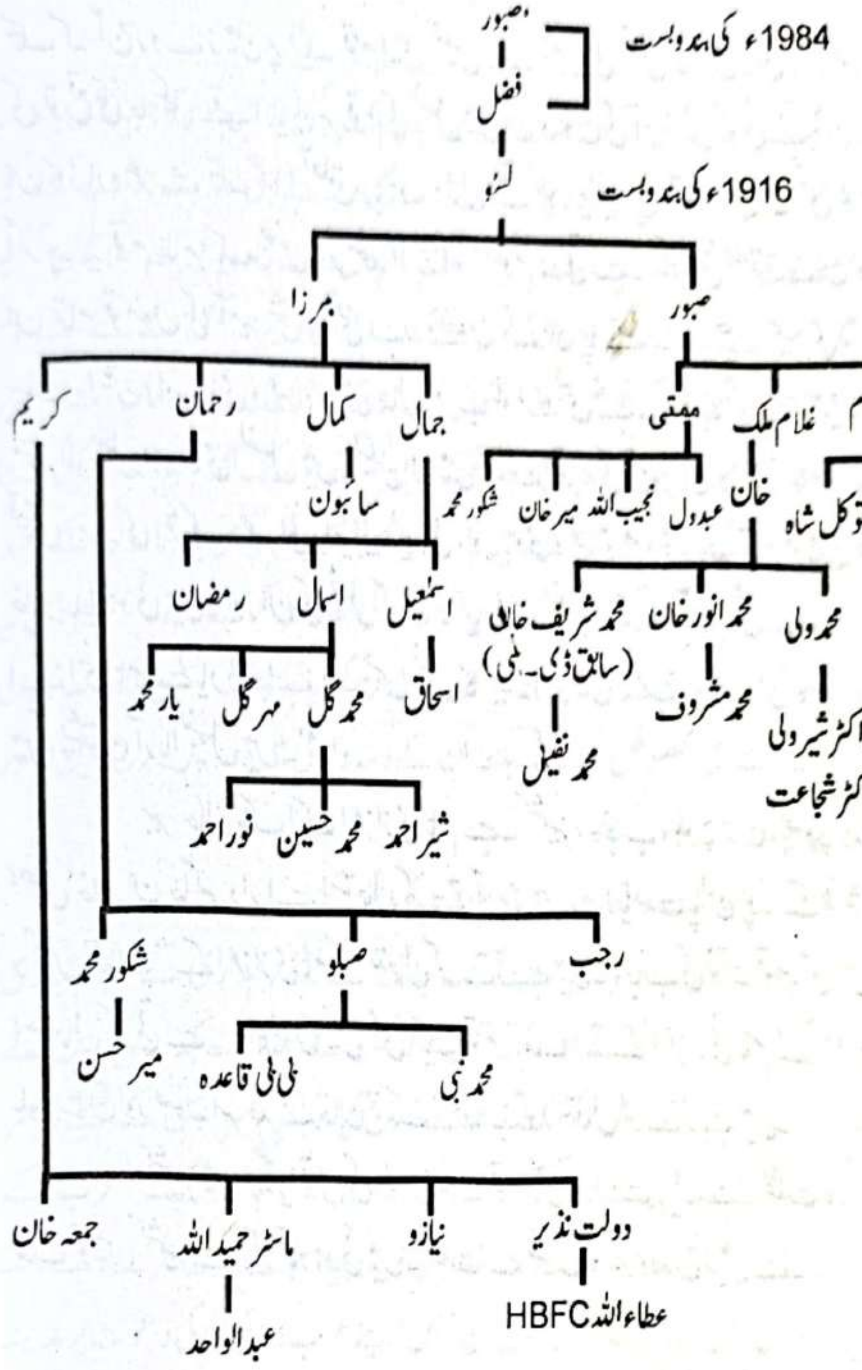
(1) علاقہ کے حالات وواقعات سے حکام وقت کو باخبر رکھنا

(2) ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک جانے کے لئے راہداری کے احکام جاری کرانا ملکوں کی قدیم تاریخ بیان کرتے ہوئے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے۔ کہ جب بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بنی اسرائیل کو ملک شام سے خارج کیا تو بنی اسرائیل کے قبیلے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ کچھ عرب میں بسے اور کچھ خراسان و افغانستان میں آباد ہوگئے۔ عرب کے بنی اسرائیل میں سے ایک عرصے کے بعد خالد بن ولید پیدا ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد افغانی بنی اسرائیل میں سے ایک شخص قیس ابن عیص اپنے عرب بھائیوں کی دعوت پر مدینہ آیا۔ کہا جاتا ہے حضورؐ نے قیس کا اسلامی نام عبدالرشید رکھا اور فرمایا۔ کہ تم طالوت یعنی ساول کی اولاد سے ہو۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے ملک کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ لہذا ہم آپ کو آئندہ ملک کے خطاب سے ہی پکاریں گے۔ اور یوں یہ خطاب عام ہوا۔ اس روایت کی صداقت مشکوک ہے کیونکہ افغانوں کا بنی اسرائیل سے ہونے کا نظریہ بہت سے محققین قبول نہیں کرتے لہذا ایک قیاسی مفروضہ پر حقیقت کی دیواریں کھڑی نہیں کی جاسکتیں۔ یہ بہادر شاہ ظفر کاکا خیل اپنی تاریخ "پشتون تاریخ کے آئینہ میں" میں لکھتے ہیں۔ "لیکن یہ حال اکیلے پشتونوں کا ہی نہیں ہے۔ تمام یورپی اور ایشیائی قوموں کی نسلیں بھی خلط ملط ہوئی ہیں۔ یہاں

تک کہ آج روئے زمین پر ایک قوم ایسی نہیں ہے۔ جس کی نسل خالص رہی ہو۔ اور نہ ہی اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم کی نسل میں ان لوگوں کی آمیزش ہوئی ہے جن کے ساتھ ان کا زیادہ عرصے تک گہرا تعلق رہا ہو۔ مثال کے طور پر یورپی اقوام میں فرانسی قوم کو لیجئے۔ اگرچہ یہ قوم بظاہر یک جنس اور متحد الاجزاء معلوم ہوتی ہے۔ لیکن فی الحقیقت ان لوگوں میں ان تمام قوموں کی آمیزش ہوگئی ہے۔ جنھوں نے ان پر حملے کئے۔ جیسے سیمیری، نارمن، سات، اکیٹن، اور رومی وغیرہ۔ یہی حال عرب قوم کا بھی ہے۔ عرب اگرچہ وسیع معنوں میں متحد الاصل اور سامی النسل ہیں۔ لیکن ان میں مختلف اقوام کی آمیزش اور اختلاط ہوا ہے۔ جیسے فینقی، بربری، ترک، عبرانی، ایرانی، یونانی، اور رومی وغیرہ کم و بیش یہ تمام قومیں عربوں میں خلط ملط ہوئی ہیں۔ اور ان کی نسل کو متاثر کیا ہے۔ لیکن اختلاط و آمیزش کے باوجود ایک قوم اپنے اسی نام سے یاد کی جائے گی۔ جس نسل کا حصہ اس میں غالب ہوگا۔ اس بنا پر ہمارے خیال میں پشتون آریا النسل ہیں۔"

بہر حال ملک ایک اعزازی نام ہے۔ کشمیر، پنجاب، بلوچستان، صوبہ سرحد، میں بعض خاندان جاگیر دار اسے استعمال کرتے آئے ہیں۔ ریاست پالن پور کے اکثر مسلمان رئیس "ملک" کے اعزازی نام کو استعمال کرتے رہے ہیں۔ پنجاب کی ٹوانہ قوم بھی اس خطاب کو استعمال کرتی ہے۔ بنگالیوں میں بھی ایک قوم "ملک" کے اعزازی نام سے معروف ہے۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد کے خان "ملک" خطاب کو استعمال کرتے رہے ہیں۔

کشمیر میں دیگر اقوام کی طرح ملک قوم بھی زراعت پیشہ ہے۔ گلگت اور اسکردو میں ملک قومیں کشمیر سے آکر آباد ہوئی ہیں۔ گلگت کے ملکوں کا شجرہ درج ذیل ہے۔



گلگت میں ملک محمد حسین بازار والے بھی ملک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ محمد دین فوق مسلمانوں کی بعض اقوام کے خطاب کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ "مسلمانوں میں ککے زیئی، ٹوانہ، گجر، پٹھان، نون، اور چند دیگر ذاتیں ملک کہلاتی ہیں۔ کشمیری مسلمانوں میں ملک ایک گوت قرار پا چکی ہے۔ ملتان میں نون قوم کو رانا بھی کہا جاتا ہے۔ وہ پھر لکھتے ہیں۔ معزز زمینداروں کو چوہدری اور ملک بھی کہتے ہیں۔ پٹھان تو ہر جگہ خان ہی ہیں۔ خواہ وہ کسی قبیلہ سے ہوں۔ لیکن افغانستان اور سرحدی اضلاع میں افغان نمبرداروں کو ملک کہتے ہیں۔ کشمیر میں ہر

معزز مسلمان خواجہ کہلاتا ہے۔ ہر ہندو خواہ وہ راجپوت، برہمن، ویش یا شودر تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد شیخ کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

ملا اور آخون :

آخون بھی اصل میں کوئی گوت نہیں بلکہ ایک معزز خطاب ہے۔ جو مسلمانوں کے لئے وقف ہے۔ لیکن کشمیر میں اس نام کے ہندو خاندان بھی پائے جاتے ہیں۔ آخون ملاگری کے فرائض سر انجام دیتا ہے۔ کشمیر میں اسے ملا کے ساتھ درجہ بند کیا گیا ہے۔ تاریخ حسن میں مُلاؤں کی چار اقسام بیان ہوئی ہیں۔

(1) مساجد میں امامت کے فرائض سر انجام دیتے ہیں۔ فتاویٰ اور خطابات کی ذمہ داری بھی ان کے سر ہوتی ہے۔ یہ درس و تدریس کے فرائض بھی بجالاتے ہیں۔ کشمیر میں ایسے ہی فرائض انجام دینے والوں کو آخون بھی کہتے ہیں۔

(2) گورکن

(3) غسال

(4) کچھ مُلا زمینداری کا کام کرتے ہیں۔

پنڈتوں میں ایک قوم مُلا بھی کہلاتی ہے۔ پنڈت جگت نرائن مُلا یوپی گورنمنٹ میں وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ اور اردو ادب میں ایک نام بھی رکھتے ہیں۔ مُلا خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں جو پنڈت درس و تدریس کے کام پر مامور ہوتے تھے۔ وہ بھی مُلا اور آخون کہلاتے تھے۔ محمد دین فوق یہ بھی لکھتے ہیں۔ کہ پنجاب کے مُلاؤں اور کشمیر کے مُلاؤں میں اتنا فرق ہے۔ کہ پنجاب میں مسجدوں کے مُلا امامت تو پڑھاتے ہیں اور بعض غسالی کا کام بھی کرتے ہیں۔ مگر گورکنی کا کام نہیں کرتے۔ بلکہ فرقہ گورکنان الگ ہے۔ جن مُلاؤں کے کام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ فتاویٰ کا کام بڑی بڑی مسجدوں خصوصاً جامع کے ملا اور خاص خاص قابلیت کے مولوی لوگ سر انجام دیتے ہیں۔

محمد عبداللہ قریشی اپنے مقالہ "کشمیری ذاتوں کے عجائبات" میں لکھتے ہیں۔

"البتہ ملا علم و فضل کی علامت ہے۔ یہ لفظ مسلمانوں میں مذہبی پیشواؤں کی ایک قسم کے لئے بولا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ابو العلی مہر بن علامہ افضل حق پوری مولانا ابو الکلام آزاد کے ایک خط کے حوالے سے جو ان کے نام ہے۔ فرماتے ہیں۔ "تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ

عربی نہیں بلکہ یہ لفظ آرمینی فیلا" ہے۔ جس کے معنی پڑھانے والا یا استاد کے ہیں۔ اس لئے ترکی کے علماء ہمیشہ ہی فیلا کہتے رہے ہیں۔ عربی و فارسی میں یہ لفظ آرمینی زبان سے بالواسطہ ترکی میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان کے مستند لغات میں اس لفظ کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ ایران میں یہ لفظ ان یہودی استادوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ جو آرمینا سے آکر درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرتے تھے۔ اس امر کی تصدیق فرہنگ نظام جلد 5 صفحہ 220 سے کی جا سکتی ہے۔ ان لوگوں کو اس نام سے پکارا جاتا تھا۔ جو طلسم اور تعویذ عورتوں کو دیا کرتے تھے۔ نیز یہ بھی تحقیق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ چھٹی صدی ہجری کے آخر تک عام طور پر عربی تحریروں میں مستعمل نہ تھا۔ اس لئے ابو الفراح شمش الدین جوزی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کسی کے نام کے ساتھ مُلا یا مُیلا نہیں لکھا۔ مسلمانوں میں قدیم ترین آدمی جو ملا کہلایا وہ ایک شیعہ فقیہہ ملا حسین واعظ الکاشفی ہے۔ جو تاتاری سلطان نور الدین 659ھ کا معاصر تھا۔ اس کی تصدیق تاریخ مصر مصنف امام سے کی جا سکتی ہے۔ (ماہنامہ المصطفیٰ فروری 1957ء) علامہ شہاب الدین محمود الوسی البغدادی جن کی تفسیر روح امعانی بڑی معرکتہ الارا تفسیروں میں شمار ہوتی ہے۔ قسطنطنیہ کے سفر نامے میں ایک موقعہ پر مُلا کے لفظ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ بعض لوگ میم کو زیر دے کر اس کا تلفظ کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ من لا تجھل (جو جاہل نہیں) کی یہ تخفیف شدہ شکل ہے۔ تجھل کا لفظ ساقط ہو گیا ہے۔ صرف "من لا" رہ گیا ہے۔ نون لام میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ اور مُلامن گیا۔ اس کے علاوہ ایک قول یہ بھی نقل کرتے ہیں۔ کہ مُلا کا لفظ املأ سے ماخوذ جس کے معنی لیکچر دینے کے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ بعض لوگ مولیٰ کو اس لفظ کی اصل بتاتے ہیں۔ یہ میرے نزدیک صحیح نہیں۔ ان کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ ایرانی یا فارسی زبان کے کسی لفظ سے بنا ہو۔ اس بنیاد پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ترکستان اور تبت کے بدھ پیشواؤں کے آخر میں لامہ کا جو لفظ آتا ہے۔ جیسے دلائی لامہ جو تبت کے بدھ پیشوا کا خطاب ہے۔ تو کیا اسی لامہ کو الٹ کر ملا کا لفظ بخارا و خراسان میں بنا لیا گیا ہو۔" محمد عبداللہ قریشی صاحب پھر لکھتے ہیں کہ کشمیر کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سری نگر کے محلہ ملہ پوری کے رہنے والوں کو بھی ملہ یا ملا کہتے ہیں۔ یہ محلہ گنپت یار کے پاس سری نگر میں واقع ہے۔ یوپی کے مشہور شاعر پنڈت نرائن ملا کشمیر کے ہی ملا خاندان کے ایک فرد ہیں۔ پنڈت جگت نرائن ملا لکھنو یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور یوپی کے منسٹر رہ چکے ہیں۔"

یہ بات خاص طور پر توجہ کے لائق ہے کہ کشمیری پنڈتوں کی ان گنت ذاتیں ہیں۔

نسلی، اندرونی، بیرونی، نسبتی، خطابی، پیشہ وری، کاروباری، علمی، وغیرہ پنڈت خود بید بھاشا جانتے ہیں۔ اور سکھاتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ آخون کہلاتے ہیں۔ کشمیری آخون بھی تقریباً ایسا کام کرتے ہیں۔ کشمیری پنڈتوں کی ایک گوتر ان ہی حوالوں سے آخون کہلاتی ہے۔ اسی طرح جو پنڈت سیدوں کے ساتھ رہتے یا اُن سے کیسی بھی نسبت رکھتے "سید" کے خطابی نام کو خود استعمال کرتے۔ مُلا کے فرائض کے حوالے سے بھی پنڈت چونکہ ایسا کام بھی کرتے تھے۔ اس لئے پنڈتوں کی کئی مشہور ذاتیں ملہ کہلائیں۔ اسی طرح درانی، ترکو، بارک، زئی، جلالی سیدوں، مصری، پیر پنڈت بھی ہوئے۔ محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں۔ کہ کشمیری پنڈتوں میں جو سید کہلاتے ہیں۔ اور سیادت کی نسبتیں استعمال کرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ محض اس خانوادہ سے اپنے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان نسبتوں کے معنوی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کسی برتری اور تفوق کا پہلو اپنے سامنے نہیں رکھتے۔ قریشی صاحب کی یہ بات درست ہے اسی طرح پنڈتوں کے آخون یا ملا کہلانے سے اگرچہ یہ اسلامی خطابات ہیں۔ پنڈت کسی برتری کے بغیر اپنی پیشہ ورانہ یا معاملاتی تعلقات کا اظہار کرتے ہیں۔

بہر حال شمالی علاقہ جات میں "مولیٰ" کے تلفظ میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ اور اس سے مراد ملا ہی ہے۔ فیروز اللغات میں مُلا کا ماخذ مولیٰ ہی بتایا گیا ہے۔ اس کے معنے نہایت عمدہ لکھنے والا، عالم، فاضل، مسجد میں نماز پڑھانے والا، اور بچوں کو پڑھانے والا کے ہیں۔ شمالی علاقہ جات میں مولیٰ کی یہی صفات سمجھی جاتی ہیں۔ آخون یا آخوند کے معنے استاد، معلم کے ہیں۔ ہمارے علاقے میں آخون تعویز کرنے والا، دم دعا کرنے والا، جادو، منتر کے اثرات زائل کرنے والا کو کہتے ہیں۔ یہاں مُلا یا آخون کی کوئی قومیت تسلیم نہیں کی جاتی لیکن کشمیر میں یہ باقاعدہ قومیت ہے۔ شمالی علاقہ جات میں ملاؤں کی قدر ہے۔ اور انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تاہم وہ ہر شخص آخون کہلاتا ہے۔ جو کوئی دم کرتا ہے یا تعویز کرتا ہے۔ آخون کے لئے کسی بڑی علمیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

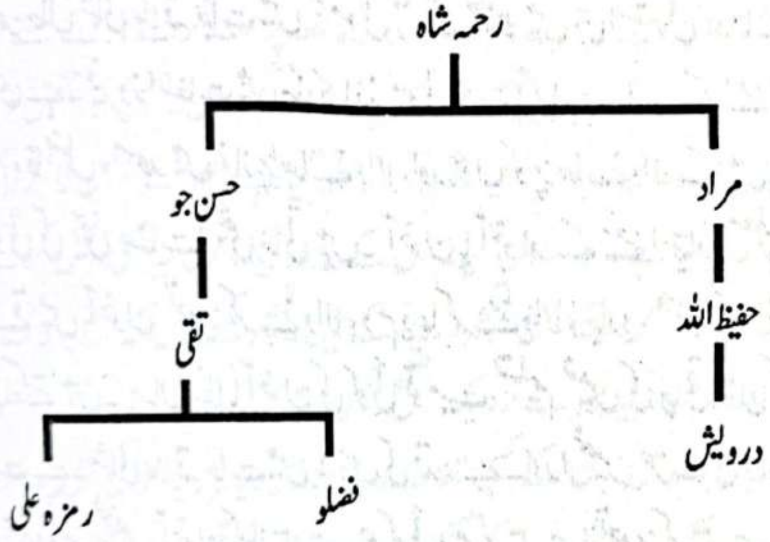
1916ء کی بندوبست دوم میں آخونوں کے دو خاندانوں کا ذکر ہے۔ یہ دونوں خاندان کشمیر سے گلگت آئے ان خاندان کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ایران سے تبلیغ کی غرض سے کشمیر آئے تھے۔ اور پھر کشمیر سے گلگت آئے۔ یہ بات صحیح ہے کہ وہ کشمیر سے گلگت آئے ہیں۔ لیکن آخون لوگوں کی یہاں تبلیغ کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ آخون درس و تدریس کرتے رہے ہیں۔ یہاں آخون یا مولوی یا مُلا ہر قومیت میں ملتے ہیں۔ لیکن

بندو بستی ریکارڈ میں دو آخون خاندانوں اور ایک مُلا خاندان کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ مُلا خاندان بھی کشمیر سے گلگت آیا کیونکہ مُلا خاندان رکھنے کا رواج محض کشمیر میں ہے۔ اور کہیں موجود نہیں۔ صوبہ سرحد، کوہستان، دیامر، کی طرف آخون، اخوندے بھی کہلاتے ہیں۔ پٹھانوں میں اخوند خیل بھی آخوندوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ گوہر آباد میں مولوی راجی الرحمت استاد اور ملا حبیب کا گھرانا آخوندے کہلاتے ہیں۔ کثروٹ میں عزیزو کا گھرانا آخوندوں کا گھرانا کہلاتا ہے۔ کوٹ محلّہ کے لوگ بھی آخون کہلاتے ہیں۔ لیکن بندو بستی ریکارڈ میں یہ زرگر درج ہوئے ہیں۔

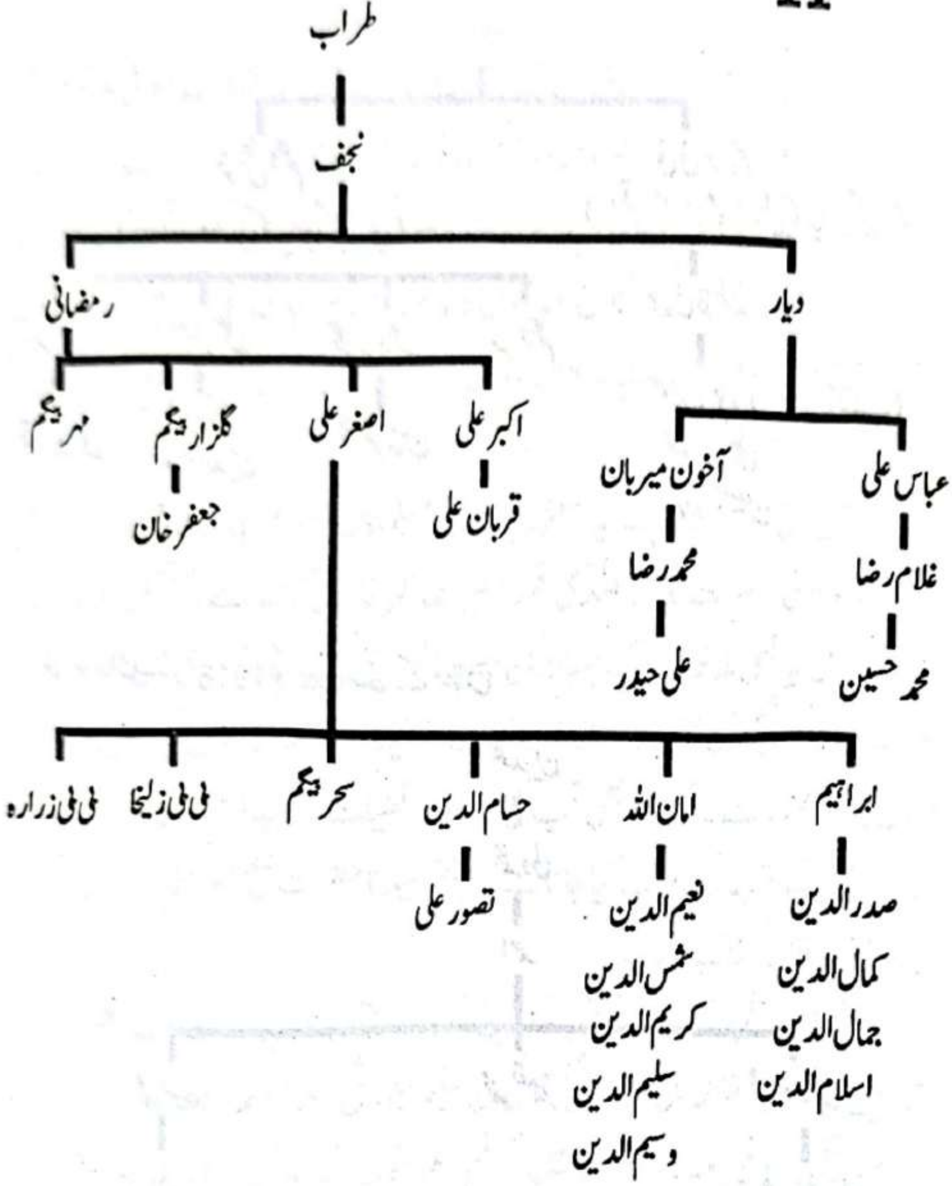
البتہ 1916ء کی بندوبست میں آخون خاندان کے دو شجرے اور ملا خاندان کا ایک شجرہ مندرج ہے جو یہاں دیا جارہا ہے۔

آخون قوم I

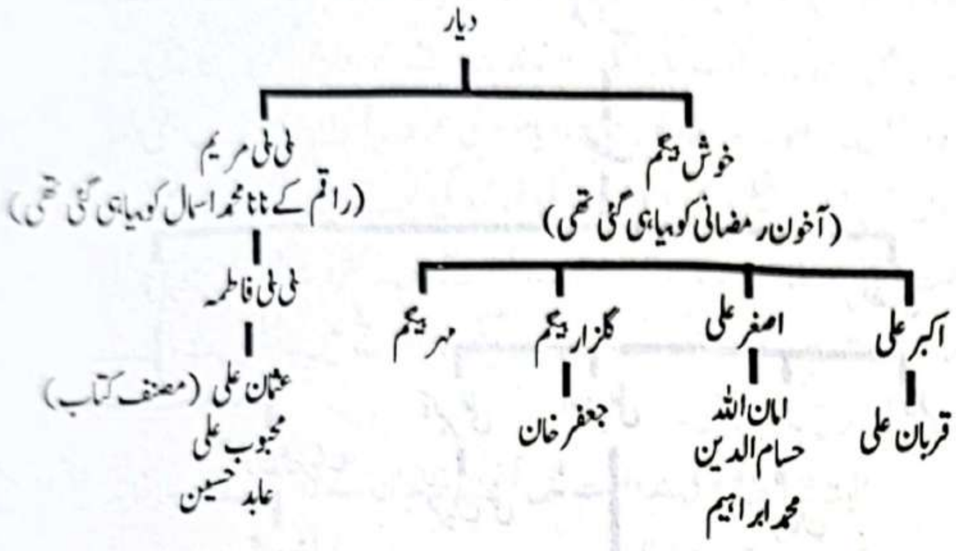
آخون :



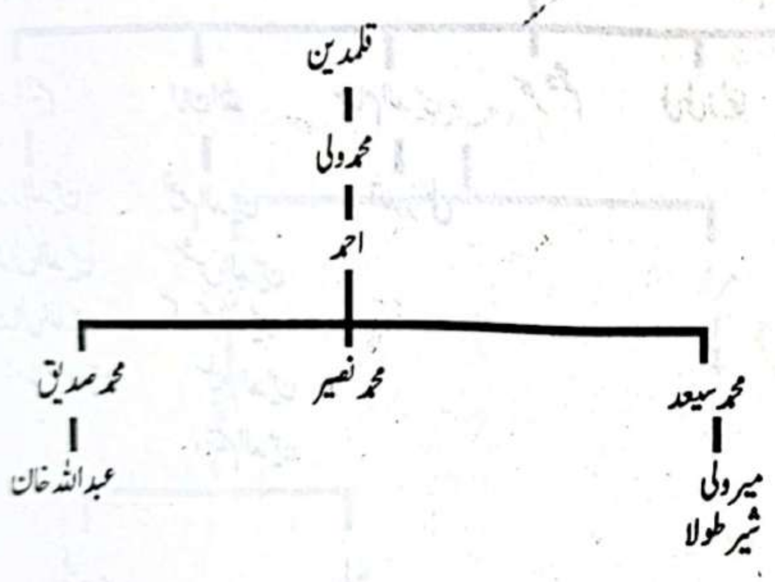
II


طراب
نجف
رمضانی
دیار
مہر بیگم
گلزار بیگم
اصغر علی
اکبر علی
آخون میربان
عباس علی
جعفر خان
قربان علی
محمد رضا
غلام رضا
علی حیدر
محمد حسین
بی بی زرارہ
بی بی زلیخا
سحر بیگم
حسام الدین
امان اللہ
ابراہیم
تصور علی
نعیم الدین
صدر الدین
شمس الدین
کریم الدین
سلیم الدین
وسیم الدین
کمال الدین
جمال الدین
اسلام الدین

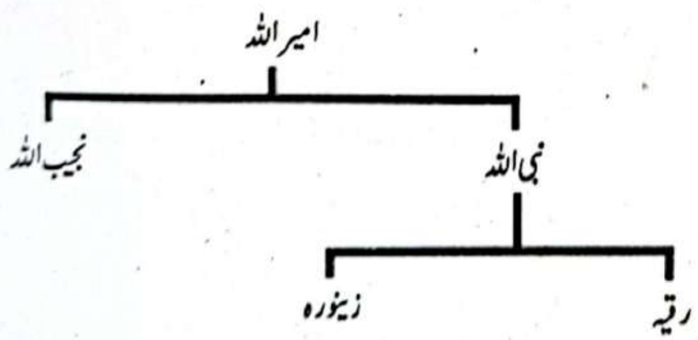
آخون طراب کے خاندان کے ساتھ راقم کا تعلق :



ملا خاندان۔ 1916ء بندوبست کے مطابق



1946ء کی جمع بندی کے مطابق ایک اور ملا خاندان



شیخ :

شیخ عربی کالفظ ہے۔اس کی جمع شیوخ اور مشائخ ہے۔ اس لفظ کے معانی پیر و مرشد ،بزرگ ، مذہبی علوم میں فائق ، پیشوا، سجادہ نشین ،خانقاہ کا سردار ، عربی سردار کے ہیں۔اسے مسلمانوں کی ایک قوم بھی قرار دیا گیا ہے۔اس لفظ سے شیخ الاسلام (مفتی اعظم)، شیخ الجامعہ (وائس چانسلر)، شیخ الرئیس ، شیخ الشیوخ)عالموں کا عالم) جیسے مرکبات بھی بنے ہیں۔ مسلمانوں میں یہ ایک محترم منکرم خطاب ہے۔ علمائے دین ،بزرگان دین ،اور برگزیدہ علماء روساء حکماء کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

شخین شیخ کا تشینہ ہے۔ یہ معزز خطاب مسلمانان اسلام کے دو برگزیدہ اور عظیم المرتبت خلفاء یعنی حضرت ابوبکرؓ صدی قور حضرت عمر فاروقؓ کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں یہ بھی مذکور ہے کہ حسان بن ثابت انصاری نے اپنی شاعری میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو شیخ کے لقب سے مخاطب کیا ہے۔ سیدنا عبدالقادر جیلانی کی شخصیت اولیاء اسلام میں بہت ممتاز ہے۔ آپ کو بھی آپ کی علمیت ، فضیلت ، نجیب الطرفین سید ہونے کی حیثیت سے شیخ کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔ یعنی سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حکیم بوعلی سینا، شیخ الرئیس کہلاتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ کے علاقے قطر ،بحرین، کویت، متحدہ عرب امارات، کے حکمران شیخ کہلاتے ہیں۔ مثلاً شیخ خلیفہ بن حماد، شیخ عیسیٰ بن سلیمان، شیخ جابر الاحمد الصباح، شیخ راشد بن سید المکتوم، شیخ زید وغیرہ۔ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے مذہبی امور کے منتظمین شیخ الاسلام کہلاتے تھے۔ مثلاً شیخ گدائی کو عہد اکبری میں سب سے پہلے شیخ الاسلام کا عہدہ ملا۔ وہ شیعہ عقائد رکھتا تھا۔ قادریہ، نقش بندیہ، چشتیہ ،سہروردیہ، کے خلفاء پیرومرشد پھر مرید بھی شیخ کے لقب سے ملقب ہوتے رہے ہیں۔ مثلا نجیب الدین عبد القادر سہروردیہ، شیخ بہاؤالدین ذکریا، شیخ احمد سرہندی، شیخ شہاب الدین سہروردیہ، شیخ محمد غوث گوالیاری، شیخ داؤ کرمانی، شیخ مطب عالم، شیخ عبدالعزیز چشتی، شیخ عبدالقدوس، گنگوہی، وغیرہ ایران میں شیخ سعدی اپنے علم و فضل کی وجہ سے کتنے مشہور تھے۔

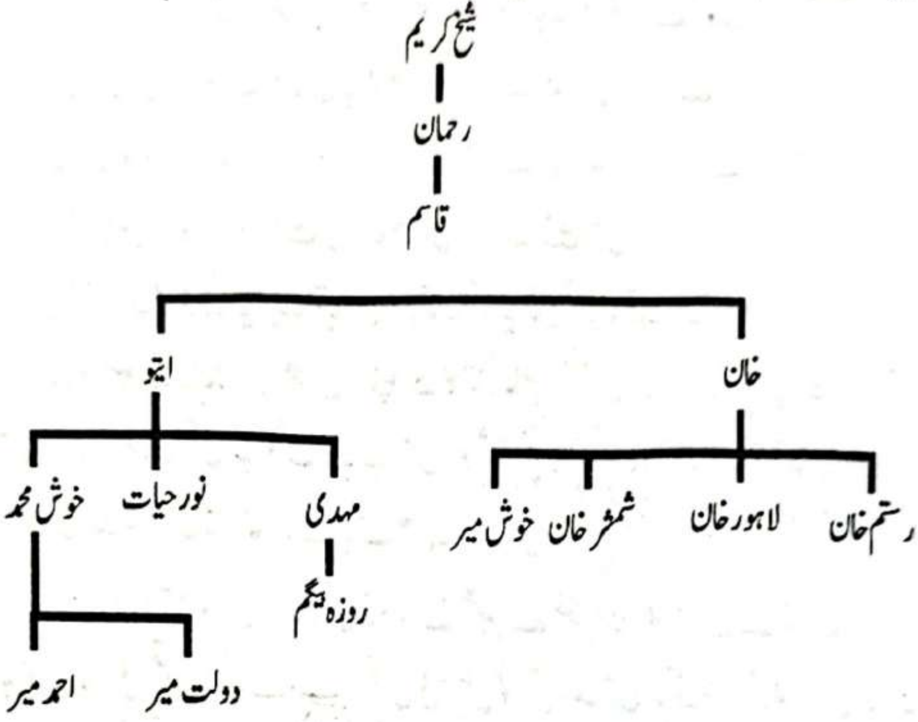
اس تفصیل سے ظاہر ہے شیخ کا لفظ تعظیم و تکریم کے حوالہ سے اسلامی دنیا میں احترام و عقیدت کا مظہر ہے۔اور یہی وجہ ہے۔اسے مسلم دنیامیں یہ خطاب اُن محترم اشخاص کو

دیا جاتا ہے جو غیر مذاہب سے اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ چنانچہ انگلستان کے باسی مز کوئیلم نے جب اسلام قبول کیا تو اسے شیخ عبداللہ کوئیلم کے متبرک نام سے پکارا گیا۔ اسی طرح جب لالہ ہرکشن لعل بار ایٹ لا کے دو فرزندان لالہ چندی لال اے اور گابھا جب مسلمان ہوئے تو ان کا نام بالترتیب شیخ محمد امین اور شیخ خالد لطیف گابھا رکھا گیا۔ شیخ خالد لطیف وہ شخص ہیں۔ جس نے بھارتی مسلمانوں کی حالت زار کو اجاگر کرنے کے لئے اپنی مشہور کتاب "خاموش آوازیں" لکھیں

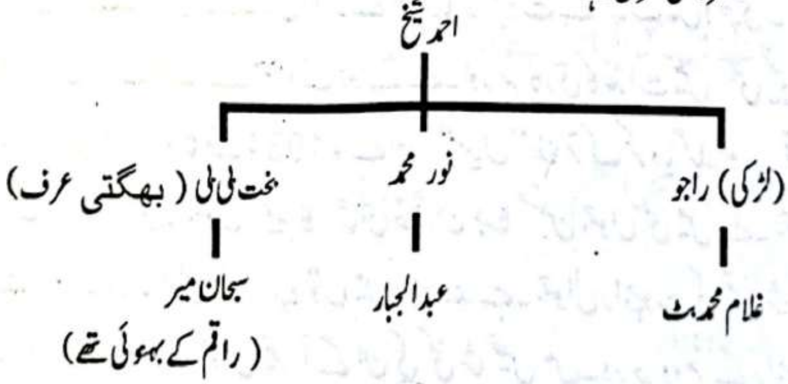
سطور گزشتہ میں میں لکھ چکا ہوں ہندوستان میں ہندوؤں میں ذات پات کی کتنی بندھنیں تھیں۔ ان کے چار ورنوں یعنی برہمن، کھشتری، ویش اور شودر میں باہمی تعلقات کی کیا نوعیت تھی۔ نچلی ذات کے لوگ کن کن مصائب سے دوچار تھے۔ ویش اور شودروں کی معاشرتی زندگی ڈور ڈنگر کی زندگی سے بدتر تھی۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، شادی بیاہ کرنے، تعلیم حاصل کرنے اور نفاذ واستعمال قانون میں ویش اور شودر کیا کیا استحقاق رکھتے تھے۔ تاریخ کی کتابوں سے عیاں ہے۔ ہندوستان اور کشمیر میں جب اسلام کی اشاعت شروع ہوئی۔ تو دین اسلام کے پاکیزہ عقائد واصول ایسے تھے۔ کہ ہندوستان میں دھرم اور معاشرے کے ستائے ہوئے لوگوں نے اسلام کو سینے سے لگایا۔ اسلام کے سایہ تلے ہی انھیں سکھ کا سانس ملا۔ یہاں چھوٹے بڑے حکمران اور غیر حکمران، راجہ و پرجا، شاہ و رعایا کی حدبندیاں نہ تھیں۔ مسجد میں عیدگاہ میں بازار میں، گھر میں، معاشرہ میں سبھی مسلمان ایک صف میں کھڑے ہوتے۔ ان ہی نو مسلموں کو مسلمانوں نے شیخ کے معزز لقب سے ملقب کیا۔

ہندوستان اور کشمیر میں جب ان چار ذاتوں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تو بعض قوموں نے اپنی قدیم ہندو قومیت کو قائم بھی رکھا اور شیخ بھی کہلائے۔ مثلاً خواجہ شیخ عزیز پنڈت، یہ دیکھا جا سکتا ہے۔ کہ مسلمان ہونے کے بعد خواجہ (معزز خطاب) شیخ ساتھ ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ کتنا بڑا اعزاز ہے۔ اسی طرح دائیں یاوانی، کول، کٹ راج، ٹاک، بٹ، گنائی، ٹوپ گرو، پکلو، شال، سُود، ملک، منٹو، مانجو، ریشی، درابو یا درانی، ترہو، واندر، سادھو ذاتوں نے شیخ کے لقب کو استعمال بھی کیا۔ اور اپنی قدیم ذاتوں کے نام بھی قائم رکھے۔ اور بعض نے شیخ کے لقب کو استعمال بھی نہیں کیا۔ لیکن عموماً ان چار ورنوں سے بہت سے لوگ جو مسلمان ہوئے انھوں نے "شیخ" کو محض بطور قومیت ہی استعمال کیا۔ ایسے لوگ اب یہ نہیں جانتے کہ ان کا کسی ورن سے تعلق تھا۔

1916ء کی بندوبست میں گلگت میں شینوں کا ایک خاندان درج ہوا۔ اس خاندان کا جد اعلیٰ شیخ کریم 1916 سے کچھ سال پہلے گلگت آیا اس کا شجرہ درج ذیل ہے۔



دوسرا خاندان۔ اس خاندان کا جد اعلیٰ احمد شیخ 1900ء کے لگ بھگ زمانے کشمیر سے گلگت آیا۔ شجرہ اس طرح ہے۔



شاہ ولی ولد چراغ محمد خان کی لڑکی ثنائی بی بی احمد شیخ کو بیاہی گئی تھی۔ ثنائی بی بی ہمبہ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

استور میں بھی کچھ شیخ خاندان ہیں جو کشمیر سے آئے۔ شمالی علاقہ جات میں بطور ذات شیخ نہ پہلے تھے۔ اور نہ اب ہیں۔ ہمارے ہاں البتہ وہ اشخاص جو عراق، ایران یا مشرق وسطیٰ کے مقدس مقامات کی زیارت سے مستفید ہوئے آتے ہیں۔ یا وہاں کے مدارس میں پڑھ کر آتے ہیں۔ شیخ کے لقب سے معروف ہوتے ہیں۔

جرال :

ہندوؤں میں کھشتری، شستری اور چھتری ایک ہی قوم کے مختلف نام ہیں۔ ہندوؤں کی ذات پات کی تقسیم کے مطابق یہ قوم برہموں کے بعد آئی۔ اس کے فرائض میں کسی بھی علاقے کے لوگوں کو اندرونی اور بیرونی خلفشاروں سے بچانا تھا۔ اسی وجہ سے ملکی نظم و نسق یعنی انتظامی، دفاعی، سیاسی معاملات کی انجام دہی ان کے حصے میں آئی۔ ان ہی کی اولاد راجپوت کہلائی یعنی راجہ کا لڑکا۔ یہ ایک امتیازی نام تھا۔ اور یہ ظاہر کرتا تھا۔ کہ موصوف کسی حکمران خاندان کا سپوت ہے۔ اس طرح راجپوت کا لفظ عام مستعمل ہونے لگا۔ راجپوت ہندو بھی ہیں۔ اور مسلمان بھی یہ لوگ پنجاب میں ہوشیار پور، کانگڑہ، شملہ، راجستھان، جموں، راجوڑی کے علاقوں میں عام پائے جاتے ہیں۔

1762ء میں راجہ رنجیت دیو نے کشمیر کے حکمران سکھ جیون کے خلاف احمد شاہ ابدالی کی مدد کی تھی۔ اس لئے اُسے اور اُس کی نسل کو اس صلہ میں ساٹھ ہزار خر اور شالی سالانہ ادائیگی کی جاتی تھی۔ تاہم اُسے کشمیر پر اور کوئی حق حاصل نہ تھا۔ 1846ء کے معاہدہ امرتسر کے بعد جب کشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ کے قبضہ میں آیا تو ڈوگرہ راجپوت کشمیر میں بھی آباد ہونا شروع ہوئے۔ اس زمانے میں ڈوگرے ٹھاکریا راجپوت کے القاب میں دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ وہ "میاں" کے لقب سے معروف ہوتے تھے۔ اور سرکاری کاغذات میں بھی یہی لفظ ان کی شناخت کا باعث ہوتا تھا۔ 1934ء کے بعد "میاں" لفظ ترک کر دیا گیا۔ اور یہ قوم سب کی سب ٹھاکر کہلائی۔ جموں کشمیر کا شاہی خاندان جسکا مسکن جموں ہی میں ہے۔ جموال کہلاتا ہے۔ اور یہ درجہ اول کے راجپوتوں میں درجہ بند ہے۔ جموال راجپوت کی تین شاخیں ہیں۔ جردیہ، منکوٹیہ، اور جموال پھر آگے ان کی کئی شاخیں ہیں۔ درجہ دوم کے راجپوتوں میں منہاس، انبارائی، چب، جرال، بھاؤ، شامل ہیں۔ راجپوت درجہ سوم میں، رکوال، سلہریہ، چاہڑک، باگل، بجیال، کھٹوعہ، پڑول، جاج وغیرہ ہیں۔ راجپوت درجہ چہارم میں ماندل، بلوال، کرتار، کھتری، سمسال، جگی، ملرترے، کنال، بھلوال، ہنس، بجو، گورے وغیرہ اور درجہ پنجم میں وانگری، بجنئی، سلہوترے، جریال، کول، آگری، گلاس وغیرہ شامل ہیں۔

جرال راجپوتوں کی درجہ دوم کی قوم ہے۔ گلگت میں اس کے کچھ خاندان موجود ہیں۔ راجہ شاہ رئیس خان تاریخ گلگت میں جرال قوم کے بارے میں جو کہانی لکھتے ہیں۔ وہ کسی

مستند تاریخ سے لگا نہیں کھاتی۔ وہ کہتے ہیں۔ 1522ء تا 1561ء کے دوران جب چترال کے شاہ رئیس اعظم کی حکومت پورے شمالی علاقہ جات میں تھی تو اس وقت راجہ بلہ شاہ نگر میں اس حکومت کا سپہ سالار تھا۔ اس دوران اس کے چھوٹے بھائی جی خان نے ایک کامیاب انقلاب کے ذریعے اپنے بھائی بلہ شاہ سے نگر کی سپہ سالاری چھین لی۔ راجہ بلہ شاہ اپنے دوسرے بھائی حیف خان کو لے کر مرکزی حکومت چترال سے مدد لینے کی بجائے کشمیر چلا گیا۔ جہاں شاہ جہاں شہنشائے ہند سیر و تفریح کی غرض سے موجود تھا۔ ان دنوں کشمیر میں کوئی خونخوار جانور جسے کشمیری میں کارن کہتے تھے۔ لوگوں پر عذاب بنا ہوا تھا۔ شاہ ہند نے ان دونوں بھائیوں کو اس شرط پر فوجی مدد دینے کا وعدہ کیا کہ اگر وہ اس خونخوار جانور کو ہلاک کرتے ہیں۔ چنانچہ دونوں نگری بھائی اس خونخوار جانور کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ شاہ جہاں نے خوش ہو کر نہ صرف یہ کہ انھیں دو تلواروں (ایک پر شاہ جہان اور دوسرے پر اورنگ زیب کندہ ہے) اور خلعت سے نوازا بلکہ اپنی خاص شاہی دستہ سے سپاہی بھی دیئے۔ جن کی مدد سے وہ اپنے بھائی سے نگر کی سپہ سالاری دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ نگر شوتا (حراموش) اور گلگت کی جرال قوم ان شاہ جہانی افواج کی اولاد ہیں۔

ان واقعات کی صداقت میں کوئی دلیل موجود نہیں۔ آپ درج ذیل موازناتی تاریخ سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ افسانہ کیا ہے اور حقیقت کیا ہے۔

(1)	راجہ شاہ رئیس اعظم اور بلہ شاہ کا دور	1522 تا 1561
(2)	ہند میں شاہ جہان کی حکمرانی کا دور	1627 تا 1658
(3)	کشمیر میں چک حکمرانوں کی آزاد حکومت	1550 تا 1582
	غازی چک	1554 تا 1563

(اس نے اس دور میں گلگت فتح کیا)

16 اکتوبر 1586ء کو اکبر نے کشمیر فتح کیا تھا۔ کشمیر پر مغلوں کا سب سے پہلا گورنر

سید یوسف خان رضوی (1587ء تا 1590ء) اسی دور میں مقرر رہا۔

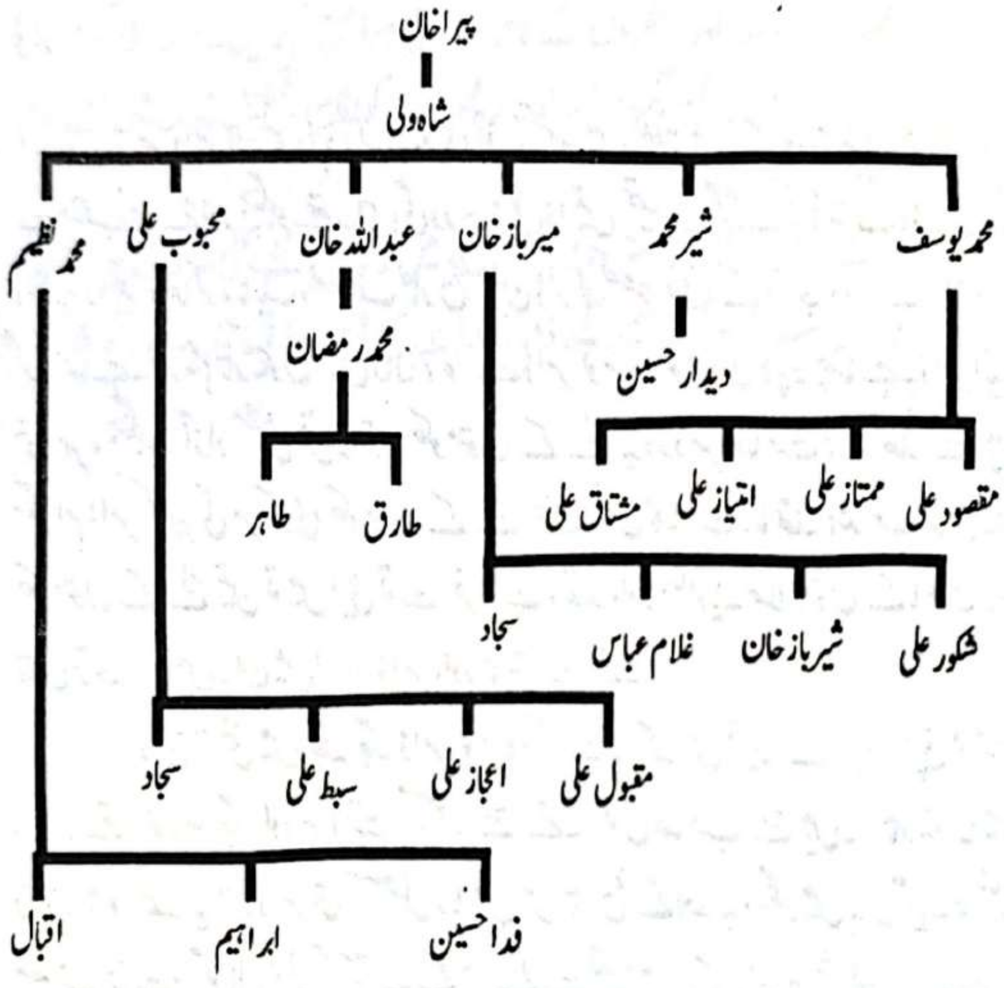
گلگت کے جس دور کا راجہ شاہ رئیس خان ذکر کرتا ہے۔ اس میں اور شاہ جہان کی حکمرانی کے درمیان ایک سو پانچ سال کا فرق موجود ہے۔ پھر کشمیر مغلوں کی تحویل میں بھی نہ تھا یہ واقعات محض افسانہ ہیں۔

پھر ان کا کہنا کہ شاہ جہانی افواج کی اولاد نگر میں جرال کہلائی بے بنیاد ہے۔ جیسے میں نے پہلے لکھا ہے۔ جرال راجپوتوں کی درجہ دوم کی قوم ہے۔ اور ڈوگروں کی ایک اہم ذات ہے۔ ان کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ پٹھا: یہ خاندان کے بانی ران بھیٹ کے اٹھارہ بھائی تھے۔ ہر بھائی الگ الگ قوم کا بانی ہوا۔ ان میں ایک بھائی "جرا" کے نام سے معروف تھا۔ اور یہی لفظ بگڑ کر ارد گرد آج بھی جرال بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔

گلگت پر کشمیر کے سلاطین کے حملے ہوتے رہے ہیں۔ اور یہ اکثر کشمیر کا زیر نگین علاقہ رہا ہے۔ اس لئے ان افواج کے ساتھ کچھ جرال بھی آئے اور یہاں ادھر اُدھر بسے۔ جرال رانا بھی کہلاتے ہیں۔ رانا دراصل راجپوتوں کا ایک خطاب ہے جو راجہ کے بیٹے کو ملتا ہے۔ اس لئے راجپوت قومیں اپنے نام کے ساتھ "رانا" کے لقب کو بھی استعمال کرتی ہیں۔ جرال اور رونو کے حوالے سے آگے مزید تفصیلات لکھی جائیں گی۔

(1947ء کی جنگ آزادی گلگت کے ایک ہیرو میجر محمد خان (8 اگست 1947ء گلگت سکاؤٹس کے ایڈ جوئنٹ اور کوارٹر ماسٹر) تھے جنہوں نے گلگت کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ جرال قوم کے ایک سپوت تھے۔

محکمہ بندوبست کے ریکارڈ کے مطابق درج ذیل جرال خاندان کا شجرہ یہاں دیا ہے۔



اس خاندان کا جداعلیٰ راجوڑی سے گلگت آیا تھا۔

ڈار :

سر والٹر لارنس اپنی کتاب ویلی آف کشمیر میں لکھتے ہیں۔ کہ وہ مسلمان جو کھتریوں سے مقلب ہوئے اور جنگجو تھے۔ اس کی درجہ ذیل ذاتیں تھیں۔ ماگرے، تانترے، ڈار، رینہ، ڈانگر، راتھر، ٹھاکر، نایک، مصنف تاریخ حسن ڈار کو کھشتریوں کے درجہ دوم کے راجپوت گردانتا ہے۔ قدیم تاریخوں میں 700ء سے ڈامر قوم کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ ڈامر ایک خود سر، جنگجو، آزاد منش قبیلہ تھا۔ حکومتوں کے لئے یہ دردسر کا باعث ہوتا تھا۔ کہتے ہیں سنگرام ڈامر کشمیر کی مرکزی حکومت کے لئے سخت ہلچل کا باعث رہا تھا۔ ہند عہد قدیم میں حکومتوں کے لئے تین قومیں اپنی قوت، فراست، تدبر، اور جنگجویانہ صلاحیتوں کے باعث سے قابل توجہ رہی ہیں۔ ان میں لون، ڈامر، اور تانترے تھے۔

راج ترنگنی میں جگہ جگہ ڈامر قوم کا ذکر ہے۔ کہ اس قبیلہ کے سردار اپنی فوجیں رکھتے تھے۔ اور ہر جگہ اور ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ فوق صاحب کہتے ہیں۔ تاریخوں میں 1120ء تک یہ لفظ ڈامر ہی مستعمل رہا لیکن اس تاریخ کے بعد یہ دانگر میں بدل گیا۔ فاضل مصنف پنڈت ہرگوپال کول کی کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ کہ راجہ ہرش اور اس کے وزیر بجے کی لڑائی کے نتیجہ میں وزیر شکست کھا کر دردستان میں پناہ گزین ہوا تھا۔ ڈانگر قوم کی مدد سے پھر اُس نے کشمیر پر حملہ کیا۔ راجہ سوسل کی حکمرانی کے دور میں دو طاقتور قوموں ڈانگر، اور لون کا خصوصی ذکر ملتا ہے۔

1325ء کے بعد جب مسلم سلاطین کی حکمرانی کا دور شروع ہوا تو ڈانگر قوم کے بڑے بڑے جتھوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ بات مسلم حکمرانوں کے لئے طاقت کا باعث بھی ہوئی۔ سلطان فتح شاہ (1487ء تا 1499ء) کے دور حکومت میں ملک سید ڈار انتہائی بااثر شخصیت تھا۔ اس کے مشورہ کے بغیر سلطان کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ سیف ڈار 1487ء تا 1496ء تک وزیر اعظم رہا۔ یہ سیف ڈار ہی تھا جس نے جہانگیر ماگرے کو شکست دینے میں فتح شاہ کی مدد کی تھی۔ بہر حال بعد میں سیف ڈار سلطان پر اتنے ہاوی ہو گئے تھے۔ کہ فتح شاہ محض کٹھ پتلی ہو کر رہ گیا۔ ایسے حالات میں سیف ڈار کو ختم کرنے کے لئے ایک خفیہ منصوبہ بنایا گیا۔ اور اسے ہلاک کیا گیا۔ بہر حال ڈار قوم ڈانگر اور ڈامر کے ناموں سے مشہور ہوئی۔ پٹھانوں کے دور میں باغ سیف ڈار، ڈار وباغ کے نام سے موسوم رہا۔

کشمیر میں ڈاروں اور ڈانگروں کے نام سے کئی مواضع آباد ہیں۔ مثلاً ڈانگر پورہ، سرائے ڈانگر پورہ، اور ڈاروں کی دیگر مواضعات ترچھ پورہ، کولگام، تحصیل خاص میں اس قوم کے نام پر کئی مواضع آباد ہیں۔

پنجاب، کشمیر، گلگت، استور، اور بلتستان، میں ڈار قوم کے کئی خاندان آباد ہیں۔ 1916ء کی بندوبست میں گلگت میں کچھ ڈار خاندان ریکارڈ ہوئے ان میں سے کچھ کا شجرہ یہاں دیا جاتا ہے۔

- دیانی
  - احدؔ
    - قدیر
      - (لڑکی) ہوا
  - شعبان
    - جان (بونجی میں مقیم ہوا)
  - صدو
    - داوو (جنگوٹ میں مقیم ہوا)
      - بکدُر
        - ختاور
          - یماٹ
            - منصور یماٹ
          - صنوبر خان
            - مقصود عالم
          - شوکت علی
            - محمد نعیم
        - قربان
          - نور محمد
            - صادق
          - شیر ولی
            - اعظم
          - عبدالصمد
            - واحد
        - اکبر خان (بونجی چلا گیا)
          - برکت
            - الطاف
          - انور
            - خالد

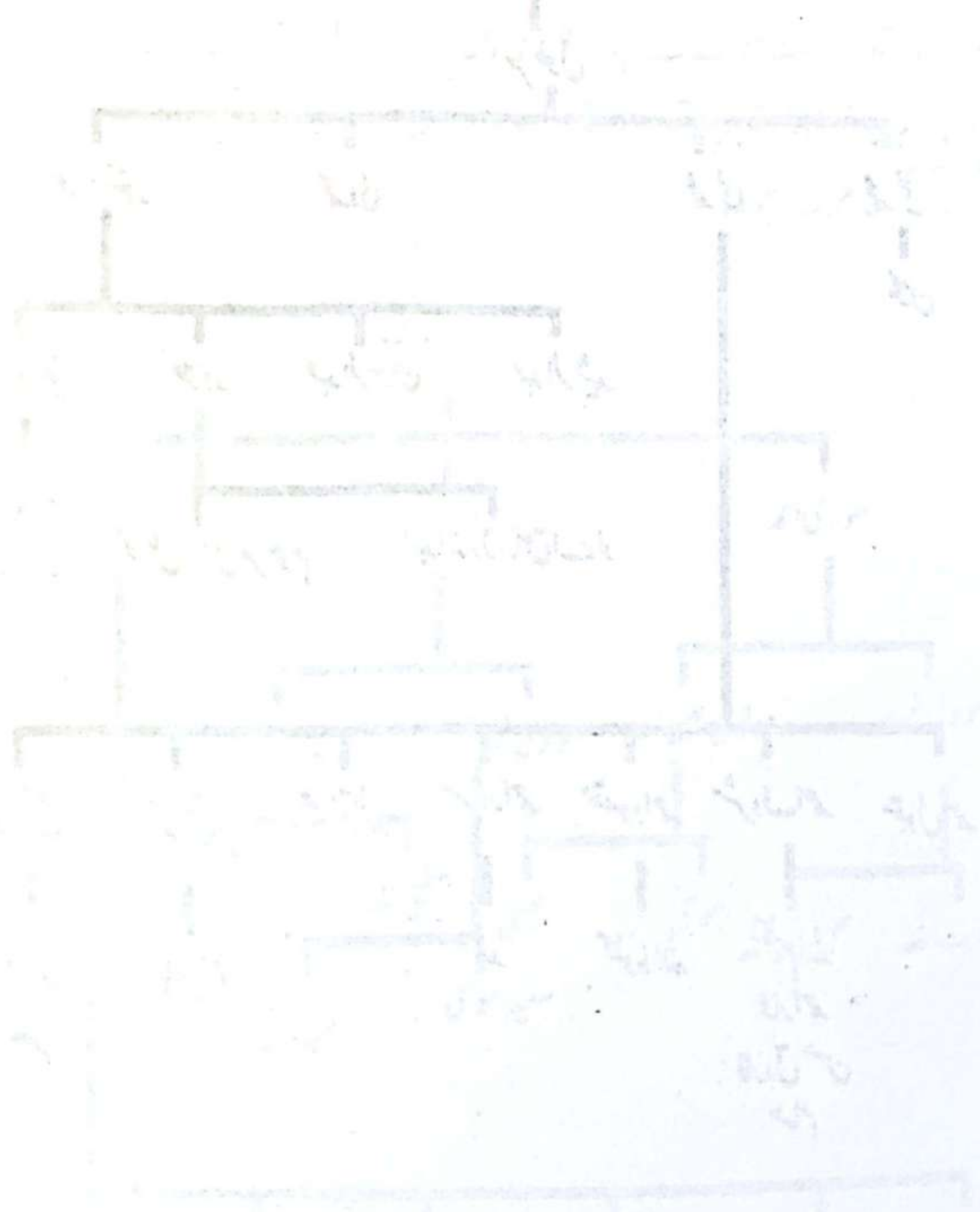
ہو ابراہیم جو کو بیاہی گئی اور قدیر کی اراضی ابراہیم جو کی اولاد کو عود ہوئی۔ ان کی اولاد درج ذیل تھی۔

- ابراہیم جوؔ
  - مجلون
    - محبوب بوٹ والے
  - شرین خان
    - سلطان ولی مرحوم
  - عیسیٰ
  - گلو
  - فقیر
  - گون
    - مولوی نذیر اللہ
  - راحیلہ
    - عبدالعزیز
      - سیف الرحمان

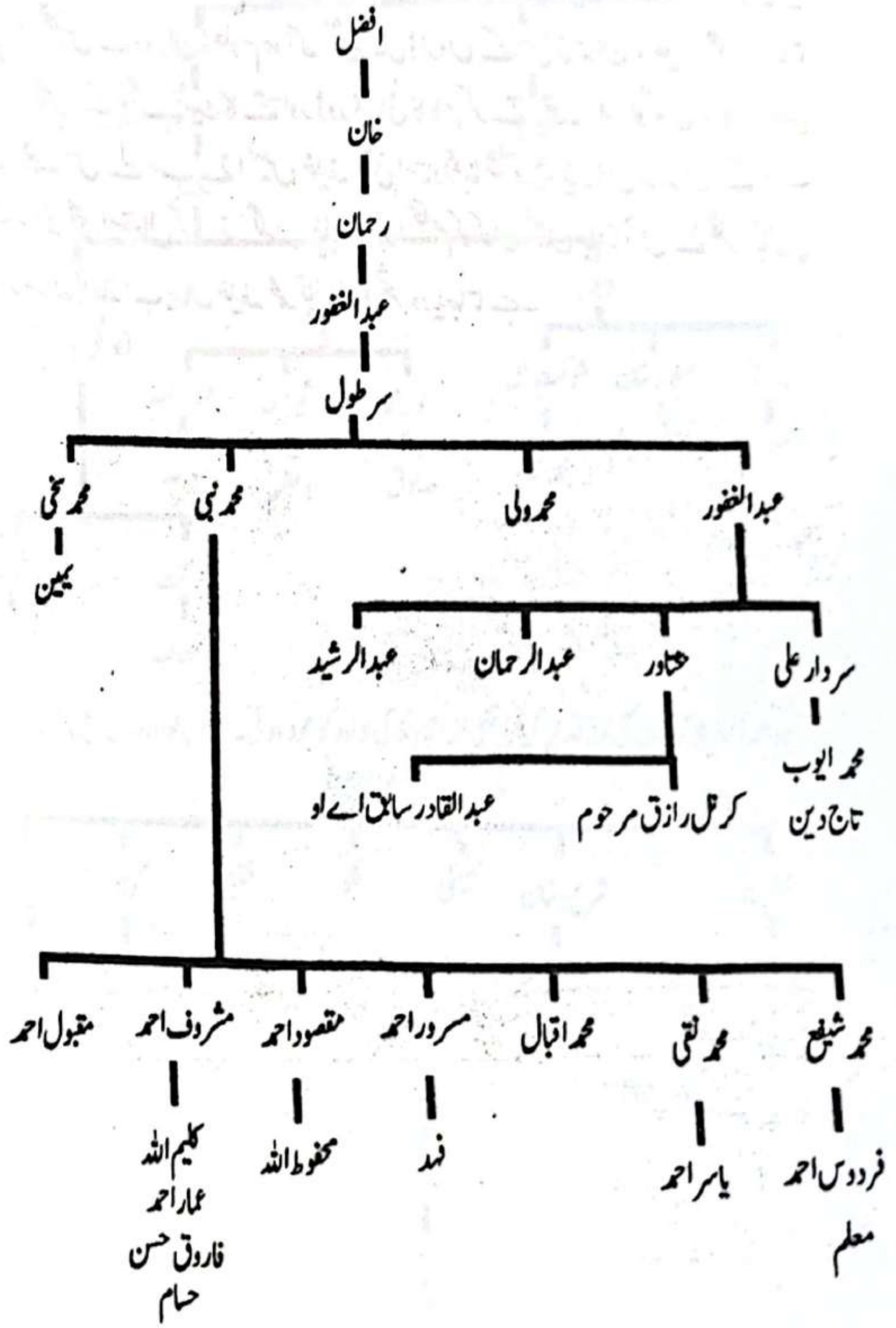
دوسرا خاندان

- افضل
  - خان
    - رحمان
      - عبدالغفور
        - سرطول
          - عبدالغفور
          - محمد ولی
          - محمد نبی
          - محمد تخی

محمد نبی ڈار میرے والد گرامی منشی محمد یوسف کے دوست اور ساتھی تھے۔ میرے والد گرامی انھیں خلیفہ بھی کہا کرتے تھے۔ میں اُس وقت یہ نہیں جانتا تھا کہ اِس لفظ کے استعمال کی کیا وجہ ہے ؟ تحقیق کے دوران معلوم ہوا کہ کشمیر میں ڈاروں کے اُس خاندان کو خلیفہ بھی کہا جاتا تھا۔ کہ جس کے لوگ پشمینہ کاتتے اور ڈوری بافی کا کام کرتے تھے۔ اور لوگوں کو کام سکھایا کرتے تھے۔ اس لئے سب نے انہیں خلیفہ یعنی استاد کہنا شروع کیا۔ اس خاندان کے لوگ خلیفہ کا سابقہ بھی استعمال کرنے لگے۔ خلیفہ عبدالحکیم کو کون نہیں جانتا جس نے فکر اقبال پر اپنا نادر مقالہ لکھا۔ اب یہاں خلیفہ محمد نبی ڈار کا شجرہ دیا جاتا ہے۔

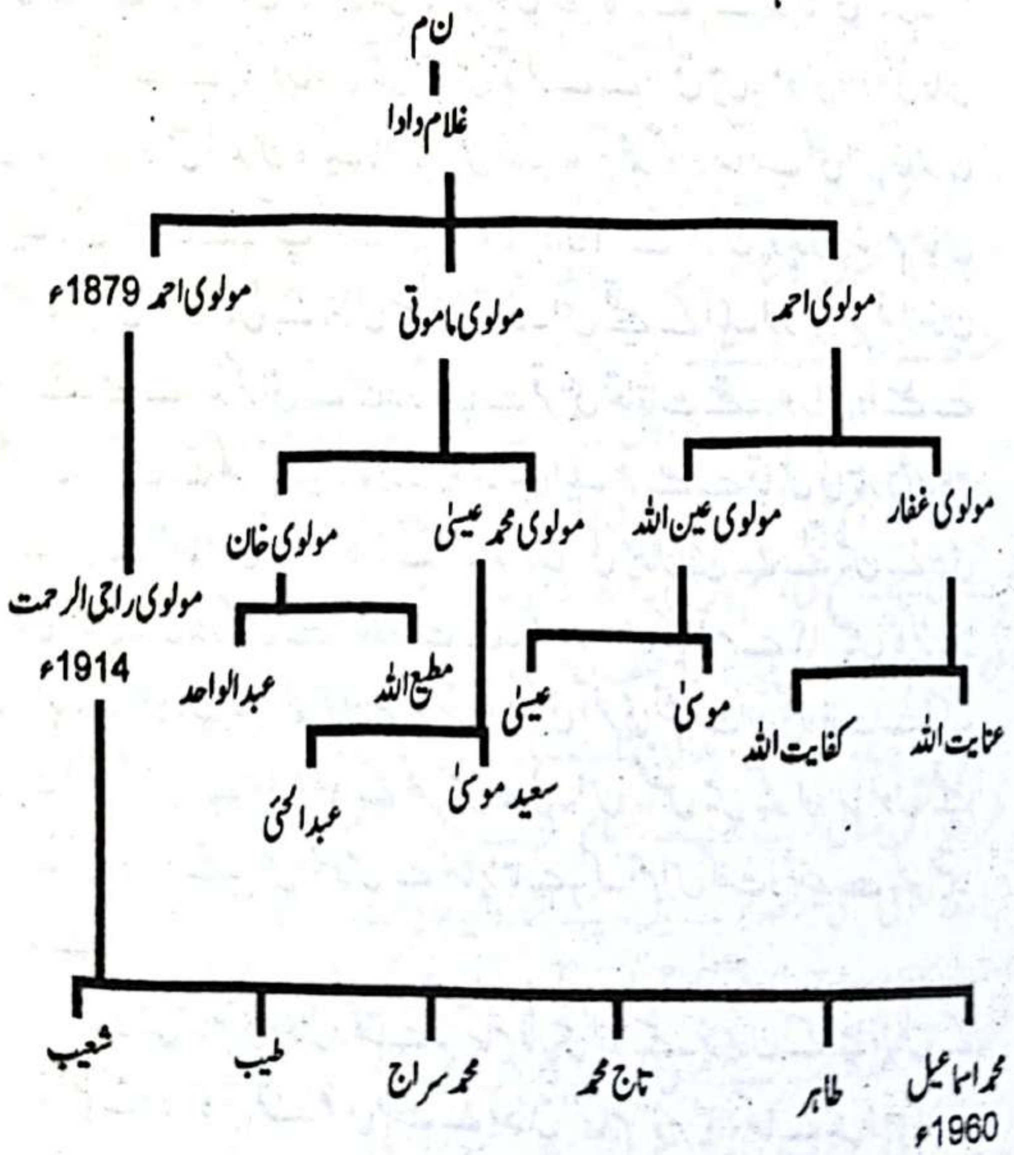


افضل کا شجرہ جدید دور تک درج ذیل مرتب کیا گیا۔



1869ء میں راجہ غزن خان والئی ہنزہ نے نومل پر حملہ کیا اور یہاں کافی لوٹ مار کی۔ دو سو آدمیوں کو غلام بنا کر ہنزہ لے جایا گیا۔ ان میں 60 کشمیری ڈار خاندان بھی تھے۔ راجہ ہنزہ نے ان 60 خاندانوں کو یارقند میں فروخت کر کے روپے کمائے۔ نومل میں ان کشمیری

خاندانوں نے اچھی جائیدادیں بنائی تھیں۔ یہاں چاول کی کاشت کا طریقہ ان ہی ڈار کشمیریوں کا مرہون منت تھا۔ نومل میں کچھ کھیتوں کے نام "محمد جوئے بری" یعنی محمد جو کا کھیت جیسے حوالے آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔ 27 نومبر 1891ء کو کرنل ڈیورینڈ کا ہنزہ پر چڑھائی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ کہ راجہ ہنزہ نے مہاراجہ کی رعایا کے کچھ افراد (60 کشمیریوں) کو فروخت کیا تھا۔ کہتے ہیں نومل کوٹ کی تعمیر کے لئے ان کشمیری خاندانوں نے سفیدے کے بڑے بڑے درخت دیئے تھے۔ یہ کشمیری خاندان نومل میں ترمئی کے حدود میں آباد تھے۔
ان ہی ڈار خاندانوں میں میرے استاد محترم مولوی راجی الرحمت کا جد بھی شامل تھا۔ جو کسی طرح یارقند فروخت ہونے سے بچا اور اُن کی ماں اُسے کسی طرح نگر لے جانے میں کامیاب ہوئی۔ یہ بچہ غلام دادا کا باپ تھا۔ اور پھر یہ خاندان کسی طرح گوہر آباد آیا۔
شجرہ کچھ اس طرح ہے۔



گھرانے کے لوگ آخوندے کہلاتے ہیں کیونکہ شروع سے یہ لوگ درس و تدریس اور وعظ تلقین کے مسند پر فائز رہے ہیں۔ مولوی راجی الرحمت ایک نامور قلمکار، شاعر اور عالم فاضل شخص تھے۔

ساموں :

کثروٹ (گلگت)، جگلوٹ، (سئی)، گریز اور سمکل (استور) میں ساموں، سام اور سامو کے نام سے کچھ خاندان آباد ہیں۔ کثروٹ کا ساموں خاندان 1762ء میں گلگت آنے والے کشمیریوں کے بڑے جتھے کا ہم رکاب تھا۔ جنھوں نے کثروٹ آباد کیا۔ محکمہ بندوبست کے ریکارڈ کے مطابق کثروٹ کا خاندان "ساموں" کے نام سے، جگلوٹ کا خاندان "سام" اور سمکل اور گریز کے خاندان ساموں اور سامو کے نام سے شناخت ہوئے ہیں۔ حقیقتاً یہ ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ انھیں علاقوں میں آباد ساموں لفظ "گاگڑے" کے شناسا بھی نہیں۔

کثروٹ کے ساموں میں تین اشخاص تذکرے کے لائق ہیں۔ موسیٰ بڑو یعنی حاجی موسیٰ ولد برات جو اس خاندان کا ایک نامور شخص تھا۔ غلام محمد گون صاحب بھی اس خاندان کے ایک لائق سپوت تھے۔ آپ اگست 1951ء تا 1954 کے دوران چوہدری غلام عباس کی مسلم کانفرنس گلگت شاخ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ اس قبیلے کے ایک اور فرد سرفراز خان نمبردار تھے۔ میرے والد گرامی کے ان بزرگوں سے قریبی تعلقات تھے۔ اور اسی واسطے سے میں بھی ان بزرگوں کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ چونکہ میں ایک عرصے سے قبائل کی تاریخ پر کام کرتا تھا۔ اس لئے "ساموں" اور "گاگڑے" خاندانوں کی چھان بین کے لئے مین نے بڑی کوششیں کیں۔ ان بزرگوں سے استفارات کئے۔ کہ ساموں کیا قوم ہے؟ انھیں گاگڑے کیوں کہا جاتا ہے؟ جناب غلام محمد گون مرحوم سے میری آخری نشست اُن کی وفات سے ایک سال پہلے اختر حسین اے اوپی ڈبلیو کے گھر میں ہوئی۔ اس محفل میں کچھ اور ساموں قبیلے کے لوگ بھی موجود تھے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ ہم اس گفت وشنید سے کچھ نتیجہ اخذ نہ کر سکے۔

لغت میں سام کئی معانی رکھتا ہے۔ سام فارسی لفظ ہے۔ نریمان کے بیٹے، زال کے باپ اور رستم کے دادا کا نام تھا۔ عربی لغت کے مطابق "سام" زہریلا، کھانے میں زہر ملانے والا، سام حضرت نوح کے بیٹے کا نام تھا۔ اور اس کی اولاد سامی کہلاتی ہے۔ یہودی اور عربی

سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

صوبہ سندھ میں سومرہ، سُمر اور سام نام کے تین قبائل کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ ان تینوں خاندانوں نے سندھ میں یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ سومرہ خاندان کے آخری بادشاہ کو سام قبیلہ نے مغلوب کر کے 752ھ میں سندھ کی حکومت پر قبضہ کیا۔ پھر سندھ کے ارغون قبیلہ نے سام یاسامہ قبائل کی حکمرانی کا خاتمہ کیا۔ سام حکمران جام کے خطاب کو شاہی ٹائٹل کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اور یہ اپنے آپ کو ایران کے جمشید کی اولاد سے سمجھتے تھے۔ کچھ روایات کے مطابق سامہ اپنے خطاب کو کاٹھیاواڑ کے ایک پہاڑ آواسام سے اخذ کرتے تھے۔ لیکن یہ بات درست نہیں لگتی۔ کیونکہ آٹھویں صدی عیسوی پہلے سے ساموں یا سموں قبائل کے سندھ میں رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے عربوں کے حملہ کے دوران کاٹھیاواڑ اور کچھ کی طرف نقل مکانی کی تھی۔ اور پھر چودھویں صدی کے دوران وہ سندھ واپس آئے۔ الیٹ انھیں راجپوت قرار دیتا ہے۔ وہ جام کے خطاب کو جمشید سے جوڑنے کے نظریے سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔ بہر حال ان ساموں کا کشمیر کی طرف نقل مکانی کرنے اور اس طرف آباد ہونے کی کوئی تاریخ نہیں ملتی۔ کشمیر کی ہزاروں ذاتوں کی فہرست میں کسی "سام" یا "سموں" یا ساموں خاندان کا تذکرہ بھی موجود نہیں۔ اس لئے ہمارے ساموں یا سام سندھ کے سام نہیں ہو سکتے۔

کشمیر میں مختلف حوالوں سے ذات سازی کا تذکرہ کیا جاتا رہا ہے۔ کشمیر کی بے شمار ذاتوں میں "سُم جی" اور "سبو" نام کی دو ذاتیں ملتی ہیں۔ سُم جی اور سبو کی لفظی ترکیب "سام" سے ملتی ہے۔ سُم جی، سُم اور بھی یہ لفظ بگڑ کی سام ہو سکتا ہے۔ اسی طرح "سبو" لفظ بگڑ کر سام بن سکتا ہے۔ کشمیر میں یا ارد گرد مختلف زبانوں، لہجوں یا آوازوں کی تبدیلی سے الفاظ کچھ سے کچھ بن جاتے ہیں۔ ایسا ممکن دکھائی دیتا ہے۔ کہ سُم جی اور سبو ذات کے لوگ گلگت، استور کی طرف نقل مکانی کرتے ہوئے۔ "سام" بن گئے ہوں۔ "سُم جی" ایک کشمیری ذات ہے۔ سُم جی کے لغوی معنی سمجھدار کے ہیں۔ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ کشمیر میں صفتی ناموں کے استعمال کا عام رواج رہا ہے۔ سُم جی کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی جاتی ہے۔ کہ کسی خاندان میں کوئی شخص بڑا سمجھدار تھا۔ اسے سُم جی کہا گیا۔ پھر اُس کا پورا خاندان "سُم جی" مشہور ہو گیا۔ اور یوں "سُم جی" وجود میں آئی۔ طرح "سبو" کشمیریوں کی اُس قوم کو کہا جانے لگا جس نے پروہت کا کام کیا۔ جیسے نہروں کا منشی نہرو کہلایا، دکانداری کرنے والا دانی، فوج میں منشی کا کام

کرنے والا خشی کہلا اسی طرح پنڈتوں میں مذہبی رسوم ادا کرنے والا شخص سبو کہلایا۔

جہاں تک "گاگڑے" کی اصطلاح کا سوال ہے۔ کشمیر میں "گاگڑے" نام کی کوئی ذات موجود نہیں۔ تاہم کشمیر میں درج ذیل نام کی ذاتیں موجود ہیں۔

(1) گکڑو، گکھڑ، گھگڑ

(2) گگڑو

گکڑو، گکھڑ، گھگڑ ایک ہی ذات کے مختلف نام ہیں۔ عام طور پر یہ گکھڑ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ پوٹھوار کی ایک بڑی قوم ہے۔ اس قوم کی تاریخ ایک درخشاں ماضی کی امین ہے۔ یہ ایک جنگجو اور حکمران قوم رہی ہے۔ اس قوم نے پوٹھوار اور ارد گرد کئی سو سالوں تک حکمرانی کی ہے۔ اس قوم کے بارے میں دو روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق گکھڑ کو ہندو راجپوتوں کا ایک خاندان بتایا جاتا ہے۔ "راجپوت گوتیں" کتاب کے مصنف نے کھوکھر، آوان، اور گکھڑ کو راجپوت قوموں میں درجہ بند کیا ہے۔ دوسری روایت کے مطابق کچھ مورخین گکھڑ قوم کو ایران کے کیانی خاندان سے ملاتے ہیں۔ اس لئے گکھڑ عموماً اپنے نام کے ساتھ کیانی کا لاحقہ لگا دیتے ہیں۔ بیشتر گکھڑ "کیانی" ہونے کا ہی ادعا کرتے ہیں۔ شجرہ یوں پیش کیا جاتا ہے۔

کیخرو بن لہراسب بن اسفندیار بن نوشاذ بن دراب بن دارب بن اردشیر بن شاپور بن آرمز بن بہرام بن یزدجرد بن حرمز بن فرود قباد بن نوشیروان بن حرمز بن خسرو بن شردیہ بن نوشیران شانی بن یامین بن فرخ شاہ شانی بن گگو بن کید بن تربیت بن جنت بن شجار بن مبارک بن بسر ہمند بن بقرہ بن قالب بن دولت بن قاب بن خرخ امیر بن علی واد بن سلطان امراء بن سلطان خیر الدین بن گوہر گنج بن سلطان نور الدین بن یزداد بن سلطان عثیار بن سلطان اعظم بن سلطان سمند بن سلطان رستم بن سلطان شاہ بن سلطان گکھڑ شاہ۔ اسی سلطان گکھڑ شاہ سے یہ خاندان گکھڑ مشہور ہوا۔ 855ھ کے قریب پنجاب سے کچھ گکھڑ کشمیر میں وارد ہوئے اور پھر اس خاندان کے لوگوں کی کشمیر آمد و رفت عام ہو گئی۔ کشمیر میں گکھڑ، گکڑ بن کر ظاہر ہوا۔ کہتے ہیں کشمیر میں خواجہ احمد گکھڑ سید شاہ روش بلکی والد کا مرید ہو کر بارہ مولا میں آباد ہو گیا۔ پنجاب سے کسی شخص نے خواجہ احمد گکھڑ کو خط لکھا اور یہ خط کسی نیم ملا کے ہاتھ آیا۔ نیم ملا نے گکھڑ کو گکڑ پڑا یوں گکھڑ کشمیر میں گکڑ بنا اور اس کے بعد خواجہ احمد گکھڑ کا خاندان گکڑو مشہور ہوا۔ کشمیر میں گاگڑے سے ملتا جلتا ایک اور خاندان گگڑ ہے۔ کشمیری زبان میں گگر چوہا کو کہتے ہیں۔ جس طرح

اور قوموں میں جانوروں میں طوطارام، واردوں میں ژکونی، (گدھا)، قطرو(کتے کا پلا)، شوانوالو(کتے والد)اسی طرح کشمیری زبان میں بھی جانوروں کے نام پر کئی ذاتیں وجود میں آئی ہیں۔ مثلاًدرج ذاتیں جانوروں کے نام کی مناسبت سے وجود میں آئی ہیں۔

(1) سہہ (شیر)اس قوم کے ایک بزرگ نے شیر ہلاک کیا تھا۔
وہ شخص سہہ کہلایا۔اُس کی ذات سہہ بن گئی۔

(2) کاؤ(کوا) کسی کے مکان کے چھجے پر کوا بولا۔اگر چہ کوے ہر کسی کے چھجے پر بیٹھ سکتے ہیں،بول سکتے ہیں، لیکن کوئی شخص ایسا مشہور ہوا کہ اُس کی ذات ہی کاؤبن گئی۔

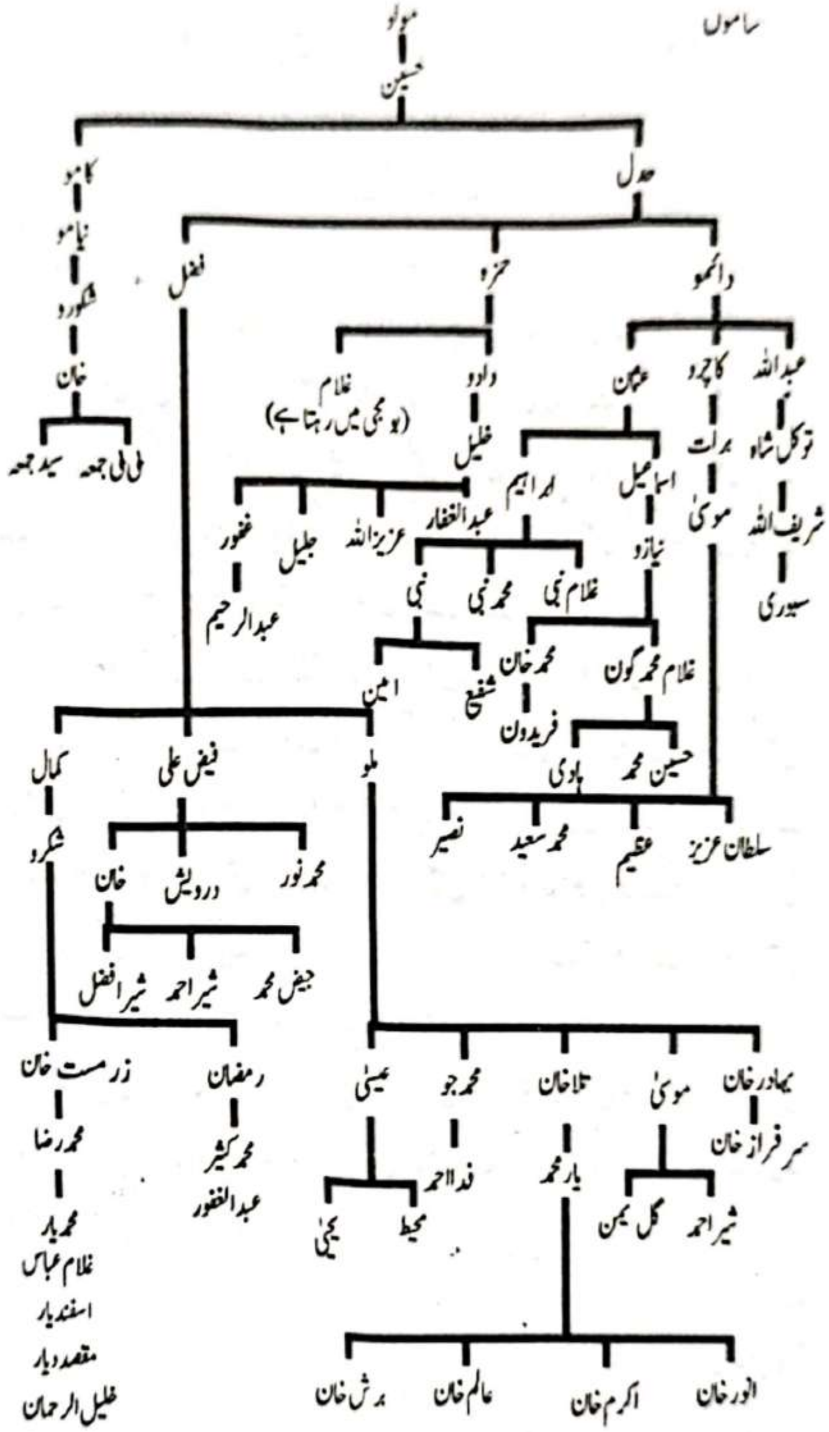
اس طرح کوتر، کھر، کچلو، شال وغیرہ سبھی ذاتیں جانوروں کے نام پر مبنی ہیں۔

اس طرح ایک شخص کا خاندان گگرو(چوہا) مشہور ہوا۔ کہتے ہیں۔اس شخص کے گھر میں چوہے بہت تھے۔ کسی نے خواجہ سلیمان گگرووالد کہااور یوں ایک ذات وجود میں آئی۔

گگرواور گکھڑ، گاگڑے سے ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ لیکن اگر ہم گلگت کےساموں کو گگرویاگکھڑ قرار توسئی اوراستوار کے ساموں کو گگرویا گکھڑ قرار نہیں دے سکتے۔کیونکہ وہ محض نام ہونے کا دعوئ کرتے ہیں۔سر ذاز نمبردار مرحوم ایک توجیہہ یہ پیش کرتے تھے۔کہ جب کہیں ساموں خاندانوں کا کوئی فرد کسی کے ساتھ لڑائی میں الجھتا تو ساموں لوگ گرگر وہاں پہنچ جاتے شینامیں "گرگر جمع ہیوک"ایک محاورہ ہے۔جس کے معنی سب تیزی کے ساتھ کہیں پہنچ جانے کے ہیں۔اس حوالے سے انہیں گاگڑے کہا گیا۔

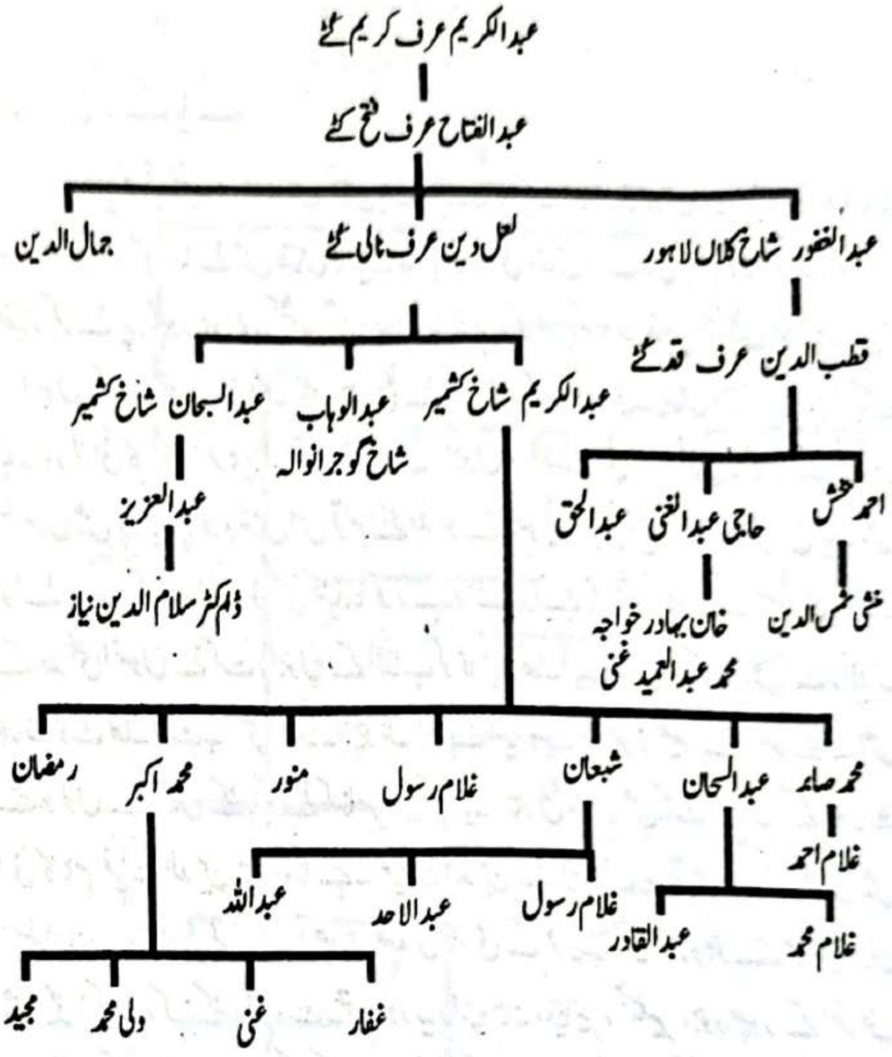
میرے خیال میں سام یا ساموں اس خاندانوں کے کسی جداعلیٰ کا نام ہوااور پھر اسی جد کے نام پر یہ ساموں کہلائے ہوں۔ شجرے میں سامو کے وزن پر اور کئی نام بھی ملتے ہیں۔ مثلاً مولو، دائمو، کامو، نیامو وغیرہ۔

بہر حال کثروٹ گلگت کے ساموں کا شجرہ درج ذیل ہے۔

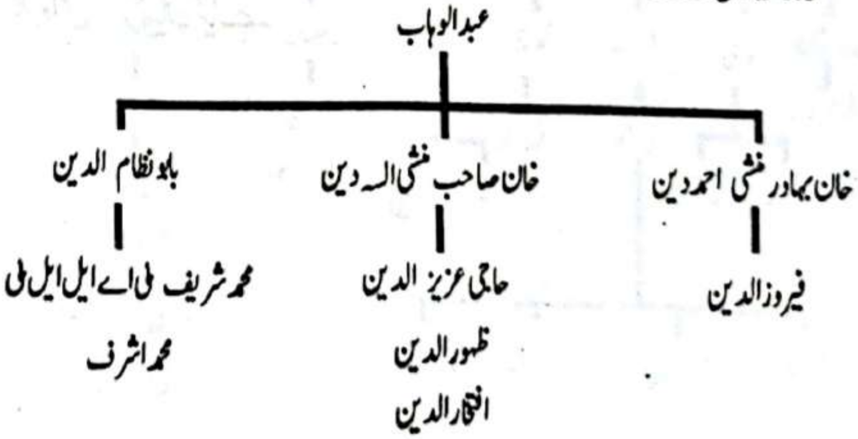


کٹ راج۔ کٹے یا کٹے :

یہ کوئی کشمیری خاندان نہیں بلکہ پنجاب کا ایک مہاجر خاندان ہے۔ اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ جو کسی زمانے میں ملتان کا ایک حاکم تھا۔ کسی مقامی جنگ میں مغلوب ہو کر راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوا اور کشمیر آیا۔ یہاں بڈگام کے ارد گرد علاقہ پر قابض ہوا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ رہنے لگا۔ لیکن تاریخ نے ایک اور کروٹ بدلی۔ یہاں مقامی طور پر انہیں ایک اور لڑائی کا سامنا کرنا پڑا۔ جس میں کٹ راجوں کو شکست ملی اور انہیں بڈگام کے پہاڑی سلسلوں میں چلا جانا پڑا۔ وہیں اس قوم کے افراد نے چھوٹی جھوٹی کٹیا بنا کر رہنا شروع کیا۔ اس حوالے سے یہ کٹ راجے (یعنی کٹیا بنا کر رہنے والے راجے) مشہور ہوئے۔ مسلمان ہونے کے بعد بھی انہوں نے کت راجوں کے القاب کو قائم رکھا۔ ایک خیال کے مطابق کٹ راجوں کا ماخذ کوٹ تھا۔ کوٹ بہ معنی قلعہ۔ چونکہ ان کے کٹیا کوٹ نما طرزِ تعمیر کے مظہر تھے۔ اس لئے لوگوں نے انہیں کٹے یا کوٹے کہنا سروع کر دیا۔ تاریخ ملتان میں کٹ راجوں کے مورثِ اعلیٰ کا نام غیاث الدین بتایا جاتا ہے۔ غیاث الدین کے اسلاف ساتویں صدی ہجری میں مسلمان ہوئے۔ ان کے خلاف آٹھویں صدی ہجری کے قریب کشمیر وارد ہوئے۔ تاریخ ملتان میں یہی ذکر ہے کہ کٹے راجپوت تھے۔ اور یہ راجپوتانہ، بیکانیر، جیلمیر، جودھپور کے اطراف سے ملتان آئے تھے اور یہاں کی حکومت حاصل کی۔ محمد دین فوق نے کشمیر میں کٹ راجوں کا شجرہ اس طرح بیان کیا ہے۔

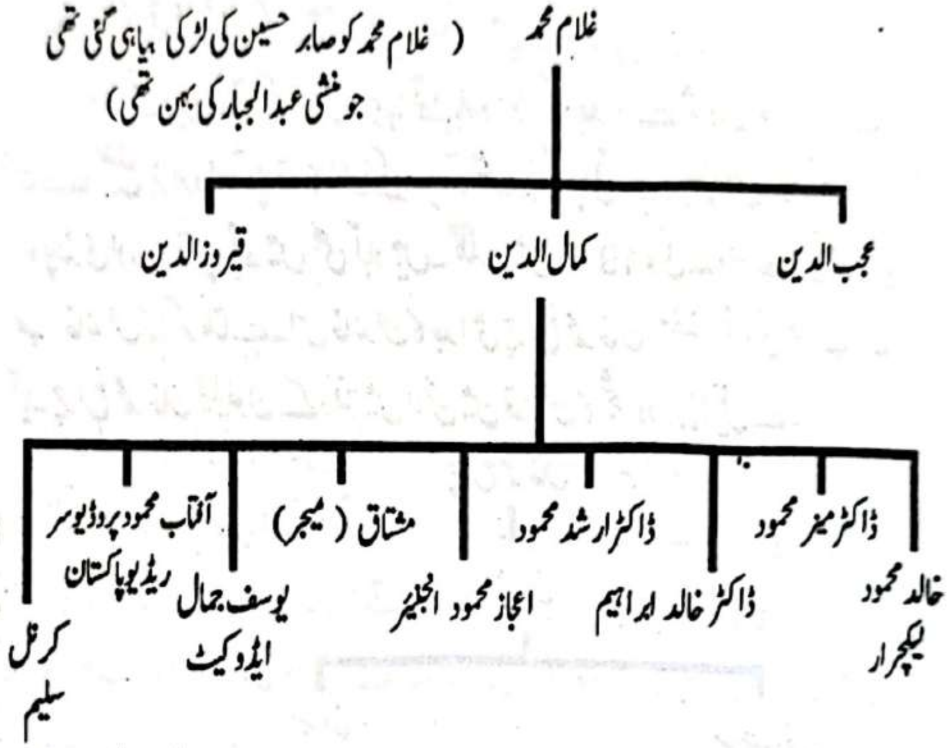


گوجرالہ شاخ کے کٹے



منشی کمال الدین اسی کٹے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا کوئی جد کشمیر سے (کوٹ کے) کی طرف آیا اور پھر وہاں سے گلگت آیا۔

گلگت میں ان کا شجرہ اس طرح ہے۔



گلگت میں یہ خاندان اچھی شہرت کا حامل رہا ہے۔ کمال الدین صاحب مجسٹریٹ درجہ اول کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ابھی حال ہی میں اُن کی وفات ہوئی ہے۔ محترم شخصیت کے مالک تھے۔ اُن سے نہ صرف میرے والد گرامی کے تعلقات تھے۔ بلکہ وہ میرے بھی مشفق تھے۔

ہمبار راجپوت : یہ اصل میں "ہمبہ" لفظ ہے۔ گلگت کی 1916ء کی بندوبست میں غلطی سے اسے ہمبار راجپوت لکھا گیا ہے۔ ہمبہ راجپوتوں کے بارے میں درج ذیل مفروضے ہیں۔

(1) یہ کہ اس کا مورثِ اعلیٰ بنی امیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ کشمیر میں امیہ سے بدل کر ہمبہ ہوا۔

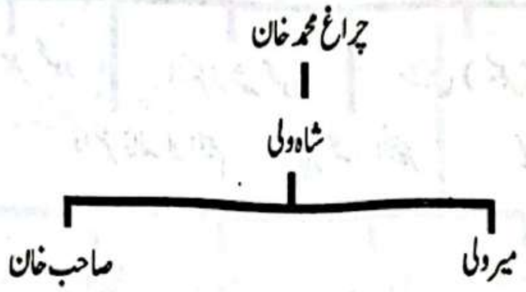
(2) پنڈت ہر گوپال کول اپنی تاریخ کی کتاب گلدستہ کشمیر میں لکھتے ہیں۔ کہ ہمبہ لفظ کا ماخذ برہمن ہے اور کھکھ لفظ کا ماخذ کھتری ہے۔

(3) ایک اور خیال کے مطابق ہملی خان اور کھکھ خان دو بھائی تھے۔ اور ان کا اصل وطن ترکستان تھا۔ اور یہ بھائی لوٹ مار کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ ہملی خان کی نسل ہمبہ کہلائی اور کھکھ خان کی نسل کھکھ کے نام سے مشہور ہوئی۔

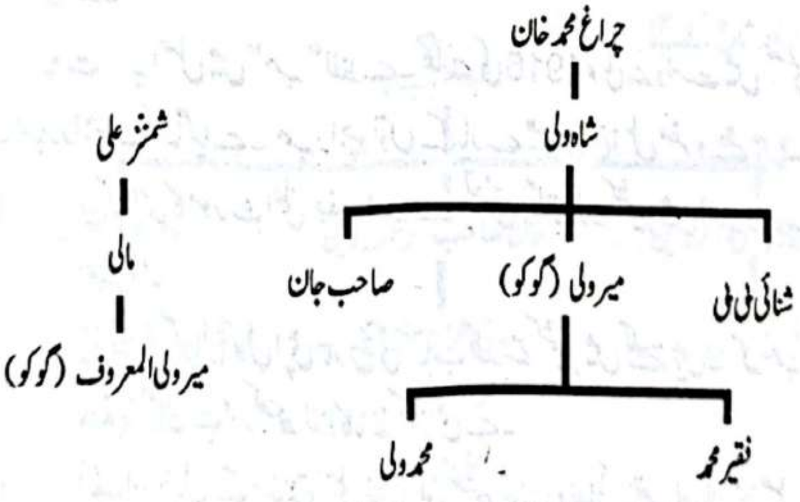
(4) پنڈت کلہن نے ہمبہ کو بومب لکھا ہے۔ اور اسے کھیش قبیلہ کا بھائی بند بتایا ہے۔

(5) خود اس قوم کے افراد بنی امیہ سے ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ اور کسی مفروضے کو قبول نہیں کرتے۔

محمد دین فوق لکھتے ہیں: "بمبہ قوم بارہ مولا کی حدود سے شروع ہو کر دریا کے دائیں کنارے ضلع ہزارہ اور علاقہ کاغان کی سرحد تک چلی جاتی ہے۔ بلکہ اس کے کچھ افراد ضلع راولپنڈی اور علاقہ پونچھ میں بھی آباد ہیں۔ گلگت میں 1916ء کی بندوبست ثانی میں ایک ہی بمبہ خاندان کا ذکر ملتا ہے۔ اس خاندان کا جد اعلیٰ چراغ محمد خان مظفر آباد کی طرف سے گلگت آیا۔ چراغ محمد خان ٹیلیفون کے دفتر میں لائن مین تھا۔ اُن کا شجرہ درج ذیل ہے۔



شاہ ولی کی شادی شمشیر علی کی بیٹی "مالی" سے ہوئی اور میر ولی المعروف گوکو اپنی والدہ کی اراضی پر قائم مقام ہوا۔ پورا شجرہ اس طرح ہے۔



چراغ محمد خان کے متعلقین جو مظفر آباد میں موجود ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اعوان برادری سے بتاتے ہیں۔ اعوانوں کے تعلق سے تین اہم کتابیں ہیں۔

باب الاعوان، تاریخ اعوان اور نسب الاعوان چھپی ہیں۔ ان کے مطابق حضرت

عباس علمدار کا فرزند عبداللہ یا عبیداللہ تھا۔ ان کی نویں پشت میں عون بن قاسم تھے۔ اعوانوں کا شجرہ اسی عون سے منسلک بتایا جاتا ہے۔ یہ عون قطب شاہ کے لقب سے ملقب تھے۔ حضرت عباس علمدار کی مناسبت سے یہ عباسی بھی کہلاتے ہیں۔ چراغ محمد خان نے گلگت میں اپنا خاندان بمبہ راجپوو درج کروایا جبکہ اس کے مظفر آبادی رشتہ دار اپنے آپ کو اعوان قرار دیتے ہیں۔

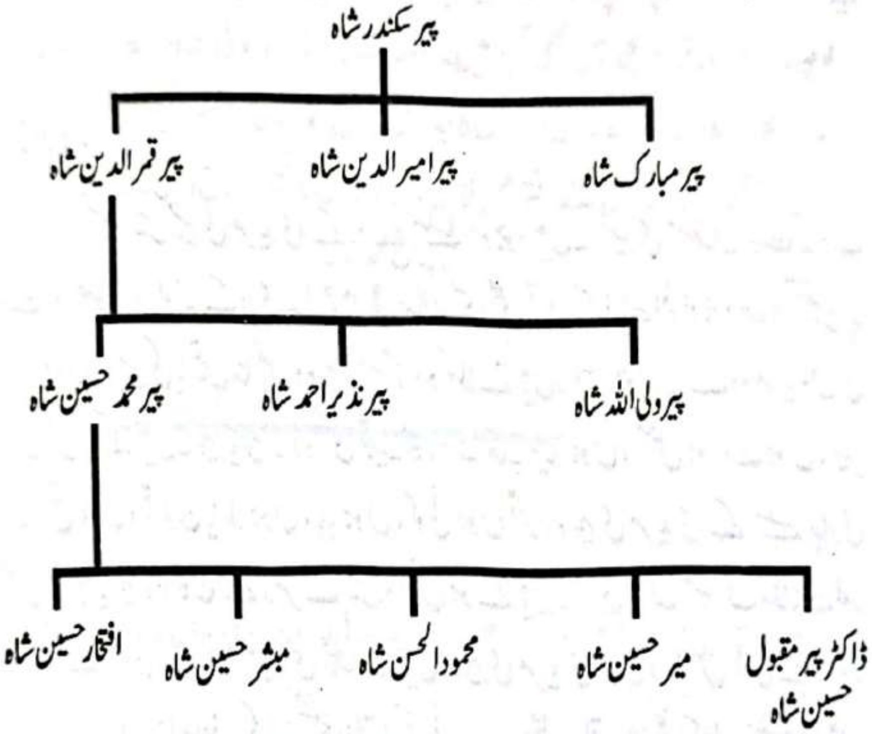
پیرزادہ :

کشمیر میں پیری مریدی کے بڑے سلسلے موجود ہیں۔ کشمیری مسلمان بہت مذہب پرست اور صوفیا اور اولیا کے بڑی مداح ہیں۔ یہاں کسی بھی قوم کے ایسے افراد جو وعظ و تلقین پر متمکن ہوں، دین کی باتیں بتائیں وہ پیر یا پیرزادہ کہلاتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ مریدوں کی ٹولیاں بھی رکھتے ہیں۔ پیر یا پیرزادہ کسی قبیلہ کا نام نہ تھا۔ سید ہوں، مغل ہو، بٹ ہوں، میر ہوں، شیخ ہوں، آخون یا ملا ہوں، بابا ہوں، کوئی ہوں اگر وہ پیری مریدی کے سلسلے جاری رکھیں تو پیر یا پیرزادگان کے زمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ یہی لوگ متبرک مقامات اور زیارات کے متولی کے فرائض بھی نبھاتے ہیں۔ پیری مریدی نسل در نسل چلتی ہے۔ اور پیروں کی اولاد اپنے اسلاف کی جانشینی اختیار کرتی ہے۔ یہ طریقے مشائخ کے اور سلسلوں میں بھی ملتا ہے۔ پیر کبار شیخ دِتو، پیر ابراہیم خان قصوری روشینہ سلسلہ کے بانی (میاں بایزید پیر روشن با پیر روخان) پیر ناصر خسرو، پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی، پیر شیخ نظام الدین تھانسیری وغیرہ سے پیری مریدی کے سلسلے نکلتے ہیں۔ پیر مرشد، ہادی اور راہنما کے طور پر کام کرتے آئے ہیں۔ چونکہ سیدوں کا بھی یہی کام ہوتا ہے۔ اس لئے کشمیر میں پیرزادوں اور سادات ایک دوسرے کے قریب آئے۔ یہاں تک کہ ان کے درمیان رشتے ناطے بھی ہوئے۔ اور اس طرح سیدوں اور پیرزادوں میں باہم تعلقات میں بڑا اضافہ ہوا۔ 1911ء کی مردم شماری سے پیرزادوں نے اپنے آپ کو علانیہ سید لکھوانا شروع کیا تھا۔

(محمد دین فوق تاریخ اقوام کشمیر صفحہ 111)

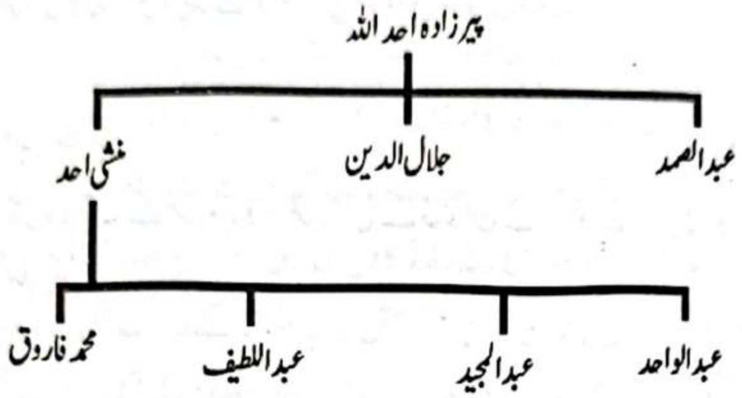
بہر حال کشمیر میں مختلف اقوام ہیں جن لوگوں نے دنیوی معاملات سے الگ ہو کر وعظ و تلقین اور دینی امور میں راہنمائی کا فریضہ نبھایا اور پھر نسل در نسل یہ سلسلے بڑھائے پیر یا پیرزادگان کی ایک قوم کی صورت میں ظہور میں آئے۔ اس خاندان کی گزر بسر مریدوں کی

نذر و نیاز پر ہونے لگی۔ زیارات، تکیے، خانقاہوں وغیرہ کی دیکھ بھال اور حفاظت کا کام بھی ان کے ذمے لگا۔ جو پیر زادگان اس کام سے رہ جاتے وہ مدارس کی معلمی کو پسند کرتے۔ گلگت میں پیرزادوں کے خاندان میں پیر زادہ محمد حسن شاہ کا خاندان نمایاں ہیں۔ان کا شجرہ کچھ اس طرح ہے۔



پیر قمر الدین شاہ نے استور (بلند) کے عزیز اللہ کی لڑکی کی مالی سے شادی کی وہ خود بطور جیل وارڈر گلگت میں ملازم تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اس نے کچھ عرصہ کتابوں کے ایک دکاندار کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر وہ کشمیر اپنے گاؤں بجہام چلے گئے۔۔ جہاں اس کی وفات ہوئی۔ پیر زادہ محمد حسین شاہ 1948 میں گلگت آیا۔ پی اے ایف میں ملازمت مکمل کرنے کے بعد آجکل وہ کتابوں کی دکانداری کر رہا ہے۔ پیر زادہ محمد عالم مرحوم اور پیر زادہ منشی احد بھی پیر زادوں کے خاندان سے تھے۔ منشی احد کے فرزند پیر زادہ عبد الواحد پی آئی اے کے ایک ذمہ دار آفیسر ہیں۔

پیرزادہ منشی احد کا شجرہ



حاشی :

پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ کشمیری قوم ذات سازی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اگرچہ کشمیری سب آریا ہیں۔ لیکن اس بڑے قبیلہ سے ذاتوں کا جو جنگل اگا ہے۔ اس کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ اذانیں دینے والے بہت ہیں لیکن کسی موذن کی اذان بھا گئی وہ بانگی کہلایا اور یہی اس کی قومیت بن گئی۔ کسی نے کسی ترک کے پاس ملازمت کی اگرچہ ایسی مثالیں کئی ہو سکتی ہیں۔ لیکن محض کوئی ایک شخص ہی ترک کہلایا اور اس کا خاندان ترک بن گیا۔ خوش نویس کئی ہونگے لیکن کوئی خوش نویس ایسا مشہور ہوا کہ وہ "زرّین قلم" کے خطاب سے ملقب ہوا۔ اسی طرح کوئی حاجی، کوئی پٹواری، کوئی قاضی، کوئی کھتو، کوئی شہدہ اور کوئی حکیم غرض عجیب وعریب ذاتیں وجود میں آئیں کشمیر میں پیشہ کے اعتبار سے بھی ذاتیں بنیں اور ایسی بنیں کہ اصل ذاتیں پس منظر میں چلی گئیں۔ اور لوگ نئے القابات سے ملقب ہوئے۔ ان ذاتوں کے حامل لوگوں نے ان نئی ذاتوں کو سینے سے ایسے لگایا کہ بس یہی سب کچھ ہو۔ وہ اسے اپنے نام کے لاحقہ کے طور پر فخریہ استعمال کرتے۔ بڑے بڑے نامور لوگ ان سلسلوں میں ہوئے ہیں۔ مثلاً پنڈت پریم ناتھ بزاز، سیف الدین کچلو (بکرا)، خواجہ سعد الدین شال (گیدڑ)، لیکن یہ خاندان شال کی تجارت کی وجہ سے مشہور ہے۔ مشہور پیشوں کے نام پر جو خاندان ہوئے۔ اُن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

- بزاز۔ کپڑا بیچنے والا
- منشی۔ افسر عدالت
- ماشکی۔ پانی بھرنے والا

۔ کھنڈ واؤ۔ پشمینہ کاتنے والا

۔ نہرو۔ نہروں کا میر منشی (پنڈت جواہر لال نہرو اسی خاندان کا تھا)

۔وانی۔بنیا

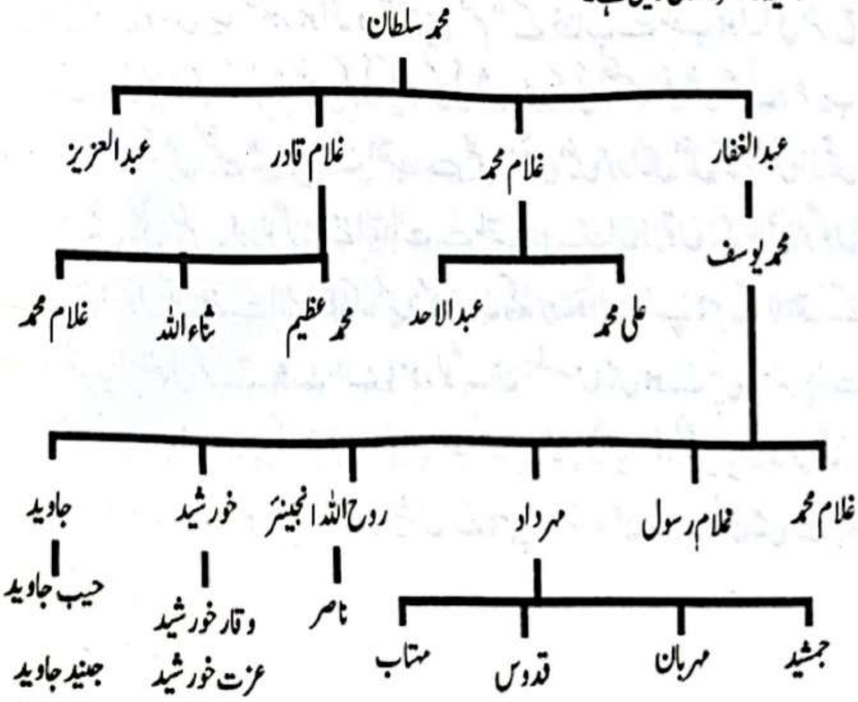
۔وکیل۔ عبدالسلام

عہد مغلیہ میں وکالت کے عہدہ پر فائز تھا۔ اس کے خاندان کے اور لوگ وکیل نہ ہوتے ہوئے بھی وکیل کہلائے۔

حاشیہ :

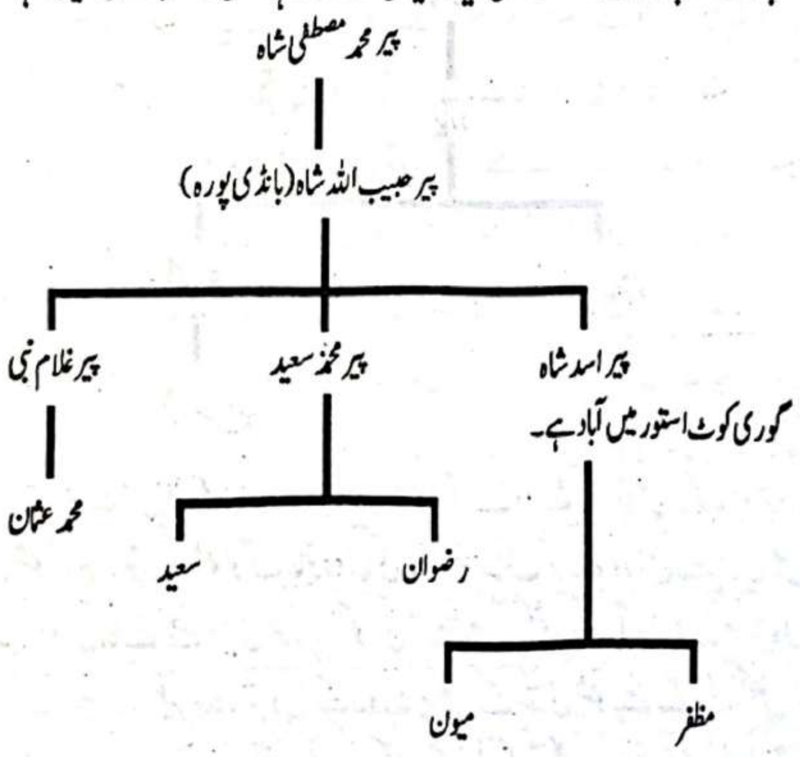
اسی طرح کشمیر کی ایک معزز ذات حاشی ہے۔ اس خاندان میں کسی نے قالین کا بیوپار کیا اور یہ حاشی مشہور ہوا۔ حاشیہ اب یہ ایک ذات ہے۔ محمد دین فوق انہیں حاشیہ باف کہتا ہے۔ اس خاندان کے کچھ لوگ اب بھی قالین کے بیوپار ہیں اور بہت سے لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ خواجہ مہر داد سکریٹری تعلیم وبلدیات وصحت، حاشی خاندان کا ایک سپوت ہیں۔ ان کے والد گرامی محمد یوسف فتح کدل سے 1946ء میں سکردو آیا اور یہیں وفات پائی۔

حاشیہ کا شجرہ درج ذیل ہے۔



دیوانی :

خواجہ اسحاق ختلانی اس خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں۔ یہ وہی بزرگ شخصیت ہیں۔ جنھیں امیر تیمور کے فرزند شاہ رخ مرزا کے حکم پر شہید کر دیا گیا تھا۔ ان کی ذرّیت میں سے ایک بزرگ خواجہ صبغتہ اللہ سلطان سکندر کے زمانے میں ہرات سے کشمیر آئے۔ خواجہ فتح اللہ آپ کے فرزند تھے۔ جنکو سلطان نے دفاتر کا دیوان اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ اسی بنیاد پر یہ خاندان دیوانی مشہور ہو گیا۔ اس خاندان میں چونکہ نقش بندیہ سلسلہ کے بزرگ بھی ہوئے۔ اس لیے یہ خاندان نقش بندیہ کے طور پر بھی معروف ہوا۔ دیوانی سلسلہ کے ایک بزرگ خواجہ طاہر دیوانی کے چار لڑکے تھے۔ جو سب کے سب زاہد، پارسا، اور متقی۔ یہیں سے یہ لوگ ”پیر“ کے لقب سے ملقب ہوئے۔ گلگت میں ایک دیوانی خاندان ہے جس کا شجرہ درج ذیل ہے۔

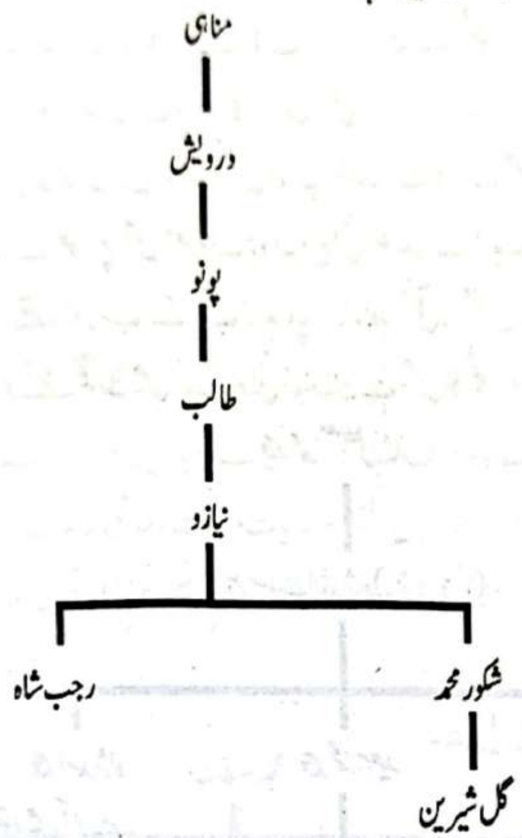


اسی خاندان کا ایک فرد پیر محمد یوسف دیوانی سکردو میں مقیم تھا۔ وہ اب ربوہ چلا گیا۔ اس نے مرزائیت اختیار کی ہے۔ دیوانی خاندان کا ایک فرد پیر محمد حنیف چوہدری غلام قادر مرحوم کے پاس ملازم تھا۔ وہ اب فوت ہو گیا ہے۔ ایک اور دیوانی خاندان کا فرد غلام حسین شاہ بونجی میں مقیم ہے۔

جامعہ بانڈی کے امام بھی عموماً دیوانی نقش بندیہ سلسلہ سے متعلق رہے ہیں۔

موچی :

1916ء کی بندوبست میں محض ایک موچی خاندان درج ریکارڈ ہوا یہ بھی کشمیر سے آیا تھا۔ اس کا شجرہ درج ذیل ہے۔



گلگت میں قدیم زمانہ سے چمڑے کا کام کرنے والے کچھ خاص لوگ موجود تھے۔ انھیں شتو کہا جاتا تھا۔ یہ شتو لوگ جانوروں کی کھال کو صاف کرتے اور اس سے پاؤں میں پہننے کے لیے پاپوش بناتے جسے مقامی طور پر "کوری" کہتے ہیں۔ کشمیر سے آنے والے موچیوں نے چپل، بوٹ، پیزار، وغیرہ بنانا شروع کیے۔ ورنہ یہاں کے مقامی شتو پہننے کے لیے محض کوری بناتے۔ اس کے علاوہ یہ اناج، آٹا، وغیرہ رکھنے کے لیے کوتو بھی (بوریاں ٹائپ) بناتے۔ شتو لوگوں کی کوئی سماجی حیثیت نہ تھی۔ معاوضہ کے طور پر ان لوگوں کو اناج، آٹا اور دیگر چیزیں دی جاتیں۔ یہ کوٹی کہلاتیں۔ اس وقت اس علاقے میں شتو لوگ نایاب ہیں یہاں جگہ جگہ موچی موجود ہیں۔ جو زیادہ تر ملنگ کے زیریں علاقوں سے کام کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔

ذاتوں سے متعلق کچھ ابہام :

اس سے پیشتر کے مزید خاندانوں کے بارے میں گفتگو جاری رکھی جائے یہاں

ذاتوں کے بارے میں کچھ ابہام دور کئے جائیں گے۔ تاکہ واضح ہو کہ القاب کیا ہیں۔ ذاتیں کیا ہیں، تعظیمی الفاظ ناموں کا حصہ کیسے بنتے ہیں۔ اور ان سے عوام الناس کس قسم کے تاثرات قائم کرتے ہیں۔

چوہدری :

یہ ایک کاروباری خطاب ہے۔ نمبردار، مقدم، گاؤں کا سردار، میر محلّہ، کاروباری جماعتوں کے سردار وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ زمیندار بھی اسے بطور خطاب استعمال کرتے ہیں۔ اس سے چودھرات، چودھرائی، چودھر (بہ معنی چودھری کا دفتر کاروبار) وغیرہ الفاظ بنے ہیں۔ یہ کوئی گوت نہیں۔ میرے تایا محمد کریم مرحوم راجہ جعفر خان گلگت کی جائیداد کے انصرام پر مقرر تھے۔ لوگوں سے کرایہ اور دیگر مالیات کی وصولی آپ ہی کرتے تھے۔ وہ اوپر کی تشریحات کے مطابق چوہدری تھے۔ اور "چودھری محمد کریم" کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ گلگت میں اور کسی چودھری کی ایسی شہرت نہیں رہی۔ چودھری غلام قادر اور چودھری عبدالخالق کشمیری بازار والے بھی چودھری کے القاب سے معروف رہے لیکن وہ یہاں چودھرائی کے کوئی فرائض سر انجام نہ دیتے تھے۔ کشمیر پنجاب یا شمالی علاقہ جات میں شجروں میں جہاں کہیں نام کے ساتھ چودھر کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ اُسے کوئی گوت خیال نہ کیا جائے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ خاندان میں کسی نے چودھری کے فرائض سر انجام دیئے ہوں۔ خاندان میں یہ خطاب اسلاف سے منتقل ہوا ہو لیکن یہ محض تعظیمی کلمہ ہو سکتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ شمالی علاقہ جات میں نمبردارن، نمبردار کے طور پر پکارے جاتے رہے ہیں۔ شروع شروع میں لمبردار ترنگفہ کہلاتے تھے۔ اب لمبرداران اور ترنگفان ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ تاہم یہاں "چودھری" کا لفظ آج تک کسی نام کے لاحقہ یا سابقہ کے طور پر مستعمل ہوتے نہیں دیکھا گیا۔

خواجہ :

خواجہ فارسی کا لفظ ہے۔ اس کے معنی سرُدار، آقا، خداوند کے ہیں۔ توران میں سادات کے لقب کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ترکی میں بھی خواجہ اور خوجیم کے الفاظ آقا، سردار، مالکن اور سردار کی بیوی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ خواجگان جمع کے لئے مستعمل

ہوتا ہے۔ ترکستان میں بیگ اور مرزا لوگوں کے نام کے آگے خواجہ بھی استعمال ہوتا دیکھا گیا ہے۔ خواجہ کشمیر میں لقب کے طور پر استعمال میں لایا جاتا رہا ہے۔ یہ بھی کوئی گوت نہیں۔ احتراماً کسی معزز فرد کے لئے بولا جاتا ہے۔ کشمیر میں بہت سے قوموں مثلاً میر (مغل)، منٹو، گنائی، بانڈے، کنٹ، بعض پنڈت خاندان کے شجروں میں اکثر ناموں کے ساتھ خواجہ کے القاب چسپاں ملتے ہیں۔ مثلاً بانڈے، خواجہ محمد کاظم بانڈے، خواجہ بدیع الزمان بانڈے وغیرہ۔ پنڈت خاندان محلہ دری بل سری نگر کے خواجہ خورم پنڈت پھر اس کے تین پشتوں کے بعد مسلمان سلسلے شروع ہوئے۔ وہ خواجہ حاجی عبدالکریم، خواجہ عنایت اللہ وغیرہ خواجہ کہلائے، گنائی خاندان میں خواجہ فتح اللہ، خواجہ کاشو، خواجہ لعل محمد، خواجہ خاوند محمود قدس سرہ العزیز، خواجہ معین الدین ہادی نقش بندی وغیرہ، کنٹ خاندان کے اجداد کابل سے کشمیر آئے، خواجہ کہلائے۔ اس خاندان میں خواجہ خضر میر، خواجہ احد میر، خواجہ حبیب اللہ میر، یا منٹو خاندان میں خواجہ محمود احمد منٹو (پنڈی کے مشہور وکیل) خواجہ رحمت اللہ، خواجہ رسول جوُ وغیرہ۔

اکثر سادات، اولیا کرام کے ناموں کے ساتھ بھی خواجہ اعزازی طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ مثلاً خواجہ باقی اللہ، خواجہ عبید اللہ، خواجہ نظام الدین اولیا، خواجہ محمد معصوم، خواجہ معین الدین چشتی وغیرہ۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں۔ "یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شیخ یا خواجہ یا بابا یا میاں وغیرہ کوئی ذات نہیں بلکہ یہ القاب ہیں جو متقی اور صاحب علم اور بزرگ حضرات کے لئے بولے جاتے ہیں۔ سید عبدالقادر جیلانی اپنی بزرگی اور فضیلت کی وجہ سے شیخ بھی کہلاتے تھے۔ سید خواجہ عبدالرحیم نقش بندی سے سادات نقش بندیہ کا کشمیر میں سلسلہ چلتا ہے۔ صاحب سیادت ہونے کے باوجود خواجہ بھی کہلائے تھے۔ یہ لفظ آج تک ان کی اولاد کے نام کا جزو ہے۔ بارہ مولا کا ایک خاندان "مکانی" کے نام سے مشہور ہے اس خاندان کا جد اعلیٰ مکہ مکرمہ سے کشمیر آیا تھا اس لئے مکانی مشہور ہوا۔ اس خاندان کے افراد خواجہ غلام احمد، خواجہ صدیق اول، خواجہ محمد اکبر جوُ وغیرہ مشہور ہوئے۔ ان کے نام کے شروع میں خواجہ اور آخر میں جوُ شامل ہے۔ یہاں نام کے ساتھ جوُ صاحب اور جی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اب یہ واضح ہونا چاہئے کہ خواجہ محض ایک اعزازی اور تعظیمی لقب ہے یہ کوئی گوت نہیں اور نہ یہ کوئی نام ہے۔ تاہم گلگت میں بعض لوگوں نے اسے بطور نام بھی استعمال کیا ہے اس صورت میں نہ یہ اعزازی نام ہے نہ کوئی گوت بلکہ کسی نام کا جزو یا حصہ ہے۔

مثلاً خواجہ خان، خواجہ احمد، اشرف خواجہ وغیرہ۔

جوُ:

سنسکرت میں "جوُ" صاحب اور جناب کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے اور اس لفظ نے یہیں سے کشمیری اور شمالی علاقہ جات کی دیگر زبانوں میں سرایت کیا۔ شینا زبان میں جوُ دو معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ایک صاحب اور جناب کے معنوں میں اور دوسرا سلام کے معنوں میں، دونوں تعظیمی الفاظ ہیں تاہم جو سلام کے متبادل نہیں "جو تھیوک" تعظیم بجا لانے کے معنی رکھتا ہے۔ بروشسکی میں ان دونوں معنوں میں استعمال کے ساتھ ساتھ سلامی دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً راجہ، میر، وزیر، اور کپشور کی خدمت میں جو تحفہ تحائف اور دیگر اشیاء پیش کی جاتیں وہ جوُ یعنی سلامی کہلاتیں نیز کسی صاحب اقتدار کے سامنے بات کی جاتی تو ہر بات کے اختتام پر جوُ احتراماً لاحقہ کے طور پر لگایا جاتا۔ بلتی زبان میں بھی "جوُ" کا استعمال ان ہی معنوں میں ہوتا ہے اور کثرت سے ہوتا ہے۔ مثلاً "یہہ جوُ یہہ" یعنی "جی جناب" "ہاں جناب"۔ شینا اور سنسکرت میں جوُ "صاحب اور جناب" کے معنوں اور "اواجوُ" ہاں جناب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہی صورت کشمیر میں تھے۔ کشمیر میں جوُ صاحب اور جی کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ مثلاً رسول جوُ رسول صاحب "اصغر علی جوُ" اصغر علی صاحب وغیرہ۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں "خواجہ کا لفظ تو اعزازی و امتیازی ہے البتہ جوُ کا لفظ کہ وہ بھی صاحب اور جی کے بجائے استعمال ہوتا تھا، متروک ہو رہا ہے۔

بہر حال ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ "جوُ" کوئی گوت نہیں بلکہ محض ایک تعظیمی کلمہ ہے جو صاحب اور جناب کے طور پر کسی بھی خاندان کے معزز افراد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم بعد ازاں شمالی علاقہ جات میں بعض خاندانوں نے کم علمی سے اپنے نام کا حصہ بنا دیا۔ یہاں کے شجروں میں بہت سے ایسے نام ملتے ہیں مثلاً احمد جوُ، رسول جوُ، احد جوُ، غفور جوُ وغیرہ یہاں جوُ صاحب کے لئے نہیں بلکہ نام کے اظہار کے لئے مستعمل ہوا ہے۔

وزیر:

وزیر دیوان، مدار المہام، منتری، دربارِ شاہی کے مہتمم کو کہا جاتا ہے۔ وزیر کا مادہ وزر قرار دیا جائے تو اس کے معنی جائے پناہ کے ہوتے ہیں اور اگر وزر مان لیا جائے تو اس سے معنی بوجھ اٹھانے والے کے بنتے ہیں۔ یہ دونوں معانی وزیر کی اصلیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وزیر ایرانی حکمرانوں کی تاریخ میں در آیا اور یہاں اس کا بڑا مقام تھا۔ عباسی خلفاء نے ساسانیوں کی تقلید میں عہدۂ وزارت قائم کر کے عرب دنیا میں وزیر وزراء کے عہدے قائم کئے اور کاروبارِ سلطنت ان وزاراء کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ برامکہ وزراء کی شہرت مشہور تھی کیونکہ ان میں مدبر وزراء کا ایک سلسلہ چل نکلا تھا۔ وزیر نالائق، بدباطن اور بدکردار ہو تو سقوطِ بغداد بھی ہو سکتا ہے۔ عباسیوں کے آخری خلیفہ مقصم کے وزیر ابنِ علقمی کا کردار سب کے سامنے ہے کہ اُس کے ہاتھوں مسلمانوں کا کیا حشر ہوا۔ ہندوستان میں مغل حکمرانوں کے دور میں وکیلِ سلطنت یا دیوان وزیر سلطنت کے طور پر فرائض نبھاتا تھا۔ کشمیر میں وزیر کا عہدہ مدار المہام کہلاتا اور وہ بادشاہ کے بعد سب سے بڑا عہدیدار ہوتا۔ یہ عام زبان میں وزیر بھی کہلاتے۔ کشمیر میں وزیروں کے ہاں جو پنڈت ملازم یا گماشتہ یعنی کارندہ کے طور پر کام کرتے وہ بھی رفتہ رفتہ وزیر ہی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور جن پنڈتوں نے وزیروں کا کام تسلسل سے کیا وہ خاندانی طور پر وزیر مشہور ہوئے۔ اور محض ان پنڈتوں کا خاندان وزیر کہلایا۔ اور یوں یہاں ایک گوت نے جنم لیا۔

شمالی علاقہ جات کی تاریخ میں راجوں، میروں، گمپوروں وغیرہ کی تاریخ کے ساتھ وزیر کا عہدہ بھی ملتا ہے۔ راجہ کسی بھی خاندان کے صاحبِ فراست، مدبر اور عاقل شخص کو وزیر مقرر کرتا جو حکمرانوں کو کاروبارِ سلطنت میں مدد دیتا۔ یہ وزیر عوام الناس کے مقدمات کا فیصلہ کرتے، جنگی امور اور مالیات کی دیکھ بھال کرتے۔ شین، یشکن، رانو، مغل وغیرہ قوموں سے وزراء لئے جاتے رہے ہیں۔ گلگت کی تاریخ میں وزیر ریشو، وزیر سلطانو، وزیر حولو، وزیر ہمایوں بیگ، وزیر شاہ مراز، وزیر غلام حیدر، وزیر محمد خان مشہور وزیر ہوئے ہیں۔ گلگت میں مہاراجہ کی حکمرانی کے اولین دور میں گلگت میں دو وزیر، وزیر محمد خان اور وزیر شاہ مرزا مقرر تھے۔ وزیر محمد خان بگروٹ حراموش چکلوں کی طرف اور وزیر شاہ مرزا سئی ڈموٹ چکلوں کا وزیر تھا۔ ان کو درج ذیل مراعات حاصل تھیں۔

(1) لسپک
(2) مقدمات فیصل کرنے کے معاوضات
(3) کاربیگار کی معافی کی مراعات
(4) وظیفہ کی مراعات
(5) وزیر کسی جنگ کے لئے جاتا لوگ لسپک کے طور پر وزیر کے گھر خدمات کے لئے آدمی مہیا کرتے۔

گلگت میں وزیر وزارات کا عہدہ جلیلہ گورنر کے برابر تھا۔ اسے مہاراجہ کشمیر مقرر کرتا اور اس طرف یہ سب سے بڑا عہدہ تھا۔

بہر حال "وزیر" ایک عہدہ ہے۔ یہ بھی یہاں کوئی گوت نہیں تاہم جن خاندانوں میں کسی فرد نے وزیر کے فرائض سر انجام دیئے ہوں۔ اُس کی اولاد اس لقب سے ملقب ہوتی رہی ہے۔ اگر چہ وہ خود کبھی وزیر نہیں رہے۔ مثلاً وزیر شاہ مرزا کی اولاد میں وزیر شفا اور وزیر عیسیٰ کے پاس وزیری نہیں تھی۔ لیکن وہ وزیر کہلاتے تھے۔ لیکن اب ان کی اولاد اس سابقہ سے محروم ہے۔

شمالی علاقہ جات میں "وزیر" اب ناموں کا حصہ بھی ہے۔ مثلاً محمد وزیر وزیر محمد، وزیر جان، وزیر خان وغیرہ نام ہیں۔ نہ یہ نسل کا اظہار ہیں اور نہ یہ عہدہ کا۔ محاورتاً وزیر اُسے کہا جاتا ہے جو بڑی بڑی باتیں کرتا ہے۔ شنا میں کہتے ہیں۔ "اومورو وزیر ہن" یعنی وہ باتوں کا وزیر ہے۔

ارغُن :

ارغُن کا لفظ شمالی علاقہ جات بشمول لداخ میں عام مستعمل رہا ہے۔ اس کی بھی وضاحت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ نسلی ادغام کا مظہر ہے۔ لداخ میں "ارغُن" اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کشمیری یا یارقندی مرد اور لداخی خاتون کی اولاد ہو (کشیر از ڈاکٹر صوفی صفحہ 219) بلتستان میں ارغن مخلوط، ملا جلا، کم اصل، دو غیر میل افراد کے اختلاط کو کہتے ہیں۔ گلگت اور اردگرد علاقوں میں بھی یہی معانی موجود ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں ارغن ایسی اولاد کو کہتے ہیں جو شاہی مرد اور غیر شاہی عورت کے اختلاط کا نتیجہ ہو۔ درج ذیل تفصیل سے یہ بات واضح ہو گی۔

(1) شاہی مرد اور شاہی عورت — گشپور

(2) شاہی مرد اور غیر شاہی عورت — ارغن گشپور

بلتستان میں "ارغن" ملی جلی اشیاء کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ اس تفصیل کے باوجود دراصل اولاد مرد کی نسل کا نمائندہ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ اصطلاحات بے معنی ہیں۔ اور قابل نفرت بھی۔ اب ہمارے علاقے میں گشپور، ارغن گشپور، راجہ، رانی کی باتیں اورق پارینہ کی زینت ہیں۔ اور بس۔ اگر ہم مختلف قوموں کے ماضی کو کھنگالیں تو کئی شوشے نکل سکتے ہیں۔ تو پھر ہم دوسروں کو کیوں ہدف تنقید بنائیں۔

خبر لے بعد میں اے گُل دلِ صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

شنوں اور یشکنوں نے یہاں کئی سو سال تک حکمرانی کی ہے۔ تو انھیں راجپوت کیوں نہ مان لیا جائے؟ ارغون تصورات جہلا کی سوچ کے انداز ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر کم علمی کی وجہ سے اپنے اصل ماخذوں پر نہیں پڑتی اور وہ دیومالائی مفروضوں کو لے کر خوش رہتا ہے۔ جبکہ سائنٹفک دور کا انسان ان باتوں پر ہنستا ہے۔

راٹھور:

راٹھور راجپوتوں کا ایک مشہور فرقہ ہے۔ راٹھور کے چند بگڑے نام راتھر، راؤ تھور اور راتیور ہیں۔ اصل لفظ راؤ تھر بتایا جاتا ہے۔ جو بدل کر راتھر بنا اور پھر راٹھور ہو گیا۔ راتھر کے معنی پہلوان کے ہیں۔ راٹھور یا راتھروں کا مرکز صوبہ راجستھان تھا۔ جہاں سے اس قوم کے افراد جموں کشمیر بھی آئے۔ "تاریخ راجپوت گوتیں" کتاب میں لکھا گیا ہے۔ کہ جنجوعہ اور راٹھور ایک ہی خاندان سے ہیں۔ راٹھوروں میں راجہ مل راٹھور بہت مشہور ہو گزرا ہے۔ اسی راجہ نے جہلم کے نزدیک ملوٹ نامی علاقہ آباد کیا تھا۔ سر والٹر لارنس لکھتے ہیں۔ کہ راتھر بھی کشمیر کے ان شیوخ میں شامل ہیں جو کھشتریوں سے مسلمان ہو گئے تھے۔ مولوی محمد سعادت لکھتے ہیں کہ راتھر بہت پہلے کشمیر آئے۔ اور یہاں بڑا اثر رسوخ رکھتے تھے۔ تاریخ حسن میں لکھا گیا ہے کہ ڈار، بٹ، لون، ماگرے اور راتھر قومیں قدیم ہندو راجاؤں کے دور میں جنگجو اقوام کی صف میں شامل تھیں۔

یہاں گلگت کے قدیم بندوبستی اور سرکاری ریکارڈ میں یہاں کسی راٹھور قوم کا

تذکرہ موجود نہیں۔ ریکارڈ میں جن قوموں کا ذکر ملتا ہے۔ اُن میں شین، یشکن، رانو، پایر، میر، بمبہ، زرگر، ہرشے، مغل جان، کمین، لوہار، حجام، ڈوم، قزلباش، بیگ، مقپون، موچی، راوٹ، مغلوٹ، آخون، شیخ، ملا، لون، ترکھان، ہٹ، فقیر، سید، جرال، کشمیری، ساموں، ملک، ڈار، گنائی وغیرہ شامل ہیں۔ راوٹ اور راٹھور دو الگ الگ ذاتیں ہیں۔ امیر سنگھ نائب مہتمم بندوبست اول اور ٹھاکر سنگھ مہتمم بندوبست ثانی دونوں کشمیری اور ہندی ذاتوں کے حقیقت شناس تھے۔ وہ راٹھور اور راوٹ ذاتوں میں امتیاز کرتے ہیں۔

ڈوم:

ڈوم ہندوؤں کی ایک گھٹیل قوم مانی جاتی ہے۔ لیکن ہندو ڈوم کو اپنے دائروں سے نہیں مانتے۔ ہندو ماہرین عمرانیات انھیں کسی سابق آرین نسل سے قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شودروں میں سے تھے۔ کروک اپنی کتاب "دی نیٹیو ریسز آف دی نادرن انڈیا" میں لکھتے ہیں۔ کہ ڈوموں کی موٹی انگلیاں، سیاہ رنگ، سیاہ اور تیز نگاہیں اُنھیں یقینی طور پر نان آرین ظاہر کرتی ہیں۔ نیز چونکہ یہ ہندوستان میں ہر طرف ملتے ہیں اس لئے ان کا کردار مختلف النوع ہے۔ معزز ہندو ان کو چھونا تو درکنار انھیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس لئے ان کے بارے میں بہت سی باتیں پردہ، اخفاء، میں ہیں۔ کہا جاتا ہے بنگال کے ڈوموں میں یہ عجیب رسم موجود تھی کہ وہ اپنے مردوں کو نہ جلاتے اور نہ ہی دفن کرتے۔ بلکہ وہ رات کو مردے کے اعضا الگ الگ کر کے دریا میں بہاتے۔ رسلے کا خیال ہے کہ شاید یہ بات اس لیے ہے کہ قدیم ہندو قانون کے مطابق انھیں اپنے مردوں کو رات کے وقت دفنانے کا حکم تھا۔ ڈوم چٹائیاں، ٹوکرے بناتے اور مختلف چھوٹے موٹے کام کرتے۔ ان سے لوگوں کو پھانسی پر چڑھانے کا کام بھی لیا جاتا۔ ہندوستان میں ڈوم ہر ایک کا بچا کھانا کھاتے۔ لیکن دھوبی کا بچا کھانا نہیں کھاتے۔ زیریں ہمالیائی علاقوں گروال وغیرہ میں یہ کسی قدیم نیچ قوم کی باقیات میں سے بتائے جاتے ہیں۔ جو مغرب میں کشمیر تک پھیلے ہوئے تھے۔ پنجاب میں ڈوم مراثی کہلاتے ہیں۔ ان کی عورتیں بھی ناچتی ہیں۔ لیکن عورتوں کے سامنے۔ یہ مراثی شادی بیاہ اور جنازوں کے موقع پر موجود ہوتے ہیں۔ وہ ناچتے گاتے ہیں اور ماتمی مواقع پر مردہ اور اس کے اسلاف کے گُن گاتے رہتے ہیں۔

کروک پیشہ وروں کی درجہ بندی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ پیشہ وروں میں سونار کا پہلا رتبہ ہے۔ وہ دھات کی اہمیت کے اعتبار سے تانبہ، پیتل، سیسہ کے کاریگر بھی سونار کے بعد درجہ بند کرتے ہیں۔ دوسرے درجے میں لوہار اور بڑھئی کو جگہ دیتے ہیں۔ وہ لوہار کو نان آرین قرار دیتے ہیں۔ اور یہ بات درست بھی ہے۔ نسل در نسل لوہوری کا کام کرنے والے لوگ ترکھانوں (ترخانوں) کی طرح مغل ہیں۔ ہاں ہندوستان میں مختلف قوموں کے وہ افراد جو لکڑی یا لوہا کا کام کرتے ہیں۔ وہ لوہار یا ترکھان نہیں کہلاتے اور جو لوہار اور ترکھانی کا کام نہ کرتے ہوئے بھی لوہار یا ترکھان (ترخان) کہلاتے ہیں۔ وہ کسی ہندوستانی یا کشمیری ذات کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ یہ دساوری مغل ذات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کی بحث آگے گزر چکی ہے۔ کروک اس کے بعد تیسرے درجہ میں کمھار، رنگ ساز، جولاہا، درزی وغیرہ کو رکھتے ہیں۔ دھوبی، قصائی، گورکن چوتھے درجے میں چمار، کہار پانچویں درجے میں حجام، ڈوم، مراثی چھٹے درجے میں اور آخری درجے میں بھنگیوں کا مقام آتا ہے۔ ڈاکٹر لٹز کہتے ہیں۔ کہ ڈوموں کا درجہ کرمنوں کے بعد آتا ہے۔ وہ پھر کہتے ہیں۔ کہ شمالی علاقہ جات میں ذاتوں کے چار طبقات موجود ہیں۔ یعنی شین، یشکن، کرمین اور ڈوم۔ شین اگر انسان کا دایاں ہاتھ ہیں۔ تو یشکن بایاں ہاتھ اور اگر کرمین دایاں پاؤں تو ڈوم بایاں پاؤں۔ ڈوم کوئی بھی کام کر سکتا ہے تاہم اگر کوئی ڈوم ملا بن جائے تو اُس کا احترام کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر لٹز یہ بھی لکھتے ہیں۔ اگر کسی گاؤں میں کرمین نہ ہوں تو اونچی کلاس کے لوگ لوہے اور لکڑی کا کام تو کرتے ہیں۔ لیکن جولاہے کا کام نہیں کرتے۔ اس کام کے لیے وہ کرمین اور ڈوم کا ہی انتظار کرتے ہیں۔

کشمیر میں راجہ چکرورمن کے دور میں ڈوموں نے بڑا عروج حاصل کیا تھا۔ یہاں تک کہ اُس دور میں ڈوم وزراء اور امراء کے عہدوں پر متمکن تھے۔ لیکن بقول محمد دین فوق اس کے باوجود چند روز کی عزت ان کی شودرپن کو دور نہ کر سکی۔

فریڈرک ڈریو درجہ اور رتبہ کے اعتبار سے داردوں کو درج ذیل پانچ طبقات میں تقسیم کرتے ہیں۔

(1) رونو
(2) شین
(3) یشکن

(4) کمین

(5) ڈوم

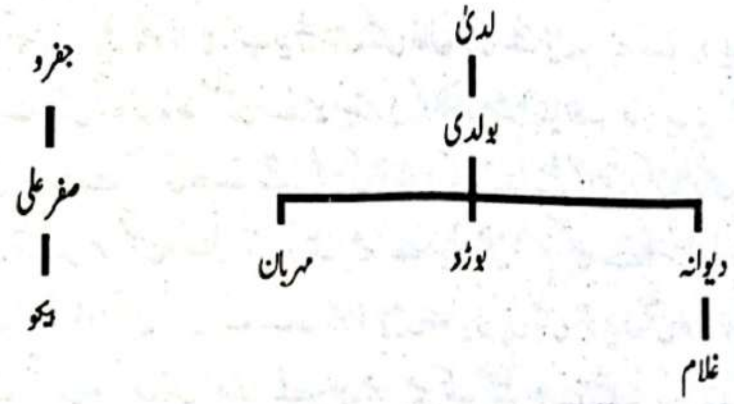
1928ء کے حکومت ہند کے گزٹیئر میں کمین، ڈوم اور شوٹو کو ہندوستانی کمار اور ڈوم کے ہم درجہ بنایا گیا ہے۔ بلتستان میں مون انسانی معاشرتی طبقات میں آخری درجہ میں آتے ہیں۔ یہ گلگت کے ڈوموں کے ہم پلہ ہیں۔ اور موسیقاری کا کام کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہندو آریا تھے۔ اور بدھ ازم کی تبلیغ کیلئے یہاں آئے تھے۔ اور پھر یہیں بسے رہے۔ بہ مرور زمان موسیقاری کو بطور پیشہ اپنایا جو مقامی طور پر کوئی معزز پیشہ نہ تھا۔ جس کے باعث یہ لوگوں کی نظروں سے گرتے گئے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر بہت سے لوگوں نے آہستہ آہستہ یہ پیشہ چھوڑا اور اب یہ بلتستان میں خال خال ملتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خیال درست نہیں لگتا کہ بدھ مبلغین نے موسیقاری کو بطور پیشہ اپنایا ہو۔ حالانکہ یہ مبلغین اونچے دینی طبقات سے متعلق ہوتے تھے۔ اُن کی اولاد کا ایک ایسے پیشے کا اختیار کرنا جو اُن کے دھرم سے متناقض ہو ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ میرے خیال میں ڈوم کشمیر سے بلتستان اور پھر گلگت آئے اور یہ ڈوم اُسی نسل کے تھے۔ جو زیریں ہمالیائی پٹی میں اتر پردیش اور ہماچل پردیش کے متصل علاقوں میں موجود تھے۔ اور جو کشمیر تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ خانہ بدوش لوگ کسی قدیم دور میں کشمیری سلاطین حملہ آوروں کے جلوئیں یہاں آئے۔ بڈلف خیال ظاہر کرتے ہیں۔ کہ ڈوم شنوں کی طرح جنوب سے آئے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ چترال کی طرف ڈوم موجود نہیں حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ چترال میں سازندے فقیر مسکین طبقے میں عام ملتے ہیں۔

ڈوم جو سازندوں اور لوہاری کا کام کرتے ہیں۔ درایل، تانگیر، یاسین، نگر اور چلاس میں بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ نگر میں شوٹو قوم بھی اسی طبقے میں شامل ہے جو چمڑا کو رنگتی ہے۔ اور پاؤں میں پہننے کے لیے پاپوش تیار کرتی ہے۔ شوٹو قوم ڈوم سے بھی کمتر خیال کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ناموس لکھتے ہیں۔ کہ یاسین میں بولی جانے والی زبان بلستم ڈوموں کی زبان ہے جو ڈوم اپنے گھروں میں بولتے ہیں۔ یاسین میں بولی جانے والی عام زبان کو ورشک کہا جاتا ہے۔ ورشک اُس کھوار کو کہا جاتا ہے۔ جو بروشکی سے مخلوط ہو تاہم ڈومکی ڈوموں کی زبان ہے۔ جو گلگت، ہنزہ اور یاسین میں بولی جاتی ہے۔ یہ ایک انڈو ایرین زبان کے خواص سے مملو ہے۔ ہنزہ میں بریشل (مومن آباد) میں بولی جاتی ہے لیکن اب وہ وقت دور نہیں

جب یہ زبان ماضی کا حصہ بن جائے اور لوگوں کے اذہان سے بالکل اُتر جائے۔

گلگت میں موضع ڈومیال میں کچھ ڈوم گھرانے موجود ہیں۔ اس موضع کا ڈومیال کے نام سے معروف ہونے کی وجہ یہی ہے کہ یہاں قدیم زمانے سے ڈوم بستے آئے ہیں۔ تاہم یہاں اور اقوام کے لوگ بھی ملتے ہیں۔

1916ء کی بندوبست میں دو ڈوم خاندانوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اُن کا شجرہ درج ذیل ہے۔



گنائی :

گنائی فارسی زبان میں اہل قلم، منشی اور محرر کو کہتے ہیں۔ یہ ایک خطاب تھا۔ جو 1420ء سے پہلے سے رائج تھا۔ چنانچہ تاریخ گلشن کشمیر میں درج ہے کہ بایزید عاصمی کو یہ خطاب ملا تھا۔ کیونکہ وہ ایک نامور خوش نویس اور معروف اہل قلم تھے۔ اس حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ خطاب کسی ایک مخصوص فرقہ کو ہی نہیں ملتا تھا۔ بلکہ ایسے تمام افراد کو ملتا جو زبردست اہل قلم ہوتے۔ تاریخ حسن میں لکھا ہے کہ یہ خطاب برہمن اقوام میں سے اُن اشخاص کو بخشا جاتا جو منشی گر ہوتے۔ یہ بات صریحاً درست نہیں کیونکہ اگر یہ لفظ بطور خطاب استعمال ہوتا تھا۔ تو صرف برہمنوں کے لئے ہی مخصوص کیوں کر ہو سکتا تھا۔ محمد دین فوق اپنی تاریخ اقوام میں لکھتے ہیں۔ "گنائی طبقہ میں وہ مسلمان بھی شامل ہیں۔ جو بیرونی ممالک سے آئے اور شیوخ کشمیر میں شامل ہیں۔ جو کشمیر کے برہمنوں اور ہندوؤں کے دیگر فرقوں سے مسلمان ہو گئے تھے۔" وہ پھر لکھتے ہیں۔ " کشمیر میں گنائی فرقہ چار طبقوں میں منقسم

ہے۔ ایک وہ جو عاصم بن حضرت عمرؓ فاروق کی اولاد سے ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو سید تھے۔ یا مغل یا پٹھان یا قریشی جن کو یہ خطاب ملا۔ ان کی اولاد بھی گنائی ہی کہلاتی رہی۔ تیسرے کشمیر کے نو مسلم جن میں برہمن، کھتری، ویش سب شامل ہیں۔ چوتھے وہ گنائی جو قصابوں کا کام کرتے ہیں۔ گنائی کے تین طبقوں کے متعلق تو تشریح کی ضرورت نہیں۔ ان کے مطالب و معانی خود بخود ظاہر ہو رہے ہیں۔ قصاب گنائیوں کے متعلق تاریخ حسن کا مصنف لکھتا ہے۔ ہلمت گنائی نام شخص نیکوکار مشہور روزگار است، و لے کار گوسفندان قصابی بر خود مقبول نمودہ، اکنوں ذریّت او تمام کار گوسفندان قصابی مے سازند، غرض قوم کا ایک گروہ قصابوں کا کام اور اپنے آپ کو ہلمت گنائی کی ذات سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن اس وقت کشمیر کے سارے قصاب گنائی طبقہ سے اور ہلمت گنائی کی زریت سے نہیں ہیں۔ بلکہ راقم حروف کی تحقیقات کے مطابق کشمیر کے قصابوں میں کول، بٹ، ڈار، میر، چک اور بعض اور اقوام بھی شامل ہیں۔ اور قصابوں میں شامل ہو کر گنائی کے نام سے موسوم ہیں۔" یہ بات بھی یاد رہے کہ کشمیر کے مواضع میں جو لوگ سرکار کی طرف سے چوکیداری کے فرائض سر انجام دیتے ہیں۔ انہیں بھی گنائی سے موسوم کیا جاتا ہے۔

گلگت میں دو گنائی خاندان موجود ہیں۔ ایک چوہدری عبدالخالق اور چوہدری غلام قادر مرحوم کا ہے۔ اس خاندان کے ایک فرد خورشید "خبریں" اخبار کے گلگت میں رپورٹر ہیں۔ دوسرا خاندان محمد وح قصائی کا ہے۔ محمد وح قصائی اُسی ہلمت قصائی کے حلقہ سے ہیں جو قصاب کا کام کرتے تھے۔

محمد وح قصائی کا شجرہ درج ذیل ہے۔

- رجب گنائی
  - محمد وح ساکن بانڈی پورہ
    - محمد رمضان
      - مبارک جان (جرنلسٹ)
      - سلامت جان
      - کامل جان
      - شاہد جان
      - عامر جان
    - کاکا جان
      - مرجان
      - کریم جان
      - صابر جان

رانگھر راجپوت :

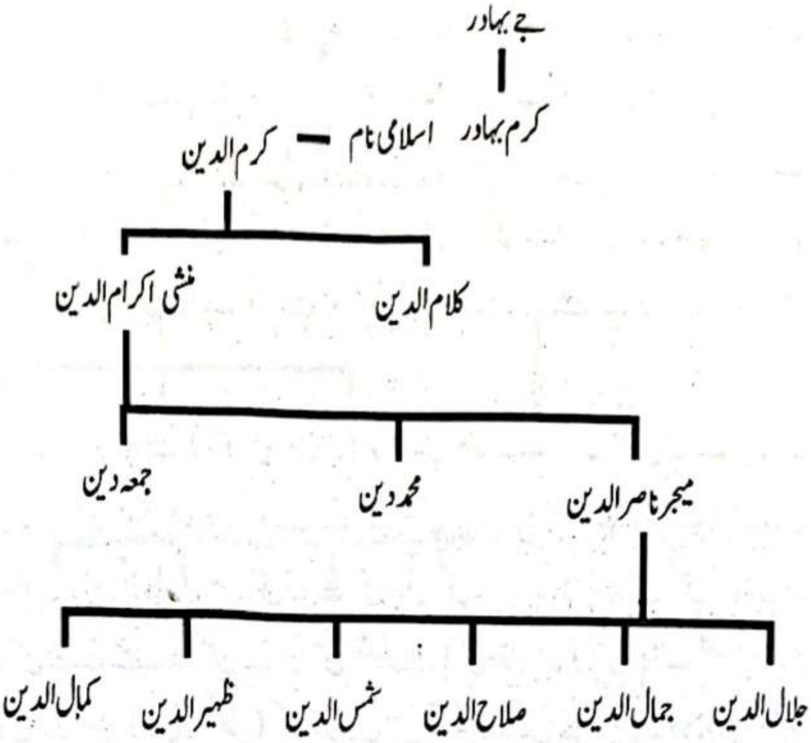
میجر ریٹائرڈ ناصر الدین گلگت کے ایک نامور سپوت ہیں۔ ان کے والد گرامی منشی اکرام الدین میرے والد گرامی منشی محمد یوسف کے دوست اور ساتھی تھے۔ وہ دونوں عرائض نویساں کے حلقے سے تھے۔ اور دونوں کا کائی ثانی بھی نہ تھا۔ میرے والد گرامی منشی اکرام الدین کو گھورکھوں کہتے تھے۔ میں منشی اکرام الدین مرحوم کو جانتا ہوں۔ شکل و صورت و شباہت میں وہ گورکھوں سے ملتے تھے۔ وہ گلگت کے کسی بھی قوم شین، یشکن، کشمیری وغیرہ سے کسی طرح میل نہ کھاتے تھے۔

نیپال کی اقوام میں گورکھے اور نوار دو بڑے خاندانی جھتے ہیں۔ یہاں کئی مختلف الاصل قومیں ملتی ہیں۔ اور کئی زبانیں بولتی ہیں۔ یہ اقوام زیادہ تر ہندوستان کی طرف سے آ کر یہاں بسی ہیں۔ ہندوستان کی طرف سے آنے والی کچھ قوموں اور نیپال میں بسنے والی تبتی اقوام کے میل سے جو قوم معرض وجود میں آئی وہی گورکھا کہلائی۔ اوڑلیہ، ناگ پور کے کولوں سے مشابہ نیم وحشی قومیں بھی نیپال میں آباد ہیں۔ لیکن جیسے میں نے پہلے اشارہ کیا یہاں

نوار اور گورکھا ہی دو بڑی قومیں ہیں۔ جو سالہا سال سے ایک ساتھ رہ رہی ہیں۔ نوار یہاں کی قدیم قوم ہے۔ گورکھوں کی آمد سے پہلے وہی یہاں حکمران قوم تھی۔ بعد میں یہاں گورکھوں نے اپنا اثر رسوخ قائم کیا اور نہ صرف پورے نیپال پر چھا گئے بلکہ ہندوستان میں بھی گورکھوں نے اپنے اثرات چھوڑے۔ یہ ایک بڑی جنگجو قوم ہے۔ اس نے ہندوستان کی انگریزی افواج میں بڑا نام پیدا کیا۔ گورکھوں نے دیگر پیشوں مثلاً تجارت، کھیتی باڑی، صنعت و حرفت وغیرہ سے کم لگاؤ رکھا ہے اور زیادہ تر جنگی امور سے دلچسپی رکھی ہے اور اس شعبے میں بڑا نام کمایا ہے۔ رانگھڑ راجپوتوں کی ایک قوم ہے جو مسلمانوں کے ہند پر غلبے کے دوران اِدھر اُدھر ہوئی۔

ماہنامہ پیام راجپوت (جنوری 1999ء) میں لکھا ہے۔ "ان کھتریوں نے اپنی ذمہ داریوں سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے فوجی تربیتی ادارے قائم کئے جہاں بچوں اور نوجوانوں کو زور آزمائی کی ضروری تربیت دی جاتی تھی۔ ان کے آپس میں جنگی مشقیں اور مقابلے بھی ہوتے تھے۔ برہمن نے ان نقلی جنگوں اور باہمی مقابلوں کو جنگی کرتب ٹھہرا کر تمام نوجوانوں کو رنگھڑ (رن۔ گھڑ) کہا اور یوں اس قدیم دور میں یہ تمام پیشہ ور جوجی رانگھڑ کہلانے لگے۔ چونکہ عرصہ دراز تک تمام بیرونی حملہ آور شمال مغربی سرحدوں سے برصغیر ہند میں داخل ہوتے رہے اور شمال سے جنوب تک پوری وادی سندھ میدان جنگ بنی رہی اس لیے ہندو حکمرانوں نے بھی پورے برصغیر سے چن چن کر ان پیشہ ور فوجیوں (رانگھڑوں) کو شمال میں کوہستان ہمالیہ سے جنوب میں گجرات کاٹھیاواڑ تک یعنی مشرقی پنجاب، راجپوتانہ اور گجرات و کاٹھیاوار تک مستقل طور پر آباد کیا۔ پھر وہ کھتری النسل پیشہ ور فوجی کہیں گورکھا، جاٹ اور بعد ازاں سکھ کا روپ دھار گئے۔ اور کہیں رنگھڑ اور مرہٹہ کہلائے" مہاراجہ کشمیر کی افواج میں گورکھے بھی ملازم تھے۔ ان ہی میں جے بہادر نامی شخص (جے۔ سی۔ او) سکنڈ کشمیر رائفلز میں متعین ہو کر گلگت آیا۔ جے بہادر کی ماو ثاتی وفات پر اُس کا فرزند کرم بہادر اپنے والد کے یونٹ میں کلرک بھرتی ہوا۔ سادات کی تبلیغ سے مشرف بہ اسلام ہو کر کرم بہادر سے شیخ کرم الدین ہوا۔ 1916ء کی بندوبست میں یشکن قرار پایا حالانکہ یہ بات اصل حقائق سے لگا نہیں کھاتی۔

شیخ کرم الدین کا شجرہ درج ذیل ہے۔



شیخ کرم الدین کی شادی وزیر ولایت علی مرحوم اور کرنل احسان علی کے خاندان میں ہوئی۔ چونکہ یہ ایک یشکن خاندان تھا۔ اور اسی ناتے شیخ کرم الدین بھی یوں یشکن کہلایا جس طرح کشمیر سے آنے والی کچھ اور قومیں مقامی شین، یشکن اور دیگر خاندانوں میں ضم ہو گئیں۔ اِسی طرح یہ رانگھڑ خاندان یشکن بنا۔

پایر:

1762ء میں کشمیر سے آنے والے کشمیریوں کے بڑے جتھے کے ساتھ آنے والی قوم پایر بھی تھی۔ پایر کے کچھ جتھے بعد میں استور میں بھی بکھرے۔ یہ پیالے کہلائے۔ جگلوٹ میں (سئی) بھی ایک پایر خاندان درج ہوا ہے۔ ہندی زبان میں پیال کے معنی خشک گھاس کے ہیں۔ سنسکرت میں بھی یہی معنی ہیں۔ یعنی گھاس پھوس، پرال وغیرہ۔ پیال سے پیالے نے جنم لیا۔ یعنی گھاس پھوس، پرالی سے متعلق کام کرنے والے چرواہے۔ گھاس پھوس اکٹھے کرنے والے کشمیری زبان میں چوہان کو پاپوہل کہتے ہیں۔ پیال پاپوہل ہی کا متبدل

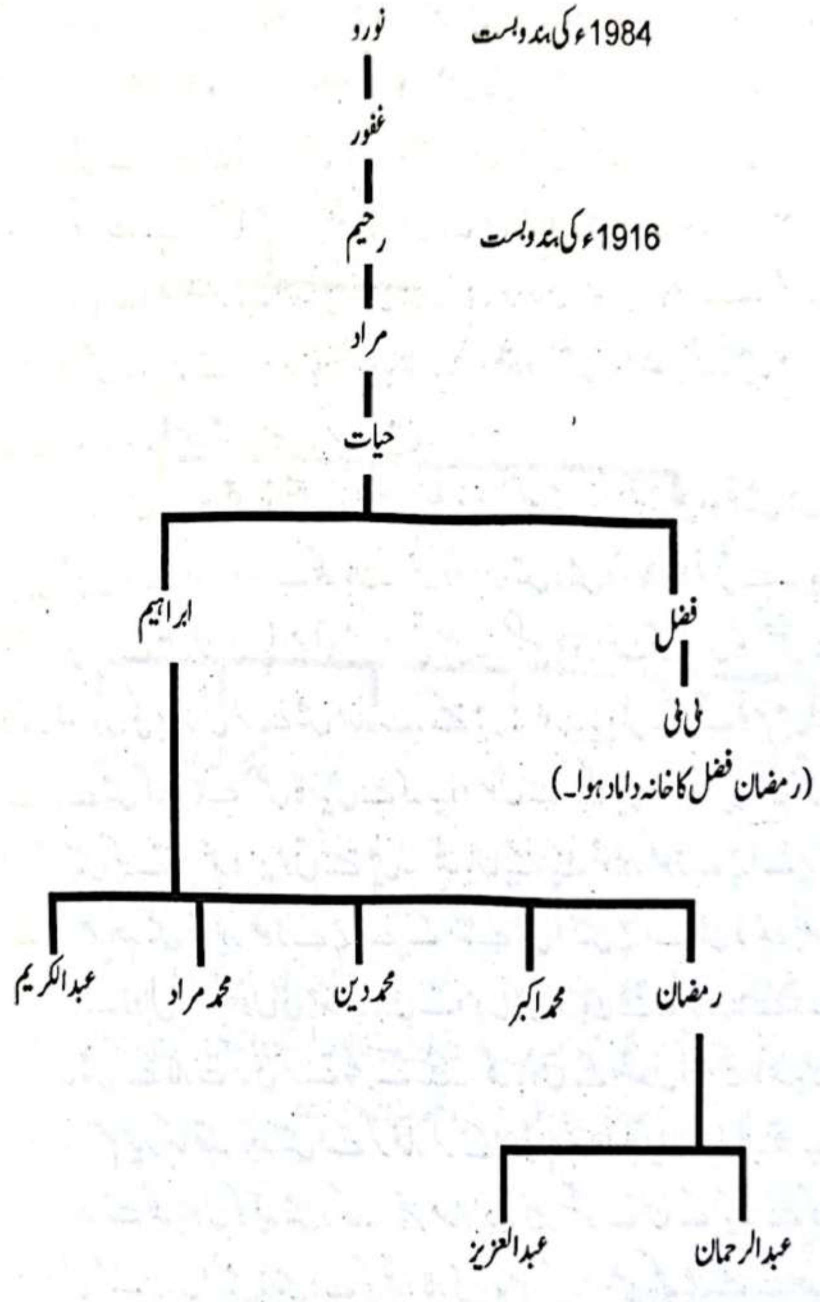
ہے۔ کشمیر میں پاپوہل مویشی چرانے کا کام کرتے ہیں۔ گلگت اور استور میں بھی اس قوم کے افراد نے ابتدائی ایام میں یہی کام جاری رکھا۔ ہماری طرف پاپوہل کثرت استعمال سے پاہل، پایل، پاریہا۔ 1894ء کی بندوبستی ریکارڈ میں یہ پیال تھا جبکہ 1916ء کے ریکارڈ اور بعد کے مال کے اندر جات میں یہ "پاری" مستعمل ہوا۔ واضح رہے پاری پیر کا مبدل نہیں اور نہ پیر کوئی قومیت ہے۔ کشمیر میں دیوانی خاندان کے ان افراد نے پیر کے لقب کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ جو صوفیا کے مسند پر متمکن ہوتے اور روحانی رہبری کا کام کرتے۔ عمومی طور پر پیر کسی بھی خاندان کے افراد کو مجازاً کہا جاتا ہے جو وعظ و تلقین کی مسند پر بیٹھتے ہیں اور لوگوں کی دینی اور روحانی امور میں رہبری کرتے ہیں۔

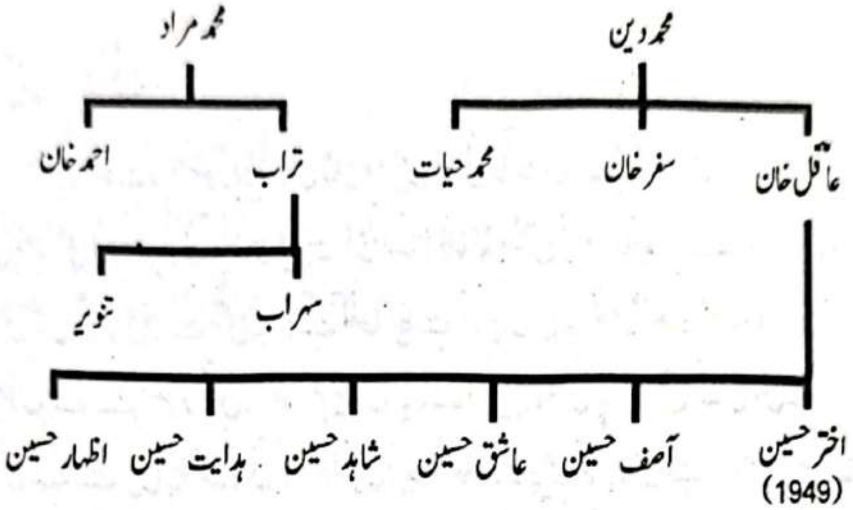
یہاں یہ بات بھی توضیح کے لائق ہے۔ کہ کشمیر میں اس قبیلہ کی دو قومیں ہیں ایک پاپوہل یعنی چرواہے اور دوسرے گلہ بان۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پاپوہل کھیتی باڑی کرتے ہیں ان کی اپنی چراگائیں ہوتی ہیں۔ لیکن جہاں تک گلہ بانوں کا تعلق ہے یہ لوگ گھوڑوں کی پرورش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اور یہ پاپوہل سے الگ قوم ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے بعض کا خیال ہے کہ یہ ڈوموں سے نکلے ہیں۔ محمد دین فوق اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں۔ گلہ بان پہلے پہلے ٹٹو اور گھوڑے چرانے پر مقرر تھے۔ مگر بعد میں ٹٹو اور گھوڑے چرانے کے مقابلے میں انہیں چرانے میں فائدہ نظر آیا۔ افغانوں کے زوال اور سکھوں کی حملہ آوری کے دنوں میں گلہ بان جتھے بنا کر اور بڑے بڑے لٹھ ہاتھوں میں لئے غارت گری کرتے پھرتے تھے۔ گلہ بانوں کے سنگدل ڈاکو خیرہ گلہ بان نے ایک اودھم مچا رکھا تھا۔ بعد میں اسے گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا گیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے بہت سے گلہ بانوں کو قید میں رکھا۔ پھر مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ان کے ایک جتھے کو بونجی جلاوطن کیا۔ یہاں انہیں زمین دے کر آباد کاری پر مامور کیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد بہت سے گلہ بان کشمیر واپس چلے گئے۔

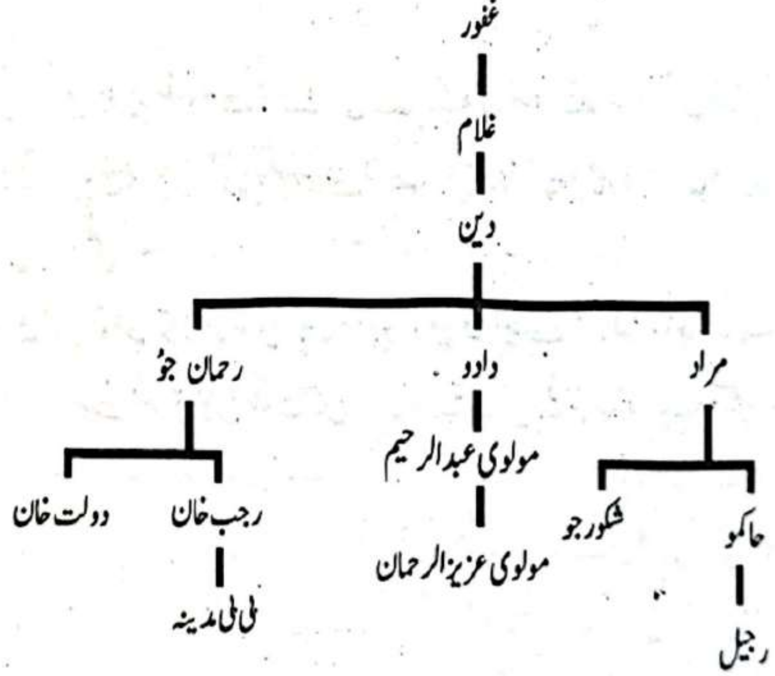
پاپوہل، پیالے، پاریوں کا نسلی ریکارڈ ان حوالوں سے صاف ستھرا ہے۔ محمد دین فوق کہتے ہیں ان کا پیشہ بھیڑ بکریوں کو چرانا ہے۔ ان کے نوجوان خوش طبعی اور سیٹی بجانے میں مشہور ہیں۔ یہ لوگ کشمیر کی بیشتر کارآمد جڑی بوٹیوں کے خواص شناس بھی ہیں اور طبیبوں کو نادر جڑی بوٹیاں بھی فراہم کرتے ہیں۔

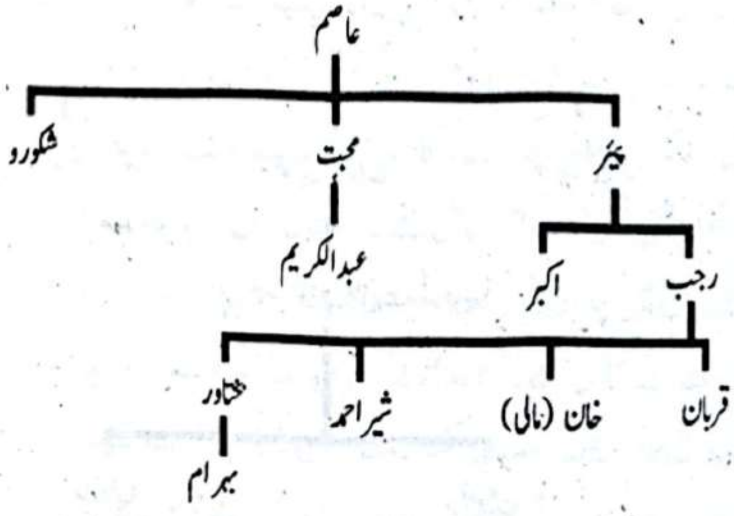
گلگت اور استور میں پیالے اور پاریوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔

یہاں چند خاندانوں کا شجرہ دیا جاتا ہے۔




محمد مراد
احمد خان
تراب
سہراب
تنویر
محمد دین
محمد حیات
سفر خان
عاقل خان
اختر حسین
(1949)
آصف حسین
عاشق حسین
شاہد حسین
ہدایت حسین
اظہار حسین


غفور
غلام
دین
رحمان جوؔ
داود
مراد
دولت خان
رجب خان
بی بی مدینہ
مولوی عبدالرحیم
مولوی عزیزالرحمان
شکور جو
حاکمو
رجیل


عاصم
شکورو
محبت
عبدالکریم
پیرؔ
اکبر
رجب
قربان
خان (نالی)
شیر احمد
بختاور
بہرام

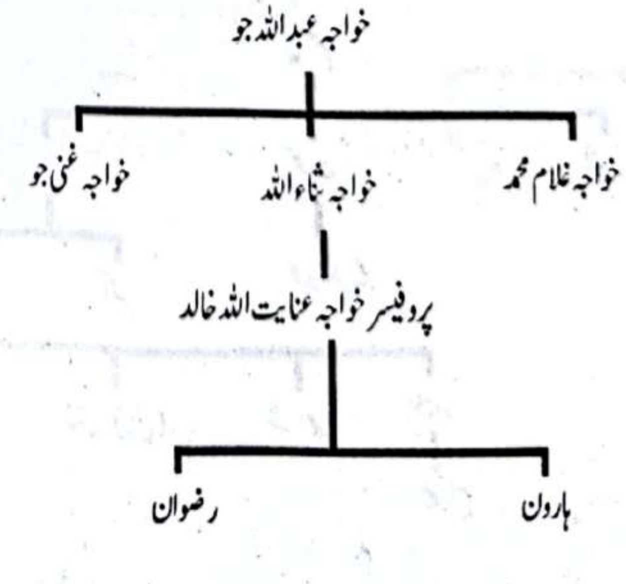
وائیں، وانی :

گلگت، استور، بلتستان میں وائیں یا وانی خاندان کے لوگ بھی ملتے ہیں۔ وائیں اور وانی ہم معنی اور مترادف الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کا ماخذ ویش قرار دیا جاتا ہے۔ جو آریوں کی درجہ بندی میں تیسری ذات تھی۔ آگے لکھا گیا ہے آریوں کی یہ قوم مختلف فنون اور کھیتی باڑی کے کاموں کے لئے مقرر تھی۔ تاہم یہاں یہ بات وائیں یا وانی پر صادق نہیں آتی۔ کہ یہ الفاظ ویش سے نکلے ہیں کیونکہ وانی اور وائیں ایک تجارت پیشہ قوم رہی ہے۔ اس قوم کے بارے میں جو تاریخی ریکارڈ ملتا ہے۔ اس کے مطابق وانی قوم کو شیوخ کشمیر کی ایک عالی نسب ذات قرار دیا گیا ہے۔

وانی یا وائیں جو چیز فروخت کرتے اس شے کے وانی کہلاتے۔ مثلاً تل وائیں یعنی تیل بیچنے والے، پوئی وائیں یعنی پشم بیچنے والے، ککڑ وائیں وغیرہ غرض وائیں کئی طبقات پر مشتمل قوم تھی۔

گلگت میں خواجہ ثناء اللہ وانی ایک نامور آدمی تھا ان کے فرزند خواجہ عنایت اللہ خالد میرے عزیز دوست ڈگری کالج گلگت میں پروفیسر تھے۔ پروفیسر خالد ایک عظیم انسان تھے۔

یہاں ان کا شجرہ دیا جاتا ہے۔



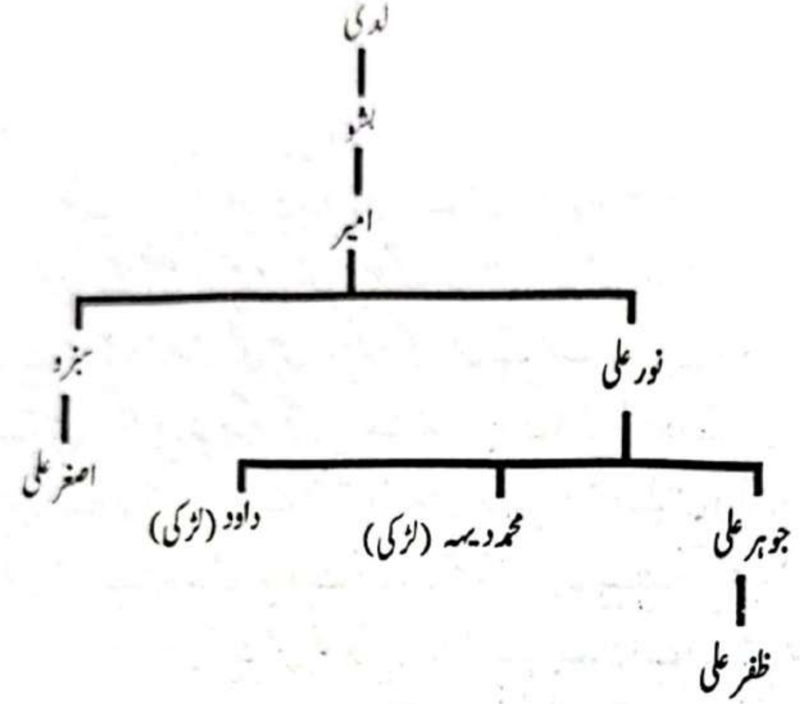
بٹ :

بٹ کشمیر کی ایک عزت مند قوم ہے۔ اس میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ بیشتر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ بٹ برہمنوں کی قوم ہے۔ راج ترنگنی کے مصنف پنڈت کلہن بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ تاہم مجھے یہاں واضح ابہام دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً بھٹ اور بھوٹ یا بھٹہ الفاظ کی مشابہتیں قطعی ہم معنی یا مترادف نہیں ہو سکتیں۔ چلاس میں شنوں کا ایک بڑا قبیلہ بوٹھ بھی ہے۔ کلہن راج ترنگنی میں لکھتے ہیں۔ "ان آدمیوں کا خیال میں یہ ایک فیاض راجہ تھا۔ (مہر گل یا مہر کل) جو یہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے اگر بار قائم کر کے اور ایسے ہی دیگر نیک کاموں کے ذریعے اپنے ظلموں کی تلافی کر دی تھی۔ بعض آدمی اس شیر سیرت انسان کے ظالمانہ کاموں کا اس مشہور عام روایت کے بموجب قابل معافی قرار دیتے ہے۔ کہ آریادیش کے باشندوں کو قتل کرنے کے بعد اس نے ایک سخت تپ کیا اور ملک میں جس کو درردوں (درد کے رہنے والے) بھوٹوں اور ملیچھوں نے تباہ کر دیا تھا۔ اور دھرم سے بالکل تلپٹ ہو چکا تھا۔ نئے سرے سے متبرک کر کے مذہبی رسوم قائم کیں۔ یہاں سٹائن فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں۔ کلہن اور اس کے بعد مورخوں نے جن لوگوں کو بھوٹ بھٹ یا بھٹوٹ بھی لکھا ہے۔ ان سے مراد اس فرقہ سے ہیں۔ جسے آج کل بٹ کہتے ہیں یہ لوگ عام طور پر تبتی نسل سے ہیں اور کشمیر کے مشرق اور شمال مشرق میں یعنی آج کل پہاڑی اضلاع دراس، لداخ اور شائد سکردو میں بھی رہتے ہیں۔ دیکھو شرنگ 4 شلوک 168۔ میرے خیال میں بھٹ اور بٹ ہم معنی اور ایک دوسرے کے مبدل الفاظ ہیں۔ یہ الفاظ ایک ہی قوم کے نمائندہ ہیں۔ اور اس قوم کے افراد قدیم زمانے سے مرکزی ہندوستان، آگرہ، اودھ، دہلی، اجین، مالوہ، گجرات، کاٹھیاواڑ تک پھیلے ہوئے تھے۔ مثلاً چندر گپت وکرماد یتہ کے نورتنوں میں تیل بھٹ بھی شامل تھے۔ سلطان زین العابدین کے دربار میں کئی ہندو عالم موجود تھے۔ ان میں پنڈت شیو بھٹ، یودھ بھٹ، روپیہ بھٹ، شری بھٹ، سوم بھٹ، پنڈت تاربوٹ بٹ شامل تھے۔ یودہ بھٹ اتھر وید کے عالم تھے۔ روپیہ بھٹ علم نجوم، شیو بھٹ طب کے ماہر تھے۔ سلطان سکندر بت شکن کا وزیر سیہ بٹ تھے۔ جو بعد میں مسلمان ہو کر سیف الدین بٹ ہو گئے تھے۔ سلطان حسن شاہ کے فوجوں کا کمانڈر تازی بٹ مسلمان تھا۔ کشمیر کے چک بادشاہ یوسف گاہ کے وزیر محمد بٹ تھا۔ غرض بٹ قوم کے افراد وزارت،

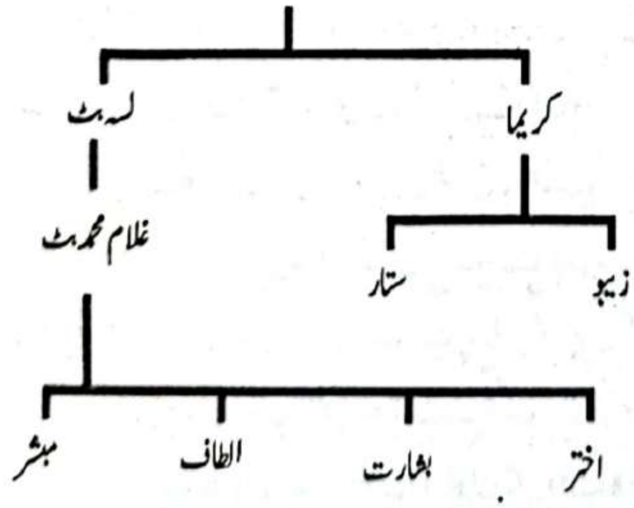
سیاست، تعلیم کے شعبوں میں اپنی شہرت رکھتے رہے ہیں۔ بٹ یا بھٹ کشمیری یا پنجابی برہمن ہو سکتے ہیں۔ لہذا انھی بھٹے یا چلاس کے بوٹھ ان بٹوں یا بھٹوں سے الگ ہیں۔ ڈاکٹر صوفی بھوٹالینڈ کو مغربی تبت قرار دیتے ہیں۔ (صفحہ 170) جسے سلطان زین العابدین نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ بھٹ منگول قوم ہو سکتی ہے۔ یا دارد (دارد آرین قوم تھی) جبکہ بٹ یا بھٹ آرین برہمن ہیں اور بوٹھ شین آرین۔ راجہ راج دیو کے زمانے میں جب اون اور دیگر فرقوں کا زور کم ہوا تو بٹ قوم نے راجہ کے خلاف بغاوت برپا کی۔ راجہ نے اس بغاوت کو سختی سے کچل دیا اور بقول محمد دین فوق راجہ نے اس برہمن فرقہ کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ کشت و خون کا ایک عالم طاری ہوا۔ کہ بٹ زیر زمین چلے گئے۔ اور بہت سوں نے اپنی ذات چھپا دی۔ بٹ قوم کے لوگ یہ کہتے پھرتے تھے کہ ہم بٹ نہیں۔ گلگت، استور اور بلتستان میں بٹ قوم کے لوگ موجود ہیں۔ گلگت کا اس قوم کا ایک نامور فرد جوہر علی خان ایڈوکیٹ مرحوم تھے۔ آپ نے 1945ء میں کشمیر سے میٹرک پاس کیا۔ بعد میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی اے، لا کالج پشاور سے ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کر کے گلگت میں وکالت شروع کی۔ آپ تنظیم انجمن سرفروشان، پیپلز پارٹی، مسلم کانفرنس اور کئی سیاسی تنظیموں سے منسلک رہے۔ آپ ایک قادر الکلام شاعر، مقرر، نثار، اور عالم فاضل شخصیت تھے عوام آپ کے گرویدہ تھے۔

تاہم حالات کی ستم ظریفی دیکھیے۔ جوہر علی کا جد اعلیٰ کشمیر سے آیا اور یہاں ایک یشکن عورت سے شادی کر کے اسی خاندان میں ضم ہو گیا۔ یوں 1916ء کی بندوبستی ریکارڈ میں یشکنوں کے زمرہ میں شامل کیا گیا۔

شجرہ یوں درج کیا گیا ہے۔



گلگت کے غلام محمد بٹ کبھی پیپلز پارٹی کے جنرل سکرٹری بھی رہے۔
بٹ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کا شجرہ درج ذیل ہے۔



محمد دیہہ امان علی سے بیاہی گئی تھی۔ عون علی اور حرّ علی اس کی اولاد ہوئی۔ داؤد سید علی کو بیاہی گئی تھی۔ حاجی ابراہیم خان، حاجی حیدر اور حاجی نائب خان اس کی اولاد ہوئی۔ جوہر مرحوم کی والدہ مریم حسن علی کی دختر اور زدار سفر علی اور حوس خان ترخان کی بہن تھی۔ نور علی کی وفات پر مریم بی بی کا سید مصطفیٰ شاہ سے نکاح ثانی ہوا۔ ان سے سید مرتضیٰ شاہ، کلثوم اور معصوم اولاد ہوئی۔

ٹھگ :

ٹھگ اقوام کے اکابرین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ چندر بنسی راجپوت ہیں۔ کہا جاتا ہے جموں کے ضلع اودہم پور میں جو لوگ بستے ہیں۔ ان میں چندر بنسی راجپوتوں کی کثرت ہے۔ ان میں مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی۔ ان کے ٹھگ کہلانے کی دو وجوہ بیان ہوئی ہیں۔ کہتے ہیں اودہم پور کی جاگیر چنگی کا ایک ہندو راجپوت بڈ شاہ کی داد و دہش سن کر ان سے ملنے کشمیر روانہ ہوا۔ لیکن دربار پہنچتے پہنچتے وہ مسلمان ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کی قدردانی کرتے ہوئے فوج میں اسے ایک اعلیٰ عہدہ سے نوازا۔ تاہم کچھ سالوں کے بعد نو مسلم ملازمت سے سبکدوش ہو کر عبادت و ریاضت میں محو ہو گیا۔ بادشاہ نے ایک دن اسے دربار میں طلب کیا۔ اور ان سے ان کی ضروریات کے بارے میں استفسار کیا۔ نو مسلم نے نماز پڑھنے کے لئے صرف مصلیٰ مانگا۔ بیوی اپنے خاوند کی اس سادگی سے بڑی پریشان ہوئی۔ تاہم اس نے اپنے خاندانی ضروریات کی تفصیل لکھ کر ایک درخواست بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اس وقت بادشاہ نے فرمایا کہ یہ شخص بڑا ٹھگ نکلا۔ خود تو چپ رہا لیکن اپنی بیوی کے ذریعے اپنا مطلب یوں نکالا۔ اس دن سے یہ راجپوت خاندان ٹھگ مشہور ہوا۔ دوسری روایت کے مطابق ایک بزرگ شیخ ابراہیم کا ذکر ملتا ہے۔ ایک بار ان کے مرشد ملا طیب بدخشانی نے ایک اور مرید کو کسی مسجد میں بلایا تا کہ اسے خصوصی توجہ سے نوازے۔ شیخ ابراہیم کسی طرح یہ بھنک پا کر مرید سے پہلے اس مسجد میں پہنچے اور کسی چٹائی میں لپٹ کر ایک کونے میں پڑے رہے اور جب وہاں شیخ ابراہیم کا پول کھلا تو ان کے مرشد نے انہیں ٹھگ بابا کے لقب سے پکارا۔ اور یوں ٹھگوں کی ایک قوم وجود میں آئی۔ حالانکہ دونوں صورتوں میں معلوم ہوتا ہے کہ ٹھگ کہلانے والے بزرگ معزز خاندانوں کے علمبردار تھے۔ یہ بات یاد رہے۔ دونوں روایتوں میں وقت کا بڑا فرق ہے۔ پہلا واقعہ زین العابدین بڈ شاہ کے دور سے وابستہ ہے۔ دوسرا واقعہ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد سے متعلق ہے۔ تاہم ٹھگ اقوام کے لوگ رشی بزرگ ہوئے ہیں۔ یہ لوگ عموماً کھیتی باڑی کرتے رہے ہیں۔

استور میں ٹھگ قوم کے کچھ خاندان موجود ہیں لیکن مجھے کسی کا شجرہ نہ مل سکا۔ لہٰذا یہ قصہ اس حوالہ سے تشنہ رہیگا۔

بابا یا شاہ :

بابا یا شاہ کوئی قومیت نہیں۔ تاہم بابا ایک عرف عام کے طور پر کشمیر اور ارد گرد ایسی بزرگ ہستیوں کے لئے مستعمل ہوتا رہا۔ جو اخلاق حسنہ کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ دینی مشاغل کے علاوہ دیگر مشاغل میں کوئی دلچسپی نہ لیتے۔ کشمیر میں سادات اور مشائخ کے ناموں کے ساتھ بابا یا شاہ کے القاب لگائے جاتے رہے ہیں۔ تاہم بابا کسی خاص قوم کے لئے ہی مخصوص نہیں۔ اس میں بٹ، گنائی، سید، قریشی، لون، منہاس، ڈار سبھی شامل ہیں۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں سوپور کے محمد احسن قاضی جو اس علاقہ میں مشہور عرائض نویس ہے۔ بابا خاندان سے ہے۔ ان کے داماد مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں عہدہ قضا پر فائز تھے۔ اس زمانے سے بابا کا لفظ جاتا رہا۔ اب قاضی کے نام سے مشہور ہے۔ صوبہ سرحد کی طرف باباؤں کا بڑا زور ہے۔ بابا کا لفظ یہاں بھی بزرگ شخصیات کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ کوہستان، سوات وغیرہ میں باباؤں ہی کی تبلیغ کے نتیجہ میں اسلام پھیلا۔ حضرت ہدایت اللہ کوئی بابا شیخ عبدالوہاب (آخون پنجو بابا) میاں بابا، باقی بابا، آخون صادق بابا، جلال الدین صادق بابا (سید تھے) سیری بابا، شیخ بابا، پیر خوشاب بابا، حضرت پیر بابا بونیر (سید علی غواص ترمذی وغیرہ کے نام دین اسلام کی تبلیغ اور صوفیانہ کردار کے لئے مشہور رہا۔ ان میں سید بھی تھے اور دیگر خاندانوں سے بھی تھے۔ جو اپنے پاکیزہ کردار کے بدولت باباؤں کے نام سے ملقب ہوئے۔ سادات کاغان بھی باباؤں کے القاب سے پکارے جاتے ہیں۔ جنہوں نے داریل، تانگیر و چلاس میں اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں۔ بہر حال یہ صاف ظاہر ہے کہ بابا نہایت قابل تعظیم لفظ ہے۔ لیکن آج اس نہایت قابل تعظیم الفاظ کو جس کا تعلق دینی خدمات کے ساتھ تھا۔ خواجہ کے لفظ نے جو آج کل امارت و شرافت کے نظریے نے شکست دے دی ہے۔

لغت میں بابا، باپ، دادا، درویش، فقیر، بزرگ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ یہ کوئی خاندان نہیں۔ چترال کے بابا ایوب کا باباؤں کے کسی خاندان سے تعلق ضرور ہوگا کہ بابا مشہور ہوئے۔

قاضی :

قاضی ایک اسلامی عہدہ کا نام ہے۔ وہ شخص قاضی کہلاتا ہے جو شرع اسلام کے مطابق منصفی کا کام کرے۔ اسے عام زبان میں جج کہا جاسکتا ہے۔ نکاح پڑھانے والا شخص بھی

قاضی کے لقب سے ملقب ہوتا ہے۔ زر قضایاد وصول کرنے پر مامور شخص بھی قاضی کہلاتا ہے۔ بعض نے غلطی سے اسے ایک گوت قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں کیونکہ ہر قوم کے لوگ قاضی مقرر ہوتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ زر قضایاد وصول کرنے والے پنڈت بھی قاضی کے لقب سے ملقب ہوتے رہے ہیں مثلاً پنڈت گنیش کول قاضی، پنڈت ہمت رام قاضی وغیرہ۔ محمد دین فوق کے مطابق بھدرواہ میں قاضیوں کی ایک قوم ہے۔ اصل میں ان کی ذات مغل ہے۔ مگر یہ خاندان قاضی کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان کے بیشتر افراد زرگری کا کام کرتے ہیں۔ جموں و کشمیر پنجاب اور صوبہ سرحد میں بھی بہت ایسے قاضی خاندان ملیں گے۔ جن کی ذات تو کچھ اور ہے لیکن خاندان میں کسی نے قاضی کے عہدے پر کام کیا اور پھر یہ منصبی نام اس خاندان پر ایسا چسپاں ہو گیا کہ بس یہ نام ان ہی کا حصہ ہو۔ اگرچہ بعد میں خاندان کے کسی فرد کے پاس یہ عہدہ رہا ہو یا نہ رہا ہو۔ تاہم یہ بات سب پر صادق نہیں آتی۔ بعض خاندانوں کے افراد نے قاضی کے فرائض سنبھالے لیکن بعد میں وہ قاضی مشہور بھی نہیں ہوئے۔ مثلاً کشمیر کے متو خاندان کے ایک نامور بزرگ شیخ الاسلام علامہ امیر الدین قاضی 1221ھ تا 1235ھ کے درمیان قاضی القضات کے عہدہ پر فائز تھے۔ اس خاندان کے ایک دو اور افراد نے بھی قاضی کے فرائض سنبھالے لیکن بعد میں یہ خاندان قاضی مشہور نہیں ہوا۔ بلکہ یہ خاندان اپنے "متو" سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ گلگت بلتستان میں ایک قاضی خاندان موجود ہے۔

جس کا شجرہ درج ذیل ہے۔

قاضی شمس الدین
- نظام الدین
  - عبدالعزیز
    - قاضی محمد شریف
      - کامران
      - خالد شریف
      - محمد نسیم
      - عدنان
      - طارق شریف
      - امجد شریف
      - زبیر
      - محمد سلیم

قزلباش :

قزلباش ایران میں صفوی حکمرانوں کے دور یعنی 1502ء میں منظر عام پر آئے۔ اور اسی دور میں 1502ء تا1536ء کے دوران ایران میں بڑے اثر رسوخ کے حامل بھی رہے۔

ایران میں خاندان تیموریہ کے آخری دنوں میں اردگرد کئی چھوٹے چھوٹے حکمران برسراقتدار آئے تھے۔ یہ اپنااقتدار بچانے کے لئے جنگ وجدل میں مصروف تھے۔ اس خانہ جنگی سے خاندان صفویہ کے شاہ اسماعیل اول نے فائدہ اٹھایااور ایران میں خاندان صفویہ کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کو خاندان صفویہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کے تمام بادشاہ سید صفی الدین اردبیلی کی اولاد سے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔

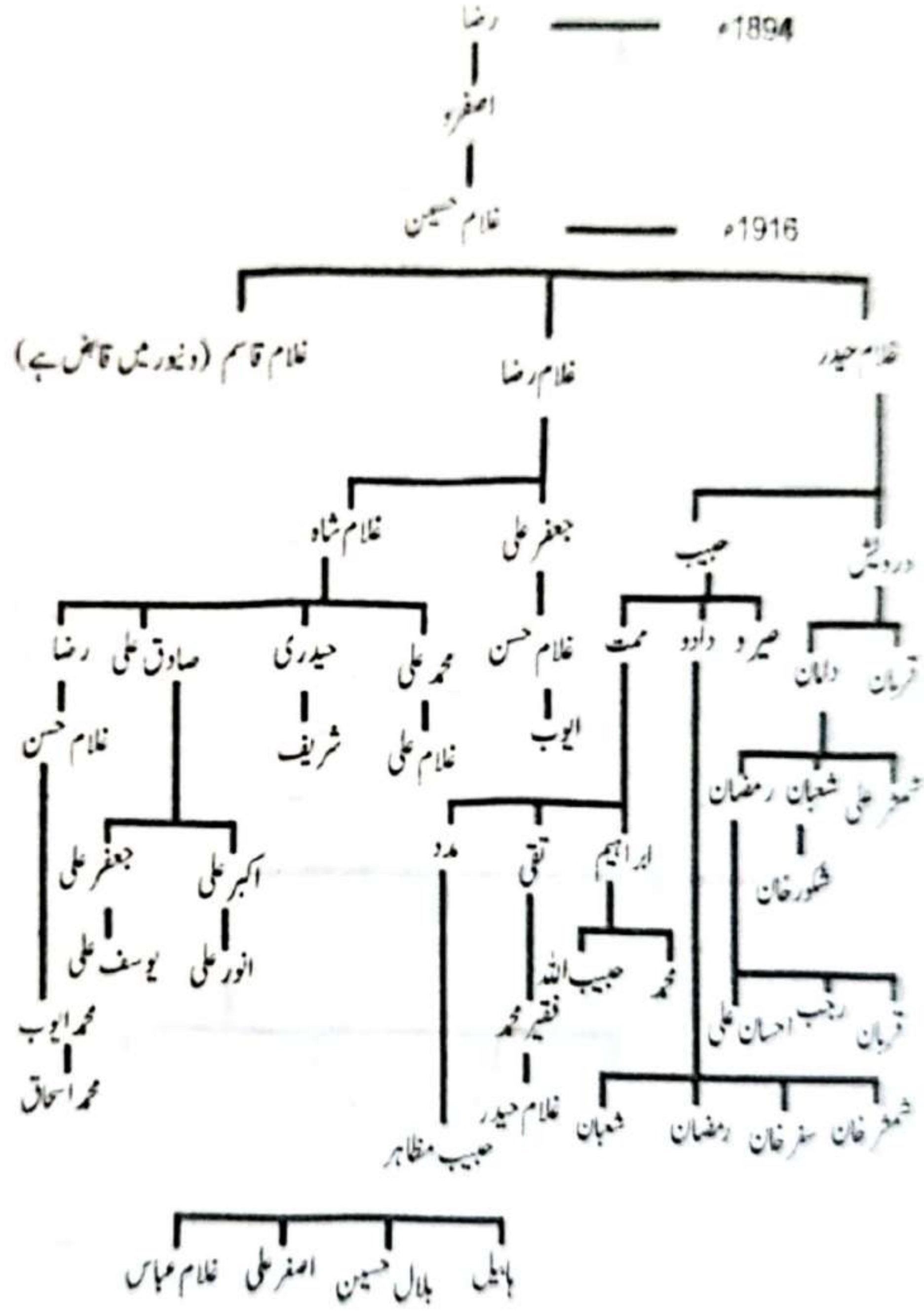
شاہ اسماعیل اول کا شروع سے کچھ لوگ ساتھ تھے۔ جو اس کے وفادار ساتھی تھے۔ جب شاہ اسماعیل گیلان میں بے سروسامانی کی حالت میں دربدر پھر رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ان وفاداروں ساتھیوں نے اسے نہیں چھوڑا۔ جب شاہ اسماعیل نے اقتدار حاصل کرنے کے لئے شیبانی خاندان کے حکمران شیبان خان سے جنگ لڑی تو بھی شاہ اسماعیل کے ان وفادار ساتھیوں نے تخت ایران کے حصول کے لئے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ یہ اپنے پیشواؤں

کی تقلید میں سرخ ٹوپی پہنتے تھے۔ اس لئے قزلباش یعنی سرخ ٹوپی والے یا سرخ سر والے کی حیثیت سے معروف ہو گئے۔ اور یوں قزلباشوں کا ایک خاندان وجود میں آیا۔ چونکہ یہ قزلباش ہی تھے جنہوں نے تخت ایران کی حصول میں صفویوں کی مدد کی تھی۔ اس لئے قزلباش ایران کے سرکاری معمولات میں بڑے دخل رکھتے تھے۔ جب شاہ طہماسپ 1524ء میں تخت ایران پر جلوہ افروز ہوا۔ تو قزلباش سرداراس پر بڑے حاوی تھے۔ یہاں تک کہ جب ایران میں شاہ عباس اعظم 1578ء تا 1629ء برسر اقتدار آیا۔ تو ایران کی فوج قزلباش سرداروں کے ماتحت تھی۔ اور یہ فوجی قزلباش سرداروں کے علاوہ کسی کا حکم قبول نہ کرتے تھے۔ شاہ عباس اعظم اس صورت حال سے باخبر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ساری فوجی طاقت قزلباشوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لئے ازبکوں کی جنگ سے فارغ ہو کر اس نے فوج کی از سر نو تنظیم کی۔ قزلباش سرداروں کی طاقت توڑنے کے لئے شاہ عباس نے ایک نئی فوجی تنظیم " شاہ سون " یعنی بادشاہ کے دوست کے نام سے بنائی۔ اس میں ہر قبیلہ کے لوگ شامل تھے۔ اس طرح شاہ عباس اعظم نے قزلباشوں کی طاقت کو توڑا اور فوج پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

شاہ طہماسپ کی حکمرانی کے دور میں (1524ء تا 1574ء) ہمایوں، شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران پہنچا اور شاہ ایران سے فوجی مدد طلب کی۔ شاہ طہماسپ نے بارہ ہزار ایرانی فوجی دیے۔ جن کی مدد سے وہ اپنا کھویا ہوا تخت و تاج سوریوں سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

غالباً اس فوج میں کچھ قزلباش فوجی بھی تھے۔ جو بعد میں ہندوستان میں بکھر ے تاہم کشمیر کی تاریخ اقوام میں جموں و کشمیر میں کسی قزلباش خاندان کا تذکرہ موجود نہیں۔ اس طرح سوائے گلگت کے ایک خاندان کے پورے شمالی علاقہ جات میں بھی کسی قزلباش خاندان کا تذکرہ نہیں ملتا۔ گلگت میں قزلباشوں کا محلہ سونی کوٹ اور ہوائی اڈہ کے متصل واقع ہے۔ اس محلہ میں اسی خاندان کے لوگ بستے ہیں۔ اس خاندان کا ایک جد غلام قاسم دینور میں شفٹ ہوا۔ اور اس کی اولاد وہیں آباد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ قزلباشوں کا جد اعلیٰ ہندوستان سے کشمیر اور پھر وہاں سے گلگت آیا ہو۔ اس خاندان کے افراد نے یہاں آ کر مختلف چھوٹے موٹے کام کر کے گزر بسر کیا۔ اب اس خاندان میں تعلیم یافتہ افراد کی بھی کمی نہیں ہے۔ مورخوں نے قزلباشوں کو مغل قرار دیا ہے۔

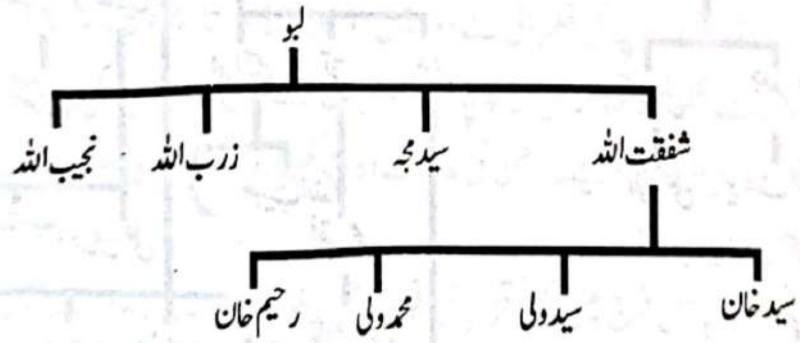
اس خاندان کا شجرہ نسب یہ ہے۔



آوان۔ آعوان:

1946ء کی جمع بندی میں آعوانوں کا ایک خاندان جگلوٹ (سئی) میں مندرج ہوا ہے۔ جمع بندی میں اعوان کو آوان کے خطاطی میں لکھا گیا ہے۔ تاریخ بونچھ مرتبہ سید محمود آزاد نے بھی کہیں آعون اور آوان لکھا ہے۔

میں کہیں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ کہ اعوان قبیلہ کے افراد اپنے نسبی تعلق کو حضرت عباس علمدار سے ملاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے حضرت عباس علمدار کا ایک فرزند عبید اللہ یا عبداللہ نامی تھا۔ جن کی نویں پشت میں حضرت عون بن قاسم تولد ہوئے۔ اعوان اپنے خاندانی سلسلہ کو حضرت عون سے جوڑتے ہیں۔ حضرت عباس چونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فرزند تھے۔ اس لئے اعوان علوی بھی کہلاتے ہیں اور حضرت عباس کے تعلق سے عباسی بھی کہلاتے ہیں سید محمود آزاد باب الاعوان کے مصنف کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔
حضرت عون کا لقب قطب شاہ تھا۔ سید عبدالقادر جیلانی کی خالہ بی بی عائشہ آپ کے گھر تھیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر کی تبلیغ سے مذہب شیعہ ترک کر کے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور صاحب شریعت و طریقت و منصب خلافت سے مشرف ہو کر ہندوستان آئے۔ اور یوں ہندو پاکستان میں اعوانوں کے سلسلے شروع ہوئے۔ کشمیر میں سری نگر خاص بڈیارہ اور بچھتر خاص میں کچھ کچھ اعوان آباد ہیں۔ تاہم پونچھ اور جموں میں اعوان زیادہ ملتے ہیں۔
جگلوٹ (سئی) کے اعوانوں کا شجرہ درج ذیل ہے۔



کاک یا کواک:

کاک یا کواک یہ ایک کشمیری خاندان ہے کشمیری زبان میں بڑے بھائی کو کاک کہتے ہیں یہی لفظ شنا میں کاکو ہے جو احتراماً کسی کو مخاطب کرنے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کشمیر میں ایک نیک نفس پنڈت تھے جو بعد میں ترک دنیا کر کے سادھو ہو گیا۔ لوگ اس سادھو کو احتراماً " کاک "بھی کہنے لگے۔ بس اسی کی اولاد کاک بن کر مشہور ہوئی۔ استور میں یہی کاک کواک کے طور پر ایک ذات ہے مجھے ان کا شجرہ دستیاب نہ ہو سکا۔

حجام:

کشمیر سے حجاموں کے آنے کی ایک تاریخ ملتی ہے 1916ء کے بندوبستی اور 1946ء کی جمع بندی میں کچھ حجاموں کے شجرے موجود ہیں۔ اگر چہ سرکاری ریکارڈ میں حجام لفظ مستعمل ہوا ہے۔ لیکن گلگت وبلتستان میں حجام کیلئے لفظ ٹھکر استعمال ہوا ہے جس کے معنی حجام کے ہیں اور یہ لفظ ہندی سے شنا میں آیا۔ گلگت وبلتستان کے بندوبستی حکام نے ٹھکر کا استعمال خصوصی احکام کی بنیاد پر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ لفظ ٹھاکر سے بھی ملتا ہے جو سردار، راجپوت، امیر جناب اور نائی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ چونکہ ڈوگر حکمران ٹھاکر کے القاب استعمال کرتے تھے۔ اس لئے ٹھاکر یا ٹھکرائن محض ڈوگرہ حکمرانوں کے لئے مخصوص تھا۔ کشمیر، گلگت، بلتستان، کے بندوبستی ریکارڈ میں نائی کے لئے حجام کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ گلگت میں کشمیر سے آئے کچھ حجام خاندان بھی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پنجاب صوبہ سرحد اور کچھ دیگر علاقوں میں حجام کا پیشہ کرنے والے لوگ اچھے خاندانوں سے بھی وابستہ ہیں۔ گلگت، پنجاب اور صوبہ سرحد میں آج ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ بڑے بڑے خاندان کے لوگوں نے گزربسر کے لئے چھوٹے موٹے پیشے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جب ایسے لوگوں کے شجرے لکھے گئے تو انہیں پیشے کی بنیاد پر حجام لکھا گیا ہے۔ حالانکہ ان کی اصل ذات بھٹی آعوان یا مغل ہے۔ ایسے انتقالات بھی ہوئے جن میں بھٹی حجام، کھوکر ترکھان، یا مغل لوہار وغیرہ ذاتیں وضع کی گئیں جو پٹواریوں اور محکمہ مال کی نالائقی کا ثبوت ہے۔ میں نے محکمہ مال گلگت کے قدیم وجدید ریکارڈ کو اغلاط سے پُر دیکھا۔ کیونکہ پٹواری بغیر کسی خاص تحقیق کے شجرے مرتب کرتے رہتے ہیں۔ محکمہ مال پنجاب میں ایسی جو اغلاط تھیں۔ ان کی اصلاح کے لئے بورڈ آف ریونیو پنجاب نے اپنے احکام نمبری 86 /1434 مورخہ 14 مئی 1986ء کے تحت یہ قرار دیا کہ پیشے کے نام پر انتقالات نہ کئے جائیں۔ اور ان تمام اندراجات کی اصلاح کے لئے ضروری احکام جاری کئے ہیں۔ جن میں بھٹی، حجام، مغل، لوہار، کھوکر، ترکھان اور جنجوعہ کمبر کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ یہ بات ضرور ہے۔ قدیم ہند میں شودر اقوام نے ابتدا ایسے چھوٹے موٹے کام شروع کئے لیکن آج کوئی سروے کرے تو معلوم ہوگا کہ بڑے بڑے خاندان لوگ ہر قسم کے چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔

راوٹ :

راوٹ کو ہند کی ایک قدیم ہندو جاروب کش قوم قرار دیا جاتا ہے۔ یہ محض مندروں کی صفائی کرتی۔ یہ دوسرے جاروب کشوں سے معزز خیال کی جاتی تھی۔ کیونکہ اس قوم کے لوگ ان کی طرح دوسروں کا جوٹھا نہیں کھاتے تھے۔ کشمیر میں یہ ہند سے ہجرت کر کے آئے اور اپنی روایات کے مطابق اپنے کام کو جاری رکھا۔ مسلمان ہونے کے بعد ان میں سے بعض دوسری قوموں کی طرح شیوخ کے زمرے میں داخل ہوئے اور بعض اپنی اصل شناخت قائم رکھتے ہوئے راوٹ ہی کہلاتے رہے۔ جیسے بتایا گیا ہے راوٹ اور راٹھور دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ راٹھور، راجپوتوں کی قوم ہے۔ جبکہ راوٹ ہندوؤں کی درجہ بندی کے مطابق ایک عام قوم ہے۔

گلگت میں پہلی بندوبست (1893-94) میں کشمیر سے آنے والی جن قوموں کا ذکر ہوا ہے ان میں پاپر، میر، زرگر، مغل جان، لوہار، حجام، قزلباش، بیگ، موچی، راوٹ، آخون، شیخ، ملا، لون، ترکھان، فقیر، سید، کشمیری اور ساموں وغیرہ ذاتیں شامل کی گئی ہیں۔ ان میں کسی راٹھور یا راتھر خاندان کا ذکر نہیں ملتا۔

1915-16ء کی بندوبست میں پھر جن آسامیوں کا ذکر ہوا ان میں بھی اوپر والی ذاتیں مندرج ہوئی ہیں۔ اور ان کے تفصیلی شجرے دیے گئے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کسی راٹھور خاندان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ٹھاکر سنگھ مہتمم بندوبست ذوات شناسی میں ماہر تھا۔ اُس نے راٹوں کا ذکر الگ سے کیا ہے۔

جان بڈلف نے اپنی کتاب ہندوکش کے قبائل (صفحہ 40) کشمیر سے آنے والی جن قوموں کا ذکر کیا ہے ان میں راوٹ شامل ہیں۔ انہوں نے کسی راٹھور خاندان کی گلگت آمد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

1946ء کی جمع بندی ریکارڈ میں بھی راوٹوں کے شجرے الگ سے دیے ہیں۔

بہر حال اسلام نے اس ہندوانہ ذات پات کے نظام کو مسترد کیا ہے۔ انسان اپنے اخلاق اور کردار کے ناتے اللہ کا مقرب بندہ بن جاتا ہے اور بس۔ نیز آج گلگت بازار کی صفائی کرنے والے میونسپل ملازمین کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کون کون لوگ اس کارِ خیر میں لگے ہیں جو اصل نیکی ہے۔

باب - 8

(کشمیر سے آنے والے مغل قبائل)

چوتھے باب میں مغل القابات اور خطابات کے بارے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کہ کونسے القابات نسبی طور پر محض مغلوں اور مغل خاندانوں کے لئے مختص تھے۔ جیسے جیسے مغل دنیا میں پھیلتے گئے۔ یہ اعزازی نام بھی عام ہوتے گئے۔ اور دیگر لوگوں نے بھی ان کا استعمال شروع کر دیا۔ مغلوں اور عام لوگوں کے استعمال میں فرق یہ تھا کہ مغل تو اپنے خاندانی اعزازی القابات استعمال کرتے تھے۔ لیکن دیگر لوگ محض اسماء الرجال کے طور پر۔ پھر قباحت یہ ہوئی کہ دوسروں نے اپنے لہجوں، تلفظوں اور حرفی تبادلوں کے ذریعے ان اعزازی ناموں کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ جیسے پہلے مذکور ہوا۔ ہندوستان میں ترخان کو ترکھان، خان کو کھان، خبر کو کھبر، اور کان کو کھان بنانا وغیرہ۔

بہر حال میر، مرزا، بیگ، امیر، ترخان، خان، لوہ آر، لار، ایل خان، قاآن، خاقان، بایان، گورگان وغیرہ الفاظ محض مغلوں کے القابات تھے۔ اور یہ نسلی شناخت کا اظہار بھی۔ کسی اور کے نام کے طور پر استعمال سے ان کی خاندانی حیثیت بدل نہیں جاتی۔ میر، امیر زادہ، مرزا، امیر مترادف القابات ہیں۔ قدیم ادوار میں خاندان مغلیہ کے شہزادوں نے ان کا استعمال شروع کیا اور پھر یہ مغل نسب کے اظہار کا ذریعہ بنے۔ ان القابات کا اصل منبع امیر لفظ تھا۔ جو امیر تیمور گورگان کے اجداد کے ناموں کے ساتھ عام استعمال ہوتا آیا تھا۔

شاہی نسلی حوالوں کے اظہار کے لئے مغل شہزادے امیر زادہ بنے۔ اور پھر یہ الفاظ مخفف ہو کر میر اور مرزا کے روپ میں ظاہر ہوئے۔ مغلوں نے مرزا کو اپنے ناموں کے آگے پیچھے استعمال کرنا شروع کیا۔ جیسے ابوبکر مرزا، خلیل مرزا، عمر شیخ مرزا، سلطان احمد مرزا، کامران مرزا، ہندال مرزا، مرزا عسکری، مرزا جانی بابا ترخان، مرزا مظفر اول، مرزا عیسیٰ ترخان۔

اسی طرح مغولستان میں حکمران ناموں میں میر سابقہ کے ساتھ کئی نام نظر آتے ہیں۔ مثلاً میر سلطان علی حاکم سیستان، امیر ذولنون ارغون حاکم قندہار، امیر التمش بانی ترخان مغلیہ خاندان، میر فرخ بیگ وغیرہ۔ ہندوستان میں مغل حکمرانوں نے ان القابات میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں۔ حکمران بادشاہ شاہ، شاہنشاہ اور شہزادے صاحب عالم کہلائے۔ مغل خاندان کے افراد مرزا کہلاتے رہے۔ اور حکمرانوں نے اپنے اور روساء کو جو مغل نسل سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ مرزا کے خطابات سے بھی سرفراز کیا۔ مثلاً مرزاراجہ مان سنگھ، اس طرح لفظ مرزا جو خصوصی حیثیت کا حامل تھا۔ عام ہوا اور دوسروں کے ناموں کا حصہ بھی بنا۔ ہندوپاکستان اور شمالی علاقہ جات میں میر، مرزا، امیر اب عام ناموں کا حصہ بن کر سامنے آئے ہیں۔ مثلاً محمد امیر، میر محمد مرزاخان، میر تھنت، میر باز خان، مرزا جان، امیر خان، میر شریف، میرزا جان، میر خان، محمد مرزا، مرزا علی، امیر علی، امیر حسین، میر حسین، میر حسن، میرو، مرزا حسین، مرزا حسن، شاہ مرزا، میر جان، اشدر مرزا وغیرہ یہ عام نام ہیں۔ یہ سیادت کا اظہار ہے۔ اور نہ نسب کا۔ اس طرح سیادت اور نسبی امتیاز کے لئے جو کسوٹی مقرر تھی۔ وہ اب نہیں رہی۔ تاہم کشمیر میں اس پر آج بھی بہت حد تک عمل ہو رہا ہے۔ جیسے پہلے لکھا گیا ہے۔ یہاں میر نسب اور سیادت کے اظہار کا ذریعہ رہا ہے۔ نام کے پہلے استعمال ہو تو سیادت اور نام کے بعد لکھا جائے تو مغل نسب ظاہر کرے۔ یہ بات یاد رہے کہ میر مغلوں کی ہی ذات ہے۔ میر مغل کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ اس پر تمام مورخین متفق ہیں۔ کئی عدالتی فیصلے صادر ہو چکے ہیں کہ میر مغلوں کی ایک اعلیٰ ذات ہے اور یہ زراعت پیشہ قوم ہے۔

1901ء ایکٹ اراضی میں اس حوالے سے ترامیم کی گئی ہیں۔ فی زمانہ میر اور مرزا الفاظ کے استعمال میں مغلوں نے بھی بے اعتدالیاں شروع کی ہیں۔ مثلاً میر مغل جو اپنے نام کے آخیر میں میر لگاتے تھے۔ اب نام کے پہلے بھی استعمال کرتے ہیں اسی طرح مرزا لفظ جو عموماً ناموں کے پہلے لگایا جاتا تھا اب بعد میں بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ القاب ان بے ہنگم استعمال سے سیدوں اور مغل قومیت کے افراد میں جو فرق موجود تھا وہ اب مٹتا جا رہا ہے۔ مثلاً میر عبدالخالق سے اب یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کوئی سید ہیں یا مغل۔

شمالی علاقہ جات میں 1760ء کے بعد میر مغل خاندان کے لوگ بڑی تعداد میں آئے۔ کہیں تو انہوں نے افغانوں کے جور و ستم سے بچنے کے لئے راہ فرار اختیار کیا۔ کہیں

مذہبی خلفشار نقل مکانی کا باعث ہوا۔ کہیں بہتر معاش اور کہیں رشتہ داری نے رشتہ داروں کو کھینچا اور یوں میروں نے کشمیر کو چھوڑا۔ شمالی علاقہ جات بلتستان، گلگت کے اضلاع میں میر بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ جگلوٹ، مناپن، گلگت خاص میں میروں کے بڑے بڑے خاندان ہیں۔ ناموں کے استعمال میں اگر کسی خاندان نے اپنی قدامت اور انفرادیت قائم کی ہے تو وہ جگلوٹ کا میر خاندان ہے۔ اس خاندان نے کشمیری روایات کے عین مطابق اپنے امتیاز کو رسول میر، رحمان میر، افضل میر کی صورت میں قائم رکھا ہوا ہے۔ ان کا ایک جد فضل میر 1770ء کے لگ بھگ زمانے میں گلگت وارد ہوا۔ اور جگلوٹ میں آبسا۔ جگلوٹ کی ابتدائی آباد کاری میں اس کا بڑا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔ اور یوں تھوڑے عرصے میں یہ خاندان پھل پھولنے لگا۔ اس خاندان میں کئی محترم شخصیات پیدا ہوئیں۔ ان میں محمد امیر سابق ڈپٹی کمشنر، شیر جہان میر موجودہ جنرل منیجر کوآپریٹو بنک، رسول میر سابق ممبر ناردرن ایریا کونسل، استاد محترم میر عیان مرحوم، میر عثمان چیئرمین یونین کونسل، کرم میر وغیرہ شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے سلیمان شاہ نے 1794ء کے قریب زمانے میں کرم میر کو اس طرف بعض انتظامی ذمہ داریاں سونپی تھیں۔ بہر حال یہ ایک نامور خاندان ہے۔ اس کا شجرہ درج ذیل ہے۔ 1894ء کے بندوبست کے مطابق۔

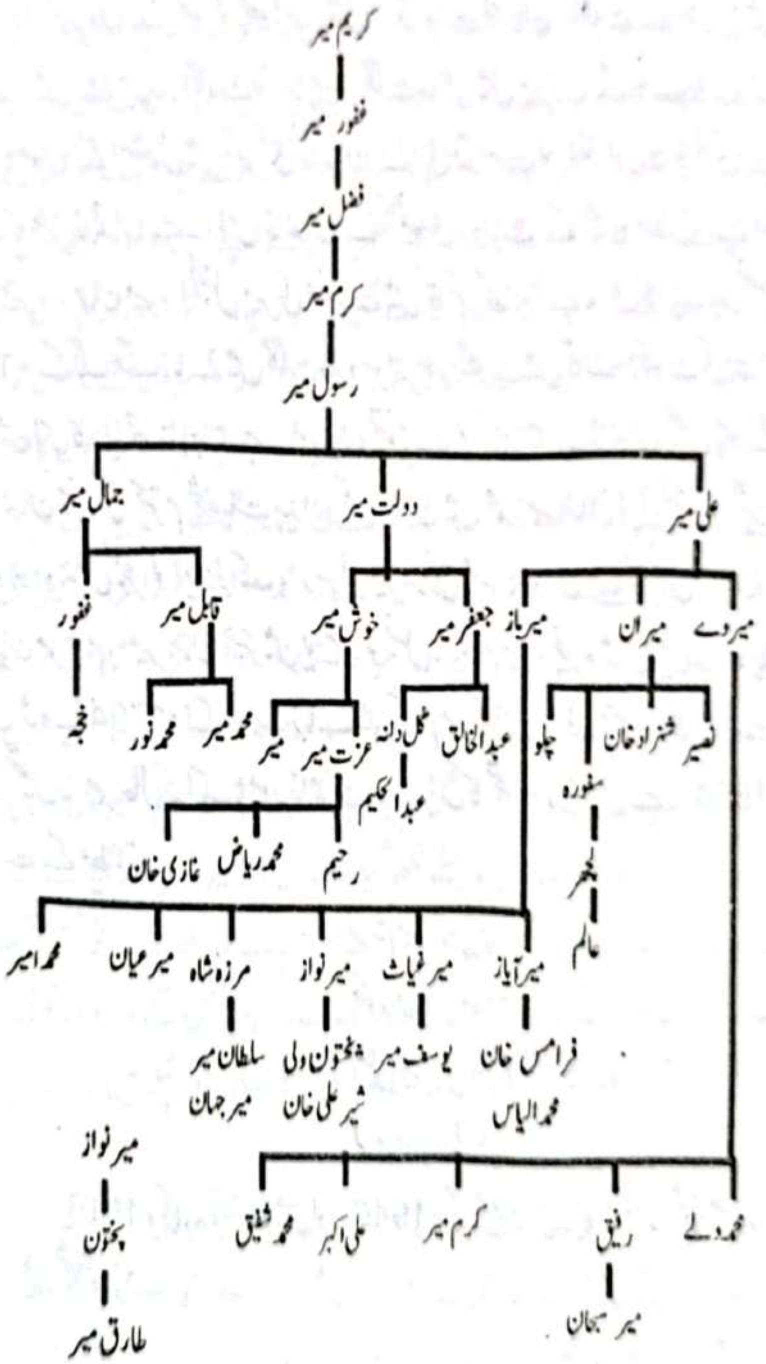
کریم میر

غفور میر

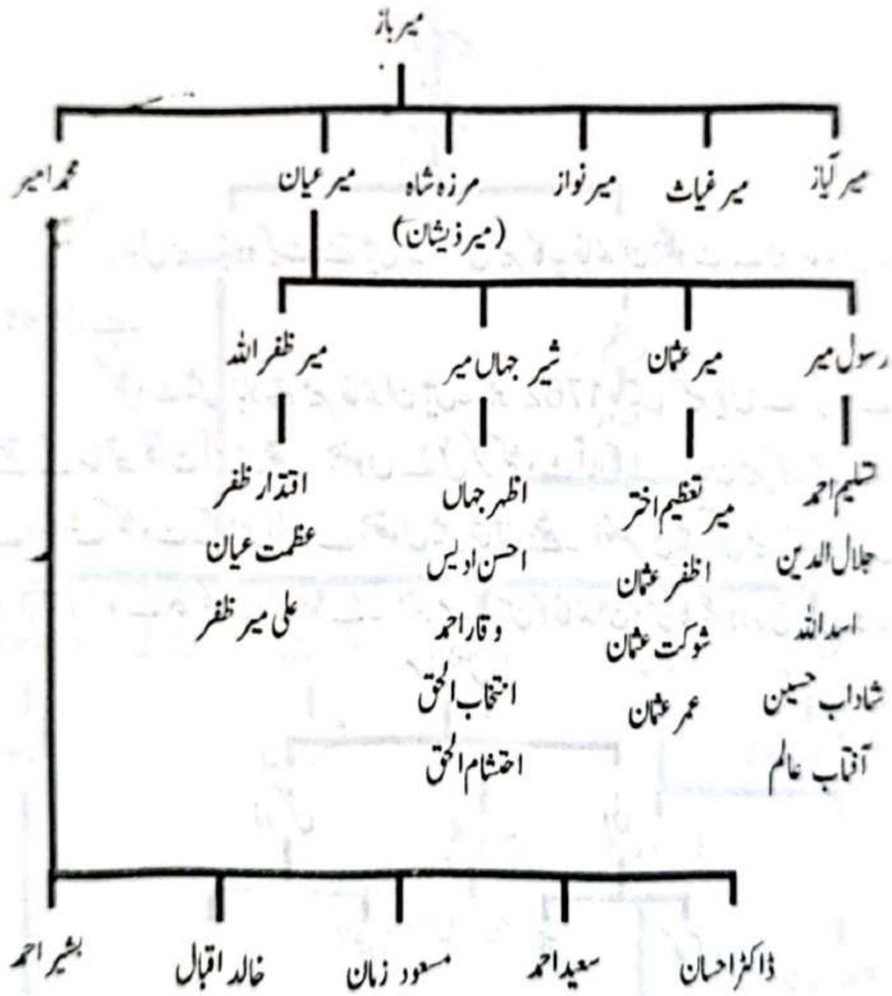
فضل میر

کرم میر

1916ء کی بندوبست میں اور 1946ء کی جمع بندی ریکارڈ کی روشنی میں راقم نے درج ذیل شجرہ مرتب کیا ہے۔


کریم میر
غفور میر
فضل میر
کرم میر
رسول میر
جمال میر
دولت میر
علی میر
غفور
قابل میر
خوش میر
جعفر میر
میریاز
میران
میردے
غنچہ
محمد نور
محمد میر
میر
عزت میر
گل دانہ
عبدالخالق
چلو
شہزادہ خان
نصیر
عبدالحکیم
سفورہ
رحیم
محمد ریاض
غازی خان
عالم
محمد امیر
میر عیان
میر نواز
میر غیاث
میر آیاز
سلطان میر
میر جہان
شیر علی خان
یوسف میر
فرامس خان
محمد الیاس
میر نواز
پختون
طارق میر
محمد شفیق
علی اکبر
کرم میر
رفیق
میر جہان

یہاں میر باز کی اولاد کا شجرہ الگ دیا جاتا ہے۔



ریکارڈ میں مرزا شاہ لکھا ہوا ہے جب یہ نام میر زیشان ہے۔ یہ اصلاح شیر جہاں میر صاحب نے کروایا۔

یہ بات یاد رہے کوہستان میں کوئی کشمیری خاندان موجود نہیں۔ رازول کوہستانی ایک نامور محقق ہیں۔ وہ اپنے ریسرچ کے نتیجہ میں لکھتے ہیں۔

"کوہستان میں قدیم کشمیری لوگوں کی آمد کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ اٹھارہویں صدی کے دوران قحط سالی کی وجہ سے چند کشمیری گھرانے جنہیں میں پہاڑی کشمیری کہنا چاہوں گا۔ کیونکہ وہ پہاڑی بولتے ہیں۔ کوہستان آئے تھے۔ لیکن نسبی طور پر یہ لوگ گجر قبائل سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ دوبارہ کوہستان سے واپس شہروں کو منتقل ہو رہے ہیں۔"

انھری میں کچھ میر خاندان موجود ہیں۔ ان میں ایک شجرہ 1946ء کی جمع

ہندی ریکارڈ میں یوں درج ملتا ہے۔

افضل میر

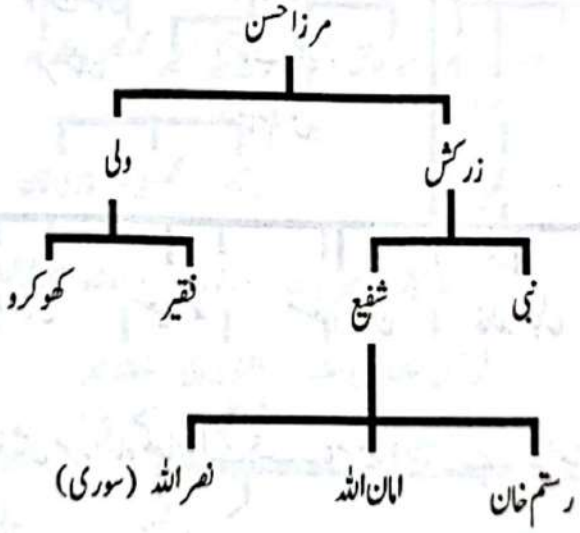
قائم میر

فضل

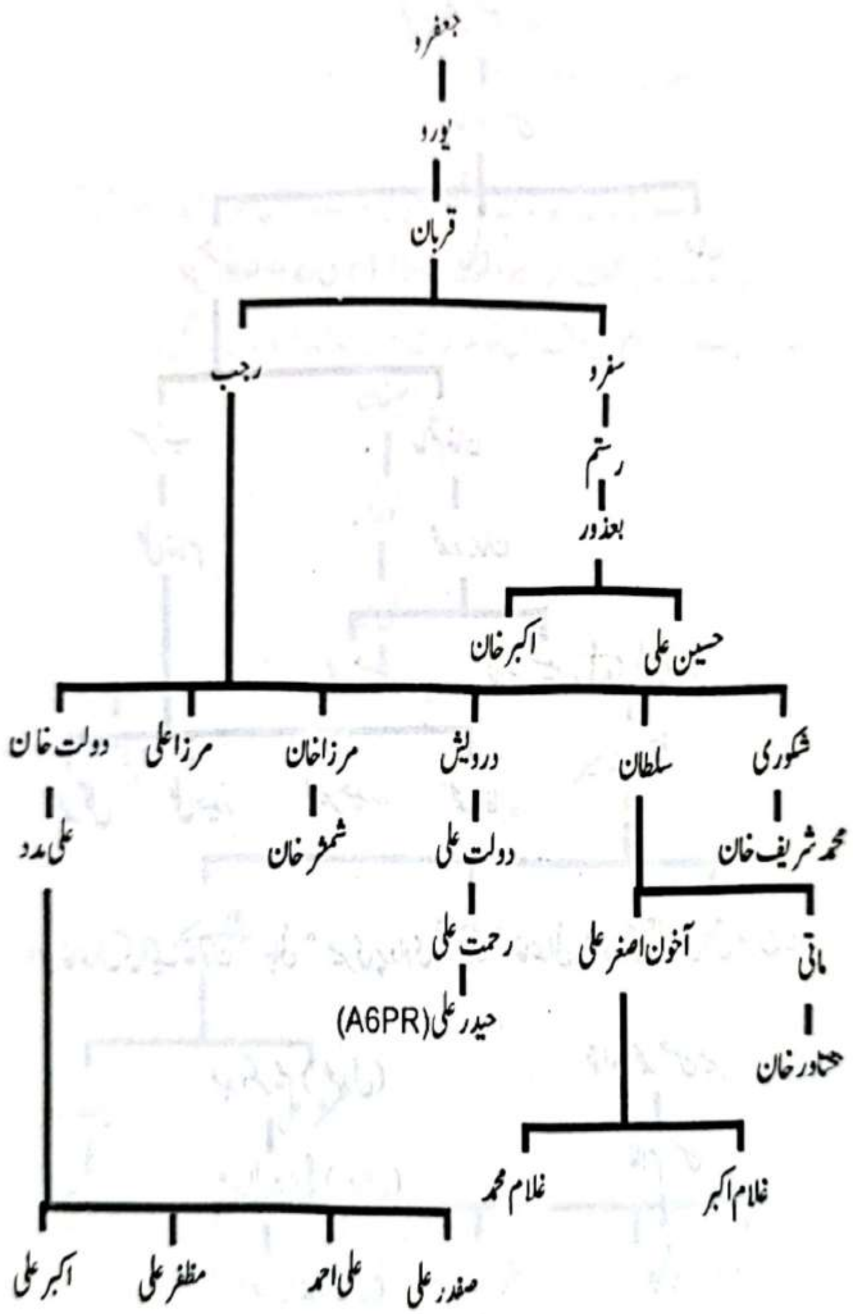
خان

رسول میر ایڈووکیٹ کہتے ہیں کہ افضل میر کا یہ خاندان جگلوٹ کے میر خاندان کا ٹوٹا ہوا جزو ہے۔

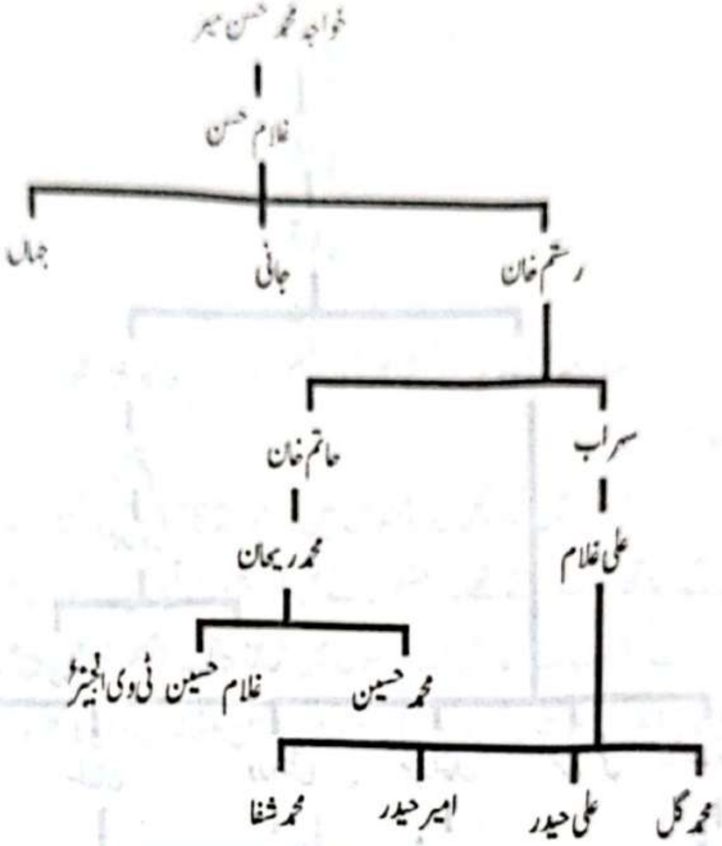
کشروٹ میں آباد کچھ میر خاندان ہیں۔ جو 1762ء میں کشمیریوں کے اس بڑے جتھے کے ساتھ گلگت آئے تھے۔ جنھوں نے مل کر کشروٹ آباد کیا۔ سلطان میر اور عجب میر کے اسلاف کشروٹ کے ابتدائی بڑے جتھوں میں شامل تھے۔ امپھری میں کئی میر خاندان ہیں جو 1770ء کے بعد گلگت وارد ہوئے۔ مثلاً مرزاحسن کا خاندان جس کا شجرہ درج ذیل ہے۔



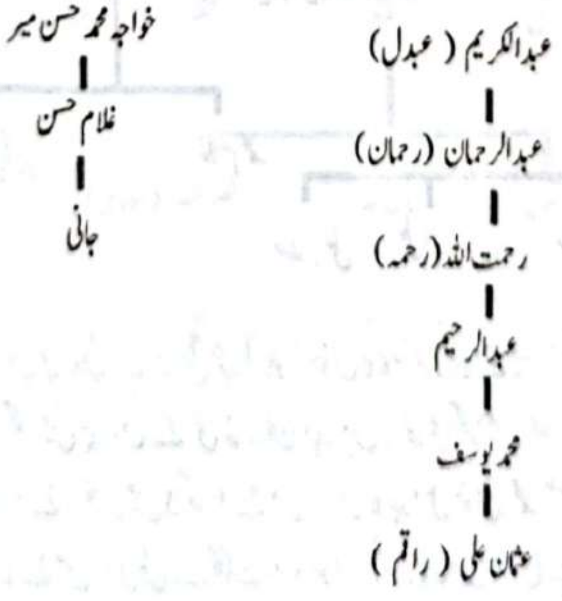
" گل چھوٹ" میں آباد میر آخون اصغر علی کا شجرہ درج ذیل ہے جسے مصنف نے قدیم و جدید سلسلوں کو ملا کر مرتب کیا۔



ان میروں کے ابتدائی اجداد جو لاہوں کا کام کرتے تھے۔
نگر میں میروں کے کئی خاندان آباد ہیں۔ بڑی نگر میں تقریباً 32 گھرانے مناپن میں 18 گھرانے، ہلمن میں 3 گھرانے ہیں۔ ان کا جداعلیٰ خواجہ محمد حسن میر 1800ء کے لگ بھگ زمانے میں زڈی بل سے گلگت وارد ہوا۔ شجرہ کچھ اس طرح ہے۔



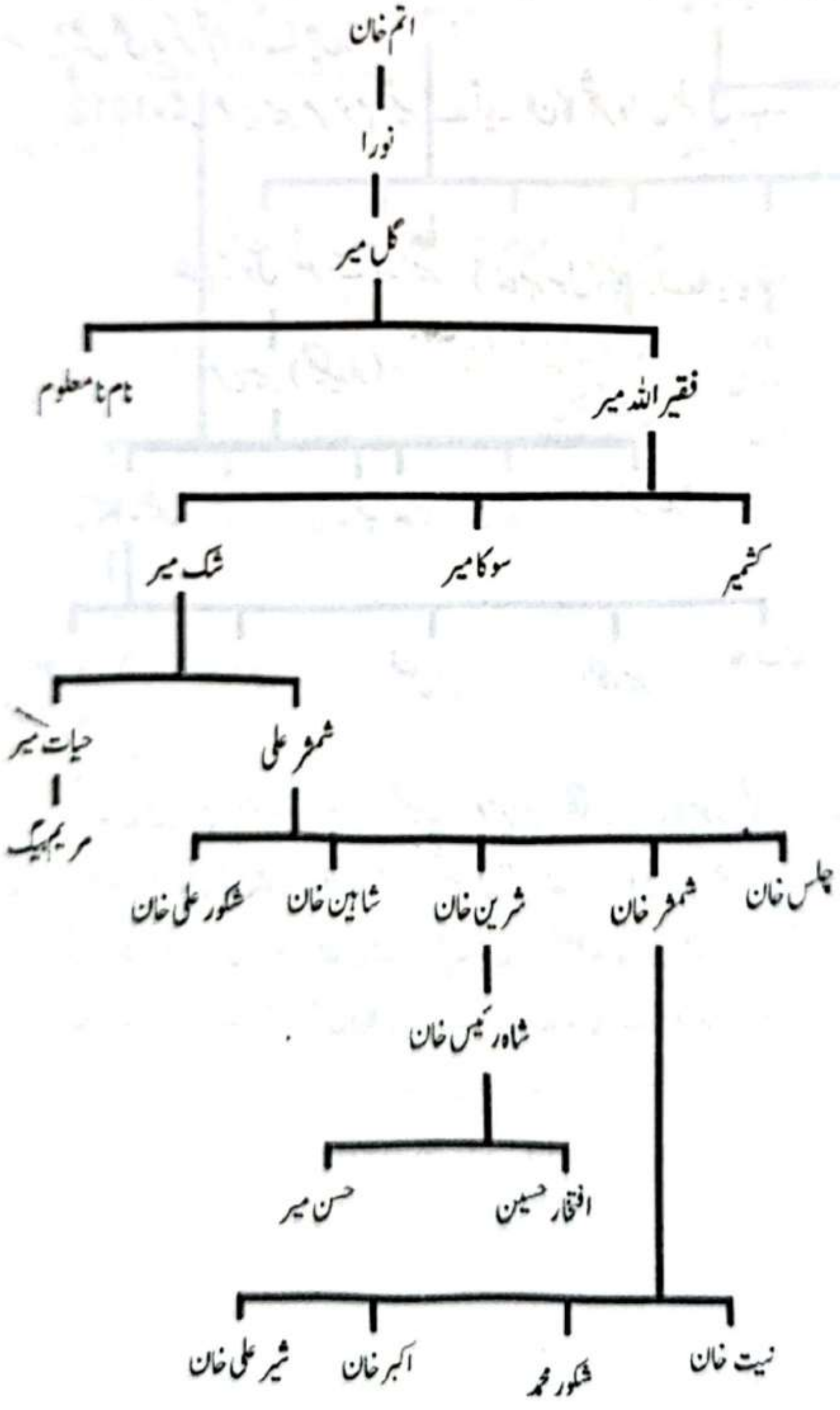
اس خاندان کی ایک خاتون " جانی " میری پردادی تھیں۔ خاندانی رشتوں کی تفصیل اس طرح ہے۔



جانی میرے پردادا عبدالرحمان کو بیاہی گئی تھی۔ یہ نگر کا ایک معزز خاندان ہے۔ خواجہ محمد حسن میر نے گوتم سر کی لڑائی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیا تھا۔ اس لیے میر نگر

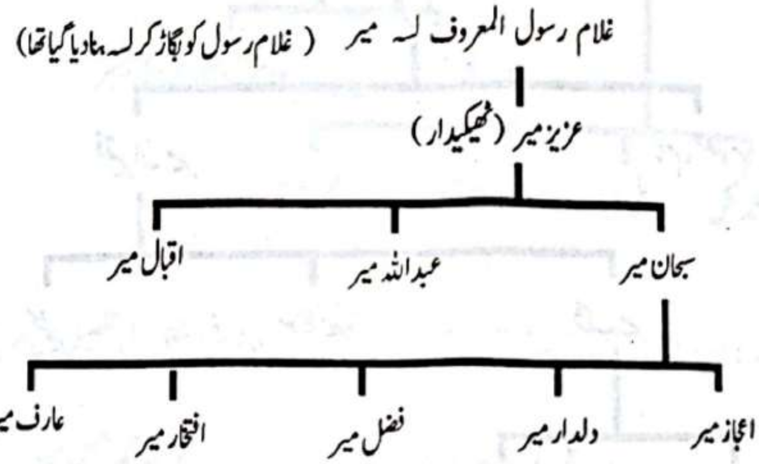
نے اسے مناپن میں جاگیر دے کر آباد کیا۔ آج خواجہ حسن میر کا خاندان نگر میں پھل پھول رہا ہے۔

دینور کے ایک میر خاندان کا شجرہ دیا جاتا ہے۔ اس خاندان کا جدِ اعلیٰ 1837ء کے بعد کسی زمانے میں گلگت وارد ہوا تھا۔ 1894ء کی بندوبست ریکارڈ کی بنیاد پر یہ شجرہ مرتب کیا گیا ہے۔ تاہم اُس وقت اس خاندان کی قومیت میر مندرج نہ تھی۔



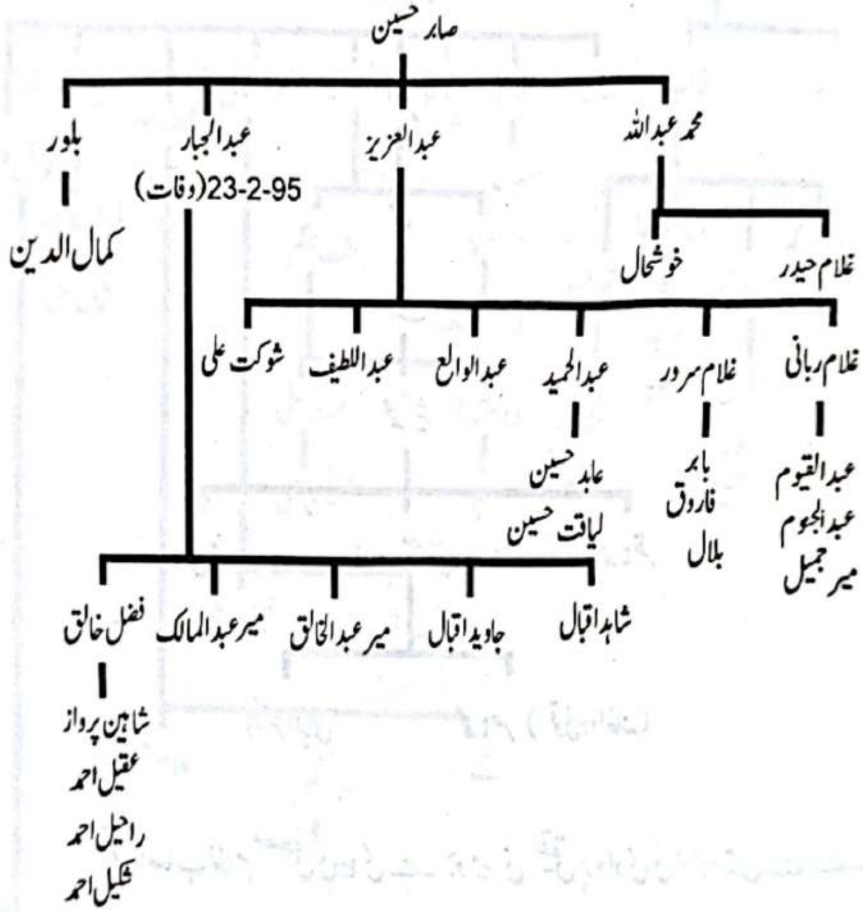
1911ء کی مردم شماری کے مطابق میر قوم کی آبادی صوبہ جموں میں 1220ء، کشمیر میں16008 سرحدی اضلاع کشمیر میں 28اور کل ریاست میں 17556 تھی۔ تحصیل پلوامہ، تحصیل بڈگام، تحصیل ہندواڑہ، صوبہ جموں کے مقامات رام بن، بانہال، بھوٹ، ریاسی، اودھم پور، میرپور وغیرہ کوہستانی علاقوں میں علاقوں میں دیگر اقوام کے مقابلے میں غیر قوم کی تعداد زیادہ ہے۔ کشمیر سے ہی میر ذات کے لوگ ہزارہ، سیالکوٹ اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں بھی جاکر آباد ہوئے ہیں۔

1912ء میں عزیز میر مرحوم کشمیر سے آیا۔ ان کا شجرہ اس طرح ہے۔



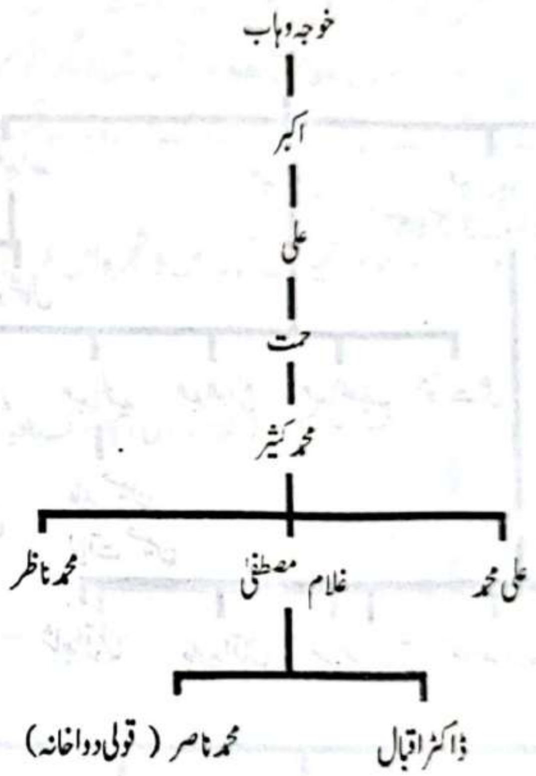
سبحان میر میرا بہنوئی ہے۔ ٹھیکیدار عزیز میر گلگت کے نامور ٹھیکیداروں میں شامل تھا۔ کاغذات مال میں اُن کی ذات "کشمیری" مندرج ہوئی۔ جو درست نہیں۔ کشمیری کوئی ذات نہیں اس پر عدالتی فیصلے ہو چکے ہیں۔ ٹھیکیدار عزیز میر "میر" ذات کا ایک سپوت تھا۔ کشمیر سے ہزارہ نقل مکانی کرنے والے میروں کے خاندان موجود ہیں۔

اسی سلسلہ کا ایک میر خاندان ہزارہ سے گلگت وارد ہوا۔ شجرہ اس طرح سے ہے۔



زیادہ قریب زمانے میں آنے والے میروں میں حبیب اللہ میر سلام میر، خالق میر وغیرہ برادران ہیں۔ یہ میروں کا ایک اچھا خاندان ہے۔ غلام حسن میر ایگزیکٹو انجنیئر، اکبر میر ڈپٹی کمشنر اس خاندان کے سپوت ہیں۔ اس خاندان کا مخیرانہ سرگرمیوں میں بڑا حصہ ہے۔ مرکزی جامع مسجد گلگت کی دیکھ بھال میں ان بھائیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خواجہ وہاب بھی میر قوم کا فرد تھا۔ یہ 1762ء کے بعد گلگت وارد ہوا۔

اس کا شجرہ درج ذیل ہے۔

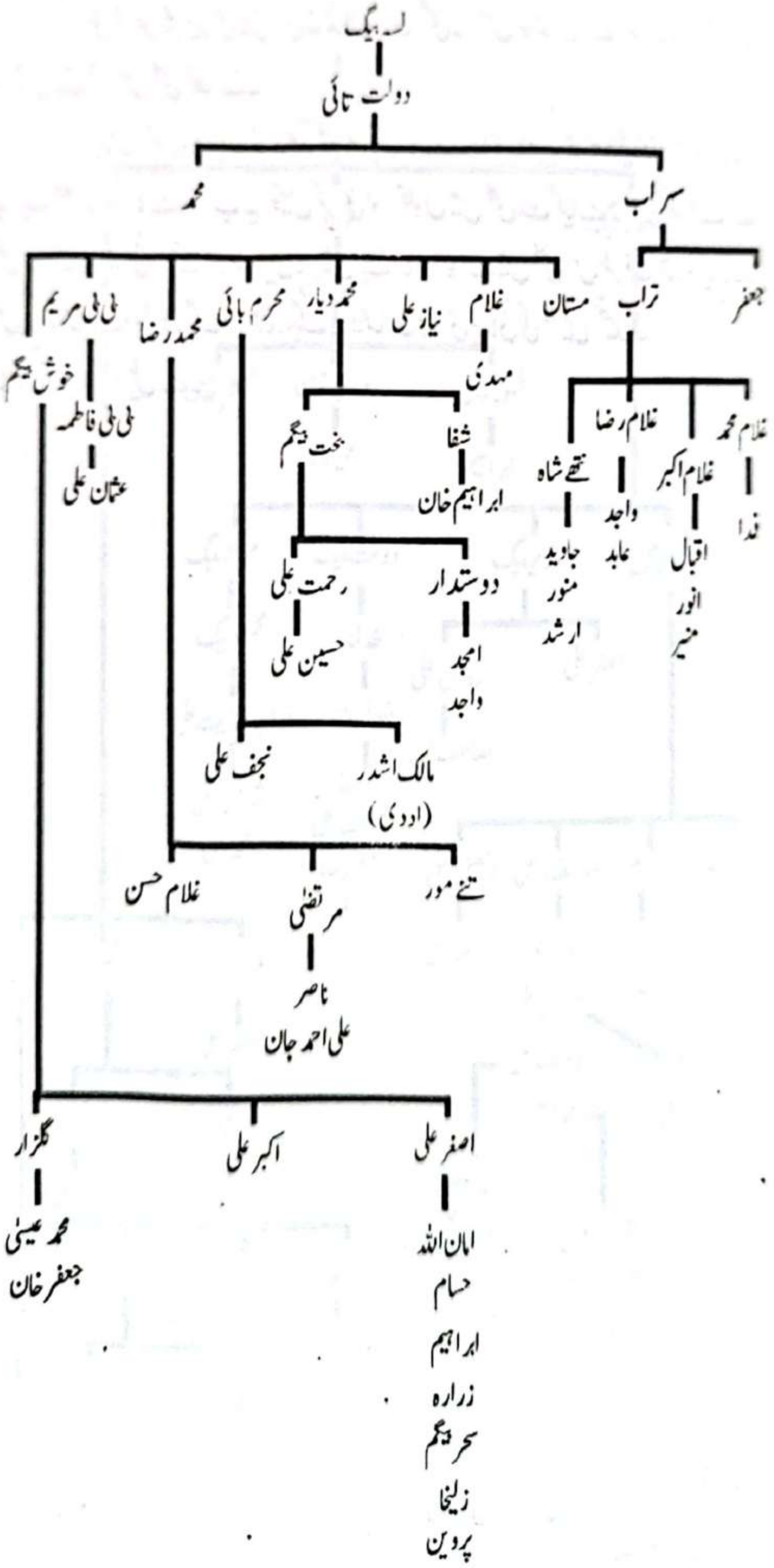


☆ گل نصاب غلام مصطفیٰ کی بیوی ہے۔ جو میری حقیقی پردادی کی اولاد میں سے ہے۔

بیگ :

بیگ بھی مغلوں کا ایک خطاب ہے۔ مختلف علاقوں میں یہ بیک، بگ، بوگ، بے وغیرہ ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں چونکہ مرزا کا لفظ افراد خاندان شاہی کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ اور بیگ کا خطاب بھی خاص خاص سر فروشان سلطنت کے علاوہ مغول ممتاز ممبروں کو ملا کرتا تھا۔ اس لیے بیگ اور مرزا کا استعمال ہر مغل خطاب کے لئے لازم سمجھا گیا۔ مثلاً مرزا رستم بیگ، مرزا یعقوب بیگ وغیرہ۔

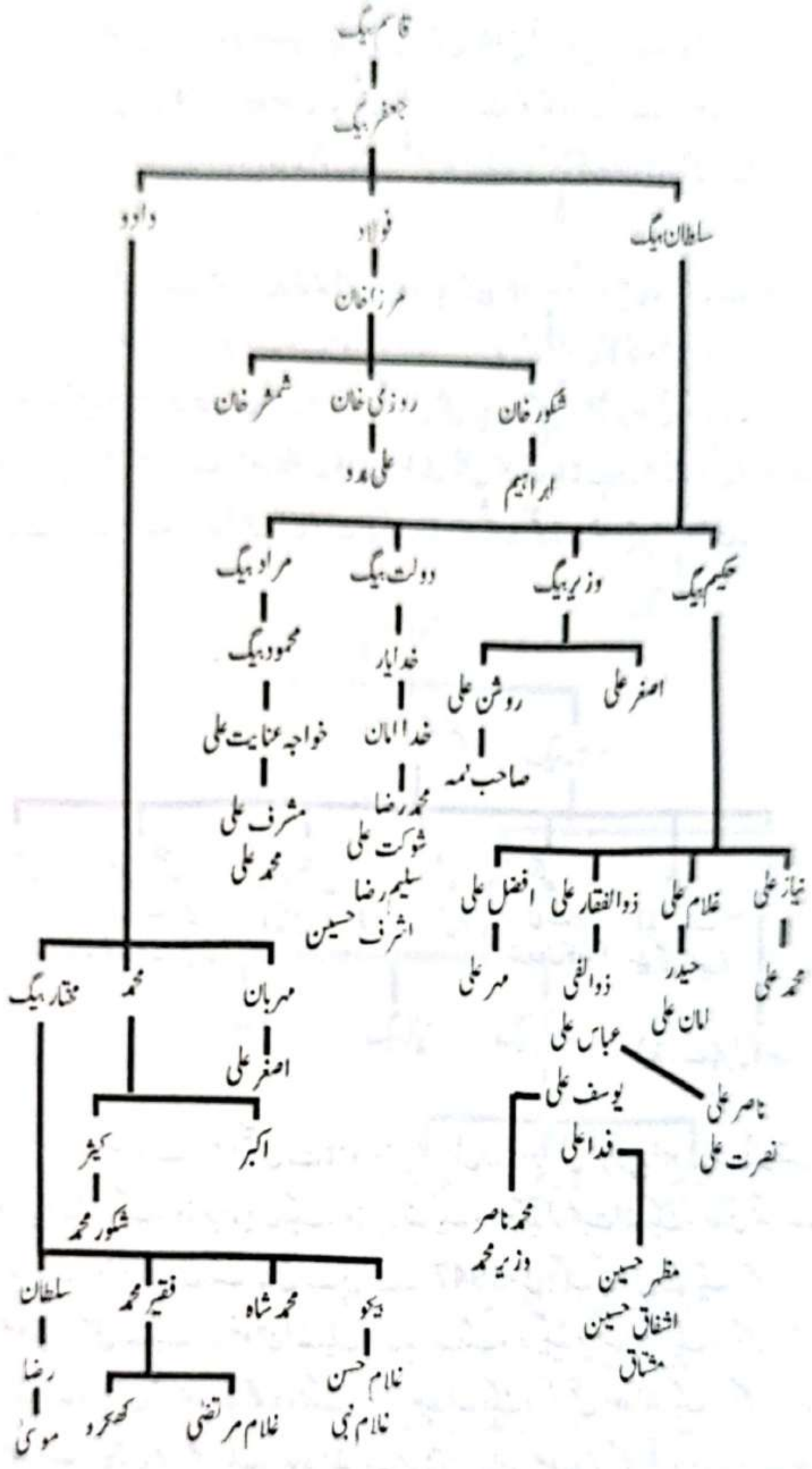
بیگ مرزا کہلاتے ہیں اور مرزا بیگ اور یہ القاب مغلوں کے لئے ہی مختص ہیں۔ لیکن جیسے پہلے بیان ہوا ہے۔ اب یہ اختصاص کی باتیں ختم ہوئی ہیں۔ اور دیگر لوگ بھی یہ القاب بطور نام عام استعمال کر رہے ہیں۔ گلگت اور منی مرگ (استور) میں کچھ بیگ خاندان موجود ہیں۔ لسہ بیگ کشمیر سے آیا تھا۔ ان کی آمد کا زمانہ 1794ء تھا۔


بیگ
دولت تائی
محمد
سراب
جعفر
تراب
مستان
غلام
نیاز علی
محمد دیار
محرم بائی
محمد رضا
بی بی مریم
خوش بیگم
غلام محمد
غلام اکبر
غلام رضا
تھے شاہ
فدا
اقبال
انور
منیر
واجد
عابد
جاوید
منور
ارشد
مہدی
شفا
ابراہیم خان
بخت بیگم
دوستدار
امجد
واجد
رحمت علی
حسین علی
بی بی فاطمہ
عثمان علی
مالک اشدر
(اددی)
نجف علی
تنے مور
مرتضی
ناصر
علی احمد جان
غلام حسن
اصغر علی
امان اللہ
حسام
ابراہیم
زرارہ
سحر بیگم
زلیخا
پروین
اکبر علی
گلزار
محمد عیسیٰ
جعفر خان

بی بی مریم میری نانی اسی خاندان سے تھی۔ اس خاندان کے سہراب اور محمد نے کوتوالی کے فرائض بھی نبھائے۔

یہاں بیگوں کا ایک خاندان قاسم بیگ کا ہے۔ اسی نام پر قاسم بیگی محلہ مشہور ہے۔ یہ ایک معزز گھرانا ہے۔ اب یہ پھیل کر کئی اور محلوں میں بھی بٹ گیا ہے۔ اس گھرانے سے بھی میرے خاندانی رشتے موجود ہیں۔ میں نے سابقہ ابواب میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اس خاندان کے دولت بیگ اور مختار بیگ کی بیگمات میری پرنانی کی بہنیں تھیں۔

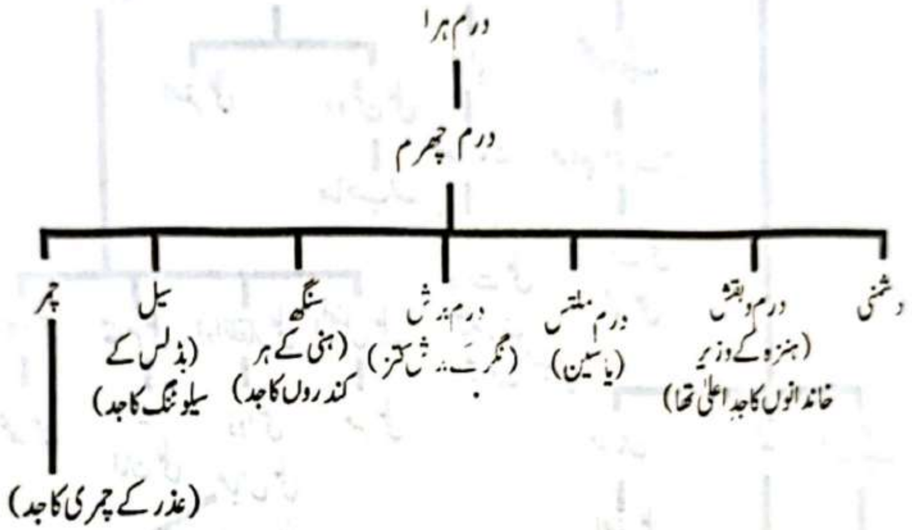
ان کا شجرہ درج ذیل ہے۔



اس خاندان کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ ان کے اجداد عراق سے ایران ہوتے ہوئے کشمیر آئے اور پھر گلگت وارد ہوئے۔

گلگت کے بندوبستی ریکارڈ میں انہیں یشکن قرار دیا گیا ہے۔ جو غلط ہے۔ میں اس بارے میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ کشمیر یا اردگرد سے جو خاندان آئے۔ انہوں نے مقامی طور پر شادیاں کر کے ان ہی خاندانوں میں ضم ہوئے۔ جن میں ان کی رشتہ داریاں قائم ہوئیں۔

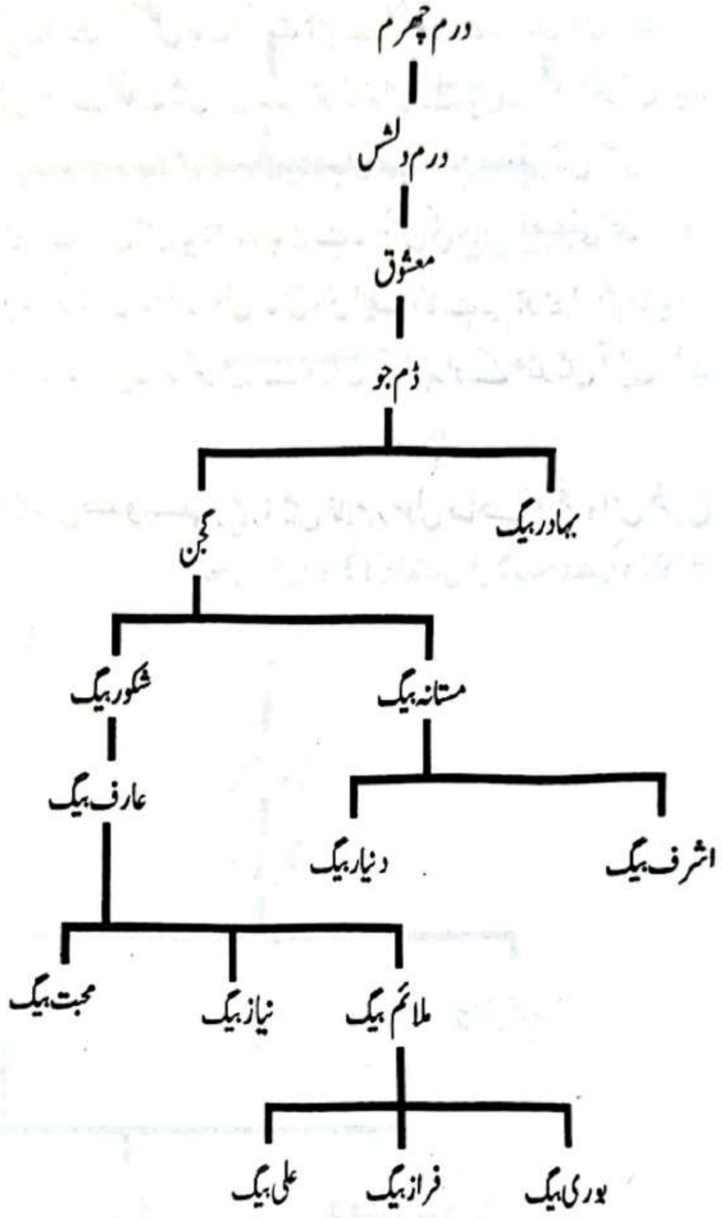
بیگوں کے کچھ بڑے خاندان ہنزہ، یاسین اور اردگرد ہیں۔ جن کے اسلاف نے کارہائے نمایاں سر انجام دیا اور نامور ہوئے۔ ہنزہ کے بیگوں کا خاندان درم ہرا ایک مضبوط قبیلے کا سپوت تھا۔ یہ قبیلہ ہنزہ اور نگر کی ملکی سیادت میں بڑا اثر رسوخ رکھتا تھا۔ اس کی اولاد میں درم چھرم سے نامور بیگوں کا ایک سلسلہ چل نکلا کہا جاتا ہے درم چھرم کی اولاد سے سات لڑکے ہوئے۔ ساتواں لڑکا فوت ہو گیا۔ ان کا شجرہ کچھ اس طرح بیان ہوا ہے۔



ہنزہ کے درم دلتس سے نامور وزیر اور اہل رزم و دانش افراد پیدا ہوئے۔ جن میں وزیر اسد اللہ بیگ، وزیر ہمایوں بیگ، وزیر رضا بیگ، صوبیدار محبت اللہ بیگ، حاجی قدرت اللہ بیگ، وزیر ہمایوں بیگ سابق اے پی اے۔ 1947ء کی جنگ آزادی کے ایک اہم کردار صوبیدار صفی اللہ بیگ، رضوان اللہ بیگ، شاہد اللہ بیگ، بریگیڈیر حسام اللہ بیگ، میجر راشد اللہ بیگ، کپتان مسعود اللہ محمد درا بیگ، میجر عبید اللہ بیگ، کرنل سعد اللہ بیگ، میجر ارشد اللہ بیگ، کپتان مہر علی بیگ، حامد اللہ بیگ سابق اے او، صوبیدار میجر مکی، وزیر ساجد اللہ بیگ وغیرہ شامل ہیں۔

یاسین کے بیگ درم ملتس کی اولاد ہیں جو درم دلتس کا بھائی تھا۔ ان کا شجرہ درج

ذیل ہے۔ جو مجھے علی بیگ صاحب نے فراہم کیا۔



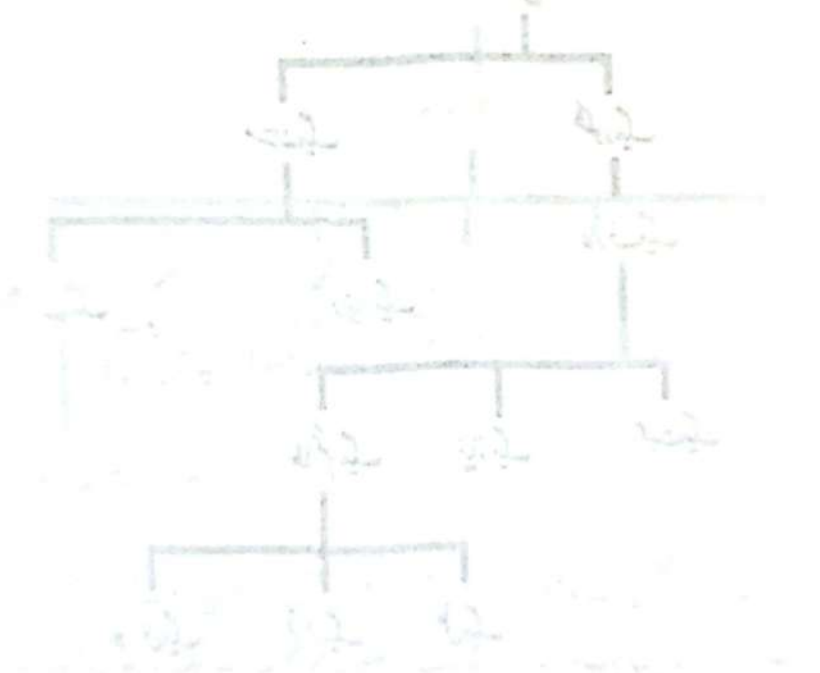
جہاں تک ہنی، نگر، بڈلس، غذر کے بیگوں کا تعلق ہے۔ مجھے کوئی قابل قدر ریکارڈ دستیاب نہ ہو سکا۔

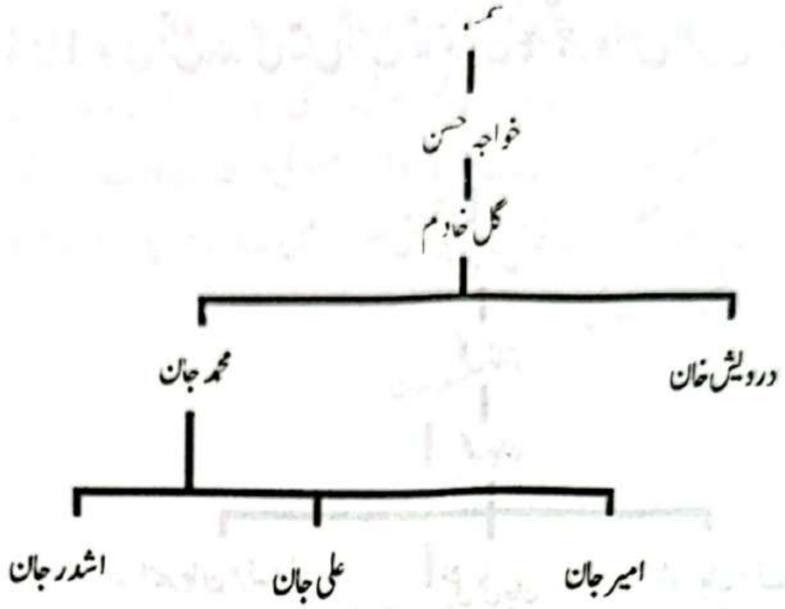
آج ہنزہ یا ارد گرد جو بہت سے بیگ نام نظر آتے ہیں۔ وہ بیشتر نام کا اظہار ہیں۔ شنوں، یشکنوں، رانو، کرمنوں وغیرہ تمام اقوام نے اپنے ناموں کے ساتھ بیگ لگایا ہے۔ لیکن یہ محض نام کے لاحقے ہیں۔ جس طرح شاہ، بادشاہ، میر، بابر، خان وغیرہ اب عام ناموں کا حصہ ہیں۔

مغل جان :

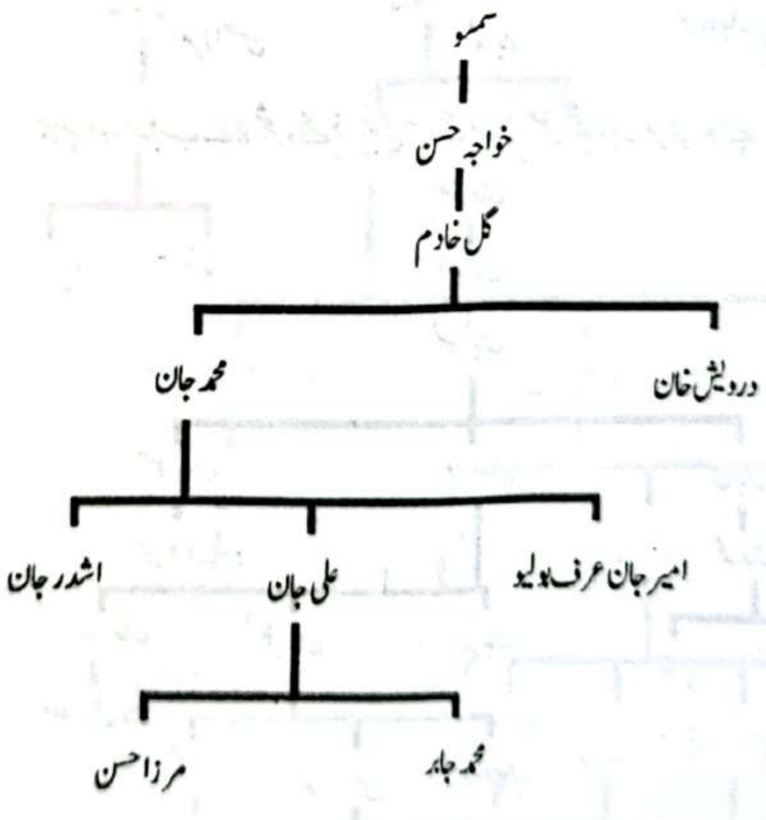
گلگت میں ایک ذات "مغل جان" کے نام سے مشہور ہے۔ ایسی کوئی ذات شنیہ یا بلتستان میں موجود نہیں صرف گلگت میں اس کے کچھ خاندان ملتے ہیں۔ تھمی بٹھو میں ایک خاندان موجود ہے۔ اس خاندان کا جد اعلیٰ تاتا جان یا ناتا جان تھا۔ بندوبستی میں کہیں تاتا اور کہیں ناتا لکھا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ نام ناتا جان ہے۔ جس کی بجاوپر نسھفنی محلہ مشہور ہوا۔ مغل جانوں کا دوسرا خاندان غلام رسول سابق ڈی ایف او کا ہے۔ جو میرا ہم سایہ اور مناپن کی دو بہوں کی وجہ سے جو ایک ساتھ میرے اور ان کے اجداد کے عقد میں آئیں رشتہ دار بھی ہے۔

1893-94ء کی بندوبستی ریکارڈ میں غلام رسول صاحب کا شجرہ اس طرح لکھا ملا۔

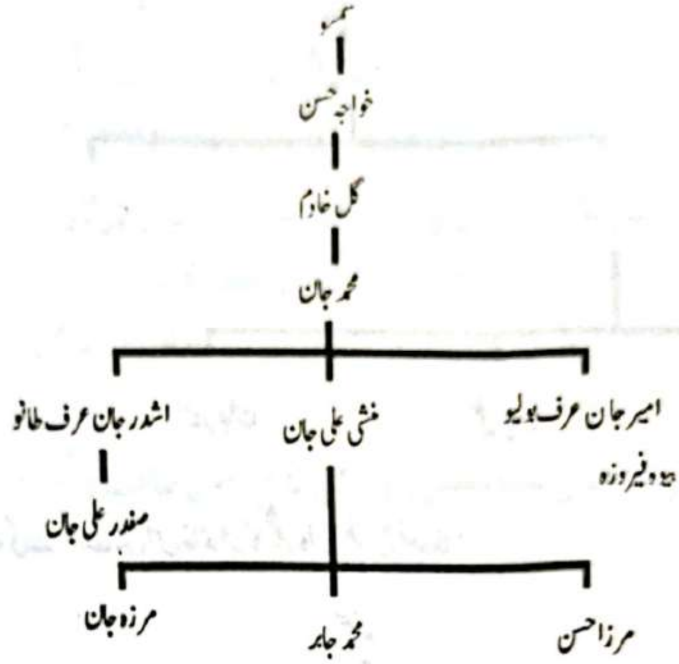




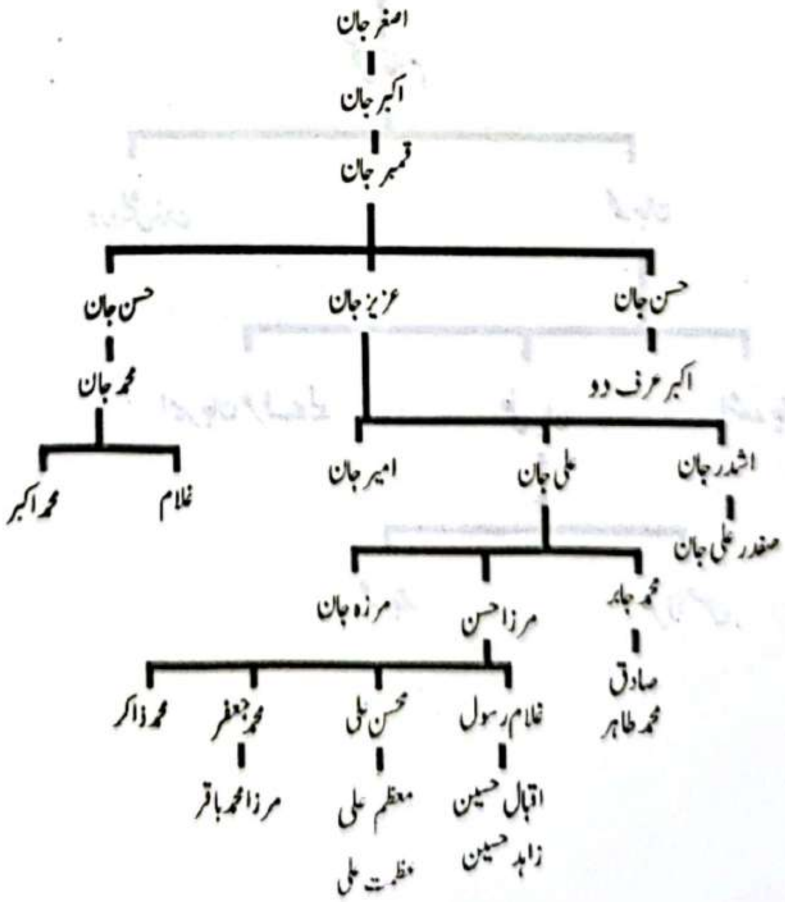
1916ء کی بندوبست میں اس خاندان کا شجرہ اس طرح لکھا ملا :



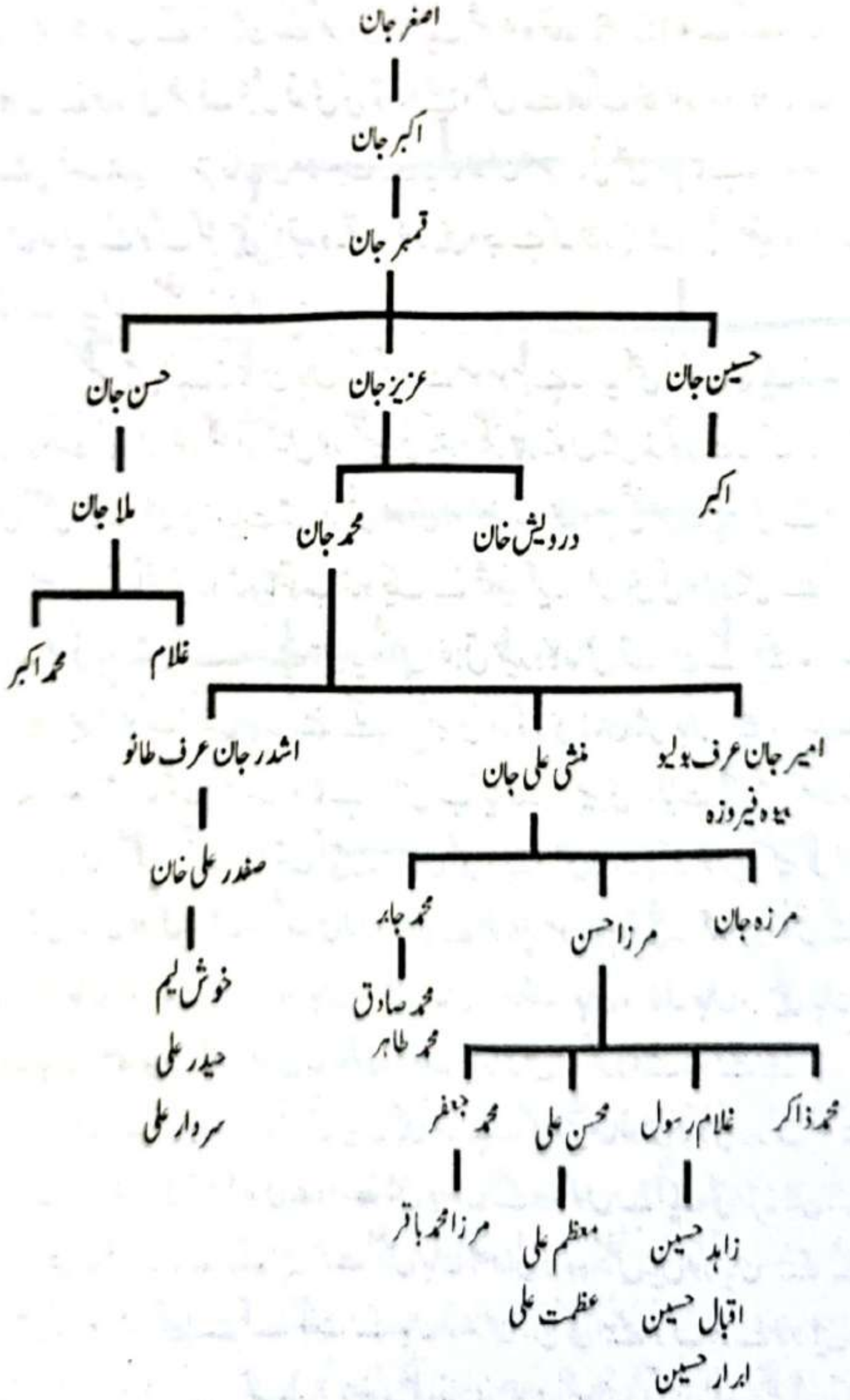
1946ء کی جمع بندی میں اس خاندان کا شجرہ اس طرح لکھا گیا ہے۔



غلام رسول صاحب نے جو شجرہ مجھے فراہم کیا اس کے مطابق اصل شجرہ یوں مرتب ہوا ہے:



گل خادم خواجہ حسن کی لڑکی تھی۔ اس کا جد اعلیٰ سمو تھا۔ اس لڑکی کی شادی عزیز جان سے ہوئی۔ جس کی اراضی اس خاندان کو عود ہوئی۔ یہی وجہ ہے اراضی کے انتقال کی بنیاد پر گل خادم کا شجرہ مغل جان خاندان سے وابستہ ہوا۔ سمو کی ذات کے بارے میں کچھ پتہ چل نہ سکا۔ جس کے ساتھ مغل جان خاندان کا تعلق ہوا۔ میں نے تمام ریکارڈ اور بیانات کی روشنی میں درج ذیل شجرہ مرتب کیا۔



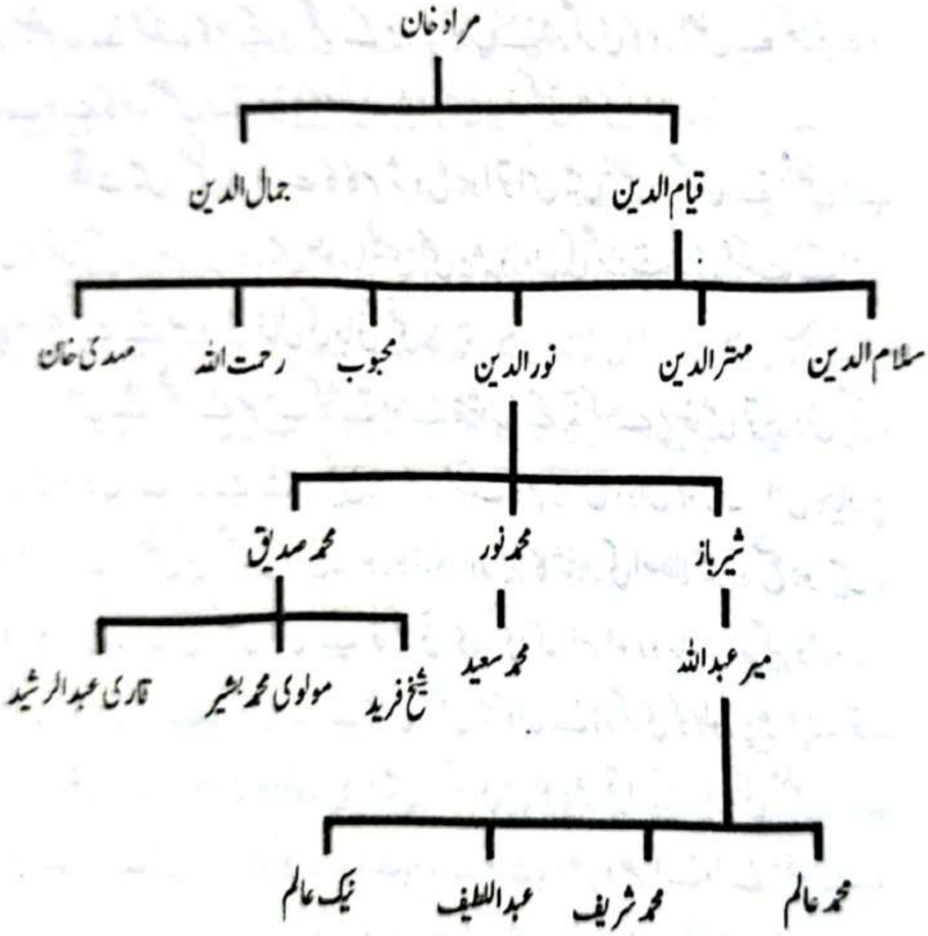
میں پہلے لکھ چکا ہوں مغل جان ہی کوئی ذات کشمیر کے ڈھائی ہزار ذاتوں میں نہیں ملتی۔ تاہم جان کے حوالے سے کچھ ذاتوں پر روشنی پڑتی ہے جو مغل خاندانوں سے متعلق ہیں۔

بخارا میں ایک خاندان جانیہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس خاندان نے 1599ء تا 1785ء تک بخارا پر حکومت کی۔ اس خاندان کا سلسلہ نسب جان (جانی) بن یار محمد سے ملتا ہے۔ جو استر خان کے خوانین کے گھرانے کا ایک شہزادہ تھا۔ 1556ء کے لگ بھگ جب روسیوں نے بخارا کی طرف پیش قدمی کی تو وہ اپنے وطن سے بھاگ نکلا اور روسیوں نے اس علاقے پر قبضہ جمایا۔ استر خان کی مناسبت سے یہ خاندان استر خانی بھی کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے خاندان جانیہ کے لوگ کٹر سنی العقیدہ تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بخارا ہمیشہ راسخ العقیدہ سنیوں کا مرکز رہا۔ یہ ایک مغل خاندان ہے۔

کشمیر میں ایک خاندان جان کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بھی مغلوں کا ایک خاندان ہے۔ روضۃ الابرار اور گلزار خلیل اور کشمیر کی کچھ دیگر تاریخوں میں مذکور ہے۔ کہ میر علی بخاری مغل تھے۔ ان کی ذریات میں قاضی موسیٰ جو حضرت مخدوم شیخ حمزہ کاشمیری کے مرید تھے کو چکوں کے آخری بادشاہ یعقوب شاہ چک نے شہید کیا۔ ان ہی کی اولاد میں سے کوئی صاحب کھوئی ہامہ میں آئے۔ کہتے ہیں یہ شخص اخلاق حمیدہ کا حامل تھا۔ ان کے اچھے عادات واطوار کو دیکھ کر لوگ انہیں جان کہنے لگے۔ کشمیری اور فارسی زبان میں جان اچھے، نہایت عزیز پیار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بس اب کیا تھا۔ کشمیری روایات کے عین مطابق جس طرح کئی وصفی ذاتیں وجود میں آئیں۔ جان بھی ایک وصفی ذات کے طور پر کشمیر کی اور ذاتوں میں شامل ہوگئی۔ ان بزرگ کی اولاد جان کے طور پر موسوم ہوئی۔ محمد دین فوق کہتے ہیں۔ اکبر جان اور ان کی اولاد جبار جان، عزیز جان، مختہ جان، لالہ جان، یحییٰ جان، یوسف جان، احمد جان تھے۔ اور یوں جانوں کا ایک بڑا خاندان ارد گرد پھلنے پھولنے لگا۔

میرے نزدیک زیادہ قرین قیاس یہی لگتا ہے۔ کہ اس خاندان کا کوئی بزرگ گلگت کی طرف آیا۔ 94-1893ء کی بندوبست میں جانوں کے بزرگوں نے ایک نئی سرزمین میں اپنی شناخت قائم رکھنے کے لئے اپنی ذات مغل جان لکھوائی کہ وہ مغل ہیں اور جان سلسلے کے مغل ہیں۔ اور جو کشمیر سے آئے گلگت کے جان خاندان میں کئی اچھے لوگ ہوئے اور ہیں۔ منشی علی جان، مرزا حسن، محمد جابر، صفدر علی خان، غلام رسول، محسن علی، نگرل کے

شکور جان، نانا جان، غلام حیدر وغیرہ علاقہ استور میں بھی کچھ مغل خاندان ملتے ہیں۔ قاری عبدالرشید کا خاندان مغل ہے کہا جاتا ہے ان کے آباؤاجداد نوشہرہ کی طرف سے بانکان ہوتے ہوئے مظفر آباد آئے۔ اس خاندان کے تین بھائی شیر باز، محمد نور اور محمد صدیق نے استور نقل مکانی کی اور مشوداس اور میچہ میں آباد ہوئے۔ قاری عبدالرشید نے جو شجرہ فراہم کیا وہ درج ذیل ہے۔



اس خاندان کے بہت سے لوگ مظفر آباد میں خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

شمالی علاقہ جات میں کشمیر سے مختلف اوقات میں آئے مغلوں کی تعداد بہت ہے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں، کھر، ہوڈر، جگلوٹ، ہوہ گاہ، یوبر، نوبل یا سین، گلگت، نگر، چترال اور ملحقہ علاقوں میں کشمیر سے نقل مکانی کرنے والے مغلوں کی تعداد تمام کشمیری اقوام سے زیادہ ہے۔ کیونکہ یہی مغل تھے جو افغانوں کے حریف اور ان کے مقابل کے تھے۔ افغانوں نے کشمیری مغلوں کو چن چن کر مروا دینے کی ایک تحریک شروع کی تھی۔ کٹڑوٹیوں

کے ابتدائی بڑے جتھے میں مغل ہی زیادہ تعداد میں تھے۔ جنہوں نے بارہ مولا کی لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ ان میں کثروٹ میں آباد ہونے والے مغل زرگر بھی تھے۔ مغل زرگروں کے اجداد میرے جد محمد کریم اور اس کے فرزند عبدالمراد کے ہم رکاب تھے۔ مغل زرگروں کے کئی اجداد اس بڑی ہجرت میں شامل تھے۔ کثروٹ کی آباد کاری میں مغلوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ جیسے میں پہلے لکھ چکا ہوں میرے پڑدادا عبدالرحمان فارسی جانتا تھا۔ ان کے وساطت بہت سی معلومات عبدالصبور اور میرے والد تک تحریری صورت میں ملیں ان کے مطابق گلگت وارد ہو کر مغلوں نے مختلف کام کیئے، نگر کے میر مغلوں نے زرگری کا اور بعض نے لکڑی کا اور بعض نے لوہے کا اور بعض نے راج کا کام کیا۔ اور بعض نے کھیتی باڑی کو اپنایا۔

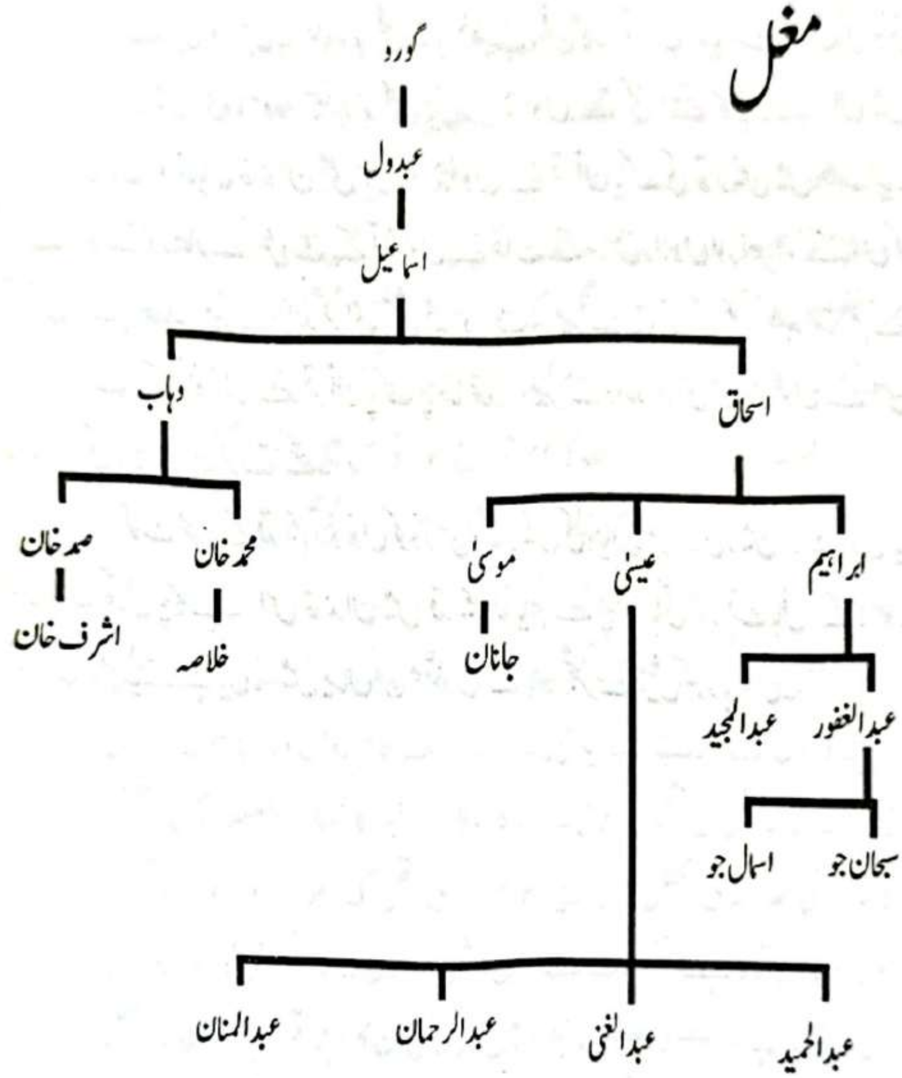
گلگت میں پہلی بندوبست کا کام شروع ہوا تو اس میں بعض لوگوں نے محض اپنے پیشوں کا اظہار کیا۔ اور اس دور میں بطور پالیسی بھی پیشہ وروں کی گروپ بندی مملکت کے امور کی انجام دہی کے لئے ضروری خیال کی جاتی تھی۔

اس لئے شجرے مرتب کرتے ہوئے پیشوں کے تذکرے پر خاص توجہ دی گئی۔ تا کہ پیشہ وروں کے درجے بنتے جائیں۔ اور مختلف کام رواں دواں ہوں۔ اس بنیاد پر 1901ء ایکٹ اراضی کی تکمیل ہوئی۔ اور کاشتکار اور غیر کاشتکار کی اصطلاحیں وضع ہوئیں۔ غیر کاشتکار کی حد بندی محض اس لیے قائم کی گئی تھی کہ امراء روساء، جاگیرداروں، حکمرانوں کا کام چلتا رہے۔ کثروٹ کے بعض مغل جنہوں نے زرگری کو بطور پیشہ اپنایا تھا۔ زرگر بن کر ہی رہے اور بندوبستی ریکارڈ میں زرگری ان کا پیشہ قرار پایا۔ ان کی مغل ذات زرگری کے پردے میں پنہاں ہو گئی۔ یہ بات یاد رہے گلگت یا ادھر ادھر آنے والے مغلوں نے لکڑی، لوہا، سونا چاندی، پتھروائی، کھیتی باڑی اور تعمیرات ہی کے کام کیے۔ لکڑی اور لوہے سے مغلوں کی محبت اور قدیم وابستگی کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ کہ کس طرح مغلوں کو لکڑی اور لوہے کے فنون میں دلچسپی تھی۔ ظفر نامہ فارسی از شرف الدین جلد اول، دی لائف آف چینگیز خان دی گریٹ از ہینس ڈیلا کروس میں لکھا گیا ہے۔ کہ جو کوئی شخص اپنے آپ کو مغل کہے اور اپنے ہاتھ سے لکڑی یا لوہے کا کام نہ کرے یا اسے کمتر خیال کرے وہ مغل ہی نہیں ہو سکتا۔ مغلوں کی فن کاری میں کوئی شک نہیں۔ دنیا میں یہ مغل ہی تھے جنہوں نے ہر قسم کے فنون کو آسمان تک سربلند کیا۔

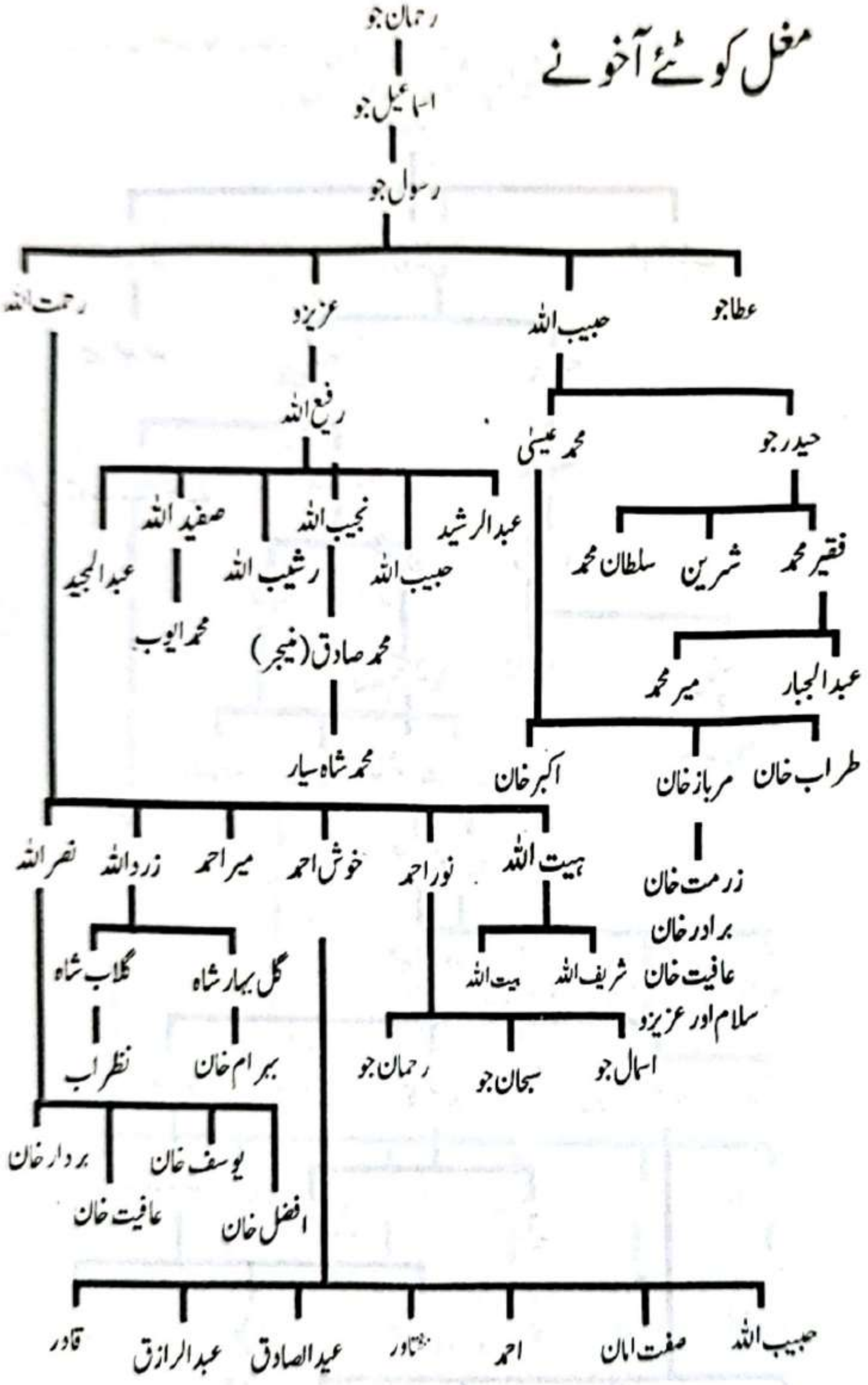
گلگت کے یہ زرگر مغل ہیں اور انہیں ریکارڈ آف رائٹس میں مغل ہی مندرج ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ان کے بزرگوں نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ان مغلوں میں بڑے بڑے لوگ ہو گزرے ہیں اور ہیں۔ علماء، فصحاء، خطیب، فن کار، آخون، سیاست کاروں کی کوئی کمی نہیں۔ ان میں کئی نامور ٹھیکیدار بھی ہیں۔ جنہوں نے کئی اچھے کام کیے۔ ان میں آخوندوں کے دو نمایاں خاندان بھی ہیں۔ جنہوں نے قرآن پاک کی تدریس میں حصہ لیا۔ کوٹے آخونے اور ہمارے کشروٹ کے آخونوں نے گلگت کے سابق راجوں اور امراء کے بچوں کو قرآن پاک پڑھایا۔ میرے والد گرامی منشی محمد یوسف، میرے چچا محمد کریم، عبدالقاسم نے بھی کشروٹ کے آخونوں سے قرآن پاک پڑھا تھا۔ میرے والد گرامی ان حوالوں سے اس خاندان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

کوٹ محلّہ کے قدیم آخونوں کو درس و تدریس کی بنیاد پر مرکزی زمین الاٹ ہوئی یہ محلّہ اب پھیل چکا ہے۔ اس خاندان میں قدیم الدیام سے پولو، ہاکی اور فٹ بال کے نامور کھلاڑی جنم لیتے رہے ہیں۔ میں یہاں ان مغلوں کے کچھ شجرے پیش کر رہا ہوں۔

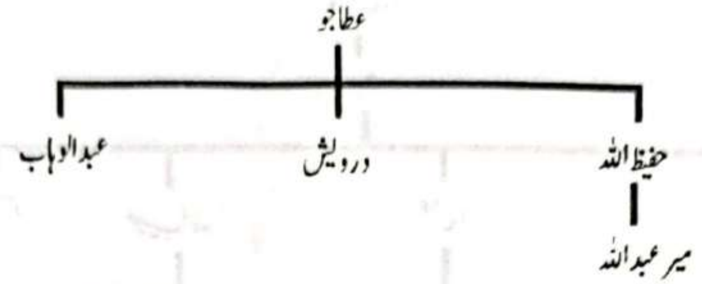
مغل


گورو
عبدول
اسماعیل
اسحاق
وہاب
ابراہیم
عیسیٰ
موسیٰ
محمد خان
صمد خان
جانان
خلاصہ
اشرف خان
عبدالغفور
عبدالمجید
سبحان جو
اسمال جو
عبدالحمید
عبدالغنی
عبدالرحمان
عبدالمنان

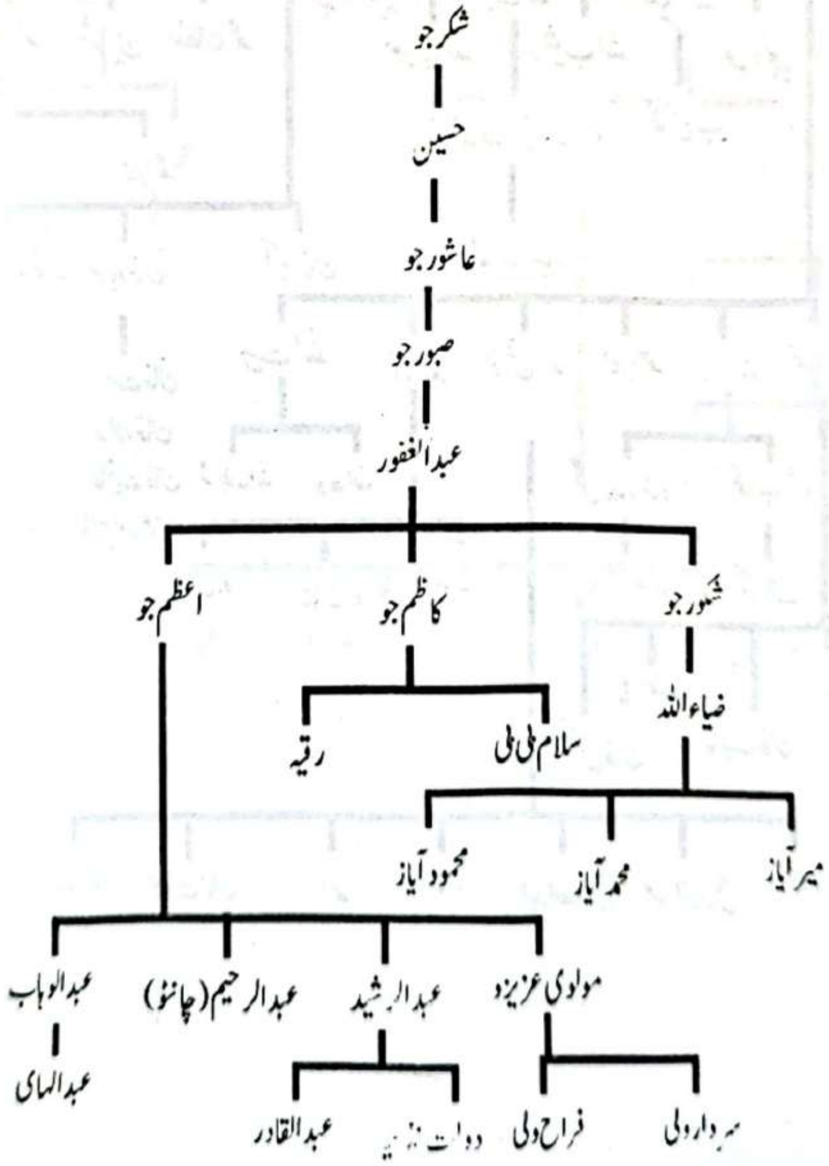
مغل کوٹے آخونے



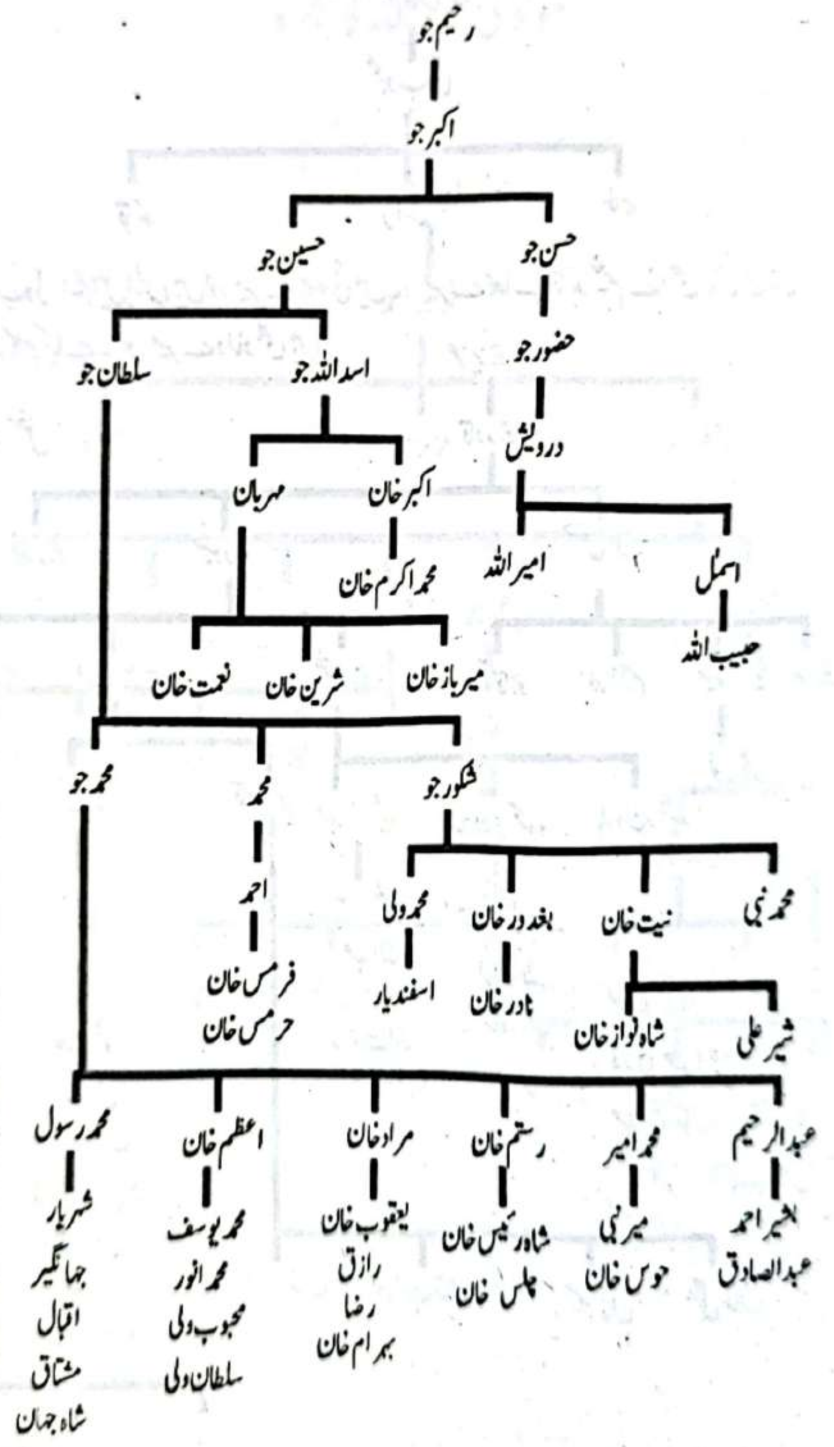
کوٹے آخونے سلسلہ جاری ہے۔

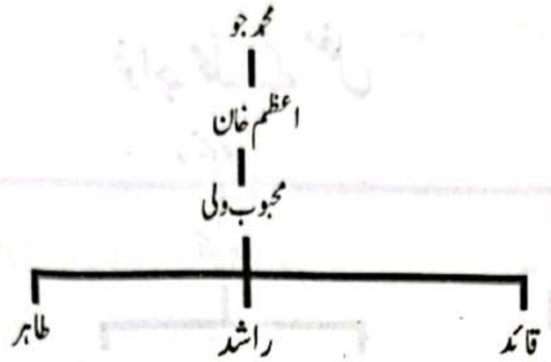


مغل کڑوٹ کے آخونے



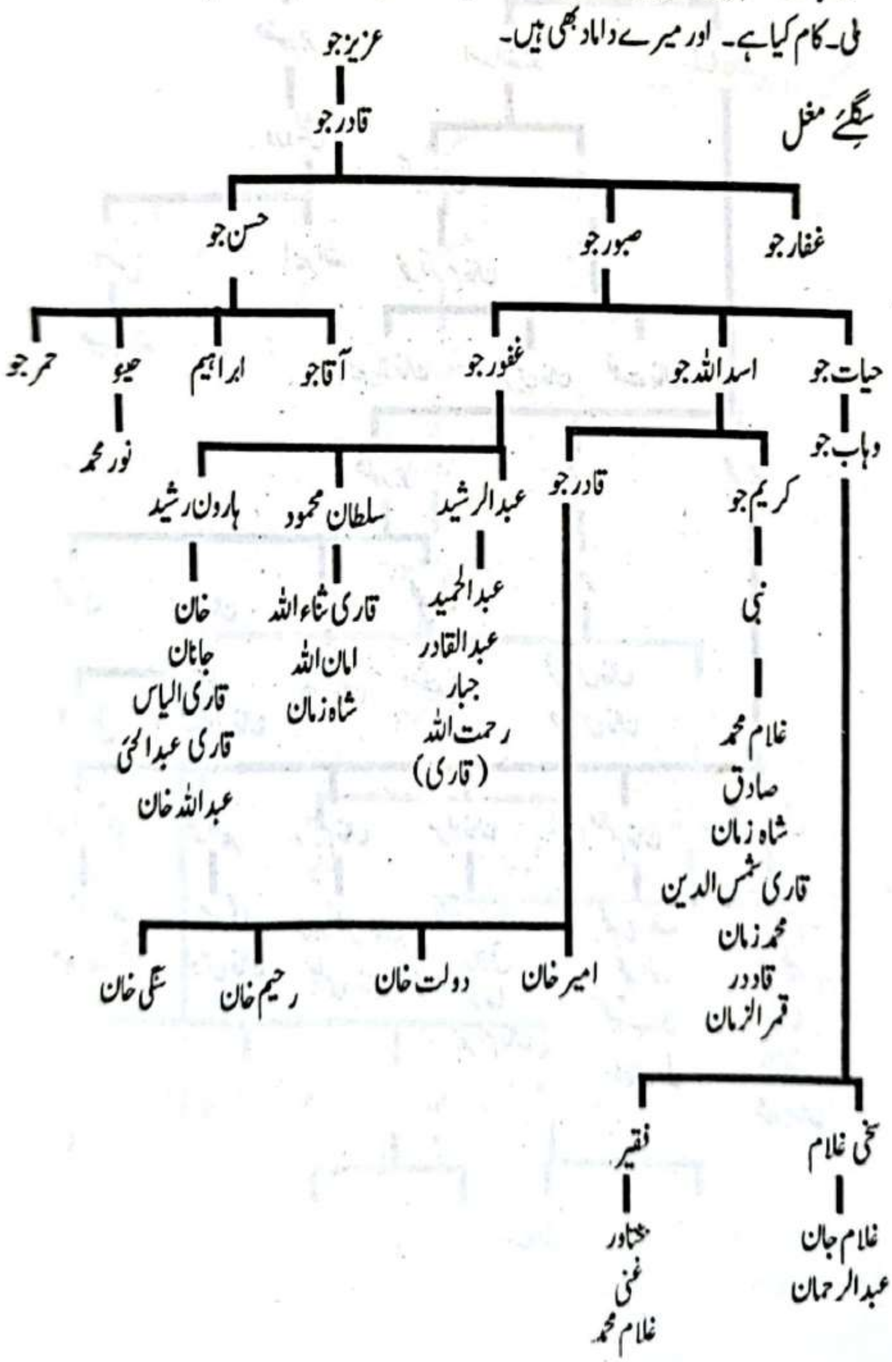
خواجہ محلّہ کے مغل





محبوب ولی ایم ایل ایس ہیں اور میرے بہنوئی ہیں۔ میرے بھانجے قائد نعیم نے ابھی حال ہی میں بی۔کام کیا ہے۔ اور میرے داماد بھی ہیں۔

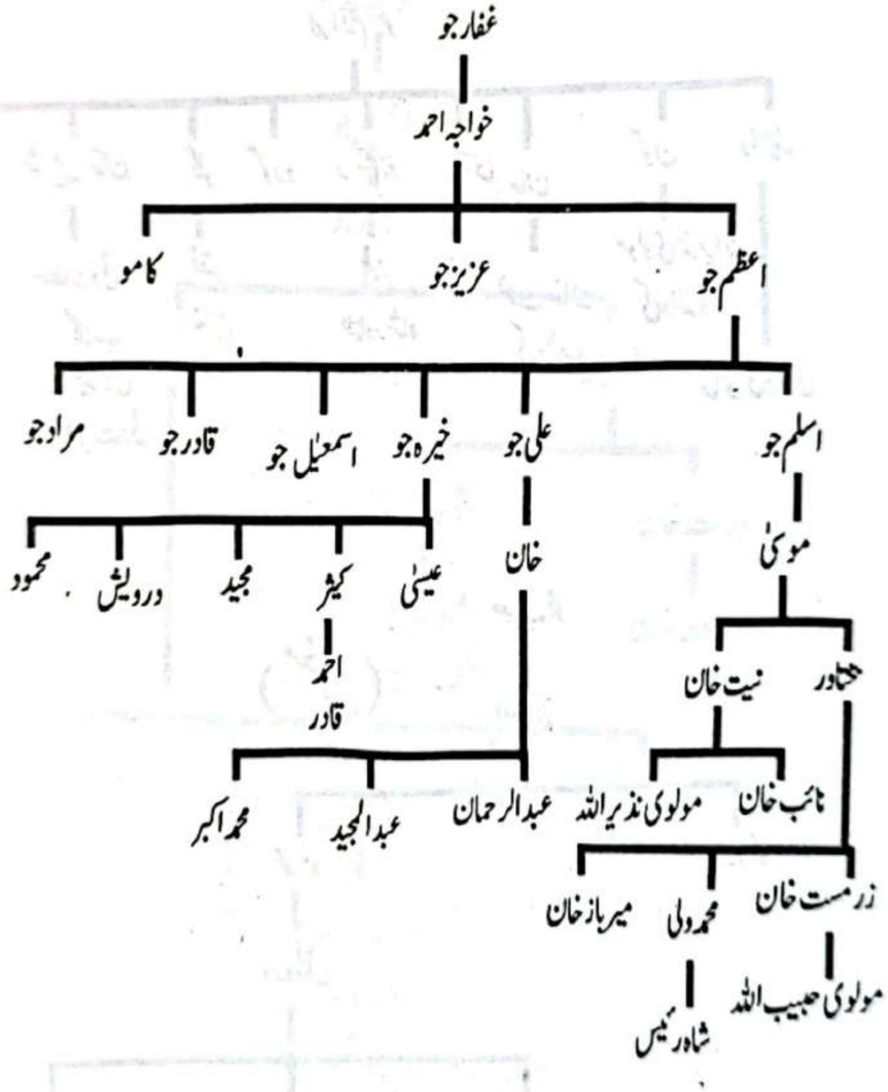
سگلے مغل

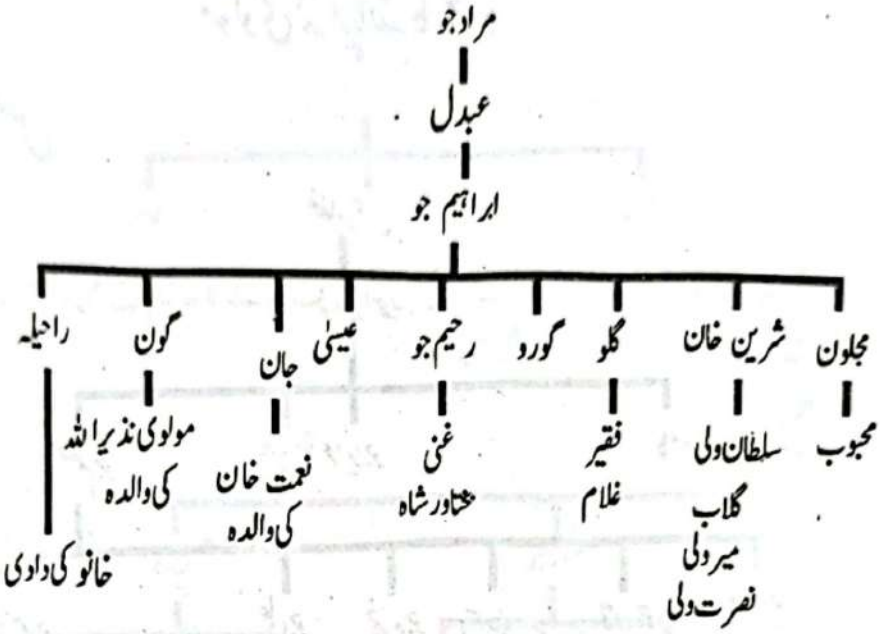


قاری ثناء اللہ میرے ہم زلف ہیں۔ غفار جو کو بدخشان میں فروخت کیا گیا تھا۔

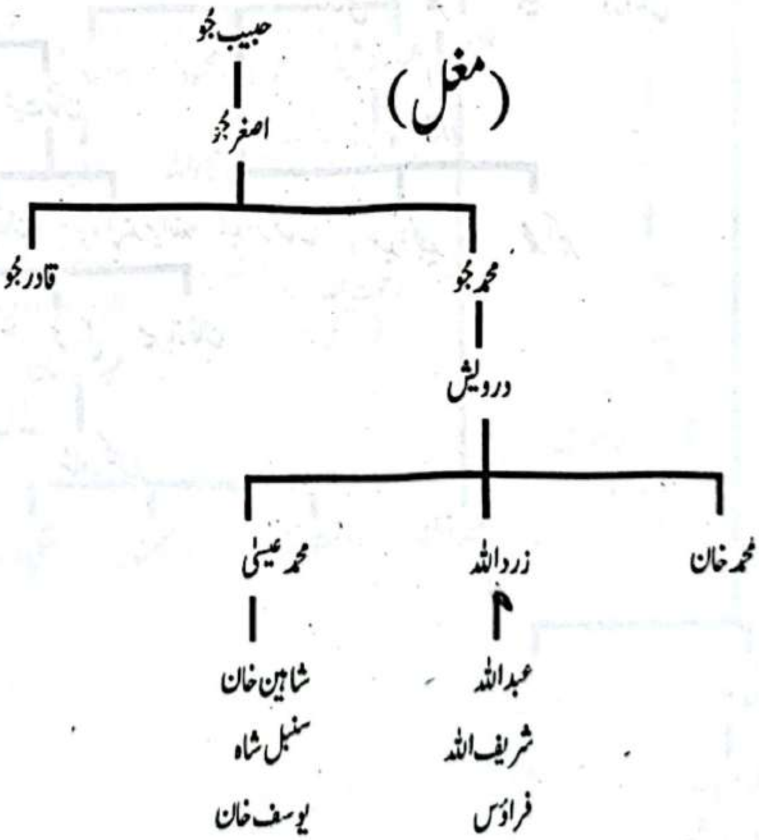
مولوی نذیر اللہ کا شجرہ

مغل

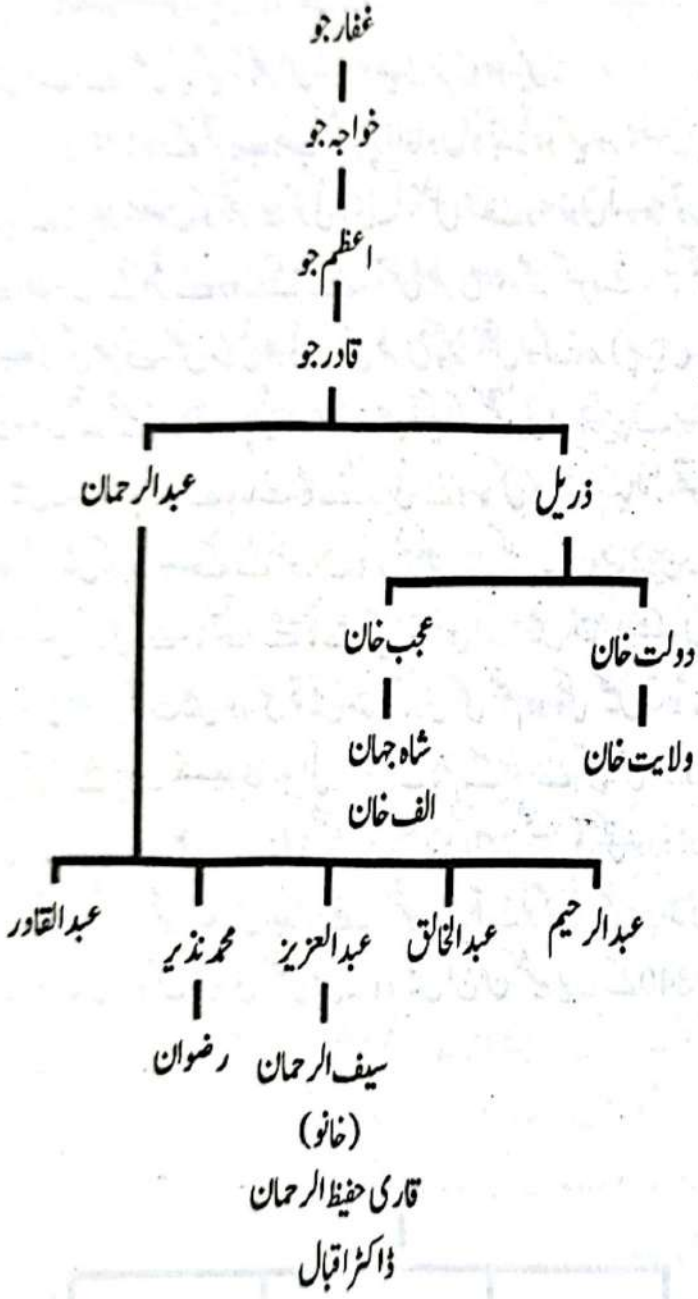



مراد جو
عبدل
ابراہیم جو
مجلون
محبوب
شرین خان
سلطان ولی
گلاب
میر ولی
نصرت ولی
گلو
فقیر
غلام
گورو
رحیم جو
غنی
مختاور شاہ
عیسیٰ
جان
نعمت خان کی والدہ
گون
مولوی نذیر اللہ کی والدہ
راحیلہ
خانو کی دادی

(مغل)


حبیب جو
اصغر جو
محمد جو
قادر جو
درویش
محمد خان
زرد اللہ
عبداللہ
شریف اللہ
فراؤس
محمد عیسیٰ
شاہین خان
سنبل شاہ
یوسف خان

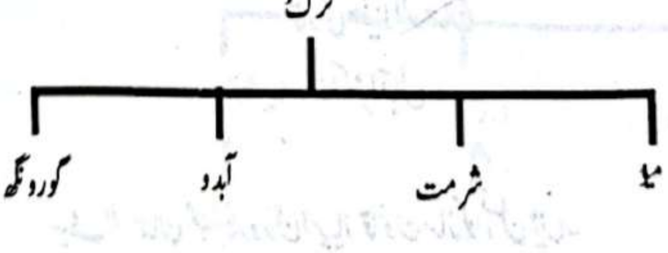
سیف الرحمان عرف خانو کا شجرہ



☆ سیف الرحمان ممبر ناردرن ایریاز قانون ساز کونسل ہیں۔

1916ء کی بندوبست میں قادر جو کی اولاد ذریل اور عبدالرحمان وغیرہ بتائی گئی ہے۔ جبکہ 1946ء کی جمع بندی ریکارڈ میں انھیں عزیز جو کی اولاد دکھایا گیا ہے۔ میرے نزدیک 1916ء کا بندوبستی ریکارڈ درست ہے۔
بعد میں جب اسے نقل کیا گیا تو پھر اس میں غلطیاں سرزد ہوئیں۔

1762ء کے قریب جب کشمیر پر افغانوں کا قبضہ ہو گیا اور مغلوں پر ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اور مغلوں کو ہجرت کرنی پڑی۔ مغل مختلف راستوں اور علاقوں سے گزرتے ہوئے افغانوں کے اثر سے دور نکلتے گئے۔ جس طرح ہٹوہ گہ کٹروٹ، تانگیر، جگلوٹ، کھنر، ہوڈر کی طرف نقل مکانی ہوئی۔ اسی طرح کچھ مغل لوگ بوبر (پونیال) تک آنکلے۔ بوبر ان دنوں آباد نہیں ہوا تھا۔ پانی اور ہموار زمین دیکھ کر کشمیری مہاجرین نے بہت جلد زمینیں ہموار کیں۔ میوہ جات کے باغات لگائے۔ پانی کے وسائل کا اہتمام کیا اور تھوڑے عرصے میں بوبر کی زمین کو پیداوار کے لئے موزوں بنا کر فصلیں تیار کیں۔ ان مہاجرین نے پونیال میں موجود یشکن آبادی کے ساتھ رشتے ناطے کیے اور اسی انداز میں مقامی یشکنوں میں ضم ہو گئے۔ جس طرح گلگت میں اور کئی قومیں مقام آبادی بھی ضم ہو چکی تھیں۔ بوبر میں آج بھی کشمیری آثار ملتے ہیں۔ کشیری ہرائی، کٹروٹ نام کے حوالے آج بھی موجود ہیں کہا جاتا ہے ان مہاجرین کا جداعلیٰ کرک نامی شخص تھا۔ یہاں اس شخص کی کئی اولاد ہوئیں۔ میو، شیرمت آبدو، گروسنگھ، مقامی اجداد تھے۔ کشمیر سے آئے لوگوں کے نام مقامی آبادی کو یاد نہیں۔ بہر حال یہ لوگ کشمیری مغل ہیں۔ بوبر میں آج ان کشمیریوں کے 340 تک گھرانے موجود ہیں۔



میو کی اولاد میں امیر شاہ وغیرہ ہیں۔ شیرمت کی اولاد میں شیر ولی ایڈوکیٹ، شاہ فراز تحصیلدار، علی امان شاہ ایگزیکٹیو انجینئر، میر جہان شاہ، سلطان اکبر، محمد یار وغیرہ ہیں۔ آبدو کی اولاد میں شاہین خان محکمہ زراعت، مستان خان وغیرہ کے 50 گھرانے شامل ہیں۔

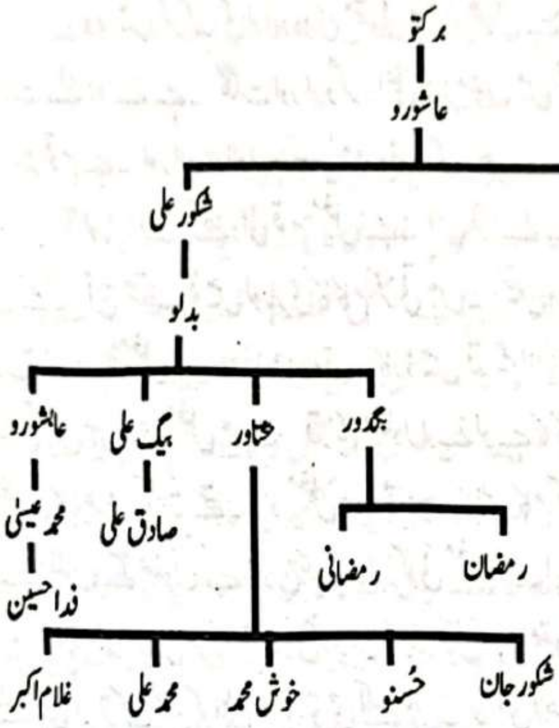
گورو سنگھ کی اولاد میں صوبیدار مرزادین وغیرہ 30 گھرانے شامل ہیں۔

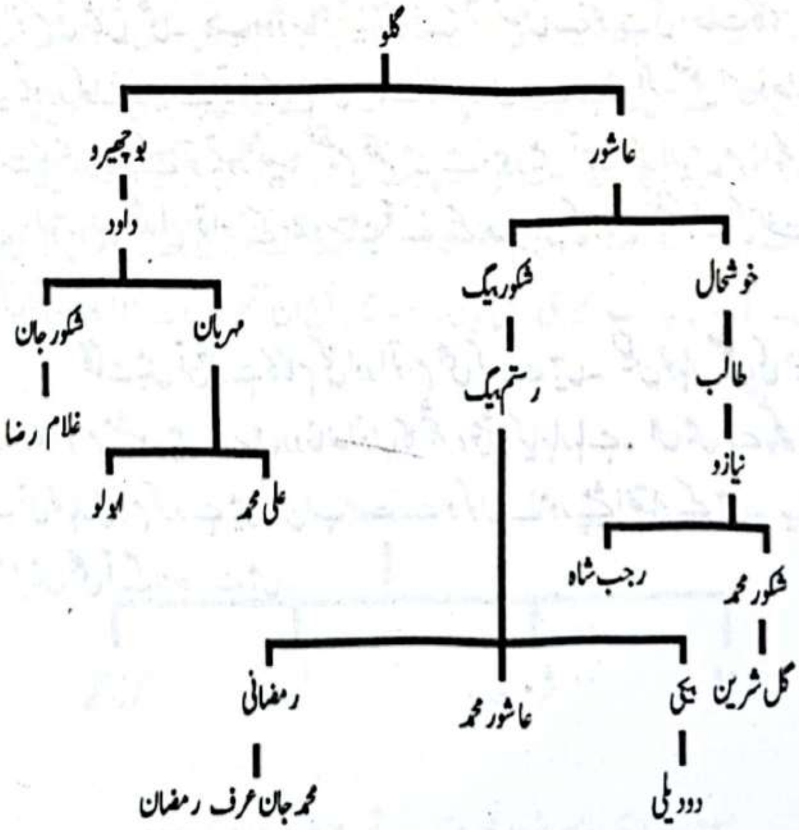
بوبر میں کرک کی اولاد بڑی متمول اور خوشحال ہے۔ تعلیمی اعتبار سے بھی یہ قبیلہ سبقت لئے ہوئے ہے۔ گلگت اور ارد گرد اعلیٰ ملازمتوں میں بھی ان کا بڑا حصہ ہے۔ یہ ایک شائستہ قوم ہے۔ اور ان حوالوں سے یہ معروف بھی ہے۔

لوہار ذات رکھنے والی قوم مغل ہے۔ اس حوالے سے کافی بحث سابقہ ابواب میں گزر چکی ہے۔ آج مختلف قومیں لوہاری کا کام کرتی ہیں۔ لیکن وہ مغل ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرتے اور نہ وہ مغل ہیں۔ بندوبستی ریکارڈ میں قدیم الایام سے جو قومیں تسلسل سے لوہار کہلاتی رہی ہیں وہی مغل ہیں۔ قدیم مغلوں نے لوہے کا کام سینے سے لگایا اور یہ اپنے لئے عظمت کا باعث سمجھتے تھے۔ جو مغل ہوتے ہوئے اس کام کو کسی طرح قابل تضحیک سمجھتا۔ اسے مغلوں کے صفوں سے خارج کیا جاتا اور کوئی مغل اسے اپنانے پر تیار نہ ہوتا۔

محمد الیاس مرزا "تاریخ ایران" جلد اول مرزا مقبول بیگ بدخشاں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ترک جن کو اہل چین توچی لکھتے ہیں۔ یہ بھی ایشیا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ جو ہن اقوام کی شاخ تھی۔ جب وہ وسط ایشیا میں آئے تو انہوں نے لوہے کی دھات کا نام تمو، تمریا تیمور رکھا۔ ظاہر ہے تیمور کا نام اسی دھات کا مرہون منت ہے۔ اگر مغل اس دھات کو عظمت کا نشان نہ سمجھتے تو تیمور جیسا عظیم حکمران کیسے وجود میں آتا۔ محمد الیاس مرزا پھر لکھتے ہیں۔ لہو اور لوہا منگول اقوام کے ہندوستان آنے کے بعد یہاں کی زبان سنسکرت کی لغت میں شامل ہوئے۔

گلگت میں آج لوہے کا کام کئی اور اقوام بھی کر رہے ہیں۔ لیکن لوہار مغل کی حیثیت سے چند اقوام مشہور ہیں۔ یہاں دو خاندانوں کا شجرہ پیش کیا جارہا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ اب بھی لوہاری کام کر رہے ہیں لیکن اب بہت سے لوگوں نے اور پیشے اختیار کیے ہیں۔ یہ لوگ تعلیم میں بھی آگے بڑھ رہے ہیں۔



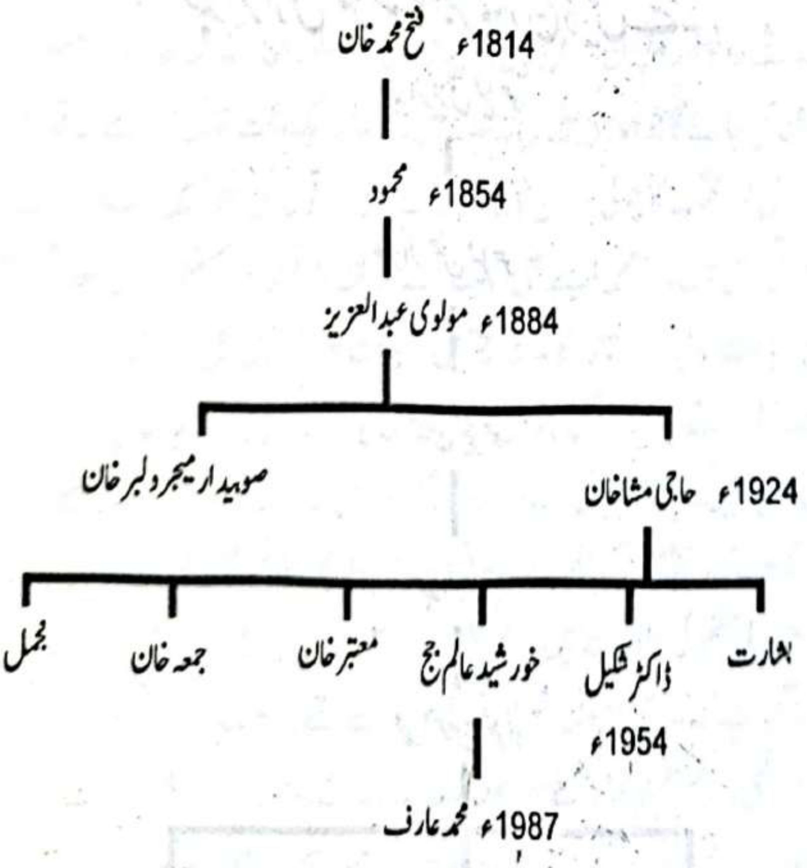


افغانوں کے ظلم سے بچنے کے لئے 1760ء کے بعد آنے والوں میں ہلوہ گاہ، کھنر،

ہوڈر اور تانگیر کے کشمیری خاندان بھی ہیں۔ یہ لوگ بھی کثروٹ اور جگلوٹ کے کشمیری مغلوں کی طرح کشمیر سے فرار ہوئے تھے۔ کیونکہ کشمیر کے مغلوں نے افغانوں سے حکومت چھینی تھی۔ اور مغلوں کی مدد سے سوکھ جیون مل کشمیر کا حکمران ہوا تھا۔ جب افغان کشمیر پر دوبارہ قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تو مغل نشانہ ستم بنے۔

تانگیر، بٹوگاہ، کھنر اور ہوڈر کے خاندان بھی مغل ہیں۔ ہوڈر کے مغل خیر اللہ نامی شخص کی اولاد ہیں۔ اس وقت ان مغلوں کی بستی 30 گھرانوں پر مشتمل ہے۔ کھنر کے مغل فتح محمد خان و قربان محمد خان کی اولاد ہیں۔ یہ مغلوں کا ایک مضبوط قبیلہ ہے۔ اس کی رشتہ داریاں جگلوٹ کے میر (مغل) خاندان سے بھی ہیں۔

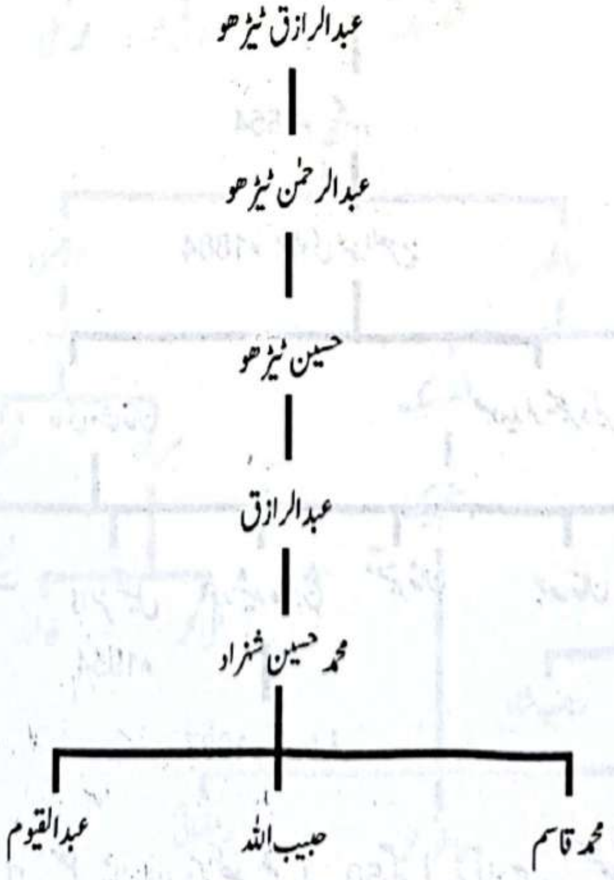
ان کا شجرہ درج ذیل ہے۔



اس مغل خاندان کے کھنر میں اب 50 گھرانے آباد ہیں۔ کشمیر سے آنے والے قبائل میں ٹیرو نام کے لوگ بھی شامل ہیں۔ کشمیریوں میں ذات ساز کیے حوالوں سے کافی بحث آگے گزر چکی ہے۔ جسمانی عیوب کے لحاظ سے جو ذاتیں وجود میں آئیں ان میں ٹیڑھو (آنکھوں کا ٹیڑھا)، لنگو (جو لنگ کرتا ہو) کھشو (جو ہاتھ سے محروم ہو) زرو (بہرہ)، گنجو

(گنجا) وغیرہ کئی مشہور ذاتیں ہوئیں۔ اس طرح ذات سازی کا یہ سلسلہ کسی اور جگہ موجود نہیں۔ چونکہ یہ خاندان ان ناموں سے مشہور ہے ان کی اصل ذاتیں تاریکی کے پردہ میں گم ہیں۔ ہماری طرف کشمیر سے آنے والی اس قبیلہ کی ایک ہی قوم نظر آتی ہے۔ وہ سان کھنار کی ہے بعض ان کو شین قرار دیتے ہیں اور بعض مغل میرے نزدیک یہ مغل ہیں کیونکہ یہ بھی کشمیر سے دیگر مغلوں کے ساتھ آئے۔ اور ارد گرد آباد ہوئے۔ ان میں سے بعض شین حلقوں میں آباد ہوئے اور اس حوالے سے اپنے آپ کو شین سمجھنے لگے۔ حالانکہ کشمیر سے شینوں کی ہجرت کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ اور پھر شینوں یا ہماری طرف دیگر قوموں میں جسمانی عیوب کی بنا پر کوئی قوم وجود میں نہیں آئی۔ سان کھنار کے خاندان پھر اپنے اپنے اجداد کے نام پر اٹھتو، چبرے، کانے، بوشے وغیرہ مشہور ہوئے۔

عبدالرازق ٹیڑھو کا شجرہ درج ذیل ہے۔



عبدالصمد خان ہیڈ ماسٹر بھی اس قوم کا ایک فرد ہے۔ اس خاندان کا کشمیری چک حکمرانوں سے کوئی تعلق نہیں۔

باب۔ 9

گلگت کے کچھ اور قبائل

شین اور یشکن شمالی علاقہ جات کی دو بڑی قومیں ہیں۔ شمالی علاقہ جات میں ان ہی دو اقوام کی بڑی اکثریت ہے۔ ان کا تفصیلی تذکرہ اگلے ابواب میں کیا جائے گا۔ یہاں کچھ ایسی اقوام کا ذکر کیا جارہا ہے جو کسی لحاظ سے کم اہم نہیں ہماری سیاسی تاریخ ان اقوام کے اثر نفوذ سے بڑی متاثر ہوئی۔ گلگت کے بندوبستی ریکارڈ میں جن اقوام کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں خوش وقت برشے رونو اور مقپون شامل ہیں۔ یہاں ان اقوام اور ان کے ان خاندانی سلسلوں کا کچھ حال بیان کیا جائے گا جو ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ قدیم الایام سے چترال اور گلگت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے ان علاقوں کی حکومتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ بعض ایسے بھی زمانے آئے کہ ان علاقوں پر مشتمل سیاسی وحدتیں بنیں۔ بلور کی ریاست ہو یا دردستان کا علاقہ چترال، گلگت اور بلتستان مل کر ایک ریاست کا سماں باندھتے نظر آتے ہیں۔ کبھی چترال کے حکمران پورے شمالی علاقہ جات پر حکمرانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً چترال کے رئیساں کے دور میں یہ علاقے چترال کا حصہ تھے۔ چترال کے رئیسوں کا بدخشان کے حکمران سے قریبی رشتہ داریاں قائم تھیں اور ان دونوں کا ادعا تھا۔ کہ وہ سکندر اعظم کی اولاد سے ہیں۔ چترال کے رئیس خاندان کے بارے میں ایک خیال یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ کسی مقپون شہزادے کی اولاد سے تھے۔ جب موازناتی اور تجزیاتی تاریخ موجود نہ تھی۔ کم علم لوگوں نے صدیوں کے تفاوت کے باوجود دو تاریخی واقعات کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا ہے۔ مثلاً ان رئیسے خاندان کا گلگت کے شاہ رئیس اعظم سے کوئی تعلق نہیں اور نہ گلگت کی تاریخ میں ایسا کوئی کردار موجود ہے۔ لیکن داستان طرازوں نے ان خاندانوں کو یکجا کرنے اور یکجدیاں ظاہر کرنے کے لئے بڑی پیوندکاری کی ہے۔ حالانکہ چترال کے ان رئیسوں کا اپنا ایک سلسلہ تھا۔ شاہ نادر رئیس (1320)، شاہ جان رئیس، شاہ خان رئیس، شاہ کرم رئیس، شاہ نظام رئیس، شاہ اکبر رئیس، شاہ ناصر رئیس، شاہ محمود رئیس، اور شاہ

قادر رئیس (1620) وغیرہ نے تین سو سال سے اوپر زمانے تک چترال پر حکمرانی کی۔ یہ حکمران باہم تعلقات بڑھانے کے لئے رشتے ناطے کرتے۔ چترال کی لوگ روایات میں کہا گیا ہے کہ شاہ خان رئیس نے گلگت کے حکمران سے بیٹی کا رشتہ طلب کیا تو گلگت کے حکمران نے نہ صرف اپنی بیٹی دی بلکہ جہیز میں پونیال کا علاقہ بھی بخش دیا تھا۔

گلگت اور چترال کے حکمران سوملک بھی ایک متنازعہ شخصیت ہیں۔ بعض مورخین اسے چترال کا اور بعض اسے گلگت کا باسی قرار دیتے ہیں۔ چترال کے تاریخی واقعات میں سوملک کا ذکر اسی انداز میں کیا جاتا ہے۔ جس طرح گلگت میں مذکور ہے۔ سوملک چترال کا ایک نامور حکمران تھا اور اس کی حکومت پورے شمالی علاقہ جات پر تھی اور اس کا دور بلور میں خوشحالی کا دور تھا چترال کی تاریخ میں لکھا گیا ہے کہ اسی سوملک نے ترک حملہ آور قبائل کو شکست فاش دیکر چترال سے نکال دیا تھا کہتے ہیں۔ اس کی وسیع سلطنت اس کے تین بیٹوں زوند، رون اور ہرایو میں تقسیم ہوئی اس حوالے سے گلگت کی تاریخ ایک اور منفرد داستان پیش کرتی ہے۔ جو تاریخی بنیادوں سے کمزور دکھائی دیتی ہے۔

چترال کا کٹور خاندان ایک نامور خاندان تھا۔ چترال اور گلگت کی تاریخ اس خاندان کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ ایک افسانوی کہانی سے اس خاندان کی شہرت کو دھندلانا کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً سید بریادلی کا واقعہ کہ اس کا ایک خادم سنگ علی چترال کی حکمرانی پر متمکن ہوا تھا اور اسی سے کٹوروں کا سلسلہ چل نکلا کوئی حقیقت نہیں میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ سید شاہ بریادلی کا زمانہ 1965ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور چترال کے کٹوروں کا دور تقریباً 1520ء کے زمانے سے ان ادوار میں کافی فرق موجود ہے اور پھر چترال پر سید بریادلی شاہ کی تبلیغ کے اثرات موجود نہیں افسانہ گھڑنا آسان ہے لیکن تجزیاتی تاریخ کے سان سے گزار کر اسے ثابت کرنا آسان امر نہیں۔

کٹور خاندان کے جد اعلیٰ کا نام بابا ایوب تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک درویش صفت انسان تھے اور وہ جلد ہی اپنے اخلاق حمیدہ کی وجہ سے عوام میں خاصے مقبول ہوئے۔ غلام مرتضیٰ اپنی تاریخ چترال میں لکھتے ہیں کہ بابا ایوب ہرات کے آخری مغل سلطان حسین مرزا کا پوتا تھا۔ انقلاب زمانہ کا مارا بابا ایوب فقیروں کے بھیس میں اپنے ایک اور بزرگ ساتھی کے ساتھ چترال وارد ہوا۔ یہ دونوں فکر اسلامی کے مبلغ تھے بابا ایوب کے اس بزرگ ساتھی نے چترال میں اسلامی تعلیمات کے مراکز قائم کیے اور درس و تدریس کے

سلسلے شروع کئے۔ یہ دونوں بزرگ اپنے اخلاقی اور معاشرتی خوبیوں کی وجہ سے علاقے میں بہت معروف ہوئے کہتے ہیں۔ شاہ اکبر رئیس حکمران چترال نے اسی وجہ سے بابا ایوب کو اپنی بیٹی عقد میں دی اس سے دو لڑکے ہوئے ماہ طاق اور خوشحال خوش حال سے سنگین علی پیدا ہوا۔ یہی سنگین علی آہستہ آہستہ مہتر چترال کے دربار تک پہنچا اور پھر اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر مہتر چترال کے فوجی امور کا نگران اعلیٰ بنا۔ آپ کی سپہ سالاری میں گلگت پر بھی حملے ہوئے۔ جس کے نتیجے میں گلگت کے حکمران کو بلتستان بھگانے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

چترال کے ایک اور مورخ منشی عزیز الدین لکھتے ہیں کہ بابا ایوب کے چترال میں آنے کے بارے میں کئی روایات ہیں لیکن ان کے مطابق سب سے زیادہ قابل اعتماد روایت وہ ہے۔ جس کے مطابق بابا ایوب مرزا کامران یا مرزا ہندال کی اولاد سے قرار دیا جاتا ہے۔ 1540ء میں ہمایوں بے یارومددگار ہو کر ایران چلا گیا تھا۔ 1545ء میں وہ ایرانی افواج کے ساتھ ہندلوٹا۔ ہمایوں نے پہلے عسکری سے قندھار اور کامران سے کابل چھینا۔ اس نے عسکری کو حج کے لئے مکہ مکرمہ روانہ کیا۔ مرزا ہندال ایک شب خون میں مارا گیا۔ ان چپقلشوں میں ہمایوں کے بھائیوں مرزا عسکری کامران اور مرزا ہندال کی اولاد تتربتر ہو گئی تھی۔ یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ بابا ایوب ہمایوں کے ان بھائیوں میں سے کسی کی اولاد ہو۔ جو آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے تباہ حالی سے دوچار ہوئی۔ بابا ایوب ہرات کے سلطان حسین مرزا کا پوتا ہو یا مرزا عسکری یا مرزا کامران کا بیٹا۔ لگتا ہے وہ ایک مغل شہزادہ تھا۔ جس کی اولاد نے چترال ور شگوم اور گلگت میں دوررس اثرات ڈالے۔ ان ہی کی تیسری نسل میں سنگین علی یا سنگ علی پیدا ہوئے میں نے سابقہ ابواب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ سید بریا ولی یا کسی سنگ علی کے گلگت کی طرف سے چترال میں آجانے کی کوئی تاریخ نہیں ملتی اور نہ یہ ادوار ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں اور نہ یہ کسی اثرات کے حامل ہیں۔

بابا ایوب کے ساتھی کے بارے میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ شمس الدین تبریز تھے۔ بابا ایوب اور شمس الدین تبریز دونوں کشمیر سے ہوتے ہوئے چترال آئے۔ لیکن شمس الدین تبریز امیر تیمور کی ولادت سے کئی سال پہلے وفات پا چکے تھے اس لئے یہ باتیں موازناتی تاریخ سے لگا نہیں کھاتیں۔

بابا ایوب کا خاندان چترال میں کٹور کہلاتا ہے۔ کٹور کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کے بانی حکمران محترم شاہ ولد محمد بیگ نے تخت چترال کے حصول

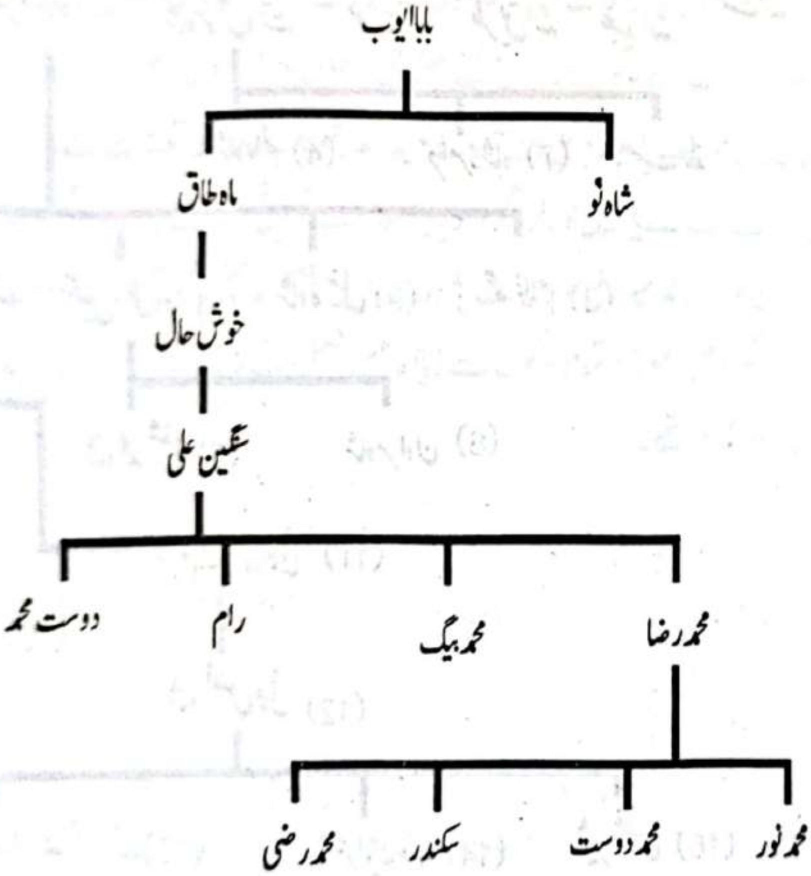
میں بڑی خونریزی کی تھی۔ مشرقی نورستان میں کٹور نامی کا ایک قبیلہ تھا۔ جو اپنی خونریزی اور بے رحمی کے لئے مشہور تھا۔ محترم شاہ کو ان ہی تقابلی حوالوں سے کٹور کہا گیا جو ایک وصفی نام تھا۔ اور اس کے سلسلے کے تمام مہتر کٹور کے نام سے یاد کیے جانے لگے۔

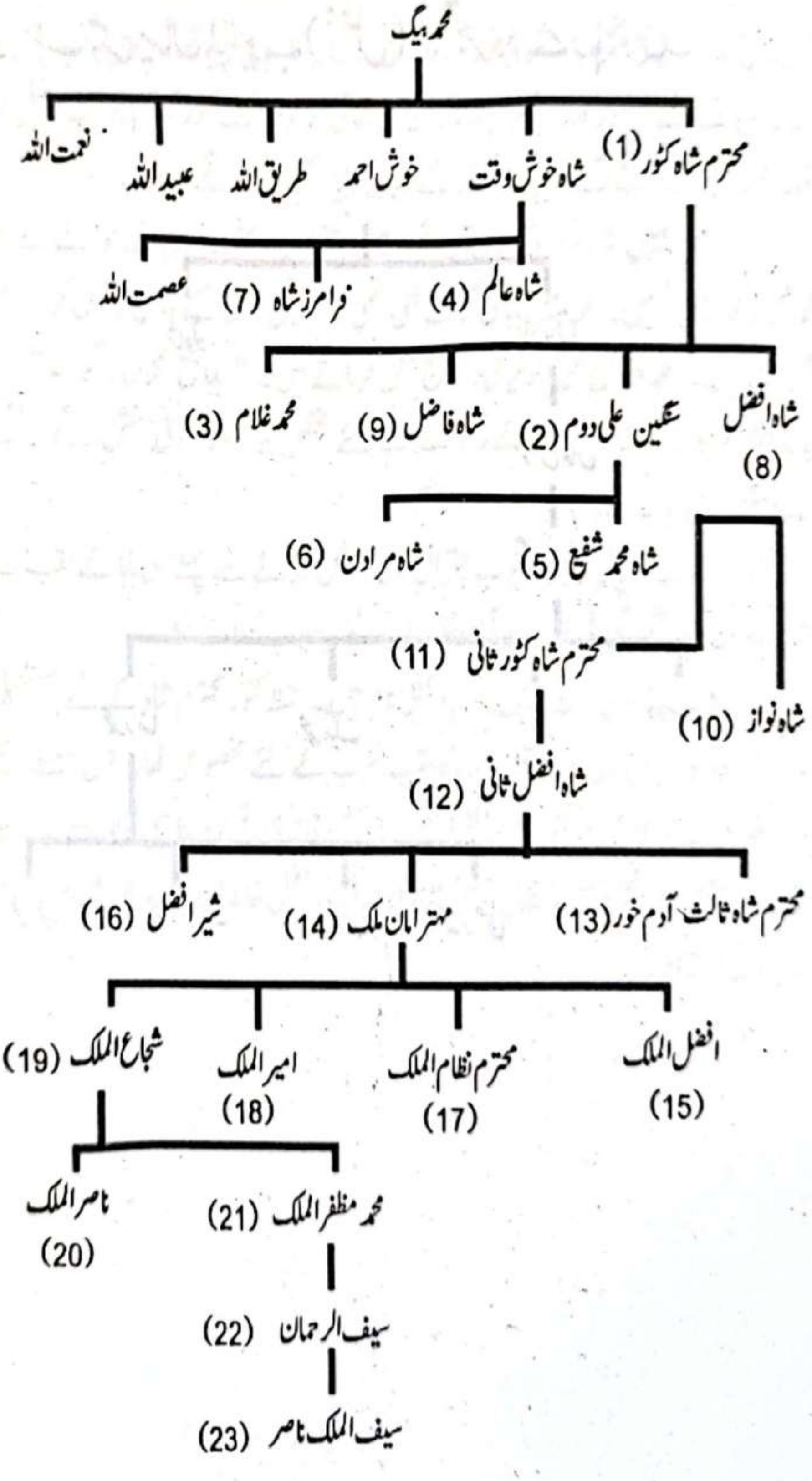
میں کہیں اشارہ کر چکا ہوں کہ کشمیر میں نسبتی اور وصفی ناموں کے حوالے سے کئی گوتیں وجود میں آئیں۔ ان میں بابا کی گوت بھی تھی۔ اخلاق حسنہ کے حامل لوگوں کو بابا یا شاہ بھی کہتے ہیں۔ مخدوم شیخ علی ہجویری داتا گنج بخش فرماتے ہیں۔ " بابا شیخ کلاں را گویند" اس سے معلوم ہوتا ہے۔ بابا صوفیا کے زمرے کے لئے مختص ہوا اور صوفی منش بزرگوں کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔

میرے خیال میں بابا ایوب چترال میں داخل ہونے سے پہلے ہی بابا کے لقب سے ملقب ہوگا۔ اور کشمیر کی طرف سے آیا ہوگا۔ اس لئے بابا ایوب کہلانے لگا۔

کٹور یا بابا کوئی ذات نہیں۔ یہ وصفی نام ہیں۔ لفظ کٹور محترم شاہ کے لئے مستعمل ہوا۔ کہ وہ خونریزی میں طاق تھا۔ یا بابا کا لقب ایوب کے لئے مخصوص تھا۔ اس سلسلے کے تمام حکمران نہ بابا تھے اور نہ کٹور اس لئے انہیں بابا یا کٹور خاندان قرار دینا کسی لحاظ سے درست نہیں۔ بیشتر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ایک مغل خاندان ہے۔ اور میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔

اب میں یہاں بابا ایوب (مغل) کا شجرہ دے رہا ہوں۔



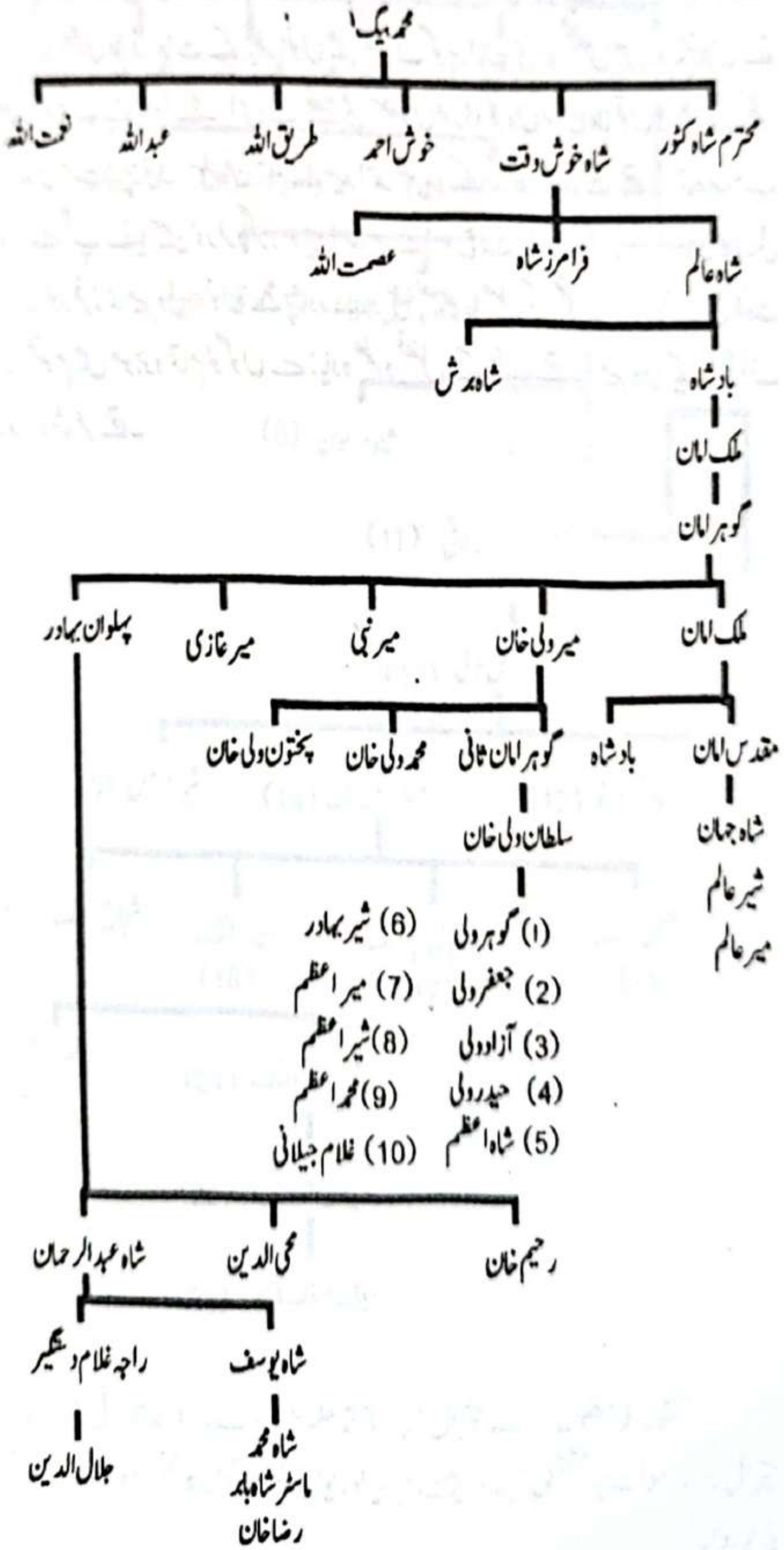


کٹور (مغلوں) کے چترال میں 23 حکمران ہوئے۔ 29 جولائی 1969ء کو چترال دیر، سوات پر مشتمل ایک ڈویژن بنایا گیا اور یوں کٹور مغلوں کا تین سو سالہ دور اختتام پذیر ہوا۔

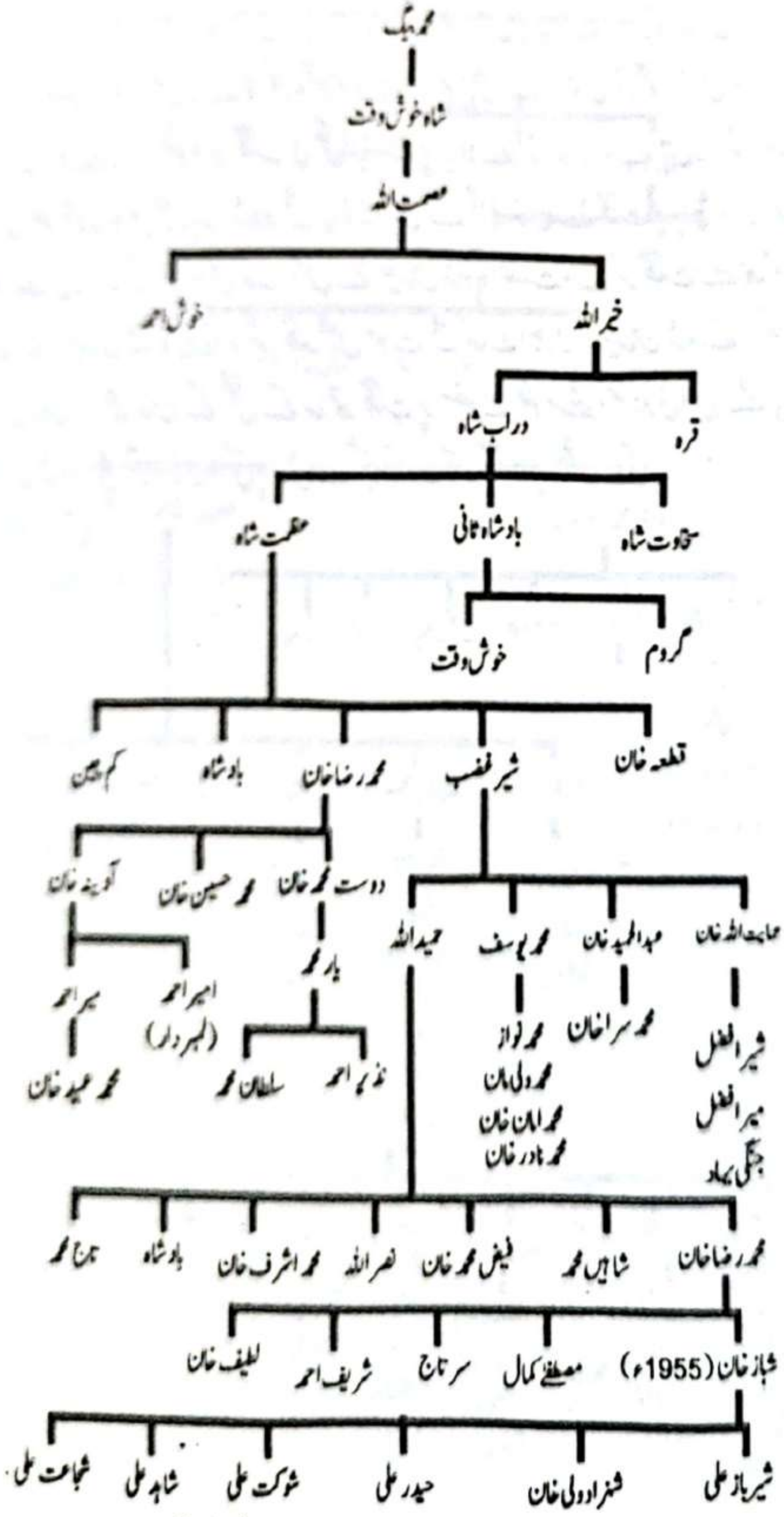
چترال میں خوش وقت کی اولاد میں سے صرف شاہ عالم اور فرامرز شاہ کو چترال کی مسترشب ملی۔ لیکن اس سلسلے میں گوہر امان، ملک امان اور سلیمان شاہ جیسے حکمران بھی ہوئے۔

شمالی علاقہ جات کے حکمرانوں میں صرف گوہر امان ہی وہ شخص ہیں۔ جنہوں نے سکھوں کو ناک چنے چبوائے۔ اس کے جیتے جی سکھوں اور ڈوگروں کو ان علاقوں کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہ پڑی۔ سلیمان شاہ کے سید احمد شہید کے ساتھ تعلقات تھے۔ شاہ صاحب کی مدد سے آپ نے یاسین اور ارد گرد دین اسلام کے فروغ کے لئے کام کیا۔ گوہر امان کا بھائی میر امان اور فرزند میر ولی دونوں نے پشاور سے دینی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور دونوں ہی گلگت اور درشگوم میں موجود تمام لوگوں سے زیادہ علم و فضل کے مالک تھے۔ میر ولی ایک معروف خطاط اور شاعر تھے۔

شاہ خوش وقت مغل کا شجرہ



عصمت اللہ ابن شاہ خوش وقت کا شجرہ

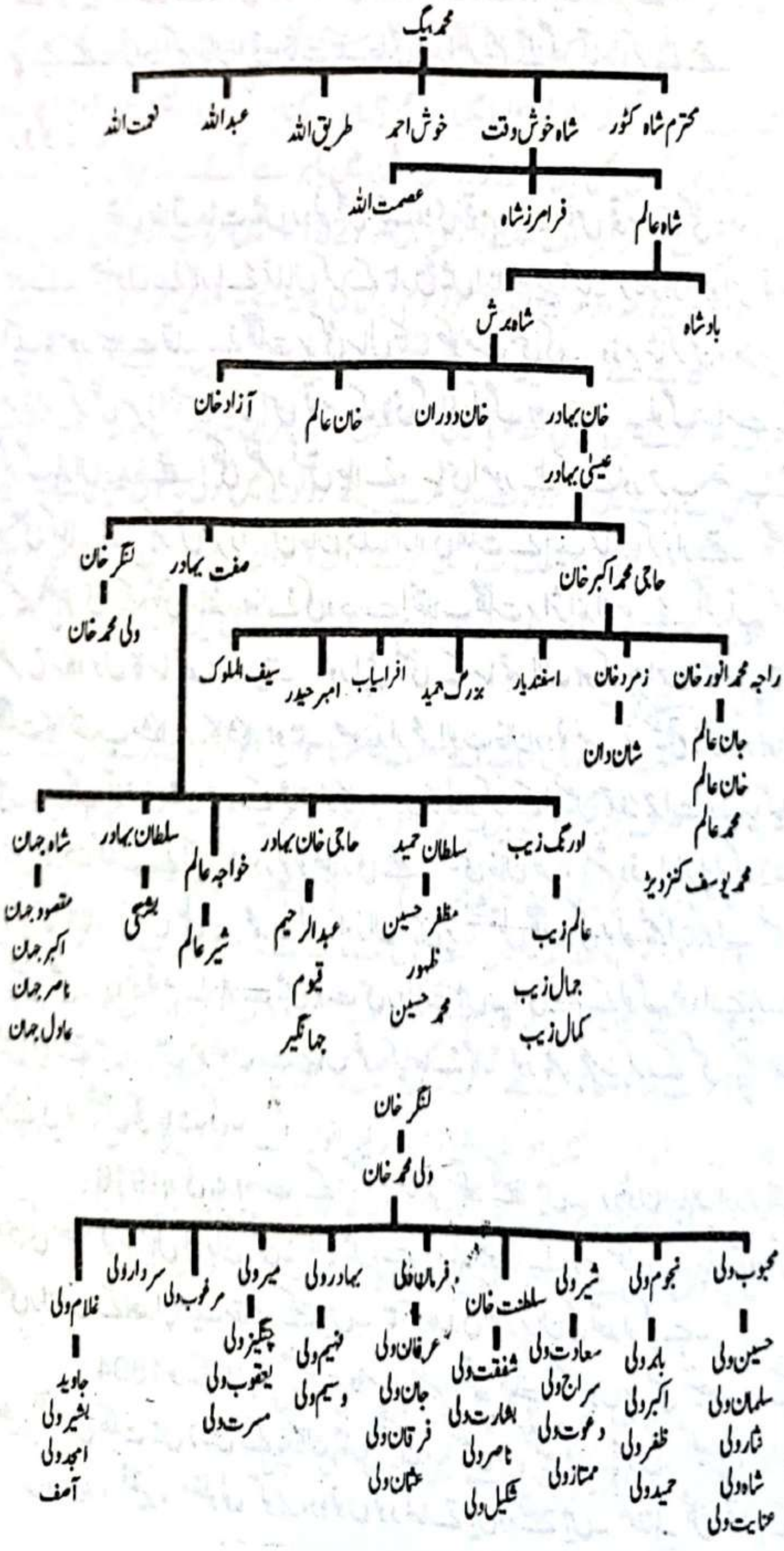


شہباز خان اور محمد عید خان میری ماموں زاد بہنوں کے لڑکے ہیں۔

برشے (مغل):

برشے مغل شاہ برش کی اولاد سے ہیں اور اس وجہ سے برشے کہلاتے ہیں۔ بندوبستی ریکارڈ میں برشے کا شجرہ موجود ہے۔ پونیال کے راجوں اور گورنروں کا سلسلہ ان سے نکلا ہے۔ درشگوم اور گلگت کی ملکی سیاست پر یہ بڑے اثرانداز ہوئے ہیں۔ شیر قلعہ برش حکمرانوں کا مرکز رہا۔ شاہ برش کی اولاد میں سے آزاد خان نے گلگت پر پانچ سال تک حکومت کی۔ یہ آزاد خان ہی تھا۔ جس نے سلیمان شاہ کو شکست دے کر گلگت سے بھاگا دیا تھا۔ پھر سلیمان شاہ کو پکڑوا کر شیر قلعہ میں موت کے گھاٹ اتارا۔ سلیمان شاہ کے ہاتھوں عباس خان اور محمد خان کے قتل کے ساتھ گلگت پر مغلوٹ حکومت ختم ہوئی اس لئے پہلے سلیمان شاہ اور پھر آزاد خان والئی پونیال نے کئی سالوں تک گلگت پر حکمرانی کی۔

برشے شجرہ


محمد بیگ
محترم شاہ کٹور
شاہ خوش وقت
خوش احمد
طریق اللہ
عبداللہ
نعمت اللہ
شاہ عالم
فرامرز شاہ
عصمت اللہ
بادشاہ
شاہ مدش
خان بہادر
خان دوران
خان عالم
آزاد خان
عیسیٰ بہادر
حاجی محمد اکبر خان
صفت بہادر
لنگر خان
ولی محمد خان
راجہ محمد انور خان
زمرد خان
اسفندیار
بزرگ حمید
افراسیاب
امبر حیدر
سیف الملوک
جان عالم
خان عالم
محمد عالم
محمد یوسف کنزدیڑ
شان دان
اورنگ زیب
سلطان حمید
حاجی خان بہادر
خواجہ عالم
سلطان بہادر
شاہ جہان
عالم زیب
جمال زیب
کمال زیب
مظفر حسین
ظہور
محمد حسین
عبدالرحیم
قیوم
جہانگیر
شیر عالم
ہاشمی
مقصود جہان
اکبر جہان
ناصر جہان
عادل جہان
لنگر خان
ولی محمد خان
محبوب ولی
نجوم ولی
شیر ولی
سلطنت خان
فرمان علی
بہادر ولی
میر ولی
مرغوب ولی
سردار ولی
غلام ولی
حسین ولی
سلمان ولی
نثار ولی
شاہ ولی
عنایت ولی
بابر ولی
اکبر ولی
ظفر ولی
حمید ولی
سعادت ولی
سراج ولی
دعوت ولی
ممتاز ولی
شفقت ولی
بشارت ولی
ناصر ولی
شکیل ولی
عرفان ولی
جان ولی
فرقان ولی
عثمان ولی
نعیم ولی
وسیم ولی
چنگیز ولی
یعقوب ولی
مسرت ولی
جاوید
بشیر ولی
امجد ولی
آصف

راجہ حاجی محمد اکبر خان گورنر پونیال میرے والد کے حقیقی ماموں حاجی عبدالکریم کے قریبی دوست تھے۔ حج کے ساتھی ہونے کے ناتے وہ ایک دوسرے کو دل وجان سے چاہتے تھے۔ راجہ اکبر خان اپنی وفات تک حاجی عبدالکریم کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔

رونو :

شمالی علاقہ جات میں رونو بھی ایک بڑی قوم ہے۔ اس قوم کے کئی نامور افراد ہوئے۔ جنہوں نے کارہائے نمایاں کر کے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا۔ ریشو وزیر جو اس قوم کا ایک نامور سپوت تھا۔ نے گلگت پر کئی سال تک حکومت بھی کی۔ وزیر شاکرین، وزیر شاہ مرزا، کرنل مرزا حسن خان اس قوم کے نامی گرامی لوگ ہوئے۔ یہ لوگ سیاست کے گرگ باراں دیدہ تھے۔ ملکی نظم و نسق چلانے، سیاسی امور طے کرنے اور حرب و ضرب کے دھنی کہلائے۔ کرنل مرزا حسن خان جنگ آزادی گلگت کے ایک نمایاں کردار تھے۔ چھٹی کشمیر انفنٹری کے کمپنی کمانڈر ہونے کی وجہ سے انقلاب گلگت پر اثرانداز ہوئے۔ اگر آپ کس طرح سکاؤٹوں کا ساتھ نہ دیتے۔ اور اپنی کمپنی کے ساتھ الگ ہو کر مزاحمت کا سوچتے تو گلگت کا انقلاب مشکلات کا شکار ہوتا۔ صوبیدار محمد ایوب خان رونو میرے حقیقی خالہ زاد بھائی ہیں۔ جنگ آزادی میں ان کے شاندار کارناموں کا لحاظ کر کے انہیں تمغۂ جرات عطا کیا گیا۔ وزیر محمد شفا گلگت کے ایک نامور پولو کھلاڑی تھے۔ عیسیٰ خان کھر، مشروف اولڈ پولو گراؤنڈ، وزیر محمد شفا، فرمان علی میر محمد وبولیوبر اور ان بسین پر مشتمل گلگت کی پولو ٹیم اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ رونو قوم کے بارے میں بہت سی روایات ہیں۔ اس قوم کے لوگ خود اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ ان حوالوں سے یہاں غور کیا جائے گا۔ اور پھر تجزیہ کر کے کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔

1916ء کی بندوبست کے مہتمم ٹھاکر سنگھ لکھتے ہیں۔ رونون سابقہ ادوار میں انتہائی معزز قوم خیال کی جاتی تھی۔ ان میں سے عموماً راجوں کے وزیر منتخب کئے جاتے وہ آج بھی راجوں کے بعد اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ تاہم عددی طور پر ان کی تعداد کم ہے۔

1894ء کے نائب مہتمم بندوبست امیر سنگھ مختلف قوموں پر کسی تبصرے کے بغیر تحصیل گلگت میں زمین کے مالکان میں یشکن، شین، کشمیری، مچھون، کمین، راجہ برس، سید، فقیر، مغلوٹو، گوجر، دونوں کو دکھاتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔ بمقابلہ کُل اقوام کے

زیر قبضہ یشکن رقبہ زیادہ ہے۔ اور اوس سے کم بہ قبضہ شین و کشمیری و کمین و سید ہے۔ باقی اقوام مجھون وراجہ برس و فقیر و مغلوتو، گوجر و رونون کے قبضہ میں بہت ہی کم زمین ہے۔

پروفیسر احمد حسن دانی اپنی کتاب " ہسٹری آف ناردرن ایریاز آف پاکستان میں لکھتے ہیں یہاں کی آبادی چار قوموں میں منقسم ہیں۔ شین، یشکن، کمین اور ڈوم ان کے ساتھ کچھ اور قومیں بھی ہیں۔ رونو جو اس وطن میں باہر سے آئے۔ وزیروں کی قوم ہے۔ ملوی رپورٹ اور گزیٹیر آف گلگت ایجنسی میں جو 1927ء میں مرتب ہوئی میں لکھا گیا ہے کہ یہ راجوں کے بعد دوسری انتہائی معزز قوم خیال کی جاتی ہے۔ وزیر (اگرچہ لازماً نہیں) رونو خاندان سے لئے جاتے ہیں۔ یہ نگر گلگت اور پونیال میں کم ہیں۔ جیسے جیسے مغرب کی طرف سفر کرتے ہیں ان کی تعداد یاسین، مستوج، اور چترال میں بڑھتی جاتی ہے۔ وہ اپنے تشخص کے بارے میں دو روایات بیان کرتے ہیں۔ دونوں میں کوئی نہ کوئی سچائی ہے۔ ایک روایت کے مطابق کسی سوملک کے تین لڑکے ژون، رون، اور ہرائی تھے۔ یہ سوملک مستوج کا حکمران تھا۔ دوسری روایت کے مطابق وہ عرب النسل ہیں اور محمد حنیفہ بن حضرت علی کی اولاد سے ہیں۔

گلگت اور شنا زبان کتاب کے مصنف ڈاکٹر ناموس رونو قوم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"رونو کے صرف چند گھرانے ہیں۔ کوئی دو ڈھائی سو گھر۔ ان کی آبادی کچھ تو نگر اور گلگت ایجنسی میں ہے۔ پونیال اور یاسین میں تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ ان کا احترام شین سے بھی زیادہ کیا جاتا ہے۔ چونکہ عہد قدیم میں تخت و تاج کے مالک تھے۔ ہر وادی کے راجہ لوگ بہت سی شادیاں کر لیتے تھے۔ ہر علاقہ کا راجہ حاکم کل تھا۔ اس کو کامل اختیار حاصل تھا۔ وہ رانیاں جو کسی دوسرے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی اولاد گشپور کہلاتی تھی۔ وہ بیویاں جو کسی راجہ کی بیٹیاں نہیں ہوتیں بلکہ زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں ان کی اولاد رونو کہلائی۔ وہ ایک الگ فرقہ بن گیا۔ اور انہوں نے آپس میں شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ آج کل یہ رواج نہیں ہے۔ راجہ عموماً ایک یا دو بیویاں منکوحہ رکھ لیتا ہے۔

خلافِ شرع تو اب شیخ تھوکتا بھی نہیں،
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

(اکبر الہ آبادی)

عامل تو یہ اس کا غیر تحریری فعل ہے۔ جس کا ہر شخص مرتکب ہو سکتا ہے۔ سکھوں کے آنے کے بعد (1842ء) پہلے ڈوگروں کی حکومت ہوئی۔ پھر انگریزوں نے دبدبہ جمایا تو تاریخ کی کتابوں میں یا جائیداد کے مقدموں میں یا حق وراثت کے پرچوں میں انہوں نے راجگان کے نام کے سامنے چند بیویوں کے نام تو ایسے لکھے جن کو منکوحہ قرار دیا۔ ان کی اولاد جاکر اور جائیداد کی وارث بیویوں کا ایک دوسرا طبقہ غیر منکوحہ قرار دیا۔ اگرچہ ان سے ہر ایک راجہ کے پاس مستقل بیوی کے فرائض سر انجام دیتی تھی۔ مگر ان کو رانی قرار نہیں دیا۔ بلکہ ہوس رانی کا تختہ مشق۔ رانی سے مہترانی بنادیا۔ ان کو غیر منکوحہ لکھا ہے۔ اور اولاد کو حرامی قرار دیا۔ یہ فرنگی حرف پہلووار کا کرشمہ ہے۔ غرض یہ کہ گدی کے لئے یہ جھگڑا نہ کریں اور جائیداد کے وراث نہ ہوں۔ مگر اسلامی فقہ کے مطابق دنیا میں کوئی شخص حرامی نہیں۔ جب اس کی ماں کا نکاح ہو چکا ہے۔ جس شخص کی وہ ظاہری اولاد ہے وہ اس کی اولاد مانا جاتا ہے۔ اور یہ فرض کیا جاتا ہے کہ جب عورت کے ساتھ زوجیت کے تعلقات قائم ہیں تو وہ اس کی بیوی ہے۔ بیوی یا میاں فقہ میں قابل گرفت ہیں۔ مگر اولاد حرامی نہیں کہلائے گی۔ راجہ لوگ اس اولاد کو اپنی حیات میں اپنی طرف سے ہمیشہ اتنی جائیداد دے دیا کرتے تھے۔ زمین، مکان وغیرہ کہ ان کے نان نفقہ کے لئے تازیست کافی ہو جائے۔ ہم نے رونو فرقہ کے وجود میں آنے کا ذکر جو کیا تو وہ انگریزوں کے آنے سے پہلے کی بات ہے۔ جب یہ واجب، غیر واجب کی تفریق پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بیچ میں انگریز کے فروغ کا دور آ گیا۔ آج کل پاکستان ہے۔ تو سب اولاد حلالی اور اپنے اپنے وقار کے مطابق حقدار۔ ڈاکٹر صاحب اسی کتاب کے صفحہ 53 میں " راجہ " کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ " راجہ لوگ کسی زمیندار یا بیکار کے گھر پر ہاتھ رکھ دے تو اولاد عہد قدیم میں "رونو" کہلاتی تھی۔ عہد انگریز میں حرامی اور عہد پاکستان میں مسلمان شریف مگر ان بیٹوں کا تعلق ریاست حکومت یا خاندان سے نہیں ہوتا۔"

ٹرائبز آف ہندو کش۔ میجر جان بڈلف کی بڑی اہم کتاب ہے۔ جان بڈلف 1877ء تا 1881ء حکومت سنٹرل انڈیا کی طرف سے گلگت میں سپیشل ڈیوٹی پر تعینات تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ایک پورا باب " ذاتیں " انتظام کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ انہوں نے دردستان میں ذاتوں کی تقسیم کا ایک گوشوارہ بھی دیا ہے۔

علاقہ	رونو ژون ہرائی	شین	برش یشکن	کرمین ڈوم شونو اور استاد
کولی	-	94%	4%	1.1/2%
پالس	-	50%	40%	10%
پٹن، سیئو	-	90%	-	10%
دوبیر/کنڈیا	-	30%	20%	50%
ہربن/سازن	-	64%	3%	33%
تانگیر	-	60%	25%	15%
داریل	-	25%	50%	25%
چلاس	-	50%	16%	34%
گور	-	65%	30%	5%
استور	-	10%	78%	12%
سئی	-	30%	65%	5%
گلگت	6%	35%	55%	4%
نگر	5%	20%	60%	15%
ہنزہ	-	5%	80%	15%
پونیال	2%	30%	55%	13%
ورشکوم	چند خاندان	-	زیادہ تر تعداد	چند گھرانے
پونیال تا چھاشی۔ سے اوپر	-	-	زیادہ تر تعداد	چند گھرانے
وادی چترال	300 گھرانے	-	-	200 گھرانے

پھر وہ رونو قوم کے بارے میں لکھتے ہیں۔ " بہت محترم ذات رونو کی ہے۔ جہاں کہیں یہ لوگ ہیں۔ حکمرانوں کے بعد ان کا درجہ آتا ہے۔ وزیر (اگرچہ ضروری نہیں) ان ہی سے لئے جاتے ہیں۔ نگر، گلگت، اور پونیال میں یہ کم تعداد میں ہیں۔ اگر کوئی یاسین، مستوج مغرب کی طرف سفر کرے۔ ان کی تعداد بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔ چترال میں اس

کے تین سو خاندان ہیں۔ نگر اور یاسین میں وہ اپنے آپ کو ہراوو، چترال میں ژندرا کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایک ہی نسل سے ہیں۔ کچھ واخاں اور سریکول میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جہاں پر یہ خیبر خطار اور شگنن میں وہ گنبا لک حظار کہلاتے ہیں۔ جہاں کہیں وہ ہیں وہ معزز خیال کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنے بارے میں دو روایات بیان کرتے ہیں جن میں کچھ نہ کچھ سچائی ملتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق وہ ژون، رون، اور ہرائی تین بھائیوں کی اولاد ہیں۔ جو سوملک حکمران کے بیٹے تھے۔ یہ سوملک رئیسے حکمران کی آمد سے پہلے مستوج میں حکمران تھا۔ دوسری روایت کے مطابق وہ عربی النسل ہیں۔ اور محمد حنیفہ بن علی کی اولاد سے ہیں۔ ان کی قلیل تعداد عام تقسیم اور ہمہ گیر وقعت جو وہ رکھتے ہیں۔ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی روایت ان پر صادق آتی ہے۔ اور یہ ممکن ہے کہ عرب النسل ہوں۔ جو بالائی چترال میں ساتویں صدی عیسوی میں عربوں کے بدخشاں پر قبضہ کے دوران آباد ہو گئے ہوں۔"

" ان وادیوں میں عربی النسل ہونے کے عام دعوے ہیں۔ لیکن کسی بنیاد کے بغیر دوسرے ایک بیان کے مطابق وہ پونچھ کے نزدیک راجوڑی سے آئے ہیں۔ اور تین بھائیوں سردنگ، سوردنگ، اور کنگر ہیتول کی اولاد سے ہیں۔ ظاہری طور پر وہ علاقے کی اور لوگوں کے مقابلے میں لمبے قد ہیں۔ وہ بیضوی چہروں ابھرے جبڑے اور کم گھنی داڑھیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اعلیٰ درجے کے راجپوت دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سیدوں اور حکمرانوں کو اپنی لڑکیاں دیتے ہیں۔ تاہم وہ شین یشکن کی لڑکیاں شادی میں لیتے ہیں۔ چترال کے ژندرے اپنی لڑکیاں دیر کے افغانوں کو بیاہ دینے سے انکار نہیں کرتے۔ یہ اپنی لڑکیاں شین اور یشکن کو بہت کم دیتے ہیں۔ داردریاستوں کے حکمران اپنی کنیزوں کی لڑکیاں تو انہیں شادی میں دیتے ہیں۔ مگر شاہی خاندان کی نہیں۔"

ڈاکٹر لٹز دردستان 1866ء 1886ء 1893ء میں لکھتے ہیں۔ "وزیر شین خاندان اور رونو سے بھی لئے جاتے ہیں۔" فریڈرک ڈریو اپنی کتاب دی جموں کشمیر ٹریٹیز میں لکھتے ہیں۔ " میری تفتیش کے مطابق درجوں کے مطابق یہاں ذاتیں اس طرح ہیں۔

1۔ رونو
2۔ شین
3۔ یشکن
4۔ کرمین

5۔ ڈوم

جہاں تک پہلی ذات یعنی رونو کا تعلق ہے۔ اس میں واضح نہیں کہ اس تقسیم کو کوئی اہمیت دوں یا نہ دوں۔ میں نے کسی اور تفصیل میں یہ نام مذکور ہوتے نہیں دیکھا۔ لیکن گلگت میں رونو کے چند خاندان موجود ہیں۔ اور وہ شیوں سے زیادہ محترم مانے جاتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے یہ وقار اپنے اسلاف کے حکمرانی سے حاصل کیا ہو اور اس طرح ان کی تعداد زیادہ نہ پھیلی ہو۔

کرنل شمبرگ اپنی کتاب ہوین دی آکس اینڈ دی انڈس میں لکھتے ہیں۔ " رونو ایک قوم ہے اور ایک ذات نہیں۔ اور یہ یقین کرنے کے لئے وجوہات ہیں کہ جیسے وہ دعویٰ بھی کرتے ہیں مغرب اور عربیہ کی طرف سے آئے مہاجر ہوں۔ اور جن کو میں نے دیکھا ہے یہ اپنے ہم سایوں سے قد کاٹھ، جبڑوں کی ہڈیوں اور عقابی خدوخال کے لحاظ سے جداگانہ ہیں۔"

کرنل ڈیورنیڈ اپنی کتاب "دی میکنگ آف اے فرنٹیر" میں کھو قوم کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "یہ لوگ پورے چترال کے مالک تھے۔ لیکن ان کو رونو جو داردوں میں بہت معزز قوم ہے نے پیچھے ڈال دیا اور کئی دوسرے فائق جماعتوں نے جو بد خشانی خاندانوں کی شاخیں تھیں۔ اور موجودہ حکمرانوں نے ان کے تمام اختیارات سلب کر کے انہیں فقیر مسکین بنادیا۔ جس کے معنی مفلوک الحال کے ہیں۔" پھر وہ لکھتے ہیں۔ "میں یہ سوچنے پر مائل ہوں۔ ایک یشکن آدمی شین سے بہتر لڑاکا ہے۔ اور رونوں کا چھوٹا قبیلہ دونوں سے بہترین ہے۔"

کتاب چترال ایک تعارف از اسرار الدین وغیرہ سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

" تیرھویں صدی کے ابتداء میں شمالی چترال میں کھو حکمران سوملک کی حکومت چترال میں تریکھو، ملکھو اور مستوج سمیت گلگت تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کافر تھا یا مسلمان۔ وہ اپنی شجاعت اور خصوصاً فیاضی کے لئے مشہور تھا اور لوگوں کی دعوتیں کرنے کے بارے میں بہت سی لوک روایات پائی جاتی ہیں۔ اس نے ایک خونخوار ترک یا مغل قبیلہ کو جس کو یار خون کہتے ہیں۔ اور جس نے شمالی چترال میں تباہی مچائی تھی۔ شکست دے کر ملک سے نکالا جس سے اس کی بڑی شہرت ہوئی۔ اور ملک میں ہر دل عزیز ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی وسیع سلطنت اس کے تین بیٹوں میں تقسیم ہوئی۔ ایک بیٹا ژوند شمالی چترال کا

حکمران ہوا اور اس کی اولاد ژندرے نام سے چترال بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک بیٹا رون گلگت کا حکمران بنا یہ خاندان سولھویں صدی عیسوی میں چترال کے مغل خاندان خوش وقتیہ شاخ کے ہاتھوں زوال پذیر ہوا۔ تیسرا بیٹا ہرایو کو ہنزہ کی حکومت ملی۔"

ان اقتباسات سے جو نتائج سامنے آتے ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں۔

1۔ تمام ملکی غیر ملکی اور مقامی مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ رونو شمالی علاقہ جات کے اقوام میں حکمرانوں کے بعد دوسرے نمبر پر آتے ہیں۔

2۔ رونو ایک معزز قوم ہے۔

3۔ رونو شین اور یشکن کے مقابلے میں بہتر مارشل قوم ہے۔

4۔ اس قوم کی اصلیت کے بارے میں درج ذیل نظریے ہیں۔

(i) یہ ایک سوملک جو کہ ترکمان تھا۔ کی اولاد سے ہیں۔ سوملک چترال، مستوج، درشگوم اور گلگت کا حکمران تھا۔ اور چترال کا باسی تھا۔ اس کی وفات پر اس کی حکومت اس کے تین لڑکوں میں تقسیم ہوئی۔ ژوند کو چترال رون کو گلگت اور ہرائی کو ہنزہ کی حکومت ملی۔

(ii) یہ محمد حنیفہ بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد سے ہیں۔ اور عربی النسل ہیں۔

(iii) یہ پونچھ کے قریب راجوڑی سے یہاں آئے اور راجپوت ہیں اور تین بھائیوں سرونگ، سرورنگ اور کنگر چتول کی اولاد ہیں۔

(iv) شاہی خاندان کے افراد نے زمیندار گھرانوں میں شادیاں کیں۔ اس طرح جو اولاد ہوئی وہ رونو کہلائی۔

(v) ژندرے، رونو، ہرایو، خیبر خطار، کنبالک حظار، سب ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔

(vi) گلگت، نگر اور پونیال میں ان کی تعداد کم ہے۔ لیکن جیسے جیسے مغرب کی طرف جائیں ان کی تعداد بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔

(vii) رونو لمبے اور بڑے قد کاٹھ کے لوگ ہیں۔ ان کے چہرے بیضوی اور چہرے کی ہڈیاں باہر کو ابھری ہوئی ہوتی ہیں۔

(viii) یہ خشخشی داڑھیاں رکھتے ہیں۔

(ix) یہ نگر، گلگت، پونیال، چترال، یاسین، سریکول، واخان، شگنن میں ملتے ہیں۔

گلگت میں اس قوم کے افراد رونو، رانا اور جرال کے وصفی اور نسبی نام استعمال

کرتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے رانا ایسو سی ایشن بنائی ہے اور اب رانا بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔

مجھے ایک پرانا فرد جمع بندی کا غذ ملا ہے۔ جس میں اس قوم کے ایک فرد دینار ولد مرزا کے لئے رونو اور جرال دونوں اصطلاحیں استعمال کی گئیں ہیں۔ واضح طور پر یہ تحریر غلط ہے۔ کیونکہ رونو جرال دو متضاد قومیں ہیں۔ رونو یہاں کی قدیم قوم ہے اور جرال بدیسی گوت ہے اور جدید دور میں اس کا یہاں استعمال شروع ہوا ہے۔ جرال قوم کے بارے میں یہاں جو غلط تعبیریں رائج تھیں۔ ان کی تفصیلات آگے پیش کی جا چکی ہیں۔ جرال راجپوتوں کی درجہ دوم کی قوم ہے اور راجوڑی کی طرف آباد ملتی ہے۔ جرال رانا بھی کہلاتے ہیں۔ نہ صرف جرال رانا کہلاتے ہیں بلکہ پنجاب میں نون قوم بھی رانا کہلاتی ہے۔ تاریخ میں رانا سانگا بہت مشہور ہوئے ہیں۔ جنہوں نے کنواہہ کی لڑائی میں بابر کا مقابلہ کیا تھا۔ رانا کا خطاب کچھ اور راجپوت قومیں بھی استعمال کرتی ہیں۔

گلگت میں 94-1893ء کی اولین بندوبست میں جو بندوبستی ریکارڈ مرتب ہوا۔ اس میں اس قوم کو رونو قرار دیا گیا پھر 16-1914ء کا بندوبستی ریکارڈ تیار ہوا اسکو رونو کے زیر عنوان قلمبند کیا گیا۔ اس طرح تمام مردم شماری ریکارڈ میں بھی محض رونو کے تذکرے ملتے ہیں۔ لیکن جرال کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ جدید کاغذات میں راجوڑی سے آئے جس جرال خاندان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا سابقہ ابواب میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

اب دونوں کی اصلیت سے متعلق نظریات پر غور کرتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ کونسا نظریہ زیادہ وزنی اور قرین قیاس اور کونسا کمزور ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر ناموس اور مقامی کچھ لوگوں کا یہ نظریہ کہ یہ کسی زمیندار خاندان کی خاتون یا قمہ عورت اور شاہی افراد کی منکوحہ یا غیر منکوحہ اولاد ہے۔ ایک بے بنیاد مفروضہ ہے۔ ارغون افراد کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ گیشور اور ارغون گشپور کا فرق بھی بیان ہوا ہے لیکن رونو خاندان کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے مقامی تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں ملی کہ رونو اس قبیلہ کی کوئی قوم ہے۔ رونو کے بارے میں کچھ سابق حکمران حلقوں میں تعصبات نے جنم لیا تھا۔ کیونکہ اس قوم کے افراد نے درشگوم، مستوج اور چترال کے حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے ان حلقوں نے انتقاماً مفروضے عام کئے کہ یہ راجوں کی غیر منکوحہ اولاد ہے۔ جب گلگت میں مغلوث حکومت کا خاتمہ ہوا تو سلیمان شاہ، آزاد خان، گوہر امان، ملک امان

وغیرہ حکمرانوں کے وزیر رونوں میں سے لئے جانے لگے۔

تاریخ میں اس قوم کا ایک معروف شخصیت ریشو، تراخانی دور میں وزیر رہا۔ اور پھر ایک ایسا دور بھی آیا جب ریشو نے گلگت کے تراخانی حکومت حاصل کی۔ اور ایک لمبے عرصے تک گلگت کا مختار کل حکمران بنا۔ راجہ شاہ رئیس خان اپنی تاریخ میں وزیر ریشو کو کوڑ نمک، قرم ساق یعنی بھڑوا، دیوث، غدار اور کیا نہیں کہتا۔ حالانکہ تاریخ میں چنگیز خان، ہلاکو خان جیسے عظیم فاتحوں کو جنہوں نے انسانی کھوپڑیوں سے مینار تعمیر کئے کسی نے بھی وہ غیر شائستہ زبان اختیار نہیں کی جو شاہ رئیس خان نے اختیار کی ہے۔ ان ہی وجوہات کی وجہ سے کہ یہ مغرب کی طرف سے آئے اور حکمرانوں کے وزیر رہے اور یہ وزیر ریشو نے جوار ی سے حکومت حاصل کر کے گلگت میں حکمرانی کی تھی۔ رونو قوم کے خلاف انتہائی سخت جذبات کا اظہار کیا گیا۔ اور اس قوم کے بارے میں ایسی بے سروپا باتیں پھیلائی گئیں کہ جن کی کوئی بنیاد نہ تھی۔ تاریخ سے انسان کو سبق سیکھنا چاہئے۔ میں آگے دل اینڈ ڈیورنیٹ کے نظریات پیش کر چکا ہوں۔ قوموں کے ابتدا کے بارے میں اگر وہ ساری باتیں کھول دی جائیں۔ تو اس حمام میں سب ننگے نظر آئیں گے۔

دل اینڈ ڈیورنیٹ کے الفاظ میں ایک دوسرے کے بارے میں جو قیاسات ہیں۔ انہیں صبر و تحمل سے برداشت کرنا سیکھنا چاہئے۔ مجھے اس تحقیق کے دوران کوئی ایسا فرد نہیں ملا۔ جس نے اپنی قوم کو محیر العقول قرار نہ دیا ہو۔ اور محیر العقول کارنامے نہ گنوائے ہوں۔ ڈوم ہو یا شوٹو ہو۔ حجام ہو یا چمار سب کے پاس اپنی قوم کی بڑائی کے بارے میں وجوہات موجود ہیں۔ ہمیں صبر و سکون کے ساتھ ان کو سننا چاہئے۔ میں کہیں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ جنوبی ہند میں تاریخ میں ادنیٰ قرار دی جانیوالی بعض قوموں نے منظم حکمرانیاں کی ہیں۔ ڈوموں کی وزارت کے بارے میں بھی کہیں لکھ چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ یہ اسی کا اختیار ہے۔ ہمیں لوگوں کو محض اپنے تعصبات یا تنگ نظری کے باعث حقیر بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ کسی کو بھی حکومت یا وزارت یا عقل و دانش یا اعلیٰ فکر ملے۔ یا علم و فضل ملے۔ اور وہ اچھا عمل بھی کرتا ہے تو وہ بڑا ہے۔ بلا لحاظ اس کے کہ وہ کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ بہر حال رونو کے بارے میں غیر منکوحہ اولاد ہونے کا نظریہ تعصبات کی بنیاد پر پھیلایا گیا اور اس لئے اسے کوئی پذیرائی نہیں ملی۔ رونو اقوام کے افراد نے اپنی روایات کو قائم رکھا۔ بُرے کس قوم میں نہیں ہوتے۔ قتل کرنا، چوری، رشوت

خوری، وغیرہ قبیح افعال بااختیار لوگوں میں زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ غریب کی جورو سب کی بھابی، بس غریب پر سب کا حق چلتا ہے۔ لیکن بااختیار پر کسی کا کوئی بس نہیں چلتا۔

رونو کے بارے میں دوسرا نظریہ اس کا محمد حنیفہ حضرت علی کی اولاد ہونے کا ہے۔
اس حوالے سے یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوپاکستان میں عرب ہونے کا دعویٰ سب کرتے آئے ہیں۔ بعض محققین نے اس نظریے پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ کہ یہ نظریات کیوں پیدا ہوئے۔ واضح طور پر یہ محض قوموں کی باہمی بڑائی کی دوڑ تھی۔ کہ قوموں نے اپنے آپ کو بڑا دکھانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ افغانوں نے مغلوں پر اپنی بڑائی جتانے کے لئے بڑے منظم انداز میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ سامی ہیں۔ باہر سے آنے والے بہت سے لوگوں نے اپنے آپ کو سید قرار دیا کیونکہ مسلمانوں کا اس قوم کے لئے جو احترام تھا اس کے نتیجے میں انہوں نے بہت سے مراعات سے استفادہ کیا اور ایک غیر وطن میں اپنے پاؤں مضبوطی سے جمائے۔ اس طرح سکندر اعظم کی اولاد ہونے کا خبط ہر کسی میں ہے کوئی خالد بن ولید کی اولاد بنتا ہے۔ کوئی صلاح الدین ایوبی کی، کوئی طارق بن زیاد اور کوئی قتیبہ بن مسلم کا کیونکہ ان لوگوں کا تاریخ میں بڑا مقام تھا۔ لیکن ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ ایسا بن کر خود کیا کردار پیش کر رہے ہیں۔ اور خود کس سطح کے لوگ ہیں۔ ان کی سوچ کتنی پست ہے کیا ان کی کوئی اعلیٰ فکر ہے۔ کیا ان میں خوبی کی ایک رمق بھی ان جلیل القدر شخصیات کی موجود ہے۔ نہیں تو فخر کس بات کا۔

بہر حال رونو اقوام محمد بن حنیفہ کی اولاد نہیں اور اس کے لئے وہ کوئی مضبوط دلیل بھی نہیں رکھتے۔ اور نہ تاریخ میں کوئی مستند روایت موجود ہے۔

جہاں تک راجوڑی سے آنے اور جرال ہونے کے نظریات ہیں۔ یہ نظریات کوئی قدامت نہیں رکھتے اور جدید دور کی پیداوار ہیں۔ جرال راجپوتوں کی ورجہ دوم کی قوم ہے۔ یہ رانا کہلاتی ہے۔ لیکن قدیم بندوبستی ریکارڈ میں محض رونو کا تذکرہ ملتا ہے پھر جب قدیم زبانی روایات پر غور کیا جاتا ہے۔ تو جرال کی کوئی تشریح نہیں ملتی کہ اس قوم کے افراد نے اپنے آپ کو جرال قرار دیا ہو۔ نیز رونو قوم مشرق و جنوب کی طرف بہت کم تعداد میں ملتی ہے۔ اور جیسے جیسے ہم مغرب کی طرف جائیں۔ تو ان کی تعداد میں اضافہ دکھائی دیتا ہے۔ لامحالہ ان کا مرکز مغرب کی طرف مستوج، چترال، درشگوم، واخان، سریکول کے حدود کے اندر نظر آتا ہے۔ ان علاقوں میں اس قوم کا احترام بھی موجود ہے۔ اگر یہ لوگ راجوڑی سے

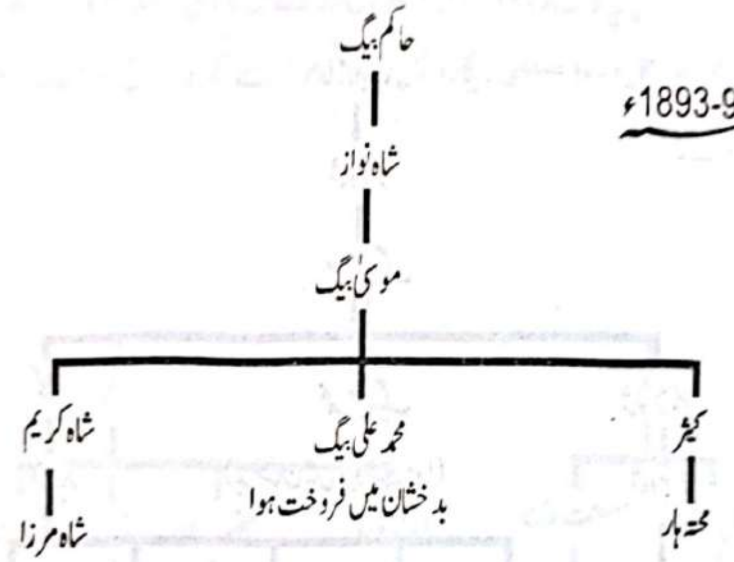
آئے ہوتے تو جنوب کی طرف ان کی تعداد زیادہ ہونی چاہئے تھی۔ جبکہ جنوب اور مشرق کی طرف جیسے کہ بڈلف نے اعدادو شمار پیش کیے ہیں۔ یہ لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پھر شمال، مغرب کی طرف آباد رونو اس نظریے کی حمایت کرتے نظر نہیں آتے۔ اور نہ یہ نظریہ ان کا پیش کردہ ہے۔ راجوڑی سے آنے کا نظریہ گلگت والوں کا پیش کردہ ہے۔ لہذا یہ نظریہ کوئی وزن نہیں رکھتا۔

ان باتوں میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ شین، یشکن، یا دیگر اقوام سے جسمانی ساخت کے اعتبار سے منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ یہ جسیم ہوتے ہیں۔ لمبے قد کاٹھ اور بیضوی چہرے رکھتے ہیں۔ اور ان کے جبڑے کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کی داڑھیوں کے بال گنجان ہوتے ہیں۔ اور مغلوں جیسی خشخشی داڑھیاں رکھتے ہیں۔ یہ خواص کافی انفرادیت کے حامل دکھائی دیتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ یہ کسی حکمران کی اولاد ہے۔ مرور زمانہ کے ساتھ جب انہوں نے اقتدار کھویا تو پھر وزارت و مشاورت، لمبرداری وغیرہ کی ذمہ داریاں ورثہ میں ملنے لگیں۔ میرے نزدیک سوملک ایک ترکمان سردار تھا۔ اور یہ مسلمان بھی نہیں تھا جو کہیں باہر سے چترال آیا اور اقتدار حاصل کیا۔ اس کی حکومت گلگت، درشگوم، چترال بلکہ واخان تک کے علاقوں پر مشتمل تھی۔

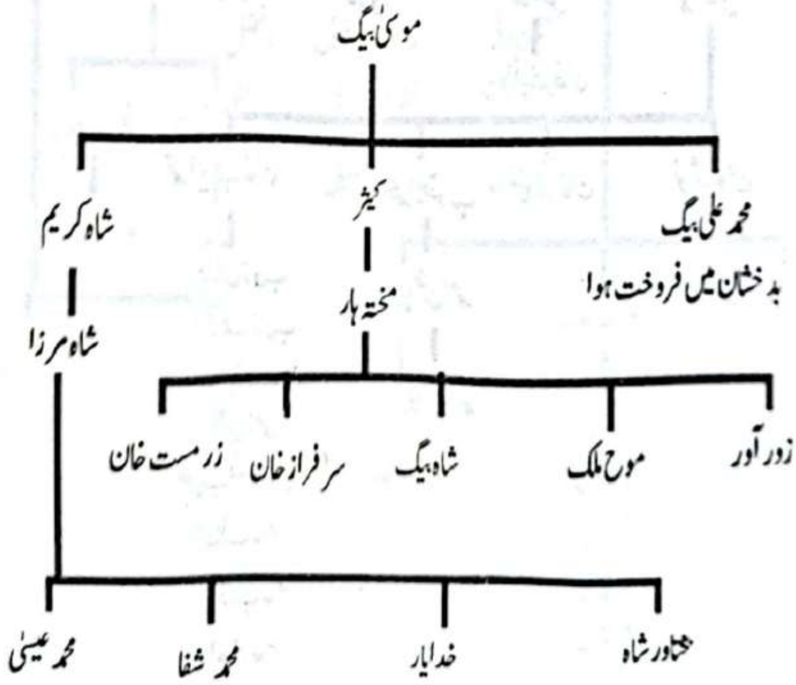
یہ ایک نامور حکمران تھا اور اس کی سخاوت فیاضی، دلیری اور اعلیٰ انتظام سلطنت کی دھوم دور دور تک تھی۔ اس کے تین لڑکے ژون، رون، اور ہرایو ہوئے۔ اس کی وفات پر اس کی حکومت ان تین لڑکوں میں تقسیم ہوئی۔ رون کو گلگت کی حکومت ملی اور اسی کے نام پر یہ قوم رون سے رونو کہلائی۔ دوسرے علاقوں میں اس قوم کے افراد ژون سے ژوندرے، خبر حظار یا گئی بایک یا ہرایو کہلانے لگے۔ اس قوم کے شمال مغرب کی طرف بسنے والے افراد رونو کو اپنا سمجھتے بھی ہیں تو ہمیں یہ نظریہ زیادہ وزنی نظر آتا ہے۔ کہ یہ ترکمان سردار سوملک کی اولاد ہے اور اس حوالے سے اسے راجپوت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمیں رانا یا جرال کی اصطلاحوں پر زیادہ گہرائیوں میں جانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ رونو کا اپنا ایک مقام ہے اسے راجوں کے بعد یہاں کے اقوام میں جو درجہ دیا جاتا ہے وہ قائم ہے۔ یہاں رونو کے چند خاندانی شجرے دیئے جا رہے ہیں۔

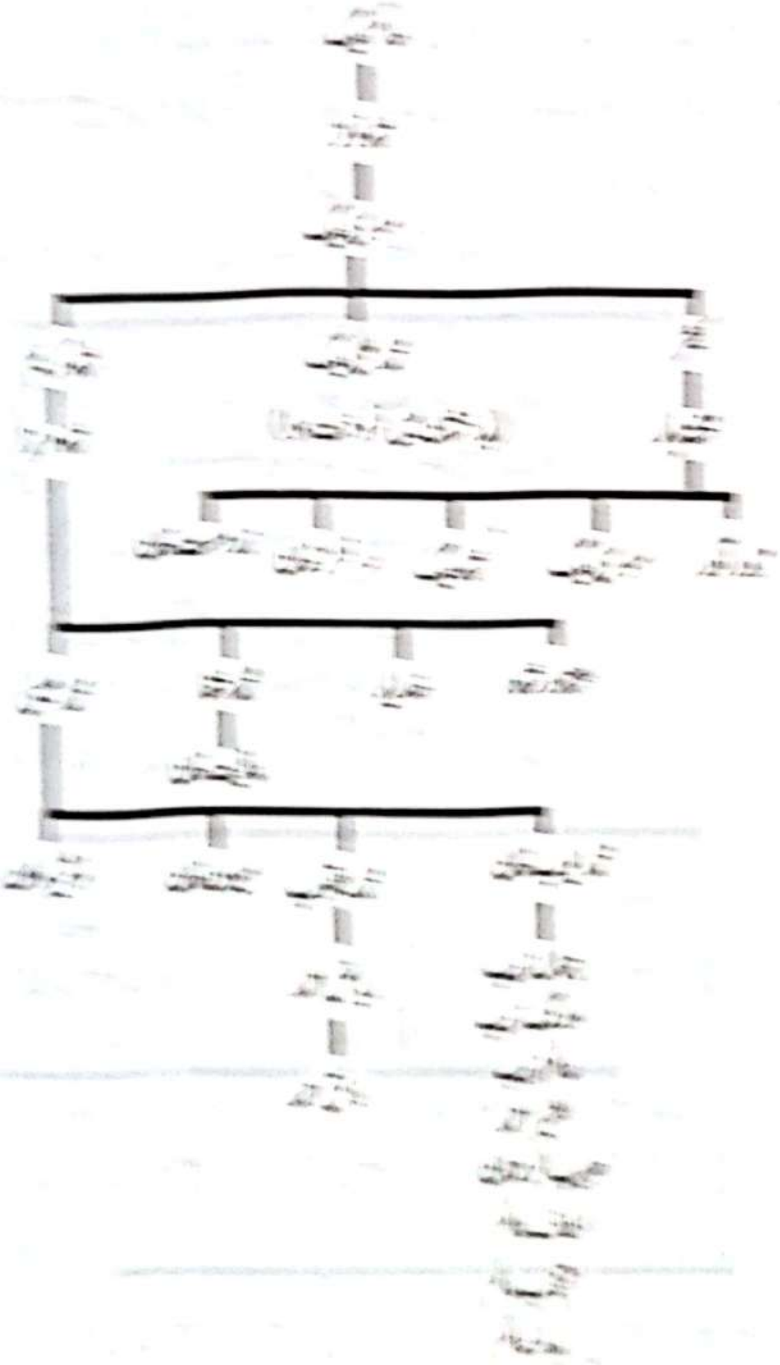
وزیر شاہ مرزا کا شجرہ

1893-94ء

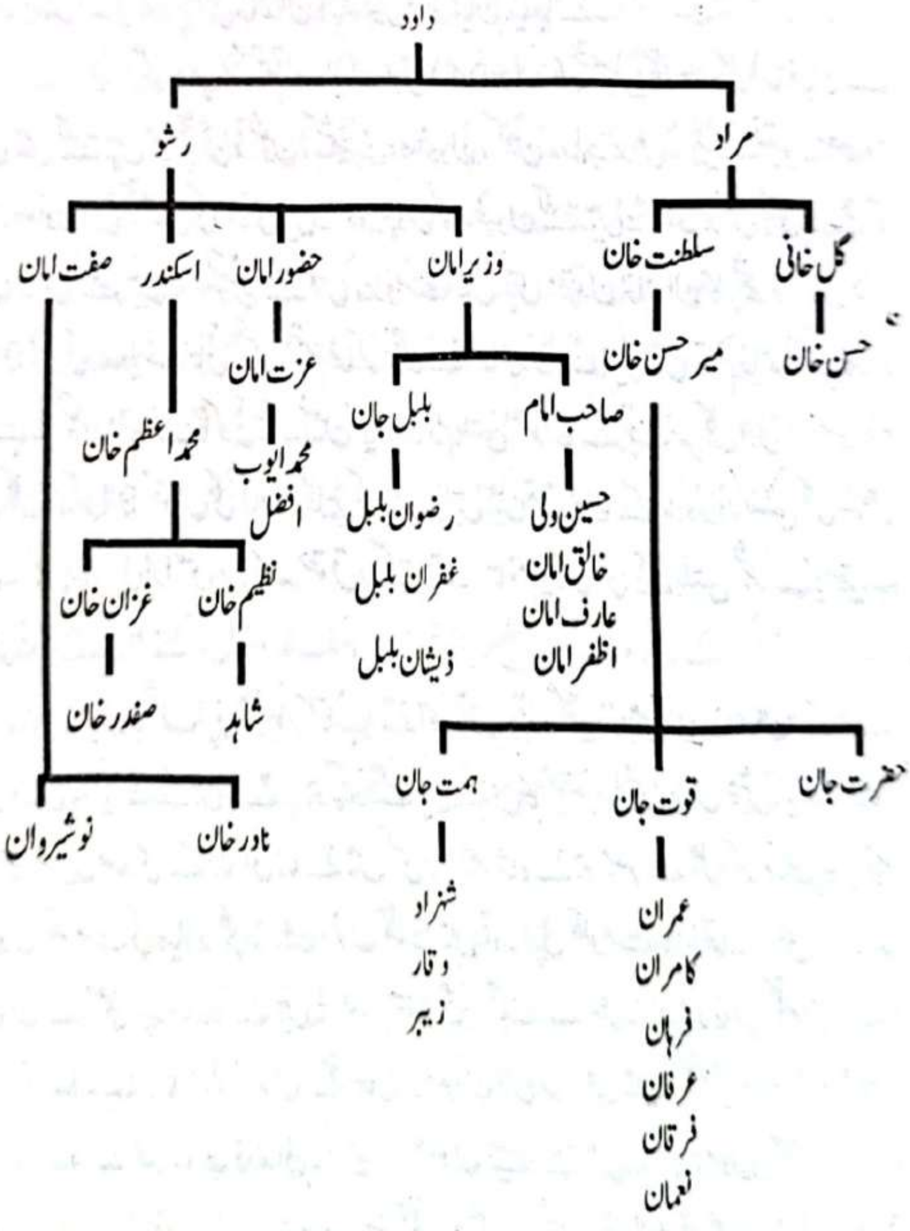


1916ء کی بندوبست میں شجرہ اس طرح دیا گیا تھا۔





نہیں دیکھی ہے یہ ضرب المثل اس وقت استعمال کرتے ہیں۔ جب کوئی اپنی مراد پوری ہوتے نہیں دیکھتا۔ بہر حال یہ لوگ ریشو وزیر کی اولاد ہیں اور مجھے ان کا کوئی مستند شجرہ کسی ریکارڈ میں دستیاب نہیں ہو سکا۔ بندوبستی ریکارڈ میں رشو اور مراد سے شجرہ شروع ہوتا ہے۔ اور یہی مستند شجرہ ہے۔



مقپون :

مقپون بلتستان کی ایک حکمران قوم رہی ہے۔ اس قوم نے بلتستان پر کئی سالوں تک حکومت کی ہے۔ اس خاندان کے علی شیر خان انچن، مقپون بوخا جیسے بڑے حکمران بھی ہوئے۔ گلگت کے بندوبستی ریکارڈ میں مقپونوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس لئے مناسب خیال کیا گیا کہ یہاں اجمالی طور پر اس خاندان کا کچھ پس منظر بیان کیا جائے۔

امیر سنگھ نائب مہتمم بندوبست اول (1894ء) تحصیل گلگت کے اسامیان کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ یشکن، شین، کشمیری، مخپون، کمین، راجہ برس، سید، فقیر، مغلوٹو، گوجر رونون اس تحصیل کی اسامی ہیں۔ وہ مقپون کو مخپون لکھتے ہیں۔ راجہ برش یعنی برشے کو راجہ برس لکھتے ہیں۔ لیکن مجھے اس بندوبست میں کسی مقپون خاندان کا شجرہ نہیں ملا۔ 1916ء کی بندوبست ثانی کے مہتمم ٹھاکر سنگھ نے اسامیوں کے ذیل میں تمام خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن مقپونوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ تاہم بلتی عنوان کے تحت سرکل اول ودوم وسوم میں کل ملا کر 91 نفوس کی آبادی ظاہر کی ہے۔ اس میں مقپونوں کے علاوہ اور بلتی بھی شامل ہیں۔ جو یہاں کی اراضی پر مالکانہ حقوق رکھتے تھے۔ تاہم یہاں بھی مجھے بلتی شجرے دستیاب نہیں ہوئے۔

جان بڈلف اپنی مشہور کتاب "ٹرائبز آف ہندوکش" میں اس خاندان کے بارے میں مقامی روایات کے بل بوتے پر جو کچھ کہتے ہیں۔ اس کا مختصر سا نچوڑ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ کہ تیرھویں صدی کے ابتدائی زمانے میں کسی ابراہیم شاہ نے جو مصر سے چل کر یہاں پہنچا تھا۔ مقپون حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان دنوں گلگت میں آذر اپنی حکومت بنا رہا تھا۔ تبتی زبان میں مقپون کے معنی سپہ سالار کے ہیں۔ اور یہ لفظ چینی تنگ کے مشابہ ہے اور غالباً تھم اسی تنگ کا بگڑا ہوا لفظ ہے۔ تاہم نو نسلوں کے بعد لفظ مقپون اس خاندان میں مستعمل ہونا شروع ہوا۔ ابراہیم شاہ کے بعد سات خاندانی نام غیر مسلموں جیسے ملتے ہیں۔ ان ناموں کے لاحقہ کے طور پر سنگھ کے استعمال سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ شین حکمران تھے پھر وہ ہنو کی شنوں کی کالونی اس پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔

اس شجرے میں بردشوگوری تھم جیسے خطاب سے برش حکمرانوں کی حکومت کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن چونکہ جدید دور تک یہاں نان برش حکمرانوں نے بھی ایسے خطاب استعمال

کئے ہیں۔ اس پر زیادہ چھنا کی ضرورت نہیں۔ تاہم وہ خاندانی نسلوں کی توڑ کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ اور اغلباً یہاں یہ شگر کے شہزادوں کی دخیل کاری ہو۔

سولھویں صدی کے آخری زمانے میں احمد خان اسکردو کا حکمران تھا۔ اس کے چار جنگجو لڑکوں کی تگ و تازیوں کی وجہ سے اس دور میں چار طرف ریاستیں اسکردو کی مطیع و فرمان بردار تھیں۔ ان لڑکوں میں سے تین کی اولاد نے روندو، کھرمنگ، اور استور میں مقپون حکومتیں قائم کیں۔ جنرل کنگھم کے مطابق تقریباً 1600ء کے قریب یہاں کے بروکپاز کے اسلاف کو بلتستان لایا گیا۔ روندو کا علی شاہ مقپون ایک طاقتور حکمران تھا۔ جس نے چترال تک کے علاقے فتح کئے اور اس نے تقریباً بارہ سالوں تک ان علاقوں پر حکمرانی کی۔ دریائے چترال پر پل، مقپون، شوارن اس دور کی یادگار ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں کی تمام ریاستوں پر مقپون فائق تھے۔ چار جنگجو بھائیوں کی ماں تراخانی خاندان کی تھی۔ کئی اور مثالیں ملتی ہیں کہ تراخانیوں کی لڑکیاں مقپونوں کے عقد میں تھیں اور ایک مثال بھی ایسی نہیں کہ مقپونوں نے اپنی لڑکیاں تراخانیوں کو دی ہوں۔ اس وقت مقپون خاندان ہیئے، مغلوٹ اور تراخانی لڑکیاں عقد میں تو لیتے ہیں۔ لیکن اپنی لڑکیاں محض مقپون ہی کے عقد میں دیتے ہیں۔

شگر کے اماچہ صاف اور تیکھے نقوش اور برہمنک خدوخال رکھتے ہیں۔ ان کے خدوخال اور حکمرانوں کی تعداد سے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ اماچہ شین حکمرانوں کے نمائندے تھے۔ جو کبھی اسکردو پر حکومت کرتے تھے۔ جب ابراہیم شاہ نے انہیں نکال دیا تو وہ شگر پر قابض ہوئے۔

ہنزہ، گلگت، نگر کی طرف یہ علاقہ پالور کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ جبکہ یہاں کے لوگ اسکردو پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس مقام کا بانی سکندر تھا۔ اس حوالے سے اسے اسکندریہ کا نام ملا تھا۔ جو بگڑ کر اسکردو بنا۔ ہندوکش اور قراقرم کے علاقوں کی طرف سکندر کا نام بڑا مستعمل ہوا ہے پنجاب میں گلگت کے حکمرانوں کو سکندر کا جانشین قرار دیا جاتا ہے۔ گلگت میں واخان کے حکمرانوں، واخان میں چترال کے امیروں اور چترال میں درواز کے حکمرانوں کو سکندر کا جانشین بنایا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ میرے نزدیک ٹھیک نہیں۔ لیکن یہ بات حیران کن ہے کہ فلپ کے بیٹے اور عظیم فاتح نے ہندوستان میں اپنے تھوڑے سے قیام کے دوران جاہل اور ان پڑھ لوگوں پر کتنا زبردست اثر ڈالا۔"

محمد قاسم نسیم اپنی کتاب "تاریخ وسیاست" میں لکھتے ہیں۔ " مقپون بلتستان کے حکمران کا نام ہے۔ جن کا دارالحکومت سکردو تھا۔ اس خاندان نے بارھویں صدی سے 1840ء تک بلتستان کے علاوہ مغربی تبت، لداخ، گلگت اور چترال پر حکومت کی۔ وادی روندو، استور گوپس، کھرمنگ، اور طولتی کے راجگان بھی اسی خاندان کی ہی شاخیں ہیں۔ لفظ مقپون کا وجہ تسمیہ خانہ داماد کے ہیں۔ بلتی میں خانہ داماد کو مقپا کہتے ہیں۔ چونکہ اسی خاندان کا جد اعلیٰ ابراہیم شاہ بارہویں صدی میں ایران کی طرف سے براستہ کشمیر سکردو پہنچا اور یہاں کے حکمران کے اکلوتی بیٹی سے شادی کر کے خانہ داماد بنا اور مقپا کہلایا۔ جو بعد میں شدت استعمال سے مقپون بنا۔ بعض مصنفین نے مقپون کو ہرحق پون یعنی سپ سالار سے تعبیر کیا ہے۔"

وزیر حشمت اللہ اپنی کتاب تاریخ جموں میں لکھتے ہیں۔ " ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ خاندان شگر گیالپو میں وارث حکومت صرف ایک لڑکی مسماۃ شکری رہ گئی۔ اسی زمانہ میں اسی دربار میں چار آدمیوں کا رسوخ تھا۔ یعنی ستانوٹوک ٹوک، ستانوے شے، ستانو کنائی، اور ستانوبابور، ان کے درمیان شکری کی شادی کے متعلق تنازعہ ہوا۔ ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنے خاندان میں شکری کی شادی کرے۔ اس اثنا میں ایک نوجوان ابراہیم نامی کشمیر سے وارد شگری ہوا۔ اس کا زمانہ ازروئے حساب 1190ء 1220ء کے قریب قریب ہوتا ہے۔ تاریخی ثبوت اس کا موجود نہیں۔ یہ لڑکا قابل اور ہوشیار تھا۔ چند روز ہی اس کی شہرت اس ملک میں پھیل گئی۔ اب ان چاروں وزیروں نے مصلحت کی کہ شکری کی شادی اس نوجوان سے ہو۔ شادی کے بعد یہ نوجوان بر سر حکومت پہنچا اور مقپون یعنی سالار فوج کے لقب سے مشہور ہوا۔"

بلتستان ان ہسٹری کے مصنف بنات گل لکھتے ہیں۔ کہ علی شیر انچن اور اس کے نواسے شاہ مراد، شیر شاہ اور علی شاہ نے مفتوح قبائل پر اپنا دبدبہ جتانے کے لئے انہیں یہ تاثر دیا کہ وہ غیر مرئی مخلوق کی اولاد ہیں۔ ایک شناگیت میں مقپون کو دیوتا ظاہر کیا گیا ہے۔

محمد حسن حسرت بلتستان تہذیب وثقافت میں لکھتے ہیں۔ "مقپون بلتستان کا نامور حکمران خاندان گزرا ہے۔ جس کی سلطنت کی سرحدیں کبھی چترال سے لے کر تبت پورانگ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مورخین کے مطابق 1190ء 1840ء بلتستان پر اس خاندان کی حکومت رہی۔ خانوادۂ مقپون کا بانی ابراہیم شاہ تھا۔ جو جان بڈلف اور بنات گل آفریدی کے

بقول نسلاً مصری تھا۔ جس کی تائید بعد میں بعض مورخین نے بھی کی ہے۔ جبکہ بعض لوگ ابراہیم شاہ کے کشمیری یا ایرانی النسل ہونے کا بھی قیاس کرتے ہیں۔ اس خاندان کے اکثر لوگ نہایت خوش شکل، سفید جلد اور درمیانہ قد ہیں۔ اس خاندان کی شاخیں سکردو خاص کے علاوہ کواردو، گمبہ، سکردو، شگری بالا، حسین آباد، گھرمنگ خاص، طولتی، کھرمنڈیانگ، روندو، استور اور گوپس میں آباد ہیں۔"

بلتستان پر ایک نظر کے مصنف محمد یوسف حسین آبادی لکھتے ہیں۔ بلتستان کا شاہی خاندان مقپون اور نگر کا راجہ خاندان عماچہ آریائی نسل کے جبکہ خپلو کا راجہ خاندان یبگوترک نسل کے بتائے جاتے ہیں۔ پھر وہ لکھتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق تقریباً ڈیڑھ صدی بعد مقامی باشندوں نے تبت سے آزادی حاصل کر لی۔ لیکن حصول اقتدار کی خاطر ان کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جس کے دوران کشمیر کے حکمران نے موقع سے فائدہ اٹھا کر دریائے سندھ کے بائیں جانب کے علاقوں پر اپنا تسلط جما لیا۔ اور ابراہیم نامی ایک شخص کو سکردو میں ہر حق پون یعنی سالار لشکر مقرر کر دیا۔ ہر حق پون کثرت استعمال سے مقپون بن گیا۔ پھر ایک دوسری روایت کا ذکر کرتے ہوئے محمد یوسف حسین آبادی لکھتے ہیں۔ ابراہیم ایک فقیر کے بھیس میں شگری پہنچا۔ موضع شگری موجودہ ہوائی اڈہ کے قریب واقع ہے۔ جو سکردو کی حکومت کا قدیم صدر مقام تھا۔ شگری کا حکمران خاندان کی اکلوتی وراث لڑکی رگیالمو کی شادی ابراہیم سے ہو گئی جس کی وجہ سے مقپا (داماد) اور برائے ادب مقپون کہلانے لگا۔"

قدیم لداخ (تاریخ تمدن) میں کاچو سکندر خان وہی کہانی دہراتا ہے۔ جو محمد یوسف حسین آبادی نے ابراہیم اور شگری کے ناتا جوڑنے کے متعلق بیان کی ہے۔

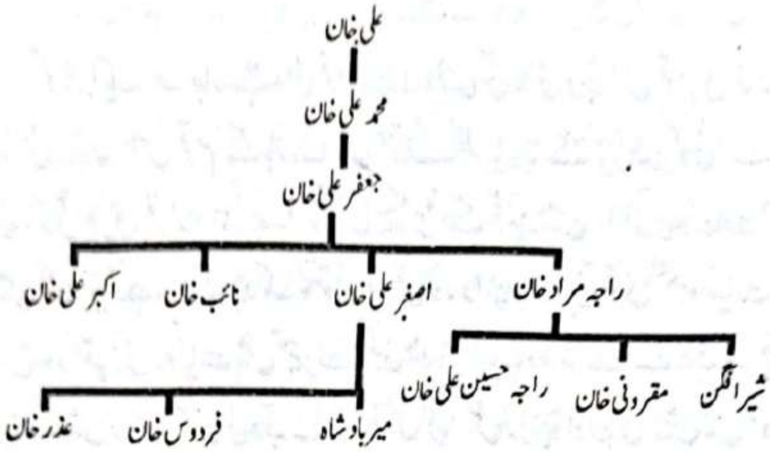
بنیادی طور پر یہ تمام کہانیاں افسانویت کی کھوکھ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اور ان کہانیوں کا ہر ہر جز ما فوق الفطرت عناصر کا آئینہ دار دکھائی دیتا ہے۔ مقپون خاندان کے جد اعلیٰ ابراہیم کا سکردو وارد ہونے کی تاریخ تقریباً تمام مورخین نے 1190ء دکھائی ہے۔ اس دور میں سارا بلتستان کفر و شرک کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کشمیر میں ابھی اسلام کا چرچا نہیں ہوا تھا۔ اور یہاں بھی کافر حکومتیں تھیں۔ کسی مسلمان ابراہیم شاہ کا کہیں سے برآمد ہونے اور پھر بلتستان وارد ہو کر حکمرانی حاصل کرنا خود ایک سوال بن کر رہ جاتا ہے۔ کشمیر میں 1320ء میں رنچن سید عبدالرحمن بلبل شاہ کی تبلیغ سے مسلمان ہوا۔ میں آگے لکھ چکا ہوں۔ بلتستان میں اسلام بہت دیر بعد آیا یہ بہت عجیب لگتا ہے۔ ڈیڑھ صدی پیشتر بلتستان میں یہ ابراہیم شاہ کہاں

سے آیا۔ پھر ابراہیم شاہ کا مصر سے آنا مان لیا جائے تو یہ عرب النسل ہوا۔ اور پھر اس عربی النسل مسلمان کی اولاد کفر میں کیسے گم ہوئی۔ ابراہیم شاہ کا بیٹا ہی اسنک سنگھ بن کر راہ مستقیم سے کیسے بھٹک گیا۔ وزیر حشمت اللہ جان بڈلف، ہنات گل، وغیرہ نے جو شجرے دیے ہیں۔ ان میں بھی بڑا فرق ہے۔ ان شجروں میں مختلف خاندانی حکمران ایک دوسرے میں مدغم ہوتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً سوملک چترال کا باسی بھی ہے۔ اور گلگت کا باسی بھی، چترال کے رئیسے، گلگت کے باسی اس طرح بروشوں کے گوری تھم، سکردو، اور شگر میں ایک ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ لگتا ہے یہ مختلف داستانوں کے جوڑ ہیں۔ جن کو ادھر اُدھر لڑیوں میں پرو دیا گیا ہے۔

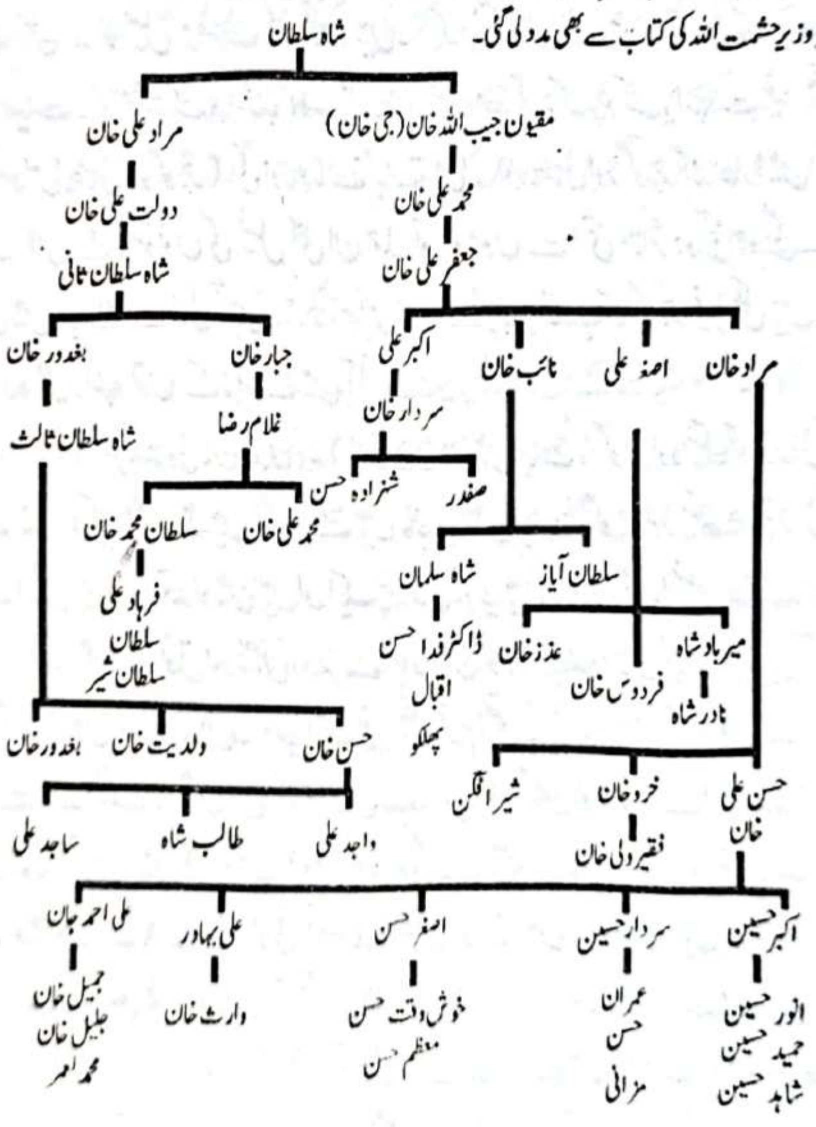
پورے شمالی علاقہ جات کی طرف سکندر اعظم کی اولاد ہونے کی کہانی سب کی زبان کی نوک پر ہے۔ سکردو کو سکندر اعظم نے آباد کیا۔ ہنزہ ونگر کے راجہ سکندر کی اولاد ہیں۔ بدخشاں کے رائیساں سکندر کی اولاد ہیں۔ چترال کے حکمران سکندر کی اولاد ہیں۔ ہمارے علاقوں میں الف لیلیٰ کی داستان، داستان امیر حمزہ، گل بکاؤلی، سیف الملوک، گل صد برگ، رستم وسہراب، کیسر وغیرہ کی داستانیں مقبول عام رہی ہیں۔ ہماری تمام کہانیوں میں ان داستانوں کا عام تاثر ملتا ہے۔ جان بڈلف کی یہ بات یقیناً درست ہے کہ اس عظیم فاتح نے جاہل اور ان پڑھ لوگوں پر کتنا اثر ڈالا۔ یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ بائیس صدیاں گزرتے اور فتوحات کے کئی طوفان ایشیا میں آنے کے باوجود یہاں کی ریاستیں فلپ کے بیٹے کو یاد رکھے ہوئے ہیں۔ اور یاد بھی کیسے رکھا جا رہا ہے کہ اس عظیم فاتح کی اولاد بن کر یونان میں اتنی اولاد نہیں ہوئی۔ جتنی ہمارے شمالی علاقہ جات واخان، درواز، چترال، بدخشان وغیرہ میں ہوئی۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ مقپون خاندان میں بڑے نامور حکمران ہوئے۔ جو پورے شمالی علاقہ جات پر حاکم تھے۔ ان کی ناموری کا معیار اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی لڑکیاں محض مقپون گھرانوں میں بیاہ دیتے تھے۔ جبکہ مغلوت، ترا خن، اور عائشی لڑکیاں اپنی عقد میں لیتے تھے۔ مقپون حکمرانوں کے سلسلے طولتی، سکردو، کواردو، استور، گوپس میں پھیلے۔

یہاں میں راجہ حسین علی خان گوپس کا شجرہ دے رہا ہوں



درج ذیل شجرہ راجہ اصغر حسن، اور محکمہ مال گلگت کے تعاون سے تیار کیا گیا۔
وزیر حشمت اللہ کی کتاب سے بھی مدد لی گئی۔



گوجر :

گوجر ایک ہمہ جا رہنے والی قوم ہے۔ اس کی بڑی وجہ اس قوم کی خانہ بدوشی اور مواشی دوستی ہے۔ اس قوم کے بارے میں مختلف نظریات ملتے ہیں۔ کوئی اسے راجپوت، کوئی یفتالی، کوئی یوچی قرار دیتا ہے۔ پشتون تاریخ کے آئینہ میں (از سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل) میں لکھا گیا ہے۔ کہ چونکہ پشتون قبائل اور راجپوت اپنی قومی خصوصیات اور قبیلوی رسم ورواج اور امتیازی روایات میں حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے کے مشابہہ ہیں۔ اب جس طرح ہند میں رہن سہن کی وجہ سے یفتالیوں کی نسل راجپوتوں کی شکل میں موجود ہے۔ اور یفتالیوں کے زیر سایہ رہنے والے گرجر آج بھی گوجر کے نام سے باقی چلے آرہے ہیں۔ آگے چل کر فاضل مصنف پھر لکھتے ہیں۔ کہ پشتونوں اور راجپوتوں کے درمیان بعض خصوصیات کے مشترک و مشابہ ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ چونکہ راجپوت غیر ملکی لوگوں (بالخصوص یفتالی اور گوجر) کی اولاد مانے جاتے ہیں۔ اور یفتالی اور گوجر گندھارا میں بھی رہتے تھے۔ اس لیے پشتونوں کی نسل بھی ان حملہ آور قوموں سے اتنی متاثر ہوگئی ہوگی۔ میرے خیال میں مبالغے سے خالی نہیں۔ تاہم اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ گوجر غیر ملکی ہیں۔ اور ان کی اولاد بھی راجپوتوں کے زمرے میں آتی ہے۔

ڈاکٹر گستاولی بان تمدن ہند (صفحہ 122) میں جاٹ، گوجر اور سکھ کو تورانی اقوام کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں پنجاب میں جاٹ، گوجر اور سکھ جو تورانی الاصل ہیں۔ تین چوتھائی تعداد میں ہیں اور ایک چوتھائی آریہ ہیں جن کا رنگ انہیں صاف بتاتا ہے۔

محمد دین فوق اور بعض دوسرے مورخین گوجر کو ہندوستان کی قدیم ترین آبادی میں شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ یہ ایک غیر ملکی قوم تھی۔ ہندوستان آکر اس نے ایک لمبے عرصے تک مختلف علاقوں میں حکومت کی ہے۔ یہ مورخین گوجروں کے اس ملک میں آنے کا کوئی زمانہ متعین نہیں کر سکتے۔ مولانا عبدالمالک سابق وزیر مال بہاولپور، اپنی کتاب شاہان گجر میں گوجروں کے بارے میں کافی معلومات پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں گوجر، خزر، خضر، جذر سب ایک ہی قوم کے لئے مستعمل الفاظ ہیں ان کا کہنا ہے۔ کہ عرب مورخین نے گوجر قوم کو ہمیشہ خزر یا خضر لکھا ہے۔ اس قوم کی اصل کے بارے میں صاحب موصوف کا کہنا ہے۔ کہ یہ قوم وسط ایشیا کے خانہ بدوش ہیں۔ بعض مورخین اس قوم کو یوچی کی اولاد کہتے ہیں۔ اور

بعض اسے تھیئن قرار دیتے ہیں۔ پھر گوجروں کی سینکڑوں گوتیں بیان کی جاتی ہیں۔ جب یہ لوگ بار سے آئے توان میں جنگجو لوگ تھے۔ وہ کھشتریوں کے روپ میں ظاہر ہوئے اور بعض لوگ جو گجر ہی رہے وہ ویش ہو کر مختلف کاروبار میں جت گئے۔

محمد دین فوق کہتے ہیں۔ کہ کشمیر میں گوجر قدیم ترین قوموں میں شامل ہے۔ یہ قوم گجرات اور نواح گجرات میں کثیر تعداد میں اس طرف آتی رہی ہے۔ کیونکہ ان ہی اطراف سے ایک سڑک کشمیر کو آتی ہے۔ اور یہی علاقے گوجروں کے بڑے مسکن ہیں۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کا کہنا ہے۔ کہ بر صغیر پاک و ہند میں 1000ق م سے 900ق م تک آریاؤں کی آمد جاری رہی اور ان آریاؤں میں گوجر قبائل بھی شامل تھے۔ گوجروں سمیت آریاؤں کی زبان سنسکرت تھی۔ پھر وہ کہتے ہیں۔ بر صغیر میں درود کے بعد گوجر قبائل نے کوہ اراؤلی اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کو خاص طور سے اپنا مرکز بنایا۔ گوجری زبانی کی نقل مکانی کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ کہ اس کے بعد زبان اس علاقے میں پہنچی جیسے گوجروں نے گوجراستر (گجرات) کا نام دیا۔ گجرات اور اس کا ملحقہ علاقہ راجپوتانہ گوجر تہذب اور گوجری زبان کے مراکز رہے ہیں۔

سطور بالا کی بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گوجر ایک غیر ملکی قوم ہے۔ اور اس نے اپنی جنگجویانہ خصوصیات کے بل بوتے پر یہاں اپنا ایک مقام بنایا۔ انہوں نے گجرات راجپوتانہ اور ملحقہ علاقوں کو اپنا مرکز ٹھہرا کر مختلف علاقوں میں کوئی سو سال تک حکومت کی۔ ان کی اولاد راجپوت بھی کہلائی۔ بعض مورخین نے انھیں یوچی بعض نے تھیئن اور بعض نے آرین اور بعض نے اسے تورانی الاصل قرار دیا۔ جہاں تک اس کی زبان اور جسمانی خدوخال کا تعلق ہے یہ قوم آریہ الاصل نظر آتی ہے۔ بلالحاظ اس کے کہ ان کا رنگ آریوں جیسا شفاف نہیں۔

محمد دین فوق تاریخ اقوام میں لکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں ککے زئی، ٹوانہ، گجر، پٹھان، نون، اور چند دیگر ذاتیں ملک کہلاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا گوجر قوم ملک بھی کہلاتی ہے۔ اور یہ ایک معزز قوم ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کشمیری زبان میں گوجر کو گورو کہتے ہیں۔ ان میں مسلمان بھی ہیں، اور پنڈت بھی۔ مسلمان تو مال مویشی پالتے ہیں۔ اور دودھ بھی بیچتے ہیں۔ لیکن پنڈت گورد گوجروں کا کام نہیں کرتے۔ بلکہ یہ لوگ جن کے آباؤ اجداد گوجروں کے قسط باشی یا پٹواری تھے۔ ان سے سرکاری ٹیکس وصول کرتے تھے۔ جان بڈلف اپنی کتاب ہندوکش کے قبائل میں لکھتے ہیں۔ کہ گلگت کے جنوب کی وادیوں میں گوجر ذات کے لوگ اپنے

مویشی چراتے ہیں۔ لیکن وہ وہاں کے لوگوں سے میل جول نہیں رکھتے۔ تانگیر اور داریل میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ اور ان کے پاس ہزاروں کی تعداد میں مویشی ہیں۔ یہ کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتے۔ وہ وقتی طور پر اپنے جھونپڑے وغیرہ بناتے ہیں۔ تھوڑی بہت زمین بھی کاشت کرتے ہیں اور پھر موسم کے ساتھ جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد دیر اور سوات کے بالائی حصے میں رہتی ہے۔ ان میں سے کچھ وادی گلگت میں بھی آگئے ہیں۔ یہ لوگ خاص گوجروں والی زبان پنجابی بولتے ہیں۔

ہمارے ہاں گوجر کشمیر کی طرف سے نہیں آئے ہیں۔ بلکہ دیر، سوات، کوہستان اور ہزارہ کی طرف سے گوجروں کے جتھے چراگاہوں کی تلاش میں یہاں آتے رہے ہیں۔ داریل، تانگیر، چترال، ہوڈر، کھنر، کارگاہ، بھتریتھ، گجرداس، نلتر، میں یہ بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ ان کا پیشہ مویشی کے ریوڑ پالنا ہے۔ کارگاہ اور ملحقہ علاقوں کے گوجروں گلگت وادیوں کے مویشی پیسہ یا اناج کے بدلے پالتے ہیں۔ اس طرف ان لوگوں کی معاشی حالت اتنی اچھی نہیں۔ تعلیم میں یہ لوگ بہت پیچھے ہیں۔

پٹھان :

گلگت کی سرحد ہزارہ اور سوات سے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے ہمارے علاقے میں ان اطراف سے پٹھان بھی آتے رہے ہیں۔ کشمیر میں بھی پٹھانوں کی کئی قومیں آباد ہیں جن میں ککی خیل (کاکا خیل)، آفریدی، کنٹ، سدوزئی، یوسف زئی، سواتی، خٹکی، بلوچ، بارک زئی، درانی، حسن زئی، خیبری، ہزارہ، کابلی، نیازی وغیرہ شامل ہیں۔ ظاہر ہے کشمیر پر کئی سالوں تک افغانوں کی حکومت رہی اور یوں اس طرح یہاں پٹھان بھی بستے رہے۔ گلگت میں پٹھان 1891ء کے دوران پہلی دفعہ اچھی خاصی تعداد میں آئے۔ ان پٹھانوں میں آفریدی اور خیبری قوم کے پٹھان شامل تھے۔ محمد دین فوق ان پٹھانوں کی تعداد 35 بتاتا ہے۔ جو گلگت کشمیر سڑک کی تعمیر پر مامور ہو گئے تھے۔ میرے خیال میں یہ تعداد اس سے زیادہ تھی۔ اس سڑک کی تعمیر کا کام مسٹر سپیڈنگ کے ذمہ تھا۔ بعد میں جب ڈوگروں اور انگریزوں کی لڑائی نگریوں سے ہوئی تو اس میں مسٹر سپیڈنگ کے پٹھان بھی شامل تھے۔ ریگولر آرمی میں بھی 76 لوگ ہزارہ مونٹین بیٹری کے شامل تھے۔ اس طرح گلگت میں پٹھانوں کی آمدورفت شروع ہوئی۔ اس کے بعد پٹھان تلاش روزگار کے سلسلہ میں آنے لگے۔ ان آنے والوں میں دیر،

ہزارہ، مردان، سوات کے لوگ زیادہ شامل تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے کاغان / ناران کے راستے ہزارہ کی طرف سے پٹھان، ہزارہ وال اور مختلف قبائل کے لوگ اونٹ، گدھے، خچر پر نمک، کپڑا اور دیگر تجارتی مال لاد کر آتے رہے۔ پھر کچھ لوگ آباد بھی ہونے لگے۔ اور پھر یہاں کاروبار کرنے لگے۔ شروع شروع میں جو پٹھان یہاں آئے۔ انہوں نے نسوار کی صنعت کو ترقی دی اور اسی کاروبار کا اپنے ہاتھوں میں لیا۔ پھر دوسرے نمبر پر موچی کا کام کرنے والے پٹھان تھے۔ جنہوں نے جوتوں اور چپل سازی کے کاروبار کو آگے بڑھایا۔ گلگت میں پٹھانوں اور ہزارہ والوں کی بڑی آبادیاں موجود ہیں۔ جہاں تک ان کی نسلیاتی گروپ بندیوں کا تعلق ہے۔ یہاں کبھی بھی اس حوالے سے ان کی الگ الگ شناخت نہیں کی گئی۔ بندوبستی ریکارڈ میں انہیں صرف پٹھان کے عنوان کے تحت ریکارڈ کیا گیا ہے اور ان کے مروجہ خیلوں کا کوئی تذکرہ موجود نہیں۔ مجھے یہ لوگ اپنی سابقہ شناخت کے بارے میں کوئی قابل اطمینان بات نہ بتا سکے۔ لہٰذا ان کو پٹھان کے عنوان کے تحت یہاں دیا جارہا ہے۔

نور ولی
سیف علی
فریدون

امیرزادہ
پائندہ خان
حشمت اللہ سابق ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیم

میرافضل
عبدالہادی
عبدالصمد - عبدالمتین - عبدالکبیر - عبدالرشید

جمعہ خان
آدم خان

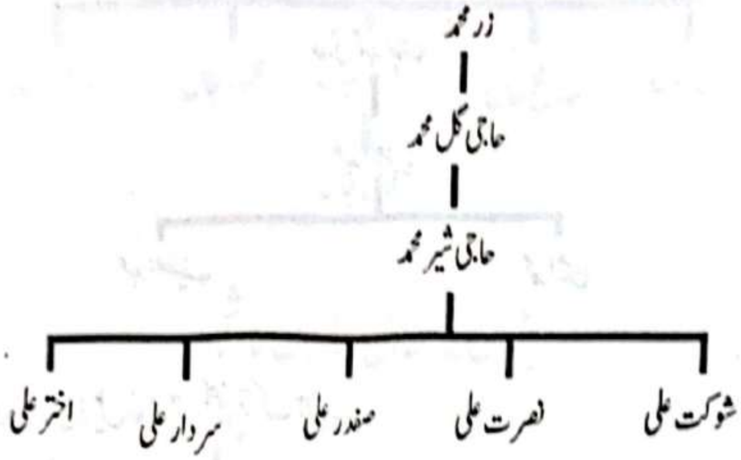
خان زادہ
محمد جان
معراج گل

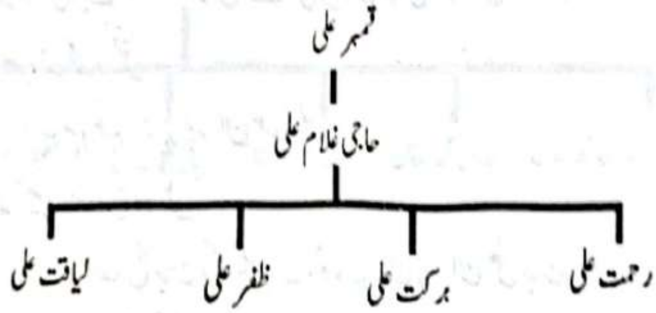
خان شرین
سید عالم
فضل احمد
سعید احمد - غلام احمد - غیور احمد - نذیر احمد
سعید احمد: سہیل احمد، سجاد احمد
غلام احمد: سبطین احمد، عثمان احمد

رام داو فیض
سردار خان - حیکم خان

سید احمد خان
طور لالی

حاجی شیر محمد اور غلام علی کو بندوبستی ریکارڈ میں پٹھان قرار دیا گیا ہے۔ خود ان کا کہنا ہے کہ وہ چنگیزی ہیں۔ ہزارہ سوات (کابل) کی طرف سے آئے ہیں۔ پٹھان لکھنے کی وجہ شاید یہی ہے کہ وہ افغانستان کی طرف سے آئے ہیں۔ جہاں افغان بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ بندوبستی ریکارڈ میں جو خامیاں ہیں ان کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ بہر حال میں نے حاجی شیر محمد صاحب سے پوچھ کر یہ شجرہ مرتب کیا ہے۔ بندوبستی ریکارڈ میں زر محمد کی جگہ پیر محمد ہے۔

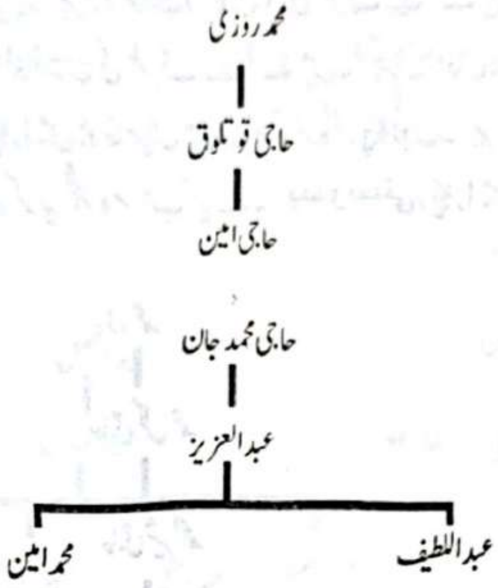




چنگیزی کوئی قومیت نہیں یہ محض صفت نسبتی ہے کہ یہ لوگ چنگیز خان کی اولاد سے ہیں۔ اس حوالے سے یہ مغل ہیں۔ پٹھانوں کی کسی ذیل سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

گلگت میں صوبہ سنکیانگ (مشرقی ترکستان) سے آئے کئی خاندان آباد ہیں۔ ان میں ایغور ترکوں کی بڑی تعداد ہے۔ ایغور کے معنی متمدن کے ہیں۔ جب ایغوروں کو شمال سے نکالا گیا تو 860ء میں یہ ادھر اُدھر پانچ شہروں میں آباد ہوئے۔ یہ دراز قد اور توانا جسم کے مالک لوگ ہیں۔ یہ قبیلہ چینیوں کی طرح لکڑی کے سنک سے کھاتا ہے۔

حاجی محمد جان مرحوم کا شجرہ جو ایغور قبیلے سے وابستہ تھا۔



ان کے علاوہ درج ذیل خاندان بھی ترک ہیں۔

1۔ حاجی میر احمد

2۔ محمد تردی بیگ مرحوم سابق اے آئی جی ولد حاجی اسماعیل

3۔ ناصر ولد محمد رفیق

4۔ عبدالقیوم و عبدالحمید پسران عبدالمجید

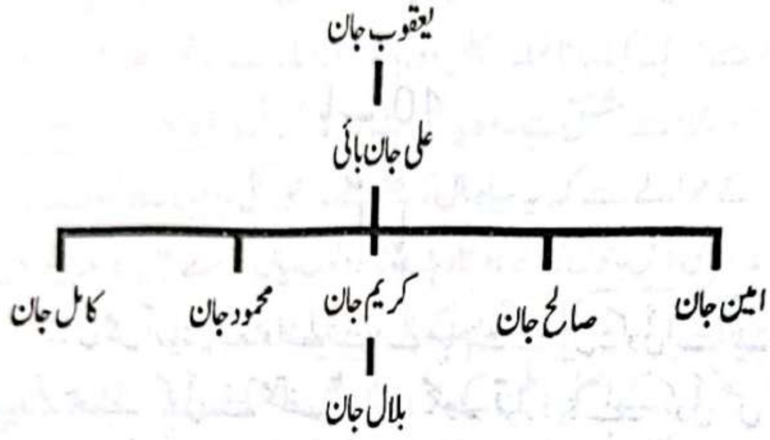
5۔ محمد امین الفلاح ہوٹل

ترک ازبک : صالح جان، کریم جان، نومان جان پسران علی جان

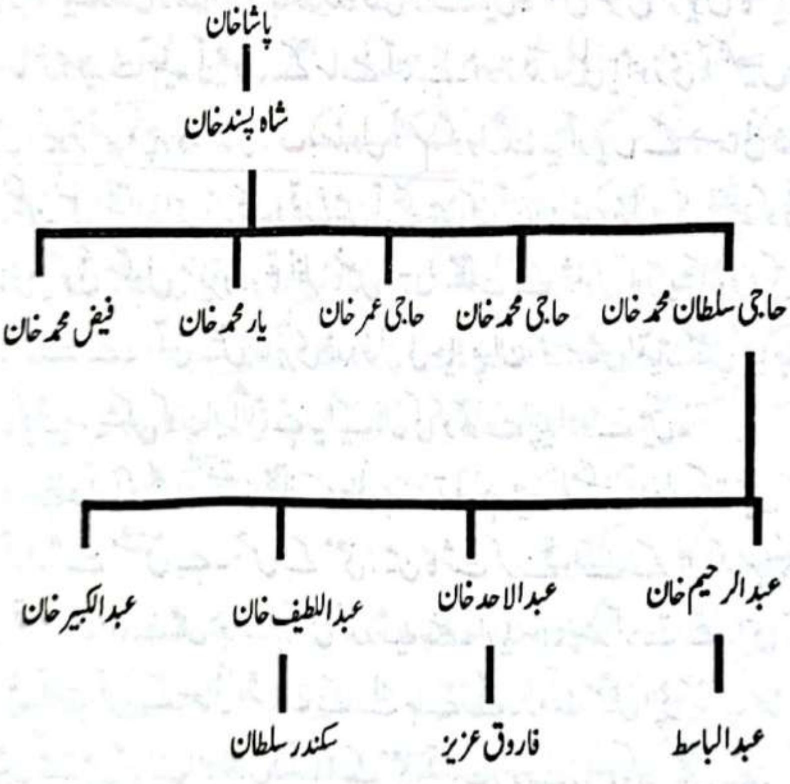
بلتی : قابض آخون، (ماں کاشغری باپ بلتی)

پٹھان : اکبر آفندی ولد حاجی مراد قاری (ماں کاشغری باپ پٹھان)

کریم جان۔ ازبک کا شجرہ۔



پٹھان۔ حاجی سلطان کا شجرہ



ترک کرغیز: محمد ابراہیم ولد جان بیگ۔

باب 10

آریا

تاریخ میں آریانام کے حوالے سے بڑے مباحث ملتے ہیں۔ کوئی اسے ایک قوم کے نام سے یاد کرتا ہے۔ کوئی اسے مختلف قوموں کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔ کوئی کسی قوم کے زمرے میں ہی شمار نہیں کرتا۔ اور لسانیات کے حوالے سے محض آریائی نژاد زبانیں گنواتا ہے۔ بعض محققین آریا کوایک قوم گرادنتے ہوئے دیگر اقوام سے ممیز کرتے ہیں۔ امتیاز کیلئے وہ آریوں کا ایک واضح رنگ و روپ اور خدوخال تراشتے ہیں۔ اس طرح آریوں کا ایک نکھرتا نکھرتا ساخوبصورت حلیہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ دراز قد، نیلی یا بھوری آنکھیں، سرخی مائل بال، لمبوترا سر وچہرہ، عقابی ناک، سڈول جسم، گورا رنگ یہ آریوں کے جسمانی خدوخال ہیں۔ لیکن نسلی اختلاط اس حد تک وقوع میں آچکے ہیں کہ آج ان خدوخال کے پیچھے کوئی آریا، کوئی سامی یا کوئی منگول منفرد ہوتا نظر نہیں آتا۔ گلگت کے شنوں اور یشکنوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ آج محض ظاہری خدوخال کی بنیاد پر ان اقوام میں امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔ کہ شین کون اور یشکن کون ایسا لگتا ہے یہ ایک ماں کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔

لفظ آریا کو بھی محققین مختلف معانی پہناتے رہے ہیں۔ میکس مولر کہتے ہیں کہ لفظ آریا "آرار" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی زمین کاشت کرنے والے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ آریا ان اقوام کے مقابلے میں جو خانہ بدوش گڈریے تھے۔ آریا کہلانا پسند کرتے تھے۔ اسی تفاوت سے آہستہ آہستہ آریا کے معانی اشراف کے لئے جانے لگے۔ رونلڈ سیگل اپنی کتاب بھارت کا بحران میں لکھتے ہیں کہ اس اصطلاح (آریا) کے معنی قرابت دار سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔ اگرچہ جلد ہی انار یایا حقیر کے مقابلہ میں اس سے عزت دار مراد لی جانے لگی۔ آریا نے اپنے علاوہ دیگر اقوام کو جن سے ان کا واسطہ پڑا کمتر اور سفلہ قرار دیا۔ لیکن جو آریا یورپ کی طرف گئے اور مقامی آبادیوں میں ضم ہوتے گئے۔ ایسے خیالات جھٹک دیتے گئے۔ تاہم ایشیا میں

برتری اور کمتری کے جذبات برابر پروان چڑھتے گئے۔ اُنھوں نے یہاں تک کہ مہذب، شائستہ، اور ترقی یافتہ پاکستانی دراڑوں کو ملیچھ (ناپاک) داسو (غلام) اور راکشس (شیطان) کے نازیبا القاب استعمال کئے۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان مشہور فرانسی محقق کہتے ہیں۔ یہ لوگ ایسی زبان بولتے تھے جسے آریک کہا جاتا تھا۔ لیکن وہ زبان مرورزمانہ کے ساتھ معدوم ہوتی گئی۔ تاہم سنسکرت اسی زبان سے مشتق ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ آریا سفید جلد اور سیاہ بالوں کے مالک تھے بالوں کے حوالے سے کہ یہ سیاہ بال رکھتے تھے۔ اور کئی بیانوں سے مختلف ہے جس میں آریوں کے سرخی مائل بالوں کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ دونوں بیان درست ہیں کیونکہ یورپین آریوں کے بال سرخی مائل اور انڈو آرین اقوام کے بال سیاہ رنگ ہوتے ہیں۔

آریوں کے اصل وطن کے بارے میں بھی بڑا اختلاف ہے۔ ژندواستا جو پارسیوں کے پیغمبر زرتشت کی کتاب ہے۔ میں آریوں کا وطن آریانیم ولیگو بتایا گیا ہے۔ یہ شمال میں واقع تھا اور اس سرزمین کو پوتر اور پاک بتایا گیا تھا۔ اور یہ کہ یہ علاقہ سلسلہ کوہ مضطاغ کے دامن میں پھیلا ہوا تھا۔ تاہم جب یہ علاقہ کسی جغرافیائی تبدیلی سے نا قابل سکونت بنا تو آریاؤں نے سغدانیہ، مرگیانہ اور مورا کی طرف مراجعت کی۔ بعض یورپین عالم آسٹریا اور ہنگری کے اردگرد کے علاقے اور بعض بحیرہ بالٹک کے کنارے کے ممالک کو ان کا وطن قرار دیتے ہیں۔ بعض قطب شمالی کے نزدیک اور آثار قدیمہ کے ماہرین دریائے ڈینوب اور آکس کے درمیان والی زمین ان کا گھر بتاتے ہیں۔ اکثریت کی رائے جو زیادہ قرین قیاس ہے۔ کے مطابق ان کا اصلی مسکن جنوبی روس کے گھاس کے میدانات اور بحیرہ کیسپین کے اردگرد کے علاقے تھے۔ سٹرابو جیسے محققین بختریہ کو آریاؤں کا اہم مرکز خیال کرتے ہیں کہا جاتا ہے۔ پرشیا، میڈیا، بختریہ اور سغدنیہ کے تمام تر باشندے ایک ہی زبان بولتے تھے۔ اور توران کے رہنے والوں کی مخالفت میں خود کو ایرین کہتے تھے۔

آریوں کے ترک وطن کے بارے میں بھی مختلف خیالات ملتے ہیں۔ ہیرلڈلیم آریاؤں کو سیتھین کے ہم نسل قرار دیتے ہیں۔ اور وہ یوچیوں کو بھی ان ہی کی ایک شاخ بتاتے ہیں۔ وہ ہنوں کی یلغار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان کے حملوں سے یوچی اور سیتھین قبیلے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ سید بہادر شاہ ظفر کا کاخیل لکھتے ہیں کہ باختر کی چراگاہوں میں جب ان کی آبادی زیادہ ہوگئی اور آہستہ آہستہ یہ زمین ان لوگوں پر تنگ ہوتی گئی تو اس علاقے سے یہ لوگ مہاجرت پر مجبور ہوگئے۔ آریوں کی نقل و حرکت کے حوالے سے بعض یہ رائے دیتے

ہیں کہ آریوں کی سرزمین موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے ناقابل سکونت ہو گئی تھی اس لئے انہیں وہ سرزمین چھوڑنی پڑی۔ مرتضیٰ احمد خان اپنی کتاب تاریخ اقوام عالم میں لکھتے ہیں کہ انہیں سگھد انیا کوٹڈی دل دشمن قبائل (شمالی سرزمین کے مغول) کے حملوں کے باعث چھوڑنا پڑا تھا۔ نقل مکانی کرتے ہوئے یہ جن علاقوں سے گزرے ہیں۔ وہاں اپنے آثار نقوش چھوڑے ہیں آریا سے آرمنیا، ایران کا کشیا میں آئرن قوم، آئرلینڈ، آریک، آریانا وغیرہ اسماء آریوں کے مختلف نام ہیں۔ جو ان کے تعلق سے مشہور ہوئے۔ سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل بعض دریاؤں اور شہروں کے ناموں میں لفظ آریا کا ریشہ تلاش کرتے ہیں۔ وہ ہرایو، ہراوتی، آریا کا ارباب، آرستو خیل ارتاکا نا وغیرہ کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ بہر حال دو ہزار قبل مسیح سے ایک ہزار قبل مسیح کے زمانے میں آریا قبائل نے مغرب اور جنوب مغرب اور جنوب کی طرف منظم نقل مکانی شروع کی وہ یورپ جنوب مغربی ایشیا، ہندوستان کے اطراف میں بڑھتے چلے گئے اور تھوڑے عرصے میں ہی پورے یورپ، ایران، افغانستان، ہندوستان کے علاقوں میں ایسے چھا گئے جیسے اور کوئی تھا ہی نہیں۔

آریا ہندوستان میں تقریباً چھ ہزار سال یا اس سے بھی پہلے زمانے میں داخل ہوئے۔ اس وقت برصغیر میں کچھ قدیم قومیں مثلاً نیگرو، منگول (لمبے سر والے اور چوڑے سر والے منگول، تبتی منگول) دراوڑ، کول، بھیل، گونڈ وغیرہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان میں دراوڑ ایک اعلیٰ تہذیب و تمدن کے مالک تھے کہا جاتا ہے۔ سندھ کی تہذیب سمیری تہذیب اور دوسری تہذیبوں سے زیادہ وسیع علاقے پر محیط تھی۔ اور معیار کے اعتبار سے کسی طرح کمتر نہ تھی۔ اب یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ یہ تہذیب بدخشاں تک کے علاقوں پر محیط تھی۔ اس تہذیب کو پروان چڑھانے والوں میں پروٹو دراوڑی اقوام کا ہاتھ رہا ہے۔ ابتدا میں ما قبل تاریخ جو اقوام باب تورانی یعنی ہمالیائی دروں سے (برہم پتر کی گھاٹی، شبوڈک لا، فنگو اور پوٹ) تورانی الاصل قومیں ہند میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے بھی پروٹو دراوڑی اقوام کی ساخت میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر گستاولی بان کہتے ہیں۔ کہ ہم یورپ میں بطور عام جنہیں ہندو کہتے ہیں۔ یہ قوم چار اقوام پر مشتمل ہے۔

1۔ حبشی

2۔ زرد رنگ قوم

3۔ تورانی

4۔ آریا

پھر جب یہ قومیں ذات برادری کی تقسیم میں آئیں تو بقول ڈاکٹر گستاولی باب آرین سے برہمن اور چھتری بنے۔ تورانیوں سے ویش نکلے اور تورانیوں اور اصلی باشندگان کے میل سے جو گروپ وجود میں آئے۔ انہیں شودروں کے زمرے میں رکھا گیا۔ ذات برادری کی یہ تقسیم حتمی یا متفقہ قرار نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ اس حوالے سے اور بھی نظریات موجود ہیں۔ ایک توانا خیال یہ ہے کہ آریا جب باہر سے اس ملک میں وارد ہوئے۔ تو انہوں نے ہند کے قدیم اقوام کو جنوبی ہند، مدارس، کالی کٹ وغیرہ کی طرف دھکیلا اور خود پنجاب اور سندھ کی سر زمین پر قابض ہوگئے۔ آریا جب تک ان علاقوں میں رہے وہ ایک ہی قوم کی صورت میں یکجا تھے۔ ان میں کوئی تفرقہ نہ تھا۔ لیکن جیسے جیسے وہ مشرق کی طرف یعنی گنگا جمنا کے دوابے کی طرف بڑھے اُن کی فتوحات میں اضافہ ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی ضرورتیں بھی بڑھتی گئیں۔ ان حالات میں انہیں اپنے مختلف کام مختلف لوگوں میں بانٹنے پڑیں۔ آرین سوسائٹی اب چار گروپوں میں تقسیم ہوگئی۔ دراصل یہ آرین ہی تھے۔ جو ذات برادریوں میں تقسیم ہوئے۔ یہ کسی اور قوم کی تقسیم نہ تھی۔ یہ چار گروپ درج ذیل تھے۔

1۔ برہمن : ان کو پڑھنے اور پڑھانے کا کام سونپا گیا۔ راجوں کے وزیر و مشیر بھی ان سے لئے جاتے تھے۔

2۔ کھشتری : ان کا کام ملکی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور امن و امان کے قیام میں مدد دینا ہوتا تھا۔ راجے اور حکمران اس ذات سے چنے جاتے تھے۔

3۔ ویش : ان کا کام عام کاروبار کرنا، تجارت، کھیتی باری کرنا اور معاش کے دیگر ذریعوں کے مطابق معیشت کی ترقی تھی۔

4۔ شودر : ان کا کام باقی تین ذاتوں کی خدمت بجا لانا ہوتا تھا۔ اس ذات میں دھرم سے گرے ہوئے آریا لوگ اور ہندوستان کے مفتوح اصلی باشندے بھی شامل تھے۔

دھرم سے گرنے کے بھی عجیب نظریات ہیں۔ برہمن، ہو یا کھشتری، بادشاہ ہو یا پروہت، اگر ایک جنم میں ان کی بداعمالیاں بڑی ہوں۔ تو دوسرے جنم میں ان کی پیدائش دھرم سے گرے ہوئے آریاوں میں ہوسکتی ہے۔

ہندو عقائد کے سلسلہ میں رونلڈ سیگل "بھارت کا بحران" کتاب میں لکھتے ہیں۔

انسان کے اعمال کا اجر جنت یا جہنم کی صورت میں حتمی اور آخری نہیں ہے اس کے اعمال کا دفتر بند نہیں ہو گیا۔ بس ایک ورق الٹ دیا گیا ہے۔ اور نفع یا نقصان کا حساب نئی زندگی کی صورت میں دوسرے صفحے پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ لہذا بادشاہ یا پروہت ایسی روح ہے جو جنت اور دوزخ میں رہ چکی ہے۔ اور اپنے حساب میں نیکیوں کا منافع لے کر ایک بار پھر انسانوں میں شامل ہوتی ہے۔ ایک قصاب یا ایک عورت نے جن کے مرتبہ کی پستی یکساں ہے۔ پچھلے جنم میں اچھے اعمال کی نسبت بد اعمالیاں زیادہ کی ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خسارے کے ساتھ نئے قالب میں پیدا کیے گئے ہیں۔ اس نظریہ سے ذات برادری کی تقسیم کی بوالعجبیاں واضح ہیں۔ اس منافع اور خسارے کی مایا لے کر برہمن، کھشتری، ویش اور شودر ایک دوسرے کا روپ بدلتے رہتے ہیں۔ اگر ایک جنم میں برہمن تھے۔ تو بد اعمالیوں کی وجہ سے دوسرے جنم میں شودر پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس طرح شودر اپنا جنمی دور بہتر گزار کر دوسرے جنم کے لئے اپنا ایک اعلیٰ مقام بنا سکتا ہے۔ یوں ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلتا ہے۔ کبھی برہمن شودر ہے تو کبھی شودر برہمن، کبھی کھشتری ویش ہے تو کبھی ویش کھشتری۔ یہ ایک گھن چکر ہے۔ جس سے نکلا نہیں جا سکتا۔ اس میں تضادات ہی تضادات ہیں مثلاً رنگوں کی تخصیص کے معاملے پر غور کریں کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ذات پات کی درجہ بندی بالعموم رنگوں کی تخصیص کا نتیجہ تھی۔ رنگوں کے اعتبار سے برہمن کو گورا رنگ، کھشتری کو سرخ ویش کو پیلا اور شودر کا کالا رنگ ملا۔ اللہ تعالیٰ کے اپنے اصول ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ رنگ دائمی ثابت نہیں ہوئے۔ اور جغرافیائی ماحول کی وجہ سے باہر سے آنے والے گورے چٹے آریا بھی سیاہ رو بنے۔ اس طرح کھلتے رنگ کے شودر سیاہ رنگ کے برہمن، پیلے رنگ کے کھشتری جب آمنے سامنے آئے تو رنگوں کی تخصیص کا بنیادی فلسفہ بھی بکھر کر رہ گیا۔ لیکن اس کے باوجود ہندوؤں میں ذات پات کا نظام چلتا رہا اور یہی نظام ان کی کمزوری کا باعث بھی بنا۔ کروڑوں ہندوؤں پر پہلے چند ہزار مسلمانوں اور انگریزوں کی ہزار سالہ حکمرانی اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ کہ آریوں کے اس معاشرے کو ضعف آیا تو کیسے آیا۔ ڈاکٹر گستاولی بان لکھتے ہیں۔ وہ کونسے اسباب ہیں۔ جن سے تیس کروڑ ہندو کئی ہزار انگریزوں کے تابع حکومت ہیں۔ یہ راز ہم پر جب کھلے گا جب ہم ان دونوں اقوام کی اخلاقی اور دماغی حالتوں کا مقابلہ کریں گے۔ اس مقابلہ سے صاف ظاہر ہو گا کہ ایک اعلیٰ درجے کا استقلال اور قوت عمل ہے۔ اور دوسرے میں کسی درجے کا ضعف اور

کمزوری ہے۔ کسی قوم کی دماغی اور اخلاقی صلاحتیں اس قوم کا وارث ہیں۔ جب ہم اخلاقی معیار پر غور کرتے ہیں تو اسلام کی تعلیمات ہماری راہیں منور کرتی ہیں۔ جس میں بڑائی کے روشن اصول اور ان اصولوں کے تحت بلال حبشی صحابہ کبار میں ہم مرتبہ وہم قرآن ہیں۔ حضرت زید بن حارثہ اور حضرت اسامہ بن زید آزاد شدہ غلام ہیں۔ مسلم افواج کے سپہ سالارن ہیں۔ جبکہ برگزیدہ صحابہ موجود ہیں۔

آریا صرف ہندوستان ہی میں نہیں آئے۔ جبکہ یورپ اور ایشیا کے بہت سے علاقوں میں چھاگئے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب سخندان فارس سے ایک شہ پارہ اقتباس قابل لحاظ ہے آپ لکھتے ہیں۔ ہاں یورپ میں علم زبان کے محققوں نے اپنے علم کے زریعہ اب استاپتا لگایا ہے کہ یونان کی تاریخ سے تقریباً ہزار برس پہلے وہی شرافت پناہ فرقہ جو اریا کہلاتا ہے۔ خاراخواو تاتار غرض وسط ایشیا سے اٹھا اور چاروں اطراف عالم میں پھیل گیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشخاص مذکور قدوں کے لمبے، رنگ وروپ سے گورے چٹے باپ دادا سے اولوالعزم اور ہمت والے چلے آتے تھے۔ خود شائستہ تھے اور جانتے تھے کہ شائستگی کے کام اور راحت و آرام کے سامان کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کی شاخ نے اپنے خیالات کو مذہبی نقش و نگار دے کر نگار خانہ چین سجایا۔ دوسرے نے یونان میں جاکر فلسفہ و حکمت کا طوفان باندھا۔ تیسرے نے روما کی بنیاد ڈال کر روئے زمین پر حکومت شاہی اور حکمت عملی کا نقارہ بجایا۔ ایک شاخ نے اندلس جاکر کیسئہ خاک سے نکالی۔ اور انگلستان سے خبر آئی کہ پانی سے مچھلیاں بلکہ پہاڑ کے سینے کو چیر کر لوہا تک نکال لائے۔ ہندوستان میں ہمالہ اتر کر آئے۔ اور برہمن دیوتا کہلائے۔ ایران میں شمشیر و گرز سنبھالا اور درفش کادیانی کو مرصع کر کے ہوا میں لہرایا۔ اور کہتے ہیں کہ قوم ہی کے نام سے ملک مذکور نے ایران نام پایا ہے۔ اسی کو یونان کی کتب قدیمہ آریان پکارتی ہیں۔ یہی آریا تھے جو کبھی کیانیہ اور کبھی ساسانیہ حکمرانوں کے روپ میں بھی نظر آئے۔ کبھی سکندر ذولقرنین اور کبھی سکندر اعظم، اور کبھی دارا کبھی یونان کے فلسفیوں کے روپ میں اور کبھی اشوک اعظم اور کبھی الفریڈ اعظم، اور کبھی جولیس سیزر جرنیل کے روپ میں اور کبھی چندر گپت موریہ کی صورت میں آریوں نے اپنا جوبن دکھایا۔ حضرت زرتشت، ارسطو، سقراط، افلاطون، گوتم بدھ، مہاویر جیسے مصلح دانشور، حکیم فلسفی آریوں میں آئے اور دنیا کی ایک بڑی آبادی کو متاثر کیا۔"

ان آریوں نے مختلف نام اپنائے۔ ہیلی اور ہیلینی خانہ بدوش قبائل جو یونان پر یلغار کر رہے تھے۔ ان آریوں کے بھائی بند تھے۔ جو ایران اور ہندوستان میں اپنا زور دکھا رہے تھے۔ گویا ہیلی اور ہیلینی آرین تھے اور انہیں یہ نام یونان کی طرف سے ملا تھا۔ ادھر ایشیائے کوچک پر جو قوم حملہ آور ہو رہی تھی۔ اور فتوحات حاصل کر رہی تھی۔ حطی نام سے معروف تھی۔ اسی قوم نے بابل کو تاراج کیا اور ارد گرد اپنی حکومتیں بنائیں۔ یہ آرین النسل تھی۔ آریوں کی ایک ہم قوم کسدی بھی تھی۔ جس نے عراق کے ارد گرد اپنی حکومت قائم کی کہا جاتا ہے عراق اور ایشیائے کوچک کے علاقوں پر کسدی اور حطی قبائل کا زور رہا۔ تاہم مرور زمانہ کے ساتھ دیگر اقوام سے خلط ملط ہو کر ان اقوام نے اپنی انفرادیت کھودی۔ اور پھر مقامی آبادیوں میں ضم ہو گئے پہلے لکھا گیا ہے۔ سیت اور سیتھین کہلانے والے لوگ بھی آریا تھے۔ جو دشت روس، بحیرہ کیسپین، کوہستان قاف کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے۔ نارڈک قبائل بھی آریا تھے۔ جنہوں نے یونان اور کریٹ پر یلغاریں کیں۔ ٹرائے کی جنگیں آریوں نے لڑیں وان کے قریب ہالدیوں کی جو ریاست قائم ہوئی وہ بھی آرین تھی۔ ان آریا قبائل نے آگے بڑھتے ہوئے ہنگری، پولینڈ، جرمنی، یونان، بلقان میں اپنی حکومتیں بنائیں۔ اسی زمانے میں ان معاشرتی میل ملاپ سے یونانی، لاطینی اور قدیم جرمن زبانوں کو فروغ ملا۔ مہابھارت اور رامائن کے واقعات ان آریوں سے متعلق ہیں۔ ان آریوں نے یورپ، ہندوستان اور ایران انڈو یورپین زبانوں کو رواج دیا۔ میری قبائل بھی آرین تھے جنہوں نے ایران میں میڈیا کے نام سے ایک حکومت قائم کی تھی۔ جسے بعد میں خسرو اعظم، ذوالقرنین نے اس حکومت کا خاتمہ کر کے ایک عظیم الشان ایرانی سلطنت قائم کی اس حکمران کے ہاتھ بڑے لمبے تھے۔ خسرو اعظم کا ذکر بائبل کے عہد نامہ عتیق میں آیا ہے۔ بہر حال آریوں نے دنیا میں ایک سے ایک نامور اور یادگار حکمرانیاں قائم کیں۔ نئی نئی تہذیبیں تخلیق کیں۔ زبانوں کے کئی خاندان پیدا کیے۔

آریوں نے یورپ میں اور ایشیا میں جہاں کہیں وہ رہے انہوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے مقامی لوگوں سے نسلی اختلاط کم سے کم کیا۔ لیکن مرور زمانہ وہ اس حد بندی کو قائم نہ رکھ سکے۔ بعد ازاں نسلی اختلاط کے مواقعوں سے استفادہ کیا جاتا رہا۔ نتیجتہً آریوں کی منفرد شناخت آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی۔ ڈاکٹر گستاولی بان کہتے ہیں۔ ایک مدت دراز سے ہند

میں آریوں کا وجود ہی نہیں کوئی کم و بیش آریا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ان کا رنگ سفید ہے۔ لیکن ہندی آریوں کی سفیدی یورپین اقوام تک نہیں پہنچتی۔ دراصل سفید یا سیاہ رنگوں کی تمیز اب کوئی ٹسٹ نہیں رہا۔ کیونکہ نسلی اختلاط بے انتہا ہو چکے ہیں۔ اور یہ بات حقائق کو چھوتی ہے کہ کوئی نسل خالص ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہندوستانی آریوں میں ابتدا کوئی منظم سیاسی نظام موجود نہ تھا۔ خاندان ہی بنیادی اور آخری اکائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ باپ پروہت بھی تھا، کاشتکار بھی اور سپاہی بھی۔ آریوں میں کوئی درجہ بندی نہ تھی۔ سب آریا برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ جنگ میں سب یکجا ہوتے۔ کھیتی باڑی کرتے، لکڑیاں کاٹتے، جنگل صاف کرتے، گاؤں بساتے سب مل کر کرتے۔ یہی وجہ ہے کاشتکاری کی زمینیں، چراگاہیں پانی کے ذرائع مشترکہ استعمال کرتے۔

آریوں میں عورت کو معزز مقام حاصل تھا۔ اسے کوئی کمتر مخلوق خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو اپنے پسند کی شادی کرنے اور شوہروں کے انتخاب کا حق حاصل تھا۔ باپ کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کی بڑی تعظیم کی جاتی مردوں کو کئی شادیاں کرنے کا اختیار تھا۔ خاندان میں بیٹے کی پیدائش کو اعزاز سمجھا جاتا کوئی شخص بغیر بیٹے کے مر جاتا تو سمجھا جاتا کہ وہ حیات جاودانی سے مرحوم ہوا۔

ویدی آریوں کے فنون کے حوالے سے جو باتیں سامنے آئی ہیں ان سے پتا چلتا ہے۔ کہ ان میں شاعری کا فن تھا۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتے ہیں۔ کہ ان کے بیش بہا لباس، سونے کی انگوٹھیاں، کپڑے اور سونے کی کلغیاں، ان کے لڑائی کے رتھ، سر پر باندھنے کے زیورات، ان کے ہتھیار خود، تلواریں، شیر دان وغیرہ اس امر کو ثابت کرتے ہیں کہ ان میں جولاہے، سونار، بڑھئی اور لوہار موجود تھے۔ ان میں لکڑی کے کاریگر بھی تھے یہ سوم رکھنے کے لئے لکڑی کے پیالے تراش کر بناتے تھے۔ محمد علی چراغ اپنی کتاب تاریخ پاکستان میں لکھتے ہیں۔ "دیہاتوں اور گھروں میں بعض مرد عورتیں اونی اور سوتی کپڑے بننے لگی تھیں۔ بڑھئی لوگوں نے بہت ترقی کر لی تھی۔ اور وہ اعلیٰ درجے کی تیز رفتار پہیوں والی بگھیاں بنانے لگے تھے۔" شروع میں آریا گائے کا گوشت کھاتے تھے۔ ابھی گائے کو وہ تقدس حاصل نہ ہوا تھا جو بعد ازاں ہوا۔ اگرچہ آریوں نے مقامی لوگوں کو اپنی زبان اور اپنا تمدن دیا۔ لیکن انہوں نے خود بھی مقامی لوگوں کے تمدن اور مذہبی عقائد سے زیادہ اثرات قبول کئے۔ شروع میں وہ گلہ بان تھے

لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے کھیتی باڑی کرنا بھی سیکھا۔ شادی کے موقع پر وہ بیل، گائے، گھوڑے ذبح کرتے اور ان کا گوشت بھی کھاتے۔ ایک قسم کا رس بطور شراب استعمال کرتے تھے۔ ناچ، پہلوانی، رتھوں، گھوڑوں کی دوڑ، تیر پھینکنا، آریوں کے محبوب مشغلے تھے۔

آریا شروع میں مظاہر قدرت کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے دیوتا بنالئے جو مخفی قوتوں کا مالک سمجھے جاتے تھے۔ اگنی آگ کا دیوتا، اندر بارش اور رعد، وایو ہوا، ورونا آسمان کا دیوتا تھا۔ آریا ان کی پرستش کرتے اور اپنی حاجات مانگتے۔ وہ خیرات کرتے اور اس سے فلاح پانے کی امیدیں بھی رکھتے۔ ان میں جوا کھیلنا عام تھا۔ اس کی واضح مثال پانڈووں اور کوروں میں جوئے بازی کا مقابلہ تھا۔ اس مقابلے میں پانڈو نہ صرف اپنی جاگیر گنوا بیٹھے بلکہ اپنی مشترکہ بیوی دروپدی کو بھی ہار بیٹھے۔ مہابھارت کی مشہور جنگ اس جوابازی کا نتیجہ تھی۔ وہ دو لکڑیوں کو رگڑ کر آگ حاصل کرنے کے فن سے واقف تھے وہ اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے۔ آریاؤں کی لڑائیاں دوبدو لڑائیاں بھی ہوتیں یعنی دو دو بہادروں کی مقابلہ کی لڑائیاں اسی نمونے کی لڑائیاں ایران میں رائج تھیں۔ رستم و سہراب کی مثالی لڑائیاں وہی آرین انداز کی لڑائیاں، تیر کمان، بھالے اور گرز کا استعمال ویسا ہی ملتا جلتا اس سے ان اقوام کے ایک جیسا ہونے کی شہادتیں ملتی ہیں۔ دشمن کو شکست دے کر اس کی عورت جیتنا کئی بھائیوں میں ایک عورت ہونا زیادہ عورتیں رکھنا معیوب افعال نہ تھے۔ مذہبی اعتقادات میں تغیر آتے آتے وہ وقت بھی آیا جب آریاؤں نے گائے کو ایک مقدس جانور کے طور پر تعظیم دینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ویدوں کی تعلیم میں یوں تبدیلیاں آئیں۔

1۔ سارا جہان اور کل دیوتا گویا گائے کا ہی سراپا ہیں۔ اتھروید

2۔ بیل نے زمین اور آسمان کو اٹھایا ہوا ہے۔ اتھروید

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں گائے کا گوہ اور پیشاب پینا گناہوں کی معافی کا ذریعہ خیال کیا گیا۔

منو کوشل خاندان سے تھا۔ وہ آریوں کا مصلح، پیغمبر، رشی، ہدایت کار، قانون ساز سبھی کچھ تھا۔ اس نے جو قانون وضع کیا اسے منوسمرتی کہتے ہیں۔ منو ہی نے آریوں کو چار ذاتوں میں تقسیم کیا اور ان کے الگ الگ فرائض متعین کیے اسی نے برہما کے منہ سے یہ کہلوایا کہ شودر کو برہموں کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ بیٹا لاولد مرتا تو وراثت اس کی ماں کو مل جاتی۔ ماں باپ کی ساری دولت بڑے بیٹے کو مل جاتی۔ چھوٹا اور منجھلا بھائی بڑے بھائی

سے گزارہ الاؤنس لیتے۔ بہر حال ہندوستان میں آ کر آریوں نے عقائد، رسومات، روایات کے ایسے ملغوبات پیدا کیے اور ایسے معاشرتی ڈھانچے کھڑے کیے کہ ان سے انسانی معاشرہ ہند پیچ گھاٹیوں میں گم ہو گیا۔ اس نظام میں انسانی مساوات کا کوئی ایک سلیقہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ چھوت چھات، ستی، بھر دین چکر، لنگ پرستی اور کئی قباحتیں ایسی ہیں کہ ان سے اشرف المخلوقات انسان کی خوبیاں پستیوں سے دوچار ہوتی ہیں۔ رونلڈ سیگل اپنی کتاب بھارت کے بحران میں لکھتے ہیں۔ "کہ اسی معاشرتی نظام کا نتیجہ ہے۔ کہ یہاں توہم پرستی، مردہ دلی، حرص طبیعت کی مسکینی، گھناؤنا پن، افلاس جیسی قباحتیں پیدا ہو گئیں ہیں۔"

باب 11

شین

شین شمالی علاقہ جات کی برگزیدہ اور حکمران قوم متصور ہوتی ہے۔ یہ شین ہی تھے جنھوں نے یشکن یابر شوں پر غلبہ حاصل کر کے اس طرف اپنی حکومتیں بنائیں۔ اس قوم نے اس علاقے کی تہذیب و ثقافت زبان وغیرہ پر دوررس اثرات ڈالے جن کے نتیجے میں ایک نیا معاشرتی نظام وجود میں آیا جن میں تفریق اور امتیازات کے پہلو موجود تھے۔ منتشر فکر کی وجہ سے معاشرہ ایک تناؤ کا شکار ہوا اور خطوطِ متارکہ کی پیدائش ہوئی کچھ منفی پہلوؤں سے ہٹ کر اغماض برت کر دیکھیں تو شین اور یشکن کی تہذیبوں کے ادغام سے ایک خلیق تمدن نے جنم لیا۔ ان اقوام نے ایک دوسرے کو بہت کچھ دیا میرے خیال میں کسی کو یہ زعم نہیں ہونا چاہیے کہ سب ان کا ہے۔ رومن اور یونانی آرین اور دراوڑی تہذیبیں ہمارے سامنے ہیں کہ ان اقوام نے ایک دوسرے سے بہت استفادہ کیا۔ کسی نے جنگ کے کرتب سکھائے تو کسی نے معاشرت کا سلجھاؤ دیا۔ کسی نے اپنی بولی دی تو کسی نے اپنا ماحول دیا۔ غرض دنیا میں جب تہذیبیں جنم لیتی ہیں تو یہ موجود خام مواد کو ضروری جذب و تحلیل کر کے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

شمالی علاقہ جات وسط ایشیا میں واقع ہیں۔ اگرچہ یہ چار طرف پہاڑوں سے گھرے ہوئے ہیں لیکن اپنے بے شمار دروں اور راستوں کے ذریعے ہر طرف سے قابل رسائی ہیں۔ جب وسط ایشیا میں مختلف زمانوں میں اقوام کا خروج ہوا تو مختلف[1] قوموں کے بٹے جتھے یہاں بھی آئے گئے۔ پھر وسط ایشیا میں جتنی لڑائیاں لڑی گئیں ان کا اثر بھی ہمارے ان علاقوں پر ہوا یہ علاقے چونکہ تنگ وادیاں بناتے ہیں اور یہ وسیع میدان جنگ کے لئے ناموزوں ہیں اس لئے بھگوڑے اور شکست خوردہ جتھے بھی جائے پناہ کی تلاش میں یہاں آتے رہے۔ اور یہی وجہ ہے بہت قدیم زمانے سے یہ علاقے مورخین کی نظر میں رہے۔ انھوں نے ہمارے علاقوں کو مختلف نام دیئے اور اُن تمام اثرات پر نظر رکھی جنگی زد میں یہ علاقے آئے۔ اسی حوالے سے ان علاقوں پر نظر ڈالی جائے تو اس زمین اور اس پر بودوباش رکھنے والے لوگوں کی قدامت کا پتہ

چلتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں مہابھارت میں شینوں اور ان کے علاقہ کا تذکرہ موجود ہے۔ ڈاکٹر گستاولی بان اپنی کتاب تمدن ہند میں لکھتے ہیں۔ ''کہ وہ خطہ جس میں سندھ کی ندی شمال سے جنوب کی طرف ننگا پربت سے گھومتی ہوئی بہتی ہے دردستان کہلاتا ہے۔ یہاں کے باشندے بالکل علیحدہ ہوتے ہیں۔ نسل میں آریا معلوم ہوتے ہیں ان کے قد بلند، رنگ صاف اور چہرے بیضوی ہیں۔ اگرچہ مذہب ان کا اسلام ہے لیکن ان میں ذات موجود ہے۔ سب سے اونچا درجہ اس ذات کا ہے جس کو شین کہتے ہیں۔ ان کا ذکر مہابھارت اور منوشاستر میں پایا جاتا ہے۔ اس نام سے بعض یورپین مصنفین نے خیال کیا ہے کہ دردستان کے باشندے چینی الاصل ہیں۔ فاضل مصنف پھر لکھتے ہیں کہ درد اس خطے کی حاکم قوم ہے اور یہاں کے اصلی باشندے جو ان کے تحت ہیں ڈوم ہیں۔ یہ من جملہ اصلی اقوام ہند کے ہیں اور پنجاب کے بلکہ شمالی راجپوتانہ تک موجود ہیں ان کی جلد سیاہ ہے۔ درد ایک آزاد اور مغرور قوم ہے یاغستان جس میں اسی قوم کی ایک شاخ بستی ہے۔ انگریزوں نے ملک باغی کا نام دیا ہے۔ کیونکہ یہ بھی زیر نہ ہو سکے دردستان کی زبان پشتو سے ملی ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر بنیر جی اپنی کتاب اشوریا انڈیا میں کورو اور پانڈو کی لڑائیوں کے تسلسل میں کہتے ہیں کہ کورو قبیلہ چترال اور گلگت کے راستے شمال مغربی ہندوستان میں داخل ہوا اور وہ بعض ان شکستوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو کوروں کو ہوئیں۔ اور غالباً یہی شکستیں تھیں کہ جو کوروں کو دردستان سے وادی سندھ اور پانچ دریاؤں کی سرزمین میں لے آئی تھیں۔ رشید ندوی اپنی کتاب ارض پاکستان کی تاریخ میں کہتے ہیں کہ کورو چترال اور گلگت کے راستے سے کشمیر پہنچے تھے۔

بالا لحاظ اس کے کہ گلگت کے شین آریا ہیں یا چینی الاصل یا وہ پشتو جیسی زبان بولتے ہیں ان پر بعد ازاں غور کیا جائے گا۔ یہاں قدامت کے اصول پر توجہ دی جائے گی کہ کورو اور پانڈو کی لڑائیاں کب ہوئیں اور مہابھارت کی نظم کب تخلیق ہوئی۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ مہابھارت کی جنگ تین ہزار قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ جبکہ یورپین مورخین کا خیال ہے کہ یہ جنگ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے ہوئی۔ دونوں صورتوں میں یہ معلوم ہوا کہ یہ علاقے اور یہ قوم علماء کی توجہ میں تھی۔ کورو اور پانڈو کا مرکز ہستناپور، دہلی کے ارد گرد تھا یہاں کوروں کا چترال، گلگت کی طرف سے ان علاقوں کی طرف بڑھنا عجیب سا لگتا ہے۔ مہابھارت ہو یا رامائن یا کیسر (قیصر) کی کہانی الف لیلہ ہو یا داستان امیر حمزہ ان میں کرداروں کو دور دور دنیا میں گھومایا جاتا ہے۔ اور قصہ برائے قصہ کے طور پر جزویات پیدا کی

جاتی ہیں۔ واقعات جیسے بھی ہوں مہابھارت کی نظم جب لکھی جارہی تھی۔ تو نظم کے مصنف رشی ویدویاس کے علم میں شین قوم اور شینوں کا وطن تھا۔

اسی قدامت کے تسلسل میں کچھ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے علاقوں میں آنے والے آریا ہندوستان کے میدانی علاقوں سے گزر کر نہیں آئے بلکہ انھوں نے یہاں آنے کے لئے مختصر راستے استعمال کیے۔ ایران/ افغانستان سے سوات کے راستے ان علاقوں میں داخل ہوئے۔ آریوں کا یہ اولیں جتھا تھا۔ جس نے ہندوپاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہی جتھا کشن گنگا، شردی، گریز، جنوب مشرقی چلاس کی طرف آباد ہوا۔ یہ وید، اوستا، یونانی، لاطینی سے ملتی جلتی زبان بولتے تھے اور اس طرف یہ لوگ پشاچہ کہلائے۔ یہ بڑے جنگجو، خونخوار اور وحشی تھے۔ یہ تانگیر سے چترال کی طرف بھی چلے گئے انہوں نے ہی کشمیر آباد کیا ان کے وحشی پن کو دیکھ کر کشمیر کی طرف رہنے والے لوگوں نے انہیں پشاچہ کہا۔ پشاچہ کے معنی بدروح، راکشس، نیم مہذب وحشی اور اُجڈ کے ہیں۔ کروک اپنی کتاب دی نیٹیو ریسز آف دی ناردرن انڈیا (صفحہ 239) میں پشاچہ کے معنی بدروح اور راکس کے معنی دیو اور آدم خور کے بتاتا ہے یہ پشاچہ لوگ شمال کی طرف گلگت ور شگوم، ہنزہ، نگر کی طرف نہیں آئے۔ کشن گنگا کے اردگرد علاقوں میں پشاچی نے اپنا روپ جمایا اور بولیوں کی لڑیاں جوڑنے کا کام شروع کیا۔

پشاچہ اور کھاشہ ایک ساتھ ان علاقوں میں آئے اور ایک دوسرے کے زیادہ قریب تھے۔ گریئرسن کھاشہ کو پشاچہ کی شاخ قرار دیتے ہیں۔ کھاشہ جنوبی ہمالیہ سے گزر کر مشرقی پہاڑی علاقوں کے ڈھلوانوں میں آباد ہو گئے۔ یہ پشاچہ چونکہ کشمیر پر مسلط ہو گئے تھے اس لئے یہاں ابتداً کشمیری زبان کا ہیولیٰ تیار ہوتا رہا یہ بھی یاد رہے چونکہ پشاچہ افغانستان کے پہاڑوں سے گزر کر سوات کے راستے یہاں آئے تھے۔ اس لئے یہ اس وقت ہند میں موجود کسی ہندو معاشرتی نظام سے بہرہ ورنہ تھے اور ان کا جو کچھ معاشرتی سرمایہ تھا وہ ہند آریائی اور ایرانی ماحول کا پیدا کردہ تھا۔ پشاچہ اقوام نے کافر، کھوار، شنا، کوہستانی اور کشمیری بولیوں کو ہڈیوں کا ڈھانچہ فراہم کیا لیکن ابھی اس ڈھانچہ میں جان نہیں پڑی تھی۔

تاریخ نے پھر ایک کروٹ لی اور آریاؤں کے بڑے بڑے جتھوں نے افغانستان اور ایران کی طرف سے ہندوپاکستان کی طرف نقل مکانی شروع کی۔ آریوں کے یہ جتھے کہیں کہیں رکتے ہوئے، ستاتے ہوئے مختلف راستوں سے ہند میں وارد ہونا شروع ہوئے۔ ہندوستان میں ان کا سامنا دراوڑوں سے ہوا۔ یہاں دراوڑوں کے علاوہ کول، منگول وغیرہ

قومیں بھی آباد تھیں۔ آریوں کو ان مقامی قوموں پر غلبہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ کیونکہ یہ لوگ فن جنگ میں زیادہ ماہر تھے۔ بہر حال تھوڑے عرصے میں آریا ہندوستان پنجاب، گنگا جمنا کا دوابہ میں پھیلتے گئے۔ اپنی سہولت اور نئے معاشرہ کی ضروریات پورا کرنے کے لئے آریا چار ذاتوں برہمن، کھشتری، ویش اور شودر میں بٹ گئے۔

بہت سے دراوڑ آریوں سے جنگ میں شکست کھا کر کوئی دکن کی طرف بھاگا اور بہت سے کشمیر، گلگت اور چترال کے پہاڑی علاقوں تک بھی آ گئے۔ آریوں کے کچھ جتھے شمال کی طرف پھیل گئے تھے۔ وادی سندھ میں شمال کی طرف بڑھتے گئے۔ پشاچہ علاقوں میں آنے والے لوگ یہاں دارد کہلانے لگے اور انہیں دارد کہنے والا پہلا شخص بابائے تاریخ ہیروڈوٹس یونانی مورخ تھا جس کا پانچویں قبل مسیح کے زمانے سے تعلق تھا۔ ہیروڈوٹس نے ان اقوام کو دارو کیوں کہا کہ اس کی کوئی واضح توضیح ابھی تک نہیں ملی۔ سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل کہتے ہیں۔ اس قوم کی شناخت ابھی تک نہیں کی جا سکی اور بغیر ہیروڈوٹس کے اور کسی نے اس قوم کا ذکر بھی نہیں کیا۔ البتہ سٹریبو نے "درادی" اور بطلموس نے داردرنی یا دارندی کے نام سے ایک قوم کا ذکر کیا ہے اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید ہیروڈوٹس کا وادیکے اور دوسرے مورخین کے مذکورہ نام ایک ہی قوم کے ہوں (صفحہ 80 پشتون تاریخ) راج ترنگنی کو پنڈت کلہن نے راجہ جے سنگھ والئی کشمیر کے عہد (1128ء تا 1149ء) میں بہ زبان سنسکرت تحریر کیا۔ اس کتاب میں اس طرف لوگوں کو دارو قوم، درداز اور دارددوں کے وطن کو درددیسا کہا ہے۔ ہیروڈوٹس، میگھسترز اور پھر کلہن نے ہی ان اصطلاح استعمال نہیں ہوئی۔ سٹائن راج ترنگنی کے دیباچہ میں اس قوم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے وطنی حدود میں ہیروڈوٹس سے لے کر اب تک کوئی فرق نہیں آیا اور یہ علاقے چترال، یاسین، گلگت، چلاس، بونجی اور کشمیر کے متصل وادی کشن گنگا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ وادی کشن گنگا کے اردگرد آباد قبائل زیادہ تر دارواز یا دارو کہلاتے ہیں۔ اس کتاب میں دارددوں کے ساتھ بھوٹاز کا بھی عام تذکرہ ہوا ہے کلہم بھوٹاز کو دراس لداخ، سکردو کی طرف آباد اقوام کا نام دیتا ہے۔ یہ درداز اور بھوٹاز جو ایک ہی تھے۔ کسی طرف جدا ہوئے لیکن انہوں نے کشمیر اور اردگرد حملے جاری رکھے۔ آریوں کے بعد میں آنے والے یہی دارد قبائل تھے۔ جنہوں نے کشن گنگا، تانگیر، چلاس، چترال کی طرف اپنے ہی ہم جنس پشاچہ قبائل کو مغلوب کیا اور اپنے آپ میں ضم کیا۔ اب یہاں بولی جانے والی زبانیں پشاچہ سے نکل کر داردی کہلائیں۔ بنیادی

طور پر پشاچہ زبانوں اور ہند آریائی زبانوں کا ذخیرہ الفاظ ایک تھا۔ داردی زبانوں میں اب سنسکرت اور ہند آریائی پراکرتوں کے اثرات شامل ہوئے یہ دارد لوگ ہندو ذات پات کے معاشرہ سے بھی بہرہ ور تھے۔

ہیروڈوٹس، میگھتھنز اور دیگر یونانی مورخین کے بیانات کی بنیاد پر سنسکرت لٹریچر میں داردی زبان داردون اور داردویسا کا عام ذکر ہوا۔ اور پھر پہلا یورپین سیاح جس نے دارد، اصطلاح کا استعمال کیا وہ مسٹر Hayward تھے۔ ڈاکٹر لٹز کا کہنا ہے کہ دارد اور دردستان کے الفاظ مسٹر ہے وارڈ نے استعمال کئے لیکن میرے خیال میں Hayward نے محض دارد کہا اور دردستان فارسی لاحقہ لگا کر کسی مسلمان مورخ یا سیاح کا استعمال کردہ نظر آتا ہے۔

فریڈرک ڈریو ایک بحث کے بعد یہ کہتے ہیں کہ دارد لازمی طور پر ایک آرین قوم ہے جسمانی طور پر وہ چوڑھے کندھے، مضبوط اور متناسب جسموں کے لوگ ہیں۔ وہ چست اور متحمل مزاج ہیں۔ وہ اچھے کوہ پیما ہیں۔ ان کے بال سیاہ اور بعض کے بھورے دیکھے گئے ہیں ان کے بولنے کا لہجہ درشت قسم کا ہے۔ آنکھیں بھوری اور نیلی رکھتے ہیں۔ وہ نرم دل لیکن دلیر ہیں اور اپنے حق کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اگرچہ کشمیریوں کی طرح تو نہیں لیکن ذہین اور تیز ہوتے ہیں۔

میں اپنے تجزیے پہلے لکھ چکا ہوں۔ پشاچہ اور دارد نسلی طور پر دونوں آرین ہیں اور دارد قوم جو زبانیں بولتی ہے۔ مثلاً کھوار، کافر، کوہستانی، شینا، کشمیری، داردی زبانیں کہلاتی ہیں۔ یہ زبانیں بولنے والے لوگ آریا ہیں۔ اگرچہ اب اور لوگ بھی یہ زبانیں بولتے ہیں مگر وہ آریا نہیں۔

جٹ مار دارد اور داربل میں ایک قریبی مماثلت محسوس کرتے ہیں وہ اس بات پر حیران ہیں کہ راج ترنگنی میں دارداز کی سرزمین اور داردویسا کا بار بار ذکر آیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں کلہن نے اس طرف کے بہت سے شہروں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن تالی لو (داریل) کا کوئی ذکر نہیں کیا وہ کہتے ہیں ذکر نہ کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ تالی لو کو دردویسا کا مرکز یا مبدل سمجھتے ہوں۔ میرے خیال میں پنڈت کلہن نے محض نام استعمال کئے جو سنسکرت لٹریچر میں موجود تھے۔ چنانچہ راج ترنگنی میں چینی نام بلور، بلور صغیر، بلور اصغر، تالی لو، چووی یا شینگ می، چن تسی کسی علاقے کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے دردستان یا دردویسا کا مرکز کشمیر کے متصل تھا۔ گریز، لولاب، کنزلوان، شردی، تھک، جل کیل وغیرہ علاقے اس

طور پر پشاچہ زبانوں اور ہند آریائی زبانوں کا ذخیرہ الفاظ ایک تھا۔ داردی زبانوں میں اب سنسکرت اور ہند آریائی پراکرتوں کے اثرات شامل ہوئے یہ دارد لوگ ہندو ذات پات کے معاشرہ سے بھی بہر دور تھے۔

ہیروڈوٹس، میگھنز اور دیگر یونانی مورخین کے بیانات کی بنیاد پر سنسکرت لٹریچر میں داردی زبان داردون اور دارددیسا کا عام ذکر ہوا۔ اور پھر پہلا یورپین سیاح جس نے دارد، اصطلاح کا استعمال کیا وہ مسٹر Hayward تھے۔ ڈاکٹر لٹز کا کہنا ہے کہ دارد اور دردستان کے الفاظ مسٹر ہے وارڈ نے استعمال کئے لیکن میرے خیال میں Hayward نے محض دارد کہا اور دردستان فارسی لاحقہ لگاکر کسی مسلمان مورخ یا سیاح کا استعمال کردہ نظر آتا ہے۔

فریڈرک ڈریو ایک بحث کے بعد یہ کہتے ہیں کہ دارد لازمی طور پر ایک آرین قوم ہے جسمانی طور پر وہ چوڑھے کندھے، مضبوط اور متناسب جسموں کے لوگ ہیں۔ وہ چست اور محمل مزاج ہیں۔ وہ اچھے کوہ پیما ہیں۔ ان کے بال سیاہ اور بعض کے بھورے دیکھے گئے ہیں ان کے بولنے کا لہجہ درشت قسم کا ہے۔ آنکھیں بھوری اور نیلی رکھتے ہیں۔ وہ نرم دل لیکن دلیر ہیں اور اپنے حق کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اگرچہ کشمیریوں کی طرح تو نہیں لیکن ذہین اور تیز ہوتے ہیں۔

میں اپنے تجزیے پہلے لکھ چکا ہوں۔ پشاچہ اور دارد نسلی طور پر دونوں آرین ہیں اور دارد قوم جو زبانیں بولتی ہے۔ مثلاً کھوار، کافر، کوہستانی، شینا، کشمیری، داردی زبانیں کہلاتی ہیں۔ یہ زبانیں بولنے والے لوگ آریا ہیں۔ اگرچہ اب اور لوگ بھی یہ زبانیں بولتے ہیں مگر وہ آریا نہیں۔

جٹ مار دارد اور داریل میں ایک قریبی مماثلت محسوس کرتے ہیں وہ اس بات پر حیران ہیں کہ راج ترنگنی میں درداز کی سرزمین اور دارددیسا کا بار بار ذکر آیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں کلہن نے اس طرف کے بہت سے شہروں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن تالی لو (داریل) کا کوئی ذکر نہیں کیا وہ کہتے ہیں ذکر نہ کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ تالی لو کو درددیسا کا مرکز یا مبدل سمجھتے ہوں۔ میرے خیال میں پنڈت کلہن نے محض نام استعمال کئے جو سنسکرت لٹریچر میں موجود تھے۔ چنانچہ راج ترنگنی میں چینی نام بلور، بلور صغیر، بلور اصغر، تالی لو، چودی یا شینگ می، چن تسی کسی علاقے کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے دردستان یا درد دیسا کا مرکز کشمیر کے متصل تھا۔ گریز، لولاب، کنزلوان، شردی، تھک، جل کیل وغیرہ علاقے اس

دردستیامیں واقع تھے۔اور یہاں داردوں نے مضبوط حکومتیں قائم کی تھیں۔ اور یہیں سے یہ کشمیر اور شمال کی طرف گلگت پر حملے کرتے رہے اور اپنی حکومت کو وسعت دیتے رہے جٹ مار، ہیروڈوٹس، میگھنز یونانی اور لاطینی ادب کے حوالے سے یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ صورت حال جیسی بھی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی دور میں یہ دارد ک قبائل باقت کا ماخذ رہے ہیں اور کبھی ان داردی یا دارد ک قبائل کسی کنفیڈریشن سے جڑ کر گندھارین حکومت سے وابستہ تھے۔ کبھی انہوں نے سوات پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ کلہن ایک جگہ کہتے ہیں وہ لوگ جن کو فاتح داردوں نے پکڑ لیا یا مار لیا ان کے دشمن پانی میں بہے کوئی شمار نہیں کیا جاسکا۔ پھر وہ لکھتے ہیں۔ متکبر او کلا مالا اور اس کا لڑکا ہی تھے۔ جو داردوں کے اس سیلاب کے سامنے چٹان بن کر ڈٹ گئے تھے پھر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ کشمیری دارد سپاہیوں کے ساتھ نبرد آزما ہوئے لیکن داردوں نے بڑے بڑے پتھر کشمیریوں پر لڑکائے اور ان کو ان کے مضبوط قلعہ کی وجہ سے شکست نہیں دیا جاسکتا تھا۔

کلہن پھر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ بہادر وجیلا مالا اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کی نظروں سے او جھل ہوا اور لاہارا کے راستے داردوں کے ملک کی طرف روانہ ہوا۔ اگرچہ کانڈرپا لارڈ آف دی گیٹ نے تمام راست مسدود کردئے تھے۔ وہ پہاڑوں کو عبور کر کے داردوں کے قصبہ دردپوری جو پہاڑوں میں پوشیدہ تھا آپہنچا۔ سٹائن راج ترنگنی کے 912 کے بارے پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

" By the town of the Dards mentioned here and viii 1153, is perhaps meant the modern gure2, the chief place of the upper kishanganga valley; comp Drew Jummu PP 394 sg. The epithet girgupta, hidden in the mountains would well apply to that place Gure2 lies in a valley whose level ground is nowhere more than one mile broad, all around rise high mountain ranges.

کشمیر کا حکمران للتادیتیا داردوں کی شراب خوری پر نالاں رہتا تھا۔ راج ترنگنی میں داردوں کو فسادگیر، شرپسند، مفسد اور فتنہ پرداز قرار دیا گیا ہے۔ جٹ مار کہتے ہیں۔ کہ گیارھویں صدی میں داردستان کے حکمران اور کشمیر کے حکمران برابر کے شریک کار نظر آتے

ہیں۔ یہاں کے حکمران کشمیر میں پناہ لیتے تھے۔ یہ بات درست ہے کہ مسلمان اور چینی عالموں نے دارد اور کشمیریوں نے بلور کے اصطلاحات استعمال نہیں کیے۔ میرے نزدیک بلور کی ایک الگ سیاسی وحدت تھی اور دردویسا کی ایک الگ سیاسی قوت بلور کا تعلق بروزا، بروشال سے تھا اور دردویسا یا دردستان کا داردوں سے۔ کلہن ایک جگہ لکھتے ہیں جب کشمیر کا بادشاہ من دھرا سے جو داردوں کا حکمران تھا۔ سے ملنے شہر سے باہر گیا تو بادشاہ کے نوکروں نے گار کا کو موت کے گھاٹ اتار دیا پھر ایک جگہ لکھتے ہیں۔ جب وہ شان و شوکت سے حکومت کر رہا تھا ان دنوں داردوں کا حکمران یشودھرا فوت ہو گیا تھا۔ پھر ایک جگہ لکھتے ہیں۔ جاہ طلب دارداز پہاڑوں پر برف پگھلنے کے منتظر تھے اور ان کے گھوڑے بھی تیار تھے۔ سٹائن یہاں اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ گریز کی طرف اچھے گھوڑے ملتے ہیں۔ کلہن ایک جگہ پھر لکھتے ہیں وہ بھوجا بھاگتے ہوئے داردوں کے علاقہ میں جانا چاہتا تھا۔ جہاں اسے ایک اچھے استقبال کی امید تھی۔ پھر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ داردوں کے حکمران سردار جمع کر رہے تھے ان کے کن فیڈریشن کے لوگ ہر طرف سے بھوجا کے سامنے آئے۔ پھر جب شہزادہ ان کے پیچھے جاتا رہا تو اسے معلوم ہوا داردوں کا حکمران آ پہنچا ہے۔ مغرور دارد فوج پہاڑوں سے اتری تاکہ دشمن سے سونے سے لدے گھوڑے چھینے ان اقتباسات سے یہ قطعی واضح ہوتا ہے کہ داردوں کا وطن اور ان کا اصل مرکز وادی کشن گنگا میں تھا۔ من دھرا اور یشودھرا داردوں کے جن حکمرانوں کا نام یہاں دیا گیا ہے۔ وہ بھی اسی ایریا سے متعلق تھے اور ان کا مرکز گلگت کی طرف کہیں نہ تھا۔ بیرونی دنیا کے مورخین نے داردیا داردستان کا ذکر محض ان بولیوں کے حوالے سے کیا۔ جو چترال، گلگت، یاسین، تانگیر، چلاس، بونجی، کیل، گریز، لولاب وغیرہ میں بولی جاتی تھیں۔ ایم اے سٹائن کہتے ہیں شردی سے اوپر بالائی وادی کشن گنگا میں قدیم زبان میں دارد رہتے تھے۔ جن کو کلہن کشمیر کے قریبی ہم سایہ قرار دیتا ہے۔ ان کا حلقہ دور شمال کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جو آج چترال، یاسین، گلگت کے علاقے ہیں۔ میگھنز ان کی موجودگی کو بالائی سندھ میں بھی پاتا تھا اور کلہن ان کو شمال کی طرف موجود ملیچھ کہہ کر پکارتا ہے۔

بہر حال کلہن، سنسکرتی لٹریچر کے علماء ہیروڈوٹس اور پھر یورپین علماء کے ذہنوں میں دردستان یا دردویسا کے مراکز الگ الگ متعین تھے۔ کلہن وغیرہ کے نزدیک دردویسا کشمیر کے بالکل متصل علاقے یعنی وادی کشن گنگا پر مشتمل تھے۔ ہیروڈوٹس کے نزدیک بھی ان ہی علاقوں کے لوگ دارد کہلائے۔ لیکن یورپین ماہرین لسان، مورخین نے جب داردی زبانوں

کے خاندان جوڑے تو انہیں یہ مراکز پھیلے نظر آئے۔ انہوں نے چترال، یاسین، گلگت، داریل، تانگیر، چلاس، گریز اور استور کے علاقے بھی اس میں ملا دیئے۔ تاہم کشمیر، کوہستان یا لداخ اس تصور سے ماورا تھے۔ حالانکہ ان علاقوں میں بھی (بلتستان اور لداخ میں بلتی چھوڑ کر) داردی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان تمام علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو نہ تو کسی دردستان نام کی سیاسی وحدت کا علم تھا۔ اور نہ دارد یا درد کو اپنی کوئی شناخت سمجھتے تھے۔ یہاں کے لوگوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو درد کے طور پر پیش نہیں کیا۔ یورپین علماء نے محض لسانی، معاشرتی اور جغرافیائی مماثلتوں کو دکھانے کے لئے درد اور دردستان کے اصطلاحات اپنے لٹریچر میں استعمال کیے۔ نسلی اعتبار سے یہاں بڑی افراط و تفریط ہے۔ یاسین، ہنزہ، نگر، پونیال، اشکومن، گوپس، گلگت، داریل و تانگیر، استور، گریز میں مختلف نسلی گروپس آباد ہیں۔ اگر داردوں کو آریا مان لیا جائے اور اس بنیاد پر ان علاقوں کو دردستان قرار دیا جائے تو دوسری آبادیاں جو اس نقطہ نظر پر پوری نہیں اترتیں۔ اور وہ اکثریت میں بھی ہوں تو دردستان کی اصطلاح کوئی مقاصد پورے نہیں کرے گی۔ پھر بلور کی بھی ایک اصطلاح ہے جو کچھ اور وحدتوں کا اظہار کرتی ہے۔ بلور ایک سیاسی وحدت رہی ہے۔ جبکہ دردستان کبھی سیاسی وحدت کے طور پر نظر نہیں آئی۔ جہاں تک ان علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے نسلی تشخص کا تعلق ہے یہاں کے لوگ واضح طور پر مختلف نسلی گروپوں کے تحت درجہ بند ہیں۔ مثلاً شین، یشکن، کمین وغیرہ یہاں اس حوالے سے بھی بحث ہو گی۔ پھر بلور اور دردستان کی بھی باتیں ہو نگی۔

ڈریو ذاتوں کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔ "کہ داردوں میں ذات برادری کی تقسیم موجود ہے۔ اور اس تقسیم کو باہمی شادیوں کے اصولوں سے منضبط رکھا جاتا ہے۔ اس میں اس علاقے پر حکومت کرنے کے تسلسل اور ایک دوسرے پر فوقیت کے اعتبار سے ذاتیں وجود میں آئی ہیں۔ میری تفتیش کے مطابق درجہ اور اہمیت کے اعتبار سے یہاں ذاتیں کچھ اس طرح صف بند ہیں۔

1۔ رانو
2۔ شین
3۔ یشکن
4۔ کرمین

5۔ ڈوم

اس ترتیب کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ ڈریو پھر لکھتے ہیں۔ " کہ ہم پھر اس قوم کی طرف آتے ہیں۔ جو عمومی تقسیم کے مطابق چار قوموں میں سے اعلیٰ ذات ہے۔ بعض الگ تھلگ علاقوں میں ان کی کثرت ہے اور یہ اپنی پوری آبادی بناتے ہیں۔ لیکن گلگت اور استور میں ایسی صورت نہیں یہاں یشکن زیادہ تعداد میں ملتے ہیں۔ مقابلتہ اور داردوں کے شنوں کی بعض خصوصیات قابل توجہ ہیں اور کسی دن ان بنیادوں پر ان کے ماخذ کے بارے میں پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ان کا گائے سے نفرت کا سوال وہ اس طرح گائے سے کراہت محسوس کرتے ہیں جس طرف مسلمان سور سے۔ وہ گائے کا دودھ نہیں پیتے۔ اور نہ اس سے مکھن بناتے ہیں۔ جیسا کہ مشرقی علاقوں میں گائے کا گوبر عام استعمال ہوتا ہے۔ یہ گائے کا گوبر استعمال نہیں کرتے وہ بصد مجبوری بیلوں کو ہل چلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ حتی المقدور بچھڑوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ بلکہ چھڑیوں سے آگے پیچھے کرتے ہیں۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اس معاملے میں ان کا اور ہندوؤں میں کتنا فرق ہے۔ ہندو گائے کا احترام کرتے ہیں جب کہ یہاں کے شین اس سے کراہت محسوس کرتے ہیں۔ دشمکن کی طرف موجود شین نہ تو مرغے مرغیاں کو چھوتے ہیں اور نہ ان کا گوشت کھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ ہندوؤں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہاں کے لوگ تمباکو اور سرخ مرچ کاشت کرنے سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں جانتا یہ بات اور شنوں میں بھی موجود ہے یا نہیں۔ شنوں میں یہ بدشی نظام اب ختم ہو رہا ہے۔ اور اس نظام کی باقیات ان جگھوں پر ملتی ہیں جہاں شین اکثریت میں ہیں اور وہ دیگر قوموں سے جداگانہ رہتے ہیں۔ شین اور یشکن وادی سندھ کے علاقوں میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ یشکن شنوں کے بغیر زیادہ دور علاقوں مثلاً نگر، ہنزہ، اشکومن، یاسین اور چترال کی طرف رہتے ہیں۔"

میجر براؤن ذی گلگت ری بلین 1947ء میں لکھتے ہیں۔ " شناکی کی طرف بڑے بوڑھے سردار اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک ہندو سردار کی اولاد ہیں جو لاہور کی طرف سے براہ کاغان آیا تھا۔ یہ مہاجرت کب ہوئی اس کا صحیح اندازہ نہیں۔ تاہم یہ بتایا جاتا ہے۔ نو نسلیں گزریں انہیں سیدوں نے جو کاغان کی طرف سے آئے مسلمان کیا۔ بہر حال یہاں عام لوگ اپنے بارے میں ایک اور خیال پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں وہ قریشی ہیں جس سے آنحضور ﷺ بھی تھے۔ حضور ﷺ جب مکہ میں اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ایک بھائی

جس کا نام گوری تھم تھا۔ اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور وہ وہاں سے بھاگ کر تھک آیا۔ اور اسی نے تھک آباد کیا۔ اس لئے تھک کے لوگ باقی چلاسیوں سے اپنے آپ کو فائق سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک ہندو شہزادے کی اولاد ہیں۔ گور کے لوگ ایک اور دلچسپ کہانی سناتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے ایک پری جس کا نام وتاس تھا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ آسمان سے اتری۔ اس نے گیئں بالا سے کوئی پاکیزہ پانی پیا اور اس سے وہ حاملہ ہو گئی۔ اس سے ایک لڑکا اور اس کے بھائی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی ان بچوں کی باہم شادی ہوئی اور ان کے تین لڑکوں نے گور کے تین گاؤں آباد کئے۔"

ڈاکٹر لٹز "دردستان ان 1866، 1886 اور 1893 میں لکھتے ہیں۔ دردستان کا نام سنسکرت دردا اور فارسی "ستان" کا مرکب ہے اور اب یہ مقبول عام نظر آتا ہے۔ میں اس میں وہ تمام علاقے شامل کرتا ہوں۔ جو ہندوکش اور کاغان کے درمیان عرض بلد 37 شمالی اور طول بلد 73 مشرقی اور عرض بلد 35 شمالی اور طول بلد 74-30' مشرقی کے درمیان واقع ہیں۔ میں اس میں شناکی کے پہاڑی علاقوں کے ساتھ چلاس، استور، گلگت، داریل، ہنزہ، نگر، یاسین، چترال اور کافرستان کے علاقے شامل کرتا ہوں۔ دارونام کوئی بھی مقامی اپنے آپ کو اس حوالے سے نہیں جانتا۔ دردستان نام مسٹر Hayward نے استعمال کیا ہے۔ چلاس، استور، داریل، گور، گلگت کے لوگ شین ہیں۔ ان علاقوں کے لوگ گریز کے لوگوں کو شین نہیں سمجھتے۔ حالانکہ گریزی خود اپنے آپ کو شین خیال کرتے ہیں۔ گریزی بولی بلاشک وشبہ کشمیری ملی شینا ہے۔ شین اپنے لئے شین، شنالوک شینا کی اصطلاحات استعمال کرنا فخر محسوس کرتے ہیں۔ اوپر دیئے علاقوں کے لئے علاوہ تانگیر، کولی، پالس، میں بھی شین ملتے ہیں۔ کولی، پالس میں موجود یہ افغانوں کے ساتھ رہتے ہین۔ کچھ لوگ کولی اور پالس کے لوگوں کو شین نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ شنا اور پشتو دونوں زبانیں بولتے ہیں۔ بلتی لوگ (تبت خورد) شین اور نگر کے لوگوں کو بردکپا کہتے ہیں۔ یا بطور عزت بردکپابابو کہتے ہیں۔ ان شنوں کی کچھ شاخیں تبت خورد اور دراس میں بھی ملتی ہیں۔ میں پہلا شخص تھا جس نے تبت خورد میں ان کی کالونیاں دریافت کیں۔ مثلاً ھنگوس، ساس پور، برالدو، بشو، دنل، داروٹ، دروا اور روندو وغیرہ۔ چلاسی اپنے آپ کو بھوٹ کہتے ہیں۔ دردستان میں مت چک اب ایک ناپید قوم ہے۔ بھوٹ اور مت چکوں کی لڑائی ہوئی جس میں مت چکوں کو شکست ہوئی۔ اور یہ لوگ استور اور تبت خورد علاقے کی طرف بھاگ گئے۔ شین اونچی ذات ہے شنالوگ استوری

ہوں۔ گلگتی یا چلاسی خالص قوم ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں یہ وہی قومیت ہے جیسے انڈیا۔ منگول ہیں۔" محمد یوسف حسین آبادی۔ بلتستان پر ایک نظر میں لکھتے ہیں۔ "تقریباً سات فی صد آبادی آریائی نسل کے چار درد قبائل شین، یشکن، کمین اور ڈوم کی ہے۔ جن کو دیگر باشندے بلو قبیہ یعنی بالائی علاقے والے کہتے ہیں۔ یہ لوگ روندو، سکردو، کھرمنگ کے بعض نالوں اور گلتری میں آباد ہیں۔ جن کو سکردو کے حکمرانوں نے اپنے عروج کے دوران (1595 تا 1680ء) گلگت کے علاقوں سے لا بسایا ہے۔ ان کی زبان شنا ہے۔"

کرنل شمبرگ اپنی کتاب آکس اور انڈس کے درمیان میں لکھتے ہیں۔ "شین ایک الگ کلاس ہے۔ میں اسے کوئی قبیلہ یا ذات نہیں کہتا۔ اگرچہ وہ ایک ذات دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کی کچھ موجود خصوصیات ہندوازم کی باقیات ہیں۔ جو وہ اب ترک کرتے جا رہے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پکھلی کی طرف سے آئے اور شمال کی طرف اپنی حکومتیں بنائیں۔ اور اپنی اعلیٰ ہندو نسل کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو مخلوط ہونے سے بچایا۔ آج کے شین کافی بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ زیادہ تر چلاس میں ہیں۔ چلاس اور بجروٹ کی آدھی آدھی آبادی شین ہے۔ شین آج بھی اپنے آپ کو یہاں کی اشرف نسل سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ان کے اس دعویٰ کو عام طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ وہ مغرور کنجوس اور تنہا پسند قوم ہے۔ گائے کے لئے ان کی کراہت ختم ہو رہی ہے۔ لیکن ابھی تک مضبوط بھی ہے۔ اگرچہ وہ کچھ کچھ گائے کا دودھ پینے لگے ہیں۔ لیکن ان کا یہ اعتقاد ہے کہ اگر وہ گائے کا دودھ یا بڑا گوشت کھائیں وہ لنگڑے یا اندھے ہو جائیں گے۔ ان کے شکاری اور گوالے کبھی کسی گائے یا اس کے بچھڑے کے دودھ یا گوشت کو نہیں چھوتے اور کہتے ہیں۔ کہ ایسا کرنے سے پریاں اور جنات ان کو پلید سمجھیں گی۔ اور وہ تباہ ہو جائیں گے۔ عورتیں اب بچھڑوں سے گائے کا دودھ چسواتی ہیں۔ لیکن مرد کبھی ایسا نہیں کرتے اگرچہ کچھ عرصہ پہلے عورتیں بھی لکڑی کے دو ٹکڑوں سے بچھڑے کو پکڑ کر ایسا کرتیں۔ عورتوں کی ماہواری کے دنوں میں عورت کو الگ تھلگ کیا جاتا ہے اور اس کے برتن بھی الگ رکھے جاتے ہیں۔ ماہواری کے دن ختم ہوں تو پھر چلی اور سیندور کی دھونی دے کر کپڑے جسم برتن اور متعلقہ چیزیں صاف کی جاتی ہیں۔ شنا کے علاوہ دوسری زبانوں کے لوگ انہیں ڈنکرک کہتے ہیں۔ جن کے معنی گائے والے لوگ ہیں۔ شنوں کی کم ظرفی اس سے معلوم ہوتی ہے کہ وہ آج بھی اپنی قیمتی چیزیں اور رقم چھپا لیتے ہیں۔ ان کے تفاخر کے باوجود وہ احمق لوگ ہیں۔ دور دیہاتوں میں کوئی ان سے معاملات

کرنے نہیں جاتا۔ کیونکہ وہ اس چیز کے لئے بازار کے نرخوں سے بہت بالا اپنی نرخ بتاتے ہیں۔ وہ پٹو کے کپڑے پہنتے ہیں۔ اور انتہائی گندے رہتے ہیں۔ وہ قسم قسم کے توہمات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر شاپاریا جنگلوٹ (نومل) کے کسی کنوئیں میں گائے کا گوبر یا اس کا چمڑا گرادیا جائے تو ان کے مطابق آندھیاں آجائیں۔"

کرنل ڈیورنیڈ اپنی کتاب "دی میکنگ آف اے فرنٹیر" میں لکھتے ہیں۔ درد اور درستان کی اصطلاحات ایک طرح سے غلط ہیں۔ کیونکہ یہاں ایسی کوئی نسل جسے عمدگی سے وارد کا خطاب دیا جاسکے نہیں ہے۔

یا ایسا کوئی علاقہ نہیں ہے جسے یہاں کے لوگ دارد کہیں۔ تاہم یہ اصطلاح استعمال کرنا آسان ہے۔ دردستان میں پورا چترال، یاسین، پونیال، گلگت، ہنزہ، نگر، استور اور وادی سندھ کوہستان کے علاقے شامل ہیں اور اس کوہستان کو دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ اوپر کی طرف واقع شین جمہورتیں گور، چلاس، داریل تانگیر جو شناکا یاشن کاری کہلاتے ہیں۔ ایک حصہ ہے۔ دوسرا حصہ جو عام طور پر کوہستان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں دریائے سندھ کے دائیں کنارے کے لوگ بائیں کنارے پر آباد لوگوں کو دارد کہتے ہیں۔ یہ نام قدیم جغرافیہ دانوں پلنی اور پوٹلمی نے استعمال کیا ہے۔ لیکن اس علاقے کے صحیح عدود کا تعین مشکل ہے۔ درد کون ہیں یہ بھی ایک پریشان کن سوال ہے۔ بہر حال لٹز، ڈریو اور بڈلف کے توضیحات کے مطالعہ سے کسی نتیجہ پر پہنچا جاسکے۔ درد نسل کو زیادہ تر آرین کہہ سکتے ہین۔ رونو، شین، یشکن نسلوں میں رشتہ ناتا کے واضح اصول ہیں۔ وہ اپنی لڑکیاں اپنے سے اوپر کلاس کو دیتے ہیں۔ لیکن اپنے سے نچلی کلاس کو نہیں دیتے۔ رونو اپنی لڑکیاں حکمرانوں خاندانوں میں دیتے ہین۔ لیکن واپسی میں راجوں کی ناجائز اولاد لے سکتے ہیں۔ مگر کوئی جائز اولاد نہیں۔ شین اپنی لڑکیاں رونو کو دیتے ہیں۔ یشکن کو نہیں دیتے۔ لیکن یہ لوگ اپنی کوئی جائزاولاد اپنے سے کم تر خاندان میں نہیں بیاہ دیتے۔" ڈیورنیڈ مختلف نسلوں کو فی صد میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

کھوار چترال

یشکنوں کی زبان بروشکی — ہنزہ انگر، یاسین۔

شنوں کی زبان شنا — گلگت، استور، پونیال، غذر کی وادیوں میں۔

شین دوسری قوموں کے مقابلے میں

کولی میں	95%
گلگت میں	35%
نگر میں	20%
ہنزہ میں	5%
استور اور اس کی وادیوں میں	28%

جیسے جیسے آپ کوہستان میں جنوب کی طرف بڑھیں گے۔ یشکن کم ہوتے جائیں گے۔ اور تقریباً 4% تک یشکن رہ جائیں گے۔ چترال میں آپ کو شین یا یشکن لوگ نہیں ملیں گے۔ ' ڈیورنیڈ پھر لکھتے ہیں کہ بلاشک شین ایک مٹتی ہوئی نسل ہے۔ چلاس میں اس کی تعداد خوفناک حد تک کم ہو گئی ہے۔ گلگت میں بھی ادھر ادھر مہاجرین کی آمد سے آہستہ آہستہ وہ گھٹتے جارہے ہیں۔ یہ لوگ غیر مہم جو اور قوت برداشت واستقلال میں کم ہوتے ہیں جسمانی طور پر وہ کافی اچھے ہوتے ہیں لیکن ان میں جنگجویانہ، جبلتیں کمزور پڑ رہی ہیں۔ وہ اپنی زمینوں سے وابستہ رہتے ہیں۔ بہت مجبوری یا سرکاری دباؤ میں یا افلاس کے تحت کہیں باہر نکلتے ہیں۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ جنگ جوئی میں شین سے یشکن اور ان دونوں سے رونو بہتر ہیں۔"

ڈاکٹر ناموس کہتے ہیں انسانوں کا وہ گروہ جو شنا زبان بولتا ہے دارد کہلاتا ہے۔ جہاں شنا بولنے والے لوگ آباد ہیں دردستان کہلاتا ہے۔ کہ دارد لوگ نسل کے لحاظ سے آریائی ہیں۔ تحصیل کے لحاظ سے سارے داردستان کے باشندوں میں خدوخال، قدوقامت، چہرے مہرے رنگ ڈھنگ، گرمی اور نرمی، افتاد اور نہاد کے لحاظ سے فرق ہے۔ گریز میں کشمیر کا اثر ہے۔ گلگت ایجنسی میں ہنزہ اور نگر کا اثر ہے۔ سندھ کوہستان میں سوات کا اثر ہے۔ چلاس میں داریل کا اثر ہے (صفحہ 42) پھر شین کے بارے میں لکھتے ہیں۔ شین اور یشکن دردستان کی دو بڑی ذاتیں ہیں۔ شین کا درجہ بلند ہے مگر وہ تعداد میں کم ہیں۔ گلگت اور استور میں یشکن کی نسبت ان کی نفری قلیل ہے۔ ان کی زیادہ آبادی شناکی میں جل کوٹ سے لے کر گور تک ہے۔ جتنا ہم وادی سندھ سے دور ہوتے جاتے ہیں اتنی ہی ان کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً نگر، ہنزہ، اشکومن، یاسین، چترال میں بیشتر یشکن آباد ہیں۔ شین ذات کی چند مخصوص عادات ہیں۔ شین عورتیں صرف شین سے شادی کرے گی۔ مرد اگر ضرورت ہو یشکن عورت سے شادی کر گا۔

شین لوگ گائے کو خاص نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کا گوشت نہیں کھاتے، گائے کا دودھ نہیں پیتے۔ مکھن نہیں نکالتے۔ اس کے گوبر نہیں جلاتے۔ دو ایک بیل وہ مجبوری سے رکھ لیتے ہیں۔ چونکہ ہل چلانا پڑتا ہے۔ مگر جب گائے بچہ دیتی ہے۔ تو دوشاخہ لکڑی کے ساتھ بچہ کا منہ گائے کے تھنوں میں لگاتے ہیں اور اس کو ہاتھ سے نہیں چھوتے شین لوگ بکریاں پالتے ہیں ان کا دودھ پیتے ہیں۔ مکھن نکالتے ہیں اور چونکہ مسلمان ہیں بکری بھیڑ کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ دشکن کے شین مرغیاں بھی نہیں پالتے ان کو ہاتھ نہیں لگاتے نہ ان کو کھاتے ہیں بلکہ وہ تمباکو اور گل لالہ کی کاشت بھی نہیں کرتے۔

ڈاکٹر احمد دانی "چلاس دی سٹی آف نانگا پربت" میں لکھتے ہیں۔ چلاس کی مقبول تاریخ شین، یشکن اور کمین کی کہانیوں میں مستور ہے ان میں کمین جو بے زمین ہیں یہ کم ترین مقام کے حامل ہیں۔ شین اور یشکن زمین کے مالگان ہیں اور اگر پہلی قوم اپنے آپ کو فائق سمجھتی ہے ان دونوں قوموں میں زمین کے مالکانہ حقوق کے لئے کشمکش جاری رہی ہے۔

ابو ریحان البیرونی کتاب الہند میں لکھتے ہیں۔ دریائے سندھ انگ پہاڑوں سے جو ترکوں کی حدود میں نکلتا ہے۔ اگر تم مدخل کی گھاٹیوں سے صحرا میں نکلو تو تمہارے بائیں طرف دو دن کی راہ پر بلور اور شمیلان ترکوں کے پہاڑ ہیں جو بھتادریاں کہلاتے ہیں۔ ان کا بادشاہ بہت شاہ ہے۔ ان کے شہر ہنزہ، گلگت، اسورہ، اور شلتاس ہیں۔ اور ان کی زبان ترکی ہے ان کی لوٹ مار سے کشمیر مصیبت میں رہتا ہے۔

استاد غلام حسین نجم دینوری اپنی کتاب "اسلام گلگت میں" میں لکھتے ہیں۔ جس طرح آدم ثانی نوحؑ کے تین بیٹے سام حام اور یافث میں یہ سماجی تقسیم ہوئی۔ حضرت نوحؑ کا بڑا بیٹا سام تھا۔ یہ اپنی بڑائی کو بڑے بھائی کے حوالے سے جتاتا تھا۔ سام کی اولاد زمینداری کرتی تھی۔ سام بڑے بھائی ہونے کے ناطے ان بھائیوں پر حکم چلاتا تھا۔ اور اس طرح ان کو بڑائی حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے آج بھی دنیا میں طاقت کے ذریعے زبردستی حکم چلانے والے لوگوں اور حکومتوں کو سامراج یعنی سام کی حکومت کا نام دیتے ہیں۔ ان واقعات اور حالات کے تناظر میں یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ شین، یشکن اور کمین تین بھائی تھے۔ شین بڑا، یشکن منجھلا اور کمین سب سے چھوٹا تھا۔ شین بکریاں چراتا تھا۔ اور اپنی آزاد اور خود سر طبیعت کی وجہ سے نیز بڑے بھائی کے ناطے اپنے چھوٹے بھائیوں پر چھوٹائی کے حوالے سے حکم چلاتا تھا۔ یشکن زمینداری کرتا تھا اور کمین زمینداری کے علاوہ برتن سازی اور دوسرے کم حیثیت کے کام کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ان کی اولاد

میں پشت در پشت چلا آیا ہے۔ جنوبی ایشیا میں کسی بھی جگہ کوئی ایسا تذکرہ نہیں ملتا ہے جو درست ہو کہ یہ ایک الگ قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ درست ہے کہ شین برادری نے کسی کی بڑائی اور حکومت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ مگر شینوں کو اس پورے خطے شمالی میں باقاعدہ حکومت کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔"

حدود العالم میں لکھا گیا ہے۔ "کہ بلور عظیم ملک ہے۔ اس کا ایک بادشاہ ہے جو کہتا ہے کہ " ما فرزندِ آفتابم" اور وہ اس وقت تک نہیں جاگتا جب تک سورج نہیں نکلتا اور کہتا ہے۔ کہ بیٹے کو باپ کے جاگنے سے پہلے نہیں بیدار ہونا چاہئے۔ اس کو بلورین شاہ کہتے ہیں۔ اس ملک میں نمک نہیں ملتا اور اسے کشمیر سے در آمد کیا جاتا ہے۔"

میر حسان الحیدری تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند میں لکھتے ہیں۔ جنوبی سندھ کے مشہور علاقہ لاڑ میں جھبیل یا جھمیر قوم کے ہزاروں افراد موجود ہیں بہاول پور ملتان اور پنجاب میں بھی اس قوم کے افراد پائے جاتے ہیں۔ ان کا پیشہ زیادہ تر ماہی گیری ہوتا ہے۔ یہ پساچ لوگ جو دردستان سے آئے۔ جن میں کشمیر گلگت اور چترال کے علاقے شامل ہیں۔ دردستان کے لوگ غیر آریا ہیں۔ ہندوستانی اہل قلم نے انہیں نفرت کی بنا پر کچا گوشت کھانے والے دیو کہا۔ ان کی زبان جو پساچی یا دردی کہلاتی ہے۔ بعض مخصوص صفات رکھتی ہے۔ یہ صفات ان نو وارد پساچ لوگوں کی وجہ سے ادھر بھی نفوذ کر گئیں۔ ظاہر ہے دردی زبان کے اثرات سندھی اور سرائیکی دونوں زبانوں نے قبول کیے۔

تاریخ ادبیات مغربی پاکستان میں وزیر محمد اشرف لکھتے ہیں۔ شین قوم کے کئی قبیلے ہیں۔ جن میں مشہور قبائل بوٹے، مچوکے، دڑمے، ملوئے، منکے وغیرہ ہیں۔ شینوں سے قبل ان اطراف میں یشکن قوم آباد تھی۔ اور صدیوں تک اس ملک پر قابض رہی لیکن بڑی خون ریز جنگوں کے بعد شینوں نے یشکنوں پر فتح پائی۔ مفتوح قوم نے فاتح فوج کی تہذیب اور زبان کو قبول کر لیا۔ اس وقت شینا بولنے والوں کا وطن گلگت، کوہستان سندھ (یاسمستان) وادی گریز، علاقہ دراس اور بلتستان کے کچھ دیہات بشمول علاقہ گلتری، ہنزہ نگر کے چند دیہات اور سرحدی اضلاع پونیال، گوپس اور شکومن، علاقہ جات خاص گلگت، چلاس اور استور پر مشتمل ہے۔ شنا کی خاص وہ علاقہ ہے۔ جو پالس سے لے گور تک دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ پرانے زمانے میں شین قوم کے وطن کو سنالوک بھی کہا جاتا تھا۔ فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں۔ دڑمے اور منکے کو انگائی وڑمے اور انگائی منکے کہا جاتا ہے۔ یعنی آسمانی قبیلہ دڑم خیل، آسمانی قبیلہ منکے خیل، دراصل یہ قبیلہ عبرانی

میں دری تھا۔ جو بگڑ کر مرورِ ایام کے بعد شنائیں وڑے بن گیا۔"

کتاب ٹرائیز اینڈ کاسٹس آف پنجاب اینڈ نارتھ ویسٹ فرنٹیئر پراونس از ڈنزل ایبٹ سن اور ایڈوڈ کے حوالے سے ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی کہتے ہیں۔" کہ چلاس کے حکمران کا جدامجد کرال اول کشمیر سے چلاس آیا تھا۔ اور عربوں کے قریش قبیلے سے تعلق رکھنے والے تار کین وطن کی نسل سے تھا۔"

جٹ مار روسی عالم جعکوف کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ کہ گندھارین اور دادکی یا داردی آ کرس رول (Xerxes I) کے دور میں یہ کن فیڈریشن بناتے تھے۔ اور ایک جرنیل کے ماتحت تھے۔ جٹ مار اپنی کتاب بلور اینڈ دردستان میں لکھتے ہیں۔ کہ راج ترنگنی میں داردوں کی کسی سلطنت یا کسی بادشاہ کا ذکر نہیں آیا۔ وہ پھر لکھتے ہیں کہ فاہیان (403 AD) اور ہیوئی چاؤ (726 AD) کے سفروں کے دوران دردستان میں ایک ایسی سیاسی طاقت تھی جس میں سوات بھی شامل تھا۔ تبتیوں نے جب بلور اعظم فتح کیا۔ اور بلور صغیر خطرے میں آیا تو چینیوں نے بلور صغیر کی سالمیت کو قائم رکھنے کے لئے مداخلت کی تھی۔ تبت والوں نے نہ صرف بلور صغیر پر قبضہ کیا۔ بلکہ اپنی حکومت کا دائرہ وادی کنار تک بڑھا دیا تھا۔ جٹ مار پھر لکھتے ہیں کہ کشمیر پر 1028-1036، 49-1128 یا اس سے پہلے دردستان کے قبائل مسلسل حملے کرتے رہے ہیں۔ کشمیری بادشاہوں نے کبھی بھی داردوں کی اس طاقت کے خلاف مزاحمت کی کوئی کوشش نہیں کی۔ فاضل مصنف پھر کہتے ہیں۔ کہ وادی گلگت میں دارڈک عنصر کے داخل ہونے کے بارے میں کوئی تسلی بخش حل موجود نہیں ہے۔ جٹ مار اپنے مقالہ دردستان میں لکھتے ہیں کہ برصغیر کے شمال مغرب کی طرف تین مشہور پہاڑوں کے سلسلے میں ہندوکش، ہمالیہ اور قراقرم ملتے ہیں۔ اس علاقہ میں زیادہ تر انڈو آرین اور ایرانی لوگ رہتے ہیں۔ وہ ایک جگہ پھر یہاں رہنے والے لوگوں کو یورپین قرار دیتا ہے (صفحہ 28)۔ وہ پھر کہتے ہیں یہاں کے آرین ہندوستان میں آئے آریاؤں سے پہلے آئے۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ اصل سٹاک سے کس طرح الگ ہوئے ہیں ان کی زبان ایک الگ لسانی یونٹ ہے۔ اور یہ لوگ بہت سے معاملات میں ایک ہیں۔ انہیں دراد کہنے میں لوگ حق بجانب ہیں۔ کشمیر کے رہنے والے بھی انڈو آریا کے اسی گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو دارد نہیں تاہم کشمیری لسانی، ثقافتی اعتبار سے ایرانی قوم میں جذب و تعدیل ہو گئے تھے۔ جٹ مار ایک جگہ اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں۔ شین اور یشکن دونوں یورپی ہیں۔ وہ داردوں کے دو معاشرتی پیٹرن حراموش اور پھوگچ پیٹرنوں کا ذکر کرتے ہیں۔ حراموش پیٹرن قدیم دارد ک

انداز ہے۔ جبکہ پھوگچ پیٹرن پر پٹھانوں کا اثر پڑا۔ اگر آپ دارد لوگوں سے پوچھیں کہ ان وادیوں میں رہنے والے ابتدائی لوگ کون تھے۔ وہ آپ کو مافوق الفطرت (دیواگوز) عناصر کا ذکر کریں گے۔ جٹ مار آگے چل کر لکھتے ہیں۔ لسانی قربتوں کے باوجود دارد داور ویدک آرین کے کلچر میں زیادہ کوئی مماثلت نہیں۔ مثلاً مشرقی لوگ اپنی بکریوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اور گائے کیلئے کراہیت رکھتے ہیں۔ جبکہ ہندو اور ایرانیوں کے نزدیک گائے مقدس جانور ہے۔

جناب رازول کوہستانی نے ابھی حال ہی میں ایک کتاب انڈس کوہستان (شین، یشکن وکمین قبائل اور ان کا نظام معاشرت) کے نام سے لکھی ہے۔ وہ ایک ذہن محقق ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ شین لوگوں سے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ قریش ہیں اور عربی حسب و نسب کی کہانیاں جوڑتے ہیں۔ یہ زیادہ ترمذہبی جذبات اور لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ اور اس کے تاریخی شواہد موجود نہیں۔ وہ ڈاکٹر حبیب گل کی ایک کہاوت کا حوالہ دیتے ہیں جو کہتے ہیں۔ کہ کوہستان کے باسیوں میں یہ بات کہ وہ عربی نسل ہیں عام ہے لیکن اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ رازول پھر کہتے ہیں ایک معمہ یہ بھی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ شین، یشکن اور کمین ذاتوں کے ناموں کے اختتام ایک جیسی معکوسی، غیر ہائیہ لفیائی آواز " ن " پر ہوتا ہے۔ اس کا سبب کہیں ایک جیسا نسبی تعلق تو نہیں؟

بڈلف اپنی کتاب ہندوکش کے قبائل میں لکھتے ہیں۔ عزت کے لحاظ سے رونو کے بعد شین "قبیلہ" ہے گور، چلاس اور تانگیر کے علاوہ ان کی اکثریت کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہ بالائی علاقوں کی طرف کم سے کم ہوتے جاتے ہیں۔ شین لوگ جو مختلف بولیاں بولتے ہیں۔ لیکن گلگت کی بولی سب سے عمدہ ہے۔ گلگت کسی زمانے میں شنوں کا دارالحکومت رہا۔ اس میں کشمیری زبان کے الفاظ بھی مل چکے ہیں۔ شین باشندے اپنی لڑکیاں رونو اور سیدوں کو دیتے ہیں لیکن اس کے بدلے میں ان کی بیٹیوں سے شادی نہیں کرتے۔ وہ یشکن عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں۔ لیکن اپنی بیٹیاں یشکن مردوں سے نہیں بیاہتے۔ دوسرے قبیلوں میں شادی کرنے کی وجہ سے ان کی نسلیں خالص نہیں رہیں۔ اس لئے ان کے خواص کی نشاندہی کرنا اب مشکل ہو گیا ہے۔ شین لوگوں میں ایک خاص بات جو نظر آئی وہ ٹھڈی چھوٹی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں خالص شین باشندے سازن سے نیچے ملتے ہیں۔ اگرچہ شنوں کی ایک جداگانہ نسل ہونے کی روایات اب ختم ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ ابھی تک اپنے آپ کو اشرافیہ حلقہ سے سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے پاس اس کیلئے کوئی بنیاد موجود نہیں۔ بلتستان میں رہنے والے شین اپنے آپ کو اپنے ہم سایہ تاتاریوں سے برتر

خیال نہیں کرتے۔ تاتاری انہیں حقارت سے ہائی لینڈر کہتے ہیں۔ گور سے افغانستان کی سرحدوں تک گور بند سے نیچے علاقہ شکاری کہلاتا ہے۔ یہاں خالص شین رہتے ہیں۔ شکاری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شین اصل اسی جگہ کے ہوں۔ اب یہاں زیادہ افغان آباد ہو چکے ہیں۔ پرانے خیالات کے شین نہ تو گائے کا گوشت کھاتے ہیں نہ اس کا دودھ پیتے ہیں۔ بڈلف یہاں بتاتے ہیں کہ شین گائے کا بہت احترام کرتے ہیں۔ گائے کا دودھ پیتا بچھڑا اگر ان کو چھو جائے تو وہ اسے فوراً دھو ڈالتے ہیں۔ شین لوگ اپنی گائے اور دودھ پیتا بچھڑا یشکنوں کو دیتے ہیں۔ جب بچھڑا دودھ پینا بند کر دے تو پھر وہ واپس لاتے ہیں۔ شین مرغیوں کو گندا پرندہ سمجھتے ہیں۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ شین بنیادی طور پر ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ بڈلف دارد لفظ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اس طرح فارسی لفظ دو (شکاری درندہ) یا درندہ لفظ سے جس کے معنی خوفناک کے ہیں۔ دارد کا لفظ بن گیا ہو۔

کاچو سکندر خان قدمؔ تاریخِ لداخ میں لکھتے ہیں۔ درد لوگ آج تک اپنی آبائی تہذیب پر ہیں۔ اور عام لداخیوں سے کسی قدر الگ نظر آتے ہیں۔ ان کی آبادی موجودہ لداخ کے مندرجہ خطوں میں مرکوز ہے۔

1۔ وادی سندھ (دیہات داہ، ہنو)
2۔ دراس، شنگھو، شگر (دریائے دراس اور دریائے شنگھو کے کنارے پر آباد علاقے)
3۔ وادی کھرمنگ (بلتستان کے کچھ دیہات)

کاچو سکندر رکھتے ہیں۔ دردستان جو گلگت کے علاقائی نام سے مشہور ہے۔ ایک وسیع ملک ہے۔ اور وہاں کے لوگ زمانہ قدم سے مختلف خطوں اور وادیوں ہنزا نگر، پونیال، چلاس، استور، پونجی، گوپس، یاسین، چترال وغیرہ میں بستے آئے ہیں۔ ہر خطہ اپنی الگ تاریخ الگ حکومت اور الگ طرز زندگی سے پہچانا جاتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے ان کے عام تہذیب تمدن میں ایک بنیادی ہم آہنگی اور اشتراک ضرور پایا جاتا ہے۔

پروفیسر دانی پاکستان کے شمالی علاقوں کی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ کہ ڈاکٹر لٹز پہلا شخص تھا جو گلگت پہنچا جس نے پہلی دفعہ دارد اور دردستان کے الفاظ استعمال کیے وہ پھر ہیروڈوٹس کی تاریخ سے ایک اقتباس پیش کر کے کہتے ہیں کہ گندھارین اور دادیکی داریوس کو خراج دیتے تھے۔ وہ ان حوالوں سے کہتے ہیں کہ دادیکے اور گندھارین کا قریبی تعلق تھا۔

پروفیسر ٹوچی کہتے ہیں کہ گندھارا کے شمال میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو جنگجو ہیں اور

مختلف بولیاں بولتے ہیں۔ یہ ایسی زبانیں بولتے تھے۔ جن میں ایرانی اور ہندی اثرات تھے اس لئے غیر ملکی لوگوں نے انہیں تھیگئن کہا۔ ہم ان کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتے ہاں اتنا معلوم ہے کہ کافر اور دردتھے۔

ایک احمدی عالم محمد اسد اللہ قریشی اپنے ایک مقالہ میں (پاکستان کے شمال مغربی قبائل کی اصلیت) میں لکھتے ہیں۔ میری تحقیق کے مطابق دردا وہی قبیلہ ہے جسے بائیبل میں دردع کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور بائبل کے تفاسیر میں ہے کہ دردع حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ایک دانا آدمی تھا۔ اس کی نسل دردع قبیلہ کے نام سے موسوم ہوئی۔

میرے استاد محترم مولوی راجی الرحمت قائد رسالہ جو کبھی میری نگرانی میں نکلتا تھا۔ میں شمالی علاقہ جات گلگت اور اس کی تاریخ کے مقالہ میں لکھتے ہیں۔ کہ کچھ عرب خانہ بدوش کسی زمانے میں درہ خیبر کے راستے قبائلی علاقے میں پہنچ گئے اور قبیلہ شنوار کے قریب وجوار میں رہنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد ان میں سے کچھ لوگ دیر اور باجوڑ کے راستے چترال کے مقام کافرستان پہنچ گئے اور وہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو قریش کہتے ہیں۔ بعد میں قریش کا لفظ بگڑ کر کلاش یا کلش بن گیا۔ کچھ عرب کافی مدت شنواری قبیلے میں رہنے کے بعد دریائے سندھ کے کنارے کنارے آگے بڑھے اور سازین کے مقام سے لیکر ضلع دیامر کے مختلف مقامات داریل تانگیر چلاس وغیرہ کو اپنا مسکن بنایا۔ چونکہ یہ لوگ شنواری قبیلے کے ساتھ رہ کر آئے تھے۔ اس لئے یہ لوگ شنواری سے شین ہو گئے۔

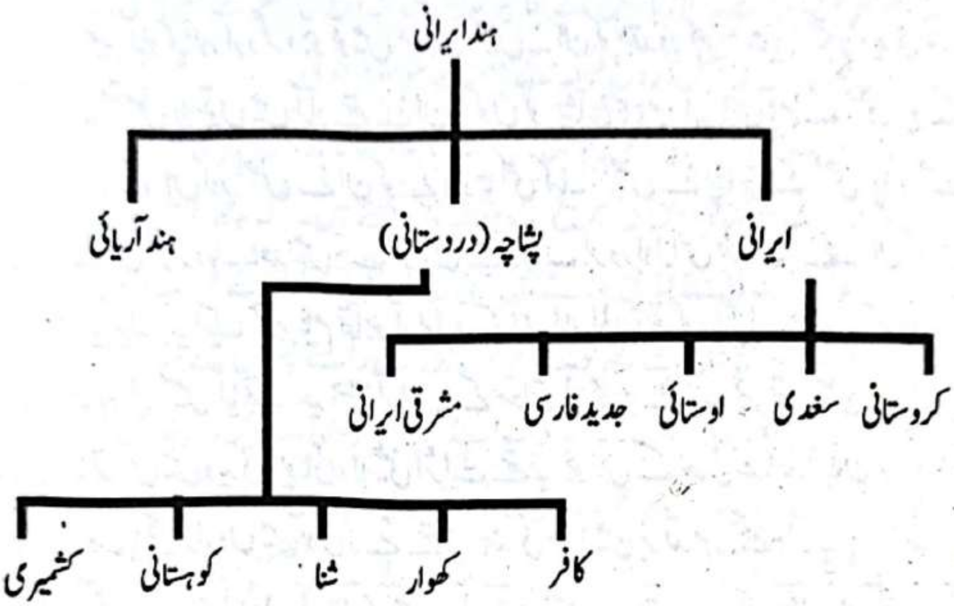
آپ نے دیکھا پساچہ، درد، دارو، داروا، داوکے، دردویا، درددیش، دردستان اور شین کے حوالوں سے معاملات سمجھنے کے لئے کتنی عرق ریزی کی گئی ہے۔ انسان اپنی تحقیق سے زندہ ہے۔ اس کی جستجو، محنت، عرق ریزی، انسانی معاشروں کی ترقی کی ضامن ہے۔ انسان انسان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کہاں سے چلا، کیوں چلا، اس میں کیا بات اچھی تھی۔ کیا بری تھی۔ جواب نہیں۔ انسانیت ترقی کے مدارج طے کر کے اب کہاں تک پہنچی ہے۔ وغیرہ وہم۔

میری کچھ بحث آگے گزر چکی ہے۔ اس طرف ابتدائی تاریخ میں ہمیں جو سب سے پہلی اصطلاح ملتی ہے۔ وہ پساچہ، پساچ، پساش، کی ہے۔ یہ بات یادرہے کہ قبیلوں کے نام کیسے پڑتے ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی نام اس قبیلہ کا ہو جو وہ اپنے ساتھ لایا یا یہ قبیلے کے کسی جد کا نام ہو۔ یہ نام قبیلے کے کسی وصف کی بنیاد پر پڑ گیا ہے۔ یا یہ نام کسی مخالف فریق نے حقارت، تضحیک

اور نفرت کے اظہار کے لئے دیا ہو، کوئی قوم دوسری قوم کو بھی کوئی اچھا نام نہیں دیتی۔ میں سابقہ ابواب میں ذکر کر چکا ہوں کہ قوموں نے ایک دوسرے کی تضحیک کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی وہ محض اپنے کو افضل اور اشرف سمجھتی ہے۔ چنانچہ جب آریوں کا پہاڑی دستہ افغانستان سے سوات اور پھر وادی سندھ میں آیا۔ یہ ایک خونخوار، جنگجو اور سنگدل ٹولہ تھا۔ قتل خون ریزی اس کا شیوہ تھا۔ اس خونخوار قبیلے کے سامنے انسانوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اس نے جیسے اپنے پاؤں پھیلائے چار طرف جنگجویانہ سرگرمیاں بڑھائیں۔ اس وقت ان کا اپنا کوئی نام نہیں تھا۔ ان ہی قبائل نے کشمیر آباد کیا اور ارد گرد جو قومیں موجود تھیں۔ ان کو مقدور بھر ستایا۔ نتیجۃً ویدی علماء نے جو کشمیر یا متصل علاقوں میں آباد تھے نے ان لوگوں کو پشاچ کا نام دیا۔ اس نام کے معنی دیو کے ہیں۔ راکس کے ہیں اور بعض نے ان کو بے دیوتا بھی کہا۔ بعض نے پشاچ کے معنی کچا گوشت کھانے والے بھی قرار دیا۔ بعد میں جب آریوں سے بھاگ کر دراوڑ اس طرف آئے۔ ان کو بھی پساچ کا نام دیا گیا۔ یہ ایک حقیر نام تھا جو آریوں کے اس ابتدائی جتھے کو دیا گیا۔ جو ہند کے میدانی علاقوں سے ہو کر نہیں آیا تھا۔ یہ جتھا آریوں کے معاشرتی نظام سے بے خبر تھا۔ لیکن جو زبان یہ جتھا بول رہا تھا اس میں ویدی، یونانی، لاطینی اثرات تھے۔ جو اس کے بھائی ہند افغانستان اور ایران کے رہگزاروں یا گل زاروں میں بول رہے تھے۔ ہند کی سرزمین پر قدم رکھنے والا یہ پہلا جتھا بھی تھا۔ کچھ لوگ پشاچہ کو زبانوں کی تیاری میں کوئی مقام نہیں دیتے۔ حالانکہ پشاچہ بولنے والے لوگ جو کوہستان کشمیر، داریل تانگیر، گریز، چترال تک پھیل گئے تھے نے داردی زبانوں کے لئے خام مواد فراہم کیا۔ کیونکہ پشاچہ زبانین بعد میں وادی سندھ میں آنے والے لوگوں کے لئے کوئی اجنبی بھی نہ تھیں۔ کیونکہ جب ان کے بھائی افغانستان اور ایران سے ہند آئے تو وہ بھی وہی بولیاں بولتے تھے۔ جو ان کے بھائی ہند بولتے ہوئے وادی سندھ میں آئے تھے۔ ان دونوں بولیوں کا خمیر ایک ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کچھ جو آریا (پساچہ) ہماری طرف پہلے آئے ان کی بولیاں زیادہ نفیس نہ تھیں۔ اور جو آریا بعد میں آئے وہ ایران اور پھر ہند میں سے ہو کر آئے تھے۔ اس لئے ان کو بولیاں پہلی بولیوں کے مقابلے میں زیادہ شفاف ہو گئی تھیں۔ اس لئے اس میں کوئی ہرج نہیں کہ ہماری بولیوں کو پشاچہ کی اولاد مان لیا جائے۔ اور پھر انہیں داردی قرار دیا جائے۔ چنانچہ ماہرین ڈاکٹر محی الدین قادری زور، سدھیشور ورما، گریرسن، مسعود حسین وغیرہ نے ان بنیادوں پر کام کیا۔ عہد پراکرت کے قدیم قواعد نویس وروچی (100 ق م) نے جو چار پراکرتیں بیان کی تھیں۔ اس میں پشاچی کو بھی جگہ دی ہے۔ وروچی کی فہرست اس طرح ہے۔

1۔ مہاراشٹری
2۔ پشاچی
3۔ ماگدھی
4۔ شورسنی

ڈاکٹر محی الدین قادری اور ہند ایرانی کا خاندانی شجرہ یوں بیان کرتے ہیں۔



آپ جیسے بھی حقیر نام دیں پشاچہ ایک قبیلہ تھا۔ اور یہ جو بولی بولتے تھے وہ پشاچی کہلائی جس کی بنیاد پر دردستانی بولیاں پیدا ہوئی۔

اس وطن میں پشاچہ قوم نے اپنے پاؤں جمائے اور یہ قوم اب ستانے لگی تھی۔ ایسے میں اور کافی زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دوسرے بھائی ہندوادی سندھ میں آئے۔ تاریخ نے اپنے آپ کو ایک بار پھر دہرایا۔ اس وطن میں نئے آنے والے لوگوں نے پشاچہ کو وہی سبق دیا جو پشاچہ یہاں کی قدیم قوموں کو دی چکی تھیں۔ یہاں اور چترال تک پشاچہ اور نئے آنے والے لوگوں میں خون ریز لڑائیاں ہوئیں۔ جس کے نتیجے میں پشاچہ اکھڑ کر رہ گئے۔ وہ یا تو ادھر اُدھر بھاگ گئے یا پھر اپنے بھائی ہندوؤں میں ضم ہو گئے۔ یہ نئے آنے والے لوگ چار طرف پھیل گئے یہ اپنے سابق بھائی ہندوں کی طرف سنگدل اور ظالم تھے۔ ان کو ان کے ظالمانہ رویے کی بنا پر ایک اور نام دیا گیا۔ یہ نام دینے والے بھی کشمیر کی طرف کے لوگ تھے۔ یہ نام انہیں ہیروڈوٹس نے نہیں دیا تھا۔ ہیروڈوٹس نے یہ نام جو یہاں رائج ہو گیا تھا اور اسے یہ یونانی حملہ آوروں کے ذریعے معلوم

ہو گیا تھا۔ تاریخ کا حصہ بنادیا اور یہ دردوو، دراور، داوار، درندہ، جیسا بھی کوئی نام تھا۔ اور یہ بھی ایک بے حرمت اور قدیم لفظ تھا جس کے معنی اس دور میں لوگوں کو معلوم تھے لیکن بعد میں یہ لفظ کسی طرح ذخیرہ الفاظ سے نکل گیا ظاہر ہے یہ کوئی اچھا لفظ نہ تھا۔ بڈ لف دو کہتے ہیں۔ جس کے معنی وحشی درندہ کے ہیں۔

ظاہر ہے پشاچہ اور درد دونوں آریا ہیں کیونکہ یہ اپنے ساتھ زبان کا جو مستحکم سرمایہ لائے وہ ہند ایرانی کا توشہ تھا۔ اور کسی زبان سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ پشاچہ بولی ہو یا دردی بولی دونوں ابتدائی ہند ایرانی پراکرت کی نشانیاں تھیں یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ سرائیکی، سندھی بلوچ، پشتو، ہندی، سنسکرت میں ان ابتدائی پراکرتوں کا خمیر موجود نہ ہو۔ لوگوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ پشاچی بولنے والے لاڑ گئے یا یہاں کی پشاچی نے جا کر سرائیکی یا کسی اور زبان پر اثر ڈالا ان تمام کا ابتدائی خمیر ایک تھا۔ اس لئے مشابہتیں ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ پشاچی چار ابتدائی پراکرتوں میں شامل تھی۔ اس لئے یہ پراکرتیں اپنی خوشبو لے کر ہر طرف بکھر گئیں۔

درد دراصل ایک چھوٹے جتھے کا نام تھا اور یہ نام کشمیر پر مسلسل حملوں کے نتیجے میں ظہور میں آیا۔ اس لئے یہ ابھی دور تک نہیں پھیلا تھا اور جیسے جیسے اس درد قبیلے کی تگ و تازیاں ادھر اُدھر بڑھ گئیں۔ یہ نام بھی اور ان کی زبان بھی چار طرف چلنے لگی۔ پشاچہ، قدیم بولیوں اور دردی بولیوں کی ملاوٹ سے کشمیری کوہستانی، شنا، کھوار، کافی زبانیں پیدا ہوئیں۔ ماہرین نے ان زبانوں کی خصوصیات کی بنیاد پر انہیں دردی زبانوں کا خاندان قرار دیا۔ اس وطن کا نام ابھی درد یا دردستان نہیں تھا۔ نہ یہاں کے لوگ جانتے تھے کہ انہیں کوئی درد کہتا ہے۔ یا ان کا علاقہ دردستان ہے۔ ہیرو ڈوٹس، میگنھز پٹولمی وغیرہ نے اپنے لٹریچر میں یہ نام دیا اور نام کشمیر کے سنسکرت علماء کو معلوم تھا۔ اس بنیاد پر کلھن نے اسے اپنی تاریخ میں جگہ دی۔ کلھن نے راج ترنگنی 1126ء تا 1150ء کے دوران مرتب کی۔ اس کے سامنے جو درد ویسا تھا۔ وہ محض وادی کشن گنگا کی طرف کے علاقے تھے۔ کیونکہ درد ویسا کے جن بادشاہوں کا ذکر اُس نے کیا۔ مثلاً یشو دھرا، من دھرا وغیرہ یہ ہماری طرف کے حکمران نہیں تھے۔ درد ویسا ایک موزوں نام بھی تھا۔ ہیرو ڈوٹس اور کلھن کے ذہن میں درد وطن کا ایک ہی تصور تھا۔ تاہم دردستان یا دردی زبانیں بہت بعد کی ترکیبیں ہیں۔ جیسے میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ پشاچی لفظ تو بہت قدیم سے رائج تھا۔ لیکن دردی زبانین اور دردستان کی تراکیب جدید دور کی پیداوار ہیں۔ دردی زبانوں کے پھیلاؤ کو دیکھ کر لفظ دردستان استعمال کیا گیا۔ اور یہ یورپین ماہرین نے کیا۔ اور لفظ دردستان سب

سے پہلے جس نے استعمال کیا وہ مسٹر ہے وارڈ تھے۔ پروفیسر دانی کچھ اور مورخین ڈاکٹر لٹز کا نام لیتے ہیں۔ پروفیسر دانی یہ بھی کہتے ہیں کہ ڈاکٹر لٹز یہاں پہنچنے والے پہلے یورپین تھے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں درست نہیں۔ ڈاکٹر لٹز خود کہتے ہیں۔

" If asked whether they were Dards, they said, certainly, thinking I mispronounced theword " dade" of the hill punjabi which means wild, independent and is a name given them by foreigners as well Yagi = rebellions and since my visit in 1866 as Dardistain a name which I see Mr. Hayward has adopted."

اصل میں 1861ء کے بعد دردستان کی اصطلاح وضع ہوئی۔ اور کتابوں میں استعمال بھی ہوئی۔ لیکن عملی طور پر نہ یہ کوئی سیاسی وحدت تھی نہ کوئی ایسا علاقہ۔ تاریخ میں اس نام کی بنیاد پر کوئی سیاسی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اگرچہ سیاسی طور پر بلور گی سلطنت تھی۔ بلور کی حکومت کے واضح خدوخال تھے۔ چین، تبت، چترال، بلتستان، لداخ میں اس سلطنت کی شہرت بھی تھی لیکن دردستان ایک کاغذی سیاسی اکائی تھی۔ جو ماہرین اور مورخین نے دردی زبانوں کے حلقے کے حوالے سے استعمال کیا۔ دردستان میں شامل علاقوں کے حوالے سے بھی مورخین، ماہرین، اور جغرافیہ دانوں نے غلطیاں کیں۔ بعض نے گریز، چلاس، داریل و تانگیر، گلگت، ہنزا، نگر، چترال اور کافرستان میں شامل دکھایا۔ بعض نے ان میں کوہستان کو بھی ملایا۔ لیکن کسی نے کشمیر کو دردستان کا حصہ نہیں دکھایا۔ اگرچہ کشمیری بھی دردی زبان کی ایک شاخ تھی۔ پھر بعض نے درد لوگوں میں بھی اختلاف کیا۔ اور بعض نے لفظ درد یہاں کی تمام نسلوں کے لئے اور بعض نے صرف آریوں کے لئے استعمال کیا۔ اور یہی درست تھا۔ کیونکہ بعد میں آنے والے آریوں کے لئے یہ نام استعمال ہوا تھا۔ تمام کے لئے استعمال کرنے سے اس میں دراوڑ، کمین، کشمیری اور دیگر قومیں بھی آسکتی ہیں ہمیں اب درد یا دردستان کی اصطلاحات میں سرگرداں ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ بہت سے پشاچہ اور درد قومیں جو آریا تھیں۔ شین کے نام سے موسوم ہوگئیں۔ شین اپنے نام سے واقف تھے بلکہ اور قومیں بھی اس نام سے اس قوم کو شناخت کرتی تھیں۔ جب آریوں کے بڑے جتھے وادی سندھ میں آئے اور دریائے سندھ کے دائیں بائیں کنارے رہنے لگے تو یہ دریا یعنی دریائے سندھ ان کی شناخت کا باعث ہوا۔ سندھو، سین قدیم شنا میں اور اب بھی سین

دریا کو کہتے ہیں۔ جیسے الفاظ عام استعمال ہونے لگے۔ اس قوم کے لئے سین شین میں بدل گیا۔ اور پھر اس قوم کا مرکز وادی کوہستان میں قائم ہوا۔ کشمیری علماء نے انہیں درد کہا تھا۔ لیکن ان کے ذہن میں کشمیر کا متصل علاقہ تھا۔ اور کوہستان کا علاقہ نہ تھا۔ شین کا لفظ کوہستان ہی میں پیدا ہوا اور اس کے معانی متعین ہوئے ان باہر سے آنے والے شنوں نے اپنی وحدت قائم رکھنے کے لئے بوے جتن کیے۔ ایک دوسرے کا ساتھ دیا چونکہ وہ جنگ وجدل کے دن تھے اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے منو کی تقسیم پر عمل کیا۔ مقامی لوگوں کو یاان لوگوں کو اپنا غلام بنایا جن پر انھوں نے قابو پالیا تھا۔ اس حوالے سے آگے بحث کی جائے گی۔ جب اس قوم کا تشخص شین کے طور پر ابھرا تو پھر انہوں نے اپنے جھتوں کو چار طرف روانہ کیا۔ سوات میں بھی ان کے کچھ حلقے تھے۔ سین کڑی شین کاری، بھکلی، دوبیر، پٹن، کولی، پالس، جل کوٹ، سازین، لوٹر، داریل تانگیر، چلاس علاقے شنوں کے نام سے گونج اٹھے۔ اب گریز کی طرف شنوں کا وہ چرچانہ تھا جو کوہستان کی طرف تھا۔ کوہستان سے شمال اور مشرق کی طرف جو حملے شروع ہوئے وہ اب شنوں کے حملے تھے۔ چترال میں پشاچہ اور بعد میں آنے والے آریا کھوبن گئے کوہستان اور اردگرد علاقوں کے آریا جو اب شین کہلا رہے تھے۔ اپنی حکومتیں قائم کر رہے تھے۔ اس دور میں چترال کے آریا (شین) فقیر مسکین بن کر رہ گئے۔ ان فقیر مسکینوں کو یساں کے شنوں کی طرح کبھی حکومت نہ مل سکی۔

بہر حال شین خالص آریا ہیں۔ اور اس سلسلہ میں تمام نامور مورخین، ماہرین متفق ہیں۔ اور اس طرح متفق ہونے کے لئے دلائل بھی موجود ہیں۔ شنوں کے بارے میں یہ نظریے کہ۔

1۔ یہ آریا ہیں۔
2۔ یہ یورپین ہیں۔
3۔ یہ چینی الاصل ہیں۔
4۔ یہ سھتین ہیں۔ سھتین سے شین بنے ہیں۔
5۔ یہ عرب ہیں۔
6۔ یہ قریشی ہیں۔ ان پر کچھ باتیں ہو جائیں۔

آریا اور یورپین دونوں ایک ہیں۔ یورپین بھی آرین ہیں اور وسط ایشیا سے آریا کے خروج کے وقت کوئی مغرب کو چلا تھا کوئی جنوب کو، مغرب کی طرف جانے والے لوگوں میں

انگریز، فرانسیسی، پرتگالی، جرمن البانوی، سپانوی وغیرہ تھے۔ اور جنوب کی طرف افغانستان اور ایران آنے والے بھی آریا تھے۔ یہ بات درست ہے اگر ہم ان سب کو آریا کہیں تو بے جانہ ہوگا۔ یہ تمام لوگ جو زبانیں بولتے ہیں۔ جس میں ہماری کشمیری، شنا، ہندی، سنسکرت، فارسی، پشتو، واخی، سرائیکی، بلوچی، سندھی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ایک ہی قسم کا لسانی بنیادی ڈھانچہ رکھتی ہیں۔ اس لئے ماہرین السنہ ان زبانوں کی بنیاد پر اور پھر رویوں اور کلچر کی بنیاد پر انہیں ایک قرار دیتے ہیں۔ لہذا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب آرین ہیں ستھین اور شین کی مماثلت ضرور ہے۔ لیکن ہندوستان کے آریا جو ہمارے آریا کے ساتھ باہر سے آئے تھے۔ ستھین نہیں کہلا رہے تھے۔ تو کوہستان میں آ کر یہ لوگ کیسے ستھین کہلانے لگے۔ کسی مستند تاریخ میں ایسی کسی ترمیم کا پتہ نہیں چلتا اگر انہیں ستھین بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ ستھین آرین تھے۔ لیکن جیسے میں نے پہلے ذکر کیا راج ترنگنی جو ایک منظم تاریخ تھی۔ اس میں یا کسی اور یونانی تاریخ میں ایسی کسی تبدیلی کا ذکر نہیں ملتا۔

ان کا چینی الاصل ہونا بالکل بے نبیاد ہے۔ چینی نہ دردستان کو جانتے تھے۔ اور نہ شنوں کو کہ وہ کون لوگ تھے اور کہاں سے آئے تھے۔ چین کی کسی تاریخ میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ پھر جسمانی خدوخال، کلچر، زبان کے لحاظ سے دیکھیں چینیوں اور شنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شنازبان اور چینی زبان ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شنوں کا چینی الاصل ہونیکا نظریہ کسی توجہ کے لائق نہیں۔ لہذا اسے نظرانداز کیا جانا چاہئے۔

شین اپنے بارے میں جو کچھ خود کہتے ہیں۔ اس پر اب نظر کرتے ہیں۔

1۔ تھک کے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ قریشی ہیں اور کسی گوری تھم کی اولاد ہیں۔ گوری تھم وہ شخص تھا۔ جس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور اس سے بچنے کے لئے اس طرف نقل مکانی کی تھی۔ وہ کسی اور کو قریش نہیں سمجھتے تھے اور وہ اپنے آپ کو چلاسیوں پر فوقیت دیتے ہیں۔

2۔ جیسے آگے مذکور ہوا گوروالے اپنے آپ کو جنات کی اولاد سمجھتے ہیں۔ اور اس حوالے سے وہ اپنے آپ کو فائق سمجھتے ہیں۔

3۔ گورہی کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ قریش عرب ہیں۔

4۔ چلاس کے بوٹھ حکمران کا جداعلیٰ کرار اول بتایا گیا۔ جو عربوں کے قریش قبیلے سے تھا۔ اور یہاں بوٹھ قبیلے کے لوگ اپنے آپ کو قریش سمجھتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے۔ کہ لوگوں کے ذہن واضح نہیں۔ پورے کوہستان، چلاس علاقے میں شنوں کے اندر

بعض شین اپنے آپ کو قریش سمجھتے ہیں۔ جب کہ دوسرے علاقے کے شنوں کو قریشی نہیں سمجھتے۔ گلگت میں بھی بعض قریشی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

5۔ سیاہ پوش بھی قریشی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔اس کی بنیادی وجوہات دو ہیں۔

(i) قریشی ہونا اعزاز کا باعث ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ کا قریش سے تعلق تھا۔ اور یہ مذہبی اعتقاد کا نتیجہ تھا۔

(ii) دیگر لوگوں پر فوقیت جتانے کے لئے قریشی ہونا کا دعویٰ کیا جاتا تھا۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ پٹھانوں نے بھی مغلوں پر فوقیت جتانے کے لئے ایک منظم منصوبے کے تحت خالد بن ولید کے خاندان سے اپنے آپ کو منسلک کیا تھا۔

میں یہاں کرار اول کے حوالے سے یہ بات لکھنا چاہتا ہوں کہ یہ اصل میں آکرس اول تھے۔ اس کے انگریزی لہجے xerxes I تھے۔ یہ ایک گندھارین جرنیل تھے اور یہ داردی اور گندھارین کن فیڈریشن کے انچارج تھے۔ کہا جاتا ہے۔اس دور میں چلاس تک کے داردی علاقے اس کن فیڈریشن کا حصہ تھے ہوسکتا ہے۔ آکرس اول فیڈرل علاقوں کے معائنہ پر اس طرف آگئے ہوں۔

شنوں کے قریش ہونے کے حوالے سے ایک بات یہاں بہت مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے یہاں بزرگوں نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو جن اقوام نے اس تبلیغ کی سخت مزاحمت کی ان میں شین سر فہرست تھے۔ سیدوں نے ان کی اس سخت مزاحمت کی بنیاد پر انہیں ابو جہل کی اولاد کہا۔ یہاں یہ ایک اہم نقطہ تغیر تھا کہ یہ ترکیب ابو جہل کی اولاد، نسل در نسل چلی۔ ابو جہل قریش تھے اس طرح قریشی نظریات شنوں میں داخل ہوگئے۔ مجھے کوئی تاریخ ایسی نہیں ملی کہ جس سے اس بات کا ایک ذرہ بھی اشارہ ملے کہ یہاں عرب آگئے ہوں۔ یورپین مورخین ہوں یا مقامی مورخین ان کا خیال ہے کہ اس طرف سکندر اعظم کی اولاد ہونے یا عرب ہونے یا افغان ہونے کے لئے ہر قوم نے دعویٰ کیا ہے۔ رازول کوہستانی ڈاکٹر حبیب گل کا کہنا ہے۔ کہ یہ محض مذہبی لگاؤ کی وجہ سے ہے ورنہ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ شنوں اور عرب کلچر میں بہت بُعد بھی ہے۔ ہماری زبان "سامی زبانوں" کے کسی حلقے میں بھی نہیں آئی۔

شین آریا ہیں کیونکہ:

1۔ ماہرین عمرانیات نے آریوں کے جو جسمانی خدوخال بیان کئے ہیں۔ وہ شنوں میں فٹ آتے ہیں۔ اس حوالے سے شین کچھ کوتاہ قد ہیں۔ جبکہ عرب لمبے قد ہیں۔ شیوں

کی داڑھیاں گنجان ہوتی ہیں۔ جبکہ عربوں کی خشخشی داڑھیاں ہوتی ہیں۔

2۔ شنوں کی زبان ہند آریائی زبانوں کی شاخ ہے۔ جبکہ عربی سامی زبانوں کی شاخ ہے۔

3۔ عربوں اور شنوں کا کلچر ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتا۔ شین گائے کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے اور مرغیاں نہیں پالتے۔ جبکہ عرب ان کے دلدادہ تھے۔ عرب لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے تھے۔ جبکہ شنوں میں اس کا کوئی رواج نہ تھا۔

4۔ یہاں کے شنوں اور ہند کے آریوں میں بہت قریبی مماثلتیں تھیں۔

عرب میں ذات پات کا طبقاتی نظام موجود نہ تھا۔ لیکن ہند کے آریوں میں ذات پات کا ایک کڑا نظام موجود تھا۔ یہی نظام شنوں میں آ گیا۔ اور کوہستان علاقے میں ذات پات کی تقسیم بندی وجود میں آگئی۔ یہاں شین ایک اعلیٰ قوم تھی۔ اس تقسیم بندی کے مطابق اس معاشرے میں اور تین طبقے موجود تھے۔ آپ ان چاروں طبقوں کو ذات برادری کی تقسیم کا نظام کہیں یا معاشرتی نظام، حقیقتاً یہاں ذات پات کی تقسیم کا نظام کڑی ہند شوں کے ساتھ موجود تھا۔ شین اپنی لڑکیاں ان نچلے طبقوں کو نہیں دیتے تھے۔ جبکہ ان کی لڑکیوں سے یہ شادی کرتے تھے۔ ہند میں برہمن، کھشتری کی لڑکیاں ویش یا شودروں میں نہیں بیاہی جاتی تھیں۔ ابتدائی شین ہندو نظریات لے کر اس وطن میں داخل ہوئے۔ ان کے بُت لات و منات نہ تھے۔ یہ اگنی دیوتا کے پرستار تھے۔ جٹ مار شنوں کے دو معاشرتی نظاموں کا ذکر کرتے ہیں۔ حراموش اور پھوگچ کے معاشرتی نظام جٹ مار کا کہنا ہے۔ کہ حراموش کا معاشرتی ڈھانچہ قدیم داردوں کے نظام سے ملتا جلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ یہاں ساری عورتیں ایک دیوی مرقوم کی پرستش کرتی تھیں۔ جٹ مار حراموش کے نزدیک ایک دستیاب عبادت گاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس عبادت خانے میں عورتیں مجمع لگاتیں۔ البتہ ایک مرد جو مرقوم کا پادری ہوتا اور جیسے زبان (Zhaban) کہا جاتا ہے موجود ہوتا وہ عورتوں کے ساتھ گھل مل جاتا اور کھُل کھیلتا۔ وہ روئیں اور مٹو کو اس نظام کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ بہر حال داردوں کے ابتدائی معاشرے میں سے جو باقیات ملیں۔ وہ صرف ہندوؤں کے معاشرتی نظام کا نمونہ تھیں۔

حضور محمد ﷺ نے جب مکہ میں دین اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء کو انتہائی نامساعد حالات کا سامنا رہا۔ قریش نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء کو طرح طرح ستانا شروع کیا۔ کافر آپ ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھاتے۔ غلاظت پھینکتے۔ آپ ﷺ کے رفقاء کو کس کس طرح سے اذیتیں نہیں دی گئیں۔ ان دنوں قریش بہت مضبوط

تھے۔ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی قریشی اسلام سے بچنے کے لئے اس طرف آیا ہو۔ پھر جب مکہ فتح ہوا۔ تو حضور ﷺ نے ابو سفیان جیسے دین اسلام کے منکر کے گھر کو بھی دارالامان قرار دیا تھا۔ اور لوگوں پر نئے دین میں داخل ہونے کے لئے کوئی جبر نہ تھا۔ تو پھر ایسے ماحول میں کسی قریش کے اس طرف بھاگ آنے کی کوئی تک نہیں بنتی۔ تاریخ اسلام میں کوئی واقعہ ایسا منضبط نہیں ہوا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران فتح ہوا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں شمال مغرب کی طرف خراسان، طخارستان کے علاقے فتح ہوئے۔ عرب ہمارے شمال میں طخارستان تک آ گئے۔ پھر 661ء تا 680ء میں امیر معاویہ کے دور میں ہمارے شمال میں ترکستان میں اسلامی فتوحات ہوئیں۔ عبدالمالک بن مروان (684ء تا 705ء) کے زمانے میں ترکستان کی فتوحات میں اضافہ ہوا۔ ولید بن عبدالمالک (705ء تا 715ء) کے زمانے میں قتیبہ بن مسلم کی وسط ایشیا میں فتوحات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ 816ء میں خلیفہ مامون کے ایک وزیر الفضل ابن صالح نے واخان فتح کیا۔ عرب اس زمانے میں ہمارے بہت قریب آئے تھے۔ ان کے چترال میں داخل ہونے اور وہاں سے بہمن نامی کس کافر حکمران کو شکست دینے کے واقعات ملتے ہیں۔ لیکن ان دنوں اس طرف سے گلگت یا کوہستان کی طرف کسی عرب کی آمد کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر اس وقت عرب آئے ہوتے تو پھر دین اسلام کی تبلیغ بھی ہوتی۔ جنوب کی طرف سے 713ء میں محمد بن قاسم فتوحات کرتے ہوئے ملتان تک آیا۔ یہاں سے شمال کی طرف کسی قریشی کی نقل مکانی کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ جہاں تک ہندو پاکستان اور کشمیر میں قریشی خاندانوں کی تاریخ ملتی ہے یہ سب لوگ ہندو پاکستان اور کشمیر میں 1320ء کے بعد آئے ہیں۔ ہمارے علاقوں میں اس کے بعد تبلیغ اسلام کے لئے آنے والوں کا حال آگے بیان کیا جا چکا ہے۔ محمد دین فوق تاریخ اقوام کشمیر میں سب سے پہلے آنے والے قریش کا حال یوں لکھتے ہیں۔ کشمیر میں جو سب سے پہلے قریش آیا وہ سید محمد قریشی تھا۔ اور وہ رفقائے حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ پھر لکھتے ہیں خاندان شیخ اسلام کشمیر کے جد اعلیٰ خواجہ بہاؤالدین خوارزمی فاروقی تھے مفتی صدرالدین وفائی نے تذکرۃ الصادقین میں ان کے فاروقی ہونے اور نسباً حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچنے کی تصدیق کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے وادی کوہستان میں کسی قریشی کی آمد محض ایک خیال ہے۔ ڈاکٹر لٹز اپنی کتاب دردستان کی ذاتیں اور زبانیں میں یہ خیال آرائی کرتے ہیں۔ کہ لبنان اور شام کے دروز قبائل اور کوہ ہندوکش کے داردوں میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ جہاں تک لبنانی درواز کا تعلق ہے۔ یہ ایک شامی عربی قبیلہ ہے مورخ انہیں نہ عیسائی قرار دیتے ہیں اور نہ مسلمان دروز قبائل کا

مذہب قرامطہ عقائد سے ملتا ہے عیسائیت سے ان کی دیرینہ چپقلش ہے۔ ان قبائل کا ٹھکانہ جبل دروز ہے۔ ہندوکشی درد اور لبنانی دروز میں مماثلت کی جو دوچار باتیں بتائی گئی ہیں۔ وہ عمومی نوعیت کی ہیں۔ مثلاً یخنی میں روٹی ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈالنااور پھر استعمال کرنا۔ دراصل ایسی بہت سی باتیں انسانوں میں تلاش کی جاتی ہیں۔ مثلاً عراق کی سومیری تہذیب کا آغاز کوئی 3400ء ق م یعنی اب سے 5500ء سال پہلے ہوا تھا۔ یہاں ایک متمدن قوم رہتی تھی۔ جو سومیری کہلاتی تھی۔ اس تہذیب کا رقبہ تقریباً دس ہزار مربع میل تھا۔ یہاں کچھ ایسے نام کے حکمران ہوئے جیسے شروکن یا سارگن یا سارگن اول یا سارگن دوم۔ سارگن گلگت ایک قدیم نام ہے۔ ان مشابہتوں کو دیکھ کر رشید اختر ندوی مرحوم نے ہمارے ایک چھوٹے سے گاؤں " سائز " کو اس سے ملادیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں میں نے یہ مدھم تصاویر اس لئے آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں تا کہ آپ خود یہ رائے قائم کر سکیں۔ کہ یہ قدیم تصویری رسم الخط اسی سومیر ایا درواقوم کا ہے۔ جو ایک وقت نہ جانے یہ کونساوقت تھا۔ سومیر سے چلی اور کوہ ہندوکش، پامیر اور قراقرم کے دروں کے ذریعہ اس شمالی علاقہ میں اتری میرے نزدیک یہاں آباد ہونے والا یہ سب سے پہلا گروہ ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جسے اپناوطن مجبوراً چھوڑناپڑا۔ اس گروہ نے نگر دریا کتے کنارے جو پہلی بستی آباد کی تو اس کا نام سومیئر رکھا۔ شکر ہے رشید اختر ندوی مرحوم کو گلگت کا قدیم نام سارگن معلوم نہ تھا۔ ورنہ یہ بھی نگر کے سائز میں بطور حکمران کھڑا کر دیتے۔ سومیری تہذیب کے بارے میں بڑی تحقیق ہوئی ہے۔ کسی نے بھی آج تک ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا کہ سومیری لوگ اس طرف آ گئے ہوں۔ اس تہذیب کا پاکستان کی ہڑپائی تہذیب کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق تھا۔ لیکن سائز جیسے چھوٹے گاؤں میں جہاں بہ مشکل سو گھرانوں کی زمین ہے۔ پھر نگر میں بہت بعد میں آباد کاری شروع ہوئی تھی۔ سومیریوں کا اس طرف آنا ممکنات میں سے نہیں۔ دراصل اسی طرح بے نیاد مفروضات پیش کئے گئے ہیں۔

بہر حال کیا شین عرب نہ ہوگا۔ تو بڑا نہ ہوگا۔ ایسی بات نہیں ہے۔ شنوں کا ایک شاندار ماضی تھا انھوں نے شمالی علاقہ جات میں اپنی حکومتیں بنائی تھیں۔ اور ایک بڑے عرصہ تک یہاں ان کا اثر رہا تھا۔ ان شین دار دوں کی حکومت سوات پر کافی عرصے تک رہی۔ ٹاروال ان شنوں کا مرکز تھا اور یہاں پندرھویں صدی تک شین حکمران تھے۔ پندرھویں صدی میں یہاں پٹھان برسراقتدار آئے (سٹائن، سکندر کا سندھ تک راستہ صفحہ 3) سٹائن لکھتے ہیں۔ یہ سلیقے کہ قلعہ نما مکان بنا کر رہنا داردوں کی نسلی خصوصیات کے عین مطابق ہے۔ پٹھانوں کے سوات پر قبضہ تک

ٹاروال میں ایسی باقیات ملی ہیں۔ جو داردوں کی ہی ہیں۔ یہ شین حکمران سوات، کوہستان، وادی کشن گنگا، چلاس، داریل تانگیر وغیرہ علاقوں پر قابض تھے۔ ان دنوں شنوں کے مراکز تالی لو (چلاس) یا تالی لو (داریل تانگیر) یا یودینایہ (سوات) میں کہیں تھے۔ ان علاقوں سے شین شمال کی طرف اور مشرق کی طرف بھی حملہ کرتے تھے۔ ان حملوں میں وہ مال غنیمت حاصل کرتے اور لوگوں کو غلام بنا کر اپنے مراکز کی طرف لاتے۔ پھر ایک ایسا وقت آیا جب گلگت پر بھی شین حکمران ہوئے۔ اور گلگت شنوں کا صدر مقام بنا۔ جب یہ دور آیا تو کم از کم سوات کی طرف اور کوہستان کے جنوب کی طرف مرکزی گلگت سے تعلق کسی طرح ختم ہو چکا تھا۔

گلگت پر بالترتیب یشکنوں، شیوں اور ترہ خانہ حکمرانوں نے کئی سو سالوں تک حکمرانی کی ہے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ہماری پوری تاریخ ماضی کی تاریکیوں میں گم ہے۔ ہم اپنی قدیم تاریخ کا حال ٹھیک ٹھیک اور سلسلہ وار جاننے سے قاصر ہیں۔ قدیم تاریخ تو ایک طرف ہم یہاں 1800ء کے قریب کے حالات کو بھی صحیح صحیح نہیں بتا سکتے۔ اس کی بڑی وجہ یہاں تاریخی ماخذوں کی نایابی ہے۔ پھر اس دور میں بھی ہمارے حکمران ان پڑھ تھے۔ یہاں مدارس یا مکاتیب یا دینی مراکز موجود نہ تھے۔ جن کی مدد سے علم تاریخ کو فروغ دیا جاتا اور تاریخی واقعات کو منضبط کیا جا سکتا۔

بہر حال 1846ء کے معاہدہ امرتسر کے بعد ہمارے یہ علاقے کشمیر اور پنجاب کے زیر اثر آئے۔ انگریزوں کو بھی زار روس کی طرف سے خدشات تھے۔ اس لئے یہاں انگریزوں کی آمد شروع ہوئی۔ سب سے پہلے جو انگریز 1846ء کے معاہدہ امرتسر کی حدبندی کے سلسلہ میں بونجی اور چھپروٹ تک آئے۔ وہ لفٹیننٹ وینیش ایگنیو اور لفٹیننٹ ینگ ہسبنڈ تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر لٹز ہے وارڈ آئے۔ اور جب انگریزوں کی ایجنسی قائم ہوئی۔ تو پھر ان کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1860ء کے بعد ان علاقوں کے بارے میں تحریری مواد سامنے آنے لگا۔

راجہ شاہ رئیس خان کی تاریخ گلگت 1987ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ان کی وفات کے 13 سال بعد چھپی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پہلے اگر کوئی الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، گل بکاؤلی، رستم و سہراب، فسانۂ عجائب، حاتم طائی جیسے داستانوں کا مطالعہ کرے اور پھر یہ تاریخ پڑھے۔ تو اسے واقعات نتھارنے، سمجھنے اور نتائج اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔

راجہ شاہ رئیس خان کی تاریخ گلگت میں آذر جمشید کی حکومت کا آغاز 643ء اور اس

سلسلہ کی حکومتوں کا اختتام 1836ء تک دکھاتے ہیں۔ جب طاہر شاہ (راجہ شاہ رئیس خان کے مطابق) صاحب نماتراخانی خاندان کی لڑکی کے سُسر یہاں قائم مقام حکمران تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گلگت پر کیانی، تراخانی، مغلوط حکومت 1193ء سال رہی۔ یوں یشکنوں اور شینوں کی حکومت 643ق م سے اور پھر قبل تاریخ ادوار میں چلی جاتی ہے۔ راجہ صاحب گلگت میں اسلام 725ء میں سوملک ولد کرک کی حکمرانی کے دور (723ء تا 793ء) میں دکھاتے ہیں۔ گلگت میں اسلام کی آمد کے حوالے سے کافی بحث آگے گزر چکی ہے۔ یہاں واقعات پھر دہرانا مناسب نہیں۔ راجہ صاحب کی تاریخ کے بارے میں نامی گرامی پروفیسر احمد حسن دانی اپنی رائے دے چکے ہیں جس کا ذکر بھی پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہاں میں ان کی رائے کی طرف اشارہ کروں گا۔ وہ کتاب کے تواریخ کی دوری پر حرف چینی کرتے ہیں۔ اور ان تواریخ کو ناقابل اعتبار گردانتے ہیں۔ پروفیسر دانی نے اس حوالے سے کوئی تجزیہ پیش نہیں کیا۔ ایک اچھے مورخ کے لئے انصاف شرط ہے۔ اگر مورخ منصف نہ ہو اور تعصبات ذہن میں رکھ کر تاریخ لکھنا شروع کرے اور پھر اسے موازناتی تاریخ پر عبور نہ ہو۔ تو ظاہر ہے تاریخ نہیں لکھی جا سکتی میں یہاں ان کتابوں، تاریخوں کی ایک تفصیل پیش کروں گا۔ جس میں ہمارے اس علاقے کے حالات ملتے ہیں۔

1۔ فاہیان (چینی سیاح) 403ء میں داریل سے ہوتے ہوئے سوات آیا۔

2۔ منگ پن (چینی سیاح) 510ء میں کافرستان سے ہوتے ہوئے سوات آیا۔

3۔ ہیون سانگ (چینی سیاح) 630ء میں کابل سے ہوتے ہوئے سوات آیا۔

4۔ کتاب حدود العالم کے نامعلوم مسلمان سیاح جس نے 982ء 983ء میں اپنی کتاب میں ہمارے علاقے کا ذکر کیا۔ وہ نامعلوم مصنف ہماری شمالی سرحدات تک آیا۔

5۔ البیرونی جو 1021ء میں محمود غزنوی کے ساتھ ہند آیا۔ اور وہ یہاں 1031ء تک رہا۔ اور پھر اپنی کتاب، کتاب الہند 1031ء اور 1048ء کے دوران لکھی۔

6۔ کلہن نے راج ترنگنی 1128ء تا 1149ء میں مرتب کی۔

7۔ مارکوپولو نے اپنا سفر نامہ 1298ء میں مرتب کیا۔ وہ بھی شمالی سرحدات سے ہوتے ہوئے چین گیا۔

8۔ مرزا حیدر دوغلت نے اپنی مشہور تاریخ، تاریخ رشیدی 1529ء کے بعد مرتب کیا۔ وہ 1528ء اور 1529ء کے دوران کوئی چھ ماہ گلگت میں مقیم رہا۔

9۔ وزیر حشمت اللہ گلگت کے وزیر وزارت رہے۔ وہ 1894ء تا 1928ء تک چترال،

گلگت، بلتستان الداخ میں بڑے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ اور اپنی تاریخ کی کتاب تاریخ جموں لکھی۔

راجہ شاہ رئیس خان کیانی، طرہ خانی حکمرانوں کی تواریخ یوں پیش کرتے ہیں۔

1۔	آذر جمشید	642ء....659ء	16 سال مدت حکومت
2۔	نور بخت	659ء....668ء	9 سال مدت حکومت
3۔	کرک	668ء....723ء	25 سال مدت حکومت
4۔	سوملک	723ء....793ء	40 سال مدت حکومت

بقول شاہ رئیس یہاں 725ء میں اسلام آیا۔

5۔	شاہ ملک	793ء....887ء	35 سال مدت حکومت
6۔	ویگ ملک	887ء....923ء	54 سال مدت حکومت
7۔	خسرو خان	923ء....997ء	65 سال مدت حکومت
8۔	حیدر خان	997ء....1057ء	60 سال مدت حکومت
9۔	نور خان	1057ء...1127ء	70 سال مدت حکومت
10۔	شاہ مرزا	1127ء...1205ء	78 سال مدت حکومت
11۔	طر طرہ خان	1205ء...1236ء	31 سال مدت حکومت
12۔	رانی طر طرہ خان	1236ء...1241ء	5 سال مدت حکومت
13۔	طرہ خان اول	1241ء...1275ء	34 سال مدت حکومت
14۔	سوملک دوم	1275ء...1345ء	70 سال مدت حکومت
15۔	چلس خان	1345ء...1359ء	14 سال مدت حکومت
16۔	فردوس خان	1355ء...1397ء	38 سال مدت حکومت
17۔	خسرو خان دوم	1397ء...1422ء	25 سال مدت حکومت
18۔	ملک شاہ	1422ء...1445ء	27 سال مدت حکومت
19۔	طرہ خان دوم	1449ء...1479ء	30 سال مدت حکومت
20۔	چلس خان دوم	1479ء...1497ء	18 سال مدت حکومت
21۔	سوملک سوم	1497ء...1522ء	25 سال مدت حکومت
22۔	شاہ رئیس اعظم	1522ء...1561ء	39 سال مدت حکومت

23-	صاحب قرآن	1561ء...1567ء	6 سال مدت حکومت
24-	سلطان مرزا	1567ء...1600ء	33 سال مدت حکومت
25-	علی شیر خان	1600ء...1632ء	32 سال مدت حکومت
26-	علی حیدر	1623ء...1633ء	1 سال مدت حکومت
27-	وزیر ریشو	1623ء...1633ء	3 ماہ
	نائب خاقان مرزا		
28-	خاقان مرزا	1623ء...1635ء	3 سال مدت حکومت
29-	وزیر ریشو	1635ء...1642ء	8 سال مدت حکومت
30-	ریشو	1642ء...1667ء	75 سال مدت حکومت
	بہ ولایت جواری		
31-	جواری	1642ء...1645ء	3 سال مدت حکومت
32-	جی خان	1670ء...1689ء	12 سال مدت حکومت
33-	جواری	1689ء...1705ء	16 سال مدت حکومت
34-	غوری تھم	1705ء...1800ء	95 سال مدت حکومت
35-	وزیر ملا بیگ	1800ء...1802ء	2 سال مدت حکومت
	سلیمان شاہ		
36-	محمد خان	1802ء...1824ء	22 سال مدت حکومت
37-	سلیمان شاہ	1825ء...1826ء	1 سال مدت حکومت
38-	صاحب نما	1825ء...1828ء	3 سال مدت حکومت
39-	طاہر شاہ	1827ء...1836ء	
	قائم مقام صاحب نما		

ہیون سانگ 630ء میں کابل سے ہوتے ہوئے سوات گیا۔ اس نے اپنا سفرنامہ ہی یو چی (Hsi - yu - chi) کے نام سے 650ء کے آگے پیچھے مرتب کیا وہ لکھتے ہیں کہ بلور ایک ایسی ریاست ہے۔ جو شمالاً جنوباً تنگ ہے۔ لیکن شرقاً غرباً پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں ایک منفرد قسم کا رسم الخط مروج ہے۔ جٹ مار کا کہنا ہے کہ ہیون سانگ کا یہ اشارہ گلگت کی طرف ہے ان کا کہنا ہے کہ بلور کا علاقہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ مشرقی حصہ بلور اعظم اور مغربی حصہ بلور صغیر۔ یہ علاقے

اس وقت تبت کے زیر اثر تھے۔ باور صغیر یا بروزا (جس میں چترال بھی شامل تھا) بلور اصغر (لداخ، بلتستان)، تبت، چین، توکھرستان (بدخشان) اور کشمیر انتہائی اہمیت کی سیاسی وحدتیں تھیں۔ ہیون سانگ باور کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن وہ یہاں کسی اور پولٹیکل ڈھانچہ کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ کوہستان وادی کشن گنگا کی طرف کسی مرکزی حکومت کے تعلق کا پتہ نہیں چلتا۔ 751ء کے قریب شمال میں عربوں اور مسلمانوں کی تگ و تازیاں بڑھ گئی تھیں۔ اس زمانے میں عباسیوں کے نامور جرنیل ابو مسلم خراسانی کے نائب زیاد بن صالح نے تالاس (کرغزیہ) کے مقام پر چینی جرنیل کاؤ کو شکست دی۔ یہ دراصل عربوں، چین، تبت کے درمیان علاقے میں برتری کے لئے جنگ تھی۔ بلور ایک سیاسی وحدت تھی۔ یہ چترال سے لداخ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس ریاست کا صدر مقام بلتستان میں تھا اس دور میں کسی کیانی ریاست کی بو باس نہیں۔

983-982ء اور اس کے قریب زمانے میں حدود العالم کتاب منظر عام پر آئی۔ یہ کسی نامعلوم مسلمان جغرافیہ دان، عالم کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کا ذکر پہلے ابواب میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نامور مصنف ہماری سرحدات کو چھوتا ہے۔ وہ یہاں بلور نام کی ریاست کا ذکر کرتا ہے اور اسے ایک کفرستان قرار دیتا ہے۔ جس کا حکمران اپنے آپ کو شمس کا فرزند گردانتا ہے اور وہ اس وقت تک نہیں جاگتا جب تک سورج طلوع نہیں ہوتا۔ وہ اس بادشاہ کا نام بلورین شاہ بتاتا ہے۔ اس ملک میں نمک نہیں ہوتی اور یہ کشمیر سے درآمد کی جاتی ہے۔ اس دور میں راجہ شاہ رئیس خان کے حکمران کردار آذر سے لے کر خسرو خان تک کسی حکمران کا ذکر نہیں آتا۔ اور نہ اس اسلام کا ذکر ہے جو شاہ رئیس خان نے 725ء میں یہاں آیا دکھایا تھا۔ ہمارے نامور مسلمان مصنف بلور کو ایک کفرستان بتاتے ہیں۔ اس سلسلے میں تفصیلی بحث آگے گزر چکی ہے کہ ان دنوں بلتستان، کشمیر اور اردگرد کہیں اسلام موجود نہیں تھا۔

ابوریحان البیرونی محمود غزنوی کے دربار کا ایک نامور عالم تھا۔ وہ عربی، سنسکرت، علم ہندسہ و نجوم کے علوم میں ماہر تھا۔ محمود غزنوی کے کشمیر پر حملے میں وہ ان کے ساتھ تھا۔ محمود غزنوی کا حملہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا اور اسے واپس لوٹنا پڑا۔ البیرونی جیسا زیرک مورخ اور سنسکرت زبان کا عالم کو اس سیاحت میں بڑا لطف آیا اس نے یہاں کشمیری پنڈتوں سوات، ہزارہ کے علماء کی مدد سے اس طرف کے جغرافیائی ماحول اور سیاسی نظاموں سے شناسائی حاصل کی۔ 1031ء تا 1048ء کے زمانے میں اس نے اپنی تاریخ کتاب الہند لکھی۔ وہ لکھتے ہیں۔ کشمیر ایک میدان ہے جس کو چاروں طرف سے اونچے اور محفوظ پہاڑ گھیرے ہوئے ہیں۔ اس کا دکھن اور

پورب حصہ ہندوؤں کا ہے۔ پچھم چند بادشاہوں کا ہے۔

جن میں سے سب سے زیادہ قریب باور شاہ ہے۔اس کے بعد بدخشاں کی سرحد تک شکنان شاہ اور وخان شاہ ہیں۔ یہ وہی بلورین شاہ ہے جس کا ذکر حدودالعالم کا مصنف بھی کر چکے ہیں۔ اس دور میں بھی راجہ شاہ رئیس خان کے کسی حکمران کردار کا نام نہیں ملتا۔ دوسرا وہ جس حکمران کا ذکر کرتے ہیں بوٹھ شاہ ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں۔ دریائے سندھ اٹک پہاڑوں سے جو ترکوں کی حدود میں نکلتا ہے اگر تم مدخل کی گھاٹیوں سے صحرا میں نکلو تو تمہارے بائیں طرف دوون کی راہ پر باور اور شمیلان ترکوں کے پہاڑ ہیں جو بھٹادریان کہلاتے ہے۔ان کا بادشاہ بوٹھ شاہ ہے۔ ان کے شہر گلگت، اسورہ، (استور) اور شلستاس (چلاس) ہیں۔ تقریباً 1000ء کے قریب زمانے میں البیرونی ہمارے علاقوں میں دو حکومتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

1۔ بلور کی حکومت جس کا حکمران بلورین شاہ ہے۔

2۔ بوٹھ کی حکومت جس کا حکمران بوٹھ شاہ ہے۔

پہلی حکومت کے بارے میں حدودالعالم مصنف کا بیان بھی موجود ہے۔ میرے نزدیک بروزا، پولیو، بلور کی حکومت جن کی سرحدیں بدخشان تک جاتی ہیں اس کا مرکز خواہ گلگت یا پونیال یا ہاتون یا یاسین قرار دیا جائے۔ یشکنوں ، بروشو کی حکومت تھی۔ چلاس داریل تا تنگیر، سازن وغیرہ علاقوں پر شنوں کی حکومت تھی اور اس وحدت کے حکمران چلاس کے بوٹھ یا آج کے بوٹے تھے۔

راج ترنگنی 1148-50ء کے دوران لکھی گئی۔ یہ جموں وکشمیر میں منظم انداز میں لکھی جانے والی پہلی تاریخ تھی۔اس تاریخ میں کسی جگہ بلور، بلورین، بلور صغیر، بلور اصغر، بروزا، بروشال وغیرہ کسی اصطلاح کا ذکر نہیں آیا۔ اس تاریخ میں درد، دردا، دردویسا، درواز، وغیرہ کا ذکر ملتا ہے یہ بات درست ہے کہ اس نے کشمیر کے متصل داردوں کے علاقہ کا ذکر کیا ان کی بے پناہ قوت کا ذکر کیا کچھ حکمرانوں کے نام دیے۔ یشودھرا، من دھرا وغیرہ یا گلگت مسودات میں (جو ساتویں صدی عیسوی میں مرتب ہوئے) جو نام دیے گئے۔ جیسے سری دیوا شاہی سریندرا، یا ایک رانی کا نام سامی دیوی وغیرہ نام گلگت کی تاریخ کے ناموں سے لگا نہیں کھاتے۔ ایسا لگتا ہے۔ 1000ء کے بعد گلگت، ہنزا، نگر، یاسین پر داردوں نے اپنی حکومتیں بڑھائیں۔ بروزا، بروشال، بلور، پولیو، پلور کی حکومت ایک بڑی تباہی سے دوچار ہوئی۔ یہاں دارد (شین) آئے اور پورے علاقے پر چترال کے حدود سے بابوسر، سازن تک پھیل گئے۔ شینوں کے ان حملوں کی وجہ سے یشکن، شمال مغرب اور

گلگت کے شمال مشرق کی طرف ہنزا، نگر، پونیال، اشکومن، گوپس، یاسین کی طرف سمٹتے گئے۔ ان کا کلچر، ان کی زبان پہاڑی تنگ نائیوں میں آگئی اور اس کی ترقی ختم ہو گئی۔

مارکوپولو نے 1298ء میں اپنا سفر نامہ مکمل کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔ "آگے ایک قصبہ بلور ہے جس کے باشندے پہاڑوں پر رہتے، بتوں کو پوجتے، شکار کرتے اور جانوروں کی کھالوں کا لباس پہنتے۔ وہ بھی راجہ شاہ رئیس خان کے کسی کردار کا ذکر نہیں کرتے۔ حالانکہ راجہ صاحب کے مطابق اس علاقے میں ان دنوں شاہ مرزا، طرطرہ خان، رانی طرطرہ خان، طرطرہ خانہ اول جیسے نامور حکمران تھے۔ ان حکمرانوں کی ملک کی سرحدیں بدخشان سے لے کر کوہ تراگ بل پہاڑ تک تھیں۔ مارکوپولو پامیر کی سرحد کے بہت قریب سے گزرا تھا۔

شاہ رئیس خان کی تاریخ ابہام کا پلندہ ہے۔ اس میں بیشتر افسانوی کردار ملتے ہیں اور افسانوی باتیں جو حقائق کے قریب سے بھی نہیں گزرتیں۔ انہوں نے یشکنوں اور شینوں کی حکمرانی کے ادوار بھی اپنے کھاتوں میں ڈال کر ان کی نامور حکمرانیوں پر پانی پھیر دیا۔ حالانکہ ماضی کی ان حکمرانیوں کی دھوم رہی ہے اور تاریخ میں ان کا ذکر اذکار ہوتا رہا ہے۔ بلور اور بوٹھ شاہ اور دردویسا کی حکومتیں تاریخ کا حصہ رہی ہیں۔ کسی زمانے میں ان داردوں، شینوں کی حکومت سوات تک تھی، جٹ مار، سٹائن وغیرہ تو داردوں کو طاقت کا مظہر سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ آج تک کسی نے یشکن اور شین اور بعد کی حکمرانیوں کے ادوار متعین نہیں کیے۔ میں نے جن ادوار کا اب تعین کیا ہے ان میں کچھ فرق ہو سکتا ہے لیکن صدیوں کا فرق نہیں ہو سکتا۔ میرے متعین ادوار کو منضبط تاریخ توانائی فراہم کرتی ہے۔ مرزا حیدر دوغلت کی تاریخ رشیدی، مارکوپولو کا سفر نامہ، ہیون، سانگ کا سیاحت نامہ، راج ترنگنی، لوک گیت، محمد دین فوق کی تاریخ کشمیر، گلگت مسودات میرے تائید میں ہیں۔

جہاں تک لوک گیت کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر لٹز نے جتنے لوک گیت حاصل کئے ہیں ان میں ایک دو لوک گیتوں کے علاوہ باقی لوک گیت قدیم شین حکومتوں سے متعلق ہیں۔ تاریخی ادوار اس طرح ہیں۔

1۔	یشکنوں کی حکومت شروع	100ق م سے 1000ء تک
2۔	شینوں کی حکومت	1000ء سے 1400ء تک
3۔	تراخانی، مغلوت کی حکومت	1400ء سے 1822ء تک

اس تراخانی دور میں وزیر ریشو کی حکومت کے کچھ سال شامل ہیں۔

یہ بات یار رہے۔ شینوں کی حکومت اس پورے علاقے پر تقریباً چار سو سال سے زائد مدت تک رہی۔ لیکن شینوں کی دردو دیسا میں حکومت کا زمانہ اس سے زیادہ لمبا ہے۔ ڈاکٹر لفز شمی شاہ کو شینوں کے بانیوں میں سے سمجھتے ہیں۔ وہ ایک لوک گیت پیش کر کے اس کا انگریزی ترجمہ یوں بیان کرتے ہیں۔

" Shammi Shah shaitheing was one of the founders of the shin rule. His wife, although she sees her husband surrounded by women anxious to gain his good graces, rests secure in the knowledge of his affections belonging to her and of being the mother of his children. She, therefore, ridicules the pretensious of her rivals, who, she fancies, will, at the utmost, only have a temporary srccess. "

شینوں کا ایک نامور حکمران سوری بدت تھم تھا۔ ان خاندان کا سلسلہ سوری بگر تھم سے تھا۔ میرے خیال میں اس بگر کا تعلق بگروٹ کے شینوں سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بگروٹ کسی زمانے میں شینوں کا گڑھ تھا۔ تھم بروشکی میں راجہ کو کہتے ہیں۔ جب گلگت میں یشکنوں کی حکمرانی کو ضعف آیا اور حکومت شینوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ تو تھم لاحقہ کے طور پر راجہ کے لئے مختص رہا۔ گلگت میں راجہ کیلئے تھم اور رع دو القاب کا استعمال ہوتا تھا۔ لیکن رع بعد کی ایک اصطلاح ہے۔ قدیم اصطلاح تھم ہے۔ جو بروشکی کا لفظ ہے۔ یہ یشکنوں اور شینوں دونوں کے ناموں کے ساتھ استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس طرح شینا میں سوری سورج کو کہتے ہیں۔ اور یہ قدیم ادوار میں راجوں کے لئے بطور سابقہ احتراماً استعمال ہوتا تھا۔ سوری آہستہ آہستہ شری میں بدل گیا۔

گلگت کے بگر تھم سلسلے کے شین حکمران طاقتور تھے۔ ان کی حکومت گلگت، ہنزا، نگر، داریل تانگیر، چلاس، گریز، چترال میں مستوج تک تھی۔ کہا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں مستوج میں شینوں کی حکومت تھی اور اس طرف شین ملتے تھے (بڈلف) ممکن ہے۔ یہ گلگت کے شین حکمرانوں کے نمائندہ ہوں اس طرح بلتستان کے مقپون اور شگر کے اماچہ حکمرانوں کے بارے میں بیشتر ماہرین عمرانیات کی رائے ہے کہ یہ بھی شین حکمران تھے۔ شگر میں بھی بلتی زبان میں تھم سرایت کر چکا تھا۔ میرے نزدیک شگر کے اماچہ نہ شین ہیں اور نہ نگری کیونکہ اماچہ خاندان کی جسمانی ساخت اور خدوخال کسی بھاری بھر کم جسم اور کسی اعلیٰ خاندان کی چغلی کھاتے ہیں۔ زیادہ

قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ترکستان کے کسی شاہی قبیلے کے گم شدہ شہزادہ ہوں۔ اس طرح میرے نزدیک کشمیر کے چک بھی شین حکمران تھے۔ چلاس میں بوٹھو اور مت چکوں کی لڑائی اور مت چکوں کا راہ فرار اختیار کرنا روایاتی تاریخ کا حصہ ہے ان ہی میں سے 1300ء کے متصل زمانے میں لنکر چک کشمیر آیا۔ یہ مت چک کی نسل سے تھا۔ ڈاکٹر صابر آفاقی ان چکوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ کہ یہ اجڈ مزاج پر آشوب عادات، مضبوط جسمانی ساخت کے لوگ تھے۔ یہ جسمانی خدوخال شینوں کی خصوصیات کے آئینہ دار ہیں۔

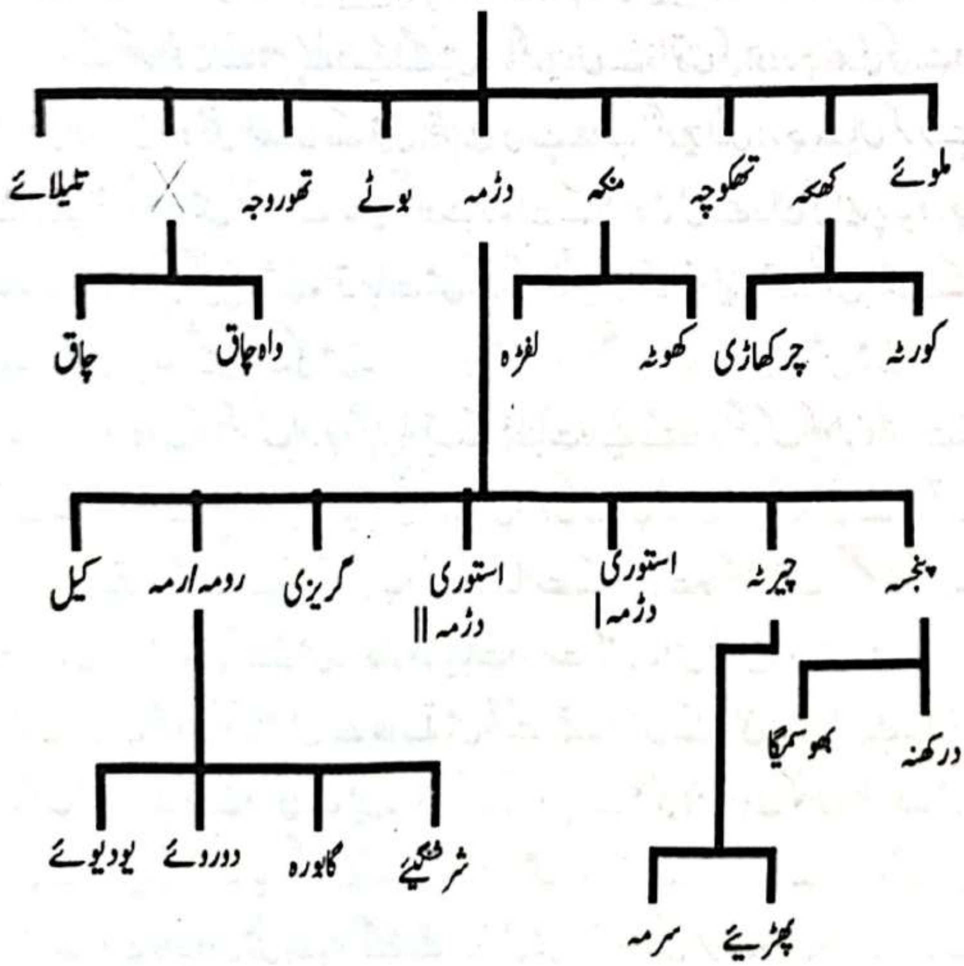
شین ایک بڑی قوم ہے۔ جس قوم نے چار سو سالوں سے اوپر حکومت کی ایک متمدن تمدن کو جنم دیا بڑے بڑے حکمران پیدا کئے کسی اور نام کی تلاش کی ضرورت نہیں کہ وہ بڑے کہلائیں۔ ان کے حکمران بگر تھم، شری بدت، شمی تھم، علی شیر لچن، احمد شاہ، وغیرہ تھے۔ دردیسا کے حکمرانوں کے نام پہلے دیئے گئے ہیں۔ انگریزوں نے ذاتوں کی جو درجہ بندی کی ہے وہ حکمرانی اور رائج حکومتی عہدوں کے پیش نظر کی گئی ہے۔ جب انگریز ایسی درجہ بندیاں کر رہے تھے۔ یہ اثر لوگوں میں گلگت کے سابق مغلوث خاندان کے افراد شامل تھے۔ ان کی ایما پر یہ درجہ بندیاں سامنے لائی گئیں۔ شمالی علاقہ جات میں کچھ کچھ شادیوں کے ضوابط تھے۔ لیکن اسلام کے آنے کے بعد یہ بند شیں ٹوٹ گئی ہیں۔

شینوں کو ڈنگرک اور بروکپایابلوقیہ کے خطابات دیے گئے۔ ڈانگرک کھوار کا لفظ ہے۔ جس کے معنی گائے والا کے ہیں۔ یہ عرفی نام چترال والوں نے ان شینوں کو دیا۔ جو ان کے علاقوں میں آگئے تھے اور گائے سے متعلق عجیب و غریب کراہت کے خیالات رکھتے تھے۔ کنگھم ڈانگرک کو بلتستان سے منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ اس طرح بروکپایابلوقیہ بلتستان والوں نے ان شینوں کو دیا جو ان کے علاقے میں آگئے تھے۔ جس کے معنی پہاڑیے ہے۔ بالائی طبقوں میں رہنے والے وحشی کے ہیں۔ ڈانگرک یا پروکپا جسے عرفی نام شینوں کو ان اطراف میں اس لئے دیے گئے۔ کہ یہ جنگجو تھے۔ درشت اور تنک مزاج تھے۔ ان اطراف کے لوگ اپنی تہذیب کو ان نوواردوں میں بلند بالا سمجھتے تھے۔ چترال میں عشریت کی طرف رہنے والے ڈانگرک قبائل ہیں۔ میرے خیال میں یہ قبائل جولواری کے دامن میں آباد ہیں۔ دیر، سوات کے منہ میں ہیں۔ ان کی آمد کا راستہ یہی نظر آتا ہے۔ اور زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ کوہستان، ٹاروال سوات کی طرف سے یہاں آگئے ہوں۔ گلگت یا چلاس سے گھوم کر ادھر جانے کی راہ بہت کم نظر آتی ہے۔ پھلوار زبان کے ابتدائی ریشے، پشتو، کوہستانی اور ٹاروالی میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی پھلوار پر

ٹاروالک سوار ہے۔ لاسپور کی طرف جو شین ہیں وہ الگ گروپس ہیں۔

یہ بات ہر لحاظ سے قوی ہے کہ شین آریا ہیں۔ ان کی زبان صرف ہند ایرانی خاندان کی ایک شاخ ہے۔ اور سوات، کوہستان میں آ کر جب یہ شین نام معروف ہوئے تو ان کے بڑے بڑے قبیلے وجود میں آئے۔ اور پھر مرور زمانہ کے ساتھ ان بڑے قبیلوں سے جدا ہو کر چھوٹے چھوٹے سب ٹرائبز بنے۔ اور یہ اپنے اجداد کے نام سے مشہور ہوئے۔ شینوں کے قبیلیاتی گروہ بندیوں کے بارے میں رازول کوہستانی نے ایک نقشہ اپنی کتاب انڈس کوہستان میں دیا ہے۔ جو میں یہاں پیش کررہا ہوں۔

آریا (یہ میرا اضافہ ہے)



ہماری طرف بڑے قبیلوں میں ملوے، دڑے، بوٹے اور مچو کے شامل ہیں۔ رازول کوہستانی ملووں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ کہ وہ اس شاخ کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ یہ کہاں آباد ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ البتہ اس نام سے داریل میں یشکن یا کمین لوگ پائے جاتے ہیں۔

(صفحہ 47)انہیں کوہستان میں اس نام کے کسی قدیم یا جدید قبیلہ کا پتہ نہ چل سکا۔ جہاں تک اس خاندان کا تعلق ہے ہماری طرف یہ ایک معزز، شین خاندان ہے۔ اور یہاں جتنے شین خاندان ہیں وہ ملووں کو شیعوں کے ابدائی گھرانوں سے سمجھتے ہیں۔ اس خاندان کے لوگ بونجی اور سئی میں ملتے ہیں۔ اس خاندان کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ ملوے خاندان کے لوگ تھور، ہوگاہ، داریل وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں قدیم زمانے سے اس خاندان کے نمبر دار مقرر کیے جاتے رہے ہیں۔ اس خاندان میں کئی نامور لوگ ہوئے۔ محمد اکرم سٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان، ڈاکٹر ہدایت ڈائریکٹر محکمہ امور حیوانات، پروفیسر مظلوم علی ڈگری کالج گلگت، نمبر دار بگدر خان، سکارڈرن لیڈر (ریٹائرڈ) ڈاکٹر محمد ایوب خان، محمد اشرف خان، یعقوب علی انسپکٹر پولیس کیپٹن حاجت، ڈاکٹر شبیر، نیاز علی نمبر دار وغیرہ شامل ہیں۔ دڑمے بھی شیعوں کا ایک بڑا قبیلہ ہے۔ اس قبیلے کے لوگ استور، گلگت، کوہستان، گور، بلتستان، کیل وغیرہ میں موجود ہیں۔

بوٹے جل کوٹ، پائس، اور چلاس میں عام آباد ہیں۔ ان کی ایک واضح تاریخ ہے۔ قدیم الایام سے چلاس کی طرف ان کی حکومت رہی ہے۔ قدیم کشمیری تاریخوں میں بوٹھوں کا بڑا ذکر ملتا ہے۔ بوٹے لداخ بلتستان کے بھی تھے۔ لیکن ان میں اور چلاس کے بوٹوں میں نمایاں فرق ہے بلتستان کے بھوٹاز کو حکومت کرنے کا وہ موقعہ نہیں ملا جو چلاس کے بوٹوں کو ملا۔ چلاس کے بوٹھ اور مت چکوں کی لڑائی کے بعد چونکہ بوٹھوں کو کامیابی ملی تھی۔ اس لئے چلاس کی حکومت بوٹھوں کے حصے میں آئی اور اس طرح یہ یہاں کے حکمران ہوئے۔ یہ قبیلہ آج بھی مضبوط ہے۔ کرامت اللہ چیف انجینئر، جان باز خان صدر مسلم لیگ، راجی الرحمت ڈی ایس پی، حاجی قدوس وغیرہ۔ جیسے لوگ اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مخہ قبیلہ کے لوگ بھی ہماری طرف موجود ہیں۔ رازدل کوہستانی کے مطابق تھک کے شین ہیٹی نظام کے گیارہ دائروں میں جو چیرٹ کہلاتے ہیں۔ منظم ہیں اور یہ گیارہ چیرٹ اس طرح دیے گئے ہیں۔

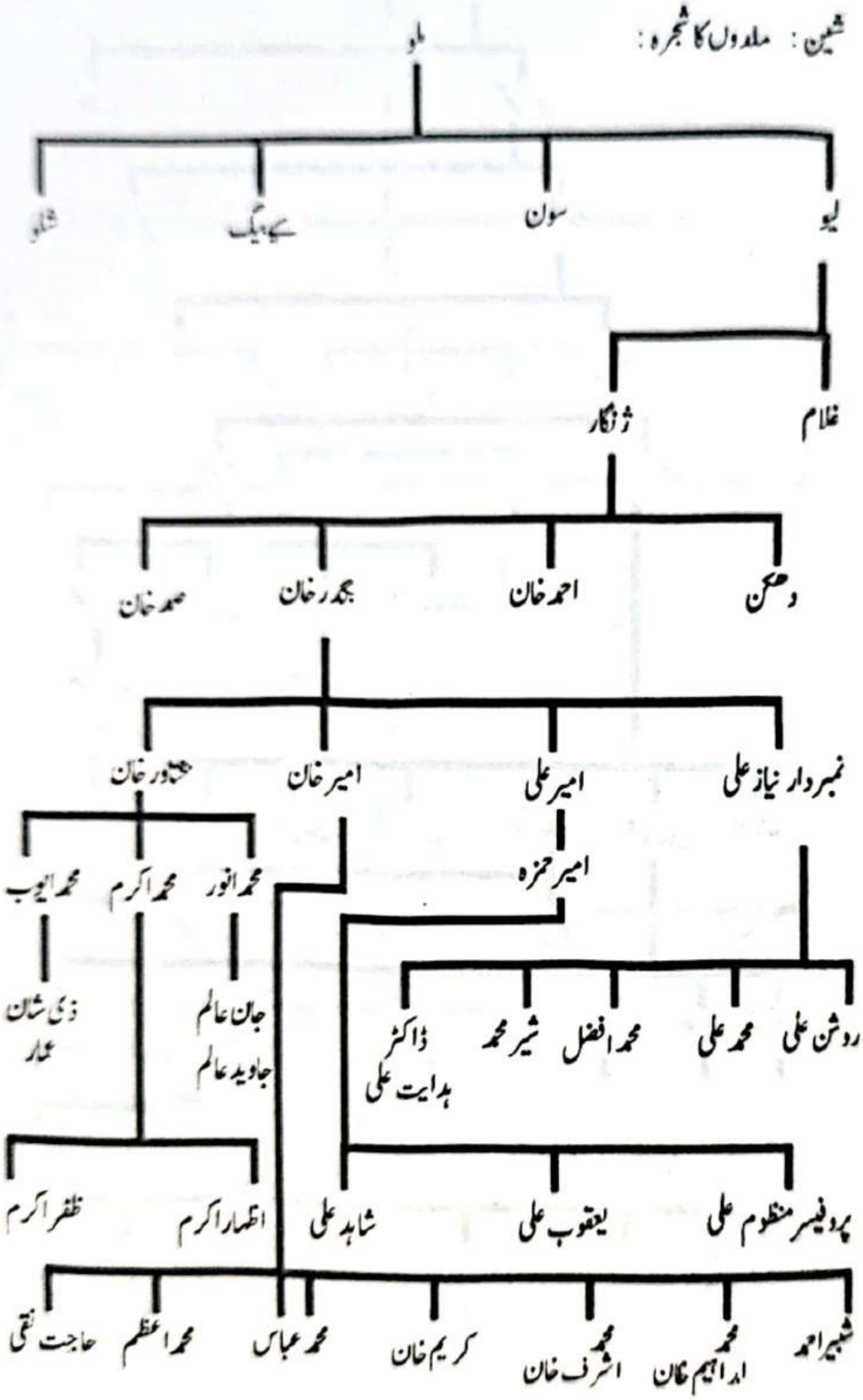
انجانے، انوارنے، نوسیدائے، دولے، شادے، بحررشے، ترخانے، شمشرے، لوسنے، گوروپے، ہملیۓ مچو کے کچھ استور میں آباد ہیں۔ جیسے میں نے پہلے ذکر کیا۔ یہ دراصل مٹ چکے تھے۔ جو بوٹھوں سے شکست کھا کر ادھر اُدھر فرار ہو گئے تھے۔ لنگر چک اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کی اولاد نے کشمیر میں چک حکومت قائم کی تھی۔ ان مچوکوں میں محمد خورشید جج ہائی کورٹ کا خاندان شامل ہے۔

ہماری طرف شیعوں کے چند معروف سب ٹرائبز درج ذیل ہیں۔

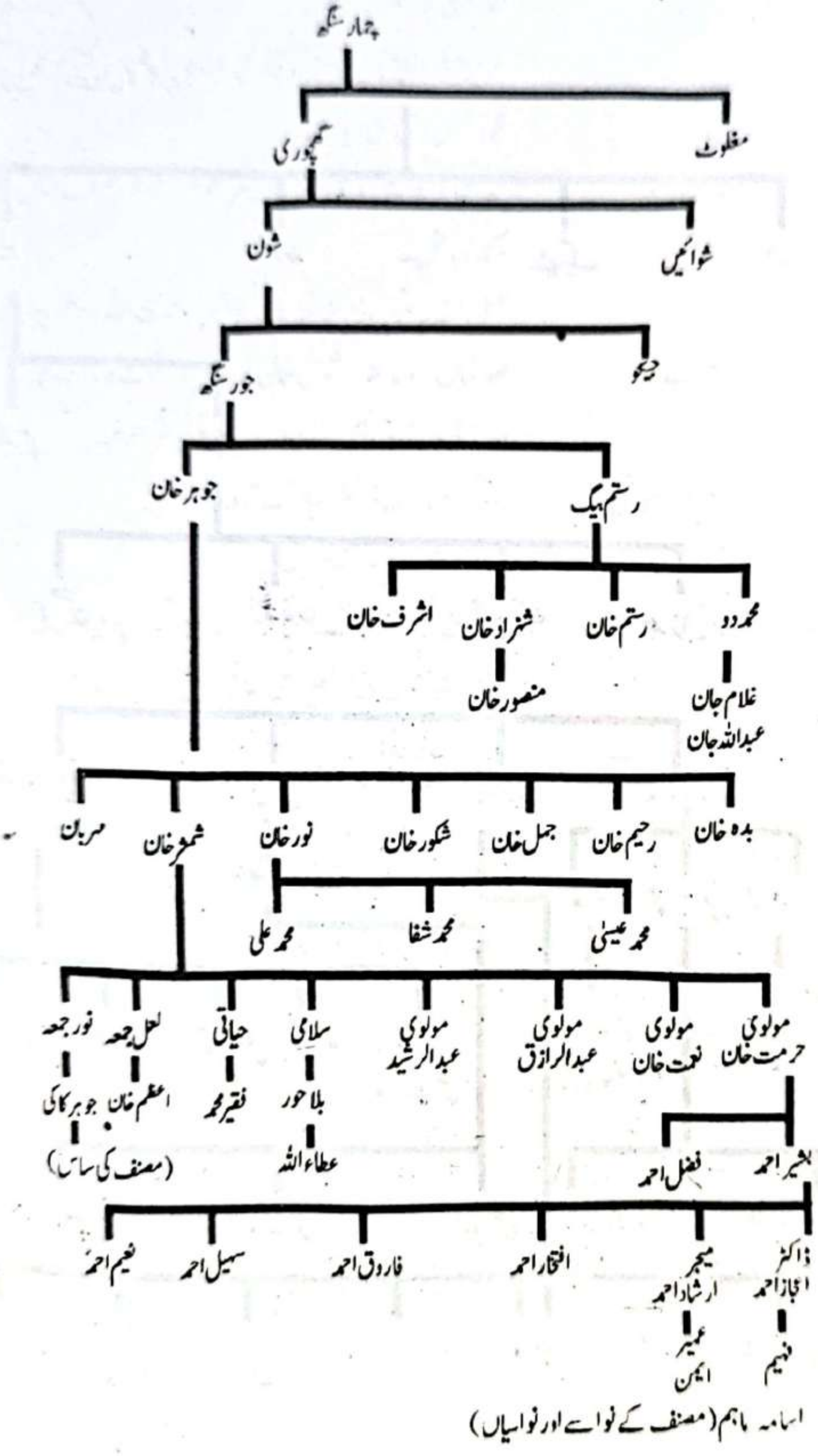
1۔ گبارے — مولوی محمد رضا، روشن خان، مولوی حنان، محمد غازی
نصر اللہ کونسلر
2۔ بڑے
3۔ چھالے — عزیز اللہ سابق ہیڈ ماسٹر، قاری عطاء اللہ استاد محترم محمد ولی،
محمد حسن ڈی سی دیامر۔
4۔ جوئے — محمد عباس وکیل، علی احمد جان مرحوم، محمد اسلم اے ایس آئی،
میجر ریاض۔
5۔ دودکا — فضل اللہ رینجر، ڈاکٹر شریف، ڈاکٹر رحمت اللہ، میجر ہدایت۔
6۔ جلوے — صمد خان ہیڈ ماسٹر، عیسٰی خان مرحوم، گلگت کا نامور پولو
کھلاڑی، شاہ رئیس خان اے ایس آئی مرحوم۔
7۔ برینے (صراموش) — ڈاکٹر مبارک ڈاکٹر مبارک شاہ۔
8۔ ژوڑے (سسی صراموش) — ڈاکٹر غلام، سلیم بیگ
9۔ دائینو — سید علی نمبردار، سنگ علی نمبردار گوہر آباد، پذیر ایس پی،
عتیق اللہ ایس ای، شکور علی سابق ڈپٹی رجسٹرار۔
10۔ رکیا (بگروٹ) — مختاور شاہ مجاہد
11۔ شتئیئے — تئیس کی اولاد
12۔ کولے — مختاور شاہ ہیڈ ماسٹر بگروٹ کا خاندان
13۔ چھلس — محمد عالم، غلام جگلوٹ۔
14۔ رجے — مجید یسین

کچھ شینوں کے شجرے یہاں دیے جا رہے ہیں۔

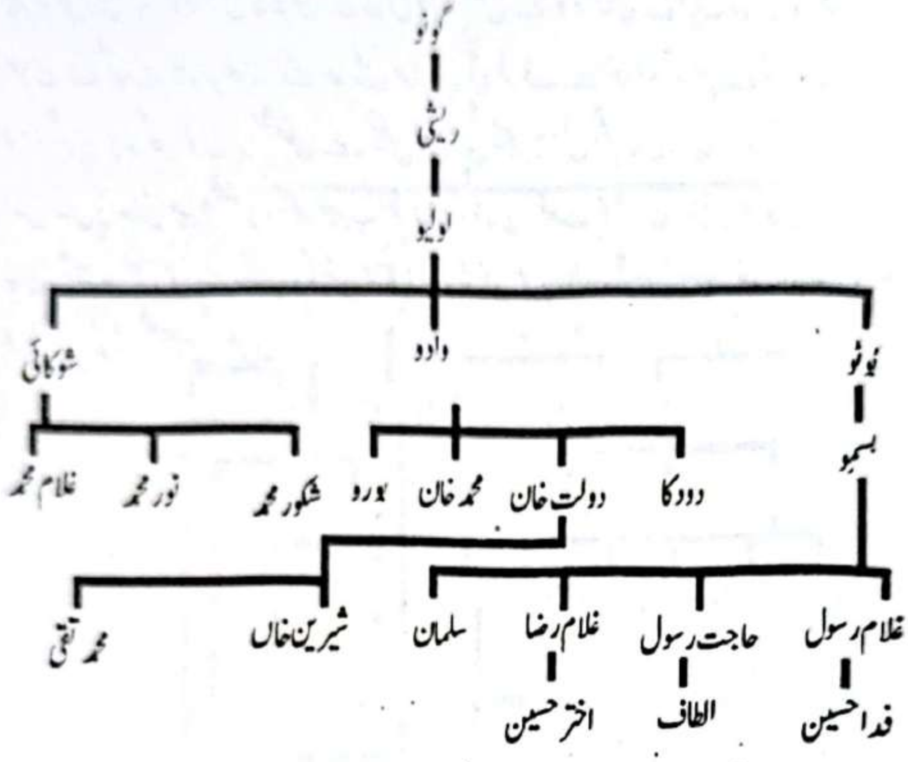
شین : ملدوں کا شجرہ :



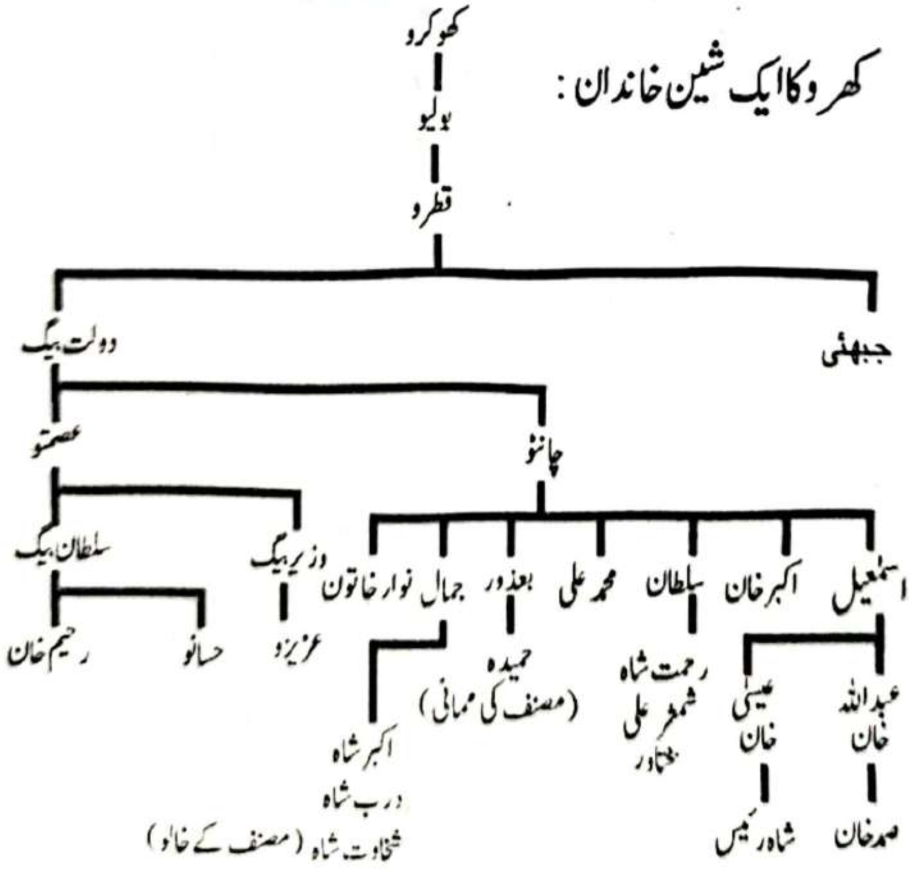
تیسوٹ بگروٹ کا ایک قدیم شین خاندان



استاد محترم غلام رضا مرحوم کا شجرہ

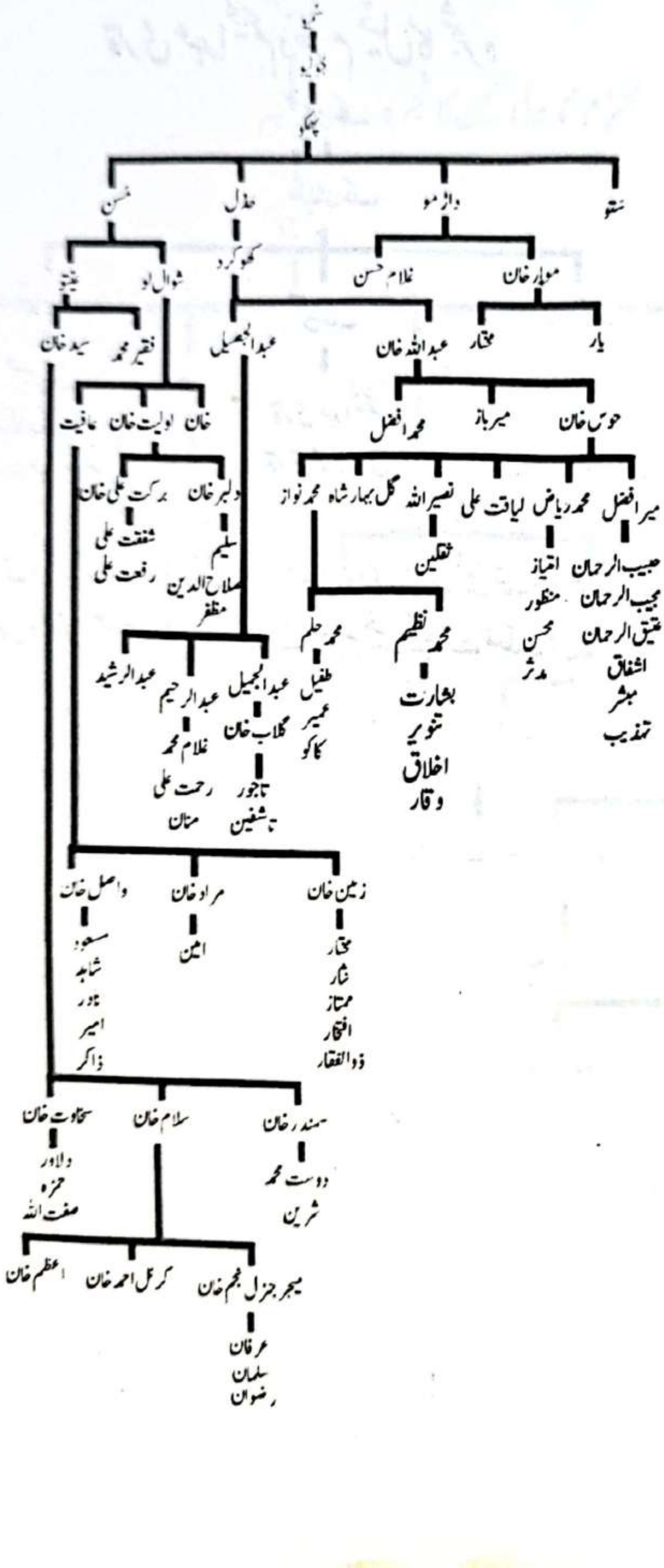


کھرو کا ایک شین خاندان :

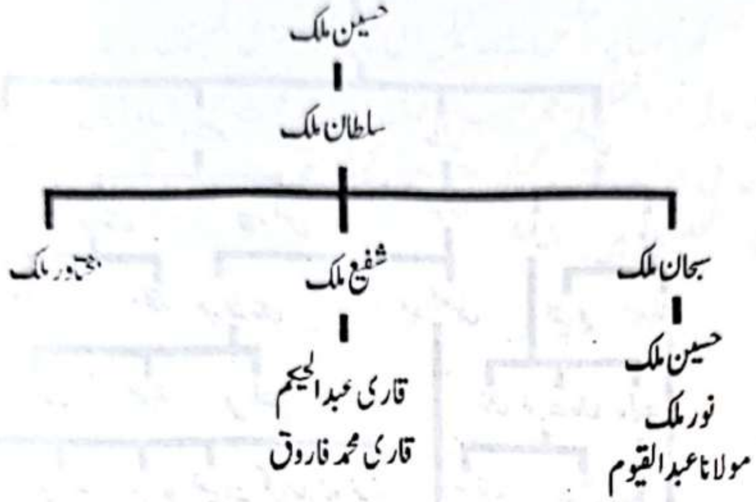


شیوں کے دھڑم خیل قبیلہ میں پھکو نامی شخص پالس کوہستان سے آ کر پہلے ڈموٹ اور پھر بونجی میں آباد ہوا۔ اس خاندان کے حَدلُ نامی شخص نے گوہر امان کے ایک سالار کو جگلوٹ میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جسے بعد میں مہاراجہ کی طرف سے انعام واکرام سے نوازا گیا۔ پھکو کی اولاد اگرچہ چند گھرانوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں میجر جنرل نجم خان، ریٹائرڈ بریگیڈئیر برکت، ایس ایس پی حاجی میر افضل، میجر حبیب الرحمان، کیپٹن رفعت علی خان، کیپٹن عرفان، کرنل احمد خان، شفقت علی سی ایس ایس، کیپٹن مختار احمد، کیپٹن مجیب الرحمان، کیپٹن رضوران اور کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز شخصیتیں ہیں۔

پھکو دھڑم خیل کا شجرہ درج ذیل ہے

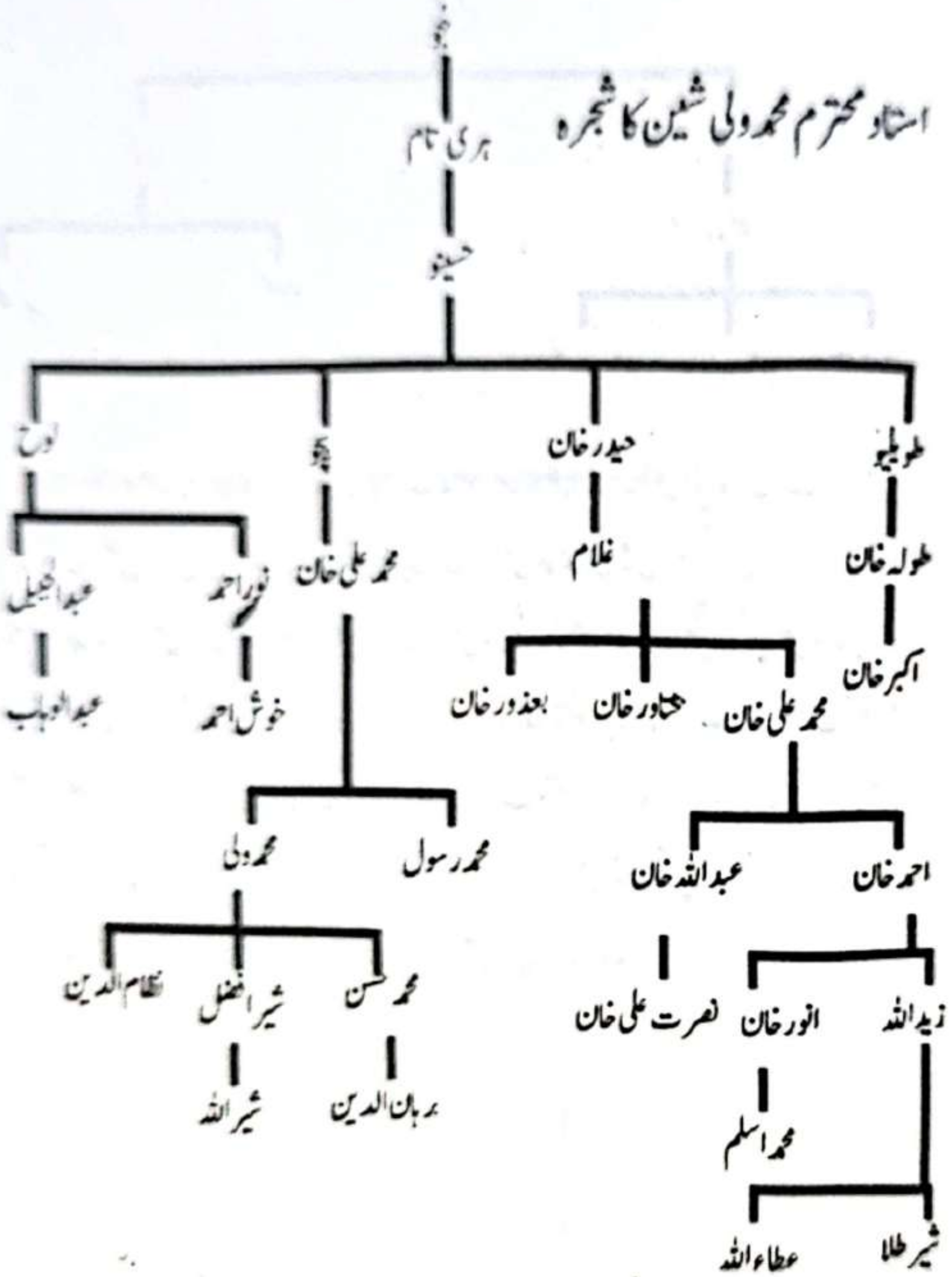


قاری عبدالحلیم دھڑم خیل کا شجرہ



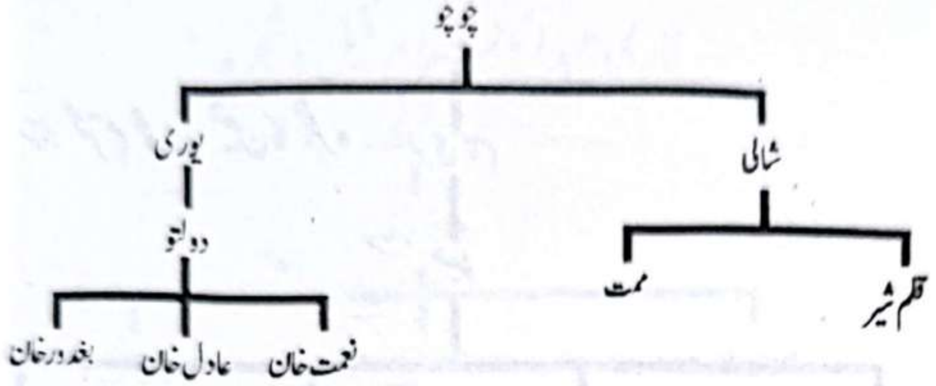
لوس، شنکر گڑھ اور پری سنگ دھڑم خیلوں کا ایک ہی جد اعلیٰ تھا۔ میجر عبدالوہاب شہید ستارہ جرأت اور پروفیسر اسلم عبداللہ پری سنگ کے دھڑم خیل قبیلے سے منسلک ہیں۔

استاد محترم محمد ولی شین کا شجرہ



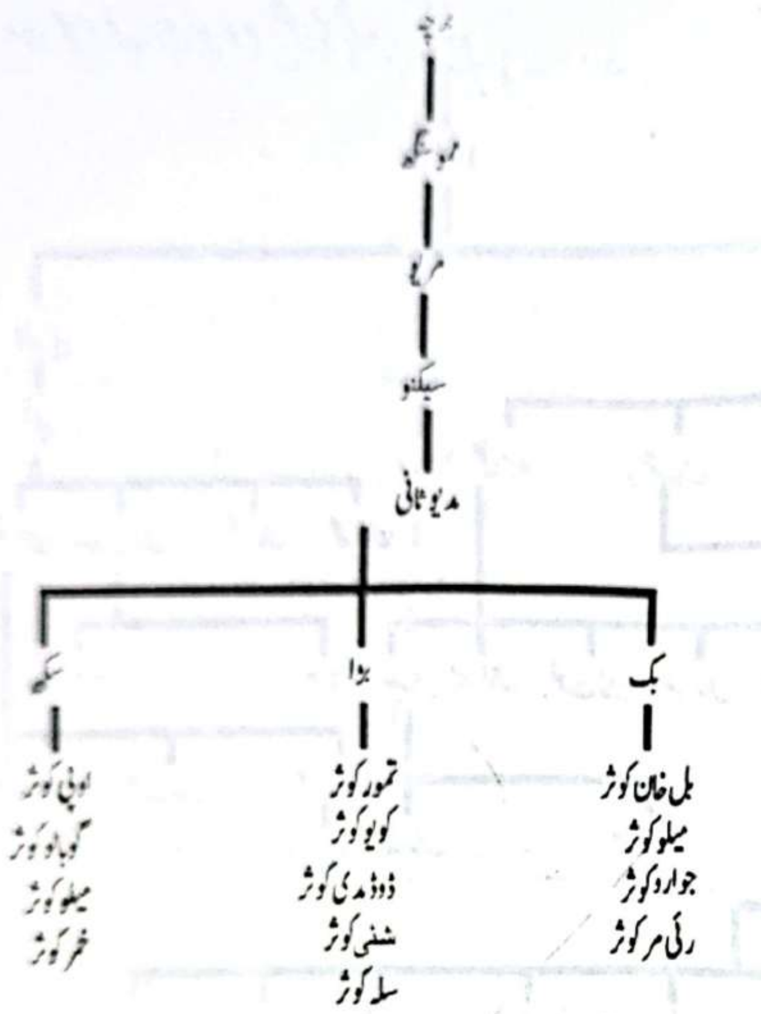
یہ چھالے شیوں کا شجرہ ہے۔ پروفیسر قاری عطاء اللہ عزیز اللہ سابق ہیڈ ماسٹر حبیب اللہ الیکشن کمشنر، غیاث انسپکٹر، ماسٹر نائب خان وغیرہ کا اس گھرانے سے تعلق ہے۔

برمس کے عادل خان شیئن کا شجرہ

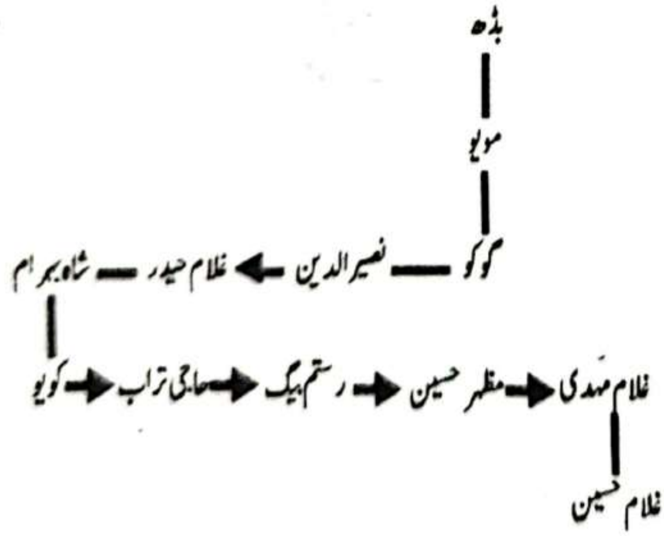


ہنزہ کا برچہ خاندان شیوں کا ایک نامور خاندان ہے۔ اس خاندان کے جداعلیٰ نے بگروٹ سے نقل مکانی کی تھی یہ ایک بڑا قبیلہ ہے۔ اس خاندان میں ناموران کی کوئی کم نہیں۔ قدیم اور جدید ناموں سے مموسنگھ، علی نعمت وکیل دربار، ترنگفا عنایت علی، سگی علی وکیل دربار، ڈاکٹر شیر زمان (پی ایچ ڈی) ڈاکٹر امیر علی، ایڈوکیٹ محمد یعقوب، امان اللہ ڈپٹی چیف میجر غلام مرتضیٰ، صوبیدار میجر فدا علی۔ جنگ آزادی گلگت کا ایک اہم کردار غلام حسین ہیڈ ماسٹر کرنل شاہ مکین، میجر عباس علی، میجر حیدر کریم، کیپٹن سخی کریم، شیر باز علی خان برچہ قلمکار، حاجی جان وغیرہ شامل ہیں۔ قدیم شجرہ اس طرح ہے جو مجھے شیر باز علی برچہ نے دیا۔

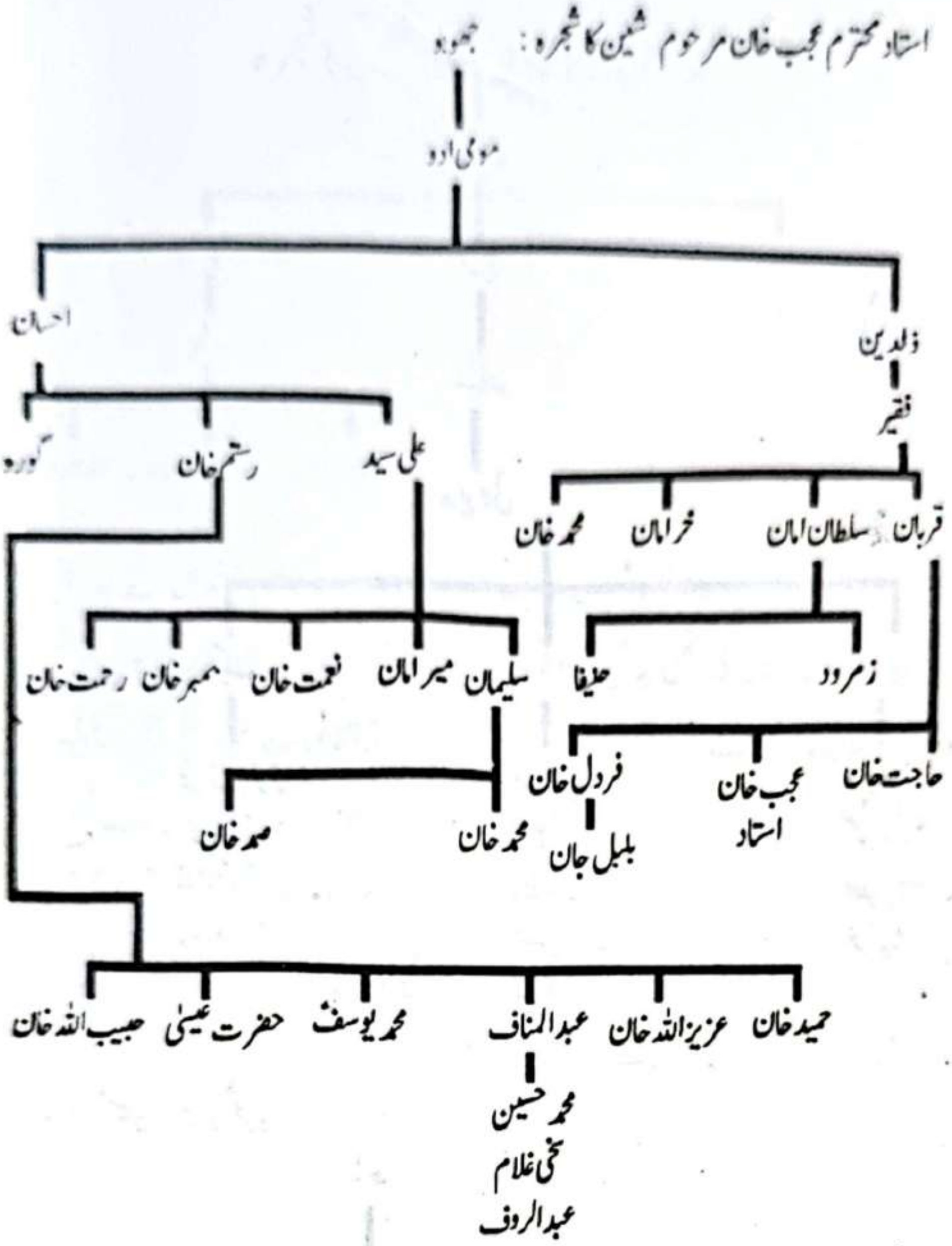
گھرانے:



برچہ غلام حسین استاد کا شجرہ:



استاد محترم عجب خان مرحوم شین کا شجرہ :



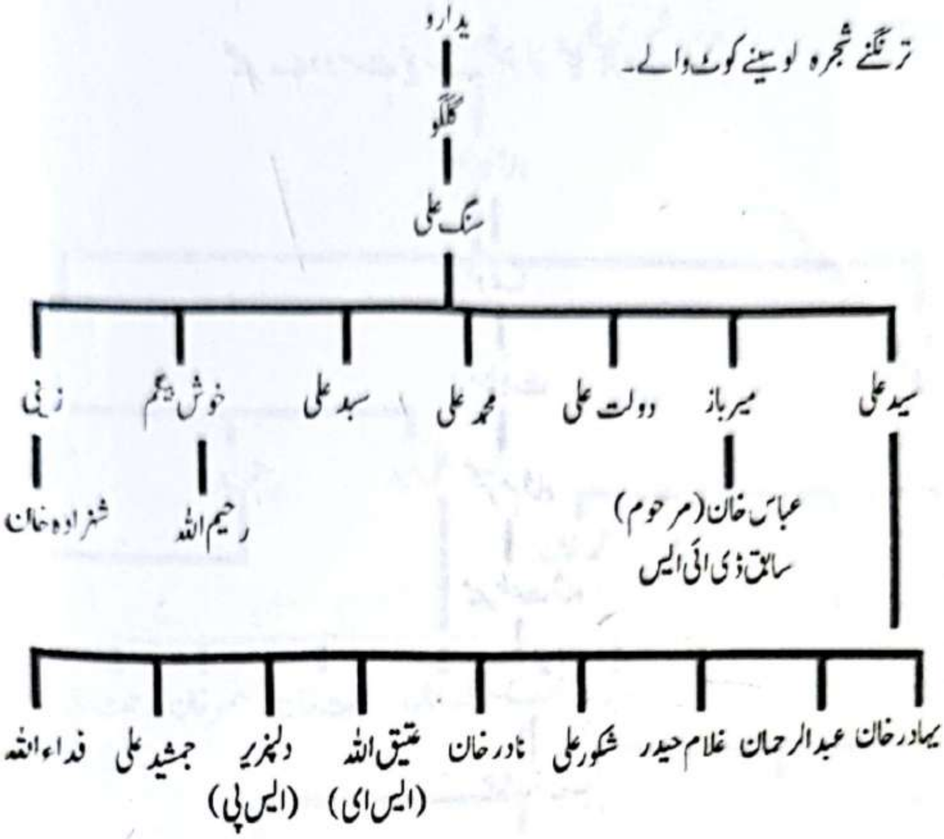
میرے دوست یوسف شہزاد کا شجرہ۔

زمرد شاہ
|
شونگ
|
مناجت
|
محترم شاہ
|
میر طنت شاہ
|
یوسف شہزاد
|
جہان زیب

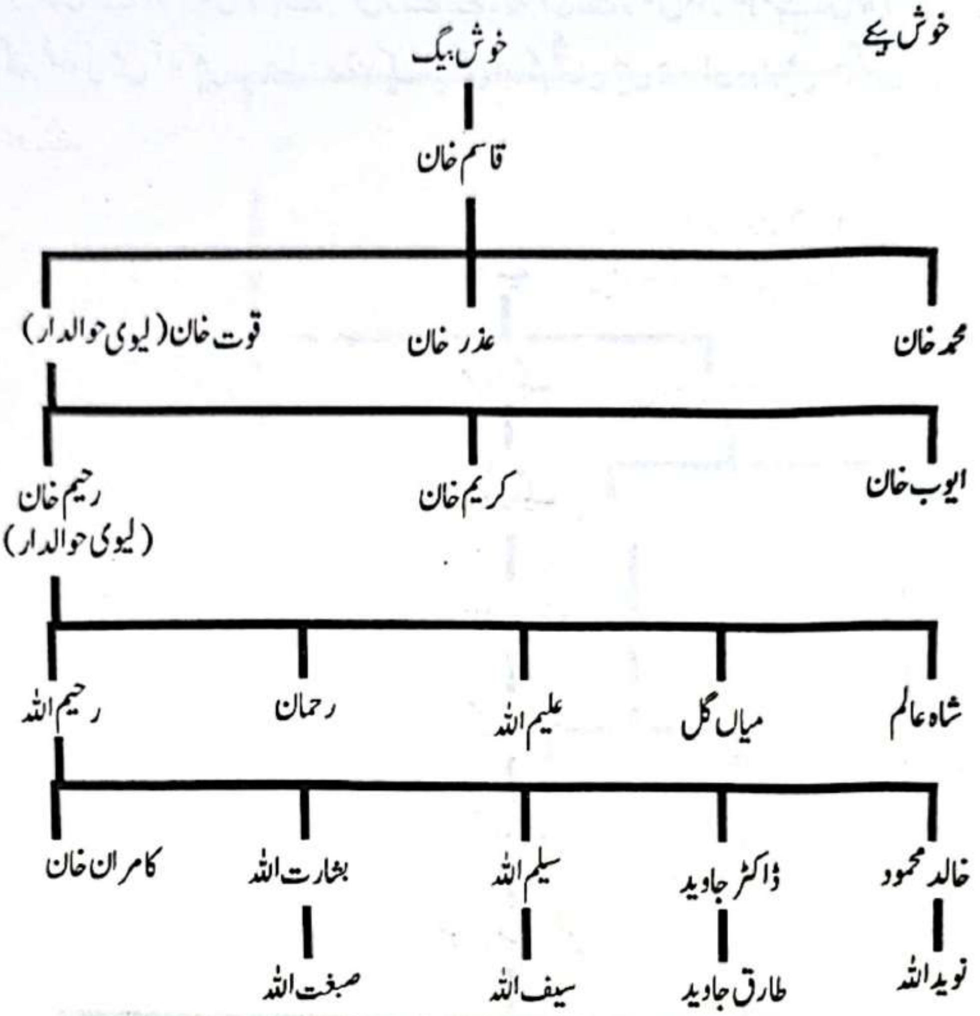
یوسف شہزاد صاحب چترال میں محکمہ اطلاعات کے انچارج ہیں۔

گوہر آباد کے شینوں کے ایک بڑے قبیلے کا شجرہ یہاں دیا جاتا ہے۔ یہ شجرہ مجھے میرے دوست رحیم اللہ خان سابق ڈپٹی کمشنر نے فراہم کیا ہے۔

ترنگفے شجرہ لو سینے کوٹ والے۔



میرے دوست رحیم اللہ سابق ڈپٹی کمشنر کا شجرہ :



گوہر آباد میں شنوں کے تین خاندان تھے۔ لوسین، ڈوبے اور جے سنگھے۔ جے سنگھے کو مختلف لڑائیوں کے نتیجے میں یہاں سے نکلنا پڑا۔ انہوں نے راستور کی طرف مراجعت کی لیکن وہاں جاکر یشکن گھرانوں میں رشتے ناتے کر کے یشکن آبادیوں میں ضم ہوئے فنہ استور کے امداد علی، محمد امین، نثار اور صوبیدار محمد علی وغیرہ جے سنگھے شین خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈوبے شنوں میں حاجی صمد خان کا خاندان شامل ہے۔

آپ کا شجرہ کچھ اس طرح ہے :



ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی نے غذر کے بوبیے خاندان کا ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ عرب سے ترکستان آئے اور قریش قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ چترال سے رئیس دور حکومت میں غذر آئے۔ یہ گلد غملوتی میں آباد ہیں۔ میرے نزدیک یہ بھی قدیم شین ہیں جو براستہ داریل و تانگیر یہاں وارد ہوئے۔

بوبیے

مرزا بیگ

پلچی بیگ

دوران شاہ

محبوب شاہ

محمود شاہ

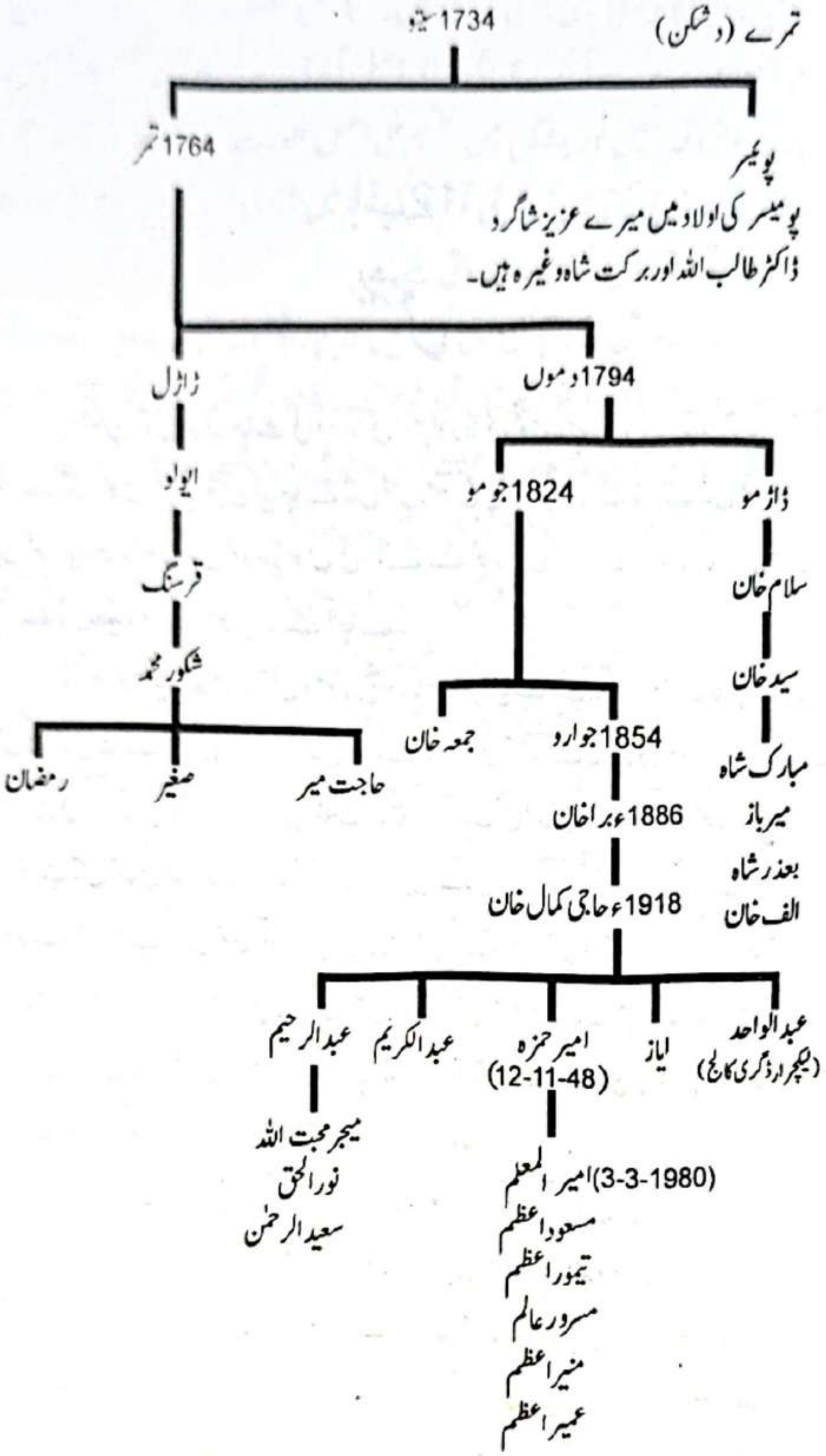
مولانا عبدالرحمٰن

حاجی عبدالحنان — عبدالرشید

جمال بیگم — خورشید بیگم

جمال بیگم میری سوتیلی ماں ہے اور خورشید بیگم میری بہن ہے میں نے والد کی وفات پر خورشید بیگم کی پرورش کی اور اس کی شادی خاندان میں خود ہی انجام دی۔

میرے عزیز شاگرد امیر حمزہ ایس پی کا شجرہ



اس خاندان میں لمبرداری برسوں سے چلتی رہی ہے۔

باب 12

یشکن

یشکن شمالی علاقہ جات کی دوسری اہم اور بڑی قوم ہے۔اس سے پیشتر کہ اس قوم کے بارے میں کوئی تجزیہ پیش کیا جائے میں اس موقع پر اس قوم کے بارے میں قدیم وجدید ماہرین عمرانیات، مورخین اور سیاحوں کی رائے سے قارئین کو شناسا کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان کے بارے میں ایک واضح تصویر سامنے آجائے۔

ڈاکٹر لٹز ایک عالم فاضل، مورخ اور ماہر عمرانیات تھے۔گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے ان کی نمایاں تعلیمی خدمات کا ہر کوئی معترف ہے۔وہ حکومت پنجاب کے مقررہ مشن کی تکمیل پر 1866ء میں گلگت آیا تاکہ یہاں کی لسانی اور عمرانی یو قلمانیوں کا جائزہ لے۔ گلگت میں لسانی جائزہ کے ساتھ ساتھ اس نے یہاں نسلیاتی گروہ بندیوں پر بھی توجہ کی۔ وہ کہتے ہیں جب شین حملہ آور اس علاقے میں آئے تو انہیں وسیع ارضیات پر قابض جس قوم کا سامنا ہوا وہ یشکن قوم تھی۔ آگے چل کر فاضل مصنف کہتے ہیں کہ یہ قوم شینوں اور مقامی اصل آبادی کے جنسی اختلاط کے نتیجہ میں وجود میں آئی۔ شین یشکن عورت سے بیاہ رچا سکتا ہے لیکن یشکن واپسی میں ایسی توقع نہیں رکھتا۔

فریڈرک ڈریو اپنی تحقیق کو بنیاد بناتے ہوئے یہاں قوموں کی درجہ بندی میں رانو کو پہلے نمبر پر پھر شین، یشکن، کرمین اور ڈوم کو رکھتے ہیں۔ وہ پھر ہندوستان میں موجود چار نسلی نظام کو شین، یشکن، کرمین اور ڈوم نظام کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دیگر قوموں کے مقابلے میں یشکن اس علاقے میں زیادہ تعداد میں ہیں گلگت اور استور میں یہ لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔وہ لٹز کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے کہ یشکن یہاں کی اصل آبادی اور شین کے جنسی اختلاط سے پیدا ہوئی ہے۔ان کے خیال میں ایسی بات کہ کمین کے بارے میں درست ہو تو لیکن یشکن کے بارے میں درست نہیں ہو سکتی۔وہ اس بات کے

لئے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شین اور یشکن کے جسمانی خدوخال ایک جیسے ہیں اور وہ دونوں ایک جیسا کام یعنی کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ فاضل مصنف کہتے ہیں کہ یہ یشکن اور شین تھے جنھوں نے باہر سے آ کر یہاں کی مقامی اصل آبادی سے ان کا قطن چھینا اور انھیں بے آسرا کیا۔ یہ سوال کہ شین اور یشکن میں تقسیم کی اصل صورت کیا رہی ہو گی بہت اہم اور دلچسپ سوال ہے۔ ڈریو کہتے ہیں کہ اونچی قوم کا نچلی قوم میں شادی کرنا خود اس قوم کو کم مصفا بنا دیتا ہے جبکہ نچلی قوم خود اس طرح مصفا رہتی ہے۔

بڈلف ہندوکش کے قبائل میں لکھتے ہیں کہ چار قوموں کی درجہ بندی میں یشکن دوسرے نمبر پر آنے والی اور اکثریت میں آباد قوم ہے۔ ہنزہ، نگر اور پونیال کی بیشتر آبادی اور یاسین کی تقریباً پوری آبادی علاوہ ازیں گلگت، سئی، داریل اور استور کی بڑی آبادی یشکنوں پر مشتمل ہے۔ ہنزہ اور نگر میں یہ خود کو یشکن نہیں بلکہ بورش کہتے ہیں یاسین میں ورشک اور بروشو کے نام سے معروف ہیں۔ ہنزہ میں مقامی طور پر بولی جانے والی زبان مشاسکی، نگر میں بروشکی اور یاسین میں ورشک کہلاتی ہے۔ نگر میں بولی جانے والی بروشکی کھجونہ کے نام سے مشہور ہے۔ وہ اسے تورانی الاصل قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہنزہ اور یاسین کے لوگوں کے خدوخال شفاف اور بالوں کا رنگ سرخی مائل ہوتا ہے۔ نگر کے بورش کچھ مختلف ہیں۔ وہ اکثر کوتاہ قد گھٹے ہوئے جسم، چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئیں اور چھدری داڑھیاں والے لوگ ہیں۔ ان کی سرشت غیر جنگجویانہ ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جب وہ سکردو کے مقپون حکمرانوں کے تابع فرمان تھے تو ان کے جسم میں تاتاری خون کی نرمی سرایت کر گئی ہے۔ اگر بورش اصلاً تورانی ہیں تو کسی زمانے میں ان میں آرین خون اس حد تک شامل ہو گیا کہ جس کی وجہ سے ان کی بنیادی خصوصیات جاتی رہی ہیں۔ شادی کی بندشوں کی وجہ سے یہ قوم زیادہ مصفا رہی ہے۔ وہ ڈاکٹر لٹز کے اس خیال کو قبول نہیں کرتے کہ یشکن، شین اور اصل مقامی آبادی کے اختلاط سے بنی ہے۔ وہ شین اور یشکنوں کے درمیان عداوتوں کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ عداوتیں صدیوں پر محیط رہی ہیں۔ وہ ہنزہ اور نگر کے لوگوں کو قذاق قوم قرار دیئے جانے کو بھی منصفانہ خیال نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ پونیال، یاسین اور گلگت کے بیشتر لوگ بھی ان کے بھائی بند ہیں۔ فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ نگر کے لوگ اپنی فطری بزدلی اور غیر مارشل ہونے کے لئے مشہور ہیں۔ ان میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ انھوں نے اپنے حریف ہنزہ والوں پر فتح پائی ہو۔

حاجی قدرت اللہ اپنے مقالہ بروشسکی ادب میں لکھتے ہیں کہ ہنزہ والوں کو یہ روایت عزیز ہے کہ ہنزہ کے قدیم باشندے سکندر اعظم کے ان تین سپاہیوں کی اولاد ہیں جن کو سکندر اعظم نے دریائے جیحوں کے علاقوں کی مہم کے دوران بیمار پڑ جانے کی وجہ سے یہاں چھوڑ دیا تھا۔ یوں شاہی خاندان کے افراد اپنی شکل و شباہت اور مزاج کے اعتبار سے یہاں کے عوام سے مختلف بھی ہیں۔ شاید یہ صحیح ہو کسی زمانے میں یہ لوگ ایران سے آ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ یہ بات وہ بار برا موزز کے حوالے سے کہتے ہیں۔

سید یحییٰ شاہ کہتے ہیں جن لوگوں نے زراعت کے پیشہ کے ساتھ گائے، بیل بھی پالنا شروع کیا تو پیشہ کے اعتبار سے انہیں یشکن اور جنہوں نے اپنا آبائی پیشہ گلہ بانی اختیار کیا وہ شین کہلائے۔ اس سے پہلے شین اور یشکن محض شین کے نام سے جانے جاتے تھے۔

ڈیور نیڈ دی میکنگ آف فرانٹیئر میں کہتے ہیں۔ کہ کن جوت یعنی ہنزہ میں ایک درد یشکن نسل کی قوم آباد ہے جس کی زبان بروشکی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شین اپنی لڑکیاں رونو کو، یشکن، شین کو بیاہ دیتے ہیں لیکن بالا نسل کی قومیں اپنی جائز اولاد اپنے سے کسی نچلے خاندان میں بیاہ نہیں دیتے۔ ان کا خیال ہے باہر سے یہاں آنے والے حملہ آوروں میں پہلے یشکن آئے اور پھر شین آئے۔ بڈلف یشکن کو یوچی قرار دیتے ہیں جنہوں نے 120ق م میں باختریہ کو فتح کر لیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ بورش پروشیا (پشاور) سے نکلا ہے۔ اور پشاور انڈو سیتھین حکمرانوں کا صدر مقام تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں یوچیوں نے گندھارا فتح کر کے اپنی حکومت قائم کی۔ اور اس قوم نے جل کوٹ سے نگر تک آریا قبائل کو مفتوح کر لیا ہو گا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں مارش قوم کی حیثیت سے شین سے یشکن اور یشکن سے رونو بہتر ہیں۔

پروفیسر دانی کہتے ہیں کہ اشوک اعظم کے وقت میں یہاں بدھ ازم پھیلا اور عام آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں شین حکمرانوں نے بدھ مت کی سرپرستی کی۔ شین قومیں درہ بروغل اور درکوت عبور کر کے یاسین آئے۔ یاسین کے پرانے قلعوں کے کھنڈرات (چومر کھنڈ اور پیر کھنڈ) سیتھین دور پر روشنی پڑتی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کے وسط ایشیا فتح کرنے کے بعد یہاں تاریخ نے ایک نیا رخ لیا۔ یاسین (چھاشی) کے نزدیک چینیوں نے تبتیوں کو شکست دیا تھا۔

جٹ مار اپنے بلور اینڈ دردستان کے مقالہ میں اس علاقے کے بارے میں کافی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی کی چٹانی تحریروں میں گلگت

کا نام ملتا ہے۔ 671ء اور 672ء کے قریب زمانہ میں گلگت میکر اسہا کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ چینی بدھ زائرین کی تحریرات اور ساطانی تاریخوں میں گلگت اور متصل علاقوں پر مشتمل علاقہ بلور کہلاتا تھا (چینی اس لفظ کو Po-lu لکھتے ہیں) اس علاقے کا صدر مقام بلور کلاں میں سکردو کی طرف کہیں تھا۔ بلور خورد میں ایک الگ زبان بولی جاتی تھی۔ ممکن ہے یہ ابتدائی بروشسکی ہی کی کوئی شکل ہو۔ تبتی حملہ آوروں نے آخر کار بور خورد فتح کر لیا۔ تبت میں بلور نام کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ وہ اس علاقے کو بروزہا کہا کرتے تھے۔ مگر شاید یہ اس علاقے کا پرانا نام ہو۔ وہ تبتی تاریخ سے اس مہم کا (747ء) صرف ایک فقرہ پیش کرتے ہیں۔ کاگ یل (Kog-yul) میں چینی برم پو (Brum-Po) ظاہر ہوئے۔ بروشا اور کاگ یل بھاگ گئے۔ وہ کاگ یل کو چترال قرار دیتے ہیں۔ جٹ مار کا کہنا ہے کہ اسلامی مصنفین نے پولیو Polu یا Pou-lu کو بور ترجمہ کیا۔ چینیوں نے بلور کے جنوب میں ایک اہم وادی تالی لو کا ذکر کیا ہے جس میں ماتریاکابت تھا۔ گنگھم اور سٹائن تالی لو کا داریل کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ گیارویں صدی عیسوی میں یہاں حالات بالکل بدل گئے۔ یہاں کے حکمران کشمیر کے حکمرانوں کے برابر آگئے تھے۔ وہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ خلیفہ ماموں کے حکم پر اس کے وزیر الفضل ابن صالح نے کچھ مہمات کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے پہلے واخان فتح کیا۔ اس طرح عرب واخان کے ذریعے بلور میں داخل ہو گئے۔ روسی عالمہ Abeva کا کہنا ہے کہ مسلمان قومیں بروغل کے راستے چترال میں داخل ہوئیں تاکہ تبتیوں کو یہاں سے نکال باہر کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں بلور صغیر تبت کے زیر نگین تھا۔ بلور میں جن بادشاہوں کے نام ملتے ہیں ان میں سری دیواشاہی سر یندار دیکر اماد تیایا ان کی رانی سامی دیوی کے نام شامل ہیں۔ جٹ مار یہ بھی کہتے ہیں کہ ختن اور بلور کے حکمرانوں کے درمیان کوئی نہ کوئی رشتہ داریاں قائم تھیں۔ ٹی اینگ چومی بلور صغیر کے بہت سے حکمرانوں کے نام دیئے گئے ہیں۔ مثلاً موکن ینگ Mo-kein Miong نن ہی (Nan-hin) مولائی۔ ہی (Molai-he) یا سوچی لی چک وغیرہ۔ چینیوں نے سوچی لی چک کے زمانہ میں یہاں مداخلت کی تھی اور اسے جنگ میں شکست دے کر قیدی بنا لیا تھا۔ تاہم بعد میں اسے معافی دی گئی۔ فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ 28-1026 اور 49-1028 کے دوران وارد قبائل کشمیر پر مسلسل حملے کرتے رہے ہیں۔ جٹ ماریشکن کے معنی قدیم آباد کار یا باشندہ قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جب تبتین حملہ آور اس علاقے میں آئے تو انہیں شینا بولنے والے کی بجائے بروشو قبائل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تبت کی

تاریخ میں یہ علاقے بروزا (Bru-za) کروزا (Cru-za)، کروسا (Cru-za) یا
(Bru-sal) کے نام سے پکارے جاتے رہے ہیں۔ جٹ مار ایک مشہور دانشور تھامس کا یہ
قول نقل کرتے ہیں کہ بروشو طبعی طور پر یورپین ہیں، منگول نہیں۔ تھامس یہ بھی کہتے ہیں
کہ جدید ہنزہ کے نسلی ڈھانچے میں ہون (Huns) یا ہپ تھےلائٹس (Hephathal-
ites) کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ جٹ مار پھر یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ شین اور یشکن
دونوں یورپین ہیں وہ کہتے ہیں کہ قراقرم کے درو، ہندوکش کے کافر، پامیر کے ایرانی اور
بروشکی بولنے والوں کا ایک ہی قسم کا کلچر ہے۔

روسی سکالر Abaeva نے اس علاقے کا نام بولرا (Bolora) استعمال کیا۔

وزیر حشمت اللہ تاریخ جموں میں لکھتے ہیں (میں پہلے ان کی تحریر کا حوالہ دے رہا ہوں) ملک دردستان کی آبادی زیادہ تر دو بڑے طائفوں شین اور یشکن میں تقسیم ہے۔ یہ آریائی نسل سے ہیں مگر شین یشکن کی وجہ تسمیہ تحقیق نہیں ہو سکی۔

ڈاکٹر ناموس گلگت اور شینا زبان کتاب میں لکھتے ہیں کہ یشکن ذات کی تعداد دردستان میں سب سے زیادہ ہے۔ جغرافیائی حالات، قدیم تاریخ، خدوخال اور موجودہ ذاتوں کے وطن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آریا قوم کے فاتح یعنی شین لوگ ولادت مسیح سے پندرہ اور دس صدی قبل وادی سندھ میں فاتح بن کر وارد ہوئے۔ انہوں نے جل کوت اور گور کے درمیان کا علاقہ فتح کرنے کے بعد اپنا وطن بنالیا۔ بعض گھرانے الگ اور پرانے قائم رہے وہ شین کہلائے۔ بعض شین لوگ آگے بڑھے۔ ملحقہ وادیوں میں جا کر انہوں نے ڈیرے جمائے۔ وہاں شادیاں کر لیں۔ مفتوحہ لوگوں نے شین فاتحین کی زبان اور اطوار اختیار کر لئے، یہ یشکن کہلائے۔ اسی لئے ہر وادی اور علاقے کے یشکن اپنے خدوخال اور رسوم میں دوسری وادی کے یشکن لوگوں سے ایک حد تک جداگانہ ہیں کیونکہ ان کا خون فاتحین سے زیادہ اصل اس مقامی وادی کی خاک کے ساتھ مربوط ہے۔ آریا نسل کے شین لوگوں کے گلگت میں وارد ہونے سے پہلے یہاں جو لوگ آباد تھے وہ خطۂ گلگت کے شمال کی طرف سے آئے تھے۔ نسل کے لحاظ سے وہ تورانی تھے۔ ہنزہ کے لوگوں کے خدوخال کا بغور ملاحظہ کرو تو صاف تورانی نظر آتے ہیں۔ چونکہ وہ ہن ہیں اس لئے ان کے وطن کا نام ہنزا ہو گیا ہے۔ شین اور اصل باشندوں کی شادیاں ہو گئیں۔ شین تعداد میں کم تھے مگر جہاں آریائی خون مقدار میں زیادہ ہے وہاں کے لوگوں کے چہرے مہرے آریائی بناوٹ کے قریب ہیں جہاں تورانی خون زیادہ ہے

وہاں چہروں سے نسل کے لحاظ سے تورانی ہونا نظر آتا ہے۔ تاتاری نسل کے لوگ بھی بعد میں ان وادیوں میں حملہ آور بن کر آئے اور انھوں نے یہاں پر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہ سب خون اب یشکن کہلاتا ہے۔ گلگت اور استور میں تو تقریباً آبادی یشکن لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان کا پیشہ زراعت ہے اور یہاں گلگت صوبے میں کام ہی کیا ہے۔ اسی طرح سے نگر، ہنزہ، اشکومن، یاسین، پونیال چترال میں بیشتر یشکن لوگ آباد ہیں۔ شین خال خال ہیں۔

کرنل شمبرگ اپنی کتاب آکس اور انڈس کے درمیان میں لکھتے ہیں کہ جس طرح درد اور دردستان کے الفاظ مبہم ہیں اسی طرح یشکن کی اصطلاح بھی گول مول ہی ہے۔ اس کے معنی کسان یا زمیندار کے علاوہ کچھ نہیں۔ اور یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو بے وقعت ہے اور خصوصیت سے اس لئے بھی بے کار ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک نسلی امتیاز بے معنی ہے۔ اس بنیاد پر کہ یشکن مقدار میں زیادہ ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں، یشکن قرار دیا جائے تو پھر نام نہاد بڑی نسلیں مثلاً شین اور رانوز کی اکثریت جو کھیتی باڑی کرتی ہیں انھیں کیا کہا جائے گا۔ پھر زراعت پیشگی کی بنیاد پر امتیاز بے معنی ہو جاتا ہے۔

سرجن میجر ایچ ڈبلیو بلیو (H.W. Bellew)

اپنی کتاب افغانستان کے قبائل میں لکھتے ہیں۔ شمال مشرق کی طرف بولر ہمارے نقشے میں ہے لیکن مقامی کتابوں میں اسے بلور (Balur) لکھا گیا ہے۔ یہ علاقہ شاید باختریہ میں شامل تھا اور یہ اضلاع چترال کا شکار، یاسین، گلگت اور سکردو پر مشتمل تھا۔ حقیقت میں ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ بلور باختریہ کا قدرتی طور پر بدلا ہوا لفظ ہے۔

میرے بھائی راز ول کوہستانی کہتے ہیں۔ یشکن لوگ مختلف مقامات پر مختلف ناموں سے یعنی بورش، ورشک وغیرہ سے پکارے جاتے ہیں یہ یشکن کے تحتانی قبیلوں کے نام ہیں۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ رونو اصل میں یشکن ہیں ان کا سماجی منصب ماں کے حوالے سے گشپور اور رونو کی اصطلاح سے واضح ہوتا ہے راجہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والی بیوی کے بیٹے گشپور اور غیر خاندانی بیوی کے بیٹے رونو کہلاتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انڈس کوہستان میں بہت ہی یشکن شاخیں پائی جاتی ہیں۔ یہ لوگ باقاعدہ طور پر شین جرگہ نظام میں جذب ہیں۔

محمد یوسف حسین آبادی لکھتے ہیں تقریباً 7% آبادی آریائی نسل کے چار درو قبائل شین یشکن کمین اور ڈوم کی ہے۔

بندوبست ثانی کے مہتمم ٹھاکر سنگھ لکھتے ہیں۔ معاشرتی طور پر یشکن کا دوسرا درجہ

ہے وہ محنت سے نہیں کتراتے اور بوجھ بھی اٹھاتے ہیں۔ یہ اپنے ہم سایوں پر کسی بڑائی کا دبدبہ نہیں جتاتے۔

یشکنوں کے بارے میں جتنے خیالات پیش کیے گئے ہیں اُن کی رنگارنگی آپ نے دیکھی اب ان خیالات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا اور معلوم کیا جائے گا کہ یشکن قوم کون ہے اور شمالی علاقہ جات کے تمدن کی تیاری میں اس کا کتنا حصہ ہے۔ یشکنوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔ کہ۔

1۔ یشکن کے معنی کسان یا زراعت کار کے ہیں۔
2۔ یشکن کے معنی قدیم آباد کار یا باشندہ کے ہیں۔
3۔ یشکن قوم مقامی اصل آبادی اور شینوں کے جنسی اختلاط سے پیدا ہوئی۔
4۔ یشکن شین کو اپنی لڑکیاں بیاہ دیتے ہیں لیکن واپسی میں ایسی توقع نہیں رکھتے۔
5۔ نسلی درجہ بندی میں ان کا مقام رونو اور شین کے بعد آتا ہے۔
6۔ یہ چار نسلی درجہ بندی نظام کے اجزا ہیں۔
7۔ یشکن اور شین یکے بعد دیگرے حملہ آور کی حیثیت سے اس علاقے میں آئے۔
8۔ یشکن ہنزا نگر، پونیال، یاسین، گلگت داریل استور میں اکثریت میں ہیں۔
9۔ یشکن ہنزہ نگر میں عموماً بورش کہلاتے ہیں۔
10۔ نگر کے بورش کوتاہ قد، گھٹے ہوئے جسم اور چھدری داڑھیاں رکھنے کے حوالے سے ہنزہ اور یاسین کے لوگوں سے کچھ مختلف ہیں۔
11۔ نگر کے یشکنوں کے جسم میں سکردو کے تاتاری خون کی نرمی سرایت کر چکی ہے۔
12۔ ہنزہ کے لوگ سکندر اعظم کے اُن تین سپاہیوں کی اولاد ہیں جو یہاں بیمار پڑ کر رہ گئے تھے۔
13۔ نگر کے لوگ غیر مارشل ہیں۔
14۔ شین سے یشکن اور یشکن سے رونو بہتر مارشل قوم ہے۔
15۔ پہلے ایک ہی قوم شین تھی جن لوگوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ یشکن ہو گئے اور جنھوں نے گلہ بانی کی وہ شین ہی رہے۔
16۔ کن جوت ہنزہ میں ایک دردیشکن قوم آباد ہے۔
17۔ یشکن یوچی قوم ہے۔

18- ہنزہ کے لوگ ہون ہیں۔

19- شین اور یشکن دونوں یورپین ہیں۔

20- شین اور یشکن دونوں آریائی قومیں ہیں۔

21- زراعت کار ہونے کی بنا پر اگر ایک قوم کو یشکن قرار دیا جائے۔ تو اکثریت رونو اور شین بھی کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ یہ القاب وجہ امتیاز کا باعث نہیں ہو سکتے۔

22- شین، یشکن کرمین ایک باپ کی اولاد ہیں۔

23- بروشال اصل میں برشل ہے۔

24- نگر کے خون میں تاتاری خون بھی شامل ہے۔

25- شین اور یشکن کی اصلیت کوئی بھی نہیں جانتا۔ دونوں اسی زمین کے باسی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ شین کے معنی برف کی طرح سفید کے ہیں اس کے معنی قدیم لوگ کے بھی ہیں۔ جبکہ یشکن کے معنی فاتح اور شین کے معنی مفتوح کے ہیں۔

26- بعض یشکن کو آرین الاصل کہتے ہیں۔

27- یہ کہ نگر کے آباد کار گور سے آئے گور بروشسکی بولنے والوں کا اصلی گھر تھا۔

28- بولر باختریہ (بخزیہ) کا بگڑا ہوا لفظ ہے۔

29- رونو اصل میں یشکن ہیں۔

30- یشکن کوشان کی ایک شاخ ہے اور اسی کوشان نسل سے کنشک بھی تھا۔

31- یشکن محنت سے نہیں کتراتے اور یہ اپنے ہم سایوں پر کسی بڑائی کا اظہار بھی نہیں کرتے۔

32- رازول کوہستانی شین یشکن اور کمین ناموں کے تناسب اور قافیہ کی بنیاد پر ان تینوں قوموں کے ہم نسب ہونے کے امکانات کے متعلق دعوت فکر دیتے ہیں۔

یشکن لفظ کے معانی ہیں کسان، زراعت کار، قدیم آباد کار یا قدیم باشندہ یا فاتح کے بتایا گیا ہے۔ لفظ یشکن دو الفاظ سے مرکب ہے یعنی لیش اور کن، کن اصل میں لاحقہ ہے جس کے معنی والا کے ہیں۔ اگر لفظ جوڑ کر معنی لیے جائیں تو اس کے معنی لیش والا کے ہونگے۔ شینا میں کن والا کے لئے مستعمل ہوتا رہا ہے۔ دادی کن کے معنی دادی والد یا دادی کی طرف منسوب یا دادی کی طرف کے رشتہ دار پھاپھی کن پھوپھی کی طرف منسوب۔ پشی کن شینا میں پشی کے معنی پیش گو کے ہیں۔ اس طرح لفظ پشی کن کے معنی پیش بینی اور

کا بن کے ہوئے اس طرح شینا میں ایک لفظ جار ہے اس کے معنی عاشق یا کسی عورت کا ... سے ناجائز تعلق ہو وہ مرد بھی جار کہلاتا ہے جبکہ یہی لفظ ہندی میں بھی ان ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں یہ اسم مشترک ہے مرد اور عورت دونوں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جار سے بجری بنا اور یوں بجری کن کی ترکیب سامنے آئی جس کے معنی عاشق سے منسوب مرد یا عورت اسی ترکیب میں اور کن لاحقہ کے ساتھ اور الفاظ بنے ہیں یشکن کا لفظ ایک قدیم لفظ ہے میرے خیال میں یہ لفظ نویں یا دسویں صدی عیسوی کے دور میں وجود میں آیا ورنہ اس سے پہلے اس قوم کو کچھ اور کہا جاتا تھا اور یہ لفظ اُن مقامات میں بولا جانے لگا۔ جہاں شین تھے جہاں شین نہیں تھے۔ مثلاً ہنزہ، نگر، یاسین وغیرہ میں اس قوم کو بُرش بروشو، ورشک کہا جاتا تھا۔

اور یہ قوم بھی اپنے آپ کو بُرش ہی کہتی تھی۔ کوہستان، چلاس، استور، گلگت، داریل و تانگیر میں یہ قوم محض یشکن کے نام سے معروف ہوئی۔ لیش لفظ اصل میں ایش تھا جس کے معنی بروشکی میں آسمان یا اوپر یا اونچائی کے تھے۔ ایش یا عیش عیش کن یا پھر مسلسل التماس نے لیش کن بنا۔ مرکب لفظ کے معنی ہوئے۔

آسمان والا، اوپر والا، پہاڑوں کی بلندی پر رہنے والا وغیرہ چونکہ اس قوم کے لوگ شمال اور مغربی پہاڑی سلسلوں میں آباد تھے۔ اس لیے انہیں یشکن کہا گیا۔

اس قوم کا یشکن کے علاوہ اور کئی نام سامنے آئے ہیں۔ مثلاً بروشو، بُرش، بورش، ورشک اور ان کے وطن کا نام بولرا، بولر، بروزا، بروشا کروزا (Cru-za)، گروسا (Gru-sa)، بروسال وغیرہ۔ جب اس وطن میں شین نہیں آئے تھے چین اور تبت میں اس وطن کے لیے اپنے اپنے نام تھے۔ مثلاً چین میں اس وطن کا نام پولیو (Pou-lu) تھا۔ جبکہ تبت میں اُس کا نام بروزا، بروسال، کروزا، گروسا وغیرہ تھے۔ اور ان ہی دو ممالک کے ساتھ اس علاقے کے قریبی رابطے تھے۔ کیونکہ شمال مغرب یا جنوب مشرق کی طرف یہاں سے گزرگاہیں جاتی تھیں۔ چین اور تبت اپنی مقبوضات اور سرحدات کی حفاظت کے لئے ان گزرگاہوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس علاقے پر اُن کا اثر نفوذ قائم ہو۔ اسلام کی آمد کے ساتھ عربوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پورا ایران فتح ہوا 644ء میں یزدگرد بھاگ کر خاقان چین کے پاس پہنچا۔ اسی وقت چین کو احساس ہو گیا تھا کہ اب سیاسی افق پر تبدیلیاں آنے والی ہیں پھر حضرت عثمانؓ کے

زمانے میں غزنی اور کابل بھی عربوں کے قبضے میں آئے۔ حضرت امیر معاویہ کے دور میں (661ء تا 680ء) بخارا سمرقند فتح ہوئے ولید بن عبدالملک کے زمانے (705ء تا 715ء) میں قتیبہ بن مسلم نائب اور بھائی صالح نے کاشان، فرغانہ، بخارا، خجستان وغیرہ فتح کیے۔ معرکہ سمرقند میں خاقان چین کا بیٹا ایک بڑی فوج لے کر سغدیوں کی مدد کو آیا تھا۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے قتیبہ نے کاشغر فتح کر کے چین کی سرحد پر اسلامی جھنڈے گاڑ دیئے۔ ہشام بن عبدالملک (724ء تا 743ء) کے زمانے میں خاقان چین کے ساتھ سمرقند بخارا، اور سغد کے محاذوں پر بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ خراسان کے حاکم اشرش بن عبداللہ کے زیر کمان عرب فوجیں ہر محاذ پر سرخ رُو ہوئیں۔

ابو العباس سفاح کے دور (749ء تا 754ء) میں خالد بن ابراہیم اور صالح بن زیاد نے ختن، فرغانہ اور کش کے علاقے فتح کیے۔

تالاس (کرغزیہ) کے مقام پر صالح بن زیاد نے چینی جرنیل کاؤ سین چی کو شکست دی۔ مامون الرشید کے زمانے میں (813ء تا 833) تبت کے کئی سرداروں نے مسلمان ہو کر اطاعت قبول کی۔

ظاہر ہے 640ء تا 883ء کے دوران تبت اور چین پر مسلمان غلبہ پا رہے تھے۔ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ عرب تبت یا چین کے ساتھ ہمارے کسی علاقے میں لڑے ہوں یا عرب ہمارے علاقے میں داخل ہوئے ہونگے۔ کیونکہ ہماری تنگ وادیاں بڑی جنگوں کے لئے کبھی موزوں نہیں رہیں۔ بہر حال چینیوں نے اس علاقے کو پولیو کہا اور تبت والوں نے بروزا یا بروسال نام دیئے۔ چینیوں نے بروزا یا بروسال نہیں کہا۔ اور تبت والوں نے پولیو نہیں کہا۔ یہ ان کے اپنے اپنے نام تھے لیکن یہ نام ہمارے علاقے میں بھی آئے۔ پولیو پلور، بلیر ربولر ہوا اور اس زمانے کے مسلمان مصنفین نے اسے بلور بنادیا۔ بلور ایک مکمل ریاست تھی جس کا مرکز بلتستان یعنی بلور کلاں میں قائم تھا۔ بلور صغیر گلگت کے مترادف تھا۔ بلور صغیر و کبیر بننے سے پہلے یہ علاقہ تبتیوں کے بقول بروزا بروشا یا بروسال تھا اور پھر ہمارے یہ علاقے بروشو، بروشال ہو گئے کیونکہ ہماری زبان بروشکی اور شینا میں "ش" کا استعمال سہولت سے ہوتا ہے۔ چونکہ یہ نام خواہ پولیو ہو یا بروزا ہو یا بروسال چینی اور تبتی نام تھے۔ اس لئے ان کے معنی اخذ نہیں کیے جا سکے۔ چینیوں نے نہ صرف گلگت اور بلتستان کا نام رکھا بلکہ ان کی ڈکشنری میں ہمارے داریل کے لئے تالی لو، بدخشان کے لئے پا۔ تو چھان (Pa-to-chan) واخان

کے لئے ہومی (Hu-me) طخرستان کے لئے یوہولو (T-u-ho-lo) کشمیر کے لئے کی پن اس طرح تقریباً بہت سے نام ملتے ہیں۔ لہذا ہمارے علاقے کا نام پولیو چینی ڈکشنری کا نام تھا جس کے معنی قدیم چینی ہی بتا سکتے ہیں۔ بلتستان کے لوگ پولیو سے پلوئے اور علاقہ بے ہال جو آج بھی گلگت والے کہتے ہیں۔

میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں دردستان کوئی سیاسی وحدت نہ تھی اور اس نام کا کوئی پولیٹکل علاقہ ہمارے ہاں موجود نہ تھا۔ دردیسا کی اکائی تھی جو وادی کشن گنگا کے علاقوں پر مشتمل تھی۔ جہاں تک بروشال یا بلور کا تعلق ہے ان ناموں سے دو سیاسی وحدتیں یکے بعد دیگرے وجود میں آئیں۔ پہلے بروشال بروشو کا وطن تھا۔ یہ ایک منظم مملکت تھی۔ اس مملکت کا تبت اور چین کے ساتھ سیاسی مراسم تھے۔ بعد میں ایک ایسا دور آیا جب یہاں بروشال کی حکومت ٹوٹ گئی اور یہ علاقہ بلور کلاں کا ایک مقبوضہ علاقہ بنا اور پھر یہ بلور صغیر کے نام سے اور پھر جب یہ سلسلہ بھی ٹوٹا تو یہ محض بلور کے نام سے معروف ہوا۔ ظاہر ہے بروشال، بلور صغیر اور بلور کی سیاسی وحدتوں پر بروشو قوم حکمران تھی۔ میں شینوں کے باب میں لکھ چکا ہوں کہ اس وطن پر شینوں اور یشکنوں نے ایک لمبے عرصے تک حکمرانی کی ہے۔ پہلے بروشو یا یشکن حکمران تھے اور پھر شینوں کی باری آئی اور اس وطن پر بڑے طمطراق کی حکومتیں ظہور میں آئیں۔ میں نے مختلف تحقیقی نکات پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ گلگت کے تراخانی راجوں کی حکمرانی 642ء سے 1400ء تک کبھی نہیں رہی۔ اس دوران حکمرانوں کے جو نام ملے وہ غیر تراخانی حکمرانوں کے نام تھے اور جو واقعات تاریخ گلگت میں بیان ہوئے ہیں وہ تبتی، چینی اور کشمیر کی تاریخوں سے کسی طرح مطابقت نہیں رکھتے۔ اس دور میں جو سفر نامے لکھے گئے جو تواریخ مرتب ہوئیں، جو زمینی آثار ملے اور جن جغرافیائی حد بندیوں کا ذکر ہوا اور جو موازناتی تاریخی واقعات ملے ان میں 643ء تا 1400ء کے دوران کی تراخانی تعلق کا کوئی اتا پتہ نہیں چلتا۔ میں نے یشکنوں، شینوں اور تراخانی حکومتوں کے جو ادوار مقرر کئے ہیں وہ کافی تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ اور ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ میں یہاں یشکیوں کے دور حکمران کا پھر سے ذکر کروں گا۔ یہ دور 100ق م سے شروع ہو کر 1000ء پر محیط ہے۔ اس دور میں یشکنوں نے ان علاقوں یعنی ہنزہ، اشکومن، پونیال، گلگت میں اپنی چھوٹی چھوٹی حکمرانیاں قائم کیں اور پھر ایک دو صدی کے بعد یہاں ایک مرکزی حکومت کی شکل سامنے آئی اور اب یہ حکومت بروزا، بروسال، گروسا، کروسا، بروشا کہلا رہی تھی۔ یہ بروشو کی

حکومت تھی اور اس کے تعلقات تبت اور چین کے ساتھ تھے۔ اس زمانے میں یشکن کی اصطلاح کہیں نظر نہیں آتی۔ پھر چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے دوران بروشال کی حکومت ٹوٹ گئی اور یہ علاقہ بلتستان کے زیر اثر آیا اور بلور صغیر اور بلور کلاں کی اصطلاحات بنیں۔ بلور کی یہ حکمرانی چترال تک تھی۔ چترال کے شمال مشرقی ہمسائے اسے بھی بلور سے موسوم کرتے تھے۔ اس دوران داردوں (شینوں) کی حکومت چلاس گریز، وادی کشن گنگا وغیرہ علاقوں پر تھی۔ اس وقت شینوں کی توجہ کشمیر، سوات، کوہستان پر مرکوز تھی۔ شمال کی طرف شین ابھی نہیں آئے تھے۔ داردوں اور بھوٹاز کے بارے میں راج ترنگی میں جو کچھ ملتا ہے وہ وادی کشن گنگا کی طرف قائم درددیسا کے متعلق تھا۔ البیرونی کا 1031ء میں یہ کہنا کہ کشمیر کا پچھم چند بادشاہوں کا ہے جن میں سب سے زیادہ وہ قریب بلور شاہ ہے اس کے بعد بدخشان کی سرحد تک شکناں شاہ اور وخان شاہ ہیں۔ اگر اس بیان کو پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کشمیر کے شمال مغرب میں بلور کا حکمران بلور شاہ تھا۔ بلور کی حکومت چونکہ چترال تک تھی اور پھر شمال میں واخان اور بدخشان ہی تھے اس لئے البیرونی کا یہ بیان بلور (گلگت) کے علاوہ کسی اور علاقے کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ آگے چل کر وہ ایک اور حکمران بوٹھ شاہ کا بھی ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے شہر گلگت، اسورہ اور شلتاس ہیں۔ اس سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ البیرونی کو قیام کشمیر کے دوران کشمیر کے شمالی قریبی ہمسایوں کے بارے میں کچھ کچھ صحیح معلومات حاصل ہوگئیں تھیں۔ شلتاس (چلاس) میں بوٹھ حکمران تھے اور اس لئے حکمران کا نام بوٹھ شاہ قرار دیا گیا اور چونکہ گلگت بلور کے نام سے معروف تھا اس لئے اس کے حکمران کو بلور شاہ کہا گیا۔ حدود العالم کے مسلمان جغرافیہ دان جس کا نام معلوم نہیں ہوا وہ 982ء و983ء کے قریب زمانہ میں بلور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بلور ایک وسیع علاقے ہے۔ اس کا حکمران بلورین شاہ جو اپنے آپ کو سورج کا لڑکا قرار دیتا ہے۔ البیرونی اور اس مسلمان جغرافیہ دان کے بیانات بلور (گلگت) کے بارے میں ایک جیسے ہیں۔

مسلمان جغرافیہ دان علاقہ کا نام بلور اور حکمران کا نام بلورین شاہ جبکہ البیرونی علاقہ کا نام بلور اور حکمران کا نام بلور شاہ بتاتے ہیں۔ یہی بلور علاقہ یشکنوں کا تھا اور ابھی یہاں شین نہیں پہنچے تھے۔ میں یہاں ہندوستان کے راجپوتوں کا ذکر کروں گا جو اپنے نسلی تعلق کو راما دیوتا تک لے جاتے ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو سورج کی اولاد کہتے ہیں۔ بلور کا حکمران بھی اپنے آپ کو سورج کا بیٹا قرار دیتا ہے۔ ان تمام نظریات سے کچھ نتائج سامنے آتے ہیں۔

راجپوتوں کے آغاز کے بارے میں یورپین مورخین کا خیال ہے کہ کئی راجپوت خاندان ہون، گوجر، شک وغیرہ بیرونی حملہ آور قوموں کی اولاد ہیں۔ ان حملہ آوروں میں جو اونچی ذات کے تھے وہ راجپوت بن گئے اور ادنیٰ درجہ والے گوجر، آہیر اور جاٹ کہلانے لگے۔ بہر حال راجپوتوں اور بروشوں کا سورج کی اولاد ہونے کا نظریہ ان کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے۔ تاریخ ہند از ابو امام میں لکھا ہے کہ راجپوتوں کی نسل کے متعلق یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ لیکن سمجھا جاتا ہے کہ راجپوتوں کے مختلف قبیلے ان بہت سے غیر ملکی قبیلوں سے پیدا ہوئے جو ہنوں کے جلو میں آئے تھے۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ ساتویں صدی میں یکایک راجپوت تاریخی منظر پر آگئے اس حوالے سے جو قوم ہمارے سامنے آتی ہے وہ ہون قوم ہے جو بروشوں اور راجپوتوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتی ہے۔

شمالی میدان اعظم کے مشرقی حصے کو تاتار اعظم کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک قوم جو ہی انگ نو کہلاتی تھی 210ق م کے قریب اپنے ایک سردار دیومان کے جھنڈے تلے طاقت پکڑ رہی تھی اور آہستہ آہستہ اس کا حلقہ چاروں طرف بڑھ رہا تھا۔ اس قوم نے یوچیوں (نفتالیوں) کو ملک حظا سے فرار ہونے پر مجبور کیا۔ دیومان کا لڑکا بغدور اپنے باپ سے بھی زیادہ خونخوار تھا۔ وہ اپنے باپ کو قتل کر کے خود بادشاہ بن بیٹھا اور آسمان کا بیٹا شہنشاہ کے لقب سے ملقب ہوا۔ اس نے بچے کچھے یوچیوں کا صفایا کیا اور انہیں اپنے تابع بنایا۔

آسمان کا بیٹا ہونے کا خیال اس قوم میں سرایت کر چکا تھا۔ یہ ایک بڑی ظالم اور سخت جان قوم تھی۔ ہیرلڈلیم تاتاریوں کی یلغار میں جسے عزیز احمد نے اردو میں ترجمہ کیا ہے امیسی مارسی پس کے حوالے سے ہون کردار کا ذکر کرتے ہیں۔ دو پیروں والے جانور، چھوٹے چھوٹے، بے ریش اپنے گھوڑوں سے بندھے ہوئے اور انہیں سے اپنا کل وشرب حاصل کرنے والے۔ سوتے بھی ہیں تو گھوڑوں کے بالوں پر سر رکھے رکھے۔ نہ کھیتی باڑی کرتے ہیں نہ ہل جوتتے ہیں۔ مکانوں میں نہیں رہتے۔ ان کی زندگی مسلسل آوارہ گردی ہے۔ جب پیدل کھڑے ہوتے ہیں تو پستہ قد معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب گھوڑوں پر سوار ہتے ہیں تو بڑے عظیم الشان نظر آتے ہیں۔ ان ہونوں نے چینیوں کو بڑا ستایا۔ چینیوں نے شمال کی طرف سے ان حملوں کو روکنے کے لئے دیوار عظیم بنائی جن کے باعث شمالی حملہ آوروں کا رخ مغرب کی طرف ہو گیا۔ یہی ہی انگ نو کی ٹکریاں تھیں جو مسگر کے راستے ہمارے علاقے میں آئیں۔ اس قوم کے کچھ حصے ہنزہ کی طرف آباد ہوئے اور چونکہ چینی ان کو ہی انگ نو کہتے تھے اس لئے

ان کا چینیوں کے قریب ان کا مسکن ہی انگ نو کہلایا۔ یہ لفظ ہی انگ نو یا ہو ینگ نو ہی ان نو، ہنی نو اور پھر مسلسل استعمال سے ہنزہ بنا۔ اس وطن میں ان کے طاقتور جتھے آتے تھے۔ انہوں نے یہاں ایک مرکزی حکومت قائم کی اس حکومت کے تعلقات چین اور تبت سے تھے۔ تبتیوں نے اس قوم کو بروزا، بروشا، بروسال کہا اور یہ بروشو کہلانے لگے اور وطن بروشال بنا۔ جیسے آگے ذکر کیا گیا ہے یہ علاقے پھر بولیو، پلور، بولر سے گزر کر بلور کہلانے لگے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یشکن ہون (مغل) قوم تھی اور یہ وسط ایشیا کی ایک طاقتور قوم تھی۔ تاتار اعظم ملک خطا (جنوبی مانچوریا و منگولیا) ان کا وطن تھا۔ انہوں نے یوچیوں اور ستھئین کی باقیات کو ملک سے نکال باہر کر دیا تھا۔ اس قوم نے پانچویں صدی کے نصف میں ہندوستان پر حملہ کیا لیکن گپت خاندان کے راجہ سکندر گپت کے ہاتھوں انہیں شکست ملی لیکن انہوں نے اپنے حملے جاری رکھے۔ یہاں تک کہ ان کے جرنیل تورمان نے آخر کار گپت خاندان کو شکست دے کر پنجاب، راجپوتانہ سندھ اور مالوہ پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان میں ہونوں کی حکومت قائم کی۔ ان کے بعد ان کا لڑکا مہر گل بادشاہ بنا۔ اس نے سیالکوٹ کو اپنا صدر مقام بنایا۔ یہ بڑا ظالم حکمران تھا اس لئے اس کے خلاف ایک عوامی بغاوت ہوئی مالوہ اور مگدھ کے بادشاہوں نے مل کر 528ء میں اسے ملتان کے نزدیک شکست فاش دی۔ ہندوستان میں 452ء تا 528ء تقریباً 72 سال تک ہونوں کی حکومت رہی۔ ملتان کی جنگ میں شکست کھا کر مہر گل کشمیر بھاگا جہاں بادشاہ کو قتل کر کے تخت کشمیر پر متمکن ہوا اور آخر 540ء میں کشمیر ہی میں فوت ہوا۔

یشکنوں کے بارے میں ان نظریات سے کہ یہ یوچی ہیں یہ آرین ہیں، یا یہ سکندر اعظم کے تین بیمار سپاہیوں کی اولاد ہیں۔ یہ شیوں اور مقامی آبادی کے نسلی اختلاط کے نتیجے میں پیدا ہوئی یا شین، یشکن اور کمین ایک باپ کی اولاد ہیں یا پیشہ کے اعتبار سے جنہوں نے کھیتی باڑی کی وہ یشکن ہوئے اور جنہوں نے گلہ بانی کی وہ شین ہوئے یا بروشو یورپین ہیں وغیرہ سے اتفاق نہیں کرتا۔ یشکنوں کے بارے میں ایک عام نظریہ یہ رہا ہے کہ یہ یوچی ہیں اور لفظ یوچی بگڑ کر یشکن بنا۔ میرے خیال میں جن لوگوں نے یشکنوں کو یوچی قرار دیا انہیں خود یوچیوں کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ اصل میں کیا ہیں۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ یوچی آرین الاصل قوم ہے تو پھر وہ یشکنوں کو یوچی نہ کہتے کیونکہ ایسی صورت میں شین اور یشکن آرین ہوتے اور پھر ان دونوں کے خدوخال میں اس حوالے سے جو فرق نکالا گیا وہ درست نہ ہوتا۔

اکثر ماہرین عمرانیات، مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ یوچی آرین الاصل قوم تھی، مثلاً ہیرلڈ لیم جو منگول تاتاری، مغل، مغول آریا اقوام وغیرہ پر ماہرانہ نظر رکھتے ہیں۔ وہ یوچیوں کو آریوں کے صف میں باندھتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب تاتاریوں کی یلغار میں آریا عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔ "ایک قوم ایسی تھی جو فضائے دشت سے نکل کے اس دور میں مشرق اور نکلتے ہوئے سورج کی سمت پھیلنے لگی یہ لوگ دراز قد تھے۔ ان کی آنکھیں نیلی یا بھوری تھیں اور ان کے بال سرخی مائل تھے۔ ان کے سر لمبوترے تھے۔ انہیں زمین میں کاشت کرنا آتا تھا۔ اور لڑائی میں یہ لمبی سیدھی سی تلواریں استعمال کرتے تھے۔ نسلاً یہ تھین قوم کے رشتہ دار تھے۔ ان کی ایک شاخ گوبی تک پہنچی اور چینیوں نے ان کا نام یوے چی رکھا۔ یہ آریائی ایرانی تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا تھین جو آریا تھے ان سے بچھڑ کر ان کی ایک شاخ گوبی (شمالی چین) پہنچی۔ چینیوں نے اس کا نام یوے چی رکھا، یوچی اُن کی ایک شاخ تھی اور یہ دونوں نسلاً آرین الاصل تھے۔ تاریخ ہند مرتبہ درسی ادارہ میں لکھا ہے۔ کوئی دو ہزار برس ہوئے کہ مغربی چین میں یو۔چی (Yehu-chi) نام کی ایک خانہ بدوش اور جنگ جو قوم آباد تھی۔ دوسری صدی قبل مسیح میں اس قوم کو چینیوں نے اپنے ملک سے نکال دیا اور یہ لوگ باختریہ اور کابل کی راہ ہندوستان کو چلے آئے معلوم ہوا یہ وہی یوچی ہیں جو چین کے مغرب میں گوبی کے ساتھ ساتھ آباد ہو گئے تھے۔ ان کا اصل وطن دشت روش تھا جہاں ان کے بھائی بند تھین بھی رہا کرتے تھے۔ اور کسی انقلاب کے تحت تھین کا ایک جتھا چین کے شمال مغرب کی طرف جا کر رہنے لگا تھا جسے چینیوں نے یوچی کا نام دیا۔ چونکہ یہ چین کے متصل علاقوں میں رہتے تھے۔ بعض کو اس حوالے سے مغالطہ ہوا کہ یہ کوئی چینی الاصل قوم تھی۔ مثلاً مولانا غلام رسول مہر جو ایک نامور مورخ تھا۔ وہ تاتاریوں کی یلغار اور ترجمہ از عزیز احمد کا دیباچہ لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔ " یہی گہوارہ تھا جہاں ابلنے والے انسانی چشمے کے بعض گروہوں کو اہل کتاب اور مسلمانوں کے مذہبی اسفار میں یاجوج ماجوج کہا گیا چینیوں کا ایک قبیلہ یواچی تھا۔ اس نام نے مختلف، تلفظ کے اختلاف سے گزر کر عبرانی میں یاجوج کی شکل اختیار کی۔ اسی طرح منگول کی اصل موگ تھی یونانی زبان میں یہ تلفظ میک اور میگاگ ہو گیا اور جب اس نے عبرانی لباس پہنا تو ماجوج بن گیا۔" اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ مولانا صاحب یوچی کو ایک چینی الاصل قوم قرار دیتے ہیں اور انہیں یاجوج بھی بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ چینیوں نے دیوار عظیم شمالی حملہ آور اقوام جن میں یوچ، تھین اور دیگر منگول قبیلے شامل تھے سے بچنے کے لئے بنائی تھی۔ اگر

ان کے بیان کو تسلیم کیا جائے کہ یوچی چینی الاصل قوم تھی تو پھر اپنے لوگوں کے خلاف دیوار عظیم کیسے بنائی گئی۔ جہاں تک یاجوج ماجوج کا تعلق ہے ہیر لڈلیم لکھتے ہیں کہ۔ " اٹیلا کے بعد کی صدیوں میں طرح طرح کی افواہیں جنوبی دنیا میں پہنچ رہی تھیں جو اس زمانے میں زمانہ جاہلیت کی تاریکیوں سے نکل کر عیسائی مذہب اختیار کر رہا تھا۔ افواہیں تھیں کہ نامعلوم مشرق کے یہ حملہ آور دجال کی امت تھے۔ ان کے بعد قیامت آنے والی تھی۔ عرصہ سے یہ اس دیوار کے پیچھے قید تھے جو یاجوج کے لئے بنائی گئی تھی۔ اب وہ دیوار توڑ کر نکل رہے تھے۔" یہاں یاجوج ماجوج مشرق کی طرف سے آنے والی تمام حملہ آور قومیں تھیں۔ تاریخ اقوام عالم میں مرتضٰی احمد خان لکھتے ہیں۔ "سھتوں اور شمال میدان اعظم کی دوسری وحشی قوموں کو اسرائیلیوں کی مذہبی کتاب بائبل میں یسعیانبی نے یاجوج ماجوج اور ال اور ٹوبالسک کی قوموں کے نام سے موسوم کیا ہے۔" پھر اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ لکھا گیا ہے "خسرو اعظم کا ذکر بائبل کے عہد نامہ عتیق میں مرقوم ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن میں اسی بادشاہ کو ذوالقرنین ظاہر کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ اس نے اپنے ملک کو یاجوج ماجوج (سھتوں اور پارتھیوں) کے حملوں سے بچانے کے لئے پہاڑوں کے (کوہستان قاف) ایک درے میں لوہے اور تانبے کی دیوار بنائی جس کے باعث اس کی مملکت کے شمالی اقطاع ان وحشی قبائل کے حملوں سے محفوظ ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چینیوں نے اپنے ملک کو شمالی حملہ آوروں سے بچانے کے لئے جو دیوار عظیم بنائی یہ بھی یاجوج ماجوج سے بچنے کے لئے تھی۔ خسرو اعظم نے جو دیوار کوہ قاف میں بنائی وہ بھی (سھتین پارتھی) یاجوج ماجوج سے بچنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ یہاں یوچی شامل نہیں جبکہ سھتین پارتھی قومیں شامل ہیں جو آرین الاصل تھیں۔ بہر حال مولانا غلام رسول مہر کا یوچیوں کے بارے میں نظریہ کسی بنیاد پر قائم نظر نہیں آتا۔

یوچیوں کے بارے میں ہیرلڈلیم نے جو خیالات پیش کئے ہیں ان سے ملتے جلتے خیالات مرتضٰی احمد خان کے ہیں وہ اپنی کتاب اقوام عالم میں لکھتے ہیں۔ " 210ق م کے قریب تاتار کے ایک قبیلوی سردار دیومان نے طاقت حاصل کر کے ہون قوم کے بادشاہ ہونے کا منصب حاصل کر لیا اور اس ملک (جنوبی منچوریا و منگولیا) سے یوچی قوم کو جیسے نفتالی بھی کہتے ہیں نکال دیا جو صدیوں سے وہاں آباد تھی۔ یوچی غالباً آریا نسل کے لوگ تھے جو وہاں سے ہجرت کر کے افغانستان کی سرزمین میں جا کر آباد ہو گئے۔"

سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل "پشتون تاریخ کے آئینے" میں لکھتے ہیں۔ "یہ تمام

حملہ آور قومیں جیسے ساکاپار تھین اور کوشان وغیرہ اصلاً ایرانی النسل تھے۔" پھر دوسری جگہ لکھتے ہیں "یوچی نے 70ق م میں رود آمو کو عبور کر کے باختریہ پر اقتدار قائم کر لیا۔ اس وقت یوچی پانچ بڑے بڑے قبیلوں پر مشتمل تھے۔ ان میں سے ایک قبیلے کا نام "کوئی شانگ" تھا۔ اس قبیلے نے رفتہ رفتہ اپنے ساتھ کے چاروں قبائل پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اور اس قبیلے (کوئی شانگ) کا سردار ان سب کا بادشاہ بن گیا اور اس بادشاہت کا نام بھی قبیلے کے نام کی مناسبت سے (کوئی شانگ) ہی رکھا گیا۔" اس سے معلوم ہوا یوچی، یا یہوچی یا یواچی ایک آرین الاصل قوم تھی۔ اس کے خدوخال ستھین سے ملتے تھے اور یہ دونوں ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا اصل ماخذ آریا قوم تھی۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہوچی ایک آریا قوم ہے اور ستھین بھی آرین اور شین ستھین ہیں اور آرین ہیں تو پھر یشکن آریا قوم نہیں ہو سکتی کیونکہ اس قوم کے خدوخال دیگر عمرانی پہلو شین قوم سے بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً

1۔ شین لمبوترے سر اور اونچی کھوپڑی رکھتے ہیں جبکہ یشکن چوڑے سر کے مالک ہیں۔ چوڑے اور لمبوترے سر کی پیمائش اس طرح کی گئی ہے۔ اگر ماتھے سے لے کر سر کے پچھلے حصے تک کی پیمائش ہو اور دائیں بائیں کی پیمائش سر سے بڑھ جائے تو اسے چوڑا سر قرار دیا جاتا ہے۔ (یشکنوں کا سر ہر لحاظ سے چوڑا ہے)۔

2۔ یشکنوں کا جسم کچھ پھیلا ہوا ہوتا ہے جبکہ شین کا جسم سیدھا اور دراز ہوتا ہے۔

3۔ شین ستواں ناک رکھتے ہیں جبکہ یشکنوں کی ناک بیٹھی ہوئی ہوتی ہے۔

4۔ یشکنوں کی جبڑے کی ہڈی ابھری ہوئی ہوتی ہے جبکہ شینوں کی ہڈی ایسی ابھری ہوئی نہیں ہوتی۔

5۔ شینوں کی داڑھیاں گنجان ہوتی ہیں جبکہ یشکنوں کی داڑھیاں چھیدری ہوتی ہیں۔

6۔ قدیم یشکن اور شینوں کی عادتوں میں بڑا فرق تھا۔ یشکن باز پالتے تھے اور گھوڑوں سے انہیں بے انتہا محبت ہوتی تھی۔ جبکہ شینوں کے پاس باز پالنے کا رواج نہ تھا۔ یشکنوں کو باز پالنے کی روایات مغلوں سے ملیں کیونکہ ان کی سرشت مغل تھی قدیم مغل بھی گھوڑوں سے محبت کرتے، ان کا گوشت کھاتے اور دودھ پیتے۔

-7 بغدور یشکنوں میں ایک عام مستعمل نام ہے اور یہ ان کے ایک بادشاہ کا نام تھا جو انہیں روایات میں ملا۔ اور پھر یہ نام آہستہ آہستہ شین اور یشکنوں نے ساتھ ساتھ استعمال کرنا شروع کیا۔ بغدور بگماتر (بہادر) سے بگڑ کر بنا لفظ ہے اور یہ محض مغل ذخیرۂ الفاظ سے متعلق ہے۔

-8 یشکنوں میں ذات پات کی تقسیم موجود نہ تھی جبکہ شینوں میں ذات پات کی سخت تقسیم موجود تھی۔ جہاں شین قبائل موجود تھے وہاں اونچ نیچ کی باتیں عام تھیں۔

-9 شین گائے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے، اس کا دودھ استعمال نہ کرتے اس کے بچھڑے کو ہاتھ نہ لگاتے جبکہ یشکن گائے پالتے، اس کا دودھ استعمال کرتے اور اس کے بچھڑے کی پرورش کرتے۔

-10 شینوں کے مقابلے میں یشکن زراعت کاری میں زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔ انہیں بوائی، کاشت کاری کے بہتر ایام، موسمی کیفیات کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہیں۔

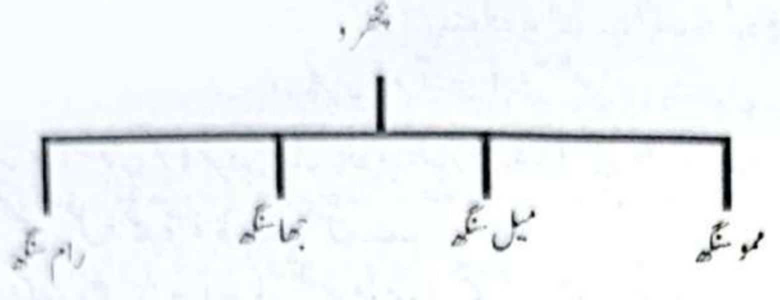
-11 شین انتقام جو قوم ہے جبکہ یشکن صلح جو قوم ہے۔ ایک شینا ضرب المثل ہے کہ "شِنو دُون قنور" یعنی شین کے دانت اس کے شکم میں ہوتے ہیں۔ اس کا کپٹ آسانی سے نہیں نکلتا۔

-12 قدیم شین مرغیاں نہ پالتے اور نہ کھاتے لیکن یشکن مرغیاں پالتے اور ان کا گوشت کھاتے۔

-13 تھوٹی(thoti) کو شینوں نے اور کوری (kori) کو یشکنوں نے رواج دیا۔

-14 دنیل عموماً شینوں سے ہوتے تھے اور یشکنوں سے بہت کم دانیل ہوئے۔

-15 شینوں کے اکثر قدیم نام سنگھ لاحقے پر ختم ہوتے۔ یشکنوں کے نام جانوروں کے حوالے سے مقرر ہوتے۔ تاہم بعد میں ملی جلی معاشرت کی وجہ سے ناموں کا استعمال ایک جیسا بھی ہوا۔ 1893-94ء کے امیر سنگھ کے مرتبہ شجروں میں زیادہ تر شینوں کے نام کے ساتھ سنگھ لکھا ملا مثلاً چھار سنگھ، پونیار سنگھ، مل سنگھ، موسنگھ، 1946ء کی جمع بندی ریکارڈ میں جو اب بھی محکمہ بندوبست میں دستیاب ہے کسی یشکن شجرہ اس طرح دیا گیا ہے۔



16- قدیم شینوں نے ہندوراج کا اجراء کیا جبکہ یشکن بدھ ازم کے پرستار تھے۔

17- بروشو کی زبان عموماً بروشکی اور شینوں کی زبان شینا رہی۔

18- شین جو بلتستان گئے انہیں بروکپا اور چترال گئے انہیں ڈنگرک کہا گیا جبکہ یہ الفاظ یشکنوں کے لئے استعمال نہیں ہوئے۔

19- قدیم شین مغرور قوم تھی۔ وہ چھوٹے موٹے کام نہ کرتی تھی جبکہ یشکن اس کے برعکس کسی پر اپنی بڑائی نہ جتاتے اور نہ کوئی کام کرنے میں عار محسوس کرتے۔

20- شینا زبان کے لئے یشکنوں نے ماحول دیا اور شینوں نے اپنی زبان دی۔

اس تفصیل سے واضح طور پر شین اور یشکن دو جدا جدا قومیں ہیں اور ان کا اپنا اپنا ایک مقام ہے۔ یہ نظریات کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ۔

1- شین نے مقامی عورت سے شادی کی تو اولاد یشکن کہلائی۔ تاہم جس نے یہ کہا اس نے یہ نہیں سوچا کہ اولاد باپ سے چلتی ہے نہ کہ ماں سے۔ اگر کسی شین نے یشکن عورت سے شادی کی ہو گی تو اولاد شین ہی کہلائے گی۔ اسی طرح اگر کوئی یشکن مرد شین عورت سے شادی کرے گا تو اولاد یشکن کہلائے گی نہ کہ شین۔

2- یشکن نہ آرین ہیں، نہ یورپین اور نہ سکندر اعظم کے بیمار سپاہیوں کی اولاد ہیں، نہ درد ہیں بلکہ یہ ہی انگ نو ہیں، ہون ہیں اور منگولی ہیں۔ انہیں یشکن (مغل) کہا جا سکتا ہے۔ اگر انہیں سکندر اعظم کے بیمار سپاہیوں کی اولاد قرار دیا جائے تو پھر یہ آرین ہوں گے کیونکہ سکندر اعظم اور اس کی افواج آرین تھی۔ ان کی خدوخال اور منگول خدوخال میں واضح فرق ٹوٹ گیا گیا ہے۔

3- یہ خیال کہ شین، یشکن اور کمین (کرمین) کا قافیہ ملتا ہے یا یہ خیال کہ یہ ایک باپ کی اولاد ہیں، کوئی وزن نہیں رکھتا کیونکہ ان تینوں کے خدوخال جدا جدا ہیں۔ ان کی قدیم معاشرت جدا جدا تھی۔ 2000ء کا زمانہ ہے۔ دو ہزار سالوں سے

شین، یشکن اور کر مین (کمین) قومیں وجود رکھتی ہیں اور ان کا اپنا ایک معاشرتی نظام رہا ہے۔ شین گندمی رنگ، یشکن زرد رنگ اور کر مین سیاہ رنگ ہیں۔ یہ الگ الگ قبیلوں کے نمائندہ ہیں۔

شینوں اور یشکنوں میں ایک بحث یہ بھی چلتی رہی ہے کہ وہ ہی اس سرزمین کا اولین آباد کار ہیں۔ اگر شین کو اس زمین کا قدیم باسی قرار دیا جائے تو یشکن بعد میں آنے والا حملہ آور قرار پائے گا۔ اس وقت شمالی علاقہ جات میں یشکنوں کی اکثریت ہے۔ پونیال، استور، یاسین، اشکومن، گوپس، ہنزہ، نگر، سئی وغیرہ علاقوں میں ان کی غالب اکثریت ہے۔ اس سے لامحالہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باہر سے بعد میں آنے والے یشکن حملہ آوروں نے شینوں کو جنوب کی طرف دھکیلا اور ان سے اہم علاقے چھینے۔ حالانکہ ایسی صورت حال سامنے نہیں آئی۔ میرے نزدیک سوات، کوہستان، وادی کشن گنگا، اور چلاس کے علاقوں میں شینوں کے قدم پہلے پڑے۔ اور شمالی زمینی علاقوں مثلاً گلگت، ہنزہ، نگر، پونیال وغیرہ میں یشکن پہلے آئے۔ لیکن ان دونوں اقوام سے پہلے جو مختلف قومیں یہاں موجود تھیں۔ ان کی ایک الگ کہانی ہے۔ جس کی یہاں تھوڑی سی تشریح بڑی کارآمد ہو گی۔

ہندوستان میں آریوں کی آمد کے وقت یہاں جو نسلیں آباد تھیں۔ ان میں کول، منگول، بھیل، گونڈ، اور دراوڑ قومیں شامل تھیں۔ ہندوستان میں آریوں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں منگول جیسی تورانی قومیں بھی آباد تھیں۔ یہ تورانی قومیں 1500 ق م سے بہت پہلے تبت، لداخ اور شمالی دروں سے ہندوستان آئیں۔ ہیرلڈ لیم کہتے ہیں۔ کہ حضرت عیسیٰ سے ہزار سال پہلے دشت ایشیا کے انتہائے شمال کی طرف عجیب وغریب وحشی اور جنگجو قومیں رہ رہی تھیں۔ چینی انہیں شیاطین کہتے تھے۔ یونانی مورخ انہیں ہائی پربورین کہتے ہیں۔ ان کی زندگی گھوڑوں کے ساتھ وابستہ تھی۔ وہ گھوڑوں پر سواری کرتے، گھوڑوں کا گوشت کھاتے اور گھوڑوں کا دودھ استعمال کرتے۔ یہ متمدن دنیا سے بہت دور تھے۔ لیکن جیسے جیسے انہیں ان ٹنڈرائی خطوں میں مشکلات پیش آئیں۔ گھاس کی تلاش ہوئی وہ جنوب کی طرف بھی آجاتے۔ وہ بڑے پختہ کار شکاری تھے۔ وہ شکار اور گھاس کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکتے پھرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کسی زمانے میں جب منگول، یا منگول یا مغول قومیں شمال کی طرف سے ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ تو ان ابتدائی جتھوں کے کچھ ٹکڑیاں ہمارے علاقے میں بھی داخل ہوئیں۔ جو تورانی الاصل قومیں ہنزہ میں آئیں۔ انہوں نے نگر اور اردگرد

کے علاقوں کو اپنا مسکن بنایا۔ یہ عجیب و غریب زبانوں کا ایک ملغوبہ استعمال کرتے تھے۔ اس میں یورالی، ارکٹسی، لیپی، فنی، میگاری، ترکی، مانچوی اور منگولی زبانوں کے اجزاء شامل تھے۔

یوں ہمارے علاقے میں ایک ایسی بولی آئی۔ جس نے ابتدائی بروشکی کے لئے زمین بنائی پھر بعد میں جب ہی، انگ۔ نو (ہون) آئے تو اس بولی میں رس اور رنگ آیا۔ اور اس بولی میں جان پڑی۔ جب بروشو قبائل ادھر اُدھر پھیلے تو انہوں نے ترکی، مانچوی اور منگولی ملی زبان کو شمال اور گلگت میں پھیلایا۔ چونکہ ان بروشو قبائل کا ابتدائی تعلق چین اور تبت سے ہوا تھا۔ اور پھر بدخشاں سے بھی تعلقات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بروشکی نے رنگ پکڑا اس کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوا۔ تبتی، چینی، انڈو آرین (قدیم فارسی) کے الفاظ بھی شامل ہوئے۔ بروشکی اور شینا کی ترقی کے مدراج اس طرح ظہور میں آئے۔

بروشکی : (منگول)

1۔ بہت پہلے ٹنڈرا اور سائبریا کی طرف سے آئے منگول قبائل جو منگولی، مانچوی، ترکی ملی وحشی بولیاں بولتے تھے۔
2۔ ہی۔ انگ۔ نو (ہون) جو منگولی زبان بولتے تھے۔
3۔ تبتی، چینی اور انڈو آرین (قدیم فارسی) کی ملاوٹ سے بروشکی نے جنم لیا۔

شینا : آریا

1۔ ہند ایرانی بولتے ہوئے پشاچہ کوہستان، گریز اور کشمیر میں آئے۔
2۔ شین آریا آئے اور پشاچہ کے سانچے پر شینا کو جنم دیا۔
3۔ شینا میں بروشسکی کے الفاظ شامل ہوئے اور بروشسکی میں شنا کے الفاظ داخل ہوئے۔

بروشسکی نے اس طرح جنم تو لیا لیکن شینوں کے آنے کے بعد جب یہ زبان پہاڑوں میں مقید ہو گئی تو اسے پھل پھولنے کے لئے موقع نہ ملا۔ شمال کی طرف اس زبان کے قدیم ماخذوں سے تعلق ٹوٹ گیا۔ اور جنوب کی طرف شین حملہ آوروں کی وجہ سے اسے پنپنے کا موقعہ نہ ملا۔ تو یہ زبان تنہا ہو گئی۔ اس کے ساتھ شکاری دور کے ذخیرۂ الفاظ باقی رہے۔ جبکہ اس کے اصل مسکنوں میں یہ ذخیرہ الفاظ بدل چکے تھے۔ یوں بروشکی زبانوں کے عام مروجہ خاندانوں سے باہر ہو گئی۔

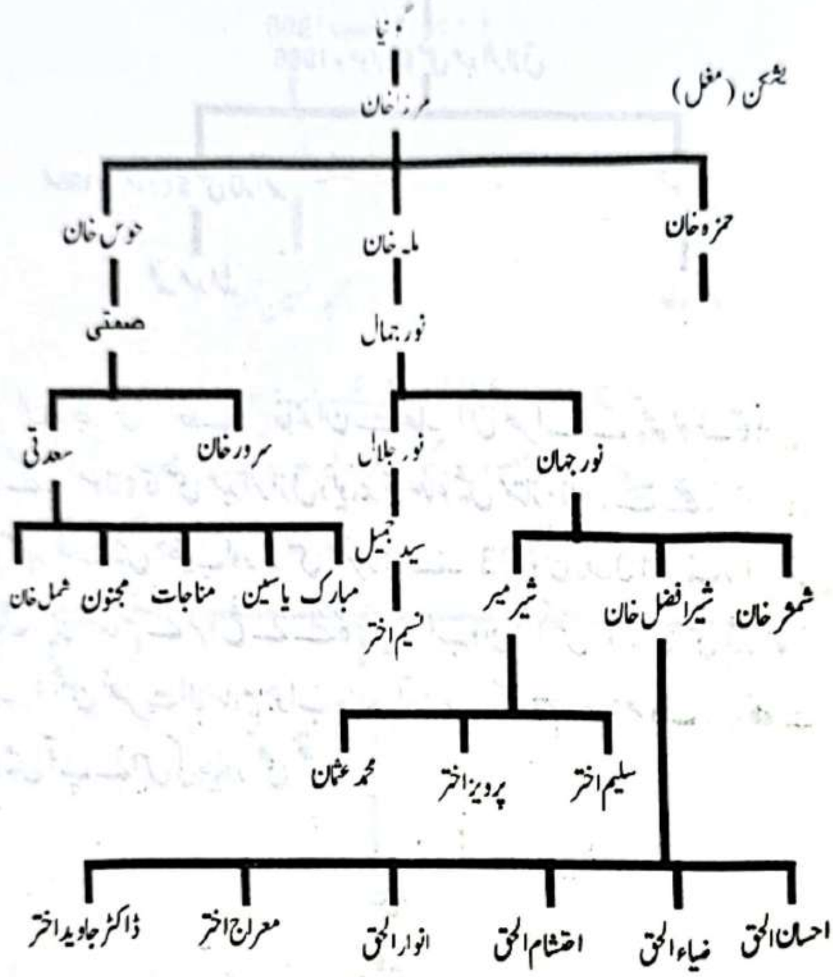
کہا جاتا ہے۔ 1028-29ء کے دوران دردقبائل ہر طرف حملے کر رہے تھے۔

جٹ مار کا کہنا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی سے حالات بالکل بدل گئے۔ دردستان کے حکمران کشمیر کے بادشاہوں کے برابر کے شریک کار ہو گئے تھے۔ یہاں کے حکمران کشمیر میں پناہ لیتے۔ اور جانشینی کے لئے وہاں سے جدوجہد کرتے۔ ممکن ہے ان تاریخوں میں کچھ فرق ہو۔ جن شین ادوار کا میں نے تعین کیا ہے۔ وہ وہی ہے کہ 1000ء میں گلگت میں یشکنوں کی حکومت نظر نہیں آتی۔ اور ان دنوں جب شینوں نے شمال میں یشکنوں سے حکومت چھینی تو یشکن شمال اور شمال مشرق کی طرف سمٹتے گئے۔ شروع شروع میں شین شمال میں بلور پر اور جنوب مشرق میں کشمیر کے متصل علاقوں پر حملے کرتے۔ حملوں میں جو مال غنیمت ہاتھ آتا۔ اور جو یشکن قیدی بنائے جاتے۔ انہیں جنوب میں اپنے مرکزی علاقوں میں لے جاتے اس طرح بہت سے یشکن خاندان گور، چلاس، داریل، تانگیر اور کوہستان میں لے جائے گئے۔ یہ خیالات درست نہیں کہ یشکن جنوب سے شمال کی طرف آئے۔ صرف وہی یشکن جنوب سے شمال کی طرف آئے جو شین بندی بنا کر جنوب میں لے گئے تھے۔ جو قدیم یشکن جنوب میں رہنے لگا۔ کہ وہ وہی کا ہو کر رہا۔ اور جو کسی طرح وہاں بس نہ سکا۔ اور وہ زمین اسے راس نہ آئی۔ وہ شمال کی طرف اپنے رشتہ داروں میں واپس آیا۔ ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے محقق جرگن (Jurgen) اپنے ایک مقالہ میں جو نگر کی تاریخ اقوام و تمدن پر ہے۔ لکھتے ہیں نگر میں آنے والے بہت سے قبائل براستہ گور سے آئے تھے۔ یہ قبائل گور میں کہاں سے آکر آباد ہوئے تھے۔ اس سلسلہ میں جرگن کہتے ہیں کہ یہی قبائل ایران، کابل اور صوبہ سرحد سے آکر گور میں آباد ہوئے تھے۔ نگر میں وارد ہونے والا شخص بروشو ہوپر میں آکر بس گیا تھا۔ اور یوں بروشال معرض وجود میں آیا۔ چلاس اور گور نگر کے بروشسکی بولنے والوں کا ابتدائی گھر ہے۔ یہ مفروضہ جرگن جٹ مار کے اس استدلال کے حوالے سے کہتے ہیں۔ کہ بلور کے بروشو کے کچھ آباؤاجداد گور رہ چکے ہوں۔ جرگن کہتے ہیں کہ یہاں سے نگر آنے والے بروشو کو زمین اور پانی کی قلت نے مہاجرت پر مجبور کیا تھا۔ ساتھ ساتھ جرگن یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ شین قبائل بھی دو سو سال پہلے جنوب کی طرف سے یہاں آئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نگر کی طرف شین 1700ء کے لگ بھگ زمانے میں آئے۔ ظاہر ہے اگر کوئی گور میں ایران، کابل اور صوبہ سرحد سے لوگ آئے تھے۔ تو وہ ہندایرانی زبانیں بولتے ہونگے۔ اگر وہاں سے ان ہی قوموں نے نگر مہاجرت کی تھی۔ تو پھر کھجونہ کہاں سے پیدا ہوئی۔ جس کا کسی ہندایرانی گروپ سے تعلق نہ تھا۔ جب کہ کھجونہ یا بروشسکی کسی ایسے خاندانی ڈھانچے سے تعلق نہیں رکھتی

تھی۔ تاہم اس کا منگولی شکاری بولی سے تعلق تھا۔ جو مرور زمانہ کے ساتھ شمالی بُنڈرائی خطوں میں بھی مٹ چکی تھی۔

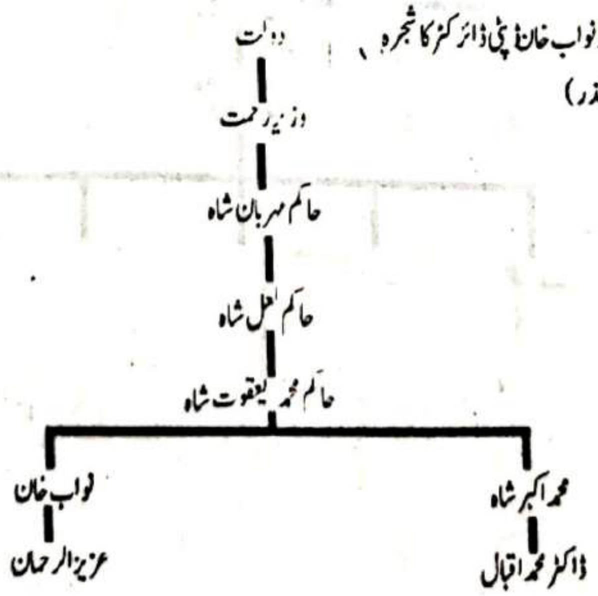
انگریز مورخین نے یہاں مارشل اور غیر مارشل کے نظریات بھی پیش کئے ہیں۔ کہ نگر کے لوگ بزدل ہیں اور غیر مارشل ہیں۔ یا شین سے یشکن اور یشکن سے رونو بہتر مارشل قومیں ہیں ان نظریات سے میرا اختلاف ہے۔ شین، یشکن اور رونو برابر کی جنگجو قومیں ہیں۔ این ایل آئی میں نگر اور ہنزہ کے جوان کسی طرح ایک دوسرے سے پیچھے نہیں۔ جنگ آزادی گلگت میں نگر اور ہنزہ کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں کسی کا حصہ کسی سے کچھ کم نہیں۔ انگریزوں نے مارشل اور غیر مارشل کی اصطلاحات اپنے ساتھ تعلق کے حوالہ سے پیدا کی ہیں۔ جاگیریں، ایوارڈز، سندات، خطابات وغیرہ ایسے لوگوں کو دی گئیں۔ جو کسی طرح ان کے کام آئے۔ اور ان کی پالیسوں کی حمایت کی۔ آگے سطور میں اس حوالے سے پروفیسر مبارک علی چیئرمین شعبہ تاریخ کراچی یونیورسٹی کی رائے نقل کی جا چکی ہے۔ اب یہاں کچھ یشکنوں کے شجرے دیے جاتے ہیں۔

عزیز شاگرد شیر افضل خان (چلاس) سشن جج کا شجرہ۔



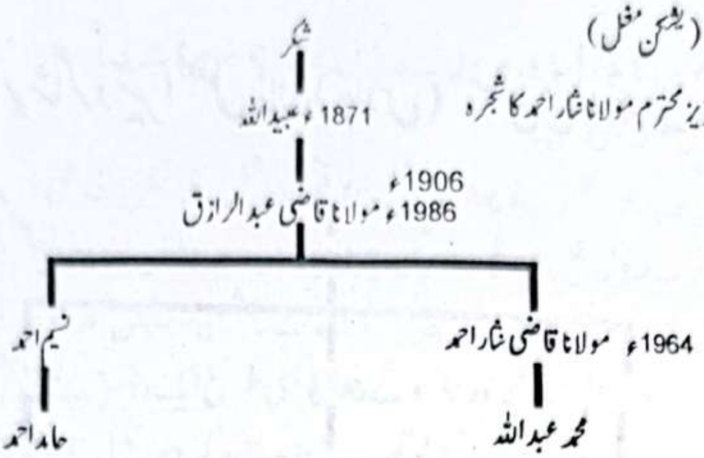
اس خاندان میں وکیل، ڈاکٹر، استاد اور جج کے عہدوں پر فائز لوگ موجود ہیں۔

عزیز شاگرد نواب خان ڈپٹی ڈائریکٹر کا شجرہ،
سوکھے (غذر)

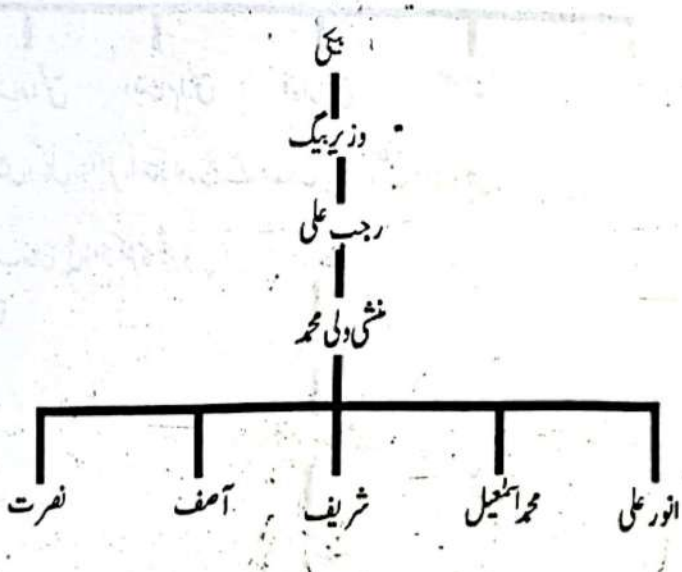


(یشکن مغل)

عزیز محترم مولانا نثار احمد کا شجرہ

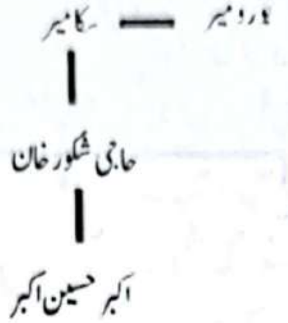


ان کا جدِ اعلیٰ "خانے" خاندان سے تھا۔ اس گھرانے کے کچھ لوگ گاہکوچ اور سنگل بھی گئے۔ مولانا قاضی عبدالرازق دیوبندی علماء میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ 1939ء میں جامع مسجد گلگت میں خطیب اور قاضی مقرر ہوئے۔ 23 جون 1986ء تک (51 سال تک) یہاں دین اسلام کے فروغ کے لئے کام کیا۔ اب وہی فرائض مولانا قاضی نثار احمد نبھا رہے ہیں۔ انجمن نصرت الاسلام جواب جامعہ اسلامیہ کے نام سے معروف درسگاہ ہے۔ 1951ء میں آپ نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔



منشی ولی محمد بھی یشکن (مغل) قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔

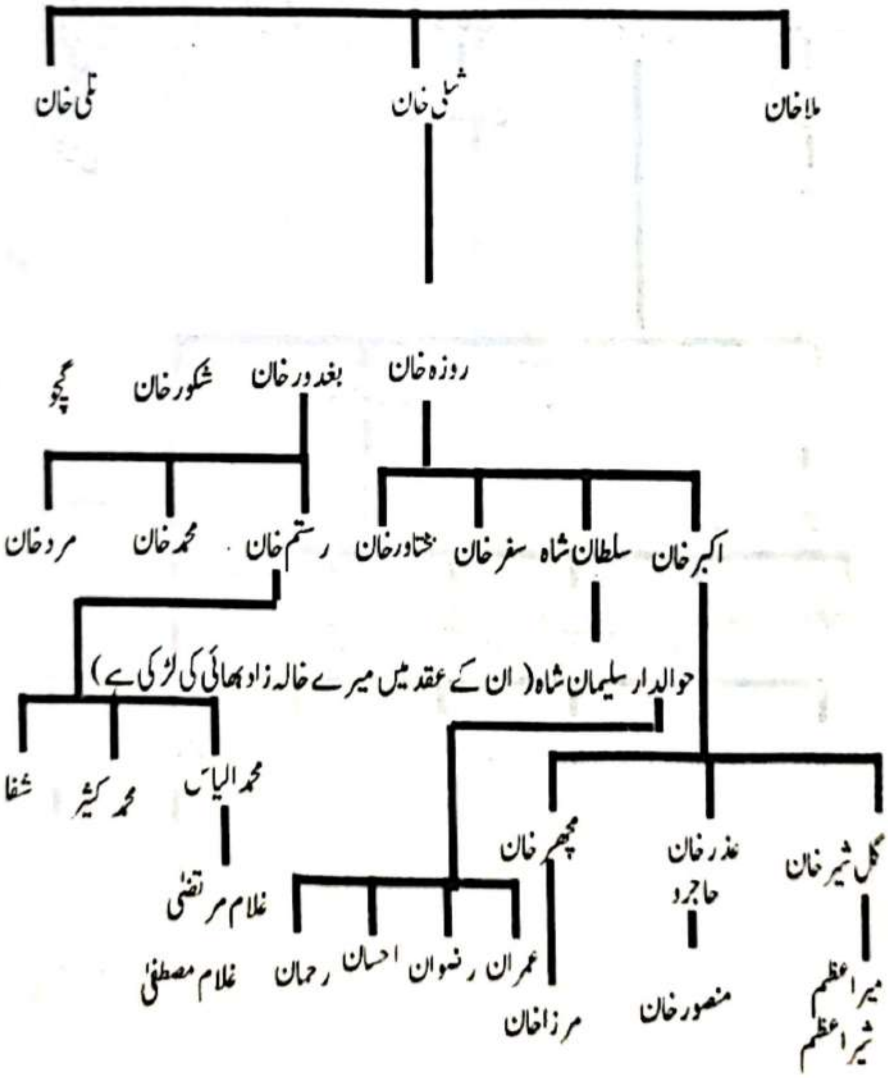
سورے (نگر) عزیز شاگرد اکبر حسین اکبر کا شجرہ

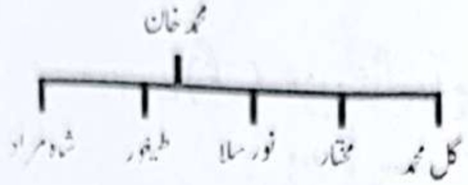


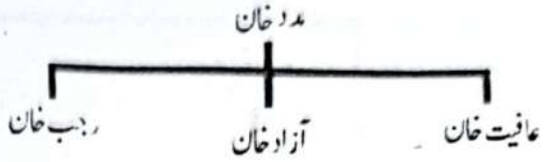
اکبر حسین اکبر "دی مسلم" اخبار کے ایڈیٹر ہوتے تھے۔ اب میدان سیاست ہیں۔

قدیم وقتوں میں اس خاندان کے مغلو، سور گذ ور شاہ وغیرہ۔ لوگ ناموران علاقہ میں شمار ہوتے تھے۔

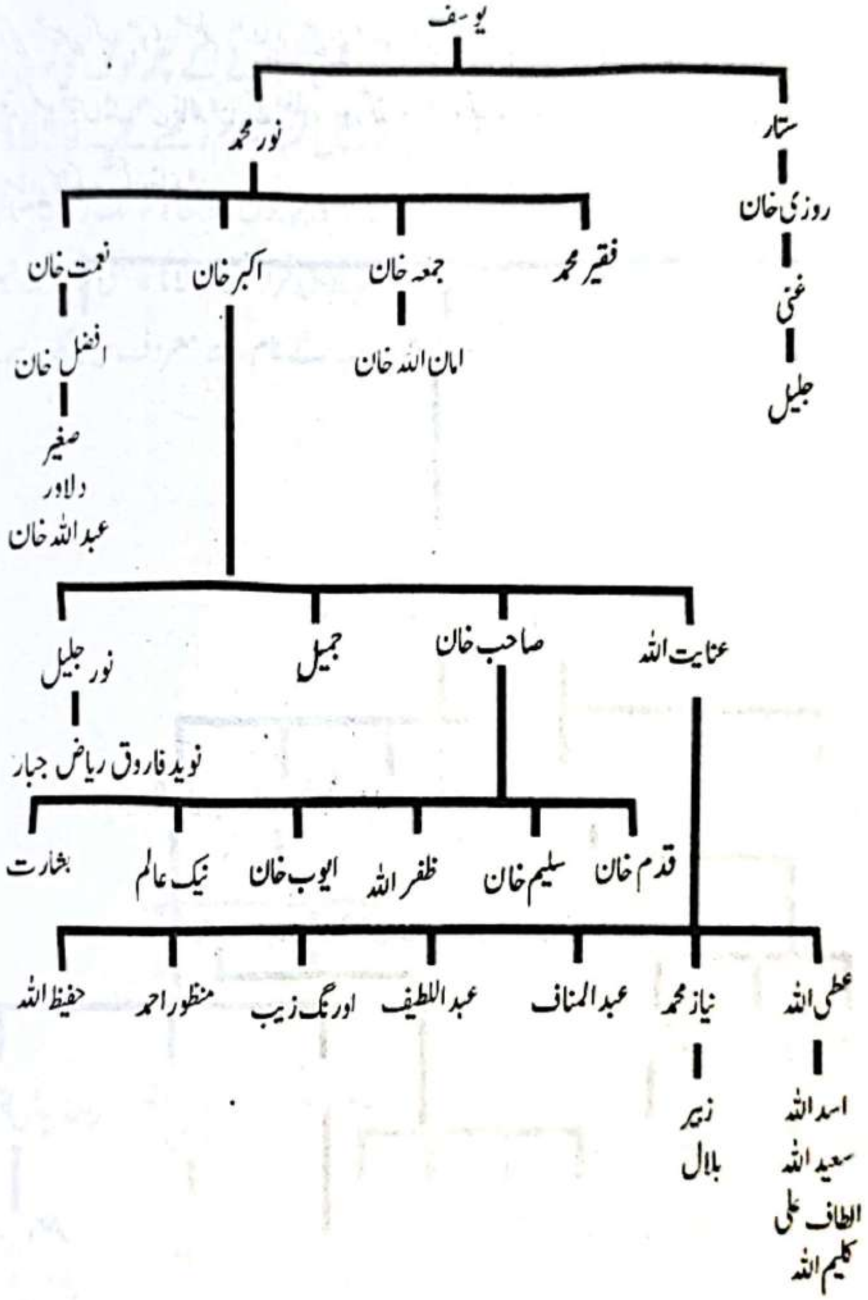
مناور کا ایک یشکن خاندان







امان اللہ خان چیر مین کشمیر و جموں لبریشن فرنٹ کا شجرہ

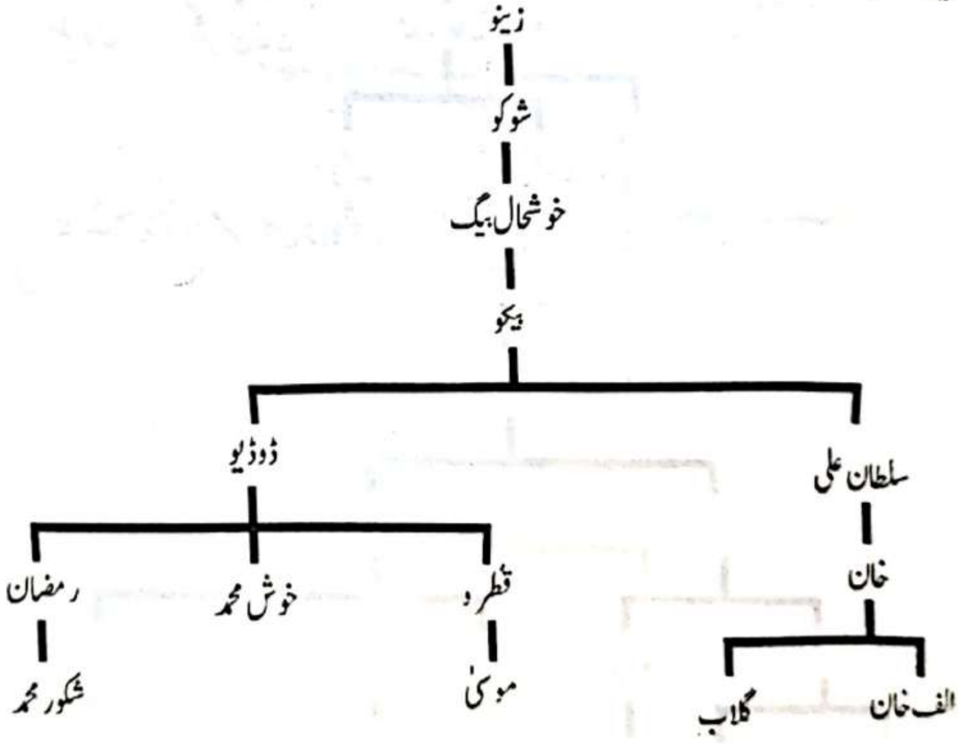


حقیقتاً یہ ایک کشمیری خاندان ہے۔ جو پانپور سے جدا ہوا اور گریز سے ہوتے ہوئے استور آیا۔ پانپور میں ایک قوم ہرے کے نام سے معروف تھی۔ یہ ایک مسلمان قوم تھی جو مسلمانوں کے اُن مفقود ذاتوں میں شامل تھی۔ جنکی وجہ تسمیہ معلوم نہیں تھی۔ محمد دین فوق نے اُن مفقود ذاتوں کی ایک لمبی فہرست اپنی تاریخ اقوام میں دی ہے۔

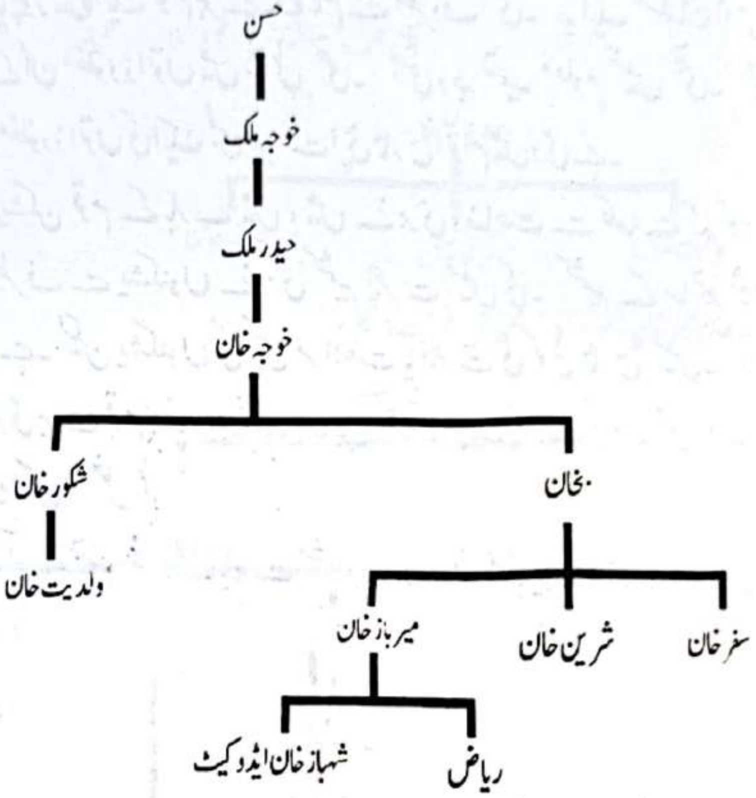
یشکن قوم کے بارے میں، میں نے بری وضاحت سے لکھا ہے کہ کوہستان یا یاغستان کی طرف سے یشکنوں نے کبھی کشمیر ہجرت نہیں کی۔ کشمیر کے ساتھ شیعوں کی وابستگی رہی ہے۔ لیکن یشکنوں کی کسی مراجعت یا ہجرت کی کوئی تاریخ نہیں۔ امان اللہ صاحب کشمیری ہرے قوم کا ایک سپوت ہے۔ اُن کے ہرے کہلانے کی وجہ یہی ہے۔

بابوسے: یشکن (مغل)

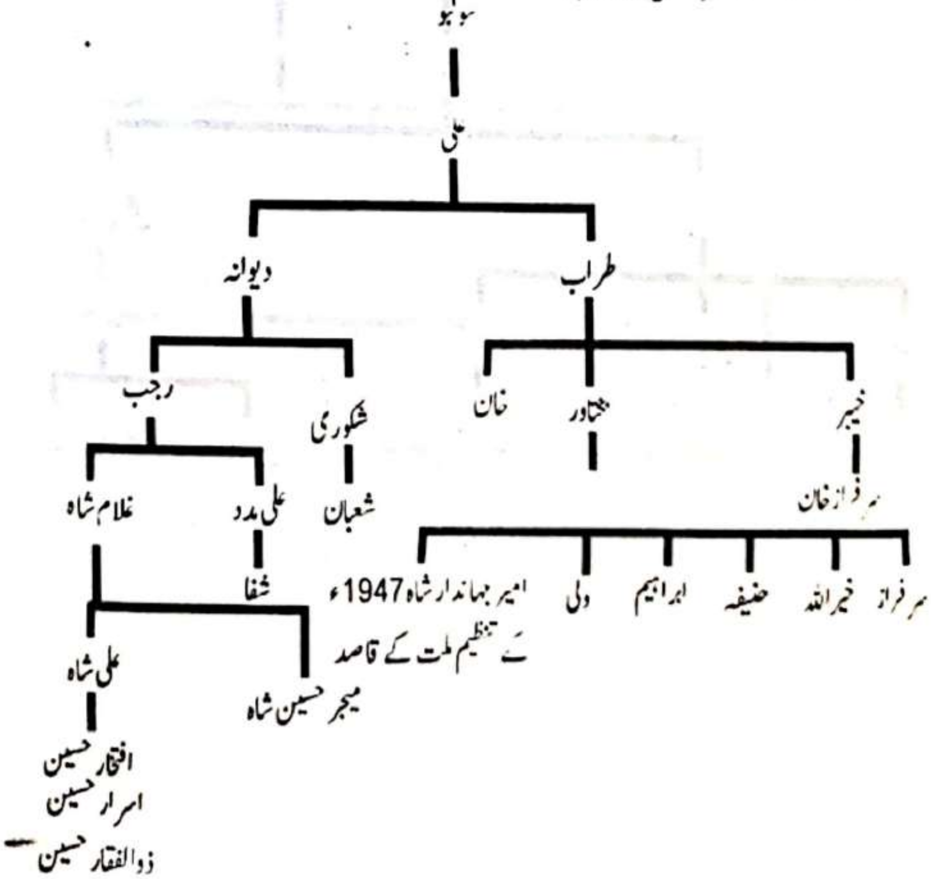
یہ بابوسر سے آئے تھے۔ اس لئے بابوسے مشہور ہوئے۔ قدیم ترین خاندانوں میں شامل ہیں۔



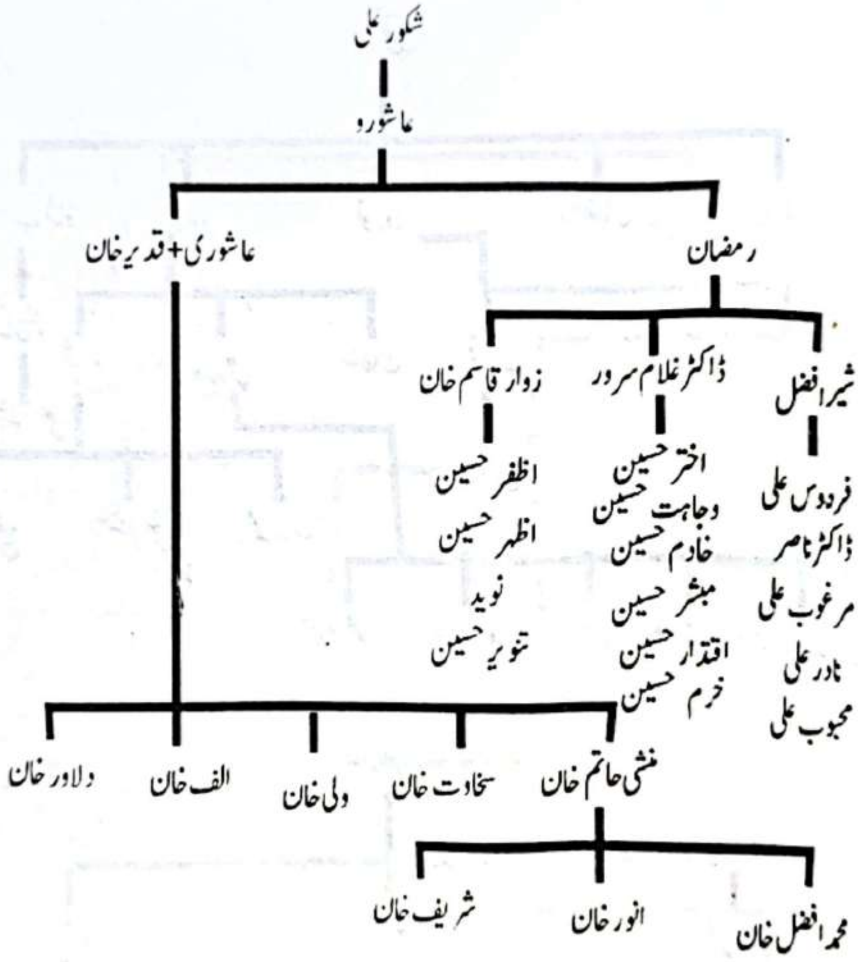
میرے محترم ساتھی میرباز خان سابق نائب ناظم تعلیمات کا شجرہ



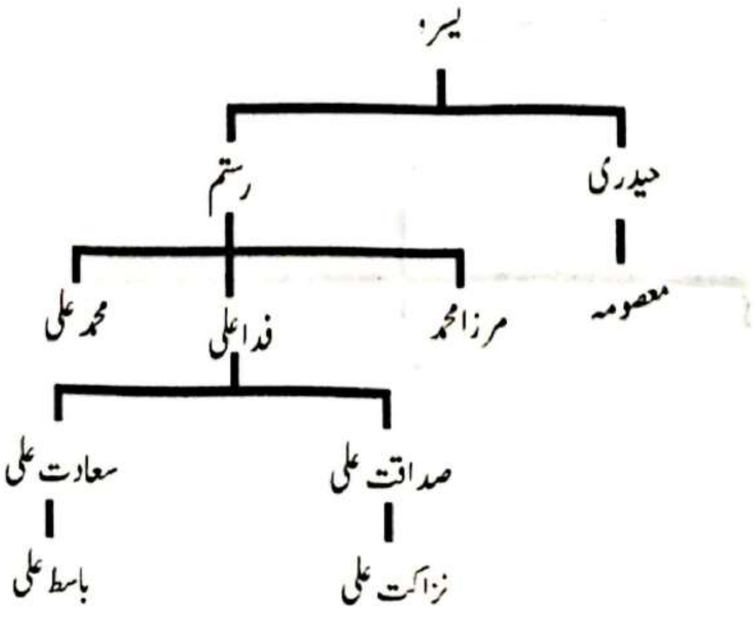
میرے عزیز شاگرد میجر حسین شاہ کا شجرہ



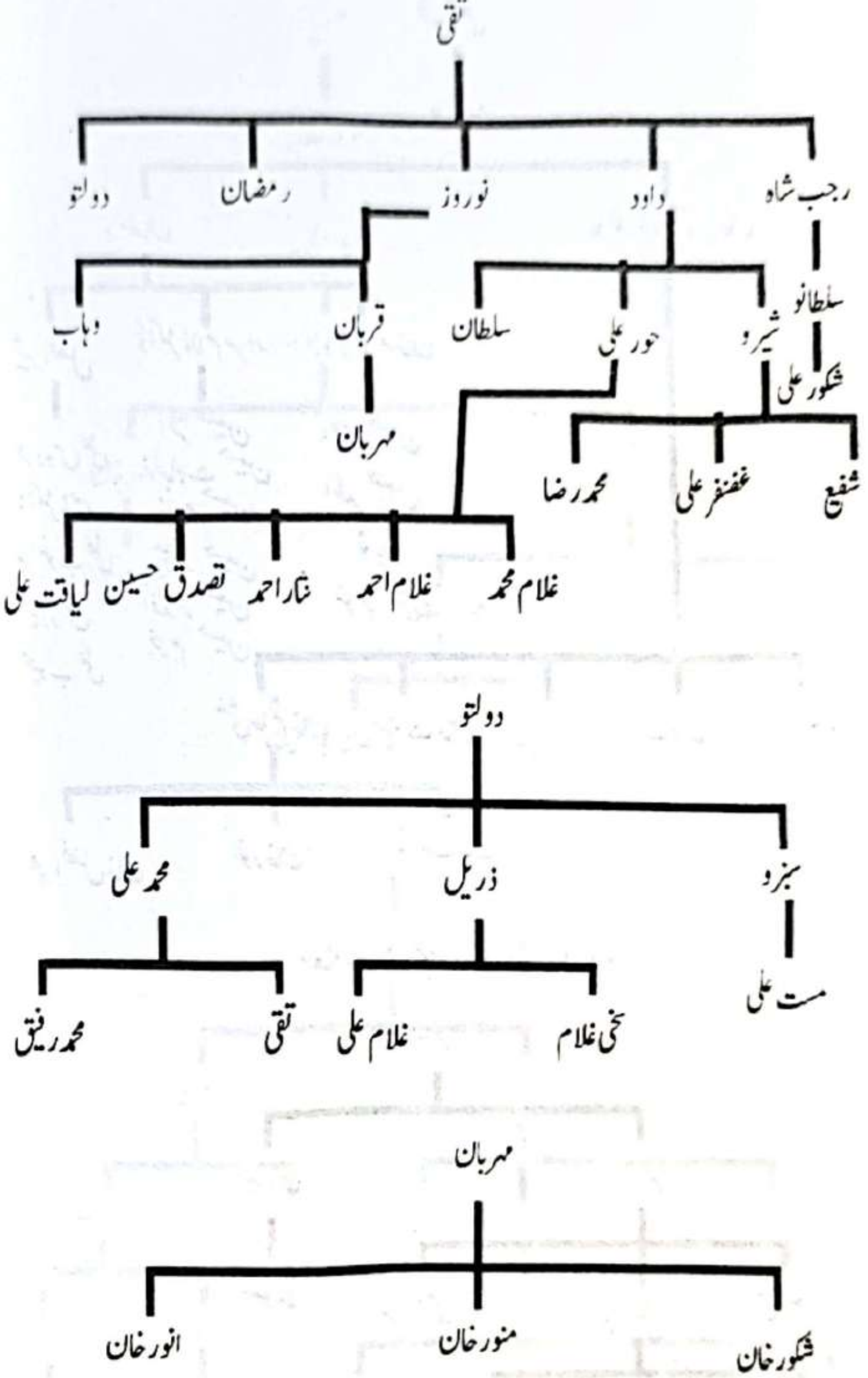
میرے دوست ڈاکٹر غلام سرور کا شجرہ



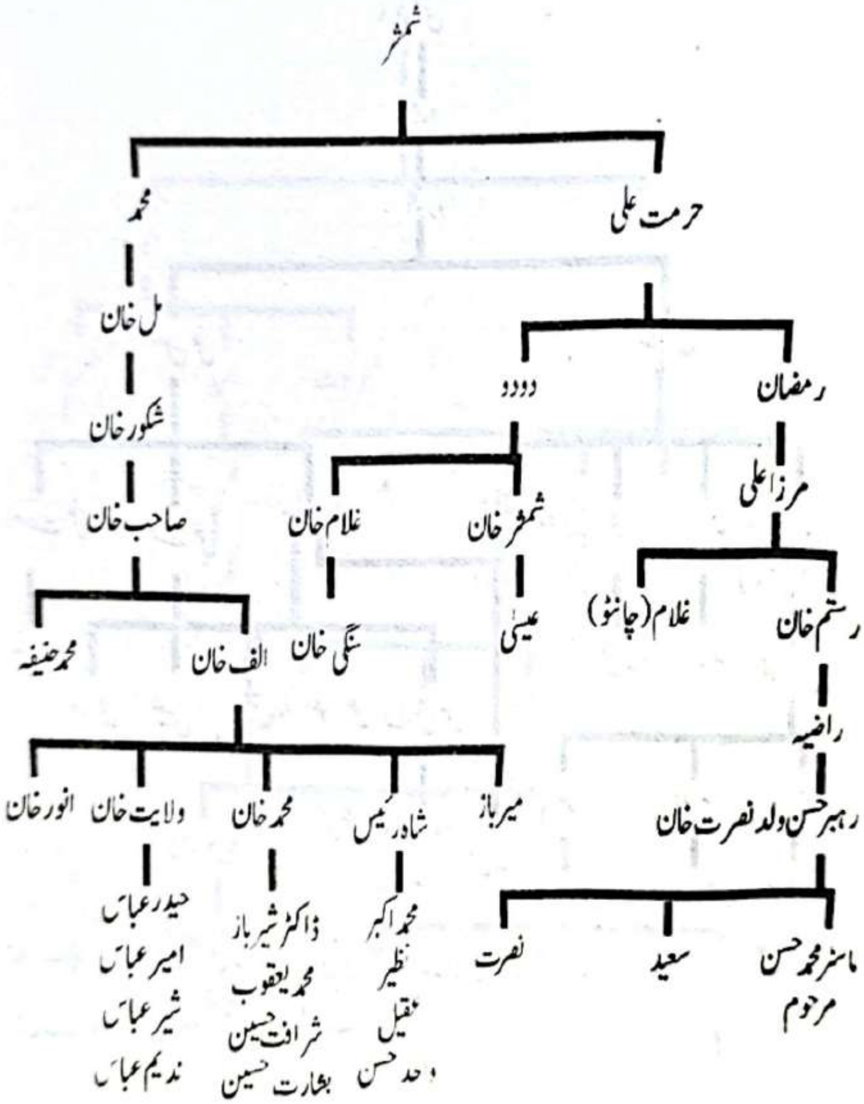
سعادت علی مجاہد اخبار جنگ کا شجرہ



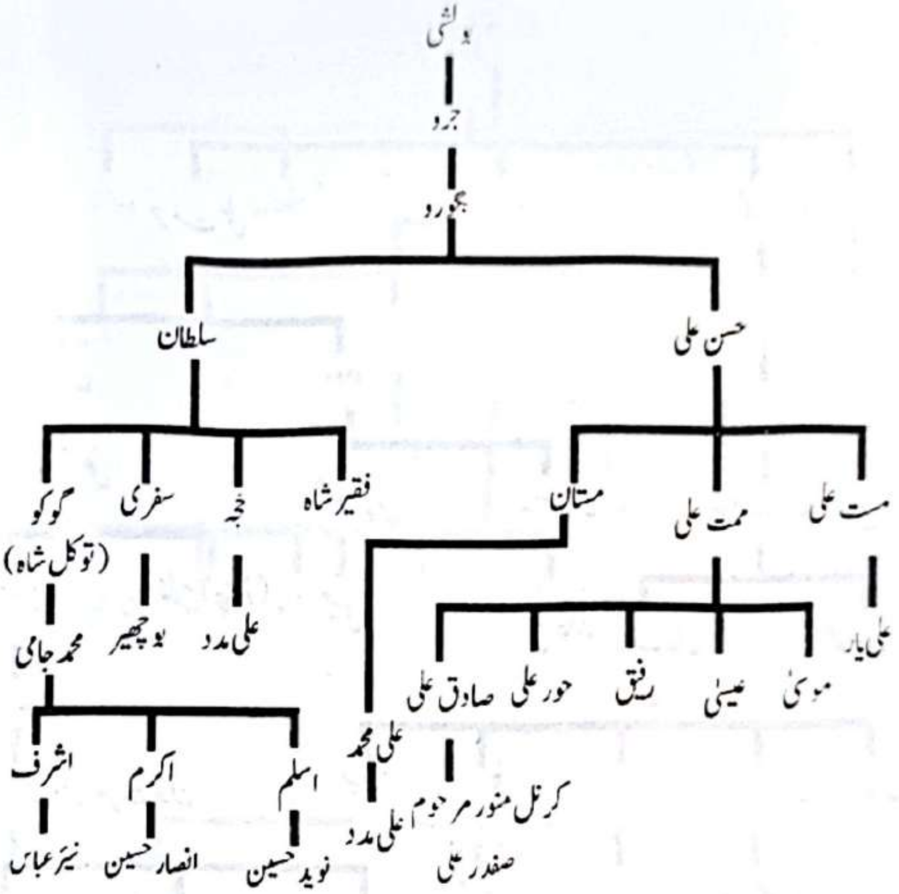
استاد محترم غلام محمد مرحوم کا شجرہ



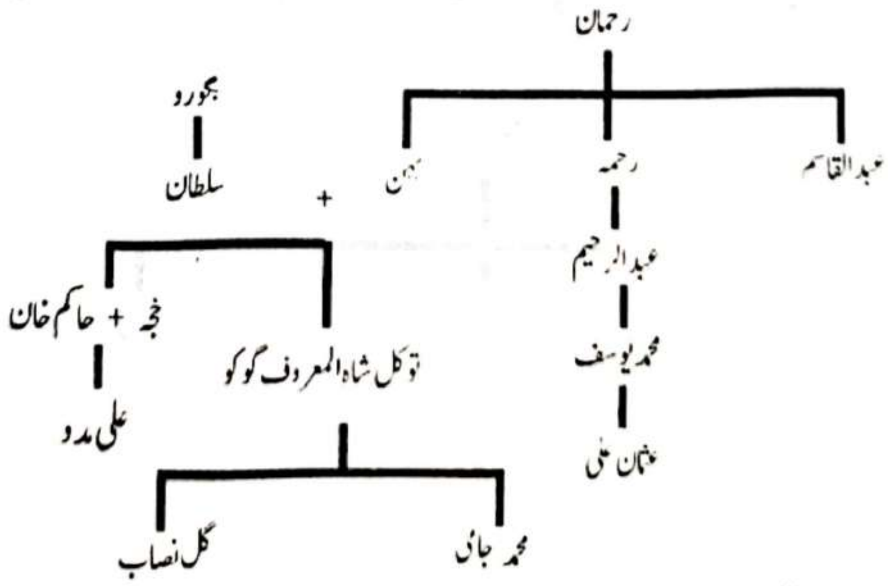
میرے والد محترم کے ساتھی الف خان اچھری کا شجرہ۔



ڈاکٹر محمد جامی کا شجرہ

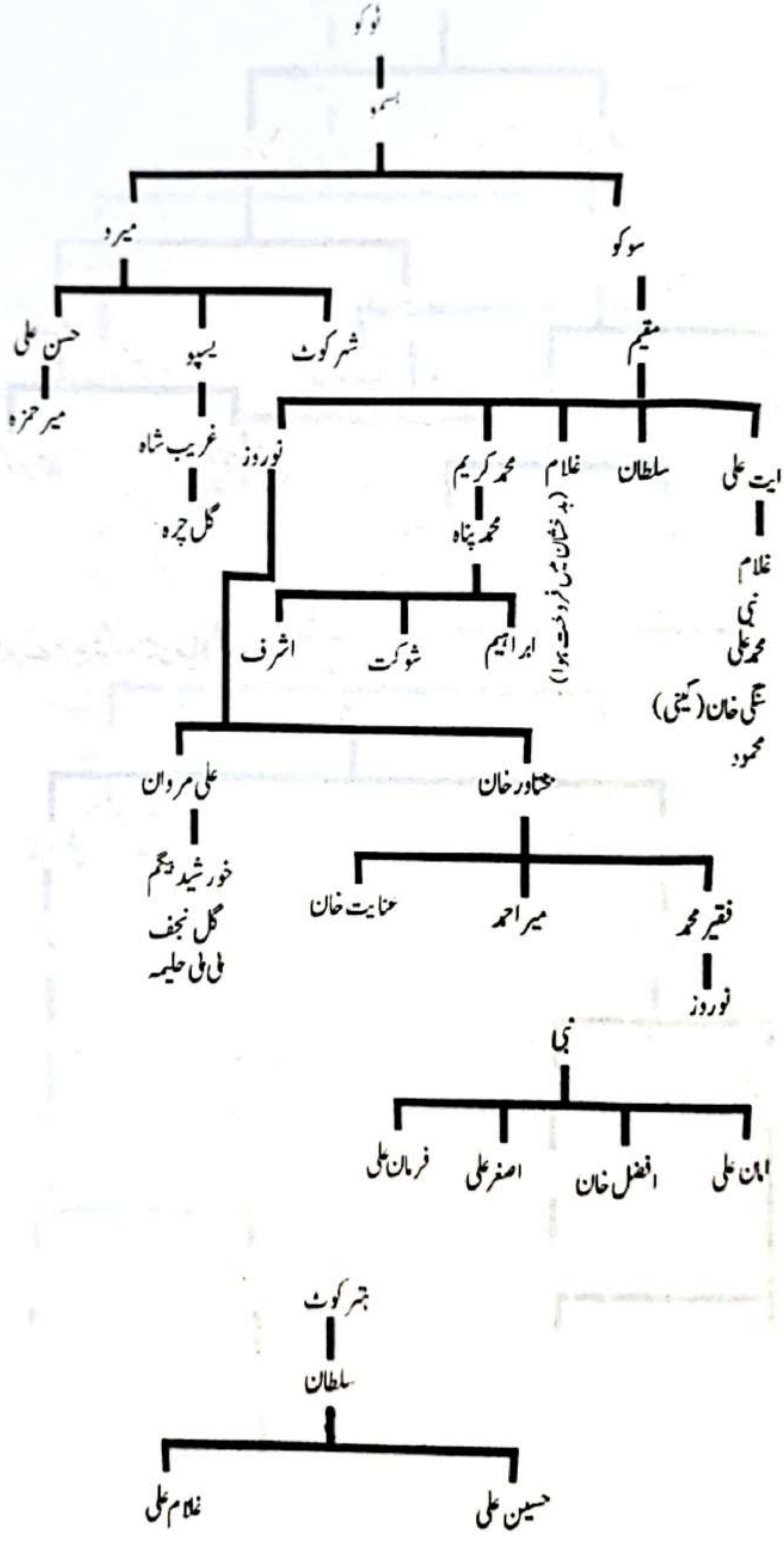


میرے پڑدادا رحمان کی لڑکی سلطان کو بیاہی گئی تھی۔ سلطان کی لڑکی ہمارے خاندان میں بیاہی گئی تھی۔
اُن سے ہمارا نسبی سے تعلق درج ذیل ہے :

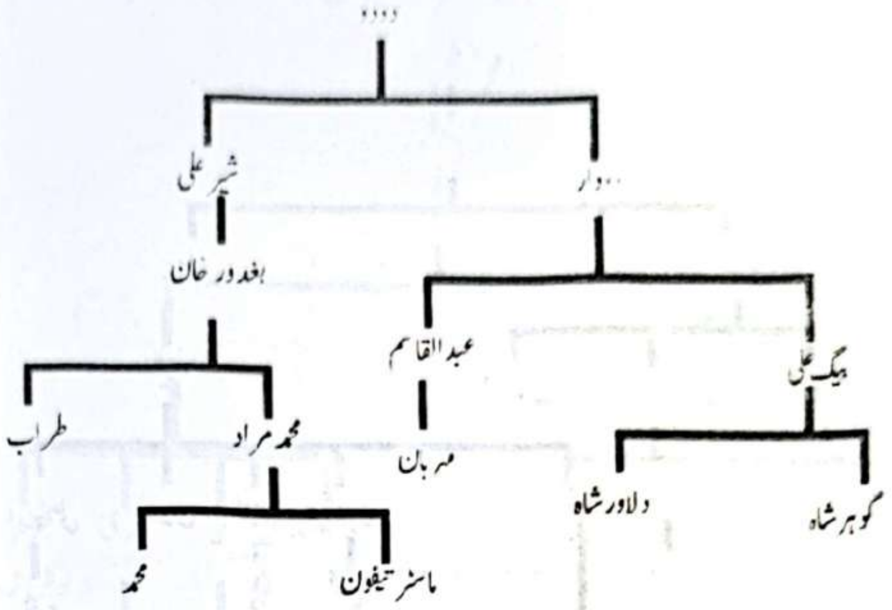


حاکم خان راقم کے خاندان کا ایک سپوت تھا۔

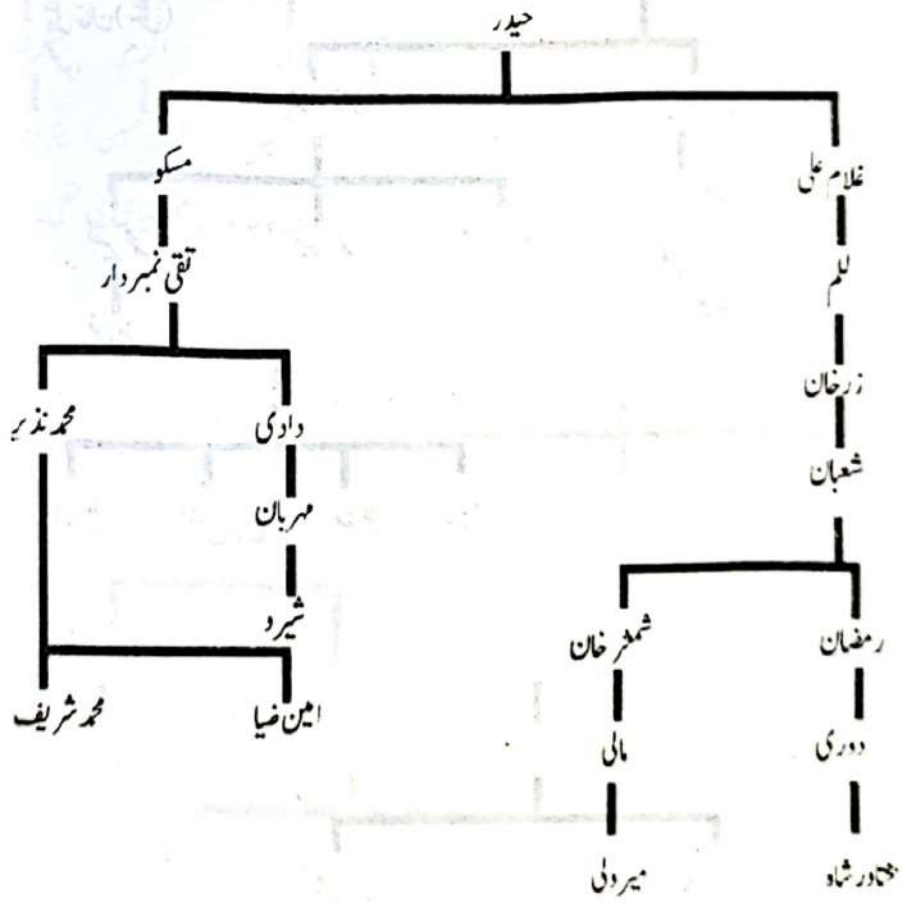
محمد پناہ نمبردار میرے والد محترم کے دوست کا شجرہ



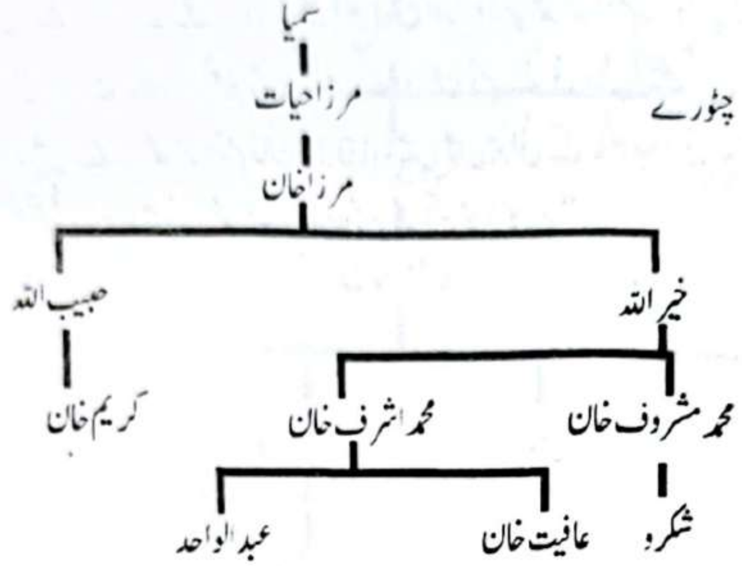
تیفون استاد کا شجرہ



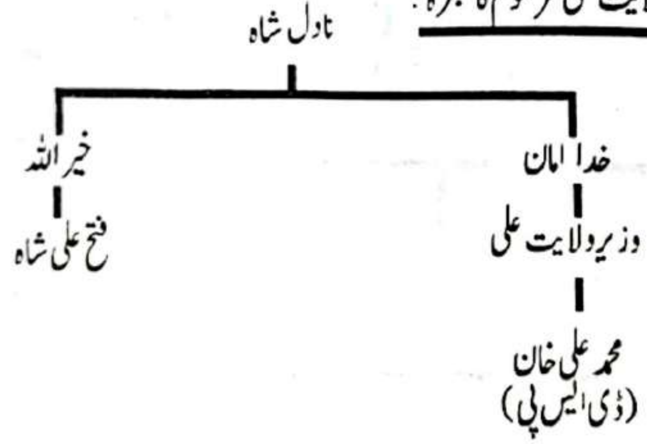
میرے عزیز شاگرد امین ضیا کا شجرہ



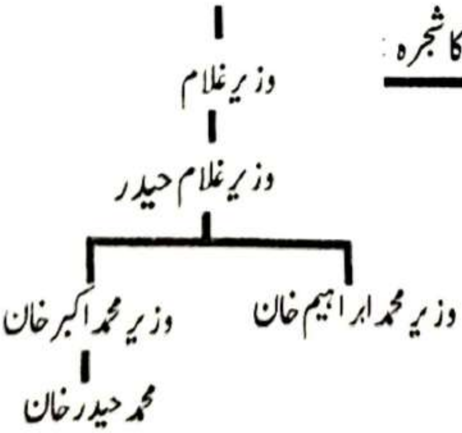
حاجی خیراللہ مرحوم کا شجرہ



وزیر ولایت علی مرحوم کا شجرہ:



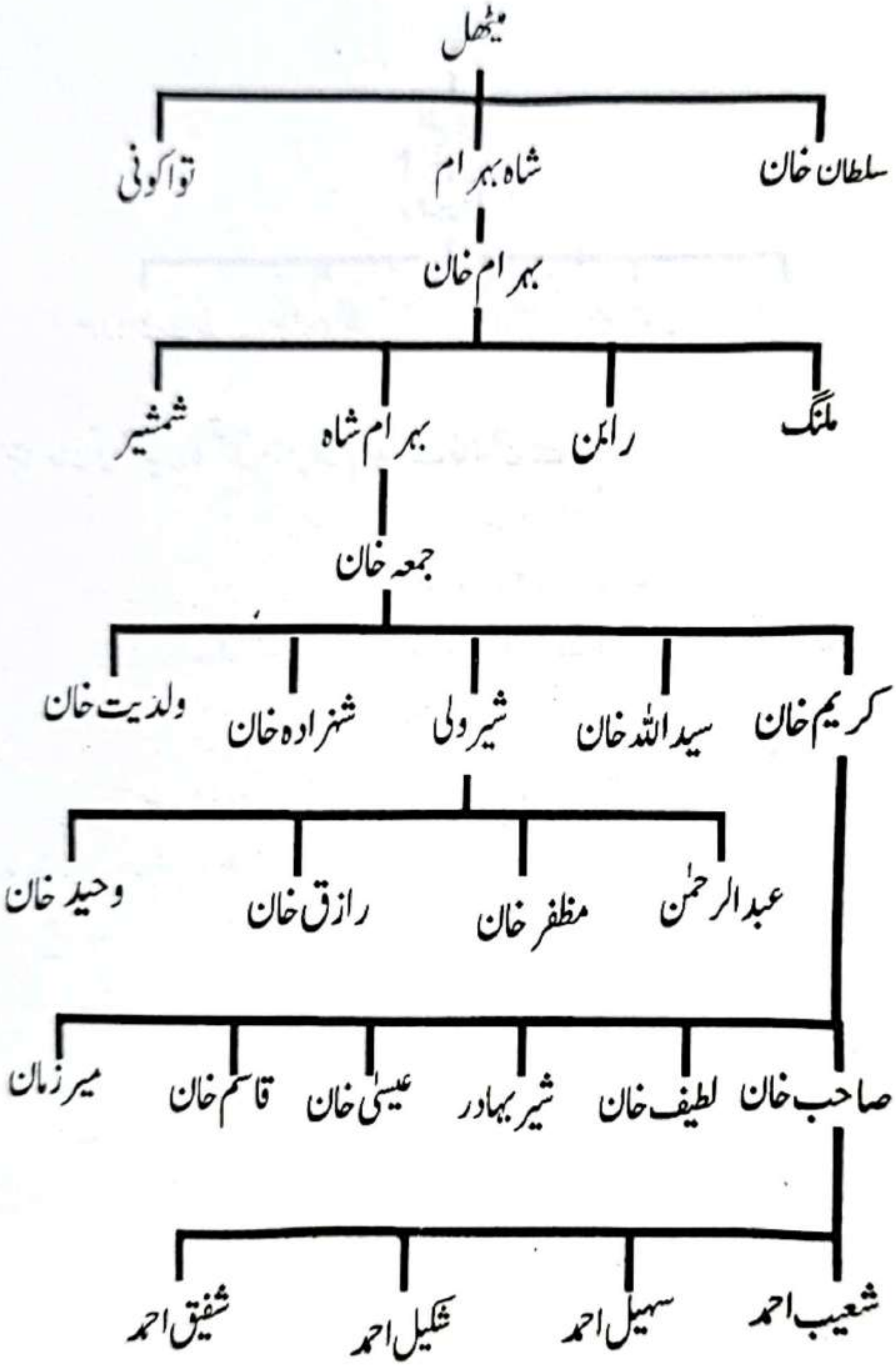
وزیر غلام حیدر کا شجرہ:



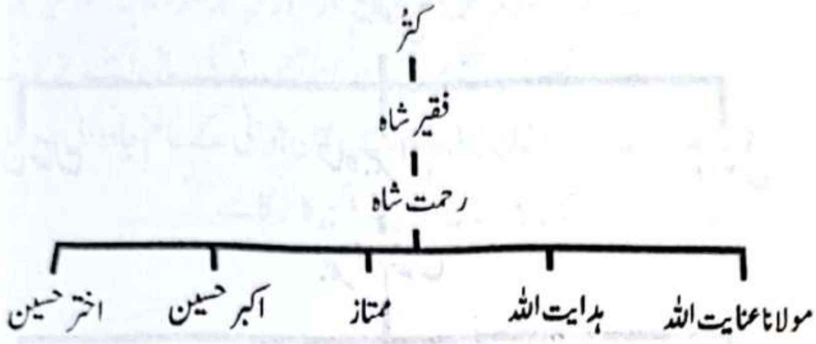
وزیر غلام حیدر کے حوالہ سے والد گرامی کی ڈائری سے یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"وزیر غلام حیدر گلگت کا ایک نامور آدمی تھا۔ 1930ء میں اُن کی وفات دینور میں
ہوئی۔ اس کے دو لڑکے تھے۔ وزیر محمد اکبر خان اور وزیر محمد ابراہیم۔ وزیر محمد ابراہیم
میرے جگری دوست تھے۔ کشمیر میں تعلیم کے دوران ہم نے کئی سال اکٹھے گزارے۔ یہ
دن ہمیشہ یاد رہیں گے۔ محمد ابراہیم خان 1936ء میں عین جوانی کے عالم جاودانی سدھارے۔
اللہ ان پر رحم کرے۔ آمین۔ محمد حیدر خان وزیر محمد اکبر کا لڑکا ہے"

صاحب خان ولد کریم خان ساکن سکوار کا شجرہ۔



میرے عزیز شاگرد ممتاز خان آف گوہر آباد کا شجرہ



ممتاز خان کی ننھیال کا تعلق وزیر غلام حیدر کے خاندان سے تھا۔

باب 13

کمین (کرمین)

مختی کو کمین کہتے ہیں : بے ایمان کو ذہین کہتے ہیں
کتنے نا سمجھ لوگ ہیں : بے حیا کو حسین کہتے ہیں

میں سابقہ ابواب میں واضح طور پر ثابت کر چکا ہوں کہ شین، یشکن، کمین (کرمین) تین الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کے خدوخال جدا جدا ہیں۔ ان کے رنگ مختلف ہیں۔ ان کی قدیم معاشرتیں مختلف تھیں۔ ان قوموں کے درمیان خطوط متارکہ قائم تھے ان کے درمیان معاشرتی قدغنیں اور ایسی سخت بندشیں رائج تھیں کہ جن کی وجہ سے معاشرتی نظام اونچ نیچ کا شکار تھا۔ مختلف خانوں میں بٹے ہونے کی وجہ سے باہم عداوتیں عام ہو گئی تھیں۔ کوئی کسی کی بڑائی قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ ہمارے لوگوں کا قدیم معاشرہ بکھرا ہوا تھا۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس، انسان نے انسان کو غلام بنا رکھا تھا۔ انسانوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر ناجائز کو جائز، ناروا کو روا اور جھوٹ کو سچ بنا دیا تھا۔ مساوات، انسانی ہمدردی، رحم وغیرہ سے یہ معاشرہ عاری تھا۔ شمالی علاقہ جات کے جنوب کی طرف کوہستان، ناروال (سوات)، گریز (استور) علاقوں میں آریوں کی آمد کے ساتھ انسانوں کی تقسیم بھی آ گئی تھی۔ حالانکہ آریوں کے ابتدائی جتھے جو افغانستان سے سوات کی طرف سے آئے اور پشاچہ کہلاتے تھے۔ ان میں کسی ذات پات کی تقسیم موجود نہ تھی۔ جب آریوں کے دوسرے قافلے شمالی ہند و پاک کی سر زمین سے گزر کر کوہستان اور سوات کے علاقوں میں داخل ہوئے تو وہ ذات پات کی تقسیم بھی ساتھ لائے۔ یہ معاشرہ کچھ وقت کے بعد واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ ایک شین اور دوسرا کمین۔ اُن ابتدائی ایام میں یہاں یشکنوں کی کوئی اصطلاح موجود نہ تھی۔

شینوں کے بارے میں آگے تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ یہاں کمین قوم کے بارے

میں ماہرین عمرانیات النسہ، مورخین وغیرہ کی رائے پیش کر کے میں اپنی رائے بھی دونگا۔

جب آریا اس ملک میں آئے تو کافی عرصے تک یہاں ذات پات کی کوئی تقسیم موجود نہ تھی۔ اُس وقت ہند میں دو قسم کے لوگ تھے۔

1۔ باہر سے آئے ہوئے آریا۔

2۔ اس ملک کے اصلی باشندے جو سیارنگ تھے۔ جسے حقارت سے داسیو کہا جاتا تھا۔

ذات پات کی تقسیم بعد میں عمل میں آئی اور پھر چار ذاتیں بنیں۔

1۔ برہمن

2۔ کھشتری

3۔ ویش

4۔ شوردر جس کا سابقہ سطور میں تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر لٹز اپنی کتاب دردستان ان 1866 - 1886 - 1893 میں اس ذات کے لیے لفظ کمین کے بجائے کرمین استعمال کرتا ہے۔ اور اسے ادنی ذاتوں میں درجہ بند کرتا ہے۔ اور انھیں ایک سوالیہ علامت کے ساتھ چمار نشان زد کرتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی اپنی کتاب دی ہسٹری میں نارورن ایریاز میں لکھتے ہیں۔ یہاں کی آبادی بہت پہلے سے چار ذاتوں شین، یشکن، کمین اور ڈوم میں بٹی ہوئی تھی۔ فاضل مصنف پھر کہتے ہیں کہ یشکن جو مالکان زمین ہیں اور کمین جو پہلے فنکار تھے اور اب زیادہ تر غریب کسان ہیں۔ شاید یہاں کے اصلی باشندے ہوں۔ چونکہ ایسے ہی گروپس ان ناموں کے ساتھ پنجاب میں موجود ہیں۔ کمین (کرمین) میں شاید بدیسی عنصر موجود ہے۔ پروفیسر صاحب پھر اپنی کتاب چلاس دی سٹی آف نانگا پربت (دیامر) میں لکھتے ہیں کہ چلاس کی عام تاریخ شین، یشکن اور کمین کی کہانیوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ ان میں سے کمین جو عملی طور پر بے زمین اور مزدور ہیں ادنی ترین قوم ہے۔ میرے بھائی رازدل کوہستانی کہتے ہیں کہ انڈس کوہستان میں جو کمین کولی، پالس اور جل کوٹ میں ہیں وہ شینوں کے روایتی تنظیمی ڈھانچہ میں ضم ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں ان کا پنجاب کے کمی سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کمین کو غیر آریا قرار دیئے جانے کے حوالے سے سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ غیر آریا ہیں تو ان کی زبان میں غیر آریائی عناصر بھی موجود ہیں یا کہ نہیں؟۔

کارل جٹ مار اپنی کتاب بلور اینڈ دردستان (صفحات 40-41) لکھتے ہیں کہ کمین اور

ڈوم دردستان سے باہر بھی ملتے ہیں۔ کمین کی اصطلاح پنجاب اور دریائے سوات اور کابل کے درمیان ایک ادنیٰ قوم کو کہتے ہیں۔ ڈوم ایک بڑے علاقے میں موجود مراثیوں کا عام نام ہے۔ اس بات کی یقینی نشانیاں ہیں کہ یہ دونوں قومیں جنوب کی طرف سے آئیں۔ اصل آبادی کے مقابلے میں ان کے خدوخال سیاہ اور یہ دبلے پتلے جسموں کے مالک ہوتے ہیں۔

رُتھ لیلیٰ شمٹ شینابولنے والے عمرانی سروے میں رائے دیتی ہیں کہ کوہستان میں کمین کی اصطلاح تمام بمیر شین اقوام از قسم یشکن، گوجر آہیر جولاہے اور ڈوم کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

ٹھاکر سنگھ مہتمم بندوبست تحصیل گلگت کے بندوبستی رپورٹ مرتبہ 1916ء میں لکھتے ہیں۔ شینوں اور یشکنوں کے درمیان مختلف تعداد میں سید، پیرزادہ، کمین، ڈوم اور کشمیری رہتے ہیں۔ یہ تمام درجے میں کمتر ہیں سوائے سید کے جس کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ سید راجہ اور رانو کی لڑکیاں بیاہ لیتے ہیں لیکن اپنی لڑکیاں ادل بدل نہیں کرتے۔ سید کی لڑکی سید کے ساتھ ہی بیاہی جاتی ہے۔ کمین زیادہ تعداد میں ہیں۔ ان کی کسی خاندان میں بھی شادی نہیں ہوتی۔

امیر سنگھ مہتمم بندوبست 94-1893ء کی اولین بندوبست میں رپورٹ مُرتب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ " یہ سب قوام یشکن، شین وکشمیری وکمین وگوجر و رونوں و سید و مچھون و فقیر زراعت پیشہ ہیں۔" امیر سنگھ تحصیل گلگت میں مختلف آسامیوں کے پاس زیر قبضہ مزروعہ زمین کی تفصیل اس طرح پیش کرتے ہیں۔

1۔	رونوں	1.00%
2۔	یشکن	59.8%
3۔	شین	15.8%
4۔	کشمیری	9.3%
5۔	مچھون	0.10%
6۔	گوجر	1.3%
7۔	کمین	8.9%
8۔	راجہ برس (برشے)	0.10%
9۔	سید	0.70%

10۔ نقیر 0.30%

11۔ مغلوٹو 1.60%

فریڈرک ڈریو اپنی کتاب دی جموں اینڈ کشمیر ٹریٹریز میں پہلے فضیلت کے اعتبار سے اس طرف موجود مختلف اقوام کو اس طرح درجہ بند کرتے ہیں۔

1۔ رونو

2۔ شین

3۔ یشکن

4۔ کرمین

5۔ ڈوم

پھر وہ کہتے ہیں کہ کرمین ہند کے کہارز کی طرح کے فرائض سر انجام دیتے ہیں۔ (یعنی کوزہ گر، چکی پھیرا، حمال وغیرہ) اس طرح وہ حیثیت میں ہند کے سودراز کے ہم مثل ہیں۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ان کا ماخذ ایک ہو۔ یہ لوگ (کچھ مخلوط خون کے ساتھ) قدیم اصل باشندوں اور ان پر غلبہ پانے والوں کی اولاد۔ گلگت میں ان لوگوں کی معمولی تعداد ہے۔ ڈاکٹر ناموس گلگت اور شینا زبان میں لکھتے ہیں۔ " زمینداروں کی بستی میں چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ مثلاً لوہار، ترکان، جلاہے یعنی زمیندار کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ یہ لوگ کام کرتے ہیں اور کمی یعنی کام کرنے والے کہلائے۔ گلگت خاص میں ان کی تعداد قلیل ہے۔ یہ لوگ مختلف کام کرتے ہیں۔ لوہار، ترکان، کمھار، نائی، دھوبی وغیرہ۔ ان کو ذات میں گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ ان کے خون میں زیادہ آمیزش قدیم اصلی باشندوں کی ہے جیسے کہ ہندوستان کے شودر ہیں۔ رنگ و روپ کے لحاظ سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کا تعلق جاہلیت کے دور کے اصل لوگوں سے ہے۔ شاید اصل شین آریا حملہ آوروں کے ساتھ ہندوستان سے چند شودر ساتھ آگئے ہوں۔ اور وہ اب تک کمی پیشہ میں مصروف ہیں۔ ملٹری رپورٹ مرتبہ جنرل ساف انڈیا (1927ء) میں لکھا گیا ہے۔ کہ کمین، ڈوم اور شاٹوز سب ادنیٰ ذاتیں اور یہ ہند کے کہار کے ہم پلہ ہیں۔ یہ لوگ داریل اور چلاس میں زیادہ تعداد میں ہیں۔ ہنزہ اور نگر میں یہ لوگ موجود نہیں۔

کرنل ڈیورنیڈ دی میکنگ آف اے فرنیٹر میں لکھتے ہیں۔ رونو کے بعد شین اور ان کے بعد یشکن اور آخر میں ادنیٰ ذاتوں کا ایک گروہ آتا ہے۔ جس میں کرمین، ڈوم وغیرہ آتے

ہیں۔ جیسے چکی پھیرے، کمھار، مراثی وغیرہ۔

بڈلف اپنی کتاب "ہندوکش کے قبائل" میں لکھتے ہیں کہ کرمین جن میں چکی پھیرے اور کمہار وغیرہ ہیں۔ داریل میں بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ ہنزہ و نگر میں یہ کوئی نہیں۔ یہ کسی اور ذات میں شادی نہیں کرتے۔ ان کا نام فارسی کے لفظ کمین سے اخذ کردہ ہے جس کے معنی اسفل کے ہیں۔ مسٹر شا اپنے مقالہ "تبت میں بھٹکے آریا" میں یہ فکر دیتے ہیں کہ یہ لفظ کروم سے بنا ہے جس کے معنی کام کے ہیں۔

کمین (کرمین) اقوام کے بارے میں ماہرین النسہ و عمرانیات آثار قدیمہ کے خیالات پیش کیئے گئے۔ ان کے مطابق۔

1۔ اس قوم کو کمین اور کرمین دو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

2۔ علماء، مورخین، ماہرین عمرانیات نے انھیں ادنیٰ ترین ذاتوں میں درجہ بند کیا ہے۔

3۔ شمالی علاقہ جات اور کوہستان میں چار ذاتی (نسلی) نظام یعنی شین، یشکن، کرمین اور ڈوم منوشاستر کے چار ذاتی نظام کے برابر پیش کیا گیا ہے۔

4۔ یہ بے زمین ہیں۔ (پروفیسر دانی)

5۔ کمین (کرمین) میں بدیسی عنصر موجود ہے۔ (پروفیسر دانی)

6۔ ادنیٰ ترین ذات ہے چمار۔

7۔ کمین کا پنجاب کے کمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر یہ غیر آریا ہیں تو غیر آریائی لسانی اثرات دیکھے جانے چاہئیں۔

8۔ کمین دردستان سے باہر بھی ملتے ہیں۔ پنجاب میں کمین کی اصطلاح ادنیٰ قوم کو کہتے ہیں۔ جو فنکار اور معمولی کسان ہیں۔

9۔ کمین اور ڈوم جنوب کی طرف سے آئے۔

10۔ ان کے خدوخال سیاہ ہیں۔ اور یہ دبلے پتلے جسم رکھتے ہیں۔

11۔ کوہستان میں شین کے علاوہ تمام قوموں کو خواہ وہ یشکن ہیں۔ گوجر ہیں لوہار ہیں۔ جولاہے ہیں یا ڈوم کمین استعمال ہوتا ہے۔

12۔ پیرزادہ، کشمیری، کمین اور ڈوم بھی کمتر قومیں ہیں۔

13۔ یہ مالکان زمین ہیں۔ اور گلگت مین 8-9% زمین اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔

14۔ کرمین ہند کے کہار کے ہم پلہ ہیں جو کوزہ گری عام چکی پھیروں اور حمال کا کام

کرتے ہیں۔

15۔ کرمین لوہاری، نائی، دھوبی، بڑھئی گری، موچی گری، چکی پھیری، مراثی اور حمالی کے کام کرتے ہیں۔

16۔ یہ ہندوستان کے شودر ہیں۔ ان کے خون میں زیادہ آمیزش قدیم اصلی باشندوں کی ہے۔

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ جب آریا کوہستان میں آئے تو اُن کا معاشرہ شین آریا اور کمین دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمین زیردست نظام کا حصہ تھا۔ کمین لوگ مالکان زمین نہ تھے۔ لیکن یہ بہت سے کام کر کے اُس وقت کے معاشرتی نظام کو سنبھالے ہوئے تھے۔ شین اور کمین کا چولی دامن کا ساتھ رہا لیکن کمین اور یشکن کبھی اتنے قریب نہیں رہے۔ جس طرح شینوں کا زور جنوب کی طرف رہا اسی طرح کرمنوں کا زور بھی جنوب کی طرف رہا۔ شمال کی طرف جہاں یشکن قبائل کثرت سے ہیں۔ وہاں کمین بعض مقامات پر سرے سے موجود ہی نہیں اور جہاں کہیں موجود ہیں۔ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شین یا تو کمین اپنے ساتھ لائے یا جن مقامات پر شینوں کا اجتماع ہوا۔ وہاں کمینوں کا معاشرہ تخلیق ہوا۔

میں یہ بھی واضح کر چکا ہوں کہ پشاچہ آرین تھے اور یہ وہ لوگ تھے جو افغانستان کی طرف سے قریبی راستوں سے گزر کر سوات اور کوہستان میں آئے اور کشمیر تک پہنچے اور یہ دردی آریائی زبانوں کے ابتدائی خالق تھے۔

انھوں نے پشاچہ زبانوں کے سانچے بچھائے۔ میں ڈاکٹر ماموس کی اس تھیوری سے اتفاق نہیں کرتا کہ قدیم زمانے میں گلگت اور کشمیر میں ناگ قوم آباد تھی۔ اور جو شین قافلے بارہویں صدی عیسوی میں جل کوٹ، چلاس، گلگت میں داخل ہوئے۔ انھوں نے قدیم ناگاؤں سے لڑائیاں کر کے ان کو پہاڑوں میں دھکیلا۔ یہی ناگا لوگ سنسکرت لٹریچر میں پشاچہ کہلائے۔ اس میں کوئی شک نہیں ناگا قبائل کشمیر میں تھے اور یہ سانپوں کی پرستش کرتے تھے لیکن ناگ قبائل اور پشاچہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

ڈاکٹر گستاؤلی بان ناگ قوم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ وہ قوم ہے جس کا نام رامائن میں آیا ہے اور اُنھوں نے جنوبی ہند کے فاتحین کو آگے بڑھنے سے روکا تھا۔ کچھ عجب نہیں جو ان کا تعلق پروٹو ڈراوڈ اقوام سے ہو کیونکہ یہ بالکل سیاہ فام ہیں۔ یہ ایک جنگجو اور بہادر قوم

ہے۔ گلگت کے قدیم قبائل بروشو کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ یہ لوگ تورانی الاصل (مغل) زرد فام لوگ تھے۔ ناگاؤں کے بارے میں ڈاکٹر جے۔ پی۔ ایچ وجل سنسکرت کے پروفیسر انڈین سارنیٹ لور میں لکھتے ہیں کہ متھرا اور اس کے ارد گرد ناگا قوم آباد تھی۔ یہاں اور نیپال کی طرف زہریلے سانپوں کی پرستش کی جاتی تھی۔ اس طرح بہت سے گونڈ سردار اس بات کا اظہار کرتے تھے۔ کہ وہ ناگا وماکا Naga vamaca کی اولاد ہیں۔ آسام کے وادی سرما میں پہاڑیوں کے نام ناگا ہلز (Naga Hill) مشہور ہیں۔ فلاپین (Philippine) کے ایک صوبے کا نام بھی ناگا ہے۔

ایسا لگتا ہے کشمیر میں بھی کچھ ناگ قبائل آ گئے ہوں لیکن گلگت میں ان کا نام و نشان نہ تھا۔ اور پھر جب پشاچہ باہر سے آئے تو کشمیر میں ناگ قبائل موجود تھے۔ جو پشاچہ کشمیر میں گئے۔ انھوں نے ناگ قبائل کو مغلوب کیا اور کشمیر کی آباد کاری میں حصہ لیا۔ کچھ ناگ قبائل پشاچہ میں ضم ہوئے اور کچھ ہماچل پردیش کی طرف چلے گئے۔ گارساں دتاسی کہتے ہیں کہ یہ لوگ درختوں اور سانپوں کی پرستش کرتے تھے۔ ان ہی کو قدیم کشمیر میں "ناگ" قوم کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

اب ہم یہاں کوہستان میں آریوں کی آمد سے پہلے صورت حال پر غور کرتے ہیں۔ شین جب کوہستان میں آئے تو ایسی صورت ہو سکتی تھی۔

1۔ یہاں کوئی قدیم قوم آباد تھی جسے شینوں نے مغلوب کیا اور انھیں کمین کا نام دیا۔

2۔ آریوں کے ساتھ شودر آ گئے ہوں جنھیں کمین کہا گیا۔

3۔ آریوں کے ساتھ کچھ دراڑا یا ہندوستان کی قدیم قومیں مثلاً کول، منڈا، گونڈ قبائل آ گئے ہوں جنھیں کمیں کہا گیا۔

4۔ آریوں کے آنے سے پہلے دراوڑ، کول، منڈا، گونڈ قبائل یہاں آ گئے ہوں۔

اب ہم ان مفروضوں پر بحث کریں گے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے آنے والوں میں نگریٹو لوگ تھے۔ یہ افریقہ کے حبشی تھے۔ جو مکران (سندھ) اور ساحلی علاقوں پر آباد ہو گئے۔ مکرانی لوگ ان ابتدائی نسلوں کے علمبردار ہیں۔ ان کے بعد بحیرہ روم کی طرح سے آسٹرک قومیں آئیں جو شمالی اور وسطی ہندوستان میں آباد ہوئیں۔ ہندوستان میں آنے والے تیسرے گروہ کا تعلق دراوڑوں سے تھا۔ یہ بھی بحیرہ روم کی طرف سے آئے اور یہ ابتدا سندھ کی طرف بسے اور پھر آہستہ آہستہ شمالی ہندوستان بشمول کشمیر وغیرہ میں پھیل گئے۔

دراوڑوں کے بارے میں اس کے علاوہ بھی کچھ نظریات ہیں۔ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دراوڑ آسٹرک اور نیگرو قبائل کے اختلاط سے پیدا ہوئے ہوں۔ بعض انھیں تورانی الاصل قرار دیتے ہیں۔ رشید اختر ندوی ایچ جی۔ ویلز کی اس روایت کو بہت زیادہ قرین قیاس قرار دیتے ہیں کہ دراوڑ اور عراق کے سومیری قبائل ہم نسل ہیں کیونکہ ان میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان بھی کچھ ایسا ہی کہتے ہیں کہ قوم ڈراویڈ ملک ہند کے قدیم باشندوں اور ان اقوام زرد رنگ کے میل سے بنی ہے جو برہم پتر کی طرف سے ہندوستان میں آئیں۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان دراوڑوں کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں۔

1۔ اولاً جن میں اصلی باشندوں کا جز غالب ہوا ان کو پروٹوڈراویڈ کہتے ہیں۔

2۔ ثانیاً وہ جو پروٹوڈراویڈ اور تورانی اقوام کے میل سے بنی ہیں۔

ڈاکٹر گستاؤلی بان پھر کہتے ہیں۔ اگرچہ ڈراویڈی اقوام کو ایک متحد اور متصل الاجزا قوم نہیں کہہ سکتے لیکن ان کی تقسیم صرف زبانوں کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ یہ کل اقوام تمدن کے میدان میں آچکی ہیں۔ انھوں نے برہمنی مذہب اختیار کر لیا اور ذات کے لحاظ سے کل کی کل اس طبقے میں شامل ہیں جس کو شودر کہتے ہیں۔ ابو امام وغیرہ ان ہی اقوام کے بارے میں کہتے ہیں کہ گویا یہ تہذیب (سندھ کی تہذیب) سمیری تہذیب اور دو مصری تہذیبوں سے بدرجہا زیادہ وسیع تھی۔ بحیرہ روم کے لوگوں نے جن قدیم زمانے کے آسٹریلیائی نما لوگوں کا کچھ حصہ بھی شامل تھا۔

نیز منگولوں اور آپیوں نے ایک حکومت قائم کی جس نے عوام کی زندگیوں میں بہتر طریق پر نظم وضبط پیدا کیا۔ آسٹریلیائی اور بحیرہ روم سے آنے والی قوم (دراوڑ) نے ایک ارفع و اعلیٰ تہذیب کو جنم دیا تھا۔

ضیاء شاہد اردو ڈائجسٹ سال نامہ 1996ء میں لکھتے ہیں۔ موئن جوڈارو کے کھنڈرات سے جو لاشیں ملی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ سندھ کی قدیم ترین قومیں کول، سنتھال اور بھیل ہیں۔ دراوڑ بعد میں یہاں آئے۔ جنگ 3 جون 1983ء وادی سندھ کے قدیم باشندے کس نسلی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کے عنوان سے شیخ عزیز لکھتے ہیں۔ "ان کھوپڑیوں پر جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا یہ کسی ایک نسلی گروہ سے متعلق نہیں تھیں بلکہ ان کا تعلق چار بڑی نسلوں سے تھا۔ آسٹریلوی، الپانوی، بحر کیپئی، مڈیٹرینین، کسپرس، سندھ کی قدیم نسل کو ہند آریائی نسل کہنے کے بجائے ہند کیپین نسل قرار دیتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ

بھی ہے کہ نسل آریائی سے قبل شمالی ہندوستان کے تمام علاقوں میں پھیل گئی تھی۔ جن کو آریاؤں نے بعد میں دراوڑ کہنا شروع کر دیا۔ چاہے وہ براہوی نسل کے قبائل ہوں یا آسٹریلیوی نسل کے۔

ڈراویڈن کے بارے میں ہیوکنیڈی کہتے ہیں۔ یہ لوگ پنجاب کے بالائی میدانوں، وادی کشمیر اور سندھ کے کناروں کی طرف بڑھے تھے۔ یہ لوگ تبت یا چین کے رہنے والے تھے۔ اور یہ اس درجہ مہذب تھے کہ ہندوستان کے دوسرے آباد کاروں نے ان کی تہذیب کو اپنایا تھا۔ پروفیسر اے۔ جی۔ راہن کہتے ہیں۔ کہ وہ سب قبائل دراوڑ ہیں جو دراوڑی زبانیں بولتے ہیں۔ یہ باہر کے لوگ تھے اور ان کے میل جول سے ایک مخلوط نسل پیدا ہو گئی تھی اور یہی مخلوط نسل آرین کی آمد کے وقت یہاں موجود تھی۔

بہر حال ہندوستان میں آریوں کے آنے سے پہلے نگریٹو آئے پھر آسٹرک آئے اور پھر دراوڑ آئے۔ جب آریا آئے ہندوستان کی یہ تمام قومیں دراوڑ کے نام سے معروف ہوئیں اور یہ نام اُنھیں آریوں نے دیا۔ ویدک گیت گانے والوں نے دراوڑوں کو کچا گوشت کھانے والی قوم قرار دیا۔ انھیں بے دیوتا کہا۔ انھیں بے ناک کی مخلوق کہا کیونکہ ان کی ناک چھوٹی اور نتھنے بڑے تھے۔ موئن جوداڑو کی تہذیب بڑی ترقی یافتہ تھی۔ یہ تہذیب سمیری اور مصری تہذیبوں سے زیادہ وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کہتے ہیں یہ تہذیب پانچ لاکھ مربع میل کے رقبے کو احاطہ کی ہوئی تھی۔ (سات دریاؤں کی سرزمین از ابن حنیف) آریاؤں نے شائستگی اور تہذیب میں رچے بسے قدیم پاکستانیوں کو ملیچھ (ناپاک) داسو (غلام) اور راکشس (شیطان) جیسے نام دیئے ہیں۔

جب آریوں نے ان شائستہ اقوام پر غلبہ پایا تو انھیں غلام بنا دیا۔ کچھ لوگ جنوب اور شمال کی طرف بھاگ چکے تھے۔ جو باقی رہے اُن کے ساتھ سخت برتاؤ روا رکھا گیا۔ ابھی ذات پات کی تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی۔ اس وقت ہندوستان میں صرف دو قومیں وجود رکھتی تھیں۔

1۔ آریا

2۔ دراوڑ

لیکن جب ذات پات کی تقسیم شروع ہو گئی تو معاشرہ چار ذاتوں میں بٹ کر رہا۔

1۔ برہمن (آریا)

2۔ کھشتری (آریا)

3۔ ویش (آریا)

4۔ شودر ان میں درج ذیل لوگ شامل تھے۔

1۔ دھرم سے گرے ہوئے آریا۔

2۔ ہندوستان کی قدیم ذاتیں۔ دراوڑ، کول، گونڈ، بھیل وغیرہ۔

معلوم ہوا شودروں میں دھرم سے گرے ہوئے آریا بھی شامل تھے۔ مہذب شائستہ اقوام بھی جن کو آریوں نے غلبہ حاصل کر کے اپنا غلام بنالیا تھا۔

دراوڑا اقوام کے بارے میں بیشتر ماہرین عمرانیات کی یہی رائے ہے کہ یہ بحیرہ روم کی طرف سے آئی ایک قوم تھی۔ اور اسی رائے سے میرا بھی اتفاق ہے۔ یہ قوم نہ چینی الاصل تھی۔ اور نہ تورانی الاصل اور نہ یہ تبت کی طرف سے آئی کوئی قوم تھی کیونکہ دراوڑ اور تورانی الاصل اقوام کے خدوخال کا واضح فرق تھا۔ کروک (Crooke) اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ منگولوں کی سب سے اہم طبیعی خصوصیت جو انھیں آرین اور دراوڑ سے جدا کرتی ہے۔ وہ منگلوں کے چوڑے سر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دراوڑ اور منگول دو الگ الگ نسلیں ہیں۔ دراوڑ منگول نہیں اور منگول دراوڑ نہیں۔

ان تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آریاؤں سے پہلے یہاں آسٹرک، نگریٹو اور دراوڑ قومیں موجود تھیں۔ اور یہ قومیں شمال کی طرف سوات، کشمیر، ہزارہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جب آریوں کے اولین دستے پشاچہ کی صورت میں یہاں آئے تو ان اقوام کو مغلوب کرنے اور اپنا مطیع بنانے میں انھیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ پشاچہ اقوام ان علاقوں میں پھیل گئے۔ یہ بات یاد رہے کہ ان اقوام میں ذات پات کی کوئی تقسیم موجود نہ تھی لہذا یہاں کسی کمتر ذات کا وجود بھی نہ تھا۔ لیکن جب آریوں کے بعد کے جتھے شمال کی طرف آئے تو یہ ذات پات کے سخت نظام سے گزر کر آئے تھے۔ لہذا اُنھوں نے یہاں ذات پات کا وہی نظام قائم کیا جو ہند میں موجود تھا۔ یہاں مغلوب ہونے والی قوموں میں پشاچہ، دراوڑ، آسٹرک وغیرہ سبھی قومیں تھیں۔ آریوں نے ان ہی قوموں کو کمین کہا۔ یاد رہے یہاں اس وقت کسی یشکن، گوجر، لوہار قوم کا وجود نہ تھا۔ لہذا ان تمام کو "کمین" قرار دینا کا نظریہ حقائق سے لگا نہیں کھاتا۔

پھر جہاں تک شودروں کا سوال ہے۔ جس کڑے معاشرتی نظام سے یہ گزرے

تھے۔ ایسا نہیں لگتا کہ یہ بھی آریوں کے جھتوں کے ساتھ شمال کی طرف آگئے ہوں۔ اگر ایسا ہو تا تو ان علاقوں میں شودر نام کا اجرا بھی ہو تا۔ جبکہ یہ نام یہاں کی کسی قدیم یا جدید تاریخ میں نہیں ملتا۔ اس طرح یہاں آریوں نے جن اقوام کو کمین کا درجہ دیا ان میں۔

1۔ نگریٹو

2۔ آسٹرک

3۔ دراوڑ

4۔ پشاچہ۔ شامل تھے۔

حالانکہ پشاچہ ان کے ہم جنس بھی تھے۔ پھر وقت کے ساتھ یہاں چار نسلی نظام وجود میں آیا۔ اب دیکھنا یہ ہے اگر درواڑ اقوام یہاں موجود تھیں۔ پشاچہ آئے اور پھر آریا جتھے آئے تو کیا یہاں دراوڑی زبان کے اثرات بھی موجود تھے ؟ اس حوالے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہاں دراوڑی لسانی اثرات موجود تھے۔ ماہر لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ ہند آریائی زبانیں بلکہ سنسکرت بھی دراوڑی زبانوں سے بہت حد تک متاثر ہوئیں۔ دراوڑی کے بہت سے الفاظ مثلاً کوٹ (قلعہ)، کیٹا (چھونپڑی)، پورب (مشرق)، پچھم (مغرب) وغیرہ اور بے شمار الفاظ ہند آریائی زبان میں آئے۔ کوہستان، سوات، گلگت، چلاس بھی یوں متاثر ہوئے۔

کمین میں بدیسی عنصر کے موجود ہونے کا نظریہ کوئی خاص وقعت نہیں رکھتا کیونکہ کوئی قوم بھی خالص دیسی یا بدیسی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ یہ سب قومیں ادھر اُدھر سے آئیں اور پھر صدیوں کے فرق سے بدیسی دیسی ہوئیں اور ہوا، پانی اور مٹی میں ڈھل کر مختلف قوموں کا روپ دھارا۔ آریائی اور غیر آریائی امتزاج اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آریائی زبانوں پر دراوڑی اثرات ہوئے اور دراوڑی زبانوں پر آریائی اثرات ہوئے جس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ماہرین لسانیات بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔

کمین اور کرمین کی اصطلاحات ہزاروں سال پہلے کی ہیں اور انھیں شین آریوں نے جنم دیا۔ یہ سمجھنے کیلئے کونسا لفظ موزوں ہے یا غیر موزوں ان مختلف الفاظ کی تشریح ضروری ہے۔

ڈاکٹر ناموس کہتے ہیں۔ " کمی لفظ کا مادہ کام ہے یعنی کام کرنے والا اس کی جمع کمین ہو گئی۔ پھر کہتے ہیں۔ کمینہ فارسی لفظ ہے۔ اس کا مخفف کمین بنا۔ اس کے معنی گھٹیا ذات کا

آدمی ہے۔ حالانکہ مقصود کام کرنے والا کمی ہے۔"

میرے نزدیک کمینہ۔ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی نیچ، کم رتبہ، ادنیٰ اور اسفل کے ہیں۔ کمین اس کا مخفف ہے۔ اور یہ کسی ذات یا نسل کو ظاہر نہیں کرتا۔ یہ محض ایک لفظ کے لغوی معنی ہیں۔ یہ کسی بھی شخص کو (چھوٹی بڑی ذات کوئی بھی ہو) اس کے سفلہ پن پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ کمین عادات کا مالک ہے۔ اس لفظ کو بطور ذات استعمال نہیں کیا جاسکتا اور نہ کرنا چاہئے۔ اس کی اصلاح ضروری ہے۔

لفظ کمی کا مادہ کام ہے۔ اور مختلف کام کرنے والوں کو کمی کہتے ہیں۔ کمی سے لفظ کمین بنا ہے جس کے معنی کام کرنے والے کے ہیں۔

ہندی میں ایک اور لفظ "کمیرا" ہے جس کے معنی کام کرنے والا، مددگار، معاون، باغبان کے تحت کام کرنے والا مزدور کے ہیں۔ کمی اور کمیرا کام کرنے والوں کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسے بطور ذات استعمال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہر قوم کے لوگ مختلف کام کرتے ہیں اور یوں کمی اور کمیرے کی اصطلاحات بے معنی ہیں۔

شمالی علاقہ جات میں شین حلقوں میں کام کے لیے "کروم" لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے اور یہ ہندی لفظ کمیرا سے اخذ کردہ ہے۔ کروم سے لفظ کرمین بنا ہے۔ یعنی کام کرنے والا ہر کام کرنے والا کرمین کہلا سکتا ہے۔ کسی مخصوص ذات کے لیے اس لفظ کا استعمال درست نہیں۔ اسی طرح شین لفظ "کوم" ہندی لفظ کام سے نکلا ہے۔ کوم اور کروم دونوں ہم معنی ہیں۔ کمین اور کرمین دونوں کے معنی کام کرنے والے کے ہیں اور اس سے کوئی نسل مقصود نہیں۔ ان الفاظ کو اُس لفظ "کمین" یا کمینہ سے جوڑا نہیں جاسکتا جس کے معنی کم رتبہ یا اسفل کے ہیں۔

جہاں تک ان کے بے زمین ہونے کا سوال ہے۔ یہ بات سراسر درست نہیں۔ ابتدا آریوں نے جب یہاں آسٹرک، دراوڑ، پشاچہ وغیرہ اقوام پر غلبہ پایا تو انھوں نے اُن کی زمینیں اپنے قبضے میں لیں اُن کی جائدادوں پر قبضہ کیا اور اُنھیں بے آسرا کیا اور پھر اُن سے مختلف کام لیے اور بڑے عرصے تک اُنھیں جائدادیں بنانے سے محروم رکھا لیکن آہستہ آہستہ "کمیرا" اقوام نے ان علاقوں میں اپنا مقام بنالیا۔ اور جیسے میں نے اعداد شمار پیش کیے ہیں۔ کمیرا اقوام کے پاس اپنی زمینیں تھیں اور ہیں۔ اپنی جائدادیں ہیں۔ اور وہ زراعت پیشہ اقوام کی صف میں شامل ہیں۔ کوہستان کی طرف "کمیرا" قوم اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ یہ بڑے غیور اور

مضبوط لوگ ہیں۔ رازول کوہستانی مختلف مقامات پر ان کی شاخیں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

بشہ۔ شمنائے، انیبگر، جگریے

دریل۔ سردریے، روزیے، ہائیہ

تانگر۔ سلمائے، حریے، رش ملکے

ہرمن۔ مذشیئے، شیائے، ونشائے، بوئیکے، برلیئے

تھور۔ پلے، برائے، نمرزے، بلتے، پھقمرائے، بلنے

شتیال۔ رلیئے، پھتیئے، منکے، چچے، شرپائے۔ لیئے، کریمائے،

کریے، جکبکے

جل کوٹ۔ تھکرہ، رمہ

پالس۔ سترہ، بائرہ

کولی۔ سیسی

یہ بڑے بڑے کرمین قبیلے ہیں اور یہ اپنے اپنے دائروں اور معاشرتی حلقوں میں وہی مقام رکھتے ہیں۔ جو دوسری قوموں کو حاصل ہے۔ یہ قبائل ہماری طرف اُسی نظام معاشرت کا حصہ رہے ہیں جس میں شین، یشکن یا دیگر قبائل رہ رہے تھے۔ ان اقوام میں کوئی امتیازی تفریق نہ تھا۔ اس بات پر تمام مورخین اور ماہرین عمرانیات متفق ہیں کہ کرمین یا کمین قبائل آریوں کی یہاں آمد کے ساتھ وجود میں آئے۔ یہ قبل مسیح زمانہ تھا 1857ء کے بعد ہند میں جو سیاسی تبدیلیاں آئیں اور اس کے نتیجہ میں مغلوں پر جو اثرات ہوئے اُن کا کسی قدیم دور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر ہمارے شمالی علاقہ جات ان تبدیلیوں کی زد میں بھی نہیں آئے کیونکہ یہاں اس سے پہلے کمین یا کرمین قبائل مدتوں سے رہ رہے تھے۔ میں نے سابقہ ابواب میں شینوں کے دور حکمرانی کا ذکر کیا ہے۔ جو گلگت میں 1000ء سے شروع ہو چکا تھا۔ اور شینوں کی رعیت میں کمین یا کرمین قبائل اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس لیے 1857ء یا 1901ء ایکٹ اراضی کے حوالوں سے یہاں کوئی قوم وجود میں نہیں آئی اور کوئی وجود میں نہیں لا سکتا۔

ان تفصیلات سے درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

1۔ کرمین یا کمین کوئی شودر قوم نہیں۔

2۔ کرمین یا کمین کے معنی کام کرنے والے کے ہیں یا کمین یعنی اسفل یا کم رتبہ کے

ساتھ گڈمڈ نہیں کیا جاسکتا۔

3۔ یہ قوم آسٹرک، ڈرویڈی، پشاچہ اقوام سے تعلق رکھتی ہے۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندے آسٹرک کہلاتے تھے۔ اور بعض کے خیال میں دراوڑی بھی اسی براعظم کی مخلوق تھی۔ برصغیر ہند میں اس قوم کی آمد کے بارے میں یہ تھیوری پیش کی گئی ہے کہ کسی قبل از تاریخ دور میں کوئی براعظم وجود رکھتا تھا۔ جو اب بحر ہند میں ڈوب چکا ہے اور اسی براعظم سے یہ لوگ ہند میں داخل ہوئے تھے۔ بعض انھیں بحر روم کے متصل علاقوں کے باشندے قرار دیتے ہیں۔

4۔ چونکہ آسٹرک، نگریٹو، دراوڑی لوگوں کے جنسی اختلاط ہوئے اس لیے ان لوگوں کے خدوخال سیاہ ہوئے۔

5۔ یہ معزز لوگ تھے اور ایک اعلیٰ تہذیب رکھتے تھے۔ یہ عراقی تہذیب کے مماثل تھی۔ یہ تہذیب دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

6۔ آریوں نے جو اجڈ تھے اور تہذیب ناشناس تھے۔ نے ان اقوام پر غلبہ پایا اور انھیں اپنا غلام بنایا اور ان سے مختلف کام لینے لگے۔

7۔ دراوڑی تہذیب اور لسان نے آریاؤں کی تہذیب اور لسان کو بنانے میں بڑا کردار ادا کیا۔

8۔ شمالی علاقہ جات میں آریوں نے انھیں کرمین، کمین اور کمیرے کے نام دیئے جس کے معنی کام کرنے والوں کے ہیں۔

9۔ عام لوگوں نے جنھیں ان الفاظ کی سمجھ نہ تھی کرمین اور کمین کے ہندی الفاظ کو فارسی کے الفاظ کمینہ اور کمین سے جوڑ دیا اور اپنے معنی پہنائے۔

10۔ جس طرح قدیم ہند میں دھرم سے گرے اپنے ہی بھائی ہند آریوں کو شودر بنا دیا گیا تھا۔ اسی طرح کوہستان اور متصل علاقوں میں اپنے ہی بھائی ہند پشاچہ (آریا) کو کرمین یا کمین کا نام دیا گیا۔ جیسے پہلے بیان ہوا پشاچہ آریوں کے ہی اولین دستے کے لوگ تھے جو اس طرف آئے۔

11۔ دراوڑ اور پشاچہ کو کچا گوشت کھانے والی قومیں قرار دیا گیا ہے۔ دونوں میں معاشرتی قربتیں موجود ہیں۔

12۔ بدیسی یا دیسی نظریہ درست نہیں کیونکہ آریا، دراوڑ، آسٹرک تمام بدیسی قومیں

ہیں۔ اور بدیسی عنصر ان تمام میں پایا گیا ہے۔

13- یہ قومیں یہاں جنوب کی طرف سے آئیں۔ اس لیے آج بھی جنوب میں ان کی کثرت ہے۔

14- پیرزادہ، کشمیری قومیں کشمیر سے متعلق ہیں ان کو مقامی ذاتوں میں درجہ بند نہیں کیا جا سکتا لیلیٰ شمٹ کی رائے درست نہیں۔

جیسے میں واضح کر چکا ہوں کہ کمین یا کرمین لفظ جو کام کرنے والے کے معنی دیتے ہیں۔ اس کو فارسی کے کمین یا کمینہ سے جوڑا نہیں جا سکتا۔ لیکن تلفظ ایک ہونے کی وجہ سے بڑا مغالط ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس ابہام کو دور کیا جائے اور چونکہ کام کرنے کی تھیوری اب بے معنی ہو گئی ہے۔ تمام اقوام کے لوگ مختلف کام کرتے ہیں۔ اس لیے اس قوم کو اس کے اصل کے حوالہ سے اظہار کیا جانا چاہئے۔ یہ قوم دراوڑ، آسٹرک کی اولاد ہے۔ اسے "در" قوم کے نام سے لکھا جانا چاہئے۔

لفظ دراوڑ سے در لیا گیا ہے۔ ہندی میں "در" عزت، آبرو اور قدر کے معنی ہیں۔ اس قوم کے شاندار تہذیبی ماضی اور تکریم محنت کے حوالے سے یہ نام انتہائی موزوں بھی ہے۔

باب۔ 14

تراخن، مغلوٹ، گرگس

تراخان، مغلوٹ اور گرگس۔ گلگت، نگر، ہنزہ کے حکمرانوں کے اہم خاندانی سلسلوں کے نام ہیں۔ ان سلسلوں کے حکمرانوں نے ان علاقوں پر کئی سو سالوں تک حکومت کی۔ ان میں نامی گرامی حکمران بھی ہوئے۔ مدبر سیاست دان اور جنگ آزما سپاہی بھی جن کی وجہ سے تاریخ نے کئی رخ بدلے۔ یہاں کی تاریخ کے دو اہم موڑ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ تاریخ بنانے اور بگاڑنے میں کس نے کیا کردار ادا کیا۔ مثلاً شاہ سکندر کا بھائی کریم خان مغلوٹ پہلا شخص ہے جس نے گوہر امان کے خلاف مہاراجہ کشمیر اور سکھوں کی مدد طلب کی۔ سکھوں کی مدد آئی تو آئی لیکن سکھوں نے جب دیوار گری دیکھی تو پھر اُنھوں نے ہماری زمین کے صحن میں راستے بنا لیئے۔

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں راستے بنا لیئے

کریم خان مغلوٹ کے بلاوے کے نتیجہ میں ہم تقریباً ایک صدی تک ڈوگروں اور انگریزوں کے غلام ہوئے۔ ہم پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ہمیں تمام شہری حقوق سے محروم کیا گیا۔ قسم قسم کے آمرانہ قوانین میں جکڑ کر ہمیں پیس ڈالا گیا۔ کریم خان کا خیال تھا کہ سکھ اور ڈوگرے حکومت حاصل کر کے اُنھیں راجگی بخشیں گے لیکن یہ محض خواب و خیال ثابت ہوا۔ سکھ اور ڈوگروں نے اپنی حکومتیں بنائیں۔ اور ہمیں اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ پھر تاریخ کا ایک ایسا موڑ بھی آیا جب اسی مغلوٹ خاندان کے ایک نامور فرد صوبیدار میجر محمد بابر خان نے گلگت سکاؤٹس کی مدد سے ڈوگروں کو یہاں سے نکال باہر کرنے میں کامیابی حاصل کی اور ہم پھر سے آزاد ہوئے۔

اب ہم یہاں کچھ تفصیل کے ساتھ ان خاندانوں کے نسلی پس منظر اور دیگر متعلقہ

امور پر غور کریں گے اور کوشش کریں گے کہ ان پر جو ابہام کی چادر پڑی ہے اُسے بھی اٹھالیں اور ٹھوس بنیادوں کا کھوج لگائیں۔

میں نے گزشتہ ابواب میں پشکنوں، شیوں اور ترا خان حکمرانوں کے جو ادوار متعین کیئے ہیں وہ ٹھوس تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ اس کے لیے میں نے درج ذیل آثار اور بنیادوں کا سہارا لیا۔

1۔ قدیم سفرنامے، تواریخ
2۔ لوک گیت
3۔ قدیم مسودات
4۔ موازناتی تاریخ
5۔ اسلامی تاریخ
6۔ قدیم شجرے
7۔ ماہرین عمرانیات کے انسانی خدوخال کے جائزے۔

شاہ رئیس خان نے اپنی تاریخ میں جو ادوار بتائے ہیں۔ وہ موازناتی تاریخ سے کسی طرح نہیں ملتے۔ اس حوالے سے کافی بحث آگے گزر چکی ہے۔ پروفیسر دانی بھی ان ادوار کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ان میں بڑا فرق موجود ہے۔ اسلام کی آمد کے حوالے سے بھی آگے کافی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ 725ء میں نہ صرف گلگت میں کفر تھا۔ بلکہ یہاں چار طرف کفر کا دور دورہ تھا۔ فاہیان، ہیون سانگ، پنڈت کلہن، حدود العالم کے مصنف البیرونی، مرزا حیدر دوغلت، ڈاکٹر گستاؤلی بان، جٹ مار، پروفیسر دانی، وزیر حشمت اللہ، کنگھم، کاچو سکندر، منشی عزیز الدین، کیپٹن غلام مرتضیٰ وغیرہ کی تاریخیں راجہ شاہ رئیس خان کی تاریخوں سے صدیوں کے فاصلے پر ہیں۔

مثلاً ترخنی دور کے آغاز کے بارے میں تمام مورخیں اور ماہرین عمرانیات اپنی الگ الگ رائے رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن وہ تمام راجہ شاہ رئیس سے بڑا اختلاف رکھتے ہیں۔ مثلاً

1۔ فاہیان 403ء اور ہیوئی چاؤ 726ء کے سفروں کے دوران یہ علاقے ایک ایسی سیاسی قوت کے مالک تھے۔ جب سوات بھی اس قوت کا ایک ماخذ تھا۔
2۔ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں بلور کے حکمران سکردو میں مقیم تھے۔

3۔ اُن دنوں برصغیر میں راج کرنے والے حکمرانوں کے نام موئنیگ، نن ہی، مولائی ہی، وغیرہ تھے۔

4۔ دسویں صدی عیسوی کے آخری دور میں یہاں کوئی باورین شاہ حکمران تھا جو اپنے آپ کو سورج کا فرزند کہتا تھا۔ (حدود العالم)

5۔ گیارہویں صدی عیسوی میں یہاں باور شاہ حکمران تھا۔ شمال کی طرف وخان شاہ، شکنان شاہ وغیرہ حکمران تھے۔ (البیرونی)

6۔ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں اس طرف داردوں کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ 36-1028ء اور 49-1128ء میں داردوں نے کشمیر پر بھی حملے کیئے۔

7۔ تبتیین جب ان علاقوں میں داخل ہوئے تو انھیں شینا بولنے والوں کی بجائے بروشو قبائل سے سابقہ پڑا تھا۔

8۔ دسویں، گیارہویں، بارہویں صدی عیسوی میں راج ترنگنی میں یہاں حکمرانوں کے جو نام ملتے ہیں۔ مثلاً آکلا منگلا، ودیادھرا، مانی دھرا، یشودھرا۔ وہ راجہ شاہ رئیس خان کے کسی نام سے مطابقت نہیں رکھتے۔

9۔ مرزا حیدر دوغلت 29-1528ء کے دوران چھ ماہ یہاں مقیم رہا۔ وہ اس علاقے کو کفرستان قرار دیتا ہے۔

10۔ ایک ہزار صدی عیسوی تک علاقے کا نام بلور استعمال ہوتا رہا۔ پھر یہ نام انتہائی مغربی علاقے کے لیے محدود ہو کر رہا۔ شاید یہ بات اس لیے ہو کہ یہ علاقہ داردوں کے قبضے میں آیا۔ (جٹ مار) میں اس بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ کب اور کس طرح داردوں (شین) نے اس علاقہ پر قبضہ جمایا۔

11۔ شمالی مغرب کی طرف (ہنزہ ملاکر) بدخشان میں بھی بلا امتیاز سارے لوگ اسماعیلی ہیں۔ اُن کے مبلغ شاید پہلے آئے۔ یہ مبلغ زیادہ اہل نہ تھے۔ نگر اور گلگت ان کے مشرق کی طرف شعیت غالب ہے۔ یہ کشمیر اور بلتی راجاؤں کے اثر نفوز کی وجہ تھی۔ یہ سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی کے واقعات ہیں۔ (جٹ مار)

12۔ تین نسلوں سے گور کے لوگ مسلمان ہوئے ہیں۔ (بڈلف)

13۔ ان علاقوں ہنزہ، یاسین، چترال، پونیال اور بدخشان میں اسماعیلی مذہب ناصر خسرو

(998ء تا 1030ء) اور اس کے مبلغین کے ذریعے پہنچا۔ ناصر خسرو محمود غزنوی کے درباری قلمکار تھے۔ (پامیر ناٹ از ذوالفقار خالد)

14۔ گلگت میں 1000ء سے پہلے کسی پرانی قبر کے آثار نہیں ملتے۔ موجودہ گلگت 1200ء تک محض نوپورہ، برمس پر مشتمل تھا۔ موجودہ بازار ایریا اور مرکزی علاقے پانی اور جنگلات سے اٹے پڑے تھے۔

15۔ گلگت میں تیرھویں صدی عیسوی میں اسلام آیا تھا۔ لیکن چھ سو سال بعد یہاں ایک قربان گاہ دریافت ہوا تھا۔ جو Cedar کی شاخوں سے ڈھانپا ہوا تھا۔ یہ گاؤں کے دیوتا کی Shirne تھی۔ جہاں عورتیں عبادت کرنے جاتی تھیں۔
(Jean fairley مصنف شیر دریا سندھ)

16۔ چینیوں کے ریکارڈ کے مطابق چترال بھی بلور کے نام سے موسوم تھا۔
(1790ء چینی امپریئل جغرافیہ)

اوپر جو واقعات بیان ہوئے ہیں۔ یہ تمام 403ء (فاہیان کا سال سفر) سے 1528-29ء (تاریخ رشیدی کے مصنف از مرزا حیدر دوغلت) تک کے واقعات پر محیط ہیں۔ ان میں 643ء (آذر جمشید کی راجگی کا آغاز) سے 1522ء (آغاز حکومت شاہ رئیس اعظم) تک کسی حکمران کا ذکر نہیں ملتا۔ نیز 725ء میں یہاں اسلام کی آمد کا بھی کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اب یہاں مختلف ادوار کا ایک موازنہ پیش کیا جاتا ہے۔۔

1۔ راجہ شاہ رئیس خان 643ء یعنی ساتویں صدی عیسوی سے تراخانی دور حکومت کا آغاز بتاتے ہیں۔

2۔ وزیر حشمت اللہ 1120ء یعنی بارہویں صدی عیسوی سے تراخانی دور کا آغاز مانتے ہیں۔

3۔ میجر جے۔ بڈلف چودہویں صدی سے اس حکمرانی کا آغاز بتاتے ہیں۔

4۔ جنرل کنگھم کا خیال ہے۔ تراخانی دور کا آغاز تیرہویں صدی سے ہوا تھا۔

5۔ فریڈرک ڈریو کے مطابق تراخان جو اس خاندان کا بانی تھا۔ کے بعد اس خاندان کے نو حکمرانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر 30 سال فی نفس عمریں شمار کی جائیں تو تراخان کی حکومت کا آغاز سولھویں صدی میں چلا جاتا ہے۔

6۔ پروفیسر دانی بڈلف اور وزیر حشمت اللہ کے ادوار کا حوالہ دیتے ہیں اور پھر کہتے

ہیں۔ کہ راج ترنگنی اور حدود العالم کے مطابق نویں اور دسویں صدی عیسوی کے دوران اس جغرافیائی مرکز میں ایک ریاست موجود تھی۔ وہ اسے درد شاہی حکومت قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں میں نے کافی تفصیلات آگے پیش کی ہیں۔ یہ یشکنوں کا آخری اور شینوں کا ابتدائی دور حکومت تھا۔ ان کے ساتھ تراخانی حکومت کا کوئی تعلق نہیں۔ حدود العالم، راج ترنگنی، گلگت مسودات، تاریخ ہند (البیرونی) میں اس دور میں کسی تراخانی حکمران، حکومت یا زمین کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔

7۔ جرگن (جرنل آف سنٹرل ایشیا) دسمبر 1982ء کے شمارہ میں نگر کے حکمران مغلوٹ کے زمانہ کو 1500ء دکھاتے ہیں۔ اس حساب سے بھی تراخان دور حکمرانی زیادہ ماضی میں نہیں جاتا۔ تاہم جرگن کا جو مضمون نگر کی تاریخ اور ثقافت کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ زیادہ تر اُن مقامی روایات پر دار و مدار رکھتا ہے۔ جو افسانویت کا شکار ہیں۔

میں نے سابقہ ابواب میں جو موازناتی واقعات پیش کیے ہیں۔ چترال، بدخشان، مشرقی ترکستان، بلتستان، لداخ، تبت اور کشمیر علاقوں کے متصل تاریخ کا جائزہ لے کر یشکنوں، شینوں اور ان تراخانی راجوں کے دور کا تعین کیا ہے۔ جو پندرہویں صدی عیسوی بنتا ہے۔ جس کا سابقہ سطور میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ آگے چل کر تراخنی راجوں کا شجرہ بھی پیش کیا جائے گا جس میں میرے موقف کی مزید تائید ہو گئی۔ یہاں میں یہ بات بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ الفاظ تراخان اور تراخنی مختلف کتابوں میں مختلف املا سے لکھے جاتے رہے ہیں۔ یہ الفاظ تراخن اور تراخانی ہیں نہ کہ تراکھان یا ترکھن یا ترکھنی۔ پرانی تاریخوں محکمہ بندوبست کے قدیم کاغذات میں تراکھان، ترکھن اور ترکھنی لکھا جاتا رہا ہے۔ یہ اُسی انداز میں لکھا گیا ہے جو ہند میں لکھے جانے کا دستور تھا۔ یعنی خ یا خا کی جگہ کھ اور کھا لکھنے کا۔ چنانچہ بندوبست اول و دوم میں تراخن یا ترخان، ترخانی، تراخانی کی جگہ تراکھان یا ترکھان، ترکھانی، تراکھانی لکھا گیا ہے۔ امیر سنگھ اور ٹھاکر سنگھ اور اُس کا بیشتر عملہ ہندی لوگوں پر مشتمل تھا۔ اس لیے اُنھوں نے خ یا خا کے بدلے اپنا انداز تحریر اور حروف تہجی استعمال کیے۔ جیسے کہ پہلے بیان ہوا ہے۔ ترخان، تراخان، تراخن، تراخنی، ایل خان، خان، وغیرہ الفاظ مغل اور منگول لغت کے ہیں اور ہند میں آنے کے بعد ان الفاظ نے حلیہ بدلا اور ترکھان، تراکھان، ترتراکھان، تراکھانی، کھان ہوئے۔

1893-94ء کی بند وبست میں تراکھان مغلٹ 1916ء کی بند وبست میں ترکھن (مغلوٹ) اور 1946ء کی جمع بندی ریکارڈ میں ترکھان (مغلوٹ) لکھا گیا ہے۔ راجہ شاہ رئیس خان نے اپنی تاریخ میں طرہ خان لکھا ہے۔ اس املا سے یہ نام کسی اور کتاب میں نہیں ملتا اور نہ یہ کوئی معنی رکھتا ہے۔

ترخان نام محض خطاب یافتہ مغلوں کے لیے مخصوص ہے۔ وزیر حشمت اللہ نے اپنی تاریخ کی کتاب میں ان ناموں کا صحیح استعمال کیا ہے۔ اُنھوں نے خان، ترخان، ترتراخان، تراخانی وغیرہ نام لکھ کر مغلوں کا انداز تحریر اختیار کیا ہے۔ راجہ شاہ رئیس خان 1241ء تا 1275ء کے دور کو تراخان اول کی حکمرانی سے منسوب کرتے ہیں۔ اس دور کا زمانہ یہی نہیں ہے اس کی بعد میں وضاحت کی جائے گی۔ پروفیسر دانی بھی ان ادوار میں بہت فرق بتاتے ہیں۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ تراخان یا تراخا نام ہنزہ چٹان پر 1241ء سے بھی بہت پہلے کندہ ملتے ہیں۔ مجھے پروفیسر صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں کیونکہ 1206ء میں چنگیز خان کے خان اعظم مقرر ہونے کے بعد ترخان اور ایل خان کے خطابات وجود میں آئے اور یہ خطابات چنگیز خان اپنے قریب ترین لوگوں کو بخشتا تھا۔ ترخان چنگیزی شہزادوں کو بطور خطاب دیا جاتا تھا۔ جُش کے معنی بڑے خان کے ہیں۔ ہلاکو خان کو ایل خان کا خطاب ملا تھا۔ اسی بنیاد پر ہلاکو خان نے 1256ء میں ایران میں ایل خانی خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ میرے خیال میں ہنزہ چٹان پر قرہ خانی، بو قاخان وغیرہ میں سے کوئی نام ہو گا کیونکہ 840ء تا 1212ء تک مشرقی ترکستان پر قرہ خانی حکومت قائم تھی۔ قرہ خانی حکومت کا بانی کاشغر کا حکمران بو قاخان تھا۔ جس نے مشرقی اور جنوبی ترکستان کو یکجا کر کے وسیع ترکستان کی ریاست کی بنیاد رکھی تھی۔ 932ء میں نوجوان خاقان ساتق بغراخان نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ قرہ خانی حکومت 1048ء میں دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک کا مرکز کاشغر اور دوسرے کا مرکز سمر قند ہو گیا۔ اسی دور میں ہمارے علاقے بھی ترکوں کی ترک تازیوں سے محفوظ نہ تھے۔ ہنزہ چٹان پر یہ کوئی نام کندہ کر گئے ہونگے۔ تاتاریوں کی یلغار، چنگیز خان، تزک بابری، تزک تیموری وغیرہ کتابوں میں ترخان ایل خان، امیر، وغیرہ القابات 1206ء کے بعد نظر آتے ہیں۔

درج ذیل اصلاحات بھی مغلوں کے لغت کے ہیں۔

نویان	معنی	شہزادہ
ختا	معنی	شمالی چین۔
قراجنگ	معنی	کالے آدم
چپر	معنی	ڈاک گھوڑے کے سوار
یام	معنی	گھوڑوں کی ڈاک گاڑی
اُچی گین	معنی	الاؤ کی آگ فروزاں کرنے والا
تولائی	معنی	آئینہ
چغتائی	معنی	جنگلی گھوڑا
یریغ	معنی	فرمان
یاسا	معنی	چنگیز خان کے مجموعہ قوانین
لُوق	معنی	شاہباز
قراقرم	معنی	کالی دیواریں
یورت	معنی	خیمہ
میگیار	معنی	ترک خانہ بدوش
یوآن	معنی	بیرونی خاندان
سائبریا	معنی	دروازہ
زرین خیل	معنی	بہت سے سوار
ایغور	معنی	متمدن
کرغیز	معنی	زرخیز کھیت
قارلق	معنی	برف کے رہنے والے
ترخان	معنی	بڑا خان
ایل خان	معنی	چھوٹا خان
منگول یا مغل	معنی	دائی کے ہیں
تاؤکیو	معنی	مضبوط (یعنی ترک)

تنگو	معنی	سور
کاغان	معنی	خان کے ہیں
تموچن	معنی	لوہا کے ہیں
امیر	معنی	سردار کے ہیں

ان تصریحات کے بعد ترا خان اول یا تر خان یا ترتراخان وغیرہ صحیح املا میں لکھے جانے میں کوئی ہرج نہیں۔

اب یہاں اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ تراخانی حکومت کے بانی کا کیا نام تھا۔ اور یہ کہاں سے آیا تھا اور یہ کس قوم سے تعلق رکھتا تھا۔

وزیر حشمت اللہ لکھتے ہیں۔ کہ اُس زمانہ میں تراخانی خاندان کے ایک رئیس آزر نامی نے مع اپنے بیٹوں کے اسکردو سے اس ملک پر حملہ کر دیا۔ آزر اور اُس کے بیٹوں کا مذہب مسلمان بتایا جاتا ہے۔ مگر میری تحقیق میں اسکردو میں اس زمانہ تک مذہب اسلام نہیں پہنچا تھا اور آزر اور تراخان ترکی نام ہیں۔ اس لیے آزر اصلاً یار قندی ترک ہونا چاہئے۔ آزر نے اپنے تین بیٹوں کے ساتھ جن میں چھوٹا جمشید تھا۔ اس سے بڑا خسرو خان تھا اور اس سے بڑا ایک اور تھا جس کا نام دریافت نہیں ہو سکا۔ اسکردو کے نالہ ہوشے کی طرف سے ہنزہ نگر پر حملہ کیا اور یہ علاقے مفتوح کیے۔ پھر اُس نے اپنے تینوں لڑکوں کو گلگت پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اُس نے شری بدت راجہ گلگت سے بڑا مقابلہ کیا۔ شری بدت مارا گیا۔ گلگت پر جمشید کا قبضہ ہو گیا۔ جمشید کے باقی دو بھائی ہنزہ کے رستے اسکردو واپس ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا

1۔ تراخانی خاندان کا جد اعلیٰ آزر تھا۔ یہ ترک تھا۔
2۔ یہ سکردو کی طرف سے آیا تھا۔ ہنزہ و نگر فتح کرنے کے بعد سکردو واپس ہوا۔
3۔ گلگت میں تراخانی حکومت کا بانی جمشید تھا۔ جو آزر کا لڑکا تھا۔
4۔ جمشید نے شری بدت کی بیٹی نور بخت سے بیاہ رچالیا۔

ڈاکٹر لٹز کی تحقیق کا نتیجہ کچھ اس طرح ہے۔ کسی زمانے میں گلگت میں ایک قوم رہتی تھی۔ جس کی اصلیت کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ مقامی تھی یا باہر سے آئی تھی۔ اس قوم پر ایک بدروح کی حکمرانی تھی۔ جس کا نام شری بدت تھا۔ اس جن نما انسان سے پاکیزہ پریاں بھی بیزار ہو چکی تھیں۔ کیونکہ یہ آدم خور تھا۔ آخر کار اللہ نے اس آدم خور جن سے لوگوں کو چھٹکارا دلانے کے لیے اسباب پیدا کیے۔ دنیور کے پہاڑ کے اوپر تین پری

زاد آئے۔ شاید یہ نگر کی طرف سے آئے تھے۔ یہ تینوں پری زاد بھائی تھے۔ ان بھائیوں میں ایک جمشید نام پری زاد بھی تھا۔ آذر جمشید کے دونوں بھائی یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح آذر جمشید انسانی روپ دھارے اور شری بدت سے انتقام لے۔ دونوں بھائیوں نے ایک چال چلی۔ انھیں ایک بچھڑا نظر آیا۔ طے یہ ہوا کہ تینوں بھائی باری باری بچھڑے پر اپنے تیر چلا کر بہترین تیر انداز ہونے کا مظاہرہ کریں گے۔ چنانچہ پہلے دونوں بھائیوں نے منصوبے کے مطابق تیر چلائے لیکن عمداً تیر خطا کیے۔ آذر جمشید کا تیر نشانے پر لگا اور بچھڑا شکار ہو گیا۔ اب دونوں بھائیوں نے بچھڑے کے گردے نکال کر پکائے اور آذر جمشید کو پیش کیے۔ آذر نے کچھ پس و پیش کیا لیکن بھائیوں نے یہ اصرار کیا کہ وہ ان کو چکھے کیونکہ وہی اس اعزاز کا مستحق ہے۔ آذر جمشید نے جیسے ہی گردے کے ٹکڑے کھائے۔ وہ پری زاد خصوصیات سے محروم ہوا اور انسانی روپ میں آ گیا۔ اُس کے دونوں پری زاد بھائی یہ کہہ کر غائب ہوئے کہ وہ گلگت میں جا کر بے رحم آمر سے لوگوں کو نجات دلائے۔ چنانچہ آذر جمشید گلگت آیا جہاں شری بدت کی لڑکی اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئی اور اپنے باپ کے خلاف سازش میں آذر جمشید کا ساتھی بنی اُس نے اپنے باپ کا یہ راز کہ اُس کی جان برف میں ہے اور آگ سے پگھل سکتی ہے۔ آذر جمشید کو یک بیک بتادیا۔ آذر جمشید نے آگ کے بگولوں (تلینے) کے حملوں سے شری بدت کا صفایا کر دیا۔

قدیم گلگت اوہام اور دیگر باطل خیالات (جو جہالت کی پیداوار ہوتے ہیں) کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ قسم قسم کے خیالی جانور، پرندے، چڑیلوں اور جنات کی بہت سی قسمیں، انسانی شکلوں میں جن پری اور پھر اس حسی اجسام کی اولاد ہونے کا تصور عام تھا۔ چونکہ سب لوگ چھوٹے بڑے، فقیر، امیر و کبیر، راجہ و پرجا ان پڑھ تھے۔ اس لیے جُہلا کی باتیں عام تھیں۔ جادو، منتر پر بھی بڑا یقین تھا۔ مثلاً یہاں کا مشہور خیالی پرندہ گورفا چھن تھا۔ یہ ایک بڑا مہیب جانور اور محیرّالعقول کارنامے سرانجام دے سکتا تھا۔ لمبے فاصلوں کے سفر طے کرتا اور جس کے مطیع ہوتا اُس کا ہر کام پورا کرتا۔ یمالے ایک عجیب الخلقت مخلوق تھی۔ اس کے سامنے جو چیز آتی یہ صفاچٹ کر جاتی۔ اس لیے شینا زبان میں یمالے محاورتاً اُن بچوں یا لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو بہت کھاتے ہیں۔ مثلاً شینا میں یہ جملہ " نی جیک یمالک ہن" یعنی یہ کتنے بڑے پیٹو ہیں۔ اسی طرح شینا میں سارپودیوا کو ایک ایسی مخلوق کا نمائندہ ہوتا ہے جو نظر نہ آنا چاہے تو لوگوں کی نظروں سے مستور ہو جائے۔ انسانی شکل میں آنا چاہے تو انسانی روپ

اختیار کرے۔ یہ بھی محض ایک خیالی مخلوق ہے جسے طاقت کا سر چشمہ بنا کر دکھایا گیا ہے اور پھر جہلا کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ کچھ راجے بھی دیواکو مخلوق میں سے تھے تاکہ اپنی خاندانی وجاہت کو بڑھایا جائے۔ چنانچہ یہاں چند راجوں کا جنگی اصلیت کا کھوج نہ ملتا تھا۔ اُنھیں دیواکو قرار دیا گیا۔ اس کے دو فائدے ہوئے۔

1۔ کسی کی اصلیت کے کھوج لگانے میں لوگ ٹامک ٹوئیاں مارتے نہ رہا کریں۔

2۔ کرداروں کو مافوق الفطرت عناصر سے جوڑ کر اُنھیں ناقابل تسخیر، انسانوں سے زیادہ قوی بنایا جائے تاکہ لوگ ایسے کرداروں کی تعظیم کریں۔ انھیں مقدس جانیں اور ان کا مطیع و تابع رہیں۔

3۔ نسلی تفاخر کا بھرم بھی قائم رہے۔

گلگت کی قدیم تاریخ میں راجہ شری بدت، راجہ آذر جمشید، راجہ عائشو ہنزہ اور راجہ شہ شاہلی نگر جیسے حکمرانوں کو دیواکو بنا کر پیش کیا گیا۔ عظمت و بڑائی، شرافت کو ایسے کرداروں کا حصہ بنا دیا گیا۔ شرارت، بد قماشی وغیرہ کو عمومی کرداروں کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ راجہ، مہاراجے خائن ہوں، زانی ہوں، ظالم ہوں، بے حیا ہوں، شرابی کبابی ہوں تو ہوں۔ اُن کی شرافت رہے گی لیکن ایک عام انسان سے چھوٹا سا قصور بھی سرزد ہو تو اُسے رذیل سمجھا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ کم اصل ہے۔ حکمرانوں میں کوئی کسی کنیز کے ساتھ ناجائز تعلق رکھے، کسی کی جائداد ہتھیالے، کسی پر ظلم کرے تو یہ اُس شاہی ٹوے کا حق بنتا ہے۔ مگر وہ کم اصل نہیں بنتا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا نافرمان وہی ہے جو الٰہی احکام کو درخور اعتنا نہ سمجھے۔ اور اپنی طاقت کے نشہ میں حرام کاری کے کام کرے وہی کم اصل ہے۔

ڈاکٹر لٹز نے جو افسانوی کہانی دہرائی ہے۔ اس کے مطابق۔

1۔ شری بدت ایک دیواکو تھا۔ اور آذر جمشید بھی کیونکہ ان کی اصلیت کا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔

2۔ آذر جمشید جو ایک پری زاد تھا اور یہ نگر کی طرف سے آیا تھا۔ بچھڑے کا گوشت کھانے کی وجہ سے انسان ہوا۔ اس کے دونوں بھائی یہ چاہ رہے تھے کہ وہ لوگوں کو شری بدت کے ظلم سے چھٹکارا دلائے۔

3۔ چونکہ شر دبدت دیواکو تھا اس لیے اس پر ایک دیواکو ہی غلبہ پا سکتا تھا۔

وزیر محمد اشرف، وزیر حشمت اللہ کی تاریخ پر انحصار کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ

آذر جمشید نے 1120ء میں گاشکیوں سے سازباز کر کے شری بدت کو شکست سے دوچار کیا۔ دوتراخائی خاندان کو بھی شین قرار دیتا ہے۔ اس کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔

وزیر قدرت اللہ بیگ اپنے بروشسکی زبان و ادب مقالہ میں وہی مافوق الفطرت کہانی جو قدیم الایام سے جاری تھی کا سہارا لیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ آذر جمشید بلتستان کی طرف سے آیا اور شری بدت کی لڑکی نوری سے سازباز کر کے اُس کے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ نوری نے اپنے باپ کا وہ راز فاش کر دیا تھا کہ اُس کے باپ کی جان آگ سے پگھل سکتی ہے۔ چنانچہ آگ کے شعلوں اور بھولوں کی مدد سے جو محل کے چار طرف لائے گئے تھے۔ شری بدت کا دل پگھلا اور وہ عالم جادوانی سدھارا۔ وزیر اشرف اور قدرت اللہ بیگ کی باتوں سے معلوم ہوا۔

1۔ آذر جمشید شین تھا

2۔ آذر جمشید بلتستان سے آیا تھا

3۔ شری بدت کی لڑکی نوری نے اپنے باپ کے خلاف سازباز کیا تھا

4۔ شری بدت ایک دیوا کو تھا۔ اُس کا دل حرارت سے پگھل سکتا تھا۔ وہی فرسودہ کہانی یہاں بھی رواں دواں ہے۔

جان بڈلف اپنی کتاب ہندوکش کے قبائل میں لکھتے ہیں کہ تراخن (مغلوٹ) جیسے حکمرانوں سے جو شجرے ملے ہیں وہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ ان خاندانوں کے بارے میں روایاتی کہانیاں مافوق الفطرت عناصر سے مملو ہیں شری بدت ایک ایسا ہی کردار تھا۔ جسے بلتستان کی طرف سے آئے ایک مہم جو شخص آذر مغلوب کرتا ہے اور پھر اُس کی لڑکی سے بیاہ کرتا ہے۔ وہ آذر کے بارے میں ایک کہانی کا حوالہ دیکر یہ بھی لکھتے ہیں کہ آذر سکردو کے ایک حکمران کا بھائی تھا۔ بڈلف کے مطابق۔

1۔ گلگت، ہنزہ، نگر کے حکمرانوں نے اپنے جو شجرے دیئے وہ ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔

2۔ آذر سکردو کے ایک راجہ کا بھائی تھا جو وہاں سے گلگت آیا تھا۔

3۔ یہاں کی قدیم کہانیاں مافوق الفطرت عناصر سے مملو ہیں۔

کرنل ڈیور نیڈوی میکنگ آف فرنٹیر میں لکھتے ہیں۔ کہ جب میں نے صفدر علی خان والئی ہنزہ کو جنگ کا الٹی میٹم دیا تو اُس نے اس کے جواب میں تین سلطنتوں ہنزہ، روس اور چین کے غیض و غضب کی طرف اشارہ کیا کہ وہ سکندر اعظم کی اولاد کو کوئی آسانی سے

مغلوب نہیں کر سکتا ہے۔ ڈیور نیڈ کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ۔

1۔ صفدر علی خان سکندر اعظم کی اولاد سے ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور یہ کہانی ہنزہ میں موجود تھی۔

فریڈرک ڈریو اپنی کتاب جموں اور کشمیر ٹریٹیز میں لکھتے ہیں۔ گلگت کے قدیم راجوں کا خاندان تراخانے کہلاتا ہے۔ یہ خاندان اب مٹ چکا ہے۔ موجودہ گلگت کا راجہ یعنی علید اد کا ماں کی طرف سے اس خاندان سے خونی رشتہ ملتا ہے اور بس۔ وہ پھر لکھتے ہیں۔ کہ جو روایاتی کہانی ملی ہیں اس کے مطابق اس خاندان کے بانی کا نام تراخان تھا۔ جو پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ ان کے بعد مجھے اس خاندان کے نصف درجن حکمرانوں کے نام بتائے گئے ہیں۔ یہ نام آذر، جمشید، خسرو، فردوس اور جی خان ہیں۔

فریڈرک ڈریو کی روایاتی کہانی سے معلوم ہوا کہ۔

1۔ اس خاندان کا بانی تراخان تھا۔ جو پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔

2۔ اس کے بعد اس خاندان کے چھ اور حکمران ہوئے جن کے نام آذر، جمشید، خسرو، فردوس اور جی خان تھے۔

جنرل شاہد حامد اپنی کتاب قراقرم ہنزہ میں ہنزہ و نگر کے حکمرانوں کے اس دعویٰ کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ سکندر اعظم کی اولاد سے ہیں۔ اور یک جدیاں ہیں اس بیان سے معلوم ہوا کہ۔

1۔ ہنزہ و نگر کے حکمران اپنے آپ کو سکندر اعظم کی اولاد سمجھتے تھے۔

2۔ وہ ایک ہی جد اعلیٰ سے ہونے کا ادعا رکھتے ہیں۔ اس جد کا زمانہ پندرہویں صدی عیسوی بنتا ہے۔

کرنل شامبرگ اپنی کتاب دریائے آکسس اور سندھ کے بیچ میں لکھتے ہیں کہ ہنزہ نگر کی ریاستوں کی اصلیت کے بارے میں کہانیاں دلچسپ تو ہیں مگر غیر متاثر کن ہیں۔ میں ان کہانیوں کو کسی زمانہ سے منسلک کرنے سے معذور ہوں۔ یہ کہانی مجھے ہنزہ میں ملی۔ ایران سے دو شہزادے عبدالفیض اور عبدالغنی جن کو وہاں سے جلاوطن کیا گیا تھا۔ بلتستان وارد ہوئے۔ یہ بات یاد رہے کہ ایشیا کے ان ممالک میں اُن اشیاء سے نسبت جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے جو قابل تعریف اور قابل تعظیم ہوتے ہوں۔ بلتستان میں اُن دنوں ایک رانی حکومت کرتی تھی۔ اُس رانی کا یہ معمول تھا کہ جس شخص کو چاہتی۔ اُس کے ساتھ رات بسر کرتی

لیکن صبح کو اُسے موت کے گھاٹ اتار دیتی۔ تاہم اُسے عبدالفیض سے محبت ہو گئی۔ چونکہ یہ ملکہ پراسرار قوتوں کی حامل تھی۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ عبد الفیض پہاڑ کی چوٹی سے ایک تخت پر نمودار ہو تا کہ وہ لوگوں کے سامنے ان کے ملکہ کا ہم پلہ ثابت ہو۔ چنانچہ یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ اور یوں فیض اور ملکہ کی شادی ہوئی۔ اُس سے ایک لڑکا ہوا جو یاقوت شاہ کے نام سے موسوم ہوا۔ یاقوت شاہ کے دو لڑکے ہوئے۔ آذر اسے جمشید بھی کہا جاتا ہے۔ اور مراد شاہ اس آذر کو ہنزہ و نگر کی حکومت ملی۔ شری بدت کی لڑکی نور بخت کو اس آذر سے محبت ہو گئی۔ اُنھوں نے چوری چھپے شادی کر لی جن سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ اسے شری بدت سے چھپانے کے لیے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہادیا گیا۔ یہ بچہ گڈس نامی مچھیرے کو ملا جو بعد میں گلگت کا حکمران ہوا۔ آذر نے نور بخت کے اللے تللوں سے تنگ آ کر خود کشی کر لی۔ آذر کا لڑکا سوملک تھا۔ کرنل شامبرگ کی یہ کہانی ہنزہ کی مقبول کہانی ہے۔ اس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

1۔ عبد الفیض اور عبدالغنی دو بھائی ایران سے بلتستان وارد ہوئے۔

2۔ عبد الفیض کی شادی ملکہ بلتستان سے ہوئی جس سے ایک لڑکا یاقوت شاہ نامی پیدا ہوا۔

3۔ یاقوت شاہ کے دو لڑکے آذر اور مراد شاہ ہوئے۔

4۔ آذر کو ہنزہ نگر کی حکومت ملی اور مراد شاہ کو بلتستان کی۔

5۔ آذر نے ملکہ نور بخت کی بوالعجبیوں سے بیزار ہو کر خود کشی کر لی

6۔ یہ کہ ملکہ بلتستان بھی پراسرار قوتوں کی حامل تھیں۔

" یہ کشمیر ہے "کتاب کے مصنف پیرس جروس (Pearce Gervis) ایک اور عجیب کہانی پیش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے گلگت کے ایک راجہ جس نے داریل میں شرطیہ پولو جیت کر اپنے سات سالوں کو مار دیا تھا۔ اپنی رانی کے ستم کا شکار ہوا۔ رانی نے اسی غصہ کی وجہ سے اپنے نو مولود بچہ کو بھی دریا میں بہادیا جو ہوڈر میں کسی شخص کے ہاتھ لگا۔ جب یہ بچہ 16 سال کی عمر کا ہوا تو وہ گلگت روانہ ہوا۔ اس بچہ کا نام ہوڈر کے سوتیلے باپ نے تراخان رکھا تھا۔ تراخان نے گلگت کے حدود میں رات بلداس میں گزاری۔ اُس رات گلگت میں مرغوں کی اذانوں پر لوگ جاگے تو وہ یہ سن کر حیران ہوئے کہ مرغوں کی بانگ میں ایسی آوازیں آرہی تھیں۔

" Beldassar thum bai"

یعنی بلد اس میں راجہ ہے۔ لوگ ایک راجہ کی تلاش میں تھے ہی۔ ملکہ نے اُسے گلگت کا راجہ تسلیم کیا کیونکہ وہ اسے اپنا کھویا ہوا بچہ سمجھتی تھی۔ اور اب اُس کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ تراخان کی بہن سے کرگس اور مغلوٹ پیدا ہوئے۔ یہ عجیب کہانی درج ذیل امور پر روشنی ڈالتی ہے۔

1- گلگت کے راجہ نے اپنے سات سالوں کو پولو میچ جیتنے کی شرط کے نتیجہ میں قتل کر دیا تھا۔ رانی نے اس کے بدلے میں زہر دے کر اپنے شوہر کو ہلاک کیا اور اپنے نو مولود بیٹے کو بھی غصے میں پانی میں بہادیا۔

2- یہ لڑکا ہوڈر میں کسی مچھیرے کے ہاتھ لگا اور اسی مچھیرے نے ان کا نام تراخان رکھا۔

3- یہ لڑکا 16 سال کی عمر میں گلگت آیا اور بلد اس میں رات گزری۔

4- صبح مرغوں نے اپنی اذانوں میں بلد اس میں ختم ہونے کی آوازیں دیں اور تراخان کو ان آوازوں کی بنیاد پر گلگت کا راجہ بنادیا گیا۔

5- اس کی بہن سے کرگس اور مغلوٹ پیدا ہوئے۔

6- جروس یہ بھی کہتے ہیں کہ گلگت کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سکندر اعظم تاش گرگان اور درہ کلک تک آیا تھا۔ حالانکہ تاریخ میں ایسا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ (صفحہ 231)

اوپر والی یہی کہانی جین فیرے اپنی کتاب ''شیر دریا سندھ''میں دہراتے ہیں۔

سر محمد نظیم نے 1930ء میں ہنزہ، نگر اور گلگت کے جن نسلیاتی سلسلوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق سکندر اعظم نے اپنی مفتوحہ مملکتیں اپنے چار جرنیلوں میں تقسیم کی تھیں۔ ان میں سے ایک جرنیل جو نسلاً آرین تھا اور جس کا نام مختار یہ تھا۔ ترکی میں مقیم ہوا۔ اس جرنیل کی فوجیں جب واپس ہو رہی تھیں تو اس کے پانچ سپاہی بیمار ہو کر ہنزہ میں پڑے رہے اور بعد وہ یہیں مستقلاً آباد ہوئے۔

ان کے نام درج ذیل تھے۔

1۔ خواجہ عرب جو غلِت میں آباد ہوا

2۔ تیتم بلتت میں آیا ہو

3۔ خورو باتت میں مقیم ہوا

4۔ گاگو گنش کا باسی ہوا

5۔ شین ہندی کو اپنا گھر بنایا

ہنزہ کے تمام لوگ ان پانچ سپاہیوں کی اولاد ہیں۔ پہلے چار سپاہیوں کی اولاد نے آپس میں رشتے ناطے کیے۔ شین نے لوہاری اور چھوٹے موٹے کام کیے اور ڈوم کے نام سے موسوم ہوا۔

ہنزہ کے حکمران نگر، گلگت، سکردو، یاسین، سریکول، پونیال کے حکمرانوں سے قریبی رشتہ داریاں رکھتے ہیں۔ سکندر اعظم کی اولاد سے ہیں۔ اور ان کے رشتہ دار شغنان، درواز اور بدخشان میں موجود ہیں۔

سر محمد نظیم کے اس دلچسپ افسانے سے درج ذیل معلومات ملتی ہیں۔

1۔ ہنزہ، گلگت، نگر کے حکمران یک جدیاں ہیں۔ اور سکندر اعظم کی اولاد ہیں۔

2۔ ہنزہ کے لوگ سکندر اعظم کے جرنیل ختاریہ کے پانچ سپاہیوں کی اولاد ہیں۔

3۔ خواجہ عرب، تیتم، خورو، گاگو کی اولاد آپس میں رشتے ناطے کرتی رہی۔ لیکن پانچوں سپاہی جو شین کہلاتا تھا۔ کہ اولاد ڈوم کے نام سے موسوم ہوئی کیونکہ وہ لوہاری اور دیگر چھوٹے موٹے کام کرتی تھی۔

راجہ کریم خان نے 19 جنوری 1987ء کو ریڈیو پاکستان گلگت سے ایک انٹرویو میں کہا کہ آذر جمشید ایران سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سے لوگ بھی آئے تھے۔ نگر کے لمبردار رفیق کی آواز میں ایک لوک گیت پیش کیا گیا۔ جسے نو سو سال پرانا بتایا گیا۔ آذر کا لڑکا کرک تھا۔ جس سے بلد اس کی پرانی کہانی جوڑی گئی۔ کرک کا لڑکا چلس خان تھا۔ جو نیلوبٹ پر بیٹھ کر لوگوں کی داد فریاد سنتا تھا۔ اس بیان کے مطابق۔

1۔ آذر جمشید ایران سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سے لوگ بھی آئے تھے۔

2۔ آذر کا لڑکا کرک تھا۔ جسے دریا میں بہا دیا گیا تھا۔ اور جو بعد میں بلد اس کے مقام سے ملا۔

3۔ نو سو سال پرانا شینا گیت پیش کیا گیا۔

راجہ شاہ رئیس خان نے 22 جنوری 1987ء کو وفات پائی۔ اس کی تاریخ گلگت جون 1987ء میں چھپی۔ اس کتاب کی ایڈیٹنگ پروفیسر دانی نے عبدالمجید خاور سابق اے

آئی۔جی اور اکبر حسین اکبر کے تعاون سے کی۔ اُس کی کتاب کا مسودہ 1970ء تا 1973ء کے دوران پایہ تکمیل کو پہنچا۔ راجہ صاحب کے ساتھ نہ صرف میرے والد گرامی کے تعلقات تھے بلکہ وہ میرے بھی مشفق تھے۔ 1973ء اور 1974ء میں میں ہائی سکول گلگت نمبر 1 میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ راجہ صاحب مجھ سے ملنے آتے تھے۔ اُس نے اپنی قدیم تاریخ کے اولیں پانچ باب کے ساتھ انقلاب آزادی گلگت کی ایک مختصر روئیداد بھی مجھے لکھ کر دی تھی۔ جو ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اس مسودہ کے ذریعہ مجھے پہلی دفعہ ترخانوں کا کیانی ہونے کا نظریہ ملا۔ راجہ صاحب فرماتے ہیں۔ جب لشکر اسلام نے سلطنت ایران فتح کر لیا تو یہ کیانی شہزادہ جس کا نام آذر جمشید تھا۔ بھٹک کر گلگت آیا۔ یہاں شری بدت کے وزیر اعظم لوٹو نے شہزادہ کو اس کے لاؤ لشکر کے ساتھ نالہ منوگہ دینور میں چھپایا۔ اس دوران شہزادی نور بخت دختر شری بدت کے آذر جمشید کے ساتھ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ آذر جمشید شری بدت کو اپنے تیر جگر دوز سے راہی ملک عدم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وزیر نے صلاح دی کہ یہ شخص چونکہ دیوزاد ہے اور اس پر کوئی حربہ کارگر نہیں ہوتا اس لیے نور بخت سے وہ راز معلوم کیا جائے کہ جس سے اُس کا خاتمہ ہو سکے۔ شہزادی چونکہ آذر جمشید کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس لیے اُس نے آذر جمشید کو باپ کے تمام راز اگل دیئے کہ آتش سوزاں سے اُس کے باپ کی موت ہو سکتی ہے۔ اسی دوران اُس نے ایک بیٹے کو بھی جنم دیا۔ اس خوف سے کہ مبادا یہ راز فاش ہو جائے اُس نے اپنے نومولود فرزند کو ایک صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا صندوق میں ایک خط اس متن کا لکھا گیا کہ جو کوئی ہمارے فرزند کی پرورش کریگا۔ وہ تین سو تولہ سونے کا حقدار ہو گا جو صندوق میں رکھا گیا تھا۔ ادھر نور بخت کی سازش کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ منصوبے کے مطابق چار طرف سے عوام نے چوب چراغوں، مشعلوں اور آگ کے بگولوں کے ساتھ شری بدت کے محل کے گرد گھیرا ڈالا۔ شری بدت کے لیے اب نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن، باہر کی طرف بھاگا تا کہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو اور مقابلہ کرے۔ لیکن اس وقت آذر جمشید نے تیر جگر دوز کو کمان کیانی سے چھوڑا اور اس کا کام تمام کیا۔ سر زمین گلگت پر 643ء میں خاندان کیانی کا پہلا حکمران آذر جمشید تخت نشین ہوا۔ اُس نے 16 سال یعنی 659ء تک گلگت پر بڑے طمطراق سے حکومت کی اور پھر حکومت ملکہ کے حوالہ کر کے کہیں نکل گیا کیونکہ ایک وسیع سلطنت کا شہزادہ اس تنگنائے میں گھبرا گیا تھا۔

''بلداس تھم بئی'' کا قصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب ملکہ کو حکومت

کرتے چار سال ہوئے تو وزراء، عمائدین وطن کو یہ فکر ہوئی کہ کوئی تخت کا وارث پیدا ہو۔ دربار میں اس بابت صلاح مشورہ جاری تھا۔ کہ ایک پالتو مرغ نے اذان دی اور آخر میں یہ جملہ اس بے زبان مرغ کی زبان پر آیا۔

بلداس تھم بئی مرغے نے یہ جملے تین بار دہرائے۔ جس پر اہل دربار چونک پڑے اور فیصلہ کیا گیا کہ وزراء و روساء کا ایک وفد بلداس جائے اور وہاں تھم کی تلاش کرے۔ چنانچہ زرگر گذوس کے گھر میں وہ دُر نایاب شہزادہ ملا جو بعد میں کرک کے نام سے مشہور ہوا۔

راجہ صاحب کی اس حکایت سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں کہ۔

1۔ آذر جمشید ایران کا ایک شہزادہ تھا۔

2۔ جب لشکر اسلام نے ایران فتح کر لیا تو یہ شہزادہ اپنے لاء لشکر کے ساتھ فرار ہو کر گلگت آیا۔

3۔ یہاں شری بدت کے وزیر نے اس شہزادے کو اس کے لاؤ لشکر کے ساتھ نالہ منوگہہ دینور میں چھپایا۔

4۔ شہزادہ اور شری بدت کی لڑکی نور بخت میں محبت ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کے ہو کر رہے۔

5۔ نور بخت نے آذر جمشید کو اُس راز سے آ گاہ کیا کہ اُس کے باپ کی موت آتش سوزاں سے ہو سکتی ہے۔

6۔ شری بدت ایک دیوزاد تھا۔ اُس پر اور کوئی حربہ کارگر نہ ہو سکتا تھا۔

7۔ نور بخت نے اپنے بچے کو باپ کے خوف سے دریا میں بہادیا جسے بلداس میں ایک شخص نے پرورش کی۔

8۔ ایک پالتو مرغے نے بر سر دربار تین بار " بلداس تھم بئی " کا جملہ دہرایا اس سے اُنھیں پانی میں بہائے شہزادہ کرک کی نشاندہی ہوئی۔

9۔ آذر جمشید نے گلگت پر 16 سال حکومت کی۔ پھر حکومت اپنی ملکہ کے حوالہ کر کے کہیں نکل گیا۔ کیونکہ وہ گلگت جیسے تنگنائے سے اکتا گیا تھا۔ اور کھلی فضاؤں کا طالب تھا۔

10۔ آذر جمشید ایران سے ایک بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ آیا تھا۔ شری بدت کے وزیر

نے اُسے شری بدت سے بچانے کے لیے منوگہ (تالہ منو) دنیور میں چھپایا تھا۔

11۔ جب بچہ کو پانی میں بہایا گیا تو نور بخت نے ایک خط لکھ کر اس میں رکھا۔ کہ جو کوئی بچہ کی پرورش کرے تو وہ بکس میں رکھے گئے تین سو تولہ سونا بھی لے سکتا ہے۔

اوپر کی اس تمام مغلق بحث سے کوئی نتیجہ نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اسی لیے کرنل شمبرگ کو یہ کہنا پڑا کہ ان خاندانوں کی کہانی پڑھنے کو دلچسپ ہے لیکن غیر متاثر کن۔ ان میں اس قدر ابہام ہے کہ انسان اندھیر انتھارتے نتھارتے اور تاریکیوں میں پڑتا ہے۔ مختلف بیانات اور مختلف پراسرار کہانیوں سے واقعات کو الجھا کر رکھا گیا ہے۔ پروفیسر دانی میر محمد نظیم خان کی نسلیاتی کہانی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

" such is the fictitious story current in the region, for which there is no historical confirmation P.116 of NAS.

اسی طرح کی باتیں بڈلف، ڈریو، ڈاکٹر لٹز وغیرہ نے بھی لکھی ہیں۔ یقیناً ایسی باتوں کے لیے انسانی تاریخ میں کوئی مقام نہیں مثلاً۔

1۔ آذر جمشید، شری بدت، تراخان، ملکہ بلتستان وغیرہ دیوا کو تھے۔ یا پری زاد تھے یا جنات میں سے تھے یا یان چھولو کی اولاد میں سے تھے۔

2۔ دنیا میں کہیں ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا کہ مرغوں نے انسانوں کی طرح بات کی ہے۔ گنز ورلڈ ریکارڈ میں محیر العقول انسانی واقعات ملتے ہیں۔ لیکن جانوروں کی بولنے کی کوئی تاریخ نہیں۔ ہمارے گلگتی مرغے کا "بلداس تھم بئی" کا اعلان جُھلا کی گنز بک کا کوئی واقعہ ہو سکتا ہے۔

3۔ نو مولود بچہ کا ماہ جدی میں پانی میں بہانا، ہوڈر میں اسے پایا جانا اور پھر بچے کا زندہ رہنا ممکنات میں سے نہیں۔

4۔ بروشسکی میں "بلداس تھم بئی" کہنا عجیب لگتا ہے۔ جبکہ گلگت میں شینا زبان رائج تھی کیونکہ یہ پندرہویں صدی عیسوی کے واقعات ہیں۔

5۔ لمبردار رفیق کی آواز میں نو سو سال پہلے کا شینا میں گیت پیش کیا گیا۔ جبکہ اُس وقت یعنی 1087ء (گیارہویں صدی عیسوی) کے قریب یہاں بروشسکی زبان کی ایک ابتدائی شکل موجود تھی۔ شینا زبان نے ابھی اس طرف اپنے قدم نہیں جمائے تھے۔

6۔ نور بخت کا اُس زمانے میں خط لکھنا زیب داستان کے لیے تو بات درست ہو سکتی ہے لیکن حقیقت حال یہ نہ تھی۔

7۔ نور بخت خاتون کا اپنے باپ کے خلاف سازش کرنا اور اُسے مروانا کسی اچھی بیٹی کا کردار نہیں ہو سکتا۔

8۔ کہا گیا ہے کہ آذر جمشید ایک بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ گلگت وارد ہوا تھا۔ اتنے بڑے لاؤ لشکر کو نالہ دنیور میں چھپانا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ اتنے بڑے لاؤ لشکر کو نالہ منو میں چھپایا جا سکتا ہے تو ایک نو مولود بچے کو کسی گھر میں چھپایا نہیں جا سکتا تھا کہ اسے دریا میں بہادیا جاتا۔

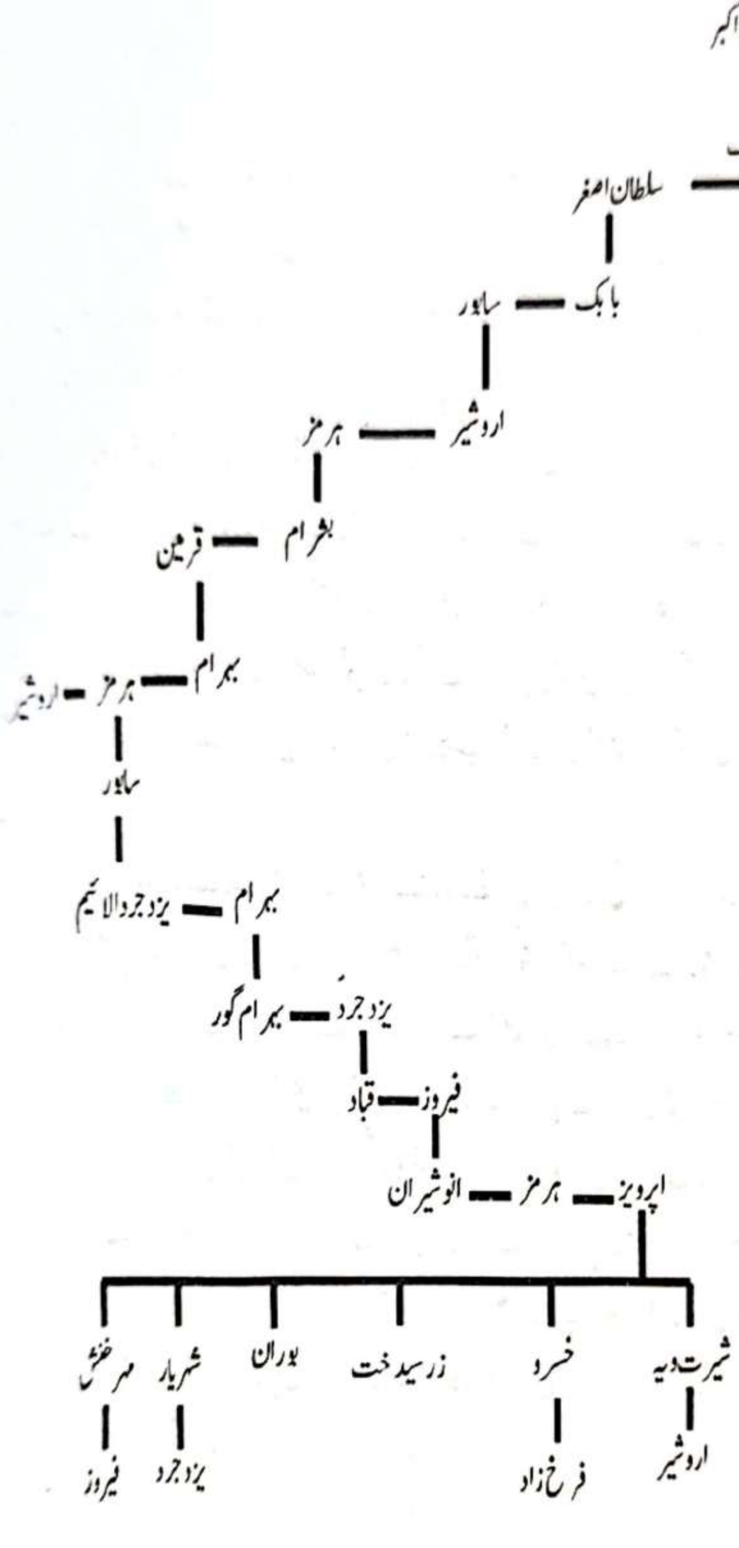
راجہ شاہ رئیس خان خاندان تراخانی، مغلوٹ اور کرگس میں پہلا شخص ہے۔ جس نے اس خاندان کے کیانی ہونے کا نظریہ پیش کیا اور یہ نظریہ 1955ء تا 1970ء کے دوران پیدا ہوا۔ اس سے پہلے ان خاندانوں کے کسی حکمران یا کسی بزرگ نے ایسا کوئی خیال پیش نہیں کیا تھا۔ گلگت کی اولین بندوبست 94-1893ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ راجہ علی داد خان اُس وقت بااثر شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کے وزیر وزارت اور پولیٹکل ایجنٹ سے قریبی تعلقات تھے۔ نیز محکمہ بندوبست شجرہ جات مرتب کر رہا تھا۔ علی داد خان اپنے ملکیتی جائداد کے تحفظ کے لیے کام کر رہے تھے۔ اُن کے خاندان سے متعلق گھراٹوں کی بوئی، لس پک، وظیفہ، دودھ اور گوشت کے مراعات کا مکمل ریکارڈ اس اولین بندوبست میں موجود ہے۔ پھر جب لوگوں سے پوچھ گچھ کر شجرہ جات تیار کیے جا رہے تھے۔ تو لازماً ان سے بھی اُن کی قومیت کے بارے میں استفارات ہوئے ہونگے۔ اگر کیانی ہونے کا نظریہ موجود ہوتا تو راجہ علی داد ترکھن مغلوٹ نہ لکھواتے جو اس اولین بندوبست میں لکھا گیا۔ ہنزہ، نگر کے قدیم و جدید حکمرانوں نے جو خاندانی ریکارڈ اپنے پاس محفوظ رکھا۔ اُس میں بھی کہیں کیانی نظریہ موجود نہیں۔ ہنزہ کے حکمران بہ تکرار اس بات کا اعادہ کرتے آئے ہیں کہ وہ سکندر اعظم کی اولاد سے ہیں اور سکندر اعظم کی اولاد سے ہونے کا نظریہ اس طرف تمام حکمرانوں نے پیش کیا ہے۔ راجہ شاہ رئیس خان اس نظریہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بعض پرانے مورخین کا اس امر پر اتفاق تھا کہ اس راجے کی پر صولت و عظمت حکومت کے عروج اور ان کے ذاتی اوصاف کی یاد کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے گلگت کے شاہی خاندان کے سابقہ نام خاندان کسری کو

خاندان طرہ خان کے نام سے تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن مورخین کی اکثریت اس قول پر تھی کہ خاندان کیانی یا کسری کے بجائے خاندان طرہ خان کا نام راجہ طرہ خان اول کی ہر دل عزیزی اور ان کی ناموری کی وجہ سے پڑ گیا۔

راجہ صاحب مورخین کا ذکر تو کرتے ہیں۔ لیکن کوئی حوالہ پیش نہیں کرتے۔ قدیم و جدید تمام مورخین کی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔ کسی نے بھی یہاں کیانی خاندان کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ عبدالمجید خاور مرحوم سابق اے آئی جی کا کہنا تھا۔ کہ یہ خیال 1955ء تا 1958ء کے دوران سامنے آیا۔ جب یہاں ایم زیڈ کیانی پولیٹیکل ایجنٹ تھے۔ راجہ شاہ رئیس خان کے ایم زیڈ کیانی کے ساتھ مراسم تھے۔ ان ملاقاتوں میں تاریخ پر بھی بحث ہوتی رہتی تھی۔ خاور صاحب کہتے ہیں کسی ایسی نشست میں کیانی صاحب نے یہ خیال پیش کیا کہ اگر کوئی ایران سے آیا ہو تو ممکن ہے وہ کیانی خاندان کا کوئی فرد ہو گا۔ کیونکہ ہنزہ و نگر میں ایران سے کسی عبدالفیض یا عبدالغنی کے آنے کی روایاتی کہانی بھی ملتی تھی۔ پس یہی خیال شاہ رئیس خان صاحب کو بھا گیا اور پھر اُس نے جب اپنی تاریخ قلمبند کرنا شروع کی تو اس نے اس خیال کو تعارفاً پیش کیا۔

یہ بات یاد رہے جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران فتح ہوا تو یہ علاقہ چودہ صوبوں پر مشتمل تھا۔ یہاں ساسانیہ کسرویہ حکمران تھے۔ 634ء سے لے کر 644ء تک ایران کے یہ تمام صوبے یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔ ان بیشتر صوبوں پر کسرویہ گورنر مقرر تھے۔ میں نے کئی ایرانی تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں کسی میں بھی آذر جمشید نام کسی شجرہ میں بھی نہیں ملتا۔ شجرہ ملوک طبقہ اول فارس میں ایک نام جمشید ملتا ہے۔ یہ جمشید ایران کا ایک نامور بادشاہ تھا۔ اسی نے کاتب اور دربان مقرر کیے تھے۔ اور اسی نے نوروز کو عید کا دن مقرر کیا تھا۔ ابن خلدون کہتے ہیں۔ یہ ممورث کا بھائی تھا۔ یہ ہفت اقلیم کا بادشاہ تھا۔ بعض کہتے ہیں۔ اس نے خدائی کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ یہ دولت کیانیہ وہی ہیں۔ جن پر سکندر اعظم غالب آیا تھا۔ ان کا زمانہ بہت قدیم ہے۔

کسرویہ جو طبقہ ثانیہ ہے۔ ان میں جمشید نام کا کوئی شہزادہ موجود نہیں۔ اسی طرح طبقہ ثانیہ اور طبقہ رابعہ میں بھی کوئی آذر جمشید موجود نہیں۔ طبقہ رابعہ کے یزد جرد کو مسلمانوں نے شکست فاش دی تھی۔ اور یہی مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان یزد جرد کا شجرہ کچھ اس طرح ہے۔



یزدجرد کے ساتھ طبقہ، ملوک فارس رابعہ کا خاتمہ ہوا اور ایران اسلام کا ایک صوبہ بنا۔

یہاں لفظ آذر پر کچھ توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ نام تواتر کے ساتھ مستعمل ہوا ہے۔ وزیر حشمت اللہ نے اسے ''آذر'' ز سے لکھا ہے۔ لیکن یہ نام عموماً ذ سے یعنی آذر لکھا گیا ہے۔

بعض نے اسے محض آذر لکھا ہے۔ اور بعض نے آذر شمس یا آذر جمشید، شاہ رئیس خان نے اسے آذر جمشید لکھا ہے۔

آذر عربی کا لفظ ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے۔ ''اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا تم کیا بتوں کو معبود بناتے ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اور تمہاری قوم صریح گمراہی میں ہے۔'' سورۃ الانعام آیت 74۔ آزر نے 205 سال کی عمر پائی اور یہ شام میں فوت ہوا۔ یہ بھی روایات ہے کہ آزر ابراہیم کا چچا تھا۔ ترجمان القران دہلی 1931ء انسائکلوپیڈیا ادارہ معارف میں لکھا ہے۔ آزر نصب بلا تنوین کے ساتھ اور آزر ضم کے ساتھ، پہلے قرات کے لحاظ سے اس لفظ کی تفسیریوں کی جاتی ہے کہ یہ لفظ عربی ہے اور اس کے معنی قوت ہیں۔ اور پہلا ہمزہ استفہام انکاری کا ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ کیا قوت کے سبب توبت بناتا ہے؟ اگر نصب بلد تنوین پڑھا جائے تو اس میں کبھی نعت کا پہلو پیدا ہو جائے گا۔ اور کبھی بدل یا عطف بیان ہو جائے گا۔ بہر حال آزر عربی لفظ ہے۔ اور یہ عجم میں استعمال نہیں ہوا۔

دوسرا لفظ ''آذر'' ہے۔ یہ فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی آگ، شمشی سال کے نویں مہینے اور ہر شمشی مہینہ کا نواں دن کے ہیں۔ آذر آباد گان اور اس کا معرب آذربائیجان اس سے مرکب الفاظ بنے ہیں۔ آذربائی جان ایران کے شمال کی طرف واقع ایک ملک ہے۔ کسی زمانے میں اس مقام پر بڑے بت تھے۔ اس لیے یہ مقام آذربائیجان کے نام سے مشہور ہوا۔ طبقہ ثانیہ ملوک فارس کے ایک بادشاہ گشتاسب جس نے زرتشت کی تعلیم سے متاثر ہو کر مجوسیت اختیار کیا تھا۔ اُس نے بلخ میں ایک بڑا آتش کدہ، آذر گشتاسب کے نام سے تعمیر کروایا تھا۔

آذر نام کا ایک شخص لطف علی حاجی اصفہانی بیگدلی۔ آقا خان بیگدلی کے فرزند اور شعرائے فارسی کے تذکرے آتش کدے کے مولف تھے۔ آپ ترکمانوں کے قبیلہ بیگدلی سے تھے۔ کہا جاتا ہے یہ قبیلہ سلطان محمود یا چنگیز خان کے زمانے میں ایران آیا تھا۔ اور یہیں آباد ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ ترک آذر نام رکھتے تھے۔ لیکن کسی نامور ایرانی کا نام کسی انسائیکلوپیڈیا میں نہیں ملا جو شاہی خاندان سے ہو یا امراء و روساء کے طبقے سے ہو۔

آذر بائجان میں رہنے والی قوم آزری کہلاتی ہے۔ یہاں 80% مسلمان ہیں۔ 80% مسلمانوں میں 70% ترک لوگ ہیں۔ 10% عرب اور ایرانی النسل لوگ ہیں۔ اس کی سرحدیں ترکی، ایران، روس اور جارجیا سے ملتی ہیں۔

بہر حال تراخانی حکمرانوں کے جداعلیٰ کے بارے میں بڑا ابہام موجود ہے۔ مثلاً وزیر حشمت اللہ کہتے ہیں۔ ان کا نام آذر تھا۔

ڈاکٹر لٹز کہتے ہیں	آذر شمشر تھا
قدرت اللہ کے مطابق	آذر جمشید
بڈلف کے مطابق	آذر (ایک لڑکی)
ڈیورنیڈ کے مطابق	سکندر اعظم کی اولاد
ڈریو کے مطابق	تراخان
شاہد حامد	سکندر اعظم کی اولاد
کرنل شابرگ کے مطابق	عبدالفیض
پیرس جردس کے مطابق	تراخان
جین فیر کے مطابق	تراخان
محمد نظیم کے مطابق	سکندر اعظم کی اولاد
شاہ رئیس خان کے مطابق	آذر جمشید

میرے نزدیک یہ لفظ محض آذر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ تواتر سے آیا ہے۔ ہمارے یہاں شمشر، جمشید، خسرو خان، بغدور خان، حیدر خان، مرزا خان وغیرہ عام نام ہیں۔ ہر کوئی استعمال کرتا ہے۔ لیکن کچھ نام ایسے ہیں۔ جو ان علاقوں کے لیے قطعی اجنبی ہیں۔ اور یہ استعمال ہوئے تو معدود چند لوگوں کے لیے اور پھر دوبارہ کبھی استعمال نہیں ہوئے۔ مثلاً آذر، تراخان، وغیرہ۔ یہ نام دساوری ہیں۔ اور ترکستان سے متعلق ہیں اور یقیناً کوئی ترکستانی یہ نام ساتھ لائے ہوں۔

اور پھر یہ لوگوں کے ذہنوں میں ثبت ہوئے اور تاریخ کا حصہ بنے۔ لیکن چونکہ یہ نام اس زمین کی پیداوار نہ تھے۔ اس لیے بعد میں عوامی اسماء کا حصہ نہ بن سکے اور شاہی انساب میں ہی ضم ہو کر رہے۔

جہاں تک آذر کے وطن اور قومیت کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں بھی متضاد

رائیں ہیں۔

وزیر حشمت اللہ	یارقندی ترک قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ بلتستان کی طرف سے آیا۔
ڈاکٹر لنز	روایاتی کہانی کی بنا پر پری زاد بتاتے ہیں۔ نگر کی طرف سے آیا۔
وزیر قدرت اللہ	بلتستان کی طرف سے آیا۔ قومیت کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔
بڈلف	آذر سکردو کے حکمران کا بھائی تھا۔ بلتستان سے آیا تھا۔
ڈیورنیڈ	سکندر اعظم کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ ہنزہ کی روایاتی کہانی کے مطابق۔
ڈریو	تراخان اور پر اسرار خصوصیات کا مالک تھا۔
شاہد حامد	سکندر اعظم کی اولاد
کرنل شامبرگ	عبدالفیض ایران سے بلتستان آیا۔ عبدالفیض کا لڑکا گلگت آیا۔
میر محمد نظیم خان	سکندر اعظم کی اولاد۔
راجہ شاہ رئیس خان	کیانی، ایران سے آیا۔

بڈلف آذر کو ایک طرف ایک روایاتی کہانی کی بنیاد پر سکردو کے حکمران کا بھائی قرار دیتے ہیں۔ تو دوسری طرف وہ اپنے مرتب کردہ شجرہ میں آذر کو ایک لڑکی ظاہر کرتے ہیں۔ اور ان کے شوہر کا کوئی اتہ پتہ نہیں دیتے۔ جمشید کو ان کا فرزند بتاتے ہیں۔ پھر اسی شجرہ میں ہنزہ و نگر کے حکمرانوں کا گلگت کے تراخانی خاندان سے محض ایک لڑکی کی بنا پر تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں خاندان یک جدیاں نہیں رہتے۔

مثلاً تراخان کی ایک لڑکی ہنزہ نگر سلسلہ کے راجہ مایور خان سے بیاہی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں کرگس اور مغلوٹ پیدا ہوتے ہیں۔ مایور خان کا باپ للی تھم اُس کا باپ شاہ تھم، اُس کا باپ نونی تھم غرض یوں یہ ایک الگ سلسلہ نکل آتا ہے۔

قدیم ہنزہ و نگر کے حکمرانوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو تراخانی یا ایران کے کیانیوں سے منسلک نہیں کیا۔ ان حکمرانوں نے جو دعوئ کیا وہ محض سکندر اعظم کی اولاد ہونے کا دعوئ ہے۔ میر محمد نظیم تک جو شاہی کہانی چلتی آئی وہ یہی کہانی تھی۔ جسے میر محمد نظیم نے

بڑے شدومد کے ساتھ دہرایا۔ وہ اپنے خاندانی شجروں کو مرتب کرتے ہوئے یہ تو کہتے ہیں کہ اُن کا نگر، سکردو، گلگت، یاسین، سریکول، پونیال کے حکمرانوں سے قریبی رشتہ داریاں ہوئی ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہنزہ کے حکمران سکندر اعظم کی اولاد سے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گلگت، یاسین، پونیال، سریکول، شنان وغیرہ کے ساتھ رشتے ناطوں کی وجہ سے رشتہ داریاں ہوئیں لیکن ان خاندانوں کا سلسلہ نسب کسی ایک جد سے نکلتا نظر نہیں آتا۔ جنرل ریٹائرڈ شاہد حامد میر محمد جمال خان آف ہنزہ کے قریبی دوست تھے۔ وہ میر محمد جمال کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُنھوں نے وہی کہانی دہرائی جو اس شاہی قبیلے میں موجود تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

" The ruling families of the too ltltle states are repeated to be descended from a common ancestor in the fifteen century, who they claim, was descended from Alexander"

شاہد حامد نے اپنی کتاب "قراقرم ہنزہ" میر صاحب کی لائبریری سے استفادہ کر کے لکھی وہ کہتے ہیں۔

" The mamuscript was a poignant reminder of the Mir and the pleasant holidays that we had spent in his company. I felt that the best tribute that i couldpay to his memory was to project his persanality and rule in a way that people all over the contry might come to appreciate his qualities and character and so came to Know him better, So, I decided to publish the manuscript which I had written in 1954 availing the facilities by the Mir's library and my discussions with the local elders and dignatories.

میر کی لائبریری، میر اور امراء وغیرہ سے جو معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ سکندر اعظم کی اولاد والی کہانی تھی۔ میر محمد جمال سے میرے بھی قریبی تعلقات تھے۔ میرے اور اُن کے درمیان خط و کتابت تھی۔ وہ ایک نامور عالم فاضل انسان تھے۔ اور تاریخ پر بڑی نظر

رکھتے تھے۔ اگر ان کے خاندانی مسودات میں کیانی ہونے کی کوئی کہانی ہوتی تو جنرل شاہد حامد ضرور اس کا تذکرہ کرتے۔

بڈلف اور کرنل شامبرگ دونوں قریب قریب ایک ملتی جلتی کہانی بیان کرتے ہیں۔ دونوں ان کہانیوں میں مافوق الفطرت عناصر کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں اور اس بنا پر ناقابل یقین بھی ہے۔ مثلاً ملکہ بلتستان کا پراسرار قوتوں کا مالک ہونا اور پھر اپنی پسند کے مردوں کو رات بسری کرنا اور پھر صبح انکا ہلاک کرنا اور اس طرح اولاد کا ہلاک کرنا عجیب افسانوی کہانی ہے۔ عبدالفیض اور ملکہ بلتستان کا شوہر بیوی بننا اور پھر ان کے فرزند کا آذر کا نوری کے ساتھ معاشقہ کرنا، پھر نوری کا اپنے باپ کو ہلاک کرنا ایک ہی نوعیت کی کہانیاں ہیں۔ کرنل شامبرگ کے مطابق نوری نے نہ صرف اپنے باپ کو ہلاک کیا بلکہ اُس نے آذر کو بھی اپنی بے رخی کی وجہ سے خودکشی پر مجبور کیا جبکہ شاہ رئیس خان فرماتے ہیں کہ آذر 16 سال حکومت کر کے اس تنگ وادی سے بیزار ہو کر کہیں نکل گیا تھا۔ کرنل شامبرگ کی بات زیادہ قرین قیاس لگتی ہے۔ جس عورت نے اپنے چہیتے باپ کو ہلاک کرانے میں مدد کی ہو تو کیا عجب ہے اس نے اپنے شوہر سے بھی بے وفائی نہ کی ہو۔

کرنل شامبرگ کہتے ہیں۔ آذر نے سات سال تک حکومت کی تاہم اپنی بیوی (نوری) کی حاسدانہ ستم رانیوں سے تنگ آکر خودکشی کر لی۔ ان کہانیوں کے ساتھ کرنل شامبرگ کہتے ہیں کہ موجودہ میر ہنزہ اور نگر دونوں سکندر اعظم کی نسل سے ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور دونوں کو یک جدیاں ہونے میں اعتراض بھی نہیں لیکن میرے نزدیک دونوں کا سکندر اعظم کی اولاد ہونا کوئی لگا نہیں کھاتا۔ (صفحہ 147)

یہاں یہ بات یاد رہے کہ سر اورل سٹائن، پروفیسر دانی، فیرلے، کرنل شامبرگ، جروس اور دیگر مورخین کا یہ پختہ خیال ہے کہ سکندر اعظم اس طرف کبھی نہیں آیا۔ پروفیسر دانی مختلف مباحث کے بعد لکھتے ہیں۔

"The anylysis of the original classical sources makes it now clear why it was not possible for Alexander to advance to Gilgit region and hence there is hardly any possibility of that region fallin within his imperial territory."

ان تفصیلات کی روشنی میں ایک بات زیادہ یقینی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ آذر بلتستان

کی طرف سے آیا۔ گلگت بلتستان میں ان دنوں کفر کا بازار گرم تھا۔ اور آذر بھی کافر تھا۔ میں وزیر حشمت اللہ سے اس بات پر اتفاق نہیں کرتا کہ آذر یارقندی ترک تھا۔ اگر آذر 1400ء کے قریب مشرقی ترکستان سے آیا ہوتا تو لازماً اسے مسلمان ہونا چاہئے تھا کیونکہ ان دنوں مشرقی ترکستان میں (1212ء تا 1369ء) چغتائی مغلوں کی حکومت تھی۔ 1357ء تک یہاں مغل اسلام قبول کر چکے تھے۔ مشرقی ترکستان میں تین سو سال پہلے تک انکی حکومت رہی۔

آذر پھر تراخان یا ترتراخان ناموں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ لوگ ترک تھے اور کسی زمانے میں ان کا کوئی نامور جد بلتستان آکر مقیم ہو گیا ہوگا۔ جس طرح لداخ کا بدھ شہزادہ رنچن کشمیر آکر صدر الدین کے نام سے کشمیر کا اولین مسلمان بادشاہ ہوا۔ اسی طرح آذر انقلاب زمانہ سے بلتستان سے گلگت آیا۔ اور پھر یہاں کی حکومت حاصل کی۔ شری بدت کا دیوا کو ہونا، پراسرار قوتوں کا مالک ہونا محض فسانے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آذر نے شری بدت کو قتل کر کے اسکی لڑکی سے شادی رچائی اور بس۔ اس میں شری بدت کی لڑکی کا یہ فسانہ بھی درست نہیں کہ اس نے باپ کے خلاف سازش کی اور یہ راز معلوم کیا تھا کہ اس کی جان کس شے میں ہے۔ گلگت میں میں اپنے بچپن میں اسی طرح کی کہانیاں اپنے ایک چچا سے سنا کرتا تھا۔ وہ الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، قصہ حاتم تائی کے بے شمار کہانیوں سے واقف تھا۔

آذر ایک کافر تھا۔ ترک تھا اور بلتستان سے آیا۔ ایران سے بھی نہیں آیا کیونکہ اگر وہ ایران سے آیا ہوتا تو مسلمان ہوتا۔ عبدالفیض اور عبدالغنی مسلمانوں کے نام ضرور ہیں۔ پھر ان کی اولاد کا یک لخت کافر ہو جانا درست نہیں لگتا۔ بلتستان میں اسلام کی آمد اور فروغ کے بارے میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ بات درست نہیں لگتی اور اس کی کوئی تاریخ ہے کہ 1400ء کے قریب دو مسلمان بھائی ایران سے آئے ہوں۔ آذر اور تراخان مغلوں کے نام ہیں۔ اور چنگیز خان کے شاہی کنبے سے متعلق ہیں۔ میں محمد الیاس مرزا صاحب اور وزیر حشمت اللہ سے اس بات پر اتفاق کرتا ہوں کہ آذر کا خاندان ترخان خاندان قیات سے تعلق رکھتا تھا۔ اور یہ مغلوں کا ایک شاہی خاندان تھا۔ اسی خاندان کا نمائندہ چنگیز خان تھا۔ جس نے چار طرف اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ اسے خاندان "تراخانی" مغل کہا جا سکتا ہے۔ بندوبست کے ریکارڈوں میں اسے تراخانی لکھنے کی بجائے ترکھنی، تراکھن وغیرہ لکھا گیا جو غلط تھا۔

میں اب یہاں آذر (ترخان) مغل کے پہلے فرزند کا ذکر کروں گا اور اس بات پر بھی

غور ہو گا کہ آیا اُسے پانی میں بہایا گیا تھا یا نہیں۔

1۔ کرنل شامبرگ : آذر کا لڑکا سوملک بتاتے ہیں۔ جسے دریا میں بہایا گیا۔ اور جسے گڈس مچھیرے نے بچایا۔ مرغوں کی اذان کا یہ کوئی ذکر نہیں کرتے۔ سوملک کو دیکھ کر نور بخت کی پستانوں میں درد اُٹھا تھا۔ (پستانوں میں درد اُٹھنے کی کہانی میں نے اکثر اور کہانیوں میں اپنے چچاؤں سے سنا تھا)

2۔ وزیر حشمت اللہ : شمشر کو آذر کا لڑکا بتاتے ہیں۔ اسے پانی میں بہانے کی کوئی بات نہیں کرتے۔

3۔ پیرس جروس : بچہ کا نام "تراخان" کہتے ہیں۔ جسے صندوق میں ڈال کر بہایا گیا تھا۔ اور اسے ہوڈر میں نکالا گیا تھا۔ ان کے مطابق "تراخان" نام ہوڈر والے سوتیلے باپ نے رکھا تھا۔ مرغ کے بلد اس تھم بئی کا قصہ یہ بھی تعجب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ملکہ نے مرغ کی اذان کی بنیاد پر تراخان کو اپنا راجہ تسلیم کیا۔ اس کی بہن سے کرگس اور مغلوٹ پیدا ہوئے۔

4۔ جین فیرے : بھی اوپر والی کہانی دہراتے ہیں۔

5۔ بڈلف : کے مطابق "جمشید" آذر کا لڑکا تھا۔

6۔ وزیر قدرت اللہ بیگ : کے مطابق آذر کا لڑکا سوملک تھا۔ وہ کہتے ہیں چونکہ یہ بچہ نور بخت اور آذر کے خفیہ ملاپ کا نتیجہ تھا۔ اس لیے اسے دریا میں بہادیا گیا۔

7۔ کرنل شامبرگ : دریا میں بہائے جانے والے لڑکے کا نام سوملک قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی گڈس مچھیرے کا ذکر کرتے ہیں۔

8۔ بڈلف کے مطابق : آذر کا لڑکا جمشید تھا۔ وہ دریا میں بہانے کا کوئی قصہ بیان نہیں کرتے۔

9۔ جنرل (ریٹائرڈ) شاہ حامد : بڈلف کی کہانی پر انحصار کرتے ہیں۔

10۔ ڈریو : تراخان کو اس خاندان کا بانی قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا لڑکا

آذر بتاتے ہیں۔ ڈریو نے مرغے کی کہانی نہیں دہرائی۔

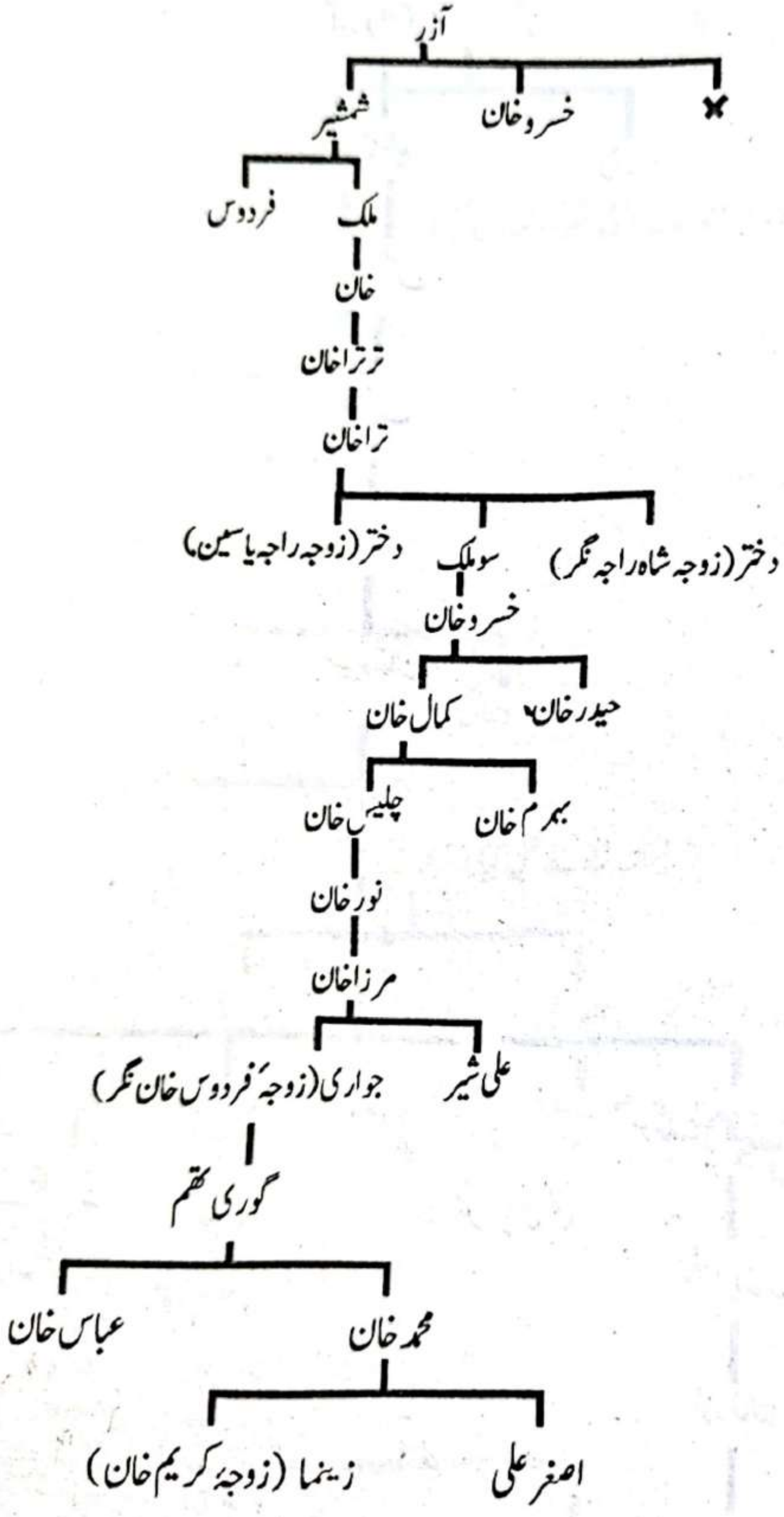
11۔ پروفیسر دانی : یہ کہتے ہوئے کہ کہانی مغلق ہے۔ شاہ رئیس خان کی کہانی دہراتے ہیں۔

12۔ شاہ رئیس خان : کے مطابق آذر کا لڑکا کرک تھا۔ جو دریا میں بہایا گیا تھا۔ وہ بڑے طمطراق سے گلگت کے پالتو مرغے کی کہانی دہراتے ہیں۔ "بلد اس کھم بنئی" کی کہانی نگر سے چلی اور بعد میں تخلیق ہوئی۔

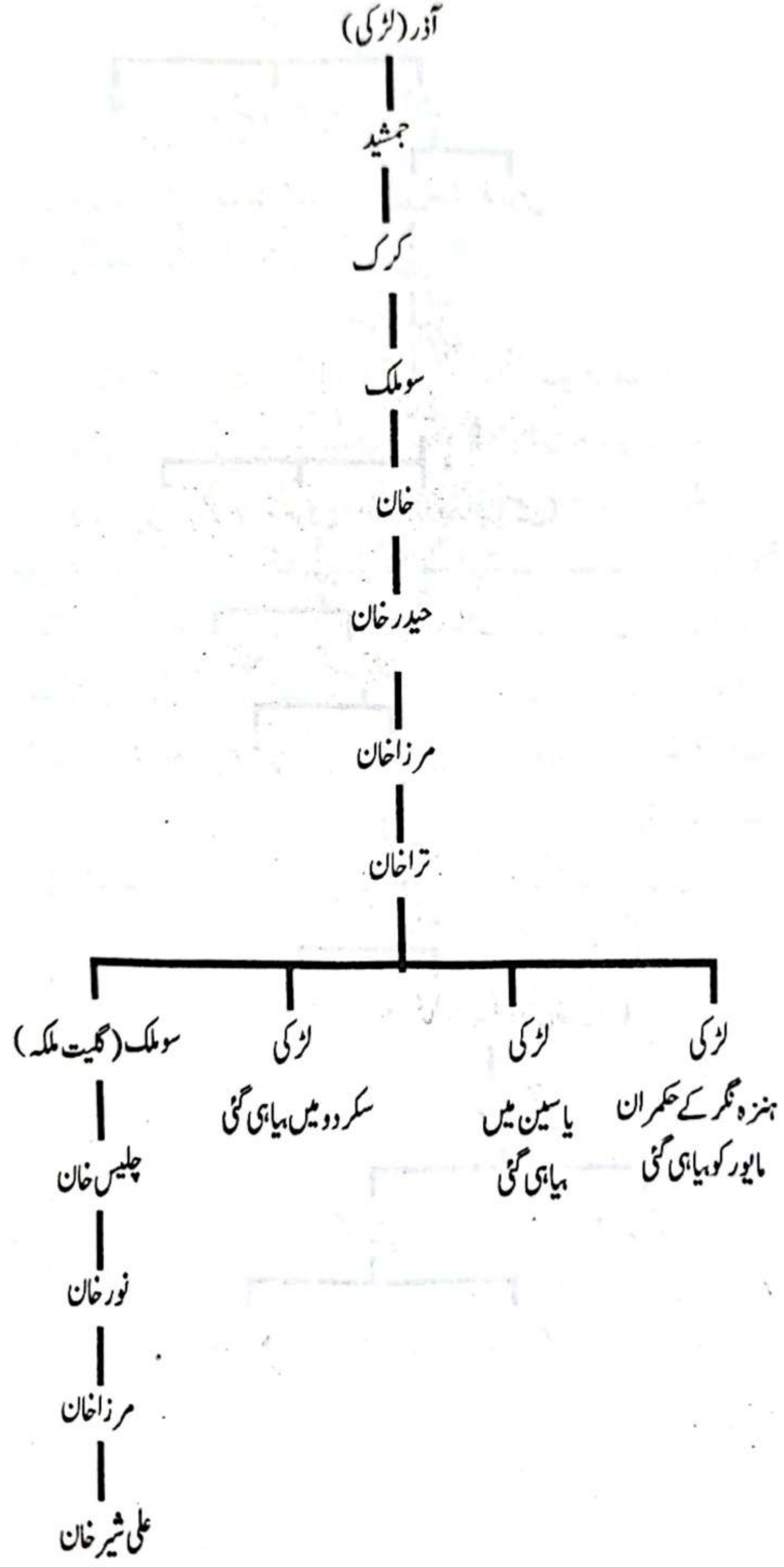
میرے نزدیک "آذر" مغل (ترخان) قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور چونکہ آذر کے اسلاف میں یہ خاندانی نام موجود تھا۔ اس لیے آذر نے اس کا نام "تراخان" رکھا تا کہ اس کا سلسلہ منقطع نہ ہو اور یہ خاندانی نام چلتا رہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ خاندان "تراخانی" مشہور ہوا۔ سوملک کے بارے میں آگے لکھا گیا ہے۔ یہ چترال اور ارد گرد علاقوں کا ایک نامور حکمران تھا۔ اس کی حکومت گلگت تک تھی۔ اسی شہرت کی بنا پر یہ نام اس خاندان میں در آیا۔ مرغے کا اذان دینا اور تراخان کا پانی میں بہانا محض فسانے ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں۔ کرک فارسی میں پالتو مرغے اور مرغی کو کہتے ہیں۔ شاہ رئیس خان صاحب نے اس نام کو اس حوالے سے تخلیق کیا ہے۔

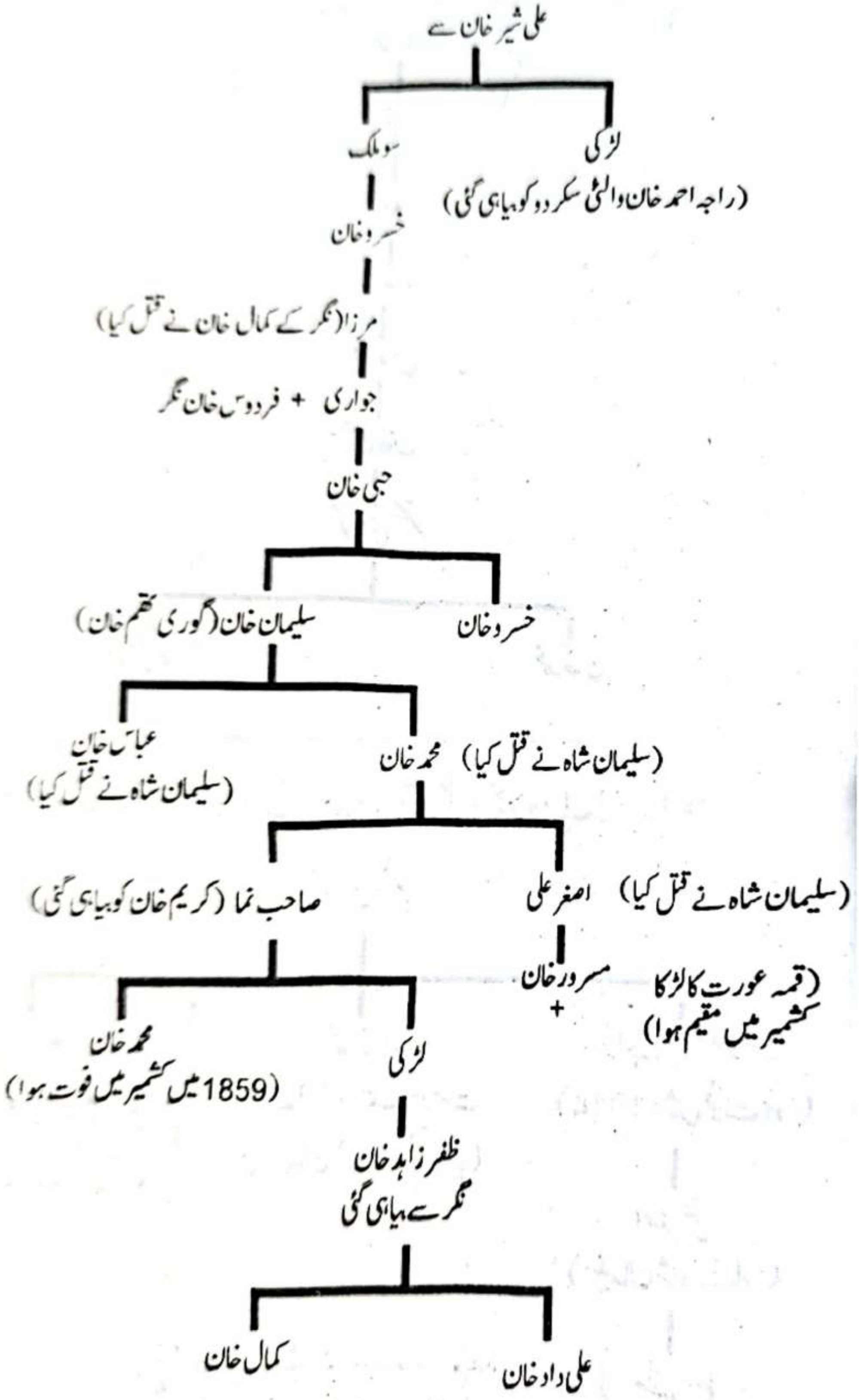
یہاں مختلف شجرے پیش کیئے جاتے ہیں۔ اس معجون مرکب سے آپ بھی حظ اٹھائیں۔

وزیر حشمت اللہ کا پیش کردہ شجرہ



بڈلف کا پیش کردہ شجرہ




علی شیر خان سے
سوملک
لڑکی
(راجہ احمد خان والئی سکردو کو بیاہی گئی)
خسرو خان
مرزا (نگر کے کمال خان نے قتل کیا)
جواری + فردوس خان نگر
جبی خان
سلیمان خان (گوری تھم خان)
خسرو خان
عباس خان
(سلیمان شاہ نے قتل کیا)
محمد خان (سلیمان شاہ نے قتل کیا)
صاحب نما (کریم خان کو بیاہی گئی)
اصغر علی (سلیمان شاہ نے قتل کیا)
مسرور خان
+
(قمہ عورت کا لڑکا
کشمیر میں مقیم ہوا)
محمد خان
(1859 میں کشمیر میں فوت ہوا)
لڑکی
ظفر زاہد خان
نگر سے بیاہی گئی
کمال خان
علی داد خان

فریڈرک ڈریو کا پیش کردہ شجرہ

تراخان

آذر

شمشر

خسرو

فردوس

حبی خان

گوری تھم

عباس خان — محمد خان

ڈاکٹر لٹنر نے 1800ء کے بعد درج ذیل شجرہ دیا۔

گوری تھم

عباس علی
(1815ء میں سلیمان شاہ نے قتل کیا)

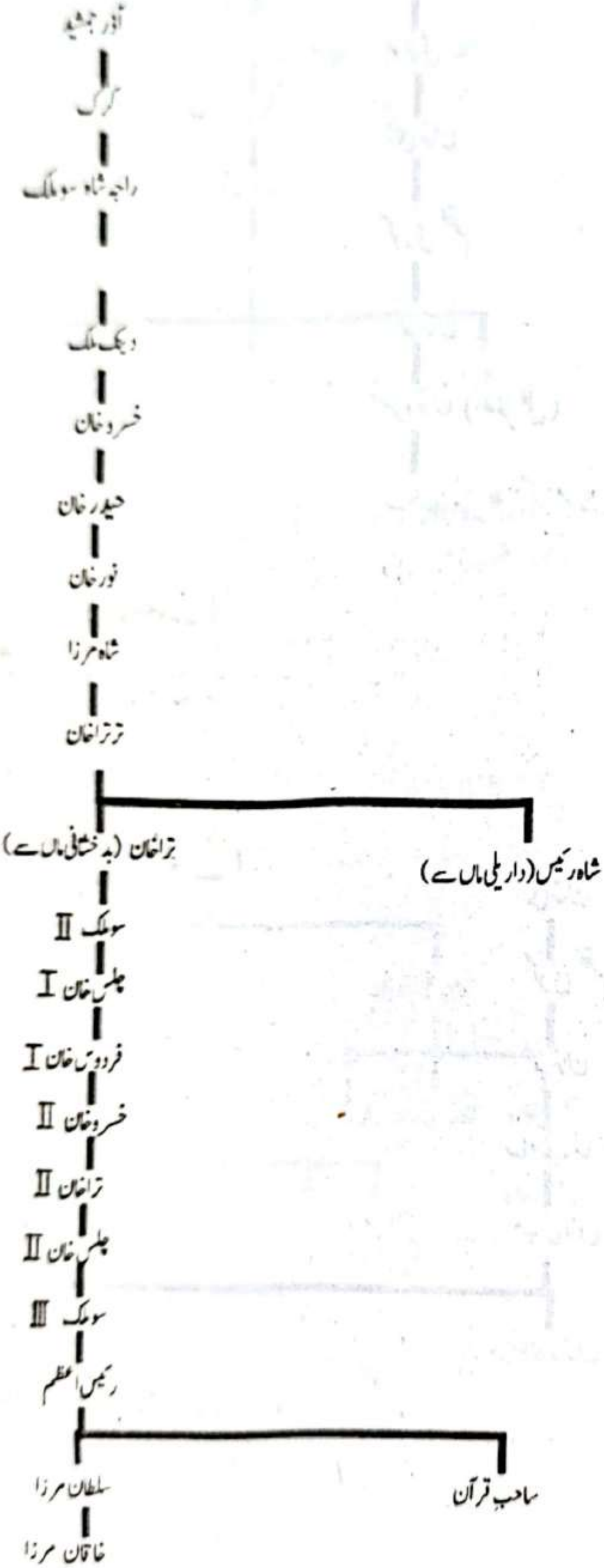
محمد خان
(1826ء تک حکومت کی سلیمان شاہ نے قتل کیا)

راجہ نام نامعلوم۔
(1814ء میں فوت ہوا)

اصغر علی
(سلیمان شاہ نے مارا)

منصور علی
(سری نگر میں قید رہا)

راجہ شاہ رئیس خان کا مرتب کردہ شجرہ



خاقان مرزا سے آگے
|
جواری
|
جبی خان
|
گوری تھم
|
محمد خان I
|
خسرو خان (اصغر علی)
|
صاحب نما + کریم خان

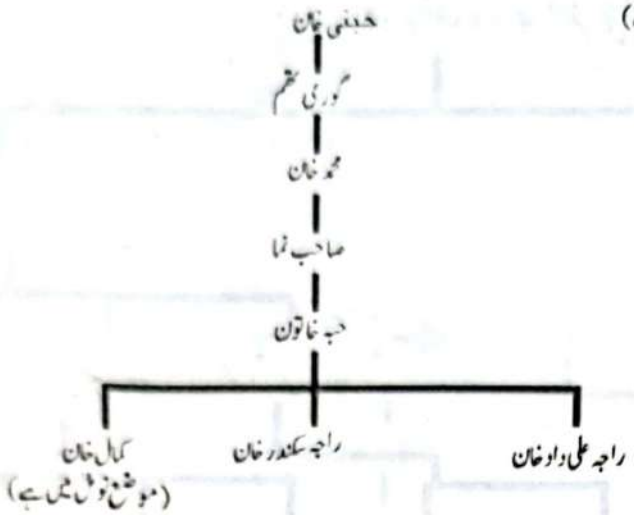
1893--94 کی بندوبست
میں شجرہ اس طرح درج ہوا:

ترکھن (مغلوٹ)

جی خان
|
گری تھم
|
محمد خان
|
صاحب نما
|
حبہ خاتون
|
راجہ سکندر خان — راجہ علی داد خان

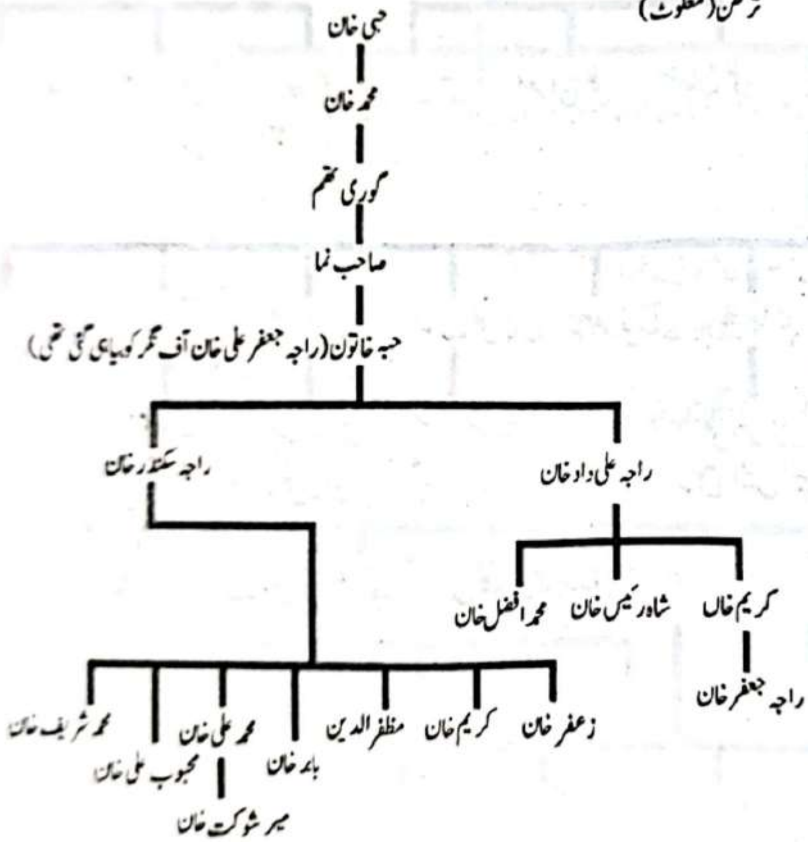
شجرہ وبندوبست 1973 بکرمی (1916)میں اس طرح درج ہے

(مغلوث)

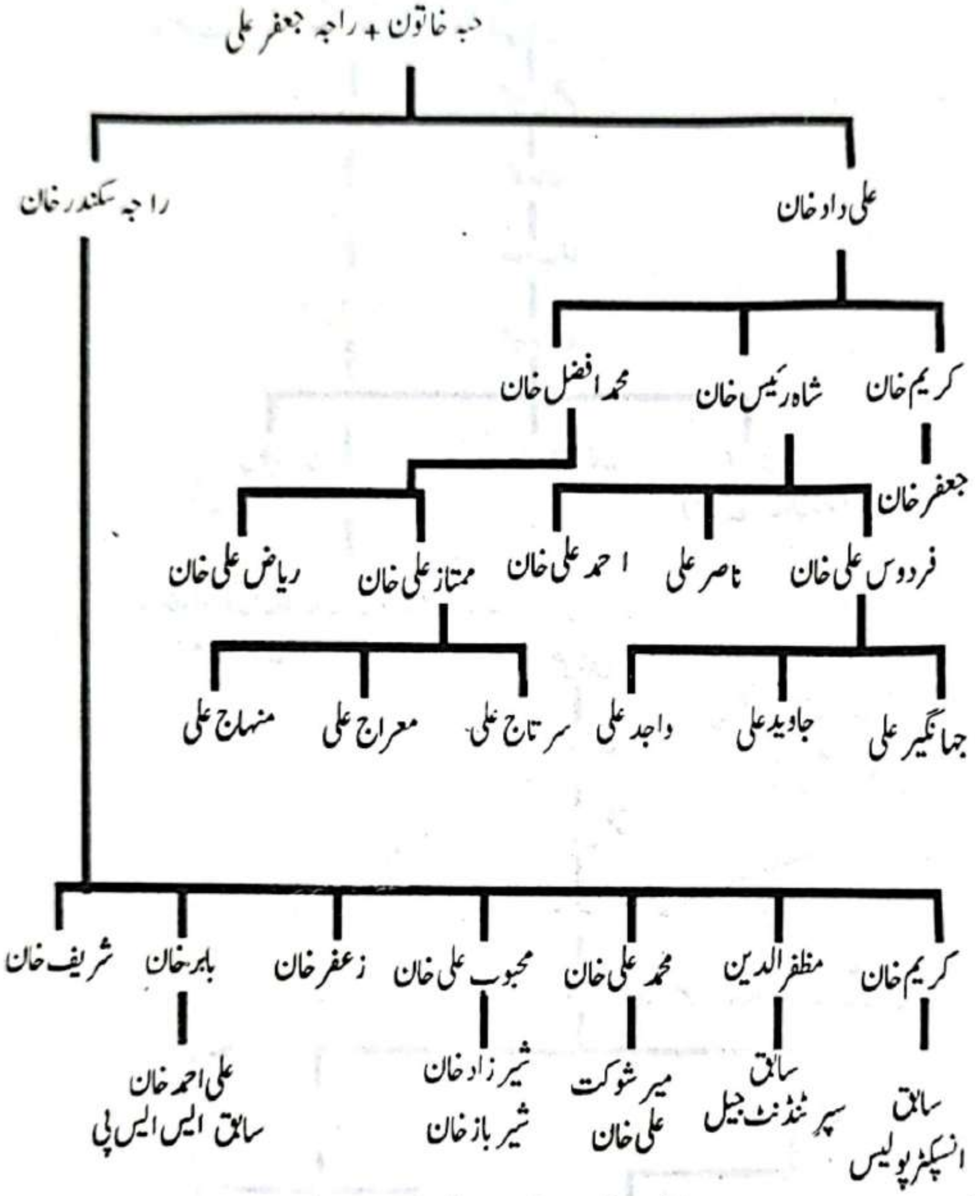


1946ء کی جمع بندی میں اس طرح شجرہ درج ہے

ترکمن (مغلوث)

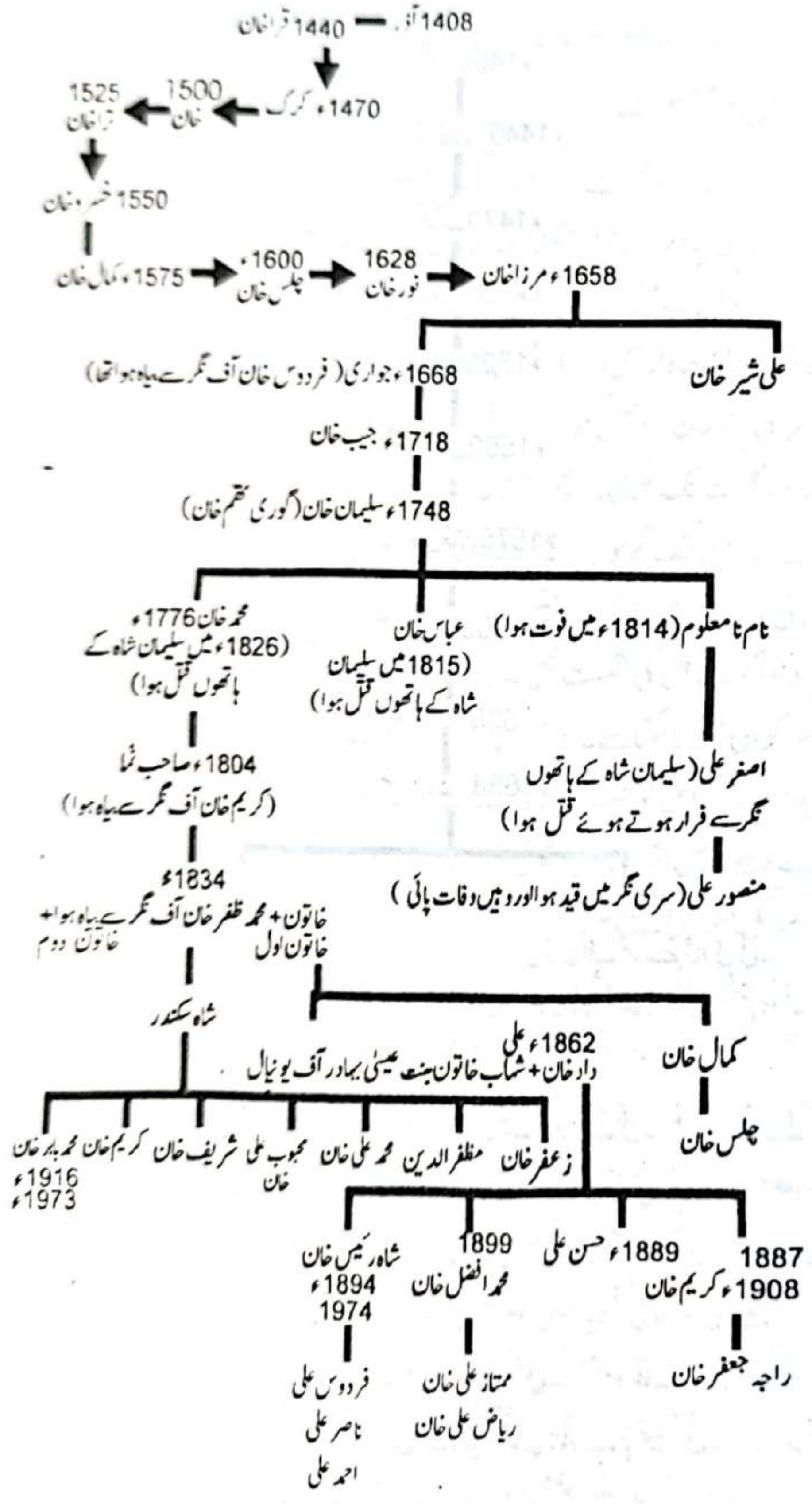


جدید شجرہ ترکھان / مغلوٹ



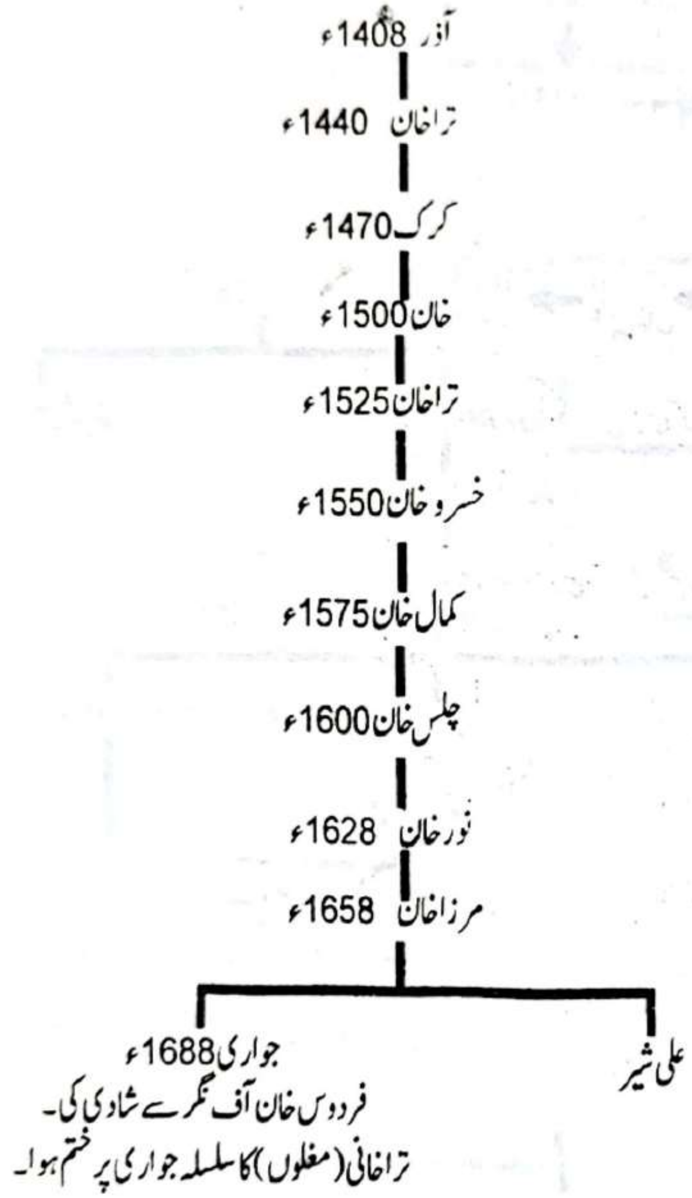
کیپٹن محمد بابر خان سابق اے آئی جی تحریک آزادئ گلگت کا ہیرو۔

مصنف کا تحقیقی بنیادوں پر تیار کردہ تراخانی، مغلوث کا شجرہ۔



مصنف کا مرتب کردہ

ترا خانی (مغل) کا شجرہ



ترا خانی مغلوں نے گلگت پر تقریباً تین سو سال تک حکومت کی۔ آذر سے لے کر مرزا خان تک تمام راجوں کے نام "مغل" نام تھے۔ خان مغلوں کی نشانی ہے۔ اور مغلوں ہی نے "خان" آذر، نام استعمال کیئے۔ ان حکمرانوں نے چترال تک کے علاقوں پر حکومت کی۔ تاہم "سوملک" جیسا پہلے بیان ہوا ہے۔ چترال، مستوج اور یارخن علاقوں سے وابستہ ایک حکمران تھا۔ اس کی حکومت گلگت تک پھیلی ہوئی تھی۔ "سوملک راجی" جیسی تمثیلات چترال میں زیادہ مروج تھیں۔ وہیں سے یہ تمثیل ہمارے ہاتھ آئی۔ بہر حال گلگت کے ترخان حکمرانوں کا شجرہ چنگیز خان تک جاتا ہے۔ یہ مغل ہیں اور آریوں کی طرح

یافث کی اولاد۔ اس میں کسی کمتری کی بات نظر نہیں آتی۔ یونان، ایران کے باسی آریا ہیں۔ سکندر اعظم اور ایران کے کیانیہ و کسر ویہ بھی آریا ہیں۔ اور آریا بھی یافث کی اولاد ہیں۔

کر گس و مغلوٹ:

ہنزہ و نگر کے حکمران کر گس و مغلوٹ کہلاتے ہیں۔ ان خاندانوں کے بارے میں بھی کئی پراسرار مافوق الفطرت کہانیاں جوڑی جاتی ہیں۔ ہمارے یہاں کیسر، ناگار جن، ڈوڈوشر گو (ایک مشہور گائے) پہاڑ تھنگ گیاپو، ڈم ڈیتھ دانئیل ڈیتھ (یعنی ایک بالشت جسم اور ایک بالشت داڑھی والا) شری بدت کی داستان اور کئی دیومالائی کہانیاں مروج رہی ہیں۔ کیسر کی داستان کا اصل مرکز لداخ، تبت کے علاقے تھے۔ یہاں سے یہ داستان بلتستان، ہنزہ، گلگت تک پھیلی۔ پھر داستان طراز اس دیومالائی داستان کو ہمارے شاہی درباروں تک لائے۔ ان قصہ گویوں نے اپنے مربیوّں کو خوش کرنے کے لیے ان کے اسلاف پر بھی دیو مالائی چادریں چڑھائیں۔ نتیجہ ہمارے یہ راجے اور ان کے اسلاف دیواکو قرار پائے۔ چونکہ یہ دیواکو تھے ان کی شکست بھی عام انسانوں سے ماورا بنائی گئی۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ دیو کو پر دیواکو ہی غلبہ پاسکتا ہے۔ دیواکو کی شادی دیواکو سے ہی ہو سکتی ہے۔ مثلاً گلگت میں شری بدت دیواکو تھا۔ اُس کو شکست دینے کے لیے ایک دیواکو کی خدمات ضروری تھیں۔ نگر کی طرف سے دینور میں اترنے والی مخلوق جس میں آذر جمشید بھی تھا۔ ایک پری زادہی تو تھا۔ ہنزہ پر کیسر کی حکمرانی کے نتیجہ میں حشتم بیگم کی اولاد کو فرار ہونا پڑا۔ یہاں کیسر کی ماورائی کہانی کو ایک عام انسانی کہانی سے جوڑ کر راہ فرار کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ حشتم بیگم کے خاندان کا ایک فرد لتی تھم نامی گلگت وارد ہوا۔ یہ کہانی وزیر قدرت اللہ بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ سو ملک کے تین بیٹے تھے۔ بڑے کا نام شاہ ملک تھا جو راجگان گلگت کا مورث اعلیٰ بنا۔ یہ ملک زرین شاخ اور خرسم یا خرپا کے نام سے بھی معروف ہے۔ روایت ہے اس کے سر پر سونے کے دو سینگ تھے۔ اور دونوں پاؤں گدھے کی طرح سم دار تھے۔ دوسرا بیٹا مہر ملک اور تیسرا زیگ ملک کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ دونوں بھائی شاہ ملک کے زمانے میں گلگت میں سکونت رکھتے تھے۔ ہنزہ میں مقول تیتم حکمران تھا۔ لیکن مالیہ جمع کر کے شاہ ملک کو گلگت بھیجا کرتے تھے۔ مہر ملک کے بعد اس کا بیٹا صاحب خان، پھر اس کا فرزند دولت شاہ اور دولت شاہ کا بیٹا شاہ ملک ثانی حکمران ہوئے۔ شاہ ملک ثانی نے بلتستان کی ایک خاتون حشتم بیگم سے شادی کی جس سے تین لڑکے

پیدا ہوئے جو اپنے بزرگوں کی طرح کبھی گلگت اور کبھی التت میں قیام کرتے تھے۔ ایک بار جب یہ تینوں بھائی التت میں قیام پذیر تھے۔ کیسر نامی ایک شخص لداخ سے ہنزہ وارد ہوا اور یہاں قابض ہوا۔ حشتم بیگم کی اولاد فرار پر مجبور ہوئی۔ اس خاندان کا ایک فرد لئی تھم نامی گلگت کی طرف اپنے بجدی بھائی راجا چلس خان کے پاس چلا گیا۔ جس نے اپنی بہن سے اس کی شادی کر دی اور اس کی اولاد میں سے دو توام بچے گرگس اور مغلت اپنے ماموں طرہ خان کی قرعہ اندازی سے علی الترتیب ہنزہ اور نگر کے حاکم بنے۔ ایک روز شکار کے بہانے مغلت کے رضائی باپ مغل بیگ نے گرگس کو تیر مارا اور قتل کر ڈالا اور ہنزہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن گرگس کے وزیر ہو نے مغل بیگ کو قتل کر کے اس کا بدلہ لیا۔ چونکہ گرگس کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس لیے یہاں کے لوگوں نے وزیر ہو کی مدد سے حشتم بیگم کی نسل سے جو کیسر لداخی کے خوف سے مفرور ہو گئے تھے۔ شاہ خان نامی پیر مرد کو ڈھونڈ نکالا اور گرگس کی بیٹی نور بی بی سے اس کا نکاح کر کے اسے تخت پر بیٹھا دیا۔ یہ لوگ اس کو آسمانی حاکم تصور کرتے ہیں۔ اور اپنی اصطلاح میں عیا شولم عیا شو کہتے تھے۔ بعد میں یہ عیاش کتس مشہور ہوا۔

اس اقتباس میں ان دیو مالائی نکات پر غور کریں۔

1۔ گلگت کے راجہ شاہ ملک کے سر پر سونے کے دو سینگ تھے۔ اور اُس کے دونوں پاؤں گدھے کی طرح سم دار تھے۔

2۔ کیسر نے لداخ سے آ کر ہنزہ پر قبضہ جمایا تھا۔

3۔ حشتم بیگم کے خاندان سے لئی تھم نے گلگت کے چلس خان کی بہن سے شادی کی اور ان سے گرگس اور مغلت دو توام بچے پیدا ہوئے۔

4۔ گرگس کی لڑکی نور بی بی کے لیے حشتم بیگم کے مفرور خاندان میں سے ایک پیر مرد شاہ خان ڈھونڈ نکالا گیا اور ان کی شادی کر دی گئی۔

5۔ لوگ اس شاہ خان کو آسمانی سمجھتے تھے۔ اور اس بنا پر یہ عیا شو مشہور ہے۔

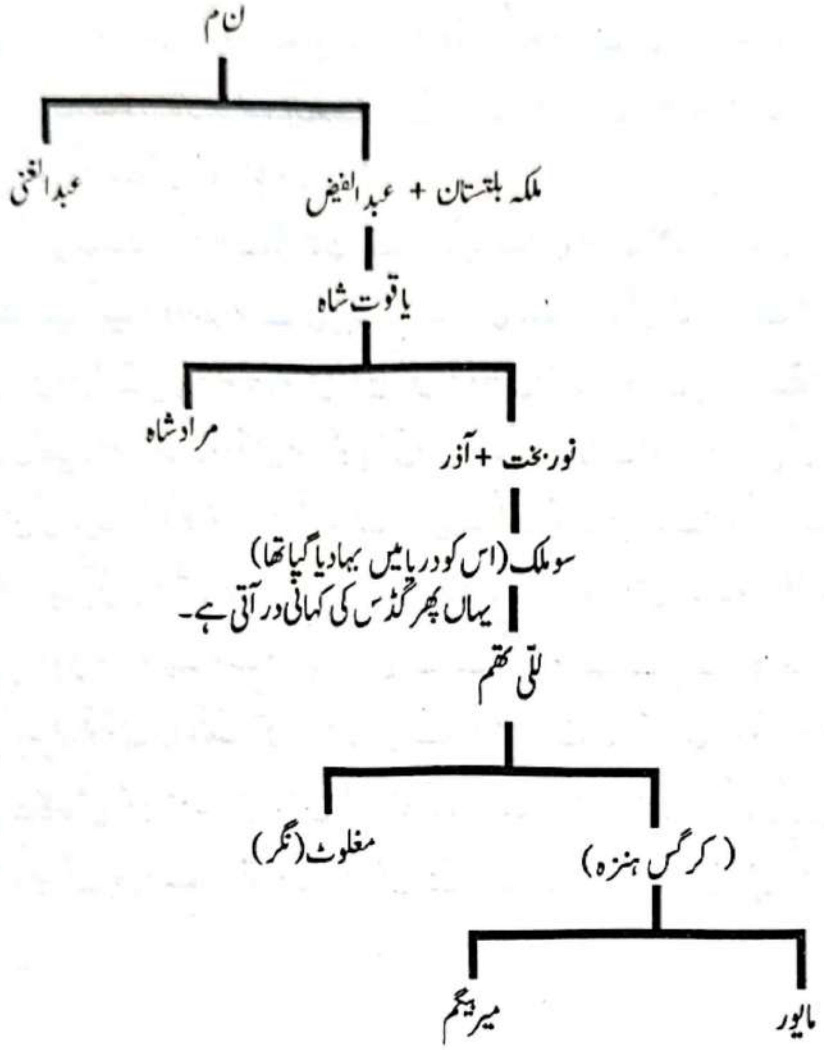
اوپر کے پانچ نکات پر غور کریں۔ یہ حیرت انگیز واقعات ہیں۔ اور کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کی جائے کہ لئی تھم کی شادی چلس کی بہن سے ہوئی۔

نیز یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ کیسر کی دیو مالائی کہانی بہت پرانی ہے۔

کرنل شامبرگ اپنی کتاب "آکس اور سندھ کے بیچ میں" میں لکھتے ہیں۔ ہنزہ نگر کے دو ریاستوں کی ابتدا کی تاریخ بڑی مبہم ہے۔ جو کہانی ملی ہے دلکش ضرور ہے۔ مگر غیر

متاثر کن۔ اس کہانی میں بڑا اختلاف رہا ہے۔ ہنزہ میں مجھے جو کہانی ملی وہ بڈالف کی کہانی سے مشابہ ہے۔ یہاں تاریخیں غائب ہیں۔ جو پریشان کن ہے۔ میں واقعات کو کسی مخصوص سال سے تطابق کرنے میں ناکام رہا ہوں۔

ایران سے دو شہزادے بلتستان آئے۔ ایشیا کے اس طرف معزز اور قابل توصیف اشیاء سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کی ایک عادت رہی ہے۔ کرنل شاہ مبرگ پھر ایک افسانوی کہانی دہراتے ہیں۔ جو ہنزہ میں رائج تھی۔ وہ اس داستان کو یوں بیان کرتے ہیں کہ ملکہ بلتستان کا یہ دستور تھا کہ وہ جس مرد کو چاہتی اُس کے ساتھ رات بسر کرتی لیکن صبح کو اُس مرد اور اُس کی نرینہ اولاد کو جو پیدا ہوتی ہلاک کر دیتی۔ اُن دنوں ایران سے دو شہزادے عبد الفیض اور عبدالغنی جلاوطن ہو کر بلتستان آئے ہوئے تھے۔ عبدالفیض سے ملکہ بلتستان کی آنکھیں چار ہوئی اور وہ اسے بہت بھا گیا۔ اُس نے اُسے قتل کرنے سے ہاتھ روکا ملکہ بلتستان چونکہ پر اسرار قوتوں کی مالک تھی۔ اور اُس کے عوام چاہتے تھے کہ اُن کی ملکہ کا ہم پلہ خصوصیات کا حامل شوہر ہو۔ عبدالفیض کو رعایا کے سامنے دیوا کو (دیوزاد) بنا کر پیش کیا گیا۔ کرنل شاہ مبرگ ہنزہ کے دانشوروں، حکمران طبقے کی مدد سے تیار کردہ درج ذیل شجرہ پیش کرتے ہیں۔



مایور کو گرگس نے در موتی کے قتل پر واخان جلاوطن کیا تھا۔ وہ وہاں سے شگنان چلا گیا اور وہاں شاہ درواز کی لڑکی سے شادی کی۔ اس سلسلہ کے لوگ بھی اپنے آپ کو سکندر اعظم کی اولاد سے سمجھتے ہیں۔ دوسری ایک روایت کے مطابق مایور یا ماموری کو گرگس اور مغلوٹ کا باپ قرار دیا جاتا ہے۔ اور اسے لٹی تھم کا بیٹا مانا جاتا ہے۔ اس طرح یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ آپ کسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ جب گرگس مارا گیا تو لوگوں نے میر یثم کو حکمران تسلیم کیا لیکن مغلوٹ کے اقتدار کو قبول نہیں کیا۔

پھر کچھ وقت کے بعد میر یثم کی حکمرانی سے تنگ آ کر لوگ پندرہ سال سے جلاوطن مایور کو لانے شگنان جاتے ہیں جو وہاں مر چکا ہوتا ہے۔ لیکن اُس کا لڑکا عیا شوُ نھیں ملتا ہے جسے ہنزہ لایا جاتا ہے اس طرح عیا شوُ ہنزہ کا حکمران ہوتا ہے۔

ایک اور کہانی کے مطابق "عیا شو" گرگس کی لڑکی ہوتی ہے جو مغلوٹ کے لڑکے

کمال خان سے بیاہی جاتی ہے۔ کرنل شامبرگ پھر کہتے ہیں۔ لڑکی عیاشو نگر کے کسی شہزادے سے سازباز رکھتی ہے اور اس تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے یہاں جنس بدل گئے ہیں۔ یہ کہانی ہو یا وہ کہانی عیاشو یا آسان والا موجودہ ہنزہ کے حکمرانوں کا باپ دادا یا ماں دادی ہے۔ کرنل شامبرگ پھر کہتے ہیں۔ میں یہاں اُن ہی کے الفاظ کو کوٹ کرتا ہوں۔

" The whole genology is most doubtful, though it is detail rather than general outline that is suspect. Easterm princes, like their collegues elsewhere , are always ready to elaborate their family trees and so enhance their prestige, as witness the fantastic claims of both present Mir's of Hunza & Nagir to be desecendents of Alexander of Macedonia, that these two chiefs have a common ancestor may be acknowldged, but to grant that he was descended from Alexander is asking too much of common politeness" (page 146-147)

اس عجیب و غریب مغلق داستان بھی پراسرار عناصر سے مملو ہے۔

1۔ ملکہ بلتستان اور عبدالفیض دیوا کو خصوصیات کے حامل ہیں۔

2۔ عبدالفیض اور عبدالغنی مسلمان نام ہیں۔ جبکہ چودہ سو عیسوی سے پہلے بلتستان اور گلگت کفر کی تاریکیوں میں گمُ تھے۔

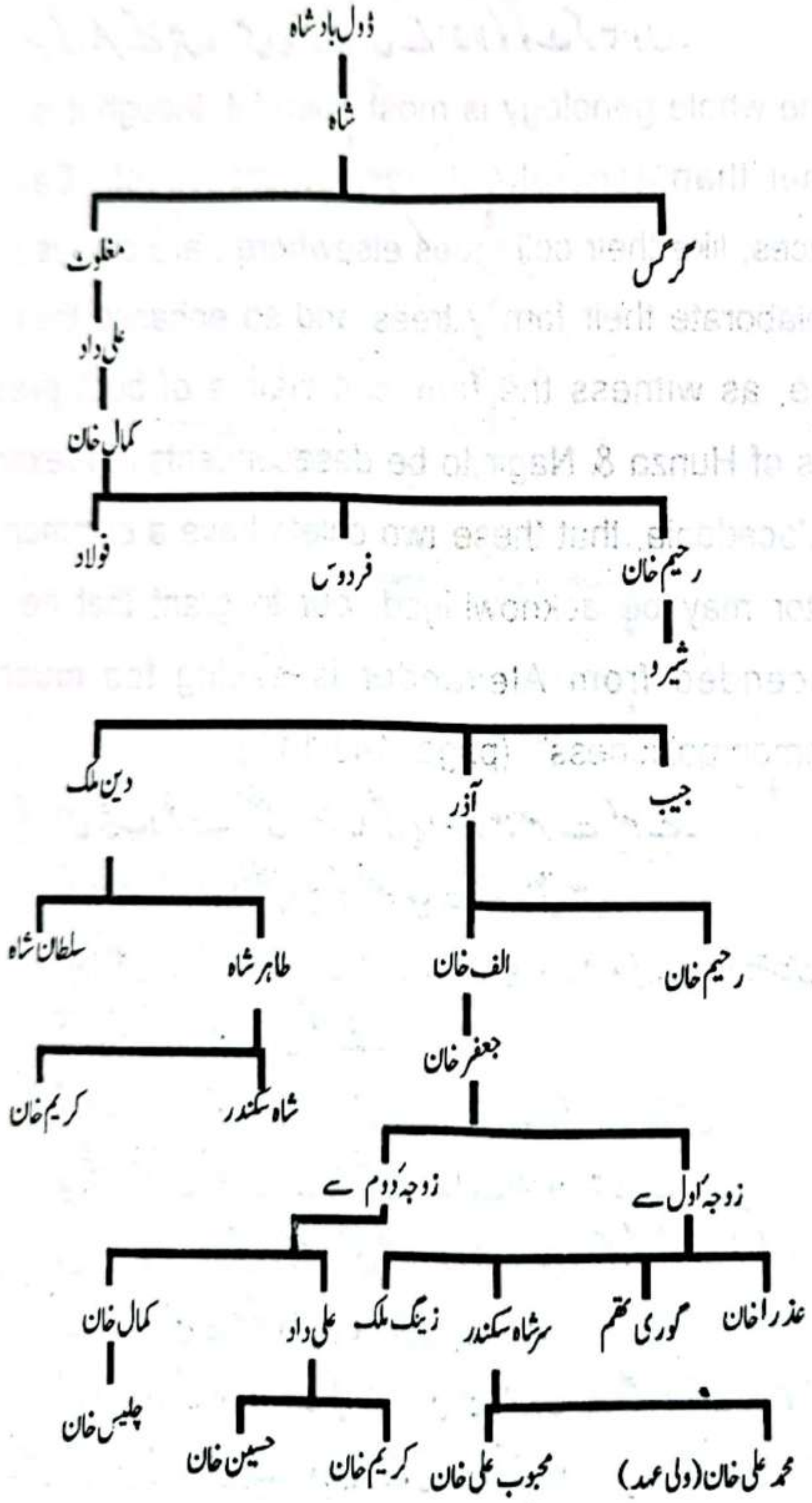
3۔ نور بخت اور آذر بھی عجیب انداز میں ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔

4۔ یہ شجرہ تراخان شجروں سے ملتا نہیں۔ یہ ایک ہنزہ داستان ہے۔

5۔ مایور اور ماموری کبھی لڑکا اور کبھی لڑکی بنتے ہیں۔ مایور کبھی گرگس کی لڑکی بنائی جاتی ہے۔ اور کبھی میر ہیگم کو لڑکی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

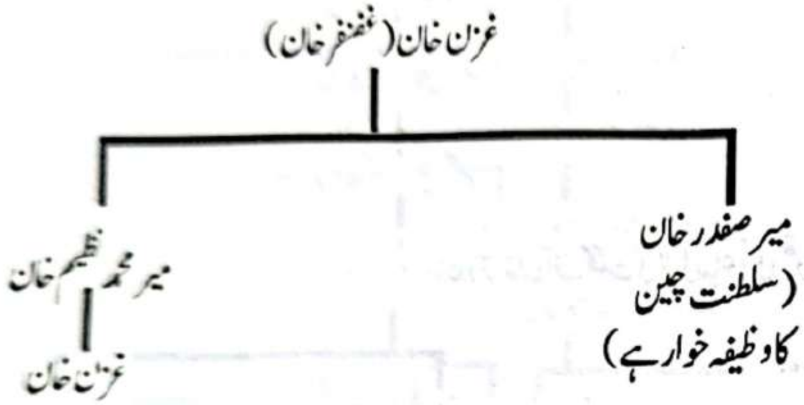
6۔ نور بخت اور آذر اور سوملک کی وہی کہانی ان شجروں سے بھی منسلک ہے جو تراخانی شجروں میں بھی دہرائی جارہی ہے۔ وہاں تراخانی دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور یہاں گرگس اور مغلوث کا باپ جنم لے رہا ہے۔

وزیر حشمت اللہ راجگان نگر کا ایک الگ شجرہ یوں پیش کرتے ہیں۔

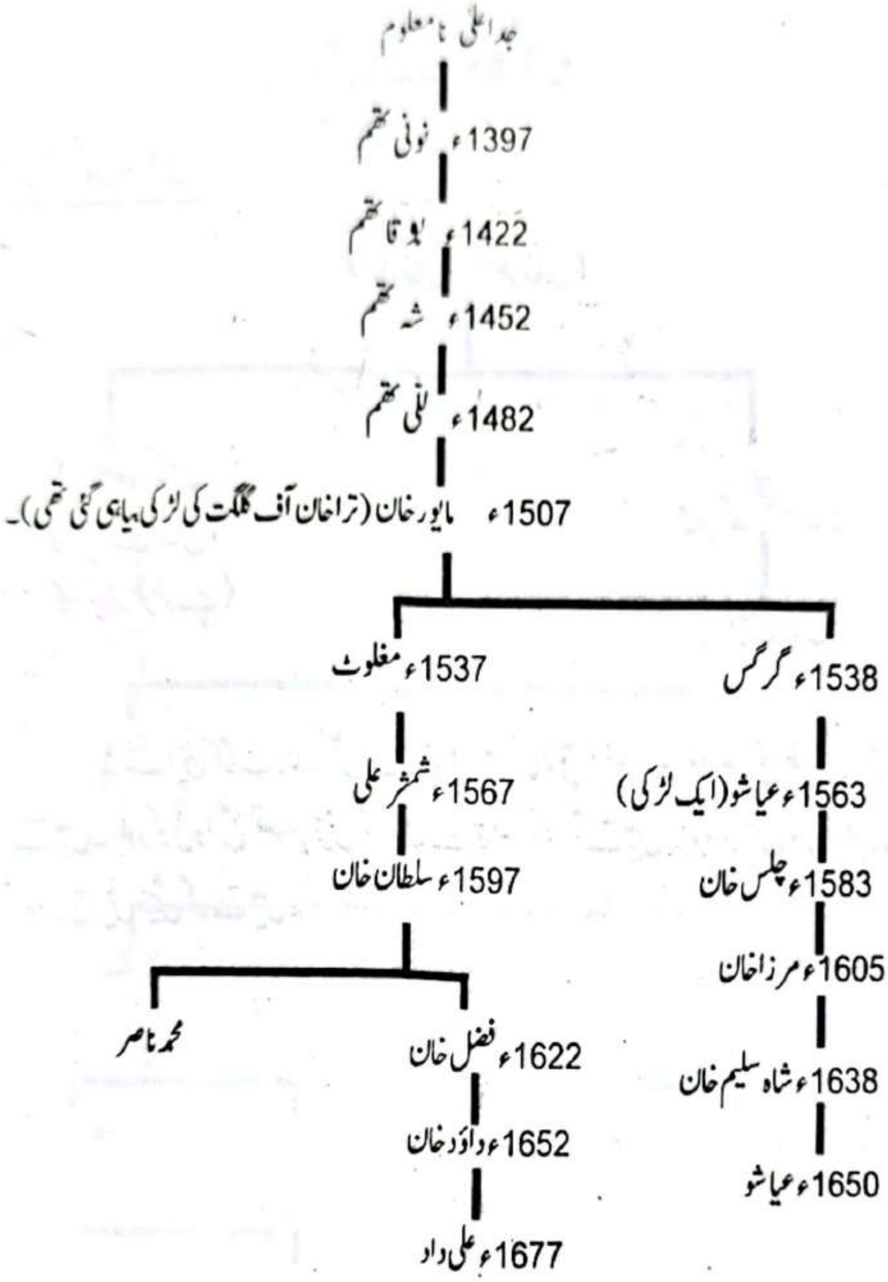


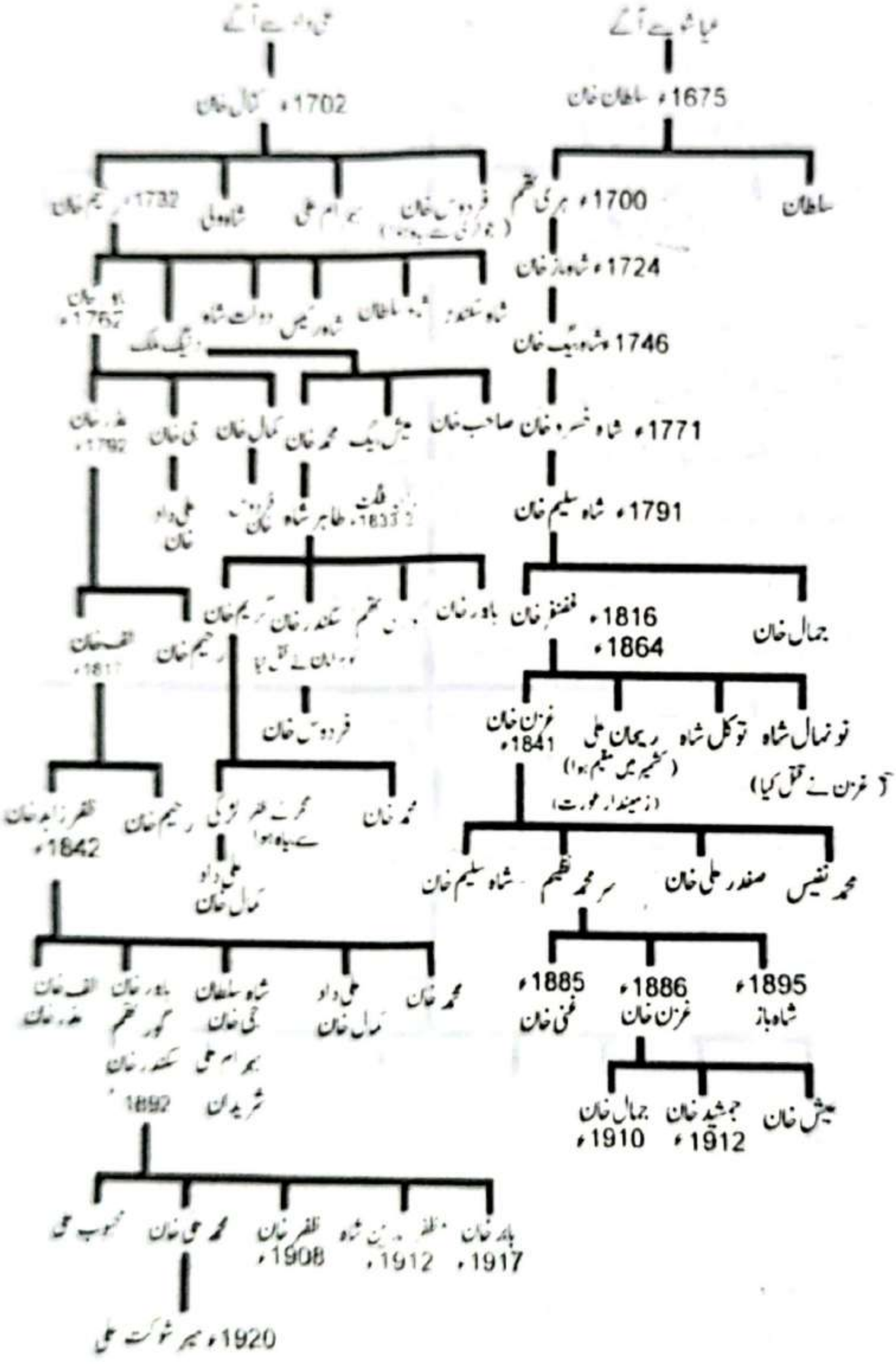
راجگان ہنزہ کا شجرہ

وزیر حشمت اللہ



بڈلف اپنی کتاب ہندوکش کے قبائل میں مافوق الفطرت عناصر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور کوئی واضح تصویر پیش کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ وہ گرگس اور مغلوت کا شجرہ درج ذیل پیش کرتے ہیں۔

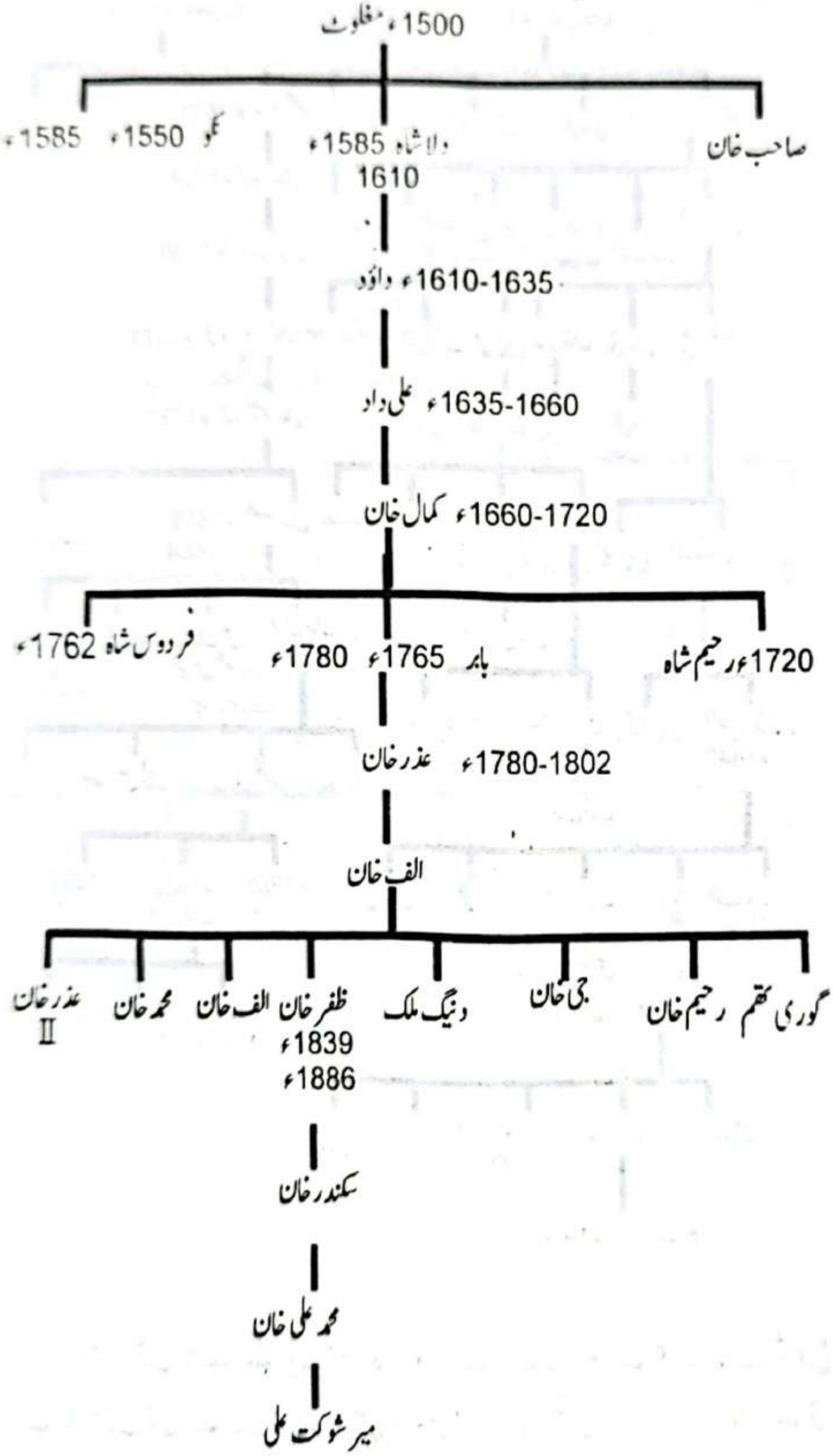

جد اعلیٰ نامعلوم
1397ء نونی تھم
1422ء بوتا تھم
1452ء شہ تھم
1482ء للی تھم
1507ء مایور خان (ترا خان آف گلگت کی لڑکی بیاہی گئی تھی)۔
1537ء مغلوٹ
1538ء گرگس
1567ء شمشیر علی
1563ء عیاشو (ایک لڑکی)
1597ء سلطان خان
1583ء چلس خان
1605ء مرزا خان
محمد ناصر
1622ء فضل خان
1638ء شاہ سلیم خان
1652ء داؤد خان
1650ء عیاشو
1677ء علی داد



تاریخیں نکالنے کے ایک مستند فارمولہ کے تحت میر شوکت علی خان سے شروع کر کے تاریخیں میں نے نکالی ہیں۔ بعض بنیادی اصل تاریخیں گزیٹیر اور دیگر مصدقہ دستاویزات سے حاصل کی گئی ہیں۔ یہ کام بھی پہلی دفعہ سرانجام پایا ہے۔

جرنل آف سنٹرل ایشیا دسمبر 1984ء میں جرگن نگر کے حکمرانوں کا ایک اور شجرہ پیش

کرتے ہیں۔ جو درج ذیل ہے۔



مغلوٹ اور گرگس کے مختلف شجروں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہو گا کہ قدیم

شجروں کو جوڑنے، ملانے اور زمانی رابطے دکھانے کے لیے محض اٹکل پچو سے کام لیا گیا ہے۔ نتیجہ کہیں لڑکا کو لڑکی بنا دیا گیا ہے۔ کہیں لڑکی کو لڑکا، کہیں باپ کو بیٹا اور کہیں بیٹا کو باپ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح شجروں کی لڑیاں کہیں سے کہیں نکلتی ہیں۔ اور ان میں کہیں بھی مطابقت نہیں۔ اصل میں یہاں قدیم شجرے تسلسل سے محفوظ رکھے جانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور یہ شجرے بہت بعد میں مرتب ہوئے۔ پھر ان شجروں کے ساتھ تخیلاتی تصورات کو باندھا گیا۔ لیکن ان خاندانوں کے اولین اجداد کو جنات اور آسمانی مخلوق بنا کر پیش کیا گیا کیونکہ ان کی اصلیت کا کچھ پتہ نہ تھا۔ آپ اس بات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ تراخانی دور کے آغاز کے بارے میں تمام ماہرین السنہ و بشریات تیرہ صدیوں کے بعد کی بات کرتے ہیں۔ جبکہ شاہ رئیس خان اسے ساتویں صدی میں لے جاتے ہیں۔ اب ایسی صورت حال میں شجروں کے تسلسل کو کیسے قائم کیا جائے اور پھر ایسا کرنے کے لیے لازماً کچھ نام وضع کرنے ہونگے کیونکہ زمانے کے بعد کو کیسے ختم کیا جائے۔ بڈلف، لٹز، کرنل شامبرگ وغیرہ اسی پس منظر میں بدگمانیوں کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان میں بڑی افراط و تفریط ہے۔ اور شامبرگ تو یہاں تک کہہ جاتا ہے کہ یہ تمام شجرے انتہائی مشکوک ہیں۔

بڈلف ہنزہ کے عیشے خاندان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ (Page-27-28)

" The ruling family of Hunza is called Ayeshe (heavenly), from the following circumstance. The two states of Hunza and Nager were formerly one, ruled by a branch of the Shahreis, the ruling family of Gilgit, whose seat of government was Nager. Traditionrelates that Mayroo Khan, apparently the first Mahommedan Thum of Nager some 200 years atter the introduction of the religion of Islamin to Gilgit, married a daughter of Trakhan of Gilgit, who bore him twin soms named Moghlot and Girkis. From the former the present ruling family of Nager is descended. The twins are said to have shown hostility to one another from their birth. Their father, seeing this

and unable to settle the question of succession, divided his state between them, giving to Girkis the north, and to Moghlot the south, bank of the river.

Age did not diminish their enmity and Girkis while out hunting, was one day killed by an adherent of Moghlot, a native of Haramosh, named Mogul Beg, who under pretence of a quarrel with Moghlot took service witn Girkis, and per suading him to look up at some game on the cliff above him, drove an arrow into his throat. Girkis left only a daughter, who according to the custom of the country, became Queen or Ganish of Hunza. Her first care was to avenge her Father's death. The tradition relates that having sworn to tear the murderer's liver with her teeth, she carried out her vow to the letter. Left without a chaperon, she was not long without getting into a scrape, as young ladies in similar circumstances are apt to do. The young prince Kamal Khan of Nager, a younger son of Moghlot, crossed the river by night, serenaded her, and won her heart. Night after night the lovers met, unknown to the rest of the world, till serious consequences ensued, and one fine day it was announced in Hunza that, though Providence had not yet provided the princess with a husband, it had seen fit to bless her with a son. Morals in Hunza are not of the strictest even now, so that few questions were asked, and the good people generally contented themselves

with beating their drums, dancing, and the usual festivities proper on the occasion of the birth of the prince Chiliss Khan. Kamal Khan seems to have "behaved badly" all through, as the above story is concealed in Hunza under the fiction that a prince of Shighnan became the brsband of the princess, but that his name being forgotten he is Known only as Ayesho (Heaven sent), from which the present ruling family of Hunza takes the mame. 11 In the meanwhile, my endeavour in 1866 to find traces of Alexander the Great's invasion in Dardistan, has led to the adoption of the myth of descent from that Conqueror by the Chinese Governor or the ancient hereditary " Tham " of Hunza, who really is "ayesho " or "heaven. born," owing to the miraculous conception of a female ancestor.

پروفیسر احمد حسن دانی ہنزہ روایات کا ذکر کرتے ایک اور کہانی بیان کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ جب گرگس مارا گیا تو اُس کے دو بچے ایک لڑکی نورنی بی نامی اور ایک لڑکا مایور زندہ تھے۔ مایور کو اُس کی بد عادات کی وجہ سے درواز جلاوطن کیا گیا تھا۔ اس لیے گرگس کے مارے جانے پر نورنی بی کو ہنزہ کے تخت پر بیٹھا دیا گیا۔ ہنزہ کے بعد کی تاریخ میں کچھ اور فرق ملتا ہے۔ لوری مر کے مطابق وزیر بٹو مایور کی تلاش میں واخان گیا۔ درواز میں اُسے یہ پتہ چلا کہ مایور فوت ہو چکا ہے۔ لیکن اُس کا لڑکا عیاشو نامی زندہ ہے۔ چنانچہ ایک عیاشو کو ہنزہ لایا گیا۔ اور نورنی بی کی جگہ اُسے ہنزہ کا حکمران بنا دیا گیا۔ ایک اور کہانی کے مطابق ہاشم بیگم جو شگنان بھاگ گئی تھی۔ عیاشو اُس کی نسل سے تھا۔ آپ کسی کہانی کو مانیں گے۔ تانا بانا سوٹ پرانا تمام محنت کے باوجود کوئی کہانی دل کو نہیں لگتی۔

چند نکات پر دوبارہ غور فرمائیں۔

1۔ مرزا خان کے بعد ترخانوں کا سلسلہ نسب جواری پر ختم ہوا۔ ان کی کوئی نرینہ اولاد

نسل آگے بڑھانے کے لیے موجود نہ رہی۔

2۔ ہنزہ و نگر کے ایک مشترکہ جد مایور کو گلگت کے ترخانوں کی ایک لڑکی بیاہی گئی۔ اور اُسی رشتے کے ناتے ہنزہ و نگر اور گلگت کے ترخان حکمرانوں میں تعلق پیدا ہوا۔

3۔ ہنزہ و نگر کے حکمرانوں کا شروع سے یہ ادّعا رہا کہ وہ سکندر اعظم کی اولاد سے ہیں۔ اور اُنھوں نے کبھی بھی کیانی ہونے یا گلگت کے ترخانوں سے ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

4۔ ہنزہ و نگر کے حکمرانوں نے یہ ضرور کہا ہے کہ اُن کی رشتہ داریاں، گلگت، بلتستان، درواز، پونیال، یاسین، داخان، شگنان کے علاقوں سے قائم رہی ہیں۔ یہ بات غلط بھی نہیں کیونکہ ان علاقوں کے حکمران خاندانوں میں شادی بیاہ کے ناطے ہوتے رہے ہیں۔

5۔ ہنزہ و نگر اور ترخانوں کے نسبی سلسلے ایک دوسرے سے الگ چلتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً مغلوٹ اور گرگس کا جد مایور خان پھر اس کا باپ للی تھم، پھر اس کا باپ شہہ تھم، پھر بوقا تھم پھر نونی تھم نام ملتے ہیں۔ نسلوں کے اخراج کے مستند فارمولا کے تحت ہنزہ و نگر کے حکمرانوں کا سلسلہ 1397ء تک جاتا ہے۔ جبکہ ترخانوں کا سلسلہ بھی قریب قریب اسی دور میں نکلتا نظر آتا ہے۔ بلکہ حالات ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ ہنزہ بہت قدیم زمانے سے آباد تھا اور اس کی حکومت بھی قدامت کی مظہر ہے۔

6۔ گرگس اور مغلوٹ کسی ایک جد کی اولاد تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کے جڑواں پیدا ہونے اور ان کی پشتیں جڑی ہونے اور پھر تلوار سے ان کو جدا کرنے کی کہانیاں محض فسانہ ہیں۔ گرگس اور مغلوٹ دو ایسے نام ہیں جو مغل فرینگ سے متعلق ہیں۔ اور یہ کسی مغل باپ نے مغلوں سے اپنی وابستگی بتانے اور یاد قائم کرنے کے لیے رکھے ہیں۔ اور یہ نام کرغیز اور مغلوٹ ہیں۔ مشرقی ترکستان میں زیادہ تر ترک قبائل بستے ہیں۔ ان میں اوئیغور، قازق، کرغیز، ازبک اور تاتار ہیں۔ یہ لفظ گرگس نہیں بلکہ کرغیز ہے اور مغلوٹ منگول ہو سکتا ہے اور ہمارے علاقے میں یہ لفظ منگول سے مغلوٹ ہوا یعنی منگول والا۔ ہمارے یہاں تعلق جوڑنے کے لیے لفظ کے آخر میں وٹ بڑھاتے ہیں۔ مثلاً کشیر سے کشروٹ، یعنی کشیر سے متعلق، شوکو سے شکیوٹ، بگر سے بگروٹ یعنی بگر سے متعلق (یہ ایک حکمران تھا) اسی طرح

ہمارے لوگوں نے منگول سے مغلوٹ بنادیا۔ میرے نزدیک کرغیز اور مغلوت ترک اور مغل نام ہیں۔ اس لیے ہنزہ و نگر کے یہ سلسلے شمال کی طرف ترکستان میں ملتے نظر آتے ہیں۔ 840ء تا 1212ء میں مشرقی ترکستان میں قرہ خانی سلطنت قائم تھی۔ اس وقت مشرقی اور مغربی ترکستان پر ایک ہی حکمران تھا۔ ہنزہ و نگر کے حکمرانوں کے ابتدائی ناموں میں مایور خان، بو قا خان، شبہ خان وغیرہ نام ملتے ہیں۔ اور یہ نام قرہ خان حکمرانوں کے نام کتے ہیں۔ ہنزہ و نگر کے اجداد میں ایک بو قا خان ہے۔ اور یہ بو قا خان قرہ خانی خاندان کا بانی کاشغر کا حکمران تھا۔ ایسا لگتا ہے اس دور میں اس سلسلہ کا کوئی شہزادہ ہنزہ وارد ہوا ہو اور پھر یہاں اپنی حکمرانی قائم کی ہو۔ یہ قرین قیاس اس لیے بھی ہے کہ ہنزہ کا علاقہ کاشغر، واخان، کے متصل واقع ہے۔ اور پورے ترکستان میں قرہ خانی حکومت کا سکہ چلتا تھا۔ ہنزہ علاقہ بھی اس حکومت کے زیر نگیں ہوگا۔

7۔ کرگس (چوہا)، مغلوٹ (نرنیولا) کی تشریحات انکل پچو ہیں۔

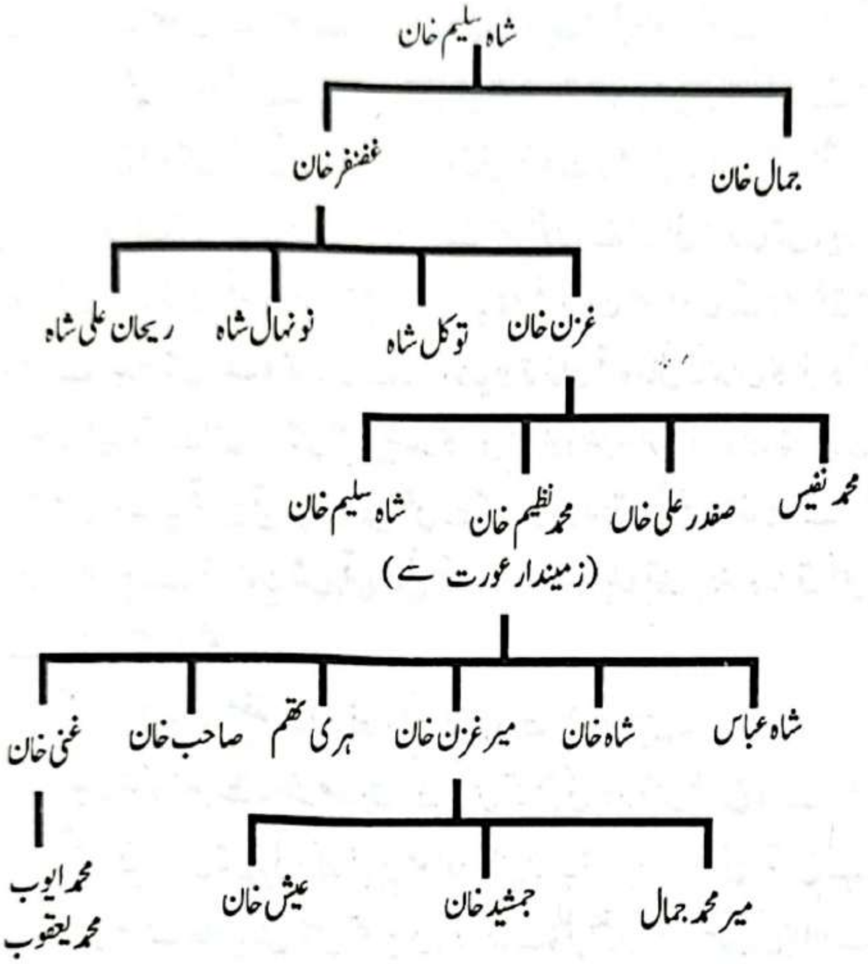
8۔ عیسا شو کو حضرت عائشہ صدیقہ سے لفظی تطابق کی بنا پر جس طرح ملانے کی فکر کی گئی ہے۔ اس میں رتی برابر سچائی موجود نہیں۔ یہ ڈاکٹر لنز کی ذہنی اختراع ہے۔

9۔ اس طرف کیا دنیا میں کہیں بھی پری زاد، جنات یا للی پٹین جیسی مخلوق کی اولاد سے ہونے کا خیال جہلا کا ہی ہو سکتا ہے۔

10۔ شمالی علاقہ جات کی تاریخ میں الف لیلوی داستانوں کے چربے اتارے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ باتیں زیب داستان کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن ان کو تاریخ کا حصہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

11۔ یہاں کوئی مخلوق دیوا کونہ تھی۔ جب رشتے ناتے نہ ملتے، جب اصلیت کا کھوج نہ لگتا تو پھر دیوا کو یا آسمانی مخلوق کا سہارا لیا جاتا۔ الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، حاتم طائی، داستانوں میں ہیرو جب کہیں پھنس کر رہ جاتا تو ایسی مشکل میں حضرت الیاس، حضرت خضر یا کسی بزرگ کی مدد سے ہیرو کو مصیبت سے نکالا جاتا۔

آخر میں عیشو خاندان کا جدید شجرہ دیا جاتا ہے۔


شاہ سلیم خان
جمال خان
غضنفر خان
غزن خان
توکل شاہ
نونہال شاہ
ریحان علی شاہ
محمد نفیس
صفدر علی خاں
محمد نظیم خان
(زمیندار عورت سے)
شاہ سلیم خان
شاہ عباس
شاہ خان
میر غزن خان
ہری تھم
صاحب خان
غنی خان
میر محمد جمال
جمشید خان
عیش خان
محمد ایوب
محمد یعقوب

تعارفات

" قراقرم کے قبائل" ایسے تشنگانِ شوق کے لئے جوئے شیر فراہم کردینے کے مترادف ہے جنکی علمی پیاس "راج ترنگنی" اور "تاریخ اقوام کشمیر" کے مطالعہ کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہے۔ ایسے وقیع اور دقت طلب موضوع کا انتخاب کر کے، وسیع اور جامع معلومات پر مبنی کتاب منظر عام پر لانا پروفیسر عثمان علی صاحب کا ایک لازوال کارنامہ ہے۔ زیرِ نظر کتاب مصنف کے وسیع مطالعے، انتھک محنت، گہری تحقیق، اعلیٰ مشاہدہ، بے پایاں لگن اور جاں فشاں مشکل پسندی کی ایک شاندار مثال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب نہ صرف ایشیاء بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی علم و تحقیق کی دنیا میں نئی راہیں متعین کرے گی۔ بقول حافظ

بیانِ شوق چہ حاجت کہ حالِ آتش دل
تواں شناخت زسوزے کہ در سخن باشد

خوشی محمد طارق

27مارچ 1999ء گلگت۔

قراقرم کے قبائل کتاب مصدِقات پر مشتمل خطۂ قراقرم کے بارے میں اولین مضبوط و مبسوط تاریخ ہے۔

عبدالخالق تاج تحصیلدار و نائب
صدر حلقہ ارباب ذوق گلگت

(1) مسیح کشمیر میں فوت ہوئے۔ ترجمہ و تلخیص از ناصر احمد 1986ء
(2) اسلامی تہذیب و تمدن از عشرت رحمانی 1987ء
(3) سندھی نامہ از نیاز ہمایونی 1978ء
(4) رودِ کوثر از شیخ محمد اکرم 1958ء
(5) سندھی اردو لغت مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ وڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان 1979ء
(6) تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو صاحب سکسینہ 1929ء مترجمہ مرزا عسکری
(7) میری آخری کتاب از ڈاکٹر غلام جیلانی برق 1977ء
(8) طبقات ابنِ سعد حصہ اول مترجمہ علامہ عبداللہ العمادی 1957ء
(9) تزک تیموری (اردو) ابو الہام شم ندوی
(10) تزک بابری (اردو) رشید اختر ندوی 1965ء
(11) تفہیم القرآن جلد سوم از حضرت ابو العلی مودودی 1992ء
(12) ترکی جمہوریہ کی نشاۃِ الثانیہ از ضمیر احمد ہاشمی 1932ء
(13) مغربی تمدن کی ایک جھلک از سید مجتبیٰ موسوی لاری 1360ھ
(14) عکس شجرہ جات مرتبہ امیر سنگھ اسسٹنٹ مہتمم بندوبست 21 مارچ 1894ء
(15) عکس شجرہ جات مرتبہ ٹھاکر سنگھ مہتمم بندوبست 15ء اگست 1916ء
(16) تدریس مطالعہ پاکستان حصہ اول مولف ڈاکٹر محمد رشید 1991ء
(17) تاریخ اور روایات از ڈاکٹر مبارک علی 1983ء
(18) قدیم لداخ (تاریخ و تمدن) از کاچو سکندر خان جنوری 1985ء
(19) شمالی علاقہ جات میں اسماعیلی دعوت از فدا علی ایثار 1991ء
(20) تاریخ عہد عتیق ہنزہ از وزیر قدرت اللہ بیگ
(21) تاریخ مغلیہ ترخان سلاطین (سندھ اور گلگت) از محمد الیاس مرزا 1984ء
(22) کشمیر میں اشاعت اسلام از سلیم خان گمی 1986ء
(23) کمال اتاترک مصنف استاد محمد توفیق مترجمہ مرزا اکرم الٰہی خاموش
(24) گلگت، نظریہ اور آزادی، از پروفیسر عثمان علی 1995ء
(25) سوانح حیات حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی از سید اسد اللہ شاہ دوار کی۔
(26) جلوہ کشمیر از ڈاکٹر صابر آفاقی 1980ء
(27) شنالوجی از پروفیسر عثمان علی 1991ء

(28) گلگت کی روگ کہانی از پروفیسر عثمان علی 1992ء

(29) چین کے مسلمان از حاجی ابراہیم۔ٹی۔وائی۔ما ترجمہ تابش صدیقی 1986ء

(30) اسلامی انسائیکلوپیڈیا کا پہلا سالنامہ (اسلامی المانک) مرتبہ قاسم محمود

(31) خطہ قراقرم زبانیں اور معاشرہ از پروفیسر عثمان علی 1996ء

(32) مضامین قرآن حکیم از زاہد ملک 1983ء

(33) کشمیر میں جناب امیر کبیر سید علی ہمدانی کا تبلیغی دور از سید اسد اللہ شاہ دواری۔

(34) کشمیر پر مغلوں کی جارحیت از پروفیسر محی الدین حاجنی مترجمہ ٹی۔ایم میر 982ء

(35) سخن دان فارس از مولانا محمد حسین آزاد 1988ء

(36) چنگیز خان از توراکینہ قاضی

(37) مشرقی ترکستان مولف عیسیٰ یوسف الپتکین مترجمہ ثروت صولت 1987ء

(38) روس میں مسلمان قومیں از آباد شاہ پوری 1989ء

(39) وسط ایشیا میں روس کے عزائم از جوزف پوپوسکی مترجمہ نذیر حق 1986ء

(40) شنا زبان اور اقوام (مقالہ) از پروفیسر عثمان علی

(41) ڈائری تحریرات والد گرامی منشی محمد یوسف مرحوم

(42) نقیب آزادی از راجہ محمد علی شاہ صبا ماچا 1998ء

(43) اردو ڈائجسٹ سال نامہ 1966ء

(44) جنگ مڈویک میگزین 3 جون 1983ء

(45) سفر نامہ مارکو پولو از مارکو پولو مترجمہ عاصم بٹ ستمبر 1996ء

(46) کشمیر اور وسط ایشیا از خواجہ غلام احمد پنڈت 1993ء

(47) شاہ رئیس خان تاریخ گلگت مولف پروفیسر احمد حسن دانی 1987ء

(48) تاریخ ادبیات۔ علاقائی ادبیات مغربی پاکستان جلد دوم 1971ء

(49) ادبیات اسلام آباد جولائی تا ستمبر 1987ء

(50) شمالی پاکستان از رشید اختر ندوی 1990ء

(51) تاریخ پاک و ہند مرتبہ درسی ادارہ گجرات

(52) تاریخ اقوام کشمیر مکمل از منشی محمد دین فوق 28 جون 1934ء

(53) تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم از منشی محمد دین فوق

(54) تاریخ بحر الجہان از منشی امیر اکبر خان 1989 بکرمی

(55) ہفتہ وار لاہور (داروؤں کی اصلیت) 18 اپریل 1977ء
(56) تاریخ اقوام کشمیر از منشی محمد دین فوق 7 دسمبر 1913ء
(57) مشرق کا سوئیزر لینڈ (سوات) از محمد پردیش شاہین 1988ء
(58) درسی جغرافیہ مرتبہ درسی ادارہ گجرات
(59) سلسلہ نوربخشیہ کشمیر اور اصلاح کی ضرورت از محمد اسد اللہ قریشی
(60) تاریخ پاکستان و ہند از ابو امام وغیرہ
(61) ہندوستانی لسانیات از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور 1961ء
(62) مقدمہ تاریخ زبان اردو از مسعود حسین استاد شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(63) اباسین کوہستان از محمد پردیش شاہین 1988ء
(64) مختصر تاریخ اسلام از مولانا غلام رسول مہر 1962ء
(65) آریائی زبانیں از سد ھیشورورما 1960ء
(66) تاریخ مغل قبائل ریاست جموں و کشمیر (جلد اوّل) از سردار بشیر احمد صدیقی 1963ء
(67) دو چینی سیاح از تابش صدیقی
(68) تین مسلمان سیاح از تابش صدیقی
(69) آئینہ کشمیر مرتبہ محمد عبداللہ قریشی (ادبی دنیا کا نمبر)
(70) مقدمہ ابن خلدون قبل از اسلام مترجمہ حکیم احمد حسین الہ آبادی
(72) تاریخ پونچھ از سید محمود آزاد 1975ء
(73) مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ از چوہدری غلام رسول
(74) زبان اور ثقافت از ڈاکٹر غلام علی الانا 1987ء
(75) بلوچستان کے قبائل حصہ اول ترجمہ پروفیسر ایم انور رومان 1989ء
(76) آب حیات از مولانا محمد حسین آزاد
(77) تاریخ اسلام از ڈاکٹر حمید الدین
(78) کوہستان قراقرم سے بحیرہ قزوین تک از جی ایم میر 1996ء
(79) تاتاریوں کی یلغار از ہیرلڈلیم ترجمہ عزیز احمد 1960ء
(80) بھارت کا بحران از رونلڈ سیگل ترجمہ حسن عابدی 1969ء
(81) کشمیر عہد بہ عہد از ڈاکٹر ایم ایس ناز 1993ء

(82) اوریحان البیرونی مرتبہ سنگ میل پبلی کیشنز 1965ء
(83) تاریخ پاکستان از محمد علی چراغ 1986ء
(84) اسلام گلگت میں از استاد غلام حسین 1994ء
(85) افغانستان دارا سے امان اللہ تک از لیفٹیننٹ جنرل سر میکمن ترجمہ پروفیسر ریاض صدیقی 1987ء
(86) قائد رسالہ کالج آف ایجوکیشن 1979ء
(87) تاریخ مغلیہ ترخان، لوہار، چغتائی، اور برلاس جلد اول پاکستان کے مغل قبائل از محمد الیاس مرزا 1984ء
(88) ارض پاکستان کی تاریخ جلد اوّل و دوم از رشید اختر ندوی 1986ء
(89) تاریخ اسلام از پروفیسر خورشید حسین بخاری 1969ء
(90) پشتون تاریخ کے آئینے میں از سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل ترجمہ سید انوار الحق جیلانی (550 تا 1964 تک)
(91) تمدن ہند از ڈاکٹر گستاؤلی بان ترجمہ مولوی سید علی بلگرامی۔
(92) بلتستان پر ایک نظر از محمد یوسف حسین آبادی 1984ء
(93) چترال از عنایت اللہ فیضی
(94) تصویر کشمیر از ڈاکٹر ایم ایس ناز 1992ء
(95) سات دریاؤں کی سرزمین از ابن حنیف 1985ء
(96) بلستان تاریخ وسیاست از محمد قاسم نسیم 1994ء
(97) چترال ایک تعارف از اسرار الدین وغیرہ 1986ء
(98) قراقرم ہندوکش منظوم علی 1985ء
(99) تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں از ڈاکٹر صابر آفاقی 1984ء
(100) مکمل تاریخ کشمیر از محمد الدین فوق 1991ء
(101) بلتستان تہذیب وثقافت از محمد حسن حسرت 1995ء
(102) تاریخ چترال از منشی عزیز الدین 1987ء
(103) انڈس کوہستان از رازول کوہستانی 1998ء
(104) تاریخ اقوام عالم حصہ اول و دوم از مرتضٰی احمد خان 1962ء
(105) مکمل راج ترنگنی جلد اول و دوم (اردو) ترجمہ ٹھاکر اچھر چند

(106) گلگت اور شنازبان از ڈاکٹر ناموس 1961ء

(107) تاریخ جموں از الحاج مولوی حشمت اللہ خان لکھنوی 1968ء

(108) اردو ڈائجسٹ سال نامہ 1966 (وادیء سندھ میں دس دن) از ضیا شاہد

(109) تذکرہ اقوام ہندوکش قراقرم چترال از فراموز خان 1992ء

(110) ہفتہ روزہ پاک جمہوریت لاہور 22 تا 28 جنوری 1986ء

(111) روزنامہ جنگ اسلام آباد کا تاریخ پس منظر از پروفیسر انور بیگ اعوان 9 اکتوبر 1985ء

(112) جنگ جمعہ میگزین 6 مئی 1994ء عربی دنیا کی پہلی زبان از حافظ عارف صدیق۔

(113) روزنامہ جنگ 2 جون 1982 وادیء سندھ کے قدیم باشندے کس نسلی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ از شیخ عزیز

(114) جمع بندی محکمہ مال 1946ء

(115) پہچان از محمد الیاس مرزا منگول ریسرچ اکیڈمی لاہور

(116) معاشرتی علوم (سوم) از عثمان علی 1998ء

(117) چھوک ماچھوک از یوسف شہزاد 1991ء

(118) بندوبست رپورٹ (اول) مرتبہ امیر سنگھ نائب مہتمم بندوبست 94-1893ء

(119) اردو دائرہ معارف اسلامیہ مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ تیار کردہ دانش گاہ پنجاب لاہور

(120) اردو کا جامع انسائیکلوپیڈیا جلد اول ودوم مرتبہ جسٹس ایس اے رحمان وغیرہ

(121) (چین میں اشاعت اسلام کی ابتداء) از سہیل احمد صدیقی جنگ میگزین

(122) تاریخ ایران جلد دوم از مرزا مقبول بیگ بدخشانی

(123) بابر بادشاہ مغل یا ازبک از اثر چوہان (نوائے وقت)

(124) تاریخ ادب اردو از رام بابو صاحب سکسینہ ترجمہ مرزا محمد عسکری (لکھنو) 1929ء

(125) ماہنامہ پیام راجپوت کراچی ماہ جنوری 1999ء مدیر راؤ محمد اقبال علی خان۔

(126) مقالہ ایران اور پاکستان کے ساڑھے چار ہزار سالہ لسانی روابط کا ایک مختصر جائزہ از عین الحق فرید کوٹی رسالہ دانش۔

Bibliography (English)

1. The India we served by sir Walten Roper Lawerence Bart. (1928)
2. Jesus in Heaven on earth by Al-Haj-Khawaja Nazir Ahmed. (1972)
3. This is Kashmir by Pearce Gervis. (1954)
4. Muslim Minorities in the world today by M.Ali Kethani. (1990)
5. An Introduction to Anthropology volume two (ethnology) by victor Barnouw. (1982)
6. Virtue's new treasury of knowledge vol.I to Vby Michael W.Demsey. (1977)
7. Memoranda on the Indian states. (1930)
8. Cultures of Hindukush edited by Karl Jettmarn in collaboration with Edelberg. (1974)
9. Sind A general introduction vol.1by H.T. Lambrick.(1975)
10. Focus on NAS Monuments of Gilgit, Nagar & Hunza by Dr.Ahmed Hassan Dani. (The Muslim 5th September 1990)
11. The tabakat-I-Nasiri complied by major Raverty.
12. Muslim in China A brief history by Brigdier (Retd) Iqbal Shafi(The Muslim Islamabad 22nd Nov.1977).

13. The Rise & Rule of Tamerlane by Beatrice forces Man2(1989)

14. The Lesson of History by Will and Arial Durant.(1977).

15. History of the Arghuns and Tarkhans of sind (1507-1593). By Mahmudul Hassan Siddiqe. (1972)

16. Article "Mediaevl Kingship in Gilgit" the PakistanTimes, 25th March 1987 by Prob. Ahmed Hassan Dani.

17. List of Leading Officials, Nobles and Personages in Jammu and Kashmir states 1918, 1925, 1939.

18. Daristan in 1866, 1886, 1893 by G.W.Leitner.

19. The Making of A Frontier by Col.Algernan Durand.(1977.)

20. Between the Oxus & the Indus by col R.C.F.Schom berg.

21. Karakuram Hunza by Maj.Gen(Retd)S.Shahid Hamid (1979).

22. Tribes of Hindoo Koosh by Maj.J.Bidduljoh Bsc(1977).

23. Journal of Central Asia vol.VII 2nd Dec.1984.

24. The Jumoo and Kashmir Territories by Frederic Drew(1980).

25. History of the Saracens by Ameer Ali Syed.(1975).

26. Administration report of the Jammu & Kashmir state(1994).

27. A journey to the Source of the River, Oxus by Captian John Wood.(1976)

28. The Races of Afghanistan by Surgeon Major H.W.Bellow.(1979)

29. Where Three Empires Meet by E.G.Knight.(1978)

30. The lion River the Indus by Jean Fairley.(1975)

31. The Gilgit Game by John Keay. (1979)

32. Baltistan in History by Banat Gul(1984)

33. Pakistan in the Pamir Knot by Zulfqar Khalid(1987)

34. Festivals folklore of Gilgit by Ghulam Muhammad (1980)

35. Gilgit Manuscripts vol edited by Dr.Nalinaksha DuttPh.d.(1939)

36. Code of Tribal custom in the Ladakh Tehsil By Thakar Singh (1912)

37. Studies in Pakistan Popular culture edited by William L.Hanavey & Wilma Heston.

38. Militry Report & Gazetteer of the Gilgit agency and the Independent territories of Targir & Darel.(1927).

39. On Alexander, Track to the Indus by Sir Aurel Stein K.C.I.E.(1975)

40. Chilas the city of Nagaparbat (dyamar) by Dr.Ahmed Hassan Dani.(1983)

41. The Native races of Northern India by Crooke(1977)

42. Bolor & Dardistan by Karl Jettman.(1980)

43. Imperral Gazeteer of India(Kashmir & Jammu) (1983)

44. History of Northern Areas of Pakistan by Prof. Dr. Ahmed Hassan Dani(1984).

45. The Tarikh –e-Rashidi of Mirza Muhammad Haider Dughlat edited by N.Elias.

46. Hudual al . Alam 982 AD Translated by V. Minorskey. (1980)

47. Kalhan's Raja Tarangini Translated & edited by M.A. Stein Vol. I & II (1979)

48. Kasher I vol. By Al-Hajj Dr.G.M.D Sufi(1948)

49. An account of the Kingdom of Cabul fo Elphinstone 1815 revised addition 1839 by sir Alexander Barni.



ڈاکٹر پروفیسر علامہ نصیر الدین نصیر ہنزائی
مغل حاجی گوژ دانشور، مفکر صوفی منش
بزرگ



صوبیدار صفی اللہ بیگ (مغل) انقلاب آزادی
گلگت کا ایک اہم کردار



نامور لکھاری منشی محمد یوسف مغل
(مرحوم) مصنف کتاب کے والد گرامی



میجر مسعود احمد مغل (ای ایس سی آنرز)
(پی ایس سی)



مغل قوم کے دو نامور سپوت عبدلواحد
سابق جائنٹ سکریٹری حکومتِ پاکستان اور
میجر مسعود احمد (پی ایس سی آرز)
(پی۔ایس۔سی)



مصنف کتاب پروفیسر عثمان علی اور سید محمد
عباس مرحوم (حسینی سید)



لیفٹنٹ جنرل نجم خان ہلال امتیاز
(ملٹری) (دھرم خیل مشن) سرجن جنرل
پاکستان آرمی شمالی علاقہ جات کا پہلا
لفٹنٹ جنرل



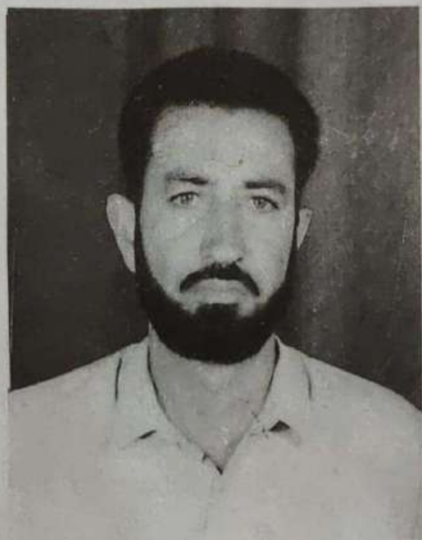
شیر محمد مغل بیورو چیف روزنامہ آج ضلعی
رپورٹر اے پی پی سکریٹری اطلاعات حکارہ
مغل ویلفیئر ایسوسی ایشن ایک نامور صحافی



حاجی زوار سفر علی خان (مغل) (مرحوم)



جمشید خان دُکھی مغل جنرل سکریٹری
حلقہ اربابِ ذوق گلگت



محمد قادر مغل جاگیر بسین



رئیس احمد مغل



ماسٹر حاجی غلام قادر (مغل) بسین



وسیم احمد مغل (امریکہ)



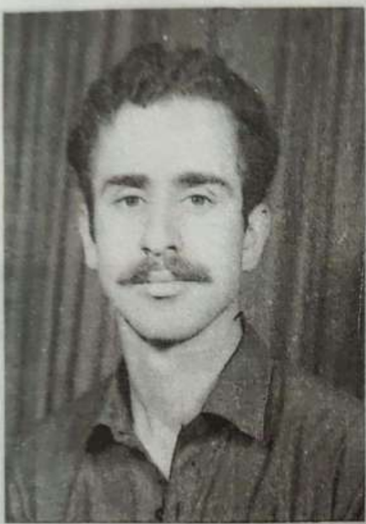
حاجی زوار سفر علی خان (مغل) (مرحوم)



جمشید خان دکھی مغل جنرل سکریٹری
حلقہ ارباب ذوق گلگت



محمد قادر مغل جاگیر بسین



رئیس احمد مغل



ماسٹر حاجی غلام قادر (مغل) بسین



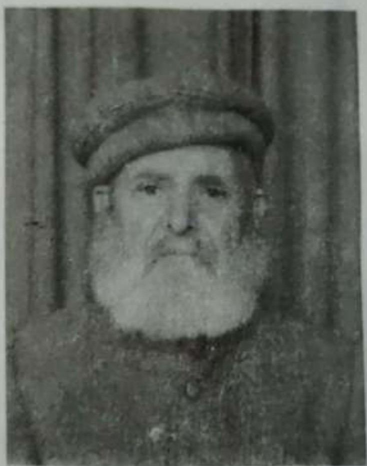
وسیم احمد مغل (امریکہ)



ذوالفقار احمد مغل زرعی یونیورسٹی پشاور



شکیل احمد مغل راولپنڈی



سید یحییٰ شاہ (حسینی سید)

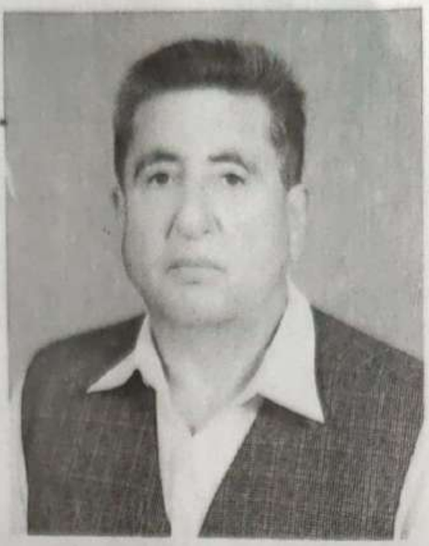


عدیل احمد مغل آرمی پبلک سکول جوٹیال



استاد محترم سید محمد عباس (مرحوم)

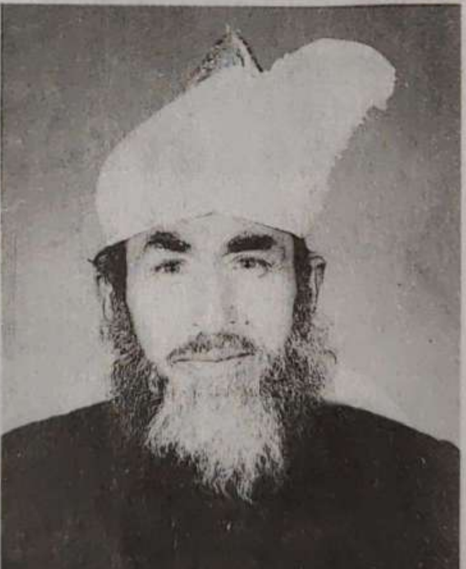
(حسینی سید)



پیر کرم علی شاہ (نقوی سید) سابق ڈپٹی
چیف ایگزیکٹیو شمالی علاقہ جات، گلگت



شاگرد عزیز شیر جہاں میر جنرل میجر
کوآپریٹیو بنک (میر مغل)



قاضی عبدالرازق (بیشکن) سابق خطیب و
قاضی جامع مسجد گلگت



سید رضی الدین رضوی سابق مشیر خوراک
شمالی علاقہ جات گلگت



محمد عالم پیرزادہ (کشمیری) سابق مہتمم
جنگلات (مرحوم)



محمد شریف خان (ملک) سابق ڈپٹی کمشنر



گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) شاہ خان (گرگس)
جنگِ آزادی گلگت کا بنیادی کردار



حسین ولی خان راجہ برش سابق جنرل میجر
اے۔ کے۔ آر۔ ایس۔ پی



شاگرد عزیز شیر جہاں میر جنرل میجر
کوآپریٹیو بنک (میر مغل)



سید رضی الدین رضوی سابق مشیر خوراک
شمالی علاقہ جات گلگت



استادِ محترم راجی الرحمت مرحوم ڈار
(کشمیری)



استادِ محترم میر عیان میر جگلوٹ (مرحوم)



عبدالرازق مغل (وکیل)



کرنل (ر) حسن خان ایک نامور رونولور جنگِ
آزلوئی گلگت کا ایک اہم کردلر



میجر (ر) حسین شاہ ایک نامور بت شکن



(ر) میجر ناصر الدین (راجپوت) گلگت



میجر ارشاد احمد (شین)



رحیم اللہ خان (شین)
سابق ڈپٹی کمشنر



میجر (ر) غلام مرتضیٰ مرچہ جنگ آزادی گلگت
کا ایک نامور جنگجو



سلطان حمید راجہ برش (مرحوم) سابق
انسپکٹر جنرل پولیس جمہوریہ گلگت
(1947ء)



کیپٹن غازی راجہ محمد بابر خان (مغلوٹ)
آزادی گلگت کا مرکزی کردار



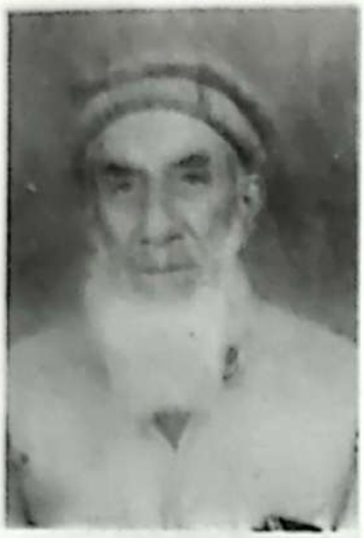
مولانا نثار احمد (یشکن) خطیب وامیر تنظیم
اہل سنت والجماعت گلگت



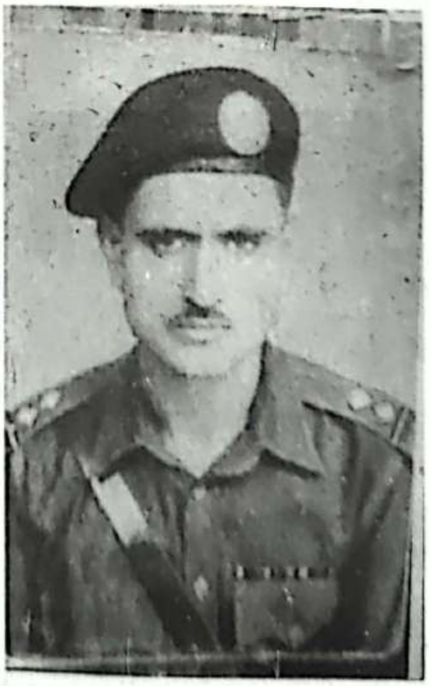
راجہ حسین علی خان (مقپون) سابق گورنر
گوپس



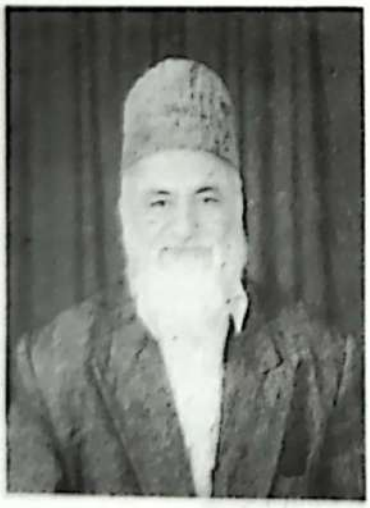
سید علی لمبردار (مرحوم) ایک نامور شین
(گور)



رحمت شاہ (پنشنر) گوہر آبادی



صوبیدار محمد ایوب (رونو) تمغہ جرات



جمعہ سید (شین) سابق چیف انجنیئر شمالی
علاقہ جات



ڈاکٹر محمد جامی (قوم یشکن)



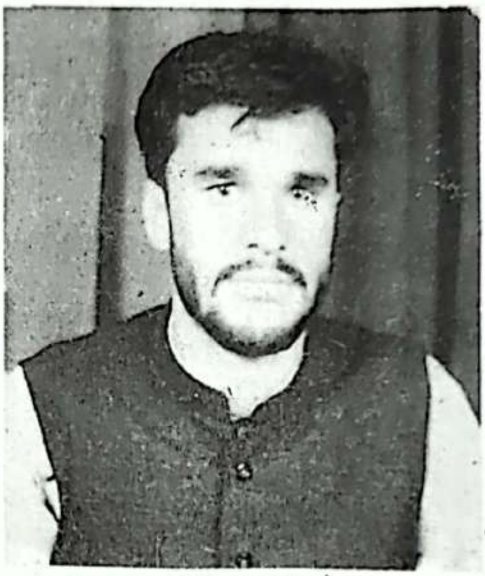
ڈاکٹر محمد سرور (یشکن)



مجاہد بختاور شاہ حراموش (شین۔ برینے)



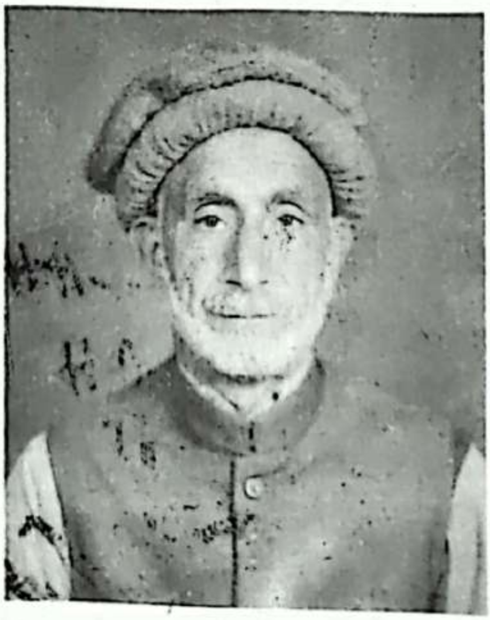
حمایت علی خان (خوش وقت) بسین



فضل خالق (میر مغل)



قائد نعیم مغل



نجیب اللہ مغل



پروفیسر عثمان علی

(1) گلگت کی روگ کہانی

(2) شنالوجی

(3) گلگت، نظریہ اور آزادی

(4) خطہء قراقرم زبانیں اور معاشرہ

(5) اخوت اسلامیؒ

(6) بچوں کی نشوونما و مشاورت

RS:475.00

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1138-7
9789693511383

یہ کتاب میں نے پی ایچ ڈی کے مقالے کے سلسلے میں پی ڈی ایف میں تبدیل کرلی ہے تاکہ جہاں بھی جاؤں یہ میرے ساتھ رہے اور کام میں آسانی ہو۔ چوں کہ بندہ تمام کتابیں اپنے ساتھ ہر جگہ نہیں لے جاسکتا ہے اس لیے مجبوراً یہ غیر اخلاقی کام انجام دینا پڑا جس کے لیے مصنف اور ناشر سے معذرت چاہتا ہوں۔میں نے اپنے حصے کی کتاب خریدی ہوئی ہے۔یہ پی ڈی ایف صرف اپنے لیے بنایا ہے جوکہ پبلک نہیں کی جائے گی۔ تاکہ جملہ حقوق محفوظ رہیں۔ آپ بھی کتاب خریدیں اور یہ پی ڈی ایف اگر آپ تک پہنچے تو اس کو خود تک محدود رکھیں۔اور صرف اور صرف تحقیقی مقاصد کے لیے استعمال کریں۔

نثار حسین سرباز

پی ایچ ڈی سکالر،جامعہ کراچی

nisarsarbaz12@gmail.com

03152270704

Edited 10:21 AM ✓

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

